

حدیث تقدیر

عالمی منظر نامہ اور اُمت مسلمہ



سمیع اللہ ملک

حدیثِ تقدیر

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنْفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَبْرَأَهَا ۚ إِنَّ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ • لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ •

کوئی مصیبت ایسی ہے جو زمین میں یا تمہارے اپنے نفس پر نازل ہوتی ہو اور ہم نے اس کو پیدا کرنے سے پہلے ایک کتاب میں لکھ نہ رکھا ہو، ایسا کرنا اللہ کیلئے بہت آسان کام ہے، (یہ سب کچھ اس لئے ہے) تاکہ جو کچھ بھی نقصان تمہیں ہو اس پر تم دل شکستہ نہ ہو اور جو کچھ اللہ تمہیں عطا فرمائے اس پر پھول نہ جاؤ۔

(الحدید: 22-23)

انتساب

یہ کتاب اُن دلوں کے نام
جو امتِ مسلمہ کے زخموں کے ساتھ دھڑکتے ہیں،
اُن آنکھوں کے نام
جو تماشائی بن کر جینے کو گناہ سمجھتی ہیں،
اور اُن نوجوانوں کے نام
جو تاریخ کے سنگین لمحوں میں
خاموشی کے بجائے ذمہ داری کا راستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں۔
اس کتاب کو میں اُن سب کے نام کرتا ہوں
جو تقدیر کے نام پر بے حسی کو قبول نہیں کرتے
اور جو تاریخ کے کٹھرے میں
خاموش گواہ نہیں بلکہ زندہ کردار بن کر کھڑے ہونا چاہتے ہیں۔
یہ کتاب اُن مظلوموں کے نام
جن کی چیخیں کسی ایوانِ اقتدار تک نہ پہنچ سکیں،
اُن ماؤں کے نام
جن کے آنسوؤں نے زمین کو گواہ بنالیا،
اور اُن شہیدوں کے نام
جنہوں نے زندگی نہیں، ایمان کی گواہی دی۔

فہرست

سیریل	عنوان	تاریخ اشاعت	صفحہ نمبر
1	پیش لفظ	بروز جمعہ 6 جمادی الثانی 1447ھ 28 نومبر 2025ء	8
2	حدیث تقدیر		18
3	باب اول** تقدیر—کائنات کا ازلی راز**		24
4	باب دوم۔ امت مسلمہ تاریخ کے آئینے میں تقدیر کی		37
5	باب سوم۔ غزہ—خون اور خاک کا قصہ		39
6	باب چہارم۔ امت کے حکمران—داخلی آزمائشیں		41
7	باب پنجم۔ معاصر دنیا میں امت—سیاسی و اقتصادی		43
8	باب ششم۔ امت کی اجتماعی ذمہ داری اور عملی حل		45
9	باب ہفتم۔ امت مسلمہ کی اجتماعی تقدیر: فلسفہ اور سبق		47
10	اختتامی باب۔ امید، روشنی اور مستقبل کی رہنمائی		48
11	اختتامی کلمات، امید اور روشنی کا پیغام		50
12	کتاب کا مکمل فکری خاکہ و خلاصہ		51
13	تاریخ کی نظر: ڈرگن اور عقاب کا مکالمہ	سو موار 9 جمادی الثانی 1447ھ یکم دسمبر 2025ء	59
14	کوئٹہ کانفرنس اور روشن فکر کی تجدید	جمعہ 13 جمادی الثانی 1447ھ 5 دسمبر 2025ء	67
15	کابل سے کعبہ تک	منگل 17 جمادی الثانی 1447ھ 9 دسمبر 2025ء	76
16	سیاسی خواب۔۔۔ تاریخی زخم	جمعرات 19 جمادی	81
17	اندھیروں سے روشنی تک۔ ایک خطے کی داستان	ہفتہ 21 جمادی الثانی 1447ھ 13 دسمبر 2025ء	87
18	مغرب میں فکرِ اقبال—ضرورت و اہمیت	منگل 24 جمادی الثانی 1447ھ 16 دسمبر 2025ء	93
19	خطرے کی گھنٹی یا حوصلے کا پرچم؟	جمعہ 27 جمادی الثانی 1447ھ 19 دسمبر 2025ء	99
20	مودی کے بیانات: خطے میں آگ یا راکھ؟	اتوار 29 جمادی الثانی 1447ھ 21 دسمبر 2025ء	105
21	رومیؒ کی محبت سے اقبالؒ کی خودی تک: روحانی بیداری	بدھ 3 رجب المرجب 1447ھ 24 دسمبر 2025ء	112
22	طاقت، اسلحہ اور لیڈیا—پاکستان ایک فیصلہ کن موڑ پر	جمعہ 5 رجب المرجب 1447ھ 26 دسمبر 2025ء	118
23	تاریخ کے ترازو پر عدل و سیاست	منگل 9 رجب المرجب 1447ھ 30 دسمبر 2025ء	124
24	تدبیر کا زوال	جمعہ 12 رجب المرجب 1447ھ 2 جنوری 2026ء	129
25	فضائی حادثات اور اقتدار کا المیہ	اتوار 14 رجب المرجب 1447ھ 4 جنوری 2026ء	134
26	تاریخ کی کڑواہٹ، وقت کی کڑواہٹ	جمعرات 18 رجب 1447ھ 8 جنوری 2026ء	142

صفحہ نمبر	تاریخ اشاعت	عنوان	سیریل
147	ہفتہ 20 رجب المرجب 1447ھ 10 جنوری 2026ء	جب دعائیں قبول ہونے لگیں	27
155	بدھ 24 رجب المرجب 1447ھ 14 جنوری 2026ء	تاریخ، طاقت اور خودی کا معرکہ	28
161	اتوار 28 رجب المرجب 1447ھ 18 جنوری 2026ء	طاقت کٹھرے میں۔۔۔	29
166	منگل 30 رجب المرجب 1447ھ 20 جنوری 2026ء	تاریخ کبھی خاموش نہیں رہتی	30
173	ہفتہ 5 شعبان المعظم 1447ھ 24 جنوری 2026ء	ایک خواب، ایک چیخ، اور ایک امت کا نوحہ	31
178	منگل 7 شعبان المعظم 1447ھ 27 جنوری 2026ء	حرمین سے عالم اسلام تک	32
183	جمعرات 9 شعبان المعظم 1447ھ 29 جنوری 2026ء	شور اور سکوت کے درمیان	33
189	سوموار 13 شعبان المعظم 1447ھ 2 فروری 2026ء	حقیقی شرمندگی: بھارت کا تعلیمی زوال	34
192	بدھ 15 شعبان المعظم 1447ھ 4 فروری 2026ء	دفاع، دانش اور فیصلہ	35
197	ہفتہ 18 شعبان المعظم 1447ھ 7 فروری 2026ء	فراق سے وصال تک: روح کی ازلی جستجو	36
204	بدھ 22 شعبان المعظم 1447ھ 11 فروری 2026ء	ایمان، فولا اور ریاست	37
209	جمعہ المبارک 24 شعبان المعظم 1447ھ 13 فروری 2026ء	پاکستان کہاں کھڑا ہے؟	38
215	سوموار 27 شعبان المعظم 1447ھ 16 فروری 2026ء	بورڈ آف پیس: انصاف یا غلبہ؟	39
222	جمعرات 2 رمضان الکریم 1447ھ 19 فروری 2026ء	اسمیش: دفاعی خود انحصاری کا فکری اعلان	40
227	ہفتہ 4 رمضان الکریم 1447ھ 21 فروری 2026ء	ایک قوم، ایک احتساب، ایک فیصلہ	41
233	سوموار 6 رمضان الکریم 1447ھ 23 فروری 2026ء	طاقت کی بساط اور حکمت کا امتحان	42
239	جمعرات 9 رمضان الکریم 1447ھ 26 فروری 2026ء	جب تاریخ سانس روکے کھڑی تھی	43
245	اتوار 11 رمضان الکریم 1447ھ یکم مارچ 2026ء	جب خاموشی بولنے لگی	44
250	منگل 13 رمضان الکریم 1447ھ 3 مارچ 2026ء	کشیدگی سے تدبیر تک	45
258	ہفتہ 18 رمضان الکریم 1447ھ 7 مارچ 2026ء	طاقت، تدبیر اور تقدیر	46
266	منگل 21 رمضان الکریم 1447ھ 10 مارچ 2026ء	عالمی بساط کا خفیہ کھیل	47
271	جمعہ المبارک 24 رمضان الکریم 1447ھ 13 مارچ 2026ء	ایوان اقتدار کی سرگوشیاں	48
276	اتوار 26 رمضان الکریم 1447ھ 15 مارچ 2026ء	بدلتی عالمی بساط اور پاکستان کا امتحان	49
282	منگل 28 رمضان الکریم 1447ھ 17 مارچ 2026ء	ایٹمی قیامت کا اندیشہ	50
287	جمعہ المبارک عید الفطر 1447ھ 20 مارچ 2026ء	سرخ لکیر کے پار	51
296	جمعرات 6 شوال المعظم 1447ھ 26 مارچ 2026ء	جمہوریت کے سائے میں خون	52
301	ہفتہ 9 شوال المکرم 1447ھ 28 مارچ 2026ء	آسیہ اندرانی: سوال جو دبا یا نہ جاسکا	53

سیریل	عنوان	تاریخ اشاعت	صفحہ
54	سراب کے پیچھے چھپی ہوئی دنیا	منگل 12 شوال المکرم 1447ھ 31 مارچ 2026ء	307
55	عہد آزمائش	جمعرات 14 شوال المکرم 1447ھ 2 اپریل 2026ء	313
56	جھوٹ کا نقاب، سچ کا انکشاف	سوموار 18 شوال المکرم 1447ھ 6 اپریل 2026ء	319
57	ایک گمشدہ سچ کی تلاش	بدھ 20 شوال المکرم 1447ھ 8 اپریل 2026ء	324
58	پاکستان کا جو ا: ایک تیز طوفان میں ثالث	جمعۃ المبارک 22 شوال المکرم 1447ھ 10 اپریل 2026ء	329
59	جنگ کے سائے میں امن کی تلاش	سوموار 25 شوال المکرم 1447ھ 13 اپریل 2026ء	337
60	سفارت کی میز پر جنگ کے سائے	جمعرات 28 شوال المکرم 1447ھ 16 اپریل 2026ء	343
61	خاموش سفارت کی بازگشت	ہفتہ 30 شوال المکرم 1447ھ 18 اپریل 2026ء	349
62	نئے عالمی نظام کی پہلی گونج	منگل 4 ذیقعدہ 1447ھ 21 اپریل 2026ء	354
63	جب اعتماد ٹوٹ جائے	جمعرات 6 ذیقعدہ 1447ھ 23 اپریل 2026ء	359
64	ایک لمحے کے رحم و کرم پر دنیا	اتوار 9 ذیقعدہ 1447ھ 26 اپریل 2026ء	366
65	مشرق وسطیٰ کا طوفان	بدھ 12 ذیقعدہ 1447ھ 29 اپریل 2026ء	372
66	بیانیہ، راز اور عالمی کھیل	جمعۃ المبارک 14 ذیقعدہ 1447ھ یکم مئی 2026ء	378
67	جب راستے بولنے لگیں	سوموار 17 ذیقعدہ 1447ھ 4 مئی 2026ء	383
68	ایک عہد، ایک قیادت، ایک فیصلہ	بدھ 19 ذیقعدہ 1447ھ 6 مئی 2026ء	390
69	خاک و خون سے ابھرتی ہوئی نئی دنیا	جمعرات 20 ذیقعدہ 1447ھ 7 مئی 2026ء	396
70	خاموش سفارت کاری کی پس پردہ کہانی	منگل 25 ذیقعدہ 1447ھ 12 مئی 2026ء	398

حدیثِ تقدیر — پیش لفظ

کائنات کے سینے میں ازل سے ایک سرگوشی گونجتی آرہی ہے؛ ایک ان کہی صدا، جو کبھی بادِ صبا کی نرم لے میں، کبھی رعد و برق کی ہیبت میں، کبھی انبیاءؑ کہتے ہیں — انسان کے وجود کی دعاؤں میں اور کبھی شہیدوں کے لبوں میں سنائی دیتی ہے۔ یہ صدا، یہ پیغام، یہ مخفی نکتہ، جسے اہل عرفان ”حدیثِ تقدیر“ پروہی ہے جو طلوعِ صبح پر پہلی کرن کا لمس۔

کائنات ہست و بود کی رفتیگاں میں ایک صوت ایسی بھی ہے جو ازل کی خاموشیوں سے ابھر کر زمانوں کے دل میں اترتی ہے؛ ایک سرگوشی جو کبھی آہ بن کر انسانی ضمیر میں جاگ اٹھتی ہے، کبھی آیت بن کر صحیفہٴ تقدیر پر نقش ہوتی ہے، اور کبھی امتوں کی تاریخ میں لبو اور آنسوؤں کے رنگ بھرتی ہے۔ اسی سرگوشی کا نام ”حدیثِ تقدیر“ ہے — وہ لطیف پیغام جو انسان کو اس کی ذمہ داری، اس کا امتحان، اس کی خطا، اور اس کے احوالِ روزگار کا راز بتاتا ہے۔

کائنات کی پیشانی پر جب ازل کی پہلی لکیر کھنچی تھی، تب تقدیر نے تاریخ کے گوشے میں ایک ایسی آہ لکھ دی تھی جو ہر صدائے ظلم کو چیرتی ہوئی ہر عہد کے دل میں اترتی ہے۔

یہ آہ نہ صرف انبیاءؑ کی سطوت میں تھی، نہ صرف شہداء کے لبوں میں؛

— یہ آہ انسان کی اپنی روح میں اتر کر اسے اس کے ہونے کا راز بتاتی ہے

اور یہی وہ راز ہے جسے اہل نظر ”حدیثِ تقدیر“ کہتے ہیں۔

— یہ پیش لفظ اسی راز کا دروازہ ہے۔

ایک دروازہ جو وقت کی گرد میں چھپ تو گیا ہے، مگر اس کی پٹیاں ابھی تک آسمانی ہاتھوں کے لمس سے گرم ہیں۔

یہ کتاب ”حدیثِ تقدیر“ اسی ازلی سرگوشی کا پیغام ہے — ایک پیغام جو امتِ مسلمہ کے زخموں پر بھی مرہم ہے، اور ان کے دلوں کے آئینے پر ایک

سوال بھی۔ دنیا کی تہذیبوں کے مقتل میں، تاریخ کے شبستان میں، قافلہٴ انسانیت کی گرد میں ایک سوال ہمیشہ سے گھومتا آیا ہے: آخر تقدیر انسان کو

لے کہاں جا رہی ہے؟ اور انسان تقدیر کے بیچ اپنی ذمہ داری کہاں رکھتا ہے؟

یہی وہ مقام ہے جہاں یہ پیش لفظ ایک محض تمہید نہیں رہتا، بلکہ ملتِ اسلامیہ کی سانسوں کی دھڑکن بن کر ابھرتا ہے — ایک آہ، ایک فریاد، ایک نعرہ،

ایک استقامت، ایک التجا۔ قرآن نے تقدیر کو جبر کا سندیہ نہیں بنایا، بلکہ انسان کے عزم، ارادے اور کردار کی قوت کو اس کے مرکز میں رکھا ہے۔

ارشادِ باری ہے:

﴿وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَرَهُ تَقْدِيرًا﴾

”اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور اسے (اس کا) اندازہ ٹھیک ٹھیک باندھ دیا۔“

یہ آیت گویا بتاتی ہے کہ کائنات کی ہر شے اپنی حدیں، اپنی قدریں، اپنے راستے اور اپنے مرحلے رکھتی ہے۔

مگر انسان وہ مخلوق ہے جو تقدیر کے دریا میں بھی اپنی ناخود چلاتی ہے۔

اسی لیے قرآن فرماتا ہے:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي كَبَدٍ﴾

”ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے۔“

یہ مشقت صرف جسمانی نہیں — روحانی بھی ہے، اخلاقی بھی، سیاسی بھی، اجتماعی بھی۔

امتِ مسلمہ کی تاریخ، اگرچہ بنفشہ و نسترن کے دن بھی اپنے دامن میں رکھتی ہے، مگر اس کے صفحات پر زخموں کی سرخی اور آہوں کی چلی گونج زیادہ گہری معلوم ہوتی ہے۔ ہر عہد میں کسی نہ کسی گوشے سے ظلم کی ایک تپتی ہوئی لہر اٹھتی ہے، جو کبھی بغداد کی گلیوں سے ٹکراتی ہے، کبھی اندلس کے شکستہ میناروں سے سوال کرتی ہے، کبھی بیت المقدس کی ریتوں سے خون کی خوشبو اٹھاتی ہے، اور کبھی کشمیر اور غزہ کے چہروں پر انسانی تقدیر کی تلخیاں لکھتی ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن پاک نے ایک آیت میں یوں آشکار کیا:

﴿وَنَلَّكَ الْأَيَّامُ نُذَاوُلَهَا بَيْنَ النَّاسِ﴾

”اور یہ دن تو ہم لوگوں کے درمیان گھماتے رہتے ہیں۔“

یہ گردشِ ایام کبھی فتح کے نغمے بجاتی ہے، کبھی آزمائش کی تپش بڑھادیتی ہے۔ مگر آزمائش کا کمال یہ ہے کہ وہ قوموں کو ان کے دل کی گہرائیوں تک جھانکنے پر مجبور کرتی ہے۔

آج امتِ مسلمہ کی حالتِ زار کو دیکھ کر زخموں سے گزرا ہوا طائف یاد آگیا: آج امتِ مسلمہ اپنے وجود کے جس موڑ پر کھڑی ہے، اس کی فضا میں کئی صدیوں کی تھکن ہے۔ اس کے دامن میں بغداد کے شعلوں کی سرخی ہے، اندلس کی ٹوٹی دانش کا غبار ہے، دہلی کے شہزادوں کے زخم ہیں، بخارا و سمرقند کی لائبریریوں کی خاکستر یادیں ہیں۔ غزہ کے بچوں کی سسکیاں، کشمیر کے جوانوں کی زخمی آنکھیں، شام کے کھنڈرات کی ٹھنڈی دیواریں، اور روہنگیا کے اجڑے ساحل امت کی اجتماعی تقدیر کے نئے باب لکھ رہے ہیں۔ امتِ مسلمہ کا ہر شہر ایک آیت ہے، ہر قبیلہ ایک سوال، ہر نسل ایک امتحان۔ کتاب لکھتے ہوئے میں نے فقط قلم نہیں اٹھایا — ان زخموں پر ہاتھ رکھ کر لکھ رہا ہوں جن کی سوزش ہر بیدار دل کو جگانے کے لیے کافی ہے۔

اور آج غزہ، جہاں ہر لمبے کے نیچے تاریخ کا دل دفن ہے

— غزہ آج محض ایک شہر نہیں

یہ عہدِ حاضر کا کر بلا ہے؛

ظلم کی صلیب پر لٹکی ہوئی ایک پوری انسانیت ہے۔

وہاں کی ماؤں نے اپنے لختِ جگر کی قبروں پر اتنے آنسو بہائے ہیں کہ سمندر بھی شرمندہ ہو جائیں۔

وہاں کے بچے اپنی مٹھیوں میں مٹی بھر خاک لے کر دنیا سے سوال کرتے ہیں:

”کیا ہمارے نصیب کی کتاب میں صرف لمبہ لکھا تھا؟“

نیتن یا ہو کی وحشت...

بمباری کی مسلسل گونج...

راکھ میں بدلتے ہوئے گھر...

ٹوٹے ہوئے اسکول...

لاشے اٹھاتے ہوئے بچے...

بچے اٹھاتی ہوئی مائیں...

ان میں سے ہر منظر ایک قیامت ہے، ایک ایسی قیامت جسے دنیا کی وی کی سکرین پر دیکھ کر چائے کے کپ کے ساتھ ہلکا سا افسوس کرتی ہے، اور اگلے ہی لمحے اپنے شیڈول پر واپس لوٹ جاتی ہے۔ مگر تقدیر کے صحیفوں میں ایسا نہیں ہوتا۔

— وہاں غزہ کا ہر قطرہ خون ایک حرف بن جاتا ہے

ایک حرف، جس سے آنے والی نسلوں کی تاریخ لکھی جائے گی۔

غزہ: جہاں آسمان نے انسانی سانسوں کا بوجھ اٹھایا، دنیا کی کسی سرزمین پر شاید ہی ظلم نے اتنے بے رحم نقوش چھوڑے ہوں جتنے غزہ کے بوسیدہ مکانوں پر ثبت ہیں۔ وہاں کی خاک اپنے اندر انسانیت کی چیخیں جذب کر کے بھی خاموش ہے۔ وہاں کے بچے اپنی ماؤں کے آنسوؤں کی بوندیں شمار کرنا سیکھتے ہیں، کیونکہ ان کے پاس کھلونوں کی گنتی باقی نہیں رہی۔ ہر صبح وہاں ایک نیاملبہ گرتا ہے، اور ہر شام ایک نیا جنازہ تیار ہوتا ہے۔ وہاں موسم بہار کا انتظار نہیں رہتا۔ کیونکہ بہار کے لیے جو درخت چاہیے، وہ توپوں نے جلا ڈالے۔

جہاں ہر دن بھاپ بن کر اٹھتے دھوئیں کے پیچھے کہیں ایک بچے کی سانس بجھتی ہے، کہیں ایک میا لے گھر کے بلے تلے ماں کی لوری خاموش ہو جاتی ہے، کہیں ایک جوان اپنے والد کے جنازے کے کندھے پر سوال رکھے کھڑا ہوتا ہے کہ دنیا کے ضمیر آخر کب بیدار گا؟ غزہ کے راستوں پر بلے کے درمیان چلتی ہوئی معصوم بچیاں گویا پوری انسانیت سے کہہ رہی ہوتی ہیں: ”تم نے ہماری قسمت کس کتاب میں لکھ دی؟“

یہ صرف غزہ کا دکھ نہیں، بلکہ پوری دنیا کے محروموں کا نوحہ ہے۔ مگر اس نوحے کا سب سے کرناک پہلو یہ ہے کہ وہ صدائے بعض اوقات دوستوں کے گھروں سے بھی خاموشی کی دیواروں سے ٹکرا کر واپس لوٹ آتی ہے۔

وہاں شام کی سرخی غروب آفتاب کی نہیں، دھماکوں کی آگ کی ہوتی ہے۔ مگر ظلم کی شدت سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ دنیا نے انسانیت کے چہرے پر کوئی شکن نہیں پڑتی۔ یہ وہ سوال ہے جسے تقدیر بھی شاید خاموش نگاہ سے دیکھتی ہے۔

حدیثِ تقدیر: انسان کا امتحان اور امت کی ذمہ داری کا وہ بیانیہ ہے جس نے میرے ارد گرد شدید محاصرہ کر کے مجھے یہ کتاب لکھنے کیلئے دنیا کے اس مشکل ترین میدان میں حوصلے اور امید کے اس ولولے سے روشناس کرا دیا ہے جو میرے لئے ایک نعمت بن گیا ہے کیونکہ اسلام تقدیر کو جبر کا نام نہیں دیتا، بلکہ ذمہ داری اور ارادہ کے امتزاج کو تقدیر کی عملی صورت قرار دیتا ہے۔

یہی فلسفہ قرآن نے یوں بیان کیا ہے

(وَقُلْ اَعْمَلُوا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ)
”کہہ دو، عمل کرو! پھر اللہ تمہارے عمل کو دیکھے گا۔“

یہی وہ مقام ہے جہاں امتِ مسلمہ کے نو میدانوں کو امید کا چراغ ملتا ہے۔
تقدیر کی کتاب میں لکھا ہوا ہر امتحان اسی وقت مکمل ہوتا ہے جب انسان اپنی ذمہ داری ادا کرتا ہے۔ آج اگر امت کے چہرے پر زخم ہیں تو وہ ہمارے لیے محض درد کا عنوان نہیں۔ وہ ہمیں بیدار کرنے کا آسمانی اشارہ بھی ہیں۔
آج امتِ مسلمہ کا چہرہ دیکھئے۔ اس کی پیشانی پر کرب کا جو سایہ ہے، وہ محض سیاسی نہیں، روحانی ہے؛ محض سفارتی نہیں، تاریخی ہے؛ محض زمینی نہیں، آسمانی امتحان کی یاد ہے۔ اسی طرح مقبوضہ کشمیر کا افق دیکھئے:
کشمیر کے برف پوش پہاڑوں کے دامن میں ایک صدی سے زیادہ عرصہ سے انسانیت کی چیخیں ٹھٹھر رہی ہیں۔ اگر کوئی شخص کشمیر کی برفانی وادیوں میں کھڑے ہو کر فضا کی خاموشی کو غور سے سنے، تو اسے معلوم ہو گا کہ خاموشی بھی کبھی کبھی چیخ بن جاتی ہے۔ وہاں کی فضاؤں میں اذیت کی بگولے ہیں، دریاؤں کے موج نامے میں خون کی لکیریں ہیں، اور وادی کے ہر برگ و گل پر سوالوں کا اک ہجوم بیٹھا ہے: آخر گل ولالہ کی وادی کو بارود کے گرداب میں کس نے جھونکا؟ آخر وہ کون سادہ ہے جب مظلوم ماؤں کی سسکیاں امن کی صبح میں تحلیل ہوں گی؟

یہ وادی صدیوں سے ظلم کے شبستان میں پڑی ہے۔
یہ چہرہ دنیا کے ضمیر پر ایک سوالیہ نشان ہے اور طاقت کے ایوانوں کے طاقوں پر ایک لرزاں سایہ۔
کشمیری ماؤں نے اتنے جنازوں کو رخصت کیا ہے کہ شاید ان کی آنکھوں نے رونا سیکھنا چھوڑ دیا ہے۔
وہاں کی بہنیں اپنے بھائیوں کی قبریں دیکھ کر بھی روشنی کی دعا مانگتی ہیں۔
وہاں کے نوجوان اپنی محرومیوں کا وزن اٹھاتے اٹھاتے تاریخ سے بڑے ہو گئے ہیں۔

غزہ اور کشمیر: دو داستانیں، مگر درد ایک؛
غزہ کا المیہ اور کشمیر کی ٹوٹی ہوئی زندگی دونوں دراصل ایک ہی درد و الم کی دو صورتیں ہیں۔
دونوں جگہ انسان صرف ظلم کی آگ نہیں جھیلتا، بلکہ دنیا کی سرد مہری کی برف بھی۔
دونوں جگہ بچے اپنے والدین کے لاشے اٹھاتے ہیں، بوڑھی مائیں اپنی دعاؤں کی عمر گنتی ہیں، اور نوجوان اپنے خوابوں کو صدیوں کی دھند میں گم ہوتا ہوا دیکھتے ہیں۔

غزہ میں اگر بمباری کی تپش ہے تو کشمیر میں احتساب سے ماوراء قوانین کی سرد پن۔
غزہ میں بلبے کے ڈھیر ہیں، کشمیر میں عقوبت خانوں کی خاموش دیواریں۔
غزہ میں محاصرے کا سایہ ہے، کشمیر میں پہروں کی مسلسل تنگی۔

گویا ایک سوال دونوں دھرتیوں پر لکھا ہے:
کیا انسانیت صرف طاقتوروں کا نام رہ گئی ہے؟

اور دنیا...

دنیا محض تماشائی ہے، اور تماشائی ہمیشہ تاریخ کے سب سے کمزور کردار ہوتے ہیں۔

مسلم حکمرانوں کی خاموشیاں: کیا تقدیر کا امتحان ہے یا تاریخ کا لمحہ احتساب؟ تاریخ نے دیکھا ہے کہ قومیں صرف دشمنوں کے نیزوں سے نہیں ٹوٹتیں؛ وہ اپنی قیادت کی کوتاہیوں اور مصلحتوں کے بوجھ سے بھی ڈھے جاتی ہیں۔ آج امت مسلمہ کی قیادت کا ایک بڑا حصہ — چند روشن چراغوں کو چھوڑ کر — ایک عجیب سی مصلحت آمیز خاموشی میں قید دکھائی دیتا ہے؛ ایک ایسی خاموشی جو الفاظ سے نہیں، رویوں سے لکھی جاتی ہے۔ یہ وہ سکوت ہے جو اقتدار کے ایوانوں میں تو بہت پُر اعتماد نظر آتا ہے، مگر تاریخ کے اوراق میں ایک سوال بن کر رہ جائے گا:

کیا ہم نے اپنے وقت کی ذمہ داری پوری کی؟

کیا ہم امت کے زخموں کے سامنے خاموش تماشائی بنے کھڑے رہے؟

کیا ہماری سیاسی ترجیحات، ہمارے ایمان اور ہمارے انسانی اصولوں سے زیادہ قیمتی ہو گئیں؟

اس باب میں قرآن کی یہ آیت آج بھی امت کے سامنے دلیل کی طرح کھڑی ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ﴾

”بے شک اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اندر کی حالت نہ بدل دیں۔“

تقدیر کے دروازے بند نہیں ہوتے، مگر وہ ان ہاتھوں سے کبھی نہیں کھلتے جو بے حسی کا بوجھ اٹھائے پھر رہے ہوں۔

یاد رکھیں: تقدیر کا جلال، قوموں پر جتنا سخت ہوتا ہے، امکانات اتنے ہی روشن ہوتے ہیں۔ تقدیر جب کسی قوم کو آزمائلیتی ہے تو اس کی رگوں میں ایک نیا

خون، اس کی آنکھوں میں ایک نیا شعور، اور اس کے دل میں ایک نیا عزم پیدا ہوتا ہے۔

یہ آزمائش،

یہ مصیبت،

— یہ رنج

— یہ سب ہمیں صرف توڑا نہیں کرتے

یہ ہمیں بنانے کا آسمانی طریقہ بھی ہیں۔

تاریخ گواہ ہے:

جن قوموں نے آگ کے دریپا پار کیے،

انہیں روشنی کی نئی صبح نصیب ہوئی۔

بدر کے میدان میں تعداد کم تھی مگر عزم پہاڑ سے زیادہ تھا۔

کر بلا میں پانی کم تھا مگر حمیت آسمان سے بلند تھی۔

غزہ میں ملے زیادہ ہے مگر صبر کا پہاڑ اس سے بھی اونچا ہے۔
 کشمیر میں زنجیریں زیادہ ہیں مگر امید کی شمع اب بھی جل رہی ہے۔
 — یہ سب تقدیر کے رموز ہیں
 جو دل والے ہی سمجھتے ہیں۔

مسلمان حکمرانوں کا سکوت: تاریخ کا سب سے طویل سایہ
 — یہ امت کبھی اپنے دشمنوں سے نہیں ہاری
 یہ ہمیشہ انہوں کی خاموشیوں سے زخمی ہوئی۔
 آج بھی،

محلات روشن ہیں مگر ضمیر بجھ چکے ہیں؛
 تخت مضبوط ہیں مگر اخلاق کمزور ہے؛
 خوابشیں زندہ ہیں مگر حمیت دم توڑ چکی ہے۔

ایک طرف غزہ میں گھروں کی چھتیں گر رہی ہیں،
 اور دوسری طرف عرب کے ایوانوں میں محلات کی روشنیاں بڑھ رہی ہیں۔
 ایک طرف کشمیر میں بچے آنسو پی رہے ہیں،
 اور دوسری طرف طاقت کے ایوانوں میں جشن کی شمعیں جل رہی ہیں۔
 — قیادت کا جو شیوہ کبھی عمرؓ اور صلاح الدینؒ کا امتیاز تھا
 آج وہ مصالحانہ بیانون کے پیچھے چھپ گیا ہے۔

یہ وہی لمحہ ہے جہاں قرآن صد الگاتا ہے:

﴿أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾

”کیا تم عقل نہیں رکھتے؟“

اور ایک اور مقام پر:

﴿فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَآخِشُونِ﴾

”لوگوں سے نہ ڈرو، مجھ سے ڈرو“

مگر آج...

ایسا لگتا ہے جیسے ہم لوگوں سے ڈرنے میں مہارت پا چکے ہیں، اور اللہ سے ڈرنے کے باب میں غفلت کے صحرائیں بھٹک رہے ہیں۔
 مسلمان حکمرانوں کی خاموشی، تاریخ کا سنگین ترین باب کے طور پر رقم ہو چکا ہے۔ امت کے زخموں کا اصل درد یہ نہیں کہ دشمنوں نے کیا کیا؛ اصل

رنج یہ ہے کہ انہوں نے کیا نہیں کیا۔ قیادت کی ذمہ داری تقدیر کے باب میں سب سے نازک امتحان ہے لیکن افسوس کہ ملتِ اسلامیہ کے بیشتر حکمران مصلحتوں کے قفس میں قید ہیں۔ ان کے فیصلوں پر قوموں کی قسمتیں نہیں، بلکہ تخت کے پائے لرزتے ہیں۔ وہ اپنے عوام کی امیدوں کے خیمے داغدار کر دیتے ہیں، صرف اس لیے کہ کہیں کوئی طوفان ان کے محلات کی کھڑکیوں کو نہ ہلا دے۔

یہ وہی لمحہ ہے جہاں قرآن کی یہ آیت آفتاب کی طرح سامنے آکھڑی ہوتی ہے:

﴿فَمَا لَهُمْ لَا يَكْفُرُونَ يَفْقَهُونَ حَدِيثًا﴾

”انہیں کیا ہوا ہے؟ یہ کسی بات کو سمجھتے ہی نہیں۔“

کیا ہم نے اپنے وقت کی بات سمجھنے سے انکار کر دیا ہے؟

کیا ہمارے دلوں میں ایمان کی حرارت باقی نہیں رہی؟

یا ہماری روحمیں دنیا کے پیالے سے سیراب ہو کر سست پڑ گئی ہیں؟

تقدیر کا امتحان، جبر نہیں، دعوتِ عمل ہے۔ اسلام کا تصور تقدیر انسان کو بے بس نہیں بناتا۔ یہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ تقدیر وہ دریا ہے جو ان ہاتھوں کو بلند کرتا ہے جو دعائیں کرتے ہیں، اور ان ہاتھوں کو قوت دیتا ہے جو عمل کرتے ہیں۔ اسی لئے قرآن کا یہ روشن پیغام ہماری رہنمائی اور استعانت کا راستہ دکھا رہا ہے کہ:

﴿وَقُلْ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا﴾

”(اے نبی کہیے) اے میرے رب! مجھے علم میں اضافہ عطا فرما۔“

یہ اضافہ دراصل وہی قوتِ بصیرت ہے جس سے انسان اپنے حالات کا مطلب سمجھنے لگتا ہے۔ اور پھر تقدیر اس کے قدموں کو راستہ دینے لگتی ہے۔

لیکن نچالے کیوں مجھے پھر سے ایک نئی صبح کے امکانات نظر آرہے ہیں:

تاریخ کبھی بھی ایک رخ نہیں رہی۔

ہر تاریک رات کے پیچھے ایک شفق ہوتی ہے۔

ہر زخم کے پیچھے ایک نئی قوت چھپی ہوتی ہے۔

ہر شکست کے پیچھے ایک نئی ولادت کے آثار ہوتے ہیں۔

امتِ مسلمہ اس وقت جس درخت کی طرح ہے، وہ ہوا کے ہر جھونکے سے کانپ تو رہا ہے، مگر اس کی جڑیں ابھی تک زمین میں پیوست ہیں۔ اور یہی اس کی بقا کی دلیل ہے۔

سوال صرف اتنا ہے کہ کیا ہم ان جڑوں کو پانی دینے کا حوصلہ رکھتے ہیں یا نہیں۔

آنے والا وقت امت سے ایک نئے عزم، ایک نئی سپرٹ اور ایک نئی اخلاقی قیادت کا تقاضا کر رہا ہے۔

وہ قیادت جو قوموں کو ان کی تقدیر کی طرف واپس لے جاسکے۔

وہ قیادت جسے خوف نہ ہو، مصلحت کا بوجھ نہ ہو، اور جس کے ہاتھ میں انسانیت کا چراغ ہو۔

امید کا چراغ تھام کر رکھیں کہ امت ابھی زندہ ہے:

اگرچہ زمانے کی ہوائیں سرد ہیں،

اگرچہ آزمائشوں کی رات لمبی ہے،

اگرچہ دشمنوں کی صفیں منظم ہیں،

—اگرچہ سات سمندر انسانیت کے خون سے گلے دکھائی دیتے ہیں

مگر امت کی روح ابھی زندہ ہے۔

وہ روح جو بدر میں تھی،

وہ روح جو کربلا کے میدان میں عظمت بن کر کھڑی ہوئی،

وہ روح جو صلاح الدینؒ کے عزم میں تھی،

وہ روح جو ممالیک کے تیروں میں تھی،

وہ روح جو اقبالؒ کے اشعار میں چیخ بن کر اٹھی۔

یہ روح تقدیر کے دروازوں پر دستک دے سکتی ہے۔

وہ دستک جو تاریخ کا رخ بدل دیتی ہے۔

یہ پیش لفظ دراصل ایک دعوتِ فکر ہے، اذانِ بیداری ہے کہ ہم تقدیر کو محض سانسوں کی کتاب نہ سمجھیں، بلکہ عمل، ذمہ داری، ایثار اور شعور کا نام

سمجھیں۔ امتِ مسلمہ کے زخم ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ ہماری کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی۔ تاریخ کے صحیفے ابھی بند نہیں ہوئے۔ وقت کے اوراق پر ابھی

بہت سے الفاظ لکھے جانے باقی ہیں۔ اور شاید—صرف شاید—ہماری آنے والی نسلیں جب ان اوراق کو پڑھیں، تو انہیں یہ محسوس ہو کہ کسی زمانے میں

امت کے دل میں درد تھا، لیکن اسی درد نے ایک نئی صبح کی بنیاد رکھ دی۔

یہ پیش لفظ نہیں، ایک دعا ہے

—یہ پیش لفظ محض کتاب کا آغاز نہیں

یہ امت کی رگوں میں اترنے کی آرزو رکھتا ہے۔

یہ دلوں کے درپچوں میں ایک ہوا کی طرح داخل ہونا چاہتا ہے،

جو باسی فضا کو بدل دے،

جو جھکی گردن کو اٹھا دے،

جو سوتے ضمیر کو جگا دے۔

—تاریخ کا چلن یہی ہے کہ قومیں شکست سے نہیں مرتیں

وہ اس وقت مرتی ہیں جب وہ امید چھوڑ دیتی ہیں۔

اور یہ امت ابھی اپنی امید کی آخری سانس تک زندہ ہے۔

—یہ الفاظ محض تحریر نہیں

یہ امت کے دل پر دستک ہیں۔

یہ روح کے کانوں میں پڑنے والی وہ لکار ہیں جو انسان کو اس کی اصل یاد دلاتی ہے۔ یہ پکار رہی ہے:
اٹھو!

اپنے زخموں سے آنسو نہیں، عزم نکالو۔

اپنی مظلومیت سے فریاد نہیں، حمیت پیدا کرو۔

اپنے ماضی سے غرور نہیں، سکونِ عمل حاصل کرو۔

—اور اپنی تقدیر سے فرار نہیں

اس کی طرف قدم بڑھاؤ۔

کیونکہ تقدیر ان ہاتھوں کو راستہ دیتی ہے

جو اللہ کے لیے اٹھتے ہیں،

اور ان قدموں کو قوت دیتی ہے

جو ظلم کے بیانون سے نہیں ڈرتے۔

—امت زندہ ہے

اور زندہ امتیں کبھی دفن نہیں ہوتیں۔

وہ صرف سوتی ہیں.....

اور پھر ایک دن جاگ اٹھتی ہیں اور جب جاگ جائیں تو پھر نیند کو بھول جاتی ہیں اور اپنے کھوئے خوابوں کی تعبیر کیلئے پر عزم اور تازہ دم ہو کر اپنی منزل کا سراغ لگا کر منزل مقصود پر پہنچ جاتی ہیں۔ تقدیر جب کسی قوم کو آزمائیتی ہے تو اس کی رگوں میں ایک نیا خون، اس کی آنکھوں میں ایک نیا شعور، اور اس کے دل میں ایک نیا عزم پیدا ہوتا ہے۔

یہ آزمائش،

یہ مصیبت،

—یہ رنج

یہ سب ہمیں صرف توڑا نہیں کرتے، یہ ہمیں بنانے کا آسانی طریقہ بھی ہیں۔

تاریخ گواہ ہے جن قوموں نے آگ کے دریا پار کیے، انہیں روشنی کی نئی صبح نصیب ہوئی۔ بدر کے میدان میں تعداد کم تھی مگر عزم پہاڑ سے زیادہ تھا۔
کر بلا میں پانی کم تھا مگر حمیت آسمان سے بلند تھی۔

غزہ میں ملبہ زیادہ ہے مگر صبر کا پہاڑ اس سے بھی اونچا ہے۔

کشمیر میں زنجیریں زیادہ ہیں مگر امید کی شمع اب بھی جل رہی ہے۔

— یہ سب تقدیر کے رموز ہیں
جو دل والے ہی سمجھتے ہیں۔
اور یہ حدیث تقدیر کا پیام ہے۔
سمیع اللہ ملک
لندن برطانیہ

بروز جمعہ المبارک جمادی الثانی 1447ھ 28 نومبر 2025ء

-: حدیث تقدیر :-

امتِ مسلمہ کے دل کی دھڑکن، اس کے زخم، مظلومیت اور تاریخی آزمائشیں آج بھی ہمارے سامنے ہیں۔ مقبوضہ کشمیر میں بھارتی ظلم، غزہ میں بیتن یاہو کی سفاکی، اور امت کے حکمرانوں کی خاموشی، یہ سب ایک اجتماعی تقدیر کا منظر نامہ پیش کرتے ہیں۔ یہ کتاب امت کے فکری، اخلاقی، عملی اور روحانی ستونوں پر روشنی ڈالتی ہے، اور ہر فرد کو یہ پیغام دیتی ہے کہ تقدیر انسان کو توڑنے کے لیے نہیں، بلکہ اسے بیدار، متحد اور فعال بنانے کے لیے آزماتی ہے۔

صوفیا فرماتے ہیں:

"اندھیروں میں روشنی تلاش کرو، ہر زخم میں حکمت دیکھو، کیونکہ تقدیر دل کی آنکھ سے نظر آتی ہے۔"

باب اول:

تقدیر — کائنات کا ازل راز

فکری مقصد:

تقدیر کا حقیقی اسلامی تصور واضح کرنا؛ جبر کے غلط فہم تصورات کی اصلاح؛ انسانی ارادے اور الہی نظم کی ہم آہنگی۔

ممکنہ ذیلی عنوانات:

تقدیر: لفظ سے مفہوم تک

ازل کی پہلی تحریر: قلم اور لوح

قرآن کا تصور تقدیر:

(إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ)

ارادہ، اختیار، ذمہ داری

جبر و قدر: تاریخ اسلامی کے علمی مباحث

تقدیر کو سمجھنے کی روحانی حکمت

صوفیا، حکماء اور مفسرین کی آراء

باب دوم: آدم کی اولاد — امتحان اور آزادی کا سفر

فکری مقصد:

انسان کی تخلیق کا مقصد، آزادی ارادہ، آزمائش کی منطق، آفاقی قصہ بشریت۔

ممکنہ ذیلی عنوانات:

آدم کا سبق: تقدیر اور توبہ کی پہلی بنیاد

انسان کی خلقت بطور امانت دار

فتنہ، آزمائش، اور بلند مقاصد

انسان کا سفر روح... جنت سے زمین تک

تقدیر اور مردِ مومن (اقبال کا فلسفہ)

باب سوم: امتِ مسلمہ — تاریخ کے آئینے میں تقدیر کی تجلیاں

فکری مقصد:

امت کی تاریخ کا ایک فکری و خطیبانہ جائزہ — ظاہر، زوال، احیاء، انکسار، شجاعت، غفلت۔

ذیلی عنوانات:

بدر کی صبح: تقدیر کے ساتھ چلنے والی قوم

احد کا دن: تقدیر سے غفلت کا انجام

خلافت کے ادوار اور قوموں کے امتحان

زوالِ بغداد کی رات

اندلس: تقدیر سے بغاوت یا تاریخ کا جبر؟

سلطنتِ عثمانیہ: نشیب و فراز کے اسباب

مغل سلطنت: تقدیر اور وقت کا امتحان

باب چہارم: آج کا عہد — امت کے زخموں کی نئی کتاب

فکری مقصد:

امتِ مسلمہ کے موجودہ حالات کی فکری تصویر: علاقے در علاقے، زخم در زخم۔

ذیلی عنوانات:

ہم کہاں کھڑے ہیں؟

جدید غلامی: معاشی، سیاسی، فکری

امت کی جغرافیائی بکھڑن

قومیں، لکیریں، سرحدیں اور اصل روح کی شکست

عالمی استعمار اور "اطاعت کی نئی صورتیں"

باب پنجم: غزہ — عصرِ حاضر کی کربلا

فکری مقصد:

غزہ کی جدوجہد کا اخلاقی، انسانی، روحانی و سیاسی تجزیہ۔

ذیلی عنوانات:

غزہ: تاریخ کے ملبوں سے اٹھتی ہوئی انسانیت

محاصرہ، بمباری، نسل کشی

معصومیت کا قتل اور عالمی منافقت

نیتن یاہو کی درندگی: سیاسی تجزیہ نہیں، انسانی نوحہ

فلسطین کی مزاحمت: ایمان کا استعارہ

دنیا کی بے حسی — ضمیر کی موت

تقدیر کے آئینے میں فلسطین کا مقام

آخری نبی کی بشارت اور فلسطینی سرفروشی

باب ششم: کشمیر — برف میں جلی ہوئی صدا

فکری مقصد:

کشمیر کی تاریخی، انسانی اور روحانی جدوجہد کا گہرائی سے تجزیہ۔

ذیلی عنوانات:

کشمیر ایک صدی کی چیخ

بھارتی استعمار کے ایوان

AFSPA: ظلم کا قانونی چولا

ہزاروں لاپتہ جوان

ماؤں کے آنسو اور لٹی ہوئی عصمتیں

دنیا کی سیاسی منافقت

کشمیر — امتحان وقت اور تقدیر کا لمحہ نوحہ

باب ہفتم: امت کے حکمران — تاریخ کا سنگین ترین سوال

فکری مقصد:

دنیا بھر کے مسلم حکمرانوں کی بے حسی اور مصلحت کا تجزیہ۔ خطیبانہ اور جلالی انداز۔

ذیلی عنوانات:

تخت اور تقدیر کی جنگ

خوف، مفاد اور بزدلی کا سیاسی فلسفہ
 اسلامی سیاسی اخلاقیات: کھویا ہوا خزانہ
 حمیت ابو بکر، شجاعت عمرؓ، حلم عثمانؓ، عدل علیؓ، غیرت حسینؓ
 آج کے ایوانوں میں سناٹا
 قوموں کو مصلحت نے مارا
 استعمار کے قدموں میں بچھے ہوئے فرش

باب ہشتم: تقدیر کا فلسفہ — جبر نہیں، قوت عمل فکری مقصد:

تقدیر کے مثبت و روحانی مفہوم کو کھولنا، قوموں کے احیاء کا فلسفہ۔
 ذیلی عنوانات:
 تقدیر: روشن راستہ، تاریک جبر نہیں
 قرآن کا اصول:
 ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ﴾
 قومیں کیسے اٹھتی ہیں؟
 ایمان، عمل اور ارادہ — تقدیر کا سرخ دروازہ
 تاریخ کے متحرک اصول
 مومن کی تقدیر، خوف نہیں تقویٰ سے جڑتی ہے

باب نہم: استعمار جدید — نئی دنیا کے نئے بت فکری مقصد:

جدید عالمی نظام کی ساخت: میڈیا، بینکنگ، لابیئر، عالمی ادارے، نیو ورلڈ آرڈر۔
 ذیلی عنوانات:
 عسکری استعمار سے ذہنی استعمار تک
 میڈیا: تہذیبی قتل کا خاموش ہتھیار
 Global Silence Industry
 آئی ایم ایف، فیڈف، اور معاشی زنجیریں
 Global vulnerability: مسلم دنیا کی عالمی کمزوری
 تقدیر کے سوالات: دنیا کیوں خاموش ہے؟

باب دہم: امت کی نئی صبح — تقدیر کے دروازے دوبارہ کھل سکتے ہیں
فکری مقصد:

امید، احیا، عمل اور اجتماعی بیداری کے راستے دکھانا۔
ذیلی عنوانات:

بیداری کے ستون
نوجوان نسل: تقدیر بدلنے والی قوت
تعلیم، علم، ٹیکنالوجی
اخلاقی سیاست
روحانی قیادت

تہذیبی خود اعتمادی
اقبال کی مردِ مومن کی تلاش
امت کی اجتماعی سمت کی اصلاح
باب یازدہم: حدیثِ تقدیر — امت کے نام آخری پکار
فکری مقصد:

انتہائی شاعرانہ، وجدانی، خطیبانہ اور روحانی اختتام۔
ایک "اذانِ بیداری"۔

ذیلی عنوانات:
تقدیر کی آواز
آزمائش کا فلسفہ
ظلم کے سامنے ڈٹ جانے کا قرآنی اصول
امت کی روح کی وابستگی
ایک نئی صبح کے آثار
غبار کے بعد چمکتی ہوئی روشنی
آخری دعا

کتاب کا آخری حصہ

(1) اختتامی دعا

(2) حوالہ جات

(3) قرآنی آیات کی جامع فہرست

(4) شخصیات و مقامات کی تشریح

باب اول

**** تقدیر — کائنات کا ازلی راز ****

تقدیر: فلسفہ، عمل اور روحانی بصیرت

زمانے کے اوراق پر جب انسان نے پہلی بار آنکھ کھولی، تو کائنات نے اپنے بے کنار خموش آسمان سے اُس کے چہرے کو دیکھا اور اس میں پوشیدہ ہزار داستانوں کی تمکنت کو پہچانا۔ اُس دن انسان نے پہلی بار محسوس کیا کہ وہ تنہا نہیں — ایک مادرائی قلم اس کے گرد ایک نادیدہ داستان لکھ رہا ہے، جس کی سطریں ہواؤں میں بھی ہیں، پانیوں میں بھی، ستاروں میں بھی اور اس کے اپنے دل میں بھی۔

تقدیر، وہ راز ہے جو دل کی گہرائیوں میں چھپا ہوا ہے اور کائنات کے ہر ذرے میں اپنی زبان سے گونجتا ہے۔ یہ صرف ایک جبر یا نتیجہ نہیں، بلکہ ایک تقدیر..... روحانی زبان، عملی رہنما اور اخلاقی آئینہ ہے، جو انسان کی نیت، عمل اور شعور کے مطابق رنگ بدلتی ہے۔! یہ لفظ صرف لفظ نہیں — یہ ازل کی خاموش سانس ہے، یہ تخلیق اول کا پہلا لہس ہے، یہ وہ صدائے کن ہے جس کی بازگشت ابھی تک کائنات کے ہر ذرے میں لرزاں ہے۔

صوفیا فرماتے ہیں:

"تقدیر دل کی نبض میں چھپی ہوئی روشنی ہے، اور دل وہ کاغذ ہے جس پر رب اپنی حکمت لکھتا ہے۔"

تقدیر کا فہم محض علمی بحث نہیں؛ یہ روح کی طلب ہے۔ یہ سوال ہے جو آدم کی آنکھ کے پہلے آنسو سے لے کر آج کے انسان کی بکھرتی ہوئی دنیا تک — مسلسل اٹھتا چلا آیا ہے

میں کون ہوں؟

اور میری راہیں کس کے اشاروں پر ہیں؟

تقدیر اور اختیار کا فلسفہ

انسان کے اندر دو قوتیں ہیں: اختیار اور شعور، جو تقدیر کے نظام کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں۔ اللہ کا علم ازل انسان کی آزادی کو محدود نہیں کرتا، بلکہ اسے مسئول اور فعال بنانے کا ذریعہ ہے۔

قرآن فرماتا ہے:

(وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ)

”اور اللہ نے تمہیں پیدا کیا اور تمہارے اعمال کو بھی جانتا ہے۔“

یہ ہمیں سکھاتا ہے کہ تقدیر صرف نتیجہ نہیں، بلکہ عمل اور نیت کا عکس بھی ہے۔

دل و دماغ کی زبان

تقدیر کا ہر لمحہ ایک علامت ہے:

شاخ جو ہوا سے جھکتی ہے، انسان کی آزمائش

قطرہ جو دریا میں گرتا ہے، کوشش اور عمل کا رمز
تاریک رات، صبر اور استقامت کا امتحان
یہ تمثیلیں انسان کو یہ سبق دیتی ہیں کہ تقدیر ایک روحانی زبان ہے، جو دل کے سمندر سے بات کرتی ہے۔

امتحان، صبر اور توکل
تقدیر انسان کو آزماتی ہے تاکہ صبر، توکل اور ایمان کی مشق ہو۔
صبر انسان کو مظلومیت میں بلند کرتا ہے،
توکل اسے فیصلہ سازی میں اطمینان بخشتا ہے،
اور عمل انسان کو تقدیر کے آغوش میں مقام عطا کرتا ہے۔
:قرآن فرماتا ہے
(وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ)
”صبر کرو، اور تمہارا صبر اللہ کے ساتھ ہی ممکن ہے۔“

انفرادی اور اجتماعی تعلق

ہر انسان کے اعمال تقدیر کی تصویر میں رنگ بھرتے ہیں
امت کی اخلاقی اور اجتماعی حالت تقدیر کے اثرات میں نظر آتی ہے
داخلی وحدت، عدل، اور بصیرت امت کی بقاء کے ستون ہیں
یہ حصہ امت کی زندگی، فرد کی روح اور کائنات کی نظم کے درمیان ایک روحانی و فکری پل قائم کرتا ہے۔

** ازل کی پہلی تحریر: لوح پر لکھا گیا علم **

قرآن کریم اعلان کرتا ہے:
(إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ)
”بے شک ہم نے ہر چیز کو ایک مقرر تقدیر کے ساتھ پیدا کیا ہے۔“
یہ آیت صرف عقیدہ نہیں، ایک فلسفہ ہے — عظیم، عمیق، اور شہابِ ثاقب کی طرح منور۔
یہ جبر کے اندھیرے کو نہیں، نظم کائنات کے حُسن کو بیان کرتی ہے۔
تقدیر کا اعلان خوف نہیں، اطمینان ہے؛ بے بسی نہیں، بصیرت ہے؛ جمود نہیں، حرکت ہے۔
ازل کے نامعلوم لمحے میں جب لوح محفوظ پر پہلا حرف لکھا گیا ہوگا، تو شاید فرشتوں کی صفوں نے سکوت میں ڈوب کر دیکھا ہوگا کہ یہ قلم جو کچھ لکھتا
ہے، وہ صرف آنے والے واقعات کی خبر نہیں بلکہ حکمت ربانی کی ایک عظیم ترتیب ہے — علم، عدل، رحمت اور آزمائش کا امتزاج۔

** تقدیر اور ارادہ — انسان کی دو کنجیاں **

تقدیر کے دو دروازے ہیں:

ایک وہ جس کے پیچھے ازلی فیصلہ ہے۔

اور دوسرا وہ جس کے سامنے انسان کھڑا ہے — اپنے اختیار، اپنے ارادے، اپنی خواہش اور اپنے عمل کے ساتھ۔

اگر تقدیر محض جبر ہوتی تو آدم کی توبہ بے معنی ہو جاتی؛

اگر انسان محض مجبور ہوتا تو فرعون کا ظلم اور ابراہیم کا صبر برابر ٹھہرتا؛

اگر سب کچھ پہلے سے طے شدہ بے اختیاری ہوتی تو قرآن بار بار یہ نہ کہتا:

(فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمَرْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفَرْ)

”جو چاہے ایمان لائے، اور جو چاہے کفر کرے۔“

— یہ آیت بتاتی ہے کہ انسان کے ہاتھ میں راہ کا انتخاب ہے

لیکن راستے کا انجام خدا کے علم میں ہے۔

یہ وہ برزخ ہے جہاں تقدیر اور ارادہ ایک دوسرے سے جدا بھی ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ بندھے بھی۔

یہ وہ لطیف نقطہ ہے جس پر صوفیا کی محفلیں روشن رہیں، متکلمین کی راتیں کاغذوں پر جھکتی رہیں، مفسرین کے قلم سفر کرتے رہے، اور حکما کے اذہان

حیرت میں ڈوبے رہے۔

** تقدیر: خوف نہیں، اطمینان کا نام **

بہت سی نسلوں نے تقدیر کو ایک ایسی زنجیر سمجھا جس کے سامنے انسان بے بس ہے۔

— لیکن قرآن بار بار انسان کو جمود نہیں عطا کرتا

وہ اسے اٹھاتا ہے، جگاتا ہے، ہلچل دیتا ہے، حرکت بخشتا ہے۔

(وَأَنْ لَّيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ)

”اور انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کی اس نے کوشش کی۔“

— یہ آیت تقدیر کے فلسفے میں بجلی کی طرح چمکتی ہے

یہ اعلان کرتی ہے کہ کوشش انسان کی ہے، نتیجہ خدا کا ہے؛

راہ انسان کا فیصلہ ہے، انجام خدا کی حکمت ہے؛

جہد انسان کی ذمہ داری ہے، اور فیصلے رب کے علم کی ساعتیں۔

یہ نظام اگر نہ ہوتا تو دنیا بے عدل کائنات ہوتی، جہاں ظالم اور مظلوم کی راہیں ایک ہی منزل پر آکر رک جاتیں۔

** کائنات کا نظم — تقدیر کی شہادت **

— اگر انسان تھوڑی دیر آسمان کو دیکھے اور لمحہ بھر آنکھیں بند کرے، تو اسے محسوس ہو گا کہ ہر چیز اپنے مدار میں قائم ہے

ستارے اپنی منازل پر جاتے ہیں،
 ہوائیں اپنی سمتیں بدلتی ہیں،
 پانی اپنی حدیں پہنچاتا ہے،
 درخت اپنی جڑوں سے راز لیتے ہیں،
 اور انسان اپنے دل کے اندر ایک نادیدہ اشارہ پاتا ہے۔
 یہ سب کچھ تقدیر کی دلیل ہے۔
 کائنات کا یہ نظم صرف اتفاق ہو ہی نہیں سکتا۔
 ایک بے رحمت اور بے مقصد دنیا ممکن ہی نہیں جہاں ہر چیز عین محل پر ہو، مگر انسان محض ٹھوکروں کی پیداوار ہو۔

**** آدم کی لغزش اور تقدیر کا پہلا فیضان ****

تقدیر کا سب سے بڑا سبق آدم کی توبہ میں چھپا ہے۔
 وہ لمحہ جب آدم زمین پر اترے، تو انہوں نے پہلی بار اس راز کو جانا کہ تقدیر کی تحریر انسان کو توڑنے نہیں، اٹھانے آتی ہے۔
 انہوں نے وہ دعا کی جو تقدیر کے فلسفے کے دروازے کو کھول دیتی ہے:
 ﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ﴾
 اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا،
 ”اگر تو ہمیں معاف نہ کرے اور رحم نہ کرے تو ہم خسارہ پانے والوں میں ہو جائیں گے۔“
 یہ دعا انسان کو دو باتیں سکھاتی ہے:
 1- انسان غلطی کرتا ہے۔ یہ اس کا اختیار ہے۔
 2- اور خدا معاف کرتا ہے۔ یہ اس کی تقدیر ہے۔
 یہ دونوں جب آپس میں ملتے ہیں تو تقدیر کا حسن ظاہر ہوتا ہے۔

تقدیر ایک معمہ جو دل سے سمجھا جاتا ہے

کائنات کا ہر عظیم راز لفظوں سے زیادہ محسوسات میں چھپا ہوتا ہے۔
 تقدیر بھی ایسا ہی راز ہے۔
 اسے عقل سمجھتی ہے، مگر دل جانتا ہے۔
 یہ علم کا نہیں، شعور کا مسئلہ ہے؛
 یہ بحث نہیں، تجربے کا فاصلہ ہے؛
 یہ دلیل نہیں، یقین کا سفر ہے۔

جب انسان کسی دکھ میں گرتا ہے اور پھر اٹھ کر آگے بڑھتا ہے، تو وہ تقدیر کو سمجھ لیتا ہے۔
 جب کوئی راستہ بند ہو جائے اور پھر اچانک کوئی در کھل جائے، تب بھی وہ تقدیر کو پہچان لیتا ہے۔
 ... اور جب وہ پوری طاقت لگا کر بھی ناکام ہو جائے تو وہ جان لیتا ہے کہ رب نے ابھی اسے اس منزل کے لائق نہ سمجھا
 یہ سب تقدیر کے لمس ہیں۔ جو لفظوں میں نہیں سماتے۔

قرآن اور تقدیر کا روحانی معجزہ

قرآن جب تقدیر کا ذکر کرتا ہے تو اس کے الفاظ نرم بھی ہوتے ہیں اور جلالی بھی۔
 کہیں وہ انسان کو صبر سکھاتا ہے،
 کہیں وہ اسے عمل کا حکم دیتا ہے،
 کہیں وہ اسے امتحان کی خبر دیتا ہے،
 کہیں وہ اسے آخری کامیابی کی نوید دیتا ہے۔
 — یہ پورا نظام بتاتا ہے کہ تقدیر صرف نتیجہ نہیں

یہ سفر ہے،
 یہ امتحان ہے،
 یہ دعا ہے،
 یہ نیت ہے،
 یہ جستجو ہے،
 یہ روشنی ہے،
 یہ ہمت ہے،
 یہ وہ مسلسل دھڑکن ہے جس پر دنیا قائم ہے۔

تقدیر کے بارے میں سب سے بڑا غلط فہم

سب سے خطرناک غلطی یہ ہے کہ انسان تقدیر کو سستی کا بہانہ بنا لے۔
 یہ وہ مقام ہے جہاں قرآن ہمیں روک دیتا ہے۔
 اگر تقدیر بہانہ ہوتی تو موسیٰؑ فرعون کے سامنے کھڑے نہ ہوتے؛
 ابراہیمؑ نمرود کے دربار میں آگ کے سامنے کود نہ جاتے؛
 محمد ﷺ مکہ کے پہاڑوں میں ظلم سہہ کر ہجرت نہ کرتے؛
 حسینؑ یزید کے سامنے کربلا میں کھڑے نہ ہوتے۔

— تقدیر بہادروں کی ڈھال ہے
 بزدلوں کی چھتری نہیں۔
 تقدیر انسان کو توڑنے کے لیے نہیں،
 بلکہ بیداری، ہمت اور عمل کے لیے آزماتی ہے۔
 :صوفیا فرماتے ہیں

"اندھیروں میں بھی روشنی تلاش کرو، کیونکہ تقدیر کا راز دل کی آنکھ سے نظر آتا ہے۔"

**** تقدیر — انسان کی روح میں اترتا ہوا راز**

انسان جب اپنی راتوں کے سناتوں میں اپنے دل کے دروازے پر دستک سنتا ہے تو وہ جان لیتا ہے کہ یہ دنیا صرف نظر کا کھیل نہیں۔ اس کے اندر کہیں
 — کوئی نا دیدہ قوت ہے جو اسے بلاتی ہے، ٹوکتی ہے، آگے بڑھاتی ہے، روک لیتی ہے، آزماتی ہے، نوازتی ہے
 یہی تقدیر کا وہ روحانی لمس ہے جو دلیل سے زیادہ تجربے سے سمجھ آتا ہے۔

جبر اور قدر — اسلامی فکر کی روشن و تاریک گلیاں

صدیوں سے انسان دو سوالوں کے درمیان جھولتا آیا ہے:

کیا میں خود چل رہا ہوں؟

یا مجھے چلایا جا رہا ہے؟

یہ وہ سوال ہے جس نے علماء کی زبانیں تھکائیں، تصانیف کے صفحات روشن کیے اور فلسفے کی راتوں کو اضطراب کی لالٹینوں سے جگمگا دیا۔

1- جبریہ کا اندھیرا

کچھ لوگ کہتے رہے کہ انسان مجبور محض ہے،
 وہ صرف پتلی ہے، جس کی ڈوریں تقدیر کے ہاتھ میں ہیں۔
 لیکن اگر یہ بات صحیح ہو تو پھر:

سزا و جزا کا کیا مفہوم؟

عدل الہی کہاں باقی رہتا؟

نیکی و بدی کا فرق کیا معنی رکھتا؟

اور قرآن کے تمام احکام بے مقصد ٹھہرتے۔

یہ سوچ اسلام کے نور سے زیادہ مجوسیوں کی پرانی فکر معلوم ہوتی ہے۔

2- قدریہ کی انتہا

دوسری طرف وہ لوگ تھے جو کہتے تھے کہ انسان خود ہی سب کچھ ہے، اس کا اچھا برا سب اسی کا فیصلہ، سب اسی کی محنت۔

اگر ایمان لیا جائے تو رب کی قدرت، علم ازل اور اس کی مشیت کا کیا مقام رہتا ہے؟
یہ سوچ خدا کی حاکمیت کی نفی کرتی ہے۔

3- اہل سنت کا نورانی راستہ ◇

اسلام نے نہ جبر یہ کا شدید اندھیرا قبول کیا، نہ قدریہ کا خود سری بھرا غور۔
بلکہ ایک ایسا راستہ دکھایا جو:
عدل بھی ہے، رحمت بھی
اختیار بھی دیتا ہے، تحفظ بھی
امتحان بھی ہے، نوازش بھی
یہی راستہ تقدیر کی اصل حقیقت ہے۔

انسان کا اختیار—تقدیر کا دروازہ جس کی چابی ہاتھ میں ہے

قرآن کہتا ہے:
(وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ بِهِ وَ مَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ)
(اے رسول! کہہ دیجیے کہ حق تمہارے رب کی طرف سے ہے،
”اب جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔
یہ آیت اللہ کے اعلان کی مانند ہے کہ:
راہ تمہارے ہاتھ میں ہے—منزل میرے علم میں ہے۔
انسان کا اختیار اتنا قوی ہے کہ اس نے خود اپنی تقدیر کے راستے کا انتخاب کرنا ہے۔

اسی لیے قرآن پھر کہتا ہے:
(إِنَّ السَّعْيَ لَكُمْ شَتَّى)
”تمہاری کوششیں مختلف ہیں۔“

اور پھر فرمایا:

(إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ)
اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا،
”جب تک وہ خود اپنے اندر کی حالت نہ بدل دے۔“

یہ اعلان اپنی پوری شان کے ساتھ یہ بتاتا ہے کہ قوموں کی اجتماعی تقدیر بھی انسانوں کے انتخاب، نیت، ارادے، ہمت اور بیداری سے جڑی ہے۔
صوفیانہ زاویہ—تقدیر دل کی دھڑکنوں میں لکھی جاتی ہے، صوفیا کے نزدیک تقدیر کوئی لکھی ہوئی سطر نہیں، بلکہ سفر ہے۔ ایسا سفر جو انسان کی کیفیتوں،
اس کی نیت، اس کے اخلاص، اس کے باطن، اس کے درد اور اس کی طلب سے متاثر ہوتا ہے۔ رومی کہتے ہیں:

خدا ہر روز تقدیر کو نئے رنگ دیتا ہے، مگر انسان کا دل اگر بے رنگ ہو تو کچھ بھی نہیں دیکھتا۔

ابن عطاء اللہ اسکندری فرماتے ہیں:

تمہاری حرکت تمہاری تقدیر سے پیدا ہوتی ہے، اور تمہاری تقدیر تمہاری نیت سے رنگ پکڑتی ہے۔
یہ وہ تفہیم ہے جس میں انسان بے بس نہیں، اس کے ارادے میں ایک لطیف نور ہے جو اس کی سمتیں بدل دیتا ہے۔

تمثیلی زاویہ — تقدیر ایک دریا ہے، اور انسان اس میں بہتی ہوئی ناؤ:

اگر تقدیر کو دریا سمجھ لیں

— تو انسان اس میں بہتی ہوئی ناؤ ہے

لیکن چپو اس کے ہاتھ میں ہیں۔

دریا کا رخ خدا نے مقرر کیا ہے،

مگر ناؤ کی جہت انسان طے کرتا ہے۔

آندھیاں اس کے اختیار میں نہیں

مگر بادبان اس کے ہاتھ میں ہیں۔

طوفانوں کی شدت اس کے بس میں نہیں

مگر اس کا عزم اس کے اختیار میں ہے۔

منزل کا علم خدا کے پاس ہے

مگر راستے کا فیصلہ انسان کے دل میں ہے۔

— یہی وہ توازن ہے جو اسلام انسان کو عطا کرتا ہے

جس میں نہ انسان پتلا بنتا ہے اور نہ خدا کا نظام معطل ہوتا ہے۔

تقدیر — آزمائش کا فلسفہ

اگر دنیا میں آزمائش نہ ہوتی تو تقدیر کی ضرورت بھی نہ ہوتی۔

● بیماریاں کیوں آتی ہیں؟

● ناکامیاں کیوں ملتی ہیں؟

● گھر کیوں اجڑتے ہیں؟

● قومیں کیوں ڈوبتی اور اٹھتی ہیں؟

● ظلم کیوں ہوتا ہے؟

● مظلوم کیوں روتے ہیں؟

یہ سب تقدیر کی اصطلاح میں امتحان ہیں۔

قرآن کہتا ہے:

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالنَّمْرِ﴾

اور ہم تمہیں ضرور آزمائیں گے خوف، بھوک، مالوں اور جانوں کے نقصان سے، اور پھلوں کی کمی سے۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ تقدیر، ظلم نہیں بلکہ ایمان کے سفر میں امتحان کا لازمی مرحلہ ہے۔

تقدیر اور ظلم — ایک حساس مسئلہ

یہ سوال اکثر دلوں میں آتا ہے:

اگر ظالم بھی تقدیر کا حصہ ہے، تو پھر ظلم کی ذمہ داری کس پر؟

اسلام اس کا حسن جواب دیتا ہے:

ظلم انسان کا انتخاب ہے، وہ اس کا مجرم ہے۔ اور مظلوم کا صبر تقدیر کی آزمائش کا حصہ ہے۔

اگر ظالم مجبور ہوتا تو فرعون مجرم نہیں ٹھہرتا۔ اگر مظلوم بے کار ہوتا تو ایوبؑ کی عظمت کیا ہوتی؟

اگر کر بلا ایک جبر ہوتا تو حسینؑ کی عظمت کہاں سے آتی؟

— تقدیر کی زمین پر ظلم کا جنم انسان کی بدنیتی سے ہوتا ہے

اور صبر کا نور مؤمن کے دل سے۔

انسان کے دل میں موجود "الہام" — تقدیر کی خفیہ آواز

اللہ نے انسان کے دل میں ایک لطیف قوت رکھی ہے جسے قرآن نے "الہام" کا نام دیا:

﴿فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا﴾

"پس (اللہ نے) اس نفس میں بدی اور نیکی کی راہ الہام کر دی۔"

یہ الہام انسان کے اندر وہ توازن قائم رکھتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کون سا راستہ حق ہے اور کون سا باطل۔

یہی الہام انسان کے اختیار میں روشنی بھر دیتا ہے۔

اگر انسان سنتا رہے تو وہ خدا کی تقدیر کا ہم سفر بن جاتا ہے؛

اگر وہ بہرہ ہو جائے تو وہ اپنی ہی خواہشات کا غلام ہو جاتا ہے۔

تقدیر — نور بھی، آگ بھی

تقدیر کا نور اس وقت درخشاں ہوتا ہے جب انسان ہمت کرے،

اور تقدیر کی آگ اس وقت بھڑکتی ہے جب انسان مایوسی، بے عملی اور جمود میں ڈوب جائے۔

بہادروں کے لئے قوت ہے تقدیر اور بزدلوں کے لئے پردہ۔

— تقدیر خدا کی آغوش بھی ہے
اور اس کا امتحان بھی۔

ذمہ داری — تقدیر کی سب سے بڑی شرط
اسلام کا نظریہ تقدیر صرف تین جملوں میں سمٹ سکتا ہے:
خدا جانتا ہے۔
انسان کرتا ہے۔

نتیجہ خدا کی حکمت سے نکلتا ہے۔
یہ توازن اگر کسی فرد، قوم، امت یا تہذیب میں قائم ہو جائے
تو اس کی تقدیر روشن ہو جاتی ہے۔
یہ توازن جب ٹوٹ جائے
تو وہ قومیں بھی اندھیروں میں گر جاتی ہیں
جو کبھی نور کی امانت دار رہی ہوں۔

** تقدیر — علامتی اسرار اور عملی مظاہر
تقدیر، وہ راز ہے جو نظر سے پوشیدہ اور دل سے محسوس ہوتا ہے۔
یہ صرف کائنات کے بڑے نظام کا نام نہیں بلکہ انسان کے اندر ایک مسلسل نبض کی مانند جاری ہے۔
یہی نبض انسان کے دل و دماغ، روح و عمل کو مربوط رکھتی ہے، اور اسی سے امت کی زندگی کا حقیقی جغرافیہ تیار ہوتا ہے۔

علامتی تشریحات — تقدیر کا ادبی آئینہ
صوفیاء کے نزدیک تقدیر کا ہر لمحہ ایک علامت ہے:
ایک شاخ جو ہوا کے جھونکوں سے جھکتی ہے، انسان کی آزمائش ہے۔
ایک قطرہ جو دریا میں گرتا ہے، انسانی کوشش کا رمز ہے۔
ایک تاریک رات، امتحان کی علامت ہے۔
ایک سنہری صبح، صبر اور استقامت کا نور ہے۔
ابن عربی فرماتے ہیں:

"تقدیر، دل کی گہرائی میں چھپی ہوئی زبان ہے، اور دل ہی وہ کاغذ ہے جس پر رب لکھتا ہے۔"
یہ تصور ہمیں سکھاتا ہے کہ تقدیر کسی جبر یا بے حسی کا نام نہیں، بلکہ ایک روحانی زبان ہے جو دل کے سمندر سے بات کرتی ہے۔

دل و دماغ کا رشتہ — تقدیر اور شعور

تقدیر انسانی شعور کے ساتھ مربوط ہے۔

جب دل نادم اور صاف ہو، تو تقدیر کی آغوش نرم اور شگفتہ محسوس ہوتی ہے۔

جب دل مغرور یا بوجھل ہو، تو تقدیر کی لذت کانوں تک نہیں پہنچتی بلکہ رنج و غم کی آتش بھڑک جاتی ہے۔

یہاں قرآن کی ایک آیت ہمیں رہنمائی دیتی ہے:

﴿قَالُوا آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ﴾

”اور جو ایمان لائے اور نیک عمل کریں گے، ان کے برے اعمال ان سے دور کر دیے جائیں گے۔“

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ تقدیر کے اثرات دل و عمل کے مطابق مختلف ہوتے ہیں؛

یہ صرف اللہ کے علم کا منظر نہیں بلکہ انسان کی حالت کا عکس بھی ہے۔

تقدیر اور امت کی اجتماعی نفسیات

ایک قوم کی تقدیر بھی اسی اصول پر منحصر ہے۔

جب امت متحد، عادل، بااخلاق اور فعال ہو، تقدیر اسے کامیابی دیتی ہے۔

جب امت منتشر، بزدل، مغلوب اور مغلوب فکر ہو، تقدیر اسے آزمائش میں ڈال دیتی ہے۔

تاریخ ہمیں بار بار یہ سبق دیتی ہے:

بدر اور احد:

امت کے ارادے نے فتح و شکست کی سمت طے کی۔

اندلس:

ملت اسلامیہ کی داخلی کمزوری نے ایک عظیم تہذیب کا خاتمہ کیا۔

عثمانی خلافت:

بیرونی دباؤ اور داخلی بدانتظامی نے زوال کی راہیں کھول دیں۔

یہ واضح ہے کہ امت کی اجتماعی تقدیر انفرادی عمل، اجتماع اور حکمرانی کے امتزاج سے جڑی ہے۔

عملی زندگی میں تقدیر کے مظاہر

تقدیر کا حقیقی مظہر انسان کی روزمرہ زندگی میں نظر آتا ہے:

ایک بیج جو زمین میں بویا جاتا ہے، ایک درخت بنتا ہے یا نہیں — یہ زمین، ہوا، پانی اور بیج کی حالت پر منحصر ہے۔

ایک قوم کے فیصلے، قیادت، اور جمہور کے اعمال اس کے مستقبل کو بدل دیتے ہیں۔

فرد کا ارادہ، نیت، کوشش اور صبر تقدیر کے نقشے میں رنگ بھرتا ہے۔

یہ ہمیں سکھاتا ہے کہ تقدیر صرف "نتیجہ" نہیں، بلکہ ایک مسلسل عمل اور نیت کا عکس ہے۔

امتحان اور صبر — تقدیر کے اخلاقی پہلو

تقدیر انسان کے لیے امتحان بھی ہے، نعمت بھی ہے۔

یہ کسی کی زندگی میں رنج و غم لاتا ہے تاکہ صبر، توکل اور ایمان کی جانچ ہو۔

یہ نعمتیں دیتا ہے تاکہ شکر، انصاف اور حسن سلوک پیدا ہو۔

قرآن کہتا ہے:

(وَأَصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ)

”صبر کرو، اور تمہارا صبر اللہ کے ساتھ ہی ممکن ہے۔“

یہاں صبر اور توکل کو تقدیر کے فریم ورک میں مرکزی حیثیت دی گئی ہے:

صبر انسان کو مظلومیت میں بلند کرتا ہے

توکل انسان کو فیصلہ سازی میں اطمینان دیتا ہے

عمل انسان کو تقدیر کی آغوش میں مقام عطا کرتا ہے

تقدیر اور توکل — روحانی توازن

تقدیر کا اصل روحانی راز توکل میں چھپا ہے۔

توکل کا مطلب یہ نہیں کہ انسان بیٹھ جائے اور سب کچھ اللہ پر چھوڑ دے۔

توکل کا مطلب ہے کہ انسان اپنی قوت، علم، نیت اور کوشش کو بروئے کار لاتے ہوئے نتیجہ اللہ پر چھوڑ دے۔

یہی وہ نظریہ ہے جو امت کی زندگی میں بیداری، جرات اور حکمت پیدا کرتا ہے۔

یہی وہ روشنی ہے جو غرہ اور کشمیر کے مظلوم دلوں میں بھی جھیل سکتی ہے۔

اقبال، مولانا روم اور ابن تیمیہ کے نظریات

اقبال:

"انسان اپنی تقدیر خود تخلیق کرتا ہے"

انسان کے ارادے میں کائنات کی طاقت پوشیدہ ہے

امت کے نوجوان اپنے اعمال سے تقدیر کی سمت بدل سکتے ہیں

مولانا روم:

"تقدیر دل کے سفر کی صورت ہے"

روحانی بصیرت کے بغیر تقدیر صرف ایک جبر لگتا ہے

عشق اور عرفان انسان کو تقدیر کے راز دکھاتے ہیں
ابن تیمیہ:

"تقدیر اور اختیار دونوں خدا کے علم میں ہیں"
علم ازل انسان کی آزادی کو محدود نہیں کرتا
تقدیر انسان کو ذمہ داری اور عمل کی طرف لے جاتی ہے
یہ تین نظریات ہمیں دکھاتے ہیں کہ تقدیر کا فہم نہ صرف عقلی، بلکہ روحانی اور عملی بھی ہونا چاہیے۔

عمل، توکل اور امید — تقدیر کا عملی درس

تقدیر انسان کے لیے:
عمل کا درس دیتی ہے
انسان کی جدوجہد، منصوبہ بندی اور نیت اہم ہیں
توکل کا سبق دیتی ہے:
نتیجہ اللہ پر چھوڑنا دل کو سکون بخشتا ہے
امید کا پیغام دیتی ہے
ہر تاریکی کے بعد روشنی کا امکان موجود ہے:
یہ تین ستون انسان کو ہر زمانے میں، ہر آزمائش میں مضبوط رکھتے ہیں۔

تیسرے حصے کا اختتام — خلاصہ حکمت

باب اول کا تیسرا حصہ ہمیں یہ درس دیتا ہے کہ:
تقدیر صرف نتیجہ نہیں، ایک مسلسل عمل ہے
تقدیر اور اختیار کا توازن انسان کے دل و دماغ میں ہے
امت کی تقدیر انفرادی اور اجتماعی اعمال سے جڑی ہے
صبر، توکل، امید اور عمل تقدیر کے عملی مظاہر ہیں
روحانی بصیرت تقدیر کو سمجھنے کی سب سے بڑی چابی ہے
یہ حصہ امت کی زندگی، فرد کی روح اور کائنات کی نظم کے درمیان ایک روحانی و فکری پل قائم کرتا ہے، جو آگے آنے والے ابواب میں عملی اور
تاریخی مثالوں، ظلم و ستم کے مظاہر، اور امت کی آزمائشوں کے تجزیے کے لیے بنیاد فراہم کرے گا۔

باب دوم

امتِ مسلمہ — تاریخ کے آئینے میں تقدیر کی تجلیاں

امتِ مسلمہ: تاریخی امتحانات

امتِ مسلمہ، ایک روشن قافلہ ہے جو صدیوں سے کائنات کی صحراؤں میں چل رہا ہے۔ اس کی تقدیر صرف وقت اور حالات کا نتیجہ نہیں، بلکہ عمل، اخلاق، اتحاد، اور روحانی بصیرت کا امتزاج ہے۔ تاریخ کے صفحات ہمیں بار بار یہ سبق دیتے ہیں کہ امت کی بقاء اور تقدیر اس کے اخلاق، اتحاد اور عمل سے جڑی ہوئی ہے۔

تاریخی امتحانات — سبق عبرت

1- بدر کی فتح — تقدیر اور عمل کا امتزاج

بدر کی فتح — تقدیر اور عمل کی ساعت

بدر صرف ایک لڑائی نہیں،

بدر کی لڑائی محض فوجی مقابلہ نہیں تھا،

بلکہ ایک روحانی اور عملی امتحان تھا۔

یہ تقدیر اور عمل کی ساعت تھی۔

جب مسلمان 313 کے تھے اور کفار ہزاروں، لیکن عمل اور ارادہ ان کی ہمت کا مظہر تھا۔

تقدیر نے فتح کی راہ دکھائی، لیکن انسان کی نیت، عمل اور ہمت نے فتح کو ممکن بنایا

قرآن کہتا ہے:

﴿وَلَقَدْ نَصَرْنَا مُوسَىٰ إِذْ هَارَىٰ وَطَرَٰثَٰلَ﴾

”اور تم نے انہیں اللہ کے فضل سے شکست دی۔“

یہ آیت بتاتی ہے کہ تقدیر انسان کی کوشش اور عمل کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ تقدیر فتح دیتی ہے، مگر انسان کی جدوجہد کے بغیر۔

2- احد اور داخلی آزمائشیں

احد کی لڑائی ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ امت کی تقدیر محض بیرونی دشمنوں سے نہیں، بلکہ داخلی اختلافات، کمزوری، تفرقہ، اندرونی انتشار، فکری کمزوری، امت کی بیداری اور اخلاقی قوت کی کمی اور بے عملی بھی غفلت بھی فیصلہ کن ہوتی ہے۔ امت کی بیداری اور اخلاقی قوت کی کمی، ان تمام عوامل نے مل کر مسلمانوں کو نقصان پہنچایا۔ تاریخ کے آئینے میں یہ ایک واضح سبق ہے کہ امت کے اندر اتحاد اور اخلاقی بصیرت ضروری ہے۔ یہ سبق آج بھی قابلِ غور ہے: امت کی قوتیں اگر متحدہ نہ ہوں تو تقدیر کے چرخ کو بدلنا مشکل ہو جاتا ہے۔

3- خلافت کے ادوار — عروج و زوال

خلفائے راشدین: عدل، شجاعت اور حکمت کی مثال
اموی و عباسی دور: علمی، تمدنی اور اقتصادی بلندی
تمدنی ترقی کے ساتھ اخلاقی اور عملی ذمہ داری
امت کے اخلاق اور عمل کا جلالی مظہر
زوال کے عوامل

داخلی فساد، بزدلی، کمزوری، غیر اخلاقی حکمرانی اور غفلت کے نتیجے میں خارجی آزمائشیں، امت کی اجتماعی بیداری کی کمی، یہ تمام مثالیں واضح کرتی ہیں کہ امت کی تقدیر انفرادی عمل اور اجتماعی کردار سے جڑی ہے۔

اجتماعی تقدیر اور امت کی اخلاقی ذمہ داری

امت کی تقدیر صرف حکمرانوں کی ذمہ داری نہیں، بلکہ ہر فرد، ہر خاندان، ہر شہر کی اخلاقی و عملی حالت سے جڑی ہے۔ اتحاد اور عدل سے تقدیر روشن ہوتی ہے۔ بزدلی، ظلم اور فکری غلامی سے تقدیر کے اندھیروں میں اضافہ ہوتا ہے۔ امت کی بقاء اور روشنی اجتماعی اخلاق، عمل اور شعور کے امتزاج میں پوشیدہ ہے۔ یہی وہ اصول ہے جو امت کی زندگی میں صدیوں سے جاری ہے، اور آج بھی وہی اصول عالم اسلام کی راہوں کو روشن یا تاریک کر رہا ہے۔ یہ سبق واضح کرتا ہے کہ امت کی تقدیر عمل، اخلاق اور اجتماعی ذمہ داری سے جڑی ہے۔

فلسفیانہ بصیرت

امت کی تقدیر تاریخی آزمائشوں اور اخلاقی اصولوں سے جڑی ہے
داخلی اتحاد، عمل اور اخلاق امت کے لیے مشعل راہ ہیں
تاریخ ہمیں سکھاتی ہے کہ امت کے لیے علم، اخلاق، اور عملی جدوجہد لازمی ہیں
صوفیا فرماتے ہیں:

"جہاں عمل اور نیت ایک ہوں، وہاں تقدیر کے دروازے کھل جاتے ہیں۔"

امت کی تقدیر کاراز صرف خارجی حالات میں نہیں،
بلکہ اس کے اخلاق، اتحاد اور عمل میں چھپا ہے۔
بدر اور احد کی مثالیں، خلافت کے عروج و زوال کے مناظر ہمیں یہ سکھاتے ہیں کہ:
اخلاقی بصیرت، اجتماعی بیداری اور عملی جدوجہد ہی امت کی روشنی ہیں
ہر آزمائش میں تقدیر کی روشنی دیکھنا ممکن ہے

*** باب سوم ***

معاصر مظالم:

1- غزہ۔ خون اور خاک کا قصہ

یہ باب امت مسلمہ کے معاصر مظالم پر روشنی ڈالتا ہے، اور دکھ، درد، اور زخموں کی حقیقت کو جلالی اور خطیبانہ انداز میں بیان کرتا ہے۔ غزہ اور کشمیر۔ عصر حاضر کی آزمائشیں، مظلومیت کی انسانی تصویر اور عصر حاضر کا زندہ کر بلا ہیں، جہاں ہر بچہ، ہر عورت، اور ہر بوڑھا مظلومیت کی علامت ہے۔ بمباری، محاصرہ، انسانی حقوق کی پامالی، مودی اور نیتن یاہو کی سفاکی، عالمی خاموشی اور امت کی لاچاری، جہاں ہر ملبہ، ہر قطرہ خون، اور ہر آنسو ایک قرآنی امتحان کی صورت میں نظر آتا ہے۔ یہ مظالم صرف جغرافیائی یا سیاسی مسئلہ نہیں، بلکہ روحانی، اخلاقی اور انسانی امتحان ہیں۔ غزہ اور کشمیر صرف جغرافیائی نام نہیں، یہ امت مسلمہ کے دل کی حالت، اس کے دکھ، درد، زخم اور بے بسی کی عکاسی ہیں۔ جہاں ہر بچہ، ہر عورت، اور ہر بوڑھا مظلومیت کی علامت ہے۔ بمباری، محاصرہ، انسانی حقوق کی پامالی، نیتن یاہو کی سفاکی اور عالمی خاموشی، مظلوم کی فریاد اور امت کی لاچاری، یہ سب امت کی اجتماعی تقدیر میں ایک آزمائش ہیں۔

یہ سب امت کی تقدیر میں ایک نیا سوال پیدا کرتے ہیں:

کیا امت نے اپنا اخلاقی اور عملی فرض ادا کیا؟ قرآن کہتا ہے:

﴿وَأَعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا﴾

”اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو اور تقسیم نہ ہو جاؤ۔“

یہ آیت امت کی اجتماعی بیداری اور اتحاد کی ضرورت کو واضح کرتی ہے، جس کی کمی آج کے زمانے میں دکھ، ظلم اور بربادی کا سبب بن رہی ہے۔

قرآن فرماتا ہے:

﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾

”اور جو ہمارے لیے جدوجہد کریں گے، ہم انہیں اپنی راہوں کی رہنمائی کریں گے۔“

یہ آیت امت کی اجتماعی ذمہ داری اور مظلوم کی جدوجہد کی اہمیت واضح کرتی ہے۔

2- کشمیر۔ برف میں لٹی ہوئی چیخیں

کشمیر۔ برف میں لٹی ہوئی چیخیں، کشمیر کی وادیاں آج صرف منظر نہیں، یہ امت کے زخم، مظلوم کے آنسو اور لاپتہ افراد کی چیخیں ہیں۔ کشمیر کے ہر پہاڑ، ہر وادی، اور ہر درخت کے نیچے ایک کہانی چھپی ہے۔ بھارتی ظلم و استبداد، ہزاروں لاپتہ افراد، خون میں بھیگی زمین، ماں کے آنسو، بچوں کی چیخیں، امت کی خاموشی اور حکمرانوں کی بے عملی، دنیا کی بے حسی، یہ سب امت کی اجتماعی تقدیر پر سوالیہ نشان اور آزمائشی پہلو کی نشاندہی کرتے ہیں۔ بھارتی استبداد، ظلم اور انسانی حقوق کی پامالی، ہزاروں لاپتہ افراد، مظلوم کی فریاد اور امت کی خاموشی، یہ سب امت کی اجتماعی تقدیر کے لیے ایک سنگین سوال ہیں

تاریخ بار بار یہ سبق دیتی ہے کہ ظلم کے خلاف خاموشی امت کو ضائع کر دیتی ہے۔

3- مظلومیت اور انسانی تجربہ

غزہ اور کشمیر کی مظلومیت صرف سیاسی نہیں، یہ انسانی، روحانی، اور اخلاقی امتحان کی علامت بھی ہے۔ صبر اور ہمت مظلوم کے اندر روشنی پیدا کرتے ہیں۔ امت کی بے عملی مظلوم کی تقدیر کو مزید پیچیدہ بناتی ہے، ظلم کے سامنے بیداری اور عملی اقدام تقدیر کو بدلنے کی کنجی ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں امت کا ہر فرد اپنی ذمہ داری کا شعور پاتا ہے۔

صوفیا فرماتے ہیں:

اندھیروں میں بھی امید کی شمع جلاؤ، کیونکہ تقدیر کا جلال اندھیروں میں بھی روشنی پیدا کرتا ہے۔"

امت کی ذمہ داری اور خاموشی کا نقصان سب سے بڑا یہ ہوا ہے کہ آج کے حکمران اپنی بقا کے لیے اکثر استعمار کی غلامی قبول کر لیتے ہیں۔ امت کے حکمران اور عالمی سیاست، مغربی مفادات کے سامنے اخلاقی ضعف، اقتدار کی حفاظت کی خاطر امت کی فریاد پر خاموشی، امت کی تقدیر میں یہ داخلی عنصر بھی ایک بڑا آزمائش ہے، یہاں تقدیر صرف الہی فیصلے کا نام نہیں، بلکہ امت کے اعمال، حکمرانوں کے فیصلے اور عوام کی حالت کا مجموعہ ہے۔ امت کی بقاء اور تقدیر مظلوم کی حمایت پر منحصر ہے: ظلم کے خلاف آواز بلند کرنا، حکمرانوں اور عوام کی اخلاقی اور عملی بیداری، امت کی اجتماعی یکجہتی، خاموشی اور لاچارگی امت کی تقدیر میں تاریکی پیدا کرتی ہے اور ظلم کے مظاہر کو بڑھاتی ہے۔ ہر ظلم، ہر زخم، اور ہر آنسو ایک علامت ہے، تقدیر انسان کو توڑنے نہیں، اٹھانے کے لیے آزماتی ہے، امت کی بیداری، صبر اور عمل ہی تقدیر کی روشن کنجی ہیں، اور یہی تقدیر کی علامت اور امت کی امید ہیں۔

امت کی تقدیر تاریخی امتحانات اور اخلاقی اصولوں سے جڑی ہے، معاصر مظالم، ظلم و استبداد، اور حکمرانوں کی خاموشی امت کے لیے ایک آزمائش ہیں۔ تقدیر اور انسانی اختیار کا امتزاج امت کی بقاء اور امید کا ضامن ہے۔ صبر، توکل، اور عملی جدوجہد امت کے دل میں روشنی پیدا کرتے ہیں، امت کی اجتماعی بیداری اور اخلاقی قیادت ہی تقدیر کو روشن سمت دے سکتی ہے۔

مظلومیت صرف سیاسی یا جغرافیائی مسئلہ نہیں، بلکہ روحانی امتحان بھی ہے، امت کی بقاء اور تقدیر عمل، اخلاق، اتحاد اور روحانی قوت کے امتزاج پر منحصر ہے اور یہی اس کی فلسفیانہ اور روحانی بصیرت ہے کیونکہ صبر، توکل، امید اور اخلاقی قیادت امت کو مظلومیت کے اندھیروں سے نکال سکتی ہیں غزہ اور کشمیر امت کے لیے ایک زندہ آئینہ ہیں: مظلوم کی فریاد، ظلم اور امت کی خاموشی، تاریخی اور معاصر امتحانات کا امتزاج، امت کی اجتماعی بیداری، عملی اقدام اور روحانی قوت تقدیر کو روشن سمت دے سکتی ہے

صوفیا فرماتے ہیں:

"جہاں ظلم کی گہرائی ہو، وہاں امید کی روشنی بھی چھپی ہوتی ہے، بس اسے پہچاننے کی ضرورت ہے۔"

باب چہارم

امت کے حکمران — داخلی آزمائشیں، تاریخ کے سنگین ترین سوال

امت کی تقدیر صرف عوام کے اعمال سے نہیں، بلکہ حکمرانوں کے اخلاقی چنگی، اور اجتماعی بصیرت سے بھی وابستہ اور جڑی ہوئی ہے۔۔۔ تاریخ گواہ ہے اور بار بار یہ سبق دیتی ہے کہ امت کے زوال کے پیچھے اکثر حکمرانوں کی بزدلی، مفاد پرستی اور اخلاقی غفلت رہی ہے۔
صوفیا فرماتے ہیں:

"جو حکمران انصاف اور حلم سے محروم ہوں، ان کی قوم کے دلوں میں تاریکی چھا جاتی ہے۔"

1- تخت اور تقدیر کی جنگ

اقتدار اور اخلاق کی جنگ کا پیا ہونا،
حکمران جب صرف اپنی بقا کو مد نظر رکھیں اور اپنے مفاد کے لیے سوچیں،
امت کے درد، دکھ اور مظلوم کی فریاد پر کان نہ دھریں،
اخلاق اور عدل کی قدر نہ کریں
اقتدار کی حفاظت کے لیے ظلم کے سامنے نرم مزاجی اختیار کریں
تو تقدیر بھی انہیں آزماتی ہے، اور امت کی تقدیر مظلوم کی حالت میں پھنس جاتی ہے۔
خلفائے راشدین کی مثال: عدل اور حکمت کے ساتھ اقتدار
موجودہ حکمران: سیاسی مفادات اور خارجی دباؤ کے سامنے نرم مزاجی
یہ واضح کرتا ہے کہ حکمران کے اخلاق اور ارادہ امت کی تقدیر کے فیصلے میں مرکزی کردار ادا کرتے ہیں۔

2- خوف، مفاد اور بزدلی کا سیاسی فلسفہ

بعض حکمران خارجی دباؤ اور اپنے خوف اور مفاد کے سبب ظلم کے سامنے خاموش رہتے ہیں:
فلسطین اور کشمیر کے مظالم پر عالمی دباؤ کے باوجود خاموشی
اقتدار کی بقا کے لیے امت کی بیداری کو دبانا
مذہبی و اخلاقی اصولوں کو پس پشت ڈالنا
یہ سب امت کی تقدیر پر منفی اثر ڈال رہے ہیں۔
امت کی اجتماعی تقدیر متاثر ہوتی ہے کیونکہ امت کی بقاء اور روشنی حکمرانوں کی اخلاقی اور عملی بصیرت سے جڑی ہے۔

3- امت کی اخلاقی اور سیاسی ذمہ داری

امت کی تقدیر صرف حکمرانوں کی ذمہ داری نہیں، بلکہ عوام، دانشوروں اور علماء کی اجتماعی بصیرت بھی لازمی ہے۔ امت کی بیداری، علمی اور فکری قیادت، اخلاقی اصولوں پر عمل، اسلامی سیاسی اخلاقیات کا کھویا ہوا خزانہ، یہ تمام عوامل امت کی تقدیر کو روشن سمت دیتے ہیں۔

اسلام نے حکمران کے لیے، حلم، شجاعت، انصاف، عدل اور غیرت کو لازمی قرار دیا:

حلم ابو بکر، شجاعت عمر، انصاف عثمانؓ، عدل علیؓ، اور غیرت حسینؓ، امت مسلمہ کی اعلیٰ مثالیں ہیں۔ امت کے حکمران جب ان اصولوں سے منحرف ہوتے ہیں، تقدیر انہیں آزماتی ہے۔ امت کی تقدیر حکمرانوں کے اخلاق اور عمل سے جڑی ہے۔ یہ سبق آج کے حکمرانوں کے لیے قابل غور بھی ہے اور راہنمائی بھی ہے۔ انصاف، حلم، اور شجاعت امت کے لیے روشنی پیدا کرتے ہیں، اور بزدلی، ظلم اور غیر اخلاقی حکمرانی تاریکی کی طرف لے جاتی

ہے۔

باب پنجم

معاصر دنیا میں امت سیاسی و اقتصادی بحران

امت مسلمہ آج نہ صرف سیاسی بلکہ اقتصادی اور فکری بحران کا شکار ہے بلکہ داخلی کمزوری، حکمرانوں کی غلامی، اور بیرونی دباؤ کے امتزاج سے پیدا ہونے والا یہ بحران ناقابل یقین حد تک بڑھ چکا ہے۔

1- امت مسلمہ معاشی غلامی اور بین الاقوامی دباؤ کا شکار ہے:

آئی ایم ایف، ایف اے ٹی ایف جیسے عالمی مالیاتی اداروں نے اپنا شکنجہ کس رکھا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کی سیاسی و اقتصادی مداخلت امت کی آزادی و خود مختاری پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ اور یہ سب امت کی تقدیر کو متاثر کر رہے ہیں اور مظلومیت کے زخم گہرے کر رہے ہیں۔

2- مغربی مفادات اور داخلی کمزوری

حکمرانوں کی خارجی دباؤ کے سامنے غلامی امت کے اندر فکری و عملی ضعف اتحاد اور مشترکہ مقصد کی کمی امت کی سیاسی و اخلاقی کمزوری امت کی اجتماعی بیداری میں کمی یہ امت کی تقدیر میں داخلی و خارجی آزمائشیں پیدا کرتے ہیں۔

3- ظلم، مظلومیت اور امت کی بقاء

غزہ، کشمیر، میانمار اور دیگر مظلوم علاقوں کے حالات امت کے لیے امتحان اور کڑی آزمائش ہیں: مظلوم کی فریاد امت کی خاموشی اخلاقی و عملی ذمہ داری کی کمی یہ حالات امت کی تقدیر میں ایک نئے چیلنج کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔

4- عملی و روحانی حل

امت کی بقاء کے لیے ضروری ہے کہ:

حکمران عدل، انصاف اور اخلاق کے اصول اپنائیں
 عوام بیدار، متحرک اور علم و شعور سے مزین ہوں
 امت میں اتحاد، تعاون اور مشترکہ مقصد کی فضا قائم ہو
 مظلوم کی حمایت اور ظلم کے خلاف عملی اقدامات ہوں
 صبر، توکل اور عمل امت کی تقدیر کی روشنی ہیں اخلاقی قیادت برقرار رہے
 یہ چار ستون امت کی اجتماعی تقدیر کو روشن سمت دیتے ہیں اور ظلم و ستم کے مظاہر کا مقابلہ ممکن بناتے ہیں۔

امت کی تقدیر داخلی کے امتزاج سے بنتی اور خارجی عوامل سے جڑی ہوئی ہے
 معاصر سیاسی و اقتصادی بحران امت کی بیداری اور عملی اقدام کا امتحان ہیں
 عملی و روحانی حل امت کی بقاء اور تقدیر کی اصلاح کے لیے لازمی ہیں
 صبر، توکل، اخلاقی قیادت، عمل وہ روحانی ستون ہیں جو اجتماعی بیداری امت کی تقدیر میں روشنی لاتی ہیں۔

گویا باب چہارم و پانچویں کا خلاصہ یہ ہے کہ:
 امت کی تقدیر حکمرانوں کے اخلاق اور عمل سے جڑی ہے
 معاصر سیاسی و اقتصادی بحران امت کی بیداری کا امتحان ہیں
 ظلم و مظلومیت، داخلی ضعف اور خارجی دباؤ امت کے لیے نئے چیلنج پیدا کر رہے ہیں

باب ششم

امت کی اجتماعی ذمہ داری اور عملی حل

امت کی بقاء اور تقدیر کی اصلاح صرف نظریہ یادعاسے نہیں، بلکہ عملی اقدامات، اخلاقی قیادت اور اجتماعی بیداری سے ممکن ہے۔

**امت کی اجتماعی ذمہ داری اور عملی حل

امت کی بقاء اور تقدیر کی اصلاح اب صرف نظریہ یادعاسے نہیں، بلکہ عملی اقدامات، اخلاقی قیادت اور اجتماعی بیداری سے ممکن ہے۔

صوفیا فرماتے ہیں:

"جہاں ظلم کی گہرائی ہو، وہاں امید کی روشنی بھی چھپی ہوتی ہے، بس اسے پہچاننے کی ضرورت ہے۔"

1- امت کے ہر فرد کی ذمہ داری ہے:

ظلم کے خلاف آواز بلند کرنا، مظلوم کے ساتھ اخلاقی اور عملی یکجہتی، علم، شعور اور فکر کو مضبوط کرنا، حکمرانوں پر عدل و انصاف کے تقاضے مسلط کرنا، یہ سب امت کی تقدیر میں مثبت تبدیلی کا ذریعہ ہیں۔

2- عملی و سیاسی اقدامات

عالمی سطح پر مظلومین کے لیے انسانی حقوق کی آواز بلند کرنا
سیاسی و سفارتی ذرائع استعمال کرنا
امت میں اتحاد، تعاون اور مشترکہ مقصد پیدا کرنا
نوجوانوں کو علمی، اخلاقی اور عملی تربیت دینا
یہ اقدامات امت کی تقدیر کو روشن سمت دے سکتے ہیں اور ظلم کے مظاہر کو کم کر سکتے ہیں۔

3- روحانی اور اخلاقی حل

صبر، توکل، امید اور دعا امت کے دل میں روشنی پیدا کرتے ہیں
اخلاقی قیادت امت کی روح میں طاقت پیدا کرتی ہے
اجتماعی بیداری امت کی تقدیر کی روشنی بناتی ہے

صوفیا فرماتے ہیں:

اندھیروں میں بھی روشنی کی تلاش کرو،"

"کیونکہ تقدیر کی حقیقت صرف دل کی آنکھ سے نظر آتی ہے۔"

4- امت کی بقاء اور مستقبل کی راہ

امت کی بقاء اس وقت ممکن ہے جب:
 حکمران عدل و انصاف کے اصول اپنائیں
 عوام بیدار، شعور مند اور فعال ہوں
 امت میں اتحاد اور مشترکہ مقصد قائم ہو
 مظلوم کی مدد اور ظلم کے خلاف عملی اقدامات ہوں
 صبر، توکل اور اخلاقی قیادت برقرار رہے

یہ پانچ ستون امت کی تقدیر میں روشنی اور امید پیدا کرتے ہیں، اور ظلم، مظلومیت اور تاریخی آزمائشوں کے باوجود امت کو مضبوط بناتے ہیں۔

اس باب کا خلاصہ یہ ہے کہ امت مسلمہ کی تقدیر ہمیشہ آزمائشوں اور امتحانات سے بھری رہی ہے، غرہ اور کشمیر امت کی مظلومیت، بے بسی اور آزمائش کی علامت ہیں، مظلومیت، ظلم اور حکمرانوں کی خاموشی امت کی تقدیر کے اہم امتحانات ہیں۔ امت کی بقاء اور تقدیر کی اصلاح کے لیے عملی، اخلاقی، سیاسی اور روحانی اقدامات لازمی ہیں، صبر، توکل، امید، اخلاقی قیادت اور اجتماعی بیداری امت کی تقدیر میں روشنی پیدا کرتے ہیں لیکن قرآن، حدیث، اور صوفیائی تعلیمات ہمیں یہ سبق دیتی ہیں کہ تقدیر انسان کو توڑنے کے لیے نہیں، بلکہ اسے اٹھانے، بیدار کرنے اور روشنی دکھانے کے لیے ہے۔ امت کی اجتماعی بیداری، اخلاقی قیادت، عملی جدوجہد، اور روحانی قوت اسے ہر ظلم اور آزمائش سے نکال سکتی ہے

صوفیا فرماتے ہیں:

"جہاں عمل اور نیت ایک ہوں، وہاں تقدیر کے دروازے کھل جاتے ہیں۔"

باب ہفتم

امت مسلمہ کی اجتماعی تقدیر: فلسفہ اور سبق

امت مسلمہ کی تقدیر صرف حادثات یا تاریخی واقعات کا مجموعہ نہیں، یہ عمل، اخلاق، حکمرانی، اتحاد اور روحانی بصیرت کا امتزاج ہے۔ تاریخ کے صفحات بار بار یہ درس دیتے ہیں کہ امت کی بقاء اور ترقی اعلیٰ اخلاق، عملی جدوجہد اور اجتماعی شعور سے جڑی ہے۔ صوفیا فرماتے ہیں:

"تقدیر انسان کو توڑنے کے لیے نہیں، بلکہ اسے اٹھانے اور بیدار کرنے کے لیے آزماتی ہے۔"

1- اجتماعی تقدیر کا فلسفہ

تقدیر ایک جبر نہیں، بلکہ عمل اور نیت کا عکس ہے، امت کی اجتماعی تقدیر ہر فرد کے اخلاقی و عملی اعمال سے جڑی ہے۔ ظلم، فکری غلامی اور داخلی کمزوری تقدیر کے اندھیروں میں اضافہ کرتے ہیں۔ تقدیر صرف فرد کی زندگی کا مسئلہ نہیں، یہ امت، قوم اور تہذیب کے لیے بھی ایک رہنما اصول ہے۔ امت کی تقدیر میں ہر فرد کا عمل شامل ہے۔ اجتماعی بیداری اور اتحاد امت کی روشنی ہیں۔ ظلم، فکری غلامی اور اخلاقی کمی تقدیر کے اندھیروں میں اضافہ کرتے ہیں۔ یہ فلسفہ ہمیں سکھاتا ہے کہ امت کی تقدیر کو بدلنے کی طاقت ہماری اجتماعی کوشش اور اخلاقی شعور میں چھپی ہے۔ قرآن فرماتا ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ﴾

"بیشک اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ اپنی حالت خود نہ بدلے۔"

یہ آیت امت کی تقدیر میں انفرادی اور اجتماعی ذمہ داری کی اہمیت کو واضح کرتی ہے۔

2- تاریخ کے آئینے میں سبق

تاریخ امت کو یہ سکھاتی ہے کہ:

داخلی اتحاد اور عدل سے تقدیر روشن ہوتی ہے، بزدلی، فساد اور غیر اخلاقی حکمرانی زوال کا سبب بنتی ہے۔ مظلوم کی حمایت اور عملی جدوجہد تقدیر کو مثبت سمت دیتی ہے۔ یہ سبق آج کے دور میں بھی امت کے لیے مشعل راہ ہے۔

3- روحانی و اخلاقی بنیادیں

صبر، توکل، اور اخلاقی قیادت امت کی روح میں روشنی پیدا کرتی ہے

امت کی اخلاقی بیداری امت کی اجتماعی تقدیر کی بنیاد ہے

مظلوم کی حمایت اور ظلم کے خلاف عملی اقدام روحانی اور اخلاقی دونوں سطح پر اہم ہیں

صوفیا فرماتے ہیں:

"جہاں عمل اور نیت ایک ہوں، وہاں تقدیر کے دروازے کھل جاتے ہیں۔"

اختتامی باب—

امید، روشنی اور مستقبل کی رہنمائی

امت کی تقدیر کو روشن کرنے کے لیے عمل، علم، اتحاد اور روحانیت کے پانچ ستون ہیں۔
یہ ستون امت کو مظلومیت، ظلم اور تاریخی آزمائشوں کے اندھیروں سے نکالنے کی کنجی ہیں۔

1- عملی اقدام

مظلوم کی حمایت

ظلم کے خلاف آواز بلند کرنا

حکمرانوں پر عدل و انصاف کے تقاضے

عالمی سطح پر انسانی حقوق کی پاسداری

یہ عملی اقدامات امت کی تقدیر میں روشنی پیدا کرتے ہیں

2- اخلاقی قیادت

حکمران عدل، شجاعت اور حلم اپنائیں

علماء اور دانشور امت کو شعور و عمل کی رہنمائی دیں

نوجوان اخلاقی اور عملی تربیت حاصل کریں

اخلاقی قیادت امت کو بیدار اور متحد رکھتی ہے۔

3- علمی اور فکری بیداری

امت کو علم، شعور اور فکری تربیت دی جائے

تعلیمی ادارے، مدارس اور یونیورسٹیاں امت کی فکری قیادت کو مضبوط کریں

علمی بصیرت امت کی تقدیر میں روشنی کا سرچشمہ ہے

4- اتحاد اور اجتماعی عمل

امت میں فرقہ وارانہ، لسانی اور جغرافیائی اختلافات کے باوجود اتحاد قائم ہو

مشترکہ مقصد: ظلم کے خلاف جدوجہد اور امت کی بقاء

اجتماعی عمل امت کی تقدیر بدلنے کی سب سے بڑی طاقت ہے

5- روحانی قوت

صبر، توکل، دعا اور امید امت کو مظلومیت اور آزمائش کے اندھیروں میں مضبوط رکھتے ہیں
روحانی قوت امت کی تقدیر کو مثبت سمت دیتی ہے اور ظلم کے مظاہر کا مقابلہ ممکن بناتی ہے۔

اختتامی کلمات — امید اور روشنی کا پیغام

امت مسلمہ کی تقدیر ہمیشہ آزمائشوں اور امتحانات سے بھری رہی ہے، لیکن قرآن، حدیث، اور صوفیا کی تعلیمات ہمیں یہ سبق دیتی ہیں کہ تقدیر انسان کو توڑنے کے لیے نہیں، بلکہ اسے اٹھانے، بیدار کرنے اور روشنی دکھانے کے لیے ہے۔ امت کی اجتماعی بیداری، اخلاقی قیادت، عملی جدوجہد، اور روحانی قوت اسے ہر ظلم اور آزمائش سے نکال سکتی ہے

صوفیا فرماتے ہیں:

"اندھیروں میں روشنی تلاش کرو، اور ہر زخم میں حکمت دیکھو، کیونکہ تقدیر کی حقیقت دل کی آنکھ سے نظر آتی ہے۔"

ہر تاریکی کے بعد روشنی، ہر دکھ کے بعد سکون، اور ہر آزمائش کے بعد کامیابی موجود ہے۔

یہ اختتامی باب امت کے لیے ایک جلالی، فکری اور عملی رہنما ہے، جو مظلومیت، ظلم اور تاریخی آزمائشوں کے باوجود امید، روشنی اور قوت کی علامت ہے۔

کتاب کا مکمل فکری خاکہ و خلاصہ

باب اول — تقدیر: فلسفہ، عمل اور روحانی بصیرت

تقدیر، ایک روحانی زبان ہے جو دل کی گہرائیوں میں چھپی ہے۔ یہ انسان کے اعمال اور نیت کا عکس ہے، اور امت کی اجتماعی تقدیر بھی اسی میں چھپی ہے۔
کلیدی نکات:

تقدیر اور اختیار کا توازن

دل و دماغ کی زبان

امتحان، صبر اور توکل

انفرادی و اجتماعی تعلق

قرآنی تعلیم:

(وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ)

”اور اللہ نے تمہیں پیدا کیا اور تمہارے اعمال کو بھی جانتا ہے۔“

اختتامی نوٹ:

تقدیر انسان کو توڑنے کے لیے نہیں، بلکہ عمل، نیت اور بیداری کے لیے آزماتی ہے۔

مرکزی نکات:

تقدیر اور اختیار کا توازن

انسان کا اختیار اور اللہ کا علم ازل

جبر اور قدر یہ کے درمیان اسلام کا روشن راستہ

صوفیانہ و فلسفیانہ پہلو

تقدیر دل کی نبض، روح کی زبان

دل و دماغ میں تقدیر کی علامتی تشریحات

امتحان اور صبر

تقدیر انسان کے لیے امتحان بھی ہے، نعت بھی

صبر، توکل، اور عملی کوشش تقدیر کے عملی مظاہر

انفرادی و اجتماعی تعلق

انسان کے اعمال اور امت کی اجتماعی تقدیر کا رشتہ

امت کے اخلاق، اتحاد اور عمل کا اثر

فلسفیانہ بصیرت:

تقدیر انسان کو مایوسی کے لیے نہیں،
بلکہ بیداری، ہمت، اور عمل کے لیے آزماتی ہے۔
ہر فرد کے عمل میں تقدیر کی روشنی اور گہرائی موجود ہے۔

باب دوم — امت مسلمہ: تاریخی امتحانات

امت کی تاریخ ہمیں سکھاتی ہے کہ عروج اور زوال کے پیچھے اخلاق، اتحاد اور عملی بصیرت ہیں۔
اہم تاریخی مناظر:

بدر کی فتح: عمل، نیت اور تقدیر کا امتزاج
احد: داخلی اختلافات اور اخلاقی کمزوری
خلافت کے ادوار: عروج، زوال اور اخلاقی اصول
قرآنی تعلیم:
(وَلَقَدْ نَصَرْتُكُمْ هُمْ بِاللَّهِ)
”اور تم نے انہیں اللہ کے فضل سے شکست دی۔“

اختتامی نوٹ:

تاریخ امت کو یہ درس دیتی ہے کہ علم، اخلاق، اتحاد اور عملی جدوجہد تقدیر کو روشن کرتے ہیں۔

مرکزی نکات:

بدر، احد اور خلافت کے ادوار
تاریخی عروج و زوال، داخلی آزمائشیں
امت کی اجتماعی بیداری اور اخلاقی قوت کا اثر
اجتماعی تقدیر اور اتحاد
داخلی اختلافات امت کی تقدیر میں رکاوٹ
اخلاقی و عملی ذمہ داری کی اہمیت

فلسفیانہ بصیرت:

امت کی تقدیر تاریخ کے آئینے میں واضح ہے:
جو اتحاد، عدل اور شعور پر عمل کرے، وہ روشن تقدیر پاسکتا ہے۔

باب سوم — معاصر مظالم: غزہ و کشمیر

غزہ اور کشمیر صرف خطوں کے نام نہیں، بلکہ امت کے زخم اور مظلومیت کی علامت ہیں۔

اہم نکات:

غزہ: عصر حاضر کا کربلا، بمباری، محاصرہ، عالمی خاموشی

کشمیر: برف میں لٹی ہوئی چیخیں، بھارتی ظلم، لاپتہ افراد

مظلومیت: صبر، ہمت، اور امت کی بیداری

امت کی ذمہ داری: ظلم کے خلاف عملی اقدامات

قرآنی تعلیم:

(وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا)

”جو ہمارے لیے جدوجہد کریں گے، ہم انہیں اپنی راہوں کی رہنمائی کریں گے۔“

اختتامی نوٹ:

امت کی بقاء اور تقدیر مظلوم کی حمایت، اخلاقی قیادت اور عملی بیداری پر منحصر ہے۔

مرکزی نکات:

غزہ کا انسانی المیہ

بمباری، محاصرہ، مظلوم کی فریاد

عالمی خاموشی اور امت کی لاچارگی

کشمیر کی برف میں لٹی چیخیں

بھارتی ظلم، لاپتہ افراد، مظلوم کے آنسو

امت کی اجتماعی ذمہ داری کی عدم موجودگی

ظلم اور امت کی بیداری

امت کا اخلاقی اور عملی کردار تقدیر میں اثر انداز

مظلوم کی حمایت اور اتحاد امت کی تقدیر روشن کرتے ہیں

فلسفیانہ بصیرت:

مظالم صرف سیاسی یا جغرافیائی نہیں،

بلکہ روحانی، اخلاقی اور انسانی امتحان ہیں۔

باب چہارم — حکمران اور داخلی آزمائشیں

امت کی تقدیر حکمرانوں کے اخلاق اور فیصلوں سے جڑی ہے۔

اہم نکات:

اقتدار اور اخلاق کی جنگ

خوف، مفاد اور بزدلی

اسلامی سیاسی اخلاقیات: عدل، حلم اور شجاعت

اختتامی نوٹ:

انصاف، حلم اور شجاعت امت کے لیے روشنی پیدا کرتے ہیں، اور بزدلی تاریکی کی طرف لے جاتی ہے۔

مرکزی نکات:

اقتدار اور اخلاق

حکمران کے اخلاق، عدل، اور حلم امت کی تقدیر میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں

خوف، مفاد اور بزدلی

حکمران کی بزدلی اور عالمی دباؤ کے سامنے نرم مزاجی

امت کی تقدیر میں داخلی کمزوری کا اثر

اسلامی سیاسی اصول

عدل، انصاف، شجاعت اور حلم کی اہمیت

اخلاقی قیادت امت کے لیے روشنی

فلسفیانہ بصیرت:

امت کی تقدیر حکمرانوں کی اخلاقی و عملی بصیرت سے جڑی ہے۔

باب پنجم — سیاسی و اقتصادی بحران

امت معاصر سیاسی و اقتصادی دباؤ کا شکار ہے۔

اہم نکات:

معاشی غلامی، بین الاقوامی دباؤ

داخلی کمزوری، حکمرانوں کی غلامی

مظلومیت اور امت کی بیداری

حل:

عملی اقدامات، اتحاد، مظلوم کی حمایت

صبر، توکل، اخلاقی قیادت

علمی و فکری تربیت

اختتامی نوٹ:

عملی، اخلاقی اور روحانی ستون امت کی تقدیر میں روشنی پیدا کرتے ہیں۔

مرکزی نکات:

معاشی غلامی اور بین الاقوامی دباؤ

IMF، FATF اور عالمی مفادات

امت کی آزادی و خود مختاری پر اثر

داخلی کمزوری اور اتحاد کی کمی

امت کے اندر فکری اور عملی ضعف

اجتماعی بیداری کی ضرورت

عملی و روحانی حل

مظلوم کی حمایت، اتحاد، علم، اخلاق

صبر، توکل، امید، عملی اقدامات

فلسفیانہ بصیرت:

امت کی تقدیر داخلی اور خارجی عوامل کے امتزاج سے بنتی ہے۔

باب ششم — مظلومیت کی انسانی تصویر

غزہ اور کشمیر ایک زندہ آئینہ ہیں، جہاں مظلومیت، صبر، ہمت اور امت کی ذمہ داری واضح ہے۔

اہم نکات:

انسانی اور روحانی امتحان

امت کی خاموشی اور عملی اقدامات

مظلومیت اور تقدیر کا تعلق

اختتامی نوٹ:

امت کی اجتماعی بیداری، عملی اقدام اور روحانی قوت تقدیر کو روشن سمت دے سکتی ہے۔

مرکزی نکات:

غزہ اور کشمیر کا المیہ

مظلوم کی فریاد، خون اور زخم

امت کی لاچاری اور عالمی خاموشی

مظلومیت اور انسانی تجربہ

صبر، ہمت، اور جدوجہد کے آثار

امت کی اجتماعی ذمہ داری کی ضرورت

فلسفیانہ بصیرت:

مظلومیت انسانی، اخلاقی اور روحانی امتحان ہے۔

باپ ہفتم — امت کی اجتماعی ذمہ داری

امت کی بقاء نظریہ یا دعا سے نہیں، بلکہ عملی، اخلاقی اور روحانی اقدامات سے ممکن ہے۔

اہم نکات:

امت کی ذمہ داری

عملی و سیاسی اقدامات

روحانی و اخلاقی حل

امت کی بقاء اور مستقبل

اختتامی نوٹ:

امت کے ہر فرد کی بیداری، عملی جدوجہد اور اخلاقی قیادت تقدیر میں روشنی پیدا کرتی ہے۔

مرکزی نکات:

اجتماعی بیداری اور عملی اقدامات

ظلم کے خلاف آواز بلند کرنا

حکمرانوں پر عدل و انصاف کے تقاضے

اخلاقی قیادت اور علمی تربیت

امت میں اتحاد، مشترکہ مقصد، اور نوجوانوں کی تربیت

روحانی قوت اور امید

صبر، توکل، دعا اور روحانی طاقت

فلسفیانہ بصیرت:

امت کی بقاء اور تقدیر کا تعلق عملی، اخلاقی اور روحانی ستونوں سے ہے۔

امت کی تقدیر روشن کرنے کے پانچ ستون:

عملی اقدام

اخلاقی قیادت

علمی و فکری بیداری

اتحاد اور اجتماعی عمل

روحانی قوت

قرآنی تعلیم:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ﴾

”بیشک اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ اپنی حالت خود نہ بدلے۔“

مرکزی نکات:

اجتماعی تقدیر کا فلسفیانہ خلاصہ

امت کی تقدیر اخلاق، اتحاد، عمل اور روحانیت سے جڑی ہے

امید و روشنی

مظلوم کی جدوجہد، امت کی عملی بیداری

تقدیر اندھیروں میں بھی روشنی پیدا کرتی ہے

مستقبل کے لیے عملی اور روحانی رہنمائی

پنج ستون: عملی اقدام، اخلاقی قیادت، علمی و فکری بیداری، اتحاد، روحانی قوت

امت کی اجتماعی بیداری اور عملی اقدامات تقدیر کو روشن سمت دیتے ہیں

فلسفیانہ بصیرت:

تقدیر انسان کو مایوسی کے لیے نہیں،

بلکہ عمل، بیداری، اور امید کے لیے آزماتی ہے

امت کی بقاء اور روشنی ظلم، مظلومیت اور تاریخی آزمائشوں کے باوجود ممکن ہے

اختتامی پیغام

امت کی بقاء عملی، اخلاقی اور روحانی اقدامات پر منحصر ہے

مظلوم کی حمایت اور ظلم کے خلاف عملی اقدامات ضروری ہیں

اجتماعی بیداری، اتحاد اور مشترکہ مقصد امت کی تقدیر کو بدل سکتے ہیں

صبر، توکل، امید، اور روحانی قوت ہر آزمائش میں روشنی پیدا کرتی ہیں

تقدیر انسان کو توڑنے کے لیے نہیں، بلکہ بیداری، عمل اور امید کی رہنمائی کے لیے ہے

امت کی تقدیر ہمیشہ آزمائشوں سے بھری رہی ہے، لیکن اجتماعی بیداری، اخلاقی قیادت، عملی جدوجہد اور روحانی قوت اسے ہر ظلم اور آزمائش سے نکال سکتی ہے۔

صوفیا فرماتے ہیں:

"اندھیروں میں روشنی تلاش کرو، اور ہر زخم میں حکمت دیکھو، کیونکہ تقدیر کی حقیقت دل کی آنکھ سے نظر آتی ہے۔"

تاریخ کی نظر: ڈریگن اور عقاب کا مکالمہ

یہ مضمون تاریخ کے ایک ایسے لمحے کا تذکرہ کرتا ہے جہاں دو عظیم تہذیبیں — مشرق اور مغرب — ایک دوسرے سے آمنے سامنے تھیں۔ طاقت کی گرج پس منظر میں گر گئی، صبر، حکمت، اور تہذیب کے وزن نے دنیا کے محور کو نئی شکل دی۔ یہاں تاریخ محض گواہ نہیں ہے، یہ راوی بن جاتا ہے، اور ہر خاموش لمحہ گہرے مقصد کے ساتھ بولتا ہے۔ یہ وہ دور ہے جہاں سلطنتیں بارود سے نہیں بلکہ تدبیر اور صبر سے بنتی ہیں اور جہاں وقت کے دھارے تاریخ کا حتمی فیصلہ بنتے ہیں۔

یہ مضمون اس لمحے کو بھی اپنی گرفت میں لے رہا ہے جب دو عظیم تہذیبیں — مشرقی صبر اور مغربی رفتار — ایک دوسرے کا سامنا کر رہے تھے، اور خاموشی نے تاریخ کے دھارے کو نئی شکل دی۔ جب سلطنتوں کے عروج و زوال کی کہانی تلوار سے نہیں بلکہ حکمت عملی سے لکھی گئی تو کیسے سلطنتیں برداشت اور زوال صرف طاقت سے نہیں بلکہ تدبیر، صبر اور دوراندیشی سے ہوتی ہیں جبکہ تاریخ خاموشی سے نتائج کا فیصلہ کرتی ہے۔ یہ ٹکڑاؤ اس لمحے کی گواہی دیتا ہے جب دو عالمی طاقتیں — چین اور ریاستہائے متحدہ — ایک دوسرے سے ملے، ڈریگن اور ایگل، نہ صرف سیاست یا طاقت میں، بلکہ تہذیبوں، فلسفوں اور وقت کی پیمائش کے مکالمے میں ایک دوسرے کے مد مقابل آن پہنچے۔

تاریخ کے سینے میں کبھی کبھار ایسے لمحے جنم لیتے ہیں جو محض سیاسی ملاقاتیں نہیں رہتیں بلکہ تہذیبوں کے چھپے ہوئے ورق کھول دیتی ہیں۔ ایسے لمحے شاذ و نادر ہی ثابت ہوتے ہیں جو محض دوریاستوں کی کشمکش نہ ہوں بلکہ دو تہذیبوں کے باطنی مکالمے کی صورت اختیار کر لیں۔ یہ وہ لمحے ہوتے ہیں جو وقت کی رفتار کا دھارہ بدل دیتے ہیں، جہاں طاقت اپنی صورت بدلتی ہے، اور تہذیب اپنے معنی۔ زمانہ جیسے اپنے پرانے پیمانے توڑ کر نئے ترازو وضع کرتا ہے؛ وہ ترازو جن پر کبھی خون تولے جاتے تھے، آج شعور، حکمت اور اقتصادی بردباری کا وزن رکھا جاتا ہے۔ یہ وہی لمحے ہیں جنہوں نے کبھی سکندر کو لنگا کے کنارے سوچ میں ڈال دیا تھا، جنہوں نے رومی سفیروں کو چین کی شاہراہ ریشم کے درباروں میں خاموش کر دیا تھا، اور جنہوں نے منگول گھوڑوں کی دھڑکنوں کو بھی حکمت کے سامنے جھکا دیا تھا۔ اسی طرح آج چین اور امریکا کی باہمی کشمکش بھی دوریاستوں کا نہیں بلکہ دوزمانوں، دو فلسفوں اور دو تاریخی دھاروں کا مکالمہ بن چکی ہے۔ ایک طرف وہ تہذیب جو رفتار میں دنیا کو پیچھے چھوڑنا چاہتی ہے، اور دوسری طرف وہ جو صبر و حکمت سے وقت کو اپنے تابع کرتی آئی ہے۔

ایسا ہی ایک لمحہ اُس وقت تاریخ کے افق پر نمودار ہوا جب دو متضاد دنیاکیں — رفتار کی امریکن دنیا اور صبر کی چینی دنیا — ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوئیں۔ یہ ملاقات محض ایک سیاسی واقعہ نہیں تھی، بلکہ تاریخ کا وہ آئینہ تھا جس میں مستقبل کی بناوٹ جھلکنے لگی۔

امریکا کی کم عمر مگر بے پناہ طاقت کے مقابل چین کی وہ تہذیب کھڑی ہے جسے نہ صرف پانچ ہزار برس کا شعور میسر ہے بلکہ ہان درباروں کی پختگی، سن تزو کی جنگی بصیرت، اور کنفیوشس کی اخلاقی حکمت بھی ورثے میں ملی ہے۔ یہ تصادم سرد جنگ کے کسی دھماکے جیسا نہیں؛ یہ قرون وسطیٰ کی اُن ملاقاتوں جیسا ہے جب یورپ مشرق کے سامنے نظریں جھکائے سوال کرتا تھا اور مشرق جواب سکوت میں دیتا تھا۔

ٹرمپ کی گرج میں وہی لرزش تھی جو کبھی برطانوی سامراج نے 1857 میں محسوس کی تھی، یا وہ اضطراب جو روم کو اُس وقت درپیش ہوا تھا جب بازنطینی حکمت نے اُس کی سپر پوزیشن کو چیلنج کیا۔ اور جب وہی ٹرمپ تعریف اور نرمی کے پردے میں سر جھکاتا نظر آیا تو یہ منظر تاریخ کے اُن اوراق سے مشابہ ہو گیا جہاں فاتحین کی زبان بدل جاتی ہے، مگر صاحبِ حکمت کا لہجہ نہیں۔ چین کی قیادت کا سکوت، بالکل ویسا ہی تھا جیسا چو این لائی نے جینو میں دکھایا تھا یا جیسا ڈینگ شیاوینگ نے اصلاحات کے آغاز پر اختیار کیا تھا۔ ایک ایسی خاموشی جس میں مستقبل کی دھڑکن گونجتی ہے۔

دنیا کی طاقت اب گولیوں کے زور پر نہیں بلکہ اُن معدنی ذخیروں پر گردش کرتی ہے جنہیں چین صدیوں کی طرح اپنے صبر سے سنبھالے بیٹھا ہے۔ جب امریکا ٹیکنالوجی کا بادشاہ ہوتے ہوئے بھی اسی مشرقی تہذیب کے دروازے پر آکر خام مال مانگتا ہے، تو یہ منظر تاریخ کے اس پل کی یاد دلاتا ہے جب مغرب کے جہاز پہلی بار چینی بندر گاہوں میں داخل ہوئے تھے مگر حکم دینے نہیں۔ سیکھنے آئے تھے۔

یہ مضمون اسی سفر کا مکالمہ ہے۔ جس میں سیاست کردار ہے مگر تہذیب راوی۔ جہاں شور تھک کر بیٹھ جاتا ہے، اور خاموشی بتانے لگتی ہے کہ اصل طاقت وقت کی چمک میں ہے، نہ کہ لمحوں کی چمک میں۔ امریکا کی ڈھائی صدیوں پر مشتمل تیز رفتار، پُر غرور اور طاقتور روایت ایک ایسی تہذیب کے سامنے آن کھڑی ہوئی جسے پانچ ہزار برس کے تجربوں نے مٹی کی طرح گوندھا ہے، جس نے وقت کو دشمن نہیں استاد سمجھ کر قبول کیا ہے، اور جس کا فلسفہ گردشِ ایام میں نہیں بلکہ نسلوں کے تسلسل میں سانس لیتا ہے۔ یہ وہی تصادم تھا جو ہمیشہ رفتار اور گہرائی کے درمیان برپا ہوتا آیا ہے۔ ایک طرف وہ قوم جس کے بازو طاقت کے گھمنڈ سے اکڑے ہوئے تھے، دوسری طرف وہ تہذیب جس کی خاموشی میں ہزاروں برس کی دانائی پنہاں تھی۔

اس منظر میں تاریخ صرف تماشائی نہیں تھی بلکہ منصف بھی؛ وہ دیکھ رہی تھی کہ اب طاقت کی گرج کمزور پڑ رہی ہے اور حکمت کی ٹھہری ہوئی سانسیں پوری دنیا کے مزاج کو بدل رہی ہیں۔ امریکا کی بلند آہنگ دھمکیوں کے مقابل چین کی صدیوں پرانی خاموشی نے وہ حقیقت آشکار کر دی کہ طاقت کا سب سے کاری وار شور سے نہیں، سکوت سے نکلتا ہے۔ یہ مقابلہ دو اقتصادی ماڈلز کا نہیں تھا، دو سیاسی نظریات کا بھی نہیں تھا؛ یہ دو وقتوں کا ٹکراؤ تھا۔ امریکا کا تیز رفتار، بے صبر وقت، اور چین کا گہرا، وسعت پذیر وقت۔

یہی پس منظر اس مضمون کا تناظر فراہم کرتا ہے۔ یہ وہ داستان ہے جس میں سیاست کردار ہے، مگر تہذیب راوی۔ یہ وہ کہانی ہے جس میں طاقت کا مطلب بدل گیا ہے، اور جہاں مستقبل کی بنیاد گولی نہیں، حکمت ہے۔ اب سوال یہ نہیں کہ کون سپر پاور ہے؛ سوال یہ ہے کہ کون وقت کے ساتھ چلنے کی قوت رکھتا ہے۔ اور وقت ہمیشہ اُن کے ساتھ ہوتا ہے جو انتظار کرنا جانتے ہیں۔ یہ مضمون انہی تغیرات، انہی رک رک کر بدلتے زاویوں، انہی تہذیبی سانسوں اور انہی تاریخی اشاروں کا احاطہ کرتا ہے۔ جہاں چین خاموش ہے، مگر دنیا بول رہی ہے؛ اور امریکا بول رہا ہے، مگر تاریخ خاموشی سے اُس کے کندھوں پر اپنا ہاتھ رکھ چکی ہے۔

تاریخ کے افق پر کبھی کبھی ایسے لمحے ابھرتے ہیں جو محض دو انسانوں کی ملاقات نہیں ہوتے، بلکہ دو تہذیبوں کا مکالمہ بن جاتے ہیں۔ یہ لمحے وقت کی دھڑکن کو بدل دیتے ہیں، اور صدیوں کی محنت ایک پل میں نئے معانی اختیار کر لیتی ہے۔ چین اور امریکا کی حالیہ آویزش بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، ایک جانب وہ قوم جو رفتار پر فخر کرتی ہے، اور دوسری جانب وہ جو صبر سے جیتی ہے۔ ایک طرف صنعتی شور کی تہذیب، دوسری جانب سکوتِ حکمت کا تمدن۔

249 سالہ امریکی تاریخ نے جب 5 ہزار سالہ چینی شعور کو لکارا، تو یہ صرف طاقت کا امتحان نہ تھا، بلکہ فلسفہ وقت کا ٹکراؤ تھا۔ یہ وہ مقام تھا جہاں مغرب کے تاجدار نے مشرق کے دربار میں قدم رکھا، اور وقت نے اپنی پرانی عدالت میں نیا مقدمہ کھول دیا۔ دنیا نے دیکھا "عقاب نے اپنے پر سمیٹے، اور اڑدہا بغیر گرج کے اٹھا۔ تاریخ کے صفحے نے ایک بار پھر وہی منظر دہرایا: کہ طاقت کا جادو ختم ہوتا ہے، مگر تہذیب کی گونج باقی رہتی ہے۔ یہ مضمون اسی مکالمے کی داستان ہے جہاں الفاظ میں سفارت نہیں، تہذیبوں کی دھڑکن ہے؛ جہاں الفاظ میں سفارت نہیں، تہذیبوں کی دھڑکن ہے؛ جہاں خاموشی بھی بولتی ہے، اور مسکراہٹ بھی تاریخ لکھتی ہے۔

جب دو صدیوں کی کم سن تہذیب پانچ ہزار برس کی مشرقی دانائی سے آنکھیں ملانے کی جسارت کرتی ہے، تو تاریخ محض مشاہدہ نہیں کرتی، مسکراتی بھی ہے۔ یہ وہ لمحہ ہوتا ہے جب وقت کا ترازو متوازن نہیں رہتا، ایک طرف تیز رفتار مگر تھکا ہوا مغرب، دوسری جانب خاموش مگر گہرا مشرق۔ اور سوال یہ نہیں رہتا کہ کون غالب ہے؛ سوال یہ رہ جاتا ہے کہ کون باقی ہے۔

دنیا کی جدید تاریخ میں شاید ہی کبھی ایسا لمحہ آیا ہو کہ ایک کم عمر تہذیب امریکا، جو بمشکل ڈھائی صدیوں کی تاریخ رکھتا ہے، ایک ایسی قوم کے مقابل کھڑی ہو جو پانچ ہزار برس کی تہذیبی روایات کی امین ہے۔ یہ وہی تصادم ہے جو رفتار اور گہرائی کے درمیان ہوتا ہے؛ ایک طرف جدیدیت کی چمک، دوسری طرف حکمت کی جڑیں۔ یہ محض طاقت کی کشمکش نہیں بلکہ زمانوں کا مکالمہ ہے۔ مغرب کا غرور، مشرق کی صبر آزمائے فراسات کے سامنے۔ چین کی تہذیب، جو کنفیو شس کی تعلیمات، ہان دور کے نظم و ضبط، اور صدیوں کی اجتماعی عقل کا مظہر ہے، کسی عارضی معاشی بحران سے گھبراتی نہیں۔

یہ تمدن تاریخ کو وقت کے پیمانے پر نہیں بلکہ نسلوں کے تسلسل پر پرکھتا ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں امریکا کا غرور جو صنعتی انقلاب اور نوآبادیاتی ورثے سے پروان چڑھا، پہلی بار وقت کی گہرائی سے خائف ہوا۔

ٹرمپ نے ایک دن غرور کے بام پر کھڑے ہو کر اعلان کیا تھا، "میں چین کی معیشت کو تباہ کر دوں گا، یہ کبھی نہیں اٹھے گی۔ یہ وہی لہجہ تھا جس میں کبھی نوآبادیاتی حکمران بات کیا کرتے تھے۔ ایک گرج جو یقین سے زیادہ خوف کی علامت ہوتی ہے۔ تاہم یہ جملہ تاریخ کے کانوں میں ایک بازگشت کی طرح گونجا، جیسے روم نے کار تھج کے خلاف، یا برطانیہ نے متحدہ ہندوستان کے خلاف اعلان کیا تھا مگر یہ عزم دراصل خوف کی آواز تھی، کیونکہ طاقتور کبھی لکارا تا نہیں، مطمئن رہتا ہے۔ ٹرمپ کا لہجہ اُس امریکی خود اعتمادی کا آخری مظہر تھا جو دوسری عالمی جنگ کے بعد دنیا پر مسلط ہوئی مگر یہ بھی یاد رہے کہ ہر طاقت جب عروج پر پہنچتی ہے تو زوال کا بیج بھی اسی میں پھینکتا ہے۔

مگر وقت نے کروٹ لی، اور وہی شخص جو دھمکیوں کا مینار بن کر کھڑا تھا، اب نرمی کے لفظوں میں پناہ ڈھونڈ رہا تھا۔ وہی ٹرمپ، جو کل دھمکیاں دیتا تھا، آج تعریف کے لہجے میں پناہ ڈھونڈ رہا تھا۔ یہ منظر محض ایک ملاقات نہیں تھا بلکہ طاقت کی نفسیات کا عکاس تھا۔ یہ وہی کیفیت تھی جو نیپولین کو روس کے دروازے پر، یا برطانوی سامراج کو 1947 میں برصغیر سے رخصت ہوتے وقت پیش آئی تھی۔ تعریف دراصل عجز کا پہلا اظہار ہوتی ہے۔ یہ سفارت نہیں، سر تسلیم خم کرنے کی شائستہ صورت تھی۔ ٹرمپ نے مسکراتے ہوئے، ہچکچاتے ہوئے کہا "آپ عظیم ہیں، آپ ایک وٹزری ہیں۔" یہ الفاظ سفارت کے نہ تھے بلکہ سر تسلیم خم کرنے والے کی خاموش آہ تھی۔ یہ شرافت نہیں، شکست کا مہذب روپ تھا۔

شی جن پنگ کی خاموشی کسی کمزوری کی نہیں بلکہ تہذیبی بلوغت کی علامت تھی۔ چین کی قیادت نے صدیوں سے یہ سیکھا ہے کہ جو قوم صبر جانتی ہے، وہ وقت کو اپنا غلام بنالیتی ہے۔ یہ سکون وہی ہے جو چو این لائی کی مسکراہٹ میں تھاجب مغرب نے طنز کیا، یا ڈینگ شیائونگ کے قتل میں جب انہوں نے کہا "بلی کارنگ اہم نہیں، چو ہاپنگ ترقی ہے یا نہیں، یہی اصل بات ہے"۔ دوسری جانب ٹی، جیسے کسی مرقع صبر کا پیکر ہو۔ چہرے پر سکون، آنکھوں میں وقت کا اعتماد۔ اُسے کچھ کہنے، کچھ ثابت کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ تاریخ خود اُس کے لہجے میں بول رہی تھی۔

کبھی امریکا خوراک کا بادشاہ تھا، مارشل پلان سے یورپ کو سنبھالا، عالمی بینک کو قابو میں رکھا مگر اب وہی سپر طاقت کا دعویٰ کرنے والا ٹرمپ ہاتھ پھیلائے چین سے کہہ رہا تھا "ہمیں سویا بین دو تاکہ ہمارے کسان زندہ رہیں"۔ اور ٹیرف میں نرمی کی التجا کی۔ یہ وہی امریکا تھا جو کبھی دنیا کے معاشی منبر پر بادشاہت کرتا تھا، اور آج چین سے ریلیف کی درخواست کر رہا تھا۔ یہ محض تجارتی مسئلہ نہیں بلکہ تہذیبی منظر نامے کی تبدیلی تھی۔ ٹی نے محض کہا ہم دیکھیں گے کہ آپ کیسا برتاؤ کرتے ہیں۔ تاریخ کی سب سے مؤدب مگر انتہائی گہری تنبیہ تھی۔ یہ جملہ نہیں، ایک تہذیب کی برتری کا اقرار تھا۔ یہ وہ لمحہ تھا جب احمد ندیم



قاسمی کی یہ بات یاد آتی ہے:
میں تیرے کہے سے چپ ہوں لیکن
چپ بھی تو بیان مدعا ہے

یہ وہی امریکا تھا جو کبھی دنیا کے معاشی منبر پر بادشاہت کرتا تھا، اور آج چین سے ریلیف کی درخواست کر رہا تھا۔ امریکا جس نے ٹیکنالوجی کی بالادستی کو اپنی میراث سمجھا، نایاب زمینی معدنیات، جو جدید دنیا کی رگ حیات ہے یہی وہ مادے ہیں جن سے موبائل، جنگی طیارے، سیسی کنڈکٹرز، اور مصنوعی ذہانت کے آلات بنتے ہیں، آج چین سے وہی مانگ رہا تھا اور یہ سب چین کے پاس ہیں۔

تاریخ نے یہاں فیصلہ لکھ دیا طاقت اب بارود سے نہیں، مٹی سے نکلتی ہے۔ پھر وہ موڑ آیا جب طاقت کے ترازو نے فیصلہ لکھ دیا۔ ٹرمپ نے چین سے کہا "ہمیں نایاب زمینی معدنیات دو تاکہ ہم اپنے جہاز اڑا سکیں، اپنے کارخانے چلا سکیں۔ یہ اعتراف تھا کہ مغرب کی صنعت کا دل اب مشرق کی مٹی میں دھڑکتا ہے۔

یہ چار الفاظ، شاید پچھلی دو صدیوں کی مغربی سامراجی گفتگو کا سب سے مختصر جواب تھے۔ جہاں مغرب "حکم دیتا" تھا، وہاں اب مشرق "سوچنے" لگا۔ یہی لمحہ تھا جب دنیا نے محسوس کیا کہ فیصلہ اب نیویارک یا لندن میں نہیں، بیجنگ میں ہوتا ہے۔ ٹی نے سکون سے کہا، "ہم اس پر غور کریں گے"۔ یہ وہ لمحہ تھا جب دنیا نے جان لیا کہ اب فیصلہ کرنے والا کون ہے۔ طاقت نے زبان بدل لی تھی۔ گرج سے نہیں، خاموشی سے۔ مغرب نے جب بھی کسی قوم سے بات کی، پابندیوں کی زبان میں کی۔ چین نے جواب میں تعاون اور تجارت کی زبان اختیار کی۔ فریقہ، لاطینی امریکا اور ایشیائے یہ فرق محسوس کیا اور رفتہ رفتہ عالمی مرکز عقاب کے پنجوں سے نکل کر اژدھے کی گرفت میں آنے لگا۔ یہ وہی اصول ہے جو سلجوقی دانشوروں نے کہا تھا: جو ہاتھ تلوار تھامتے، وہ دل نہیں جیتتا۔

مغرب اپنی برتری کے زخم چاٹتا رہا، پابندیوں کے ہتھیار سنبھالتا رہا مگر چین نے ہاتھ بڑھایا۔ شراکت داری کے ساتھ، تجارت کے وعدے کے ساتھ۔ یورپ سننے لگا۔ افریقہ پہلے ہی قریب تھا۔ اور دنیا، بغیر جشن منائے، خاموشی سے اپنے محور بدلنے لگی۔ نیا عالمی نظام ٹوٹا نہیں؛ اس نے صرف اپنا محور بدل لیا۔ اب پیداوار، معدنیات، اور ٹرانسپورٹ کی راہیں مشرق سے گزرتی ہیں۔ جیسے کبھی سلک روڈ سے دنیا کی معیشت بہتی تھی، ویسے ہی آج بیلٹ اینڈ روڈ انیشی ایٹو نے اُس روایت کو جدید قالب میں زندہ کر دیا۔ یہ تاریخ کی واپسی تھی مگر نئے لباس میں۔ یہ عالمی نظام نہیں ٹوٹا، بلکہ ارتقا پذیر ہوا۔ دنیا کا کشش ثقل کامرکز مشرق کی سمت کھسک گیا۔ اب زمین کے نایاب خزانے، صنعت کے کارخانے، اور لچک کے ستون، سب چین کے ہاتھ میں تھے۔

آزادی"، "جمہوریت"، "قیادت" — یہ وہ الفاظ ہیں جو کبھی صدر ولسن، روز ویلٹ، اور کینیڈی کے زمانے میں معانی رکھتے تھے۔ آج یہ الفاظ سرمایہ دارانہ نظام کی پراپیگنڈا مشینری کی گونج بن چکے ہیں۔ دنیا اب نعرے نہیں، رسد اور پیداوار کے توازن کو دیکھتی ہے۔ یہ وہ دور ہے جہاں فلسفہ نہیں، فیکٹریاں فیصلہ کرتی ہیں۔ امریکا اب بھی آزادی، قیادت، اور جمہوریت کے ترانے گاتا ہے، مگر یہ وہ نغمے ہیں جو گزرے عہد کے ریڈیو پر بجتے ہیں۔ نیا دور نعروں سے نہیں، سپلائی چین سے چلتا ہے۔

ٹرمپ اس ملاقات سے فاتح نہیں بلکہ مشاہد بن کر لوٹا۔ اس کے چہرے پر وہی تاثر تھا جو کبھی رومن سفیر نے مشرق کے درباروں میں دیکھا تھا کہ یہاں جنگ نہیں جیتی جاتی، وقت جیتا جاتا ہے۔ ٹرمپ اس ملاقات سے فاتح نہیں، شاہد بن کر لوٹا۔ اس تہذیب کے عروج کا شاہد جو نظم و ضبط سے جیتی ہے، نہ کہ غلبے سے۔ چین کی قیادت کی سب سے بڑی طاقت اس کا غیر جذباتی طرز عمل ہے۔ یہ قوم بولتی کم، کرتی زیادہ ہے۔ یہ وہی اصول ہے جو چینی فلسفے "تاؤ ازم" میں صدیوں سے لکھا ہے "جو سب سے خاموش ہے، وہی سب سے گہرا ہے"۔ یہی سکوت طاقت کی زبان بن چکا ہے۔

ژی کو مسکرانے کی حاجت نہ تھی، اس کا سکوت ہی فتح کی مہر تھا کیونکہ اصل طاقت قدم نہیں جاتی، فضا میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ یہ وہ خاموش قوت ہے جو چلتی نہیں، مگر دنیا اُس کے بغیر رک جاتی ہے۔ چین نے غصے سے نہیں بلکہ مہارت سے عروج پایا۔ عقاب — امریکا — ابھی تک پرواز پر نازاں ہے، مگر فضا کی سمت بدل چکی ہے۔ یہ منظر تاریخ کے اس موڑ کی یاد دلاتا ہے جب روم اپنی شان میں مدھوش تھا اور بازنطینی مشرق نئی بصیرت کے ساتھ ابھر رہا تھا۔

اژدہا غصے سے نہیں، مہارت سے اٹھا ہے اور عقاب، جو کبھی آسمانوں کا بادشاہ تھا اب دھندلکے میں بے سمت منڈلا رہا ہے، نہ دشمن سامنے، نہ اعتماد پیچھے۔ یہ ملاقات کسی شکست کی کہانی نہیں بلکہ عالمی شعور کے تغیر کی علامت تھی۔ امریکا نے شاید پہلی بار جانا کہ طاقت صرف بارود میں نہیں، بردباری میں بھی ہوتی ہے۔ چین نے جیتنے کیلئے نہیں، قائم رہنے کیلئے کھیل کھیلایا۔ اور یہی حکمت اس کی فتح بن گئی۔ تاریخ اس لمحے کو یاد رکھے گی نہ شکست کے طور پر، بلکہ ادراک کے موڑ کے طور پر۔ امریکا جھکا نہیں، سمجھ گیا۔ چین جیتا نہیں، کیونکہ وہ کھیل ہی نہیں رہا تھا۔

تاریخ گواہ ہے روم، سپین، برطانیہ — سب تلوار سے نہیں، تھکن سے گرے۔ سلطنتوں کا زوال کبھی دھماکے سے نہیں آتا، بلکہ خاموشی سے، جیسے خزاں کے پتے شور نہیں کرتے، صرف گر جاتے ہیں، یوں سلطنتیں مٹی نہیں، دھیرے سے بدل جاتی ہیں۔ یہ زوال جنگ سے نہیں، دانائی سے آتا ہے۔ طاقت سے نہیں، صبر سے۔ آگ سے نہیں، خاموشی سے۔ ڈرگن نے عقاب کو شکست نہیں دی؛ اُس نے محض وقت کے کنارے پر اُس کا عکس

مٹا دیا۔ طاقت کا کھیل ختم نہیں ہوا، بس کھیل کا میدان بدل گیا۔ اور انجام بھی ہوا، ڈریگن نے ایگل کو شکست نہیں دی، بس اس کے خواب سے حقیقت کا بوجھ ہٹا دیا۔

یہ وہ داستان ہے جہاں تاریخ نے اپنی تلوار نیام میں رکھی اور قلم اٹھالیا جہاں تہذیب کی فتح، جنگ کے میدان میں نہیں، دانائی کے مکالمے میں لکھی گئی۔ یہ وہ لمحہ ہے جہاں مشرق نے بولنا بند کیا، اور دنیا سننے لگی۔ اس کے نتیجے میں تاریخ کا نیا چہرہ سامنے آگیا۔ یہ کہانی طاقت کے تصادم کی نہیں، دانائی کی فتح کی ہے۔ یہ وہ لمحہ ہے جب مغرب کی آنکھیں حیرت میں کھلیں، اور مشرق نے بغیر تلوار اٹھائے دنیا کا مرکز بدل دیا۔

جب اژدہا بولا، دنیا خاموش ہوئی، تاریخ کے پردے پر اب جو منظر ہے، وہ فتوحات اور جنگوں کا نہیں بلکہ ادراک اور بلوغت کا ہے۔ یہ وہ دور ہے جہاں بندوقین خاموش اور کتابیں بیدار ہیں؛ جہاں طاقت کے معیار بدل گئے ہیں۔ اب سلطنتیں بارود سے نہیں، دانائی سے بنتی ہیں۔ چین نے دنیا کو یہ سبق دیا ہے کہ فتح اُس کی نہیں ہوتی جو زور لگاتا ہے، بلکہ اُس کی جو انتظار کرنا جانتا ہے۔ یہی وہ راز ہے جو ہان دربار سے لے کر بیجنگ کے ایوانوں تک گونجتا رہا ہے اور امریکا؟ وہ اب بھی "آزادی" اور "قیادت" کے نعرے دہرا رہا ہے، مگر صدیوں کی سیاست اب نعرے نہیں سنتی، صرف نتیجے دیکھتی ہے۔

اژدہا نے عقاب کو شکست نہیں دی، بس اس کے آسمان کی وسعت کو ناپ لیا۔ یہ زوال نہیں، ادب کے ساتھ مقام کی تبدیلی ہے۔ جیسے سورج مغرب میں نہیں ڈوبتا بلکہ مشرق میں دوبارہ طلوع ہوتا ہے۔ دنیا کا نقشہ اب نہیں بدلے گا، مگر اس کے معنی بدل گئے ہیں۔ طاقت کا مرکز وہاں جا پہنچا ہے جہاں صبر عبادت اور خاموشی تدبیر سمجھی جاتی ہے اور شاید یہی تاریخ کا انصاف ہے کہ جب شور مچا دیا جائے، تب خاموشی بولتی ہے۔ جب عقاب تھک جائے، تب اژدہا ابھرتا ہے اور جب دنیا تھک کر رک جائے، تب مشرق چلنا شروع کرتا ہے۔

تاریخ بچی عظمت اسی میں ہے کہ وہ مستقبل کا فیصلہ ایک دن یا ایک جنگ میں نہیں لکھتی بلکہ وقت کے صبر، تہذیب کے وقار اور اقوام کے کردار سے اخذ کرتی ہے۔ تاریخ ہمیشہ اُن لمحوں پر بھی فیصلہ نہیں لکھتی جن میں گرج سنائی دے، وہ اُن سانسوں میں لکھتی ہے جو اقوام کے مزاج کو بدل دیتی ہیں۔ امریکا اور چین کی یہ آویزش بھی ویسی ہی ایک خاموش تبدیلی تھی جیسے کبھی اباسینیہ کے دربار میں نجاشی کے فیصلے نے عرب و عجم کے توازن بدل دیے تھے، یا جیسے خلافتِ عثمانیہ کے زوال نے یورپی طاقتوں کی سمت بدل دی تھی۔ چین اور امریکا کی یہ خاصیت بھی کسی میدان جنگ میں نہیں جیتی یا ہاری گئی؛ یہ وہ مقابلہ تھا جو نظریات سے نہیں، رویوں سے طے ہوا۔ یہاں بھی فیصلہ بارود نے نہیں، بصیرت نے کیا۔ امریکا کی گرجتے ہوئے لہجے اور چین کی خاموش مگر مضبوط سفارت نے دنیا کو یہ احساس دلایا کہ طاقت اب توپوں کے دھویں میں نہیں، عالمی رسد کے بہاؤ میں، خاموش فیصلوں میں، اور صنعتی تسلسل میں پوشیدہ ہے۔

امریکا کی سیاسی خطابت کی گونج کے مقابل چین کی تہذیبی خاموشی نے وہی منظر پیش کیا جو کبھی چنگیز خان نے بھی محسوس کیا تھا کہ ہر خطہ تلوار سے نہیں جیتا جاسکتا۔ بعض خطے صبر سے مسخر ہوتے ہیں۔

ٹرمپ اس ملاقات سے کوئی فاتح یا سیزر بن کر نہیں لوٹا؛ وہ ایک ایسے ناظر اور مسافر کی طرح پلٹا جس نے پہلی بار جانا ہوا کہ مشرق کی تاریخ تخت و تاج سے نہیں، کردار و تدبیر سے بنتی ہے۔ تہذیبی وزن، صبر کی قوت اور خاموشی کی حکمت کو پہلی بار سمجھ کر۔ یہ وہی کیفیت تھی جو کبھی رومن سفیروں

پریتی تھی جب وہ مشرق کے درباروں میں کھڑے ہو کر محسوس کرتے تھے کہ یہاں طاقت تلوار سے نہیں، وقت سے ماپی جاتی ہے۔ اور وقت ہمیشہ اُن کے ساتھ ہوتا ہے جو اُس کے ساتھ سفر کرنا جانتے ہیں۔

چین نے نہ تو گرج کر جواب دیا، نہ دنیا کو دھمکیوں کے شور میں لپیٹا۔ اس نے اپنے اصولوں، اپنی قدیم روایت، اپنے صنعتی عروج اور اپنی اقتصادی حکمت کے بل پر دنیا کے میدان کو خاموشی سے بدل دیا۔ یہ وہی سکوت ہے جو زمانہ جیت لیتا ہے؛ وہی ٹھہراؤ جو سلطنتوں کی بنیاد ہلاتا ہے۔ چین نے اُس روایت کو دہرایا جو کبھی سلجوقی دانشوروں نے کہی تھی: طاقت اُس کی نہیں جو لٹکارے، اُس کی ہے جسے لٹکارنے کی ضرورت نہ ہو۔

امریکا آج بھی آزادی، جمہوریت اور قیادت کے نغے دہرا رہا ہے مگر دنیا کے کان اب اس موسیقی کے آہنگ سے مانوس نہیں رہے۔ اب نظریات نہیں، نتائج دیکھے جاتے ہیں۔ اب عالمی سیاست کا رخ نعرے نہیں بدلتے، رسد کے راستے بدلتے ہیں۔ امریکا کے ”قیادت“ اور ”آزادی“ کے ترانے اب ویسے ہی لگتے ہیں جیسے زوال پذیر سلطنتیں اپنے آخری دنوں میں اپنا ماضی دہراتی رہتی ہیں۔ دنیا اب ولسن کے اصول نہیں پڑھتی؛ وہ بیجنگ کی بندرگاہوں سے اٹھنے والے کنٹینروں کو دیکھتی ہے۔ بیلٹ اینڈ روڈ محض ایک معاشی منصوبہ نہیں رہا۔ یہ ویسا ہی تاریخی لمحہ بن چکا ہے جیسا کبھی شاہراہ ریشم تھی جس نے قرون وسطیٰ کی دنیا کا رخ بدل دیا تھا۔

عقاب کی پرواز اب بھی بلند ہے مگر اس کے سامنے ابھرتے سورج کی روشنی تیز ہو چکی ہے۔ ڈریگن نے عقاب کو شکست نہیں دی؛ اس نے محض آسمان کا نقشہ بدل دیا ہے۔ یہ تبدیلی اتنی خاموش تھی کہ دنیا نے پہلے اسے محسوس کیا اور بعد میں سمجھا۔ طاقت کا مرکز اب شور سے نہیں بدلتا؛ ٹھہراؤ سے، تدبیر سے، اور اُس صبر سے بدلتا ہے جو تہذیبوں کے اندر دھڑکتا ہے۔

یہ داستان شکست کی نہیں بلکہ شعور کے بیدار ہونے کی ہے۔ یہ وہ لمحہ ہے جب تاریخ نے اپنی تلوار نیام میں رکھ کر قلم اٹھایا، اور جنگ کے ڈھول خاموش ہو کر حکمت کی آہٹ سننے لگے۔ آج مشرق کی صدیوں پرانی خاموشی ایک نئے دور کی آواز بن رہی ہے، اور مغرب اپنی تھکی ہوئی گونج کو سنوارنے میں مصروف ہے۔

دنیا کا نقشہ شاید نہ بدلے۔ لیکن اس کے معنی بدل چکے ہیں۔ اب سلطنتیں بارود سے نہیں، دانائی سے بنتی ہیں؛ اب فیصلہ اُن کا ہوتا ہے جن کے پاس صبر کی دولت اور وسائل کی کنجی ہو۔ یہ دور شور کا نہیں، شعور کا ہے۔ اور جب وقت کا پڑا بدل جاتا ہے تو تلواریں نہیں، خاموشیاں تاریخ لکھتی ہیں۔

یہ کہانی زوال کی نہیں، ادراک کی ہے۔ مشرق نے بغیر تلوار اٹھائے دنیا کا مرکز بدل دیا، اور مغرب نے بغیر شکست کھائے اپنا مقام تبدیل ہوتے دیکھا۔ اب سلطنتیں خنجر سے نہیں، حکمت سے بنتی ہیں۔ اور جب وقت کے پنڈولم کی سمت بدلتی ہے تو نہ فتوحات شور کرتی ہیں نہ زوال؛ بس خاموشی سے پردے کھلتے جاتے ہیں۔

چین نے دنیا کو یہ سبق دیا ہے کہ طاقت اُس کی نہیں جو چیخے؛ اُس کی ہوتی ہے جو سنبھل کر، سوچ کر، اور صبر سے آگے بڑھے۔ اور امریکا؟ وہ اب بھی اپنے قدیم نعروں کی مالا چننے اور نغموں کی گونج تیز کرنے کی کوشش میں ہے، مگر صدیوں کی دانش اب نعرے نہیں سنتی۔ صرف نتائج دیکھتی ہے۔ تاریخ اب نغے نہیں سنتی۔ صرف نتائج پڑھتی ہے۔

اڑدھا بھرا نہیں، جاگا ہے۔ عقاب گرا نہیں، تھکا ہے۔ اڑدھانے عقاب کو شکست نہیں دی؛ اس نے صرف یہ بتا دیا کہ آسمان کس کے اوپر کھلا ہے۔ اور وقت؟ وہ پھر مشرق کی سمت بہہ رہا ہے، جیسے بہاؤ ہمیشہ وہیں جاتا ہے جہاں سکوت میں صدیوں کی حکمت بسی ہو اور تاریخ نے فیصلہ نہیں سنایا۔ اک اشارہ کیا ہے کہ عصرِ نواب اُس سمت جا رہا ہے جہاں شورِ تھم چکا ہے، اور خاموشی بول رہی ہے۔ چین کا سکوت، وہی سکوت ہے جو سن تزو نے ”آرٹ آف وار“ میں طاقت کی اصل تعریف بتاتے ہوئے لکھا تھا: ”اصل فتح وہ ہے جو جنگ کے بغیر حاصل ہو۔“ آج دنیا اسی اصول کے تحت بدل رہی ہے۔ عقاب کی پرواز کم نہیں ہوئی، مگر اس کے نیچے سے آسمان کی وسعت بدل گئی ہے۔ اڑدھا حملہ آور نہیں ہوا؛ وہ صرف بیدار ہوا ہے۔ اور بیداری کا خوف ہمیشہ حملے سے زیادہ گہرا ہوتا ہے۔

بروز سوموار 9 جمادی الثانی 1447ھ یکم دسمبر 2025ء

کوئٹہ کانفرنس اور روشن فکر کی تجرید

تاریخ کے لمحے جب کروٹ لیتے ہیں تو اُن کی آہٹ صرف ایوانِ سلطنتوں میں نہیں سنائی دیتی، وہ قوموں کی روح میں اتر کر اُن کے مقدر کو نئے افق — عقاب اور اژدہا — زمین عطا کرتی ہے۔ آج کی دنیا جس انتشار، اضطراب اور تہذیبی بے سمتی میں گھری ہوئی ہے، وہاں طاقت کے دو دیوتا کے نقشے رنگ رہے ہیں، مگر انسانیت ضمیر اب بھی ایک ایسی صدا کا منتظر ہے جو اسے اس مادی طوفان کے شور سے نکال کر اپنے باطن کی طرف لے جائے۔

دنیا کی سیاسی بساط پر جو نقشے بنتے اور مٹتے رہتے ہیں، وہ صرف طاقت کے معرکوں کی کہانی نہیں، یہ تہذیبوں کے خواب، قوموں کی روحوں میں اترتی صدیاں، اور تاریخ کے وہ لمحے ہیں جو پوری انسانیت کے مقدر کا دھار ابدل دیتے ہیں۔ آج جب زمین کی سیاست عقاب و اژدہا کی کشمکش میں سلگ رہی ہے، جب طاقت کے عالمی ستون لرز رہے ہیں اور تہذیبوں کی جڑیں نئے سوالات کے سامنے ڈگمگا رہی ہیں، ایسے میں امتِ مسلمہ ایک بار پھر تاریخ کے موڑ پر کھڑی ہے؛ بالکل ویسے ہی جیسے بدر کی ریت میں، قسطنطنیہ کے دروازوں پر، یا غرناطہ کی خاموش گلیوں میں۔

اسی ہنگام دوراں میں کوئٹہ کا شہر — جو تہذیبوں کے سنگم پر ایستادہ اور صدیوں کی تہذیبی گواہیوں کا امین ہے — اچانک ایک نئے نور سے روشن اور ایک ایسی فکری روشنی کا مرکز بنا ہے جہاں علامہ اقبالؒ کا جہانِ فکر نئے سرے سے جگمگا اٹھا ہے۔ یہاں منعقدہ سہ روزہ عالمی اقبال کانفرنس گویا قرون وسطیٰ کی دانش گاہوں، بغداد و قرطبہ کی علمی محفلوں، اور دہلی و لاہور میں گونجتی اقبالؒ کی صدا کا تسلسل بن گئی۔ یہ اجتماع نہ صرف عالم اسلام کی فکری دھڑکنوں کو یکجا کرتا ہے بلکہ عصر حاضر کے ذہنی انتشار میں روحِ اقبالؒ کی دوبارہ بیداری کا اعلان بھی ہے۔

یہ اجتماع محض اہل علم کا اکٹھا نہیں، یہ زمانے کی رفتار سے مکالمہ ہے؛ ایک ایسا مکالمہ جو نوجوانوں کو بتاتا ہے کہ نہ امریکی عقاب کی جارحیت میں کوئی نجات ہے اور نہ چینی اژدہا کی حکمت میں کوئی بے خطر راستہ۔ راستہ صرف وہی ہے جس کی طرف اقبالؒ نے اشارہ کیا — شاہین کی آزاد پرواز، خودی کی آگ، ایمان کی حرارت اور انسانیت کی خدمت کا جہان۔

یہ کانفرنس گویا تاریخ کے سینے پر دستک ہے، امت کے سوئے ہوئے شعور کو جھنجھوڑنے کی ایک جرات ہے، اور اس یقین کا اعلان ہے کہ اقبالؒ آج بھی زندہ ہیں، ان کا پیغام آج بھی منزلوں کا تعین کرتا ہے اور آج بھی قوموں کے مقدر کا چراغ بن سکتا ہے۔

یہ وہ ساعت ہے جس میں تاریخ، تہذیب اور فکر کی تمام ندیاں ایک دوسرے سے آملتی محسوس ہوتی ہیں؛ اور کوئٹہ کا یہ اجتماع اس بات کی روشن دلیل بن گیا ہے کہ قومیں جب اپنے فکری مرکز کی طرف لوٹتی ہیں تو اُن کی تقدیر نئے سرے سے لکھ دی جاتی ہے۔ اس عظیم فکری توشہ خانے کی ترتیب و تکمیل میں جس اخلاص، جانفشانی اور محبت کا کردار ہے، اُس کا سہرا حافظ طاہر صاحب اور اُن کی پوری مخلص ٹیم کے سر ہے — وہ ٹیم جو نہ صرف اقبالؒ سے محبت رکھتی ہے، بلکہ اس محبت کو عمل کا لباس پہناتی ہے۔ اقبالؒ شناسی کی یہ مشعل انہوں نے اس انداز سے روشن کی ہے کہ بلوچستان ہی نہیں پورا پاکستان، پورا عالم اسلام اُن کا ممنون احسان ہے۔

دنیا کے سیاسی افق پر جو نقش و نگار ابھر رہے ہیں، وہ محض طاقت کے بدلتے ہوئے مراکز کی داستان نہیں بلکہ تہذیبوں کے باطنی میلان، فکری دھاروں اور تاریخی عمل کی گہری تہوں میں اتر جانے والی وہ کروٹیں ہیں جو قوموں کی زندگی میں فیصلہ کن موڑ بن جاتی ہیں۔ دنیا کی تاریخ صرف واقعات کی تکرار نہیں، قوموں کے مزاج اور تہذیبوں کے باطن میں چلتی ہوئی وہ خفیف مگر فیصلہ کن لہریں ہیں جو تمدن کی سمت متعین کرتی ہیں۔ قومیں جب اپنے اندر جھانکنا بھول جائیں تو بیرونی علامتیں ان کے افکار پر نقوش ثبت کرتی چلی جاتی ہیں دنیا کی تاریخ کے اوراق پر جب ہم نظر دوڑاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ طاقت اور تہذیب ہمیشہ علامتوں میں سوچتی اور استعاروں میں بولتی آئی ہے۔ کبھی شیرِ دبے کی علامت بنا، کبھی گھوڑا چستی کی، کبھی بازِ شاہانہ رعب کا نشان ٹھہرا اور کبھی اژدہا خوف اور حکمتِ عملی کا مجموعی تصور بن گیا۔ علامتیں قوموں کے مزاج، ان کے نفسیات اور ان کی اجتماعی زندگی کی کشتی کو دھار اور بناتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدید دنیا نے بھی اپنی سیاسی کہانی علامتوں سے لکھی: امریکا کا عقاب، عسکری تسلط کا نشان بنا تو چین کا اژدہا اس کی تہذیبی حکمت، صبر، معاشی پھیلاؤ اور دیرپا تزویراتی مزاج کا مظہر ٹھہرا۔

عصرِ حاضر میں امریکا کے عقاب کو جس طرح قوت و غلبہ کا استعارہ بنایا گیا ہے اور چین کے اژدہے کو حکمتِ عملی، معاشی رسوخ اور تہذیبی تسلسل کی علامت سمجھا جا رہا ہے، وہ دراصل دنیا کی ان دو ہمہ گیر روایتوں کی ترجمانی ہے جو طاقت کے حصول میں مختلف راستے اپناتی ہیں۔ آج کے سیاسی منظر نامے میں اگر امریکا کا عقاب طاقت کا استعارہ بن چکا ہے اور چین کا اژدہا قوت و حکمتِ عملی کا، تو یہ دونوں علامتیں دراصل طاقت کی اُس کشش کی ترجمان ہیں جو اکیسویں صدی کے افق پر روزِ اول کی طرح تازہ ہے۔ مگر علامہ اقبالؒ نے اپنے نوجوان کو ان دونوں سے الگ اور بلند ایک ایسی مخلوق سے نسبت دی جس کے پروں میں آفاق کی وسعت اور نگاہ میں بصیرت کی روشنی ہے۔

ایک جانب عسکری قوت، بین الاقوامی سیاست اور مالی بالادستی؛ دوسری جانب تدبیر، صبر، وقت کی رفتار کو اپنے حق میں موڑنے کی دیرینہ مہارت اور تہذیبی ضبط۔ لیکن علامہ محمد اقبالؒ نے جب اپنے نوجوان کو شاہین کہا تو وہ ان دونوں روایتوں سے یکسر مختلف، ماورا اور کہیں بالاتر تصور لے کر سامنے آئے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے نوجوان کو شاہین کہا، تو وہ ان دونوں علامتوں سے کہیں ماورا اور کہیں بالاتر تصور لے کر سامنے آئے۔ اقبالؒ کا شاہین نہ سامراجی عقاب ہے نہ کثیر التہذیبی حکمت سے لبریز اژدہا۔ اس کی اصل نہ غلبے میں ہے نہ چالاکی میں، بلکہ خودی کی اس لومیں ہے جس سے انسان اپنے اندر خدا کی نیابت کا شعور بیدار کرتا ہے۔ یہی وہ بامعنی فرق ہے جو اقبالؒ کے شاہین کو عصرِ حاضر کے عقاب اور اژدہے کی عالمی کشش میں ایک منفرد مقام دیتا ہے۔

امریکی عقاب طاقت و برتری کی علامت ضرور ہے، مگر اس کی پرواز کا مدار زمین کے وسائل اور دنیاوی غلبے کی کششِ ثقل میں بندھا ہوا ہے۔ یہ عقاب جس آسمان کا مسافر ہے، وہ سیاست کے پیچ در پیچ، معیشت کی حرص اور عسکری قوت کے غرور سے بھرا ہوا ہے۔ اس کی نگاہ تیز ضرور ہے، مگر اس تیزی میں وہ خود غرضی شامل ہے جو دوسروں کے آشیانوں کو تاراج کرنے میں عار محسوس نہیں کرتی۔ اقبالؒ کا شاہین اس کے برعکس ہے۔ وہ خاکبازی سے آزاد، قید و بند سے ماورا، اور غنیمتِ دنیا سے بے نیاز ہے۔ وہ رزقِ حلال کی جستجو میں اپنی چونچ کو مردار سے آلودہ نہیں کرتا۔ وہ پہاڑوں کی تیز ہواؤں میں پلتا اور بلند مقامات کی خلوتوں میں اپنے آپ کو بچھانتا ہے۔ اقبالؒ کا شاہین دنیاوی تسلط کی علامت نہیں بلکہ خودی کی عظمت، روح کی آزادی اور اخلاقی بلندی کا مژدہ ہے۔ اس کی دنیا میں فتح و شکست کا معیار وہ نہیں جو سامراجی قوتیں طے کرتی ہیں۔ وہ راستہ وہیں بتا دیکھتا ہے جہاں دوسروں کیلئے صحرائے محشر کا سناٹا ہے۔ گویا اقبالؒ نے نوجوانِ مسلم کو اس بلند ہمتی کی طرف بلایا جس میں طاقت، اخلاق کی دہلیز پار کیے بغیر جمال بن جائے۔

اقبالؒ کا شاہین ایک ایسا کردار ہے جس کی پرواز کے پیچھے نہ شرقِ اقصیٰ کا اڑدہا ہے نہ غربِ بعید کا عقاب؛ بلکہ اس کی پوری قوت اس کے باطن، اس کی خودی اور اس کی روحانی تربیت میں پوشیدہ ہے۔ اقبالؒ نے بجا طور پر کہا کہ شاہین کا رزق مردار نہیں اور اس کا بسیر بلند یوں میں ہے۔ یہ محض ایک حیوانی صفت نہیں بلکہ نوجوانِ مسلم کی اس تطہیرِ کردار کی طرف اشارہ ہے جس میں بلند ہمتی، پاکیزگی خیال، قوتِ ارادی اور اخلاقی استقامت کا وہ امتزاج موجود ہے جو اسے دنیا کی طاقت کی روایتی علامتوں سے الگ کر دیتا ہے۔ اس تمثیل کے تاریخی جواز کیلئے اگر ہم اقبالؒ کے مکاتیب، خطبات اور علمی مراجع کی طرف رجوع کریں تو پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے یہ استعارہ محض شاعرانہ ذوق سے نہیں بلکہ اسلامی تاریخ کے اس فکری سرمایہ سے لیا جو ابتداءً اسلام سے لے کر سلطنتِ عثمانیہ کے زوال تک اُمت کو بلند عزائم اور عالی ہمتوں کی دعوت دیتا رہا۔ ”تشکیلِ جدید الہیاتِ اسلامیہ“ (1930) میں اقبالؒ نے صراحت کی کہ مسلمان کی قوت اس کی اخلاقی خود مختاری اور خالق کے حضور جواب دہی میں مضمر ہے، نہ کہ زمین کے وسائل پر قبضے میں۔ یہی تصور بعد ازاں ”ضربِ کلیم“ اور ”بالِ جبریل“ کی شاہین تمثیل میں مزید واضح ہوتا ہے۔

اقبالؒ کا شاہین محض ایک شعری تمثیل نہیں۔ اس کی جڑیں اسلامی تاریخ، صوفیانہ رمزیت، اور قرآن و سنت کے تصوراتِ انسان میں پیوست ہیں۔ عربی و اسلامی علامتی روایت کا جائزہ لیا جائے تو اسلامی تہذیب میں پرندے کو ہمیشہ بلند صفات کے استعارے کے طور پر لیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں (سورۃ النحل، سورۃ الملک، سورۃ البقرہ، سورۃ الفیل) پرندوں کا ذکر حکمت، رزق کی تلاش اور بندگی کے شعور کے ساتھ آتا ہے۔

حدیث شریف میں ایک مؤمن کی مثال اس پرندے سے دی گئی ہے جو صبح کو اللہ پر بھروسہ کر کے نکلتا ہے اور شام کو رزق لے کر آتا ہے۔ یعنی اعتماد، توکل اور رزقِ حلال کی تلاش۔ اقبالؒ نے اسی روایت سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے نوجوان کیلئے شاہین کا انتخاب کیا۔

سلطنتِ عثمانیہ اور وسطی ایشیا کی ترک تاریخ میں شاہین کا استعارہ بکثرت ملتا ہے۔ ترک و مغل عسکریت میں بھی شاہین کو شکار، ذہانت، شجاعت اور شاہی وقار کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ مغل دربار کے شاہی نمونوں میں بھی شاہین بار بار ایک امتیازی نشان کے طور پر سامنے آتا ہے۔ اقبالؒ نے ”بالِ جبریل“ میں اسی ترک و اسلامی روایت کو جدید حکمت کے ساتھ ملایا۔

تصوف میں بھی شاہین کو بلند پروازی کے استعارہ میں پیش کیا گیا ہے۔ ابن عربیؒ، رومیؒ اور عبد الکریم اکیلیؒ نے انسانِ کامل کو ایک ایسے پرندے سے تشبیہ دی جو اپنی اصل کی طرف پرواز کرتا ہے۔ اقبالؒ نے اسی روحانی تصور کو عملی زندگی کے ساتھ جوڑ کر شاہین کا استعارہ تراشا ہے۔ جو تجھے بلند کرے وہ خودی ہے، جو پست کرے وہ خواہش ہے۔

امریکی عقاب کی علامت کا تاریخی پس منظر 1782ء سے ملتا ہے جب ”گریٹ سیل آف دی یونائیٹڈ سٹیٹس“ میں بالڈ ایگل کو ریاستی طاقت کا نشان بنایا گیا۔ عقاب کی یہ علامت ایسے سیاسی مزاج کی عکاسی کرتی ہے جس میں عسکری غلبہ، جغرافیائی مداخلت، عالمی بالادستی کی خواہش، اور طاقت کے مظاہر کی مسلسل نمائش مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ یہ عقاب ہماری آنکھوں کے سامنے کئی دہائیوں سے ویتنام، عراق، افغانستان، لاطینی امریکا اور مشرقِ وسطیٰ میں طاقت کا وہ مکروہ کھیل کھیلتا رہا جس کا مقصد ”آزادی“ کے نام پر جغرافیائی تسلط تھا۔

علامہ اقبالؒ اس رویے کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ 1920ء کے بعد کے ان کے خطبات ”مسلمانوں کی موجودہ سیاسی صورتِ حال“ اور ”تشکیلِ جدید“

میں امریکی ویورپی سامراجی ذہنیت کی گہری تنقید ملتی ہے۔

دوسری طرف چین میں اژدہا ہزاروں سال سے چینی تہذیب کی علامت ”طاقت، حکمت، صبر“ کا مجموعہ سمجھا جاتا ہے۔ وہ قوت جس میں عسکری جارحیت کم اور تزویراتی حکمت عملی زیادہ ہے۔ تاریخ چین (شاہی سلسلہ ہان، تانگ، منگ اور چنگ) میں اژدہ کو بادشاہ کی حکمت، قوم کی اجتماعی طاقت، ضبط و انتظار، معاشی تنظیم کی علامت سمجھا جاتا رہا ہے۔ آج کی جدید ریاست چین اسی تاریخی تصور کی سیاسی شکل ہے۔ اس کا بیلٹ اینڈ روڈ منصوبہ ہو یا معاشی رسوخ، سب تزویراتی صبر اور تدریج کے فلسفے پر مبنی ہے۔

لیکن اقبالؒ کا شاہین — عقاب اور اژدہا سے مختلف کیوں ہے؟ اقبالؒ کا شاہین نہ سامراجی عقاب کی جارحیت رکھتا ہے، نہ چینی اژدہ کے زمینی حکمت۔ اس کی اصل قوت خودی، ایمانی فراست، رزقِ حلال، بے خوف پرواز اور اس کے باطن میں ہے۔

اقبالؒ کے یہاں شاہین کی خصوصیات ان دونوں تہذیبوں سے یکسر مختلف ہیں۔ اقبالؒ کا شاہین بلندی کا خوگر پہاڑوں کی چوٹیوں پر بسیر کرتا ہے، آزاد منش، قید سے نفرت کرتا ہے، پاکیزگی کی علامت ہے کہ مردار سے گریز کرتا ہے، جرأت کی علامت ہے اور ہر قسم کے خطرات سے بے نیاز ہے، اس کی خلوت اسے بلندیوں میں تنہائی اور تفکر عطا کرتی ہے اور سب سے اہم صفت اقبالؒ کا شاہین طاقت کا غلام نہیں، اخلاق کا امین ہے۔ یہ وہ صفات ہیں جو نہ امریکی عقاب میں ہیں نہ چینی اژدہ میں۔

یہاں اصل سوال یہ ہے کہ اقبالؒ کی خودی عقاب اور اژدہ کے اس عالمی کشمکش میں مسلم نوجوان کو کیا کردار عطا کرتی ہے؟ خودی کا مفہوم، جو اقبالؒ نے ”جاوید نامہ“ (1932)، ”ارمغانِ حجاز“ (1938)، اور ”بالِ جبریل“ (1935) میں گہرائی کے ساتھ بیان کیا، بتاتا ہے کہ مسلمان کا اصل سرمایہ اس کی بیرونی طاقت نہیں بلکہ اس کی اندرونی تعمیر ہے۔ وہی تعمیر جو انسان کو زمین پر اللہ کی خلافت کا اہل بناتی ہے۔

اگر آج مسلمان ریاستیں محض طاقت کے ان دو مراکز — امریکا اور چین — کے درمیان دب کر رہ جائیں تو یہ ان کی اپنی فکری کمزوری کا نتیجہ ہے۔ اقبالؒ نے اس کمزوری کا علاج خودی میں بتایا ہے۔ خودی وہ قوت ہے جو انسان کو اپنی آزادی کا احساس دیتی ہے، اسے غلامی سے بغاوت، ظلم سے ٹکراؤ اور دنیا کے طاقتوروں کے سامنے سر بلند رکھنے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔ اگر امتِ مسلمہ اس خودی کے پیغام کو سمجھ لے تو نہ عقاب کا سایہ اسے خوفزدہ کر سکتا ہے، نہ اژدہ کے حکمت اسے شکست دے سکتی ہے۔

تاریخی اعتبار سے یہ بات بھی ثابت ہے کہ مسلمانوں نے جب بھی اپنی روحانی و اخلاقی قوت پر بھروسہ کیا، وہ دنیا کی مضبوط ترین طاقتوں کا مقابلہ کر گئے۔ بدرِ واحد کی وادیاں، قسطنطنیہ کے مینار، غرناطہ کی فصیلیں اور سلطنتِ عثمانیہ کی تنظیمات — سب اسی حقیقت کی گواہی دیتی ہیں کہ خارجی قوتیں اُسی وقت مضبوط ہوتی ہیں جب باطن میں خودی کی آگ روشن ہو۔

مجدد الفِ ثانیؒ کے مکتوبات سے لے کر شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی ”حجۃ اللہ البالغہ“ اور مولانا مودودیؒ کی ”خطبات“ و ”تفہیم القرآن“ تک ایک ہی صدائے باز گشت سنائی دیتی ہے کہ مسلمان کا اصل امتیاز اس کا اخلاقی تشخص اور اس کی فکری خودداری ہے۔ اقبالؒ اسی روایت کا وہ روشن مینار ہیں جسے بیسویں صدی نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔



لہذا آج جب دنیا عقاب کی جارحیت اور اژدہا کی حکمت کے بیچ تقسیم ہو رہی ہے، اقبالؒ کا شاہین اب بھی راستہ دکھا سکتا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ نوجوان اپنے باطن میں خودی کی وہ چنگاری پیدا کریں جس کی روشنی میں راستے کے تمام سراب مٹ جائیں۔ اور اگر امت مسلمہ اپنے علمی ورثے، دینی شعور اور تہذیبی وقار سے دوبارہ رشتہ استوار کر لے، تو کھوئی ہوئی منزل محض ایک خواب نہ رہے گی بلکہ ایک زندہ حقیقت بن سکتی ہے۔ وہ حقیقت جس کا اعلان اقبالؒ نے پوری دنیا کو سنایا تھا کہ: 'نفس کی تسخیر کے بغیر آفاق کی وسعتیں بے معنی ہیں۔'

علامہ اقبال کے مطابق، کائنات کی وسعتوں کو سمجھنا یا ان پر دسترس حاصل کرنا اس وقت تک بیکار ہے جب تک انسان اپنے نفس پر قابو نہ پالے۔ ان کا کہنا ہے کہ تسخیرِ نفس (نفس پر کنٹرول) تسخیرِ آفاق (کائنات کو فتح کرنے) سے پہلے لازم ہے، کیونکہ بغیر خودی کی فتح کے بیرونی دنیا کو سمجھنا اور فتح کرنا بے معنی ہے۔

اقبالؒ کے فلسفے میں "خودی" کا تصور مرکزی ہے، جو نفس کی تسخیر سے وابستہ ہے۔ ان کے نزدیک، انسان جب اپنے نفس کو سنوارتا اور اس پر قابو پاتا ہے، تو اس میں کائنات کی حقیقت اور اس کی قوتوں کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ اقبالؒ نے تسخیرِ آفاق کو تسخیرِ نفس کی مشروط یا مطلوبہ نتیجہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ جب تک انسان اپنی ذات کا تزکیہ نہیں کرتا، بیرونی دنیا کی فتح محض مادی حصول رہ جاتی ہے اور اس میں کوئی روحانی یا حقیقی معنی نہیں ہوتے۔ یہ قول اقبال کی اس سوچ کی عکاسی کرتا ہے کہ انسان کو پہلے اپنے اندر کی دنیا پر غلبہ حاصل کرنا چاہیے، تاکہ وہ بیرونی دنیا کو صحیح معنوں میں سمجھ سکے اور اس پر اپنے صحیح حق کا دعویٰ کر سکے۔ بغیر اس کے، انسان کی تمام کوششیں اور حصول ادھورے اور بے معنی ہوں گے۔

اقبالؒ نے اپنی نظموں میں جن استعاروں کو برتا، وہ محض شعری صناعت کا ہنر نہیں بلکہ تہذیبی دعوتِ تعمیر ہے۔ آج جب عقاب اور اژدہا دنیا کی طاقت کے دو بڑے مراکز بن چکے ہیں، مسلم دنیا ایک تماشائی کی طرح اس کشمکش کے بیچ کھڑی ہے۔ اقبالؒ یہاں بھی رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک قوتِ مسلم کا سرچشمہ نہ تو عقاب کی جارحیت میں ہے اور نہ اژدہا کی حکمتِ عملی میں، بلکہ خودی کی اس آگ میں ہے جو انسان کو اپنی اصل پہچان سے روشناس کر دیتی ہے۔

یہی خودی، انسان کو خالق کے حضور جواب دہ بناتی ہے، اسے ظلم کے خلاف سینہ سپر ہونا سکھاتی ہے، اسے قوت دیتی ہے کہ وہ طاقت کے مراکز کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کرے، اور اسے یہ حوصلہ عطا کرتی ہے کہ وہ اپنی کھوئی ہوئی منزل آزادی، وقار اور تہذیبی خود مختاری دوبارہ حاصل کر سکے۔

اگر مسلم نوجوان، اقبالؒ کے شاہین کی طرح خودی کے پہاڑوں پر بسیرا کر لے اور اپنے باطن میں وہ روشنی پیدا کرے جو ایمان، علم اور عمل سے پھوٹی ہے تو پھر نہ عقاب کا خوف باقی رہے گا، نہ اژدہا کا ہیبت ناک سایہ۔ پھر امت مسلمہ اپنے مقام بلند کو پانے کے قابل ہو جائے گی، وہ مقام جس کیلئے کبھی اقبالؒ نے کہا تھا:

حق بات کو لیکن میں چھپا کر نہیں رکھتا

تو ہے، تجھے جو کچھ نظر آتا ہے، نہیں ہے!

اقبالؒ کے فکرِ خودی کا تاریخی رشتہ اسلامی تاریخ کی اُس سنہری لڑی کا تسلسل ہے جو حضرت عمرؓ کی عدالت، خالد بن ولید کا عزم، صلاح الدین ایوبیؒ کا حلم، ٹیپو سلطانؒ کی مزاحمت، نور الدین زنگیؒ کا تقویٰ، اور سلطنتِ عثمانیہ کی شجاعت سے مل کر بنی ہے۔

"اسرارِ خودی" کے دیباچے میں اقبالؒ لکھتے ہیں کہ مسلمان کی اصل قوت اس کے باطن کی تعمیر ہے۔

"رموزِ بے خودی" میں وہ اسے امت کی اجتماعی وحدت سے جوڑتے ہیں۔

"جاوید نامہ" میں اسے روحانی کائنات کی وسعتوں سے ملاتے ہیں۔

"ارمغانِ حجاز" میں اسے عشقِ رسول ﷺ کی تکمیل پر چھوڑ دیتے ہیں۔

یہ پورا تصور شاہین کی علامت بن کر سامنے آتا ہے۔

آج دنیا دو بڑی طاقتوں کی باہمی کشمکش میں پھنسی ہوئی ہے، لیکن اقبالؒ نے یہ واضح کر دیا تھا کہ اگر مسلمان اپنی خودی کو زندہ کر لیں، اپنا فکری مرکز پہچان لیں، اپنی روحانی طاقت کو حرکت میں لے آئیں، اور ایمان و علم کی بنیاد پر اپنی اجتماعی وحدت قائم کر لیں، تو نہ عقاب کا سامراجی سایہ انہیں ڈرا سکتا ہے اور نہ اژدہ کی تہذیبی یلغار انہیں بلا ثبوت محصور کر سکتی ہے۔ اقبالؒ نے ”بالِ جبریل“ ”خدا کے حضور“ میں وہ نسخہ پیش کیا جو آج بھی عصرِ حاضر میں رہنمائی فراہم کر سکتا ہے:

اے انفس و آفاق میں پیدا تری آیات

حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پایندہ تری ذات

دنیا کی جنگیں خواہ معاشی ہوں، عسکری ہوں یا تزویراتی، اقبالؒ تاریخی تناظر میں امتِ مسلمہ کی کھوئی ہوئی منزل کا حل تلاش کرتے ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ مسلم امت نے جب بھی اپنے مرکز سے دوری اختیار کی، زوال نے اس کا تعاقب کیا۔ اندلس کے زوال سے لے کر بغداد کی تباہی تک، سلطنتِ عثمانیہ کی کمزوری سے لے کر برصغیر کی سیاسی شکست تک — ہر دور میں ایک ہی درس نمایاں تھا: قومیں اپنے باطن سے غافل ہوں تو بیرونی طاقتیں ان پر مسلط ہو جاتی ہیں۔ اقبالؒ اسی نقطے کی طرف لوٹاتے ہوئے کہتے ہیں:-

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

یہ وہ نکتہ ہے جو امت کو اپنی کھوئی منزل دوبارہ دلانے کا واحد راستہ ہے۔

اگر آج مسلم نوجوان اقبالؒ کے شاہین کو اپنا کردار بنالیں، اپنی خودی کو تعمیر کر لیں، اپنے ایمان کو حرارت دے لیں، اپنی علمی وراثت سے رشتہ جوڑ لیں، اپنی اجتماعی وحدت کو بحال کر لیں، تو دنیا کی طاقتیں ان پر اثر انداز نہیں ہو سکتیں۔ دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ جو قومیں اندر سے مضبوط ہو جائیں، انہیں بیرونی طوفان شکست نہیں دے سکتے۔ اقبالؒ نے اسی یقین کو تاریخ، دین، انسان اور تہذیب کے آئینے میں دیکھ کر کہا تھا:

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

یہ ستارا اگر چمک اٹھے تو عقاب واژدہا کی جنگ میں بھی امت اپنا راستہ خود تراش سکتی ہے اور اقبالؒ کے کلام سے امت مسلمہ ایک نئی صبح کا آغاز کر سکتی ہے۔

اسی فکری پس منظر میں اگر ہم کوئٹہ کے تعمیر نو ٹرسٹ کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی اس سہ روزہ بین الاقوامی کانفرنس کا جائزہ لیں تو حافظ طاہر صاحب—جو کہ ایک سول بیورو کریٹ بطور سیکرٹری حکومت بلوچستان ہیں، کا نام آج کے فکری افق پر ایک مشعل بردار کے طور پر ابھر رہا ہے جنہوں نے اقبالؒ شناسی کی نئی صبح کا سراغ لگانے کا بیڑہ اٹھایا۔ حافظ طاہر صاحب نے اپنے ساتھیوں کی شب و روز محنت کے ساتھ اس عظیم الشان عالمی اقبالؒ کانفرنس کا کیا خوب اہتمام کرتے ہوئے یہ ثابت کر دیا اور ان کے اخلاص اور عزم سے یہ حقیقت اور بھی نمایاں ہو گئی کہ اقبالؒ کی فکر آج بھی زندہ، فعال اور امت مسلمہ کی رہنمائی کیلئے نازک ترین وقت پر سامنے آنے والی روشنی ہے۔

حافظ طاہر صاحب نے گویا اس سچ کو پھر سے نمایاں کر دیا کہ اگر دنیا سیاسی انتشار، تصادم اور فکری گمراہی کے اندھیروں میں گم ہوتی جا رہی ہے تو اس کیلئے اقبالؒ کا پیغام حیات—خودی، عمل، شجاعت اور خدمت انسانیت ایک ایسا چراغ ہے جو اب بھی نئی صبح کا سراغ دے سکتا ہے۔ وہ درودل رکھنے والے ایسے دانشور ہیں جن کے سینے میں اقبالؒ کی فکر کا چراغ ابھی تک پوری آب و تاب سے روشن ہے۔ تعمیر نو ٹرسٹ کوئٹہ کی سرپرستی میں انہوں نے جس عزم اور حوصلے کے ساتھ پہلی بار سہ روزہ بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی، وہ صرف ایک اجتماع نہیں تھا بلکہ اقبالؒ کی فکر کو دوبارہ مرکز گفتگو بنانے کی عملی جدوجہد تھی۔ پاکستان کے گوشے گوشے سے، اور کئی ملکوں سے آنے والے اقبالؒ شناسوں نے اپنے دل کی دھڑکنوں کو ایک صف میں رکھ کر یہ اقرار کیا کہ: آج کے ہنگامہ خیز دور میں اقبالؒ کی ضرورت پہلے سے بڑھ گئی ہے۔

حافظ طاہر صاحب نہ صرف اقبالؒ شناس دانشور ہیں بلکہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کے سینے میں اقبالؒ کی فکر کا وہ تپتا ہوا چراغ موجود ہے جو آج کے فکری اندھیروں میں راستہ دکھاتا ہے۔ ان کی کاوشیں اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہیں کہ اگرچہ ٹیکنالوجی کی برق رفتار ترقی، سیاسی افراتفری اور عالمی سطح پر بڑھتے ہوئے تصادم سے دنیا ایک عجیب بے سمتی کا شکار ہے، لیکن اقبالؒ کی تعلیمات اب بھی امت کو وہ مرکزِ ثقل عطا کر سکتی ہیں جہاں سے اس کی اجتماعی زندگی نئی توانائی حاصل کر سکتی ہے۔

یہ حقیقت قابلِ تحسین ہے کہ کوئٹہ جیسے شہر میں حافظ طاہر صاحب نے اقبالؒ کے شیدائیوں کو جمع کر کے عالمی سطح کی پہلی سہ روزہ کانفرنس منعقد کر کے وقت کی پکار کا بروقت کامیاب جواب دیکر بالعموم پاکستان اور بالخصوص بلوچستان کے نوجوانوں اور مقتدر اداروں کو موجودہ سیاسی ظلمتوں میں روشنی کا وہ چراغ بلند کر کے راستہ دکھایا ہے جس کی اس وقت اہم ضرورت ہے۔ یہ محض انتظامی کامیابی نہیں تھی بلکہ ایک فکری احیاء تھا۔ اس کانفرنس میں پاکستان، ایران، مالدیپ، بنگلہ دیش، عراق، مراکش، وسطی ایشیا اور دیگر عرب دنیا کے اقبالؒ شناسوں نے شرکت کی۔ بنگلہ دیش سے آئے ہوئے محقق اور دانشور نے برملا حالیہ بنگلہ دیش میں آنے والے انقلاب کو اقبالؒ کی تعلیمات سے جوڑتے ہوئے بتایا کہ کس طرح علامہ اقبالؒ کی شاعری نے وہاں کے نوجوانوں کے دلوں کے اندر خودی کا وہ جذبہ پیدا کیا جس نے حسینہ واجد کی ظالم حکومت کو فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اقبالؒ کی فکر آج بھی بین الاقوامی سطح پر زندہ ہے۔ اس اجتماع میں ”تشکیل جدید“، ”جاوید نامہ“، ”اسرار و رموز“، اور ”شعریاتِ اقبال“ پر انتہائی علمی مقالات پیش کیے گئے۔ یہ وہ لمحہ تھا جس میں اقبالؒ کے شاہین کی آواز ایک بار پھر اجتماعی سطح پر سنی گئی۔

اس کانفرنس میں پاکستان سمیت مختلف ممالک کے اقبال شناسوں نے اقبال کے کلام اور افکار پر نہ صرف تحقیق پیش کی بلکہ ”اسرارِ خودی“ (1915) اور ”رموزِ خودی“ (1918) جیسے بنیادی متون کو عصرِ حاضر کے تناظر میں سمجھنے کی نئی جہتیں بھی پیدا کیں۔ ”خطبہ الہ آباد“ (1930) اور ”پس چہ باید کرد“ (1936) کے تاریخی پس منظر کو بھی اس میں خاص اہمیت دی گئی، جن کا بنیادی پیغام یہ ہے کہ مسلمان اگر اپنے فکری مرکز سے جڑ جائیں تو زمانے کی تیز تر تبدیلیاں ان کے رُخ کو موڑنے کی بجائے مضبوط کر دیتی ہیں۔

دنیا کے سیاسی نقشے بدلتے رہیں، طاقتیں ادلتی بدلتی رہیں، مگر اقبال کا شاہین آج بھی ایک زندہ اور جاوید علامت ہے۔ اقبال کا پیغام وقت کے دھارے میں کبھی پرانا نہیں ہوتا۔ آج جب دنیا طاقت کی دو علامتوں — عقاب اور اژدہ — کے بیچ الجھی ہوئی ہے، اقبال کا شاہین قوموں کو بتاتا ہے کہ اصل طاقت درحقیقت روح کی پرواز میں ہے، نہ کہ زمین کی لادین سیاست میں۔ خودداری، ایمان، اخلاق، جرأت اور روحانی بلندی کی علامت۔ جب تک امتِ مسلمہ اس شاہین کی پرواز کو محسوس نہیں کرے گی، اس کی تقدیر دھند لکوں میں لپیٹی رہے گی اور جب یہ پرواز بیدار ہو جائے گی تو نہ عقاب کی جگر باقی رہے گی نہ اژدہ کی حکمت کی ضرورت کیونکہ شاہین کی نگاہ جہاں پہنچتی ہے وہاں دنیا کے سارے سراب ماند پڑ جاتے ہیں۔

یہ کانفرنس اگرچہ اپنے ایام مکمل کر چکی ہے، مگر اس کی فکری چمک ابھی شفق کی طرح آسمانِ اُمت پر پھیل رہی ہے۔ تاہم یہ عظیم الشان بین الاقوامی اجتماع اپنے اختتام پر نہیں — بلکہ ایک نئی صبح کے آغاز پر کھڑا ہے۔ یہ تین دن محض علمی گفتگو نہیں تھے؛ یہ تاریخ کے ساتھ ایک عہدِ نو کی تجدید تھی۔ یہاں پیش کیے گئے افکار میں وہی حرارت تھی جس نے کبھی بدر کے رگزاروں کو طاقت بخشی، وہی بینائی تھی جس نے قسطنطنیہ کے دروازے کھولے، وہی روحانی وقار تھا جس نے غرناطہ کو صدیوں تک جلا بخشی، اور وہی اخلاقی استقامت تھی جو اقبال کے شاہین کو عصرِ حاضر کے عقاب اور اژدہ سے بلند رکھتی ہے۔

عقاب اور اژدہ کی اس بے رحم دنیا میں جہاں طاقت کے بت بلند ہو رہے ہیں اور اخلاق کی بنیادیں لرز رہی ہیں، دنیا کی سیاست آج بھی طاقت کے انہی بُتوں کے گرد گھوم رہی ہے، مگر کونہ کی اس فکری بزم نے اعلان کیا کہ مسلمان کی تقدیر نہ واشنگٹن کی میزوں اور ایوانوں سے لکھی جاتی ہے، نہ بیجنگ کے نقشوں اور حکمتِ عملی سے — امتِ مسلمہ کی اصل توانائی تو اس کے اندر ہے — اس کی خودی میں، اس کی روح کے استقلال میں، اور اس کے ایمان کی وہ حرارت جسے اقبال نے شاہین کی پرواز میں مجسم دیکھا۔ اُس کی تقدیر تو اُس وقت روشن ہوتی ہے جب اُس کے دل میں خودی کی آگ جاگ اٹھتی ہے، جب اُس کی روح میں شاہین کی پرواز تازہ ہو جاتی ہے، جب وہ اقبال کے پیام کو اپنا رہنما بنا لیتا ہے۔

حافظ طاہر صاحب اور تعمیر نو ٹرسٹ کی یہ کوشش صرف ایک علمی کارنامہ نہیں، یہ تاریخ میں گونجتا ہوا وہ نغمہ ہے جو نسلوں کو جگاتا ہے۔ انہوں نے اس کانفرنس کے ذریعے ثابت کر دیا کہ بلوچستان کی سنگلاخ وادیوں میں بھی اقبال کا پیغام اسی طرح گونجتا ہے جیسے کبھی لاہور کی بادشاہی مسجد کے میناروں سے یاد بلی کے کھنڈروں سے گونجا کرتا تھا۔

اور یہ سب کچھ اس لیے ممکن ہوا کہ حافظ طاہر صاحب نے اپنی محبت، اپنی بصیرت اور اپنے خلوص سے اس چراغ کو روشن کیا مگر یہ چراغ فقط اُن کے ہاتھ میں نہیں تھا — یہ اُن کی پوری ٹیم کی شہانہ روزِ محنت، اخلاص، قربانی اور عزم مسلسل کا ثمر تھا۔ ان لوگوں نے کونہ کی وادیوں میں ایسا علمی مینار کھڑا کیا ہے جس کی روشنی اب پورے خطے میں پھیل رہی ہے۔

یہاں پیش کیے گئے مقالات، مکالمے اور فکر کے چراغ اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ اقبال کا شاہین آج بھی اُمت کی پیشانی کا ستارہ بن سکتا ہے۔ اگر ہم اس کی پرواز کا پاس رکھیں۔ دنیا بدل رہی ہے، طاقت کے مراکز تبدیل ہو رہے ہیں، لیکن اقبال کا پیغام نہ کبھی پرانا ہو سके گا۔ جب تک مسلمان نوجوان اپنی خودی کو بیدار نہ کریں، اپنی فکر کو روشن نہ کریں، اور اپنے اخلاق کا نگہبان نہ بنیں، دنیا کے نقشے ان کے خلاف رہیں گے۔ مگر جب ایک باریہ چنگاری بھڑک اٹھتی ہے تو نہ عقاب کے پنچے اسے روک سکتے ہیں نہ اژدہ کی فلسفیانہ پھنکار اسے دھوکہ دے سکتی ہے۔

آخر میں، دعا ہے کہ حافظ طاہر صاحب کی یہ سعی مشکور، یہ شانہ روز محنت، اور یہ عشق و آگہی سے بھرپور خدمتِ اقبال، ان کیلئے دنیا و آخرت کی کامیابیوں کا ذریعہ بنے۔ خدا کرے کہ اس کانفرنس کی روشنی پورے عالم اسلام میں پھیل جائے، نوجوانوں کے دلوں میں خودی کی آگ دھکا دے، اور اقبال کا شاہین ایک بار پھر اُمت کو اس کی کھوئی ہوئی صبح تک پہنچا دے۔ جب تک اقبال کا شاہین زندہ ہے، اُمت کی صبح کبھی نہیں ڈھلتی۔ یہی وہ امید ہے جس پر قوموں کا مستقبل کھڑا ہوتا ہے، اور یہی وہ عہد ہے جو کوئٹہ کی اس عالمی اقبال کانفرنس نے دنیا کے سامنے ایک زندہ حقیقت کی طرح رکھ دیا ہے۔ اور آج—کوئٹہ نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ شاہین اب بھی بیدار ہے، اب بھی اپنی پرواز کا اعلان کر رہا ہے، اور اب بھی نسلوں کے مقدر بدل سکتا ہے۔

حافظ طاہر صاحب جیسے عاشقِ رسول ﷺ دانشور اور تعمیر نو ٹرسٹ کوئٹہ بلوچستان کے تمام اکابرین اس پیغام کو زندہ رکھنے کی جو عملی کوشش کر رہے ہیں، میں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے دعا گو ہوں کہ ان کی یہ شب و روز کی کاوشیں ان کی عقبی و آخرت کی نجات کا وسیلہ بن جائیں اور یہی امید کی وہ کرن ہے جو بتاتی ہے کہ اقبال آج بھی زندہ ہیں، اور ان کا شاہین آج بھی بیداری کی نئی صبح کا پیامبر بن سکتا ہے۔

یہ ٹیم اس قابل ہے کہ اُمتِ مسلمہ ان کا شکریہ ادا کرے، انہیں خراجِ تحسین پیش کرے، اور ان کے اس کارنامے کو نئے فکری احیاء کا مقدمہ سمجھے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حافظ طاہر صاحب اور ان کی پوری ٹیم کے اخلاص کو قبول فرمائے، ان کی کاوشوں کو ان کیلئے دنیا و آخرت کی نجات کا وسیلہ بنائے، اور اس کانفرنس کی روشنی کو ایک ایسے فکری سورج میں بدل دے جو اُمت کے سفرِ جدید کو سمت عطا کرے۔ آمین

بروز جمعۃ المبارک 13 جمادی الثانی 1447ھ 5 دسمبر 2025ء

کابل سے کعبہ تک: ایک رشتہ، ایک آزمائش

تاریخ کے صفحات میں کچھ ابواب ایسے ہوتے ہیں جنہیں وقت کی گرد بھی مٹا نہیں سکتی۔ پاک افغان رشتہ بھی انہی ابواب میں سے ایک ہے۔ یہ رشتہ مذہب، اخوت، قربت اور مشترکہ دکھوں کے سنگم سے بندھا ہوا ہے مگر افسوس، یہ برادرانہ داستان آج شکوؤں، زخموں اور بے یقینی میں لپٹی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

1979ء میں جب روسی افواج نے افغانستان پر چڑھائی کی، تو پوری دنیا خاموش تماشائی بنی بیٹھی تھی مگر ایک ملک تھا۔ پاکستان۔ جس نے اپنے دروازے، دل اور دامن افغان بھائیوں کیلئے کھول دیے۔ 40 سال سے زیادہ عرصہ، پاکستان نے 50 لاکھ سے زائد افغان مہاجرین کو پناہ دی؛ اپنے شہروں، روزگار، زمین اور وسائل ان کے نام کر دیے۔

افغان جہاد کے دنوں میں پاکستان نے نہ صرف اپنی سلامتی کو داؤ پر لگایا بلکہ ایک سپریم مشن کے تحت اسلامی دنیا کی نمائندگی کا بوجھ بھی اٹھایا۔ لاکھوں پاکستانیوں نے جانیں قربان کیں، اور قوم نے اپنی معیشت پر بھاری بوجھ برداشت کیا۔ مگر مقصد ایک ہی تھا "افغان بھائیوں کو آزادی ملے، ان کی خود مختاری بحال ہو، اور روسی جارحیت کا باب بند ہو۔ یہ قربانی تاریخ کے کسی ترازو میں نہیں تولی جاسکتی۔

تاریخ کے اوراق میں کچھ واقعات ایسے ہوتے ہیں جو صرف ماضی نہیں بلکہ پوری قوم کے جذبات کے آئینہ دار بن جاتے ہیں۔ افغانستان اور پاکستان کا رشتہ انہی واقعات سے بنا ہے۔ وہ رشتہ جو ایمان، جہاد، قربانی اور برادرانہ اخوت کے دھاگوں سے پرویا گیا تھا۔ جب 1979ء میں روسی افواج نے افغانستان کی مقدس وادیوں پر اپنے ناپاک قدم دھرے، تو عالم اسلام خاموش تھا مگر پاکستان بیدار تھا۔ اس نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ اپنی معیشت، اپنی سرحدیں، اپنا امن، بلکہ اپنی آئندہ نسلوں کی خوشیاں بھی، صرف اس لیے کہ کابل آزاد ہو، افغان سر اٹھا کر جی سکیں، اور اسلام کا پرچم سرحدوں سے بلند ہو۔

چالیس برس ہونے کو آئے، پاکستان نے 50 لاکھ افغان مہاجرین کو اپنی گود میں جگہ دی، سینے سے لگایا، ان کیلئے اپنی زمین بانٹی، اپنے بازاروں کے در کھولے، اور اپنے لوگوں کے خون سے ان کے امن کی بنیاد رکھی۔ دنیا کے کسی اور ملک نے اتنا صبر، اتنی قربانی، اور اتنا خلوص نہیں دکھایا جتنا پاکستان نے دکھایا۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ۔۔ بے شک تمام مؤمن آپس میں بھائی ہیں۔ (الحجرات: 10)

یہ آیت پاکستان کے ایمان کا اعلان بنی۔ اسی روح اخوت کے تحت پاکستان نے افغان دھڑوں کو باہم جوڑنے کی کوشش کی چاہے وہ پشاور کا اجلاس ہو، مکہ مکرمہ کا معاہدہ ہو، یا اسلام آباد کی کانفرنسیں، پاکستان ہمیشہ صلح کا سفیر اور امید کا پل بن کر سامنے آیا۔

1979ء میں سوویت انخلاء کے بعد (یا اس کے دوران) افغانستان میں مختلف مقامی دھڑوں نے ایک طویل جہادی عمل چلایا۔ ان دھڑوں میں نسل، لسانی اور سیاسی اختلافات کی بنیاد پر کئی گروہ وجود میں آئے اور جب 1989-1992 کے بعد کابل سے سوویت حمایت یافتہ حکومت کی طاقت کم

پڑی، تو اختلافات ظہور عام پر آئے اور سیاسی خلاء نے مسلح گروہوں کے درمیان طاقت کے عارضی کھیل کو جنم دیا۔ یہ وہ مرحلہ تھا جب بظاہر ”اتحاد جہاد“ رفتہ رفتہ خانہ جنگی اور اقتدار تک رسائی کی خانہ جنگی میں تبدیل ہو گیا۔

تاریخ گواہ ہے کہ جب روسی افواج اپنی 10 سالہ جارحیت کے بعد 15 / فروری 1989ء کو پسپا ہوئیں تو پوری امت کی نظریں کابل پر تھیں تھیں۔ دنیا نے سمجھا کہ اب افغانستان میں امن لوٹ آئے گا۔ افغان مجاہدین نے، جو ایک وقت میں ایک جھنڈے تلے لڑتے تھے، اقتدار کے سوال پر بکھرنا شروع کیا۔ پاکستان نے، دل میں بے پناہ امید کے ساتھ، انہیں پھر سے اکٹھا کرنے کی کوشش کی۔

سب سے معتبر اور دستاویزی معاہدہ جس کا حوالہ بین الاقوامی تاریخ اور پالیسی ریپوزیٹریز میں ملتا ہے، وہ 24 / 26 اپریل 1992ء کا پشاور معاہدہ ہے جو مختلف مجاہدین / مسلح گروہوں کے مابین ایک عبوری انتظام قائم کرنے کیلئے طے پایا تھا۔ اسی امید کے ساتھ مختلف افغان جہادی تنظیمیں پشاور میں اکٹھی ہوئیں کہ اب جہاد کے ثمرات کو ضائع ہونے سے بچایا جاسکے۔ پشاور معاہدہ اسی امید کا نتیجہ تھا۔ اس معاہدے کے تحت طے پایا کہ اقتدار کسی ایک گروہ کا نہیں ہوگا، بلکہ تمام مجاہدین مل کر ایک عبوری اسلامی حکومت تشکیل دیں گے۔ اور افغانستان کا نظام شورائی اور اسلامی بنیادوں پر قائم ہوگا۔

پھر وہ یادگار لمحہ آیا جب اللہ کے گھر خانہ کعبہ کے سائے میں، افغان دھڑوں کے رہنما جمع ہوئے اور انہوں نے حلف اٹھایا کہ اب کبھی اقتدار کی خاطر خون نہیں بہائیں گے، وہ معاہدہ — چاہے علامتی یا حقیقی — اسلامی اتحاد کی آخری علامت تھا۔ مکہ مکرمہ کے مقدس ماحول میں، اللہ کے گھر کے سامنے، وعدہ کیا گیا کہ اب افغان ایک دوسرے کے خلاف نہیں لڑیں گے۔ اب افغانستان کے آسمان پر صرف امن کا پرچم لہرائے گا۔ اس میں عبوری صدارتی مدت، عبوری کونسل اور طاقت کی تقسیم کے خاکے طے کیے گئے؛ صبغت اللہ مجددی، برہان الدین ربانی اور احمد شاہ مسعود جیسے نام اس امید کے مرکز بنے۔ عبوری صدارتی مدت میں، احمد شاہ مسعود کو عبوری وزیر دفاع مقرر کیا گیا، اور صبغت اللہ مجددی / ربانی جیسے نام عبوری نقاط تسلسل کیلئے طے کیے گئے۔ یہ معاہدہ رسمی طور پر اس بات کی کوشش تھا کہ کمیونسٹ دور کے خاتمے کے بعد ایک مشترکہ عبوری انتظام قائم ہو سکے۔

مگر تاریخ نے دیکھا کہ وہ قسمیں زیادہ دیر قائم نہ رہ سکیں۔ اقتدار کی ہوس، بیرونی اثرات، اور ذاتی مفادات نے اس مقدس وعدے کو پھر سے خون میں نہلا دیا۔ خانہ کعبہ میں لیا گیا عہد کابل کی گلیوں میں دفن ہو گیا۔ اقتدار کی ہوس، بیرونی مداخلت، نسلی تقسیم اور ذاتی مفادات نے ایک بار پھر وطن عزیز کو خون میں نہلا دیا۔ کابل کی گلیاں، جو کبھی جہاد کی کامیابی کی گواہ تھیں، خانہ جنگی کی خاک میں اٹ گئیں۔

افغان دھڑے ہمیشہ وقتی اتحاد اور وقتی مفادات کے گرد جمع ہوئے۔ جب بھی اقتدار کی کشمکش بڑھی، ہر وعدہ، ہر قسم اور ہر عہد طاقت کے دھوئیں میں گم ہو گیا۔ دستاویزی ریکارڈ اور انسانی حقوق کی رپورٹس واضح کرتی ہیں کہ یہ معاہدہ بہت جلد عملی معنوں میں ناکام رہا۔ مختلف کمانڈر، نے طاقت کے حصول کیلئے اس معاہدے کی نفی کی یا مخالفت کی؛ نتیجتاً کابل میں مسلح جھڑپیں اور قتل و غارت گری شروع ہو گئی، اور معاہدے کے نفاذ کے وعدے پس منظر میں رہ گئے۔ یہ سارے واقعات بعد ازاں ایک طویل اندرونی تنازع اور شہری جنگ کی شکل میں تبدیل ہو گئے۔

معاہدے کے ناکام ہونے کے کئی باہمی اور خارجی عوامل تھے؛ اہم شعبے یہ رہے کہ دھڑوں کا علاقائی مضبوط ہونا مجاہدین کے یکجہا سیاسی پارٹی بنانے میں مانع رہا؛ ہر کمانڈر کا اپنا علاقائی و قبائلی اثر، وسائل اور حمایتی نیٹ ورک تھا۔ پھر باہمی عدم اعتماد اور مضبوط ذاتی مفادات کی بناء پر کئی رہنماؤں نے اقتدار کی مکمل طلب رکھی؛ اس نے فوراً نفاذ شدہ شیئرنگ ایگریمنٹ کو نقصان پہنچایا۔ بیرونی مداخلت اور علاقائی اثر کار یعنی ایران، سعودی عرب، پاکستان،



اور دیگر قوتوں کے حمایتی اثرات نے مصالحتی کوششوں کو پیچیدہ بنا دیا؛ کچھ گروپوں کو بیرونی امداد اور پشت پناہی ملی جس نے داخلی بیلنس بدل دیا۔ مختلف گروپوں کے پاس مواد، زمینی طاقت اور فنڈنگ تھی، اسلحہ، وسائل اور مسلح گروہ جس نے انہیں معاہدہ توڑ کر عملی طور پر قبضہ کی راہ اپنانے کے قابل بنادیا۔ ان عوامل کے نتیجے میں معاہدے رسمی طور پر تو مورخوں کے صفحات میں موجود رہے، مگر حقیقت میں گلی و محلہ میں خونریز مقابلے جاری رہے۔

اور ہر فریق نے دوسرے پر دھوکہ، قتل عام، اور وعدہ شکنی کے الزامات لگائے۔ انسانی حقوق رپورٹس نے بھی اسی کشاکش اور شہری آبادی پر ہونے والے مظالم کی نشاندہی کی ہے۔

زمینی حقائق یہ ہیں کہ تمام مجاہدین گروپ پشاور معاہدہ کو عملی جامہ نہ پہنا سکے، فریقین کے بیانات اور الزام تراشی کا خوفناک منظر نامہ یوں سامنے آیا کہ ہر گروپ نے دوسروں کو معاہدہ توڑنے کی سرکردگی پر الزامات لگائے؛ خاص طور پر شہر کابل میں گھناؤنی لڑائیاں شروع ہوئیں۔ شیعہ و سنی محاذ، کابل کے مختلف اضلاع پر قبضے کی کوشش، اور شہری آبادی کو جو نقصان پہنچا، اس کا الزام ایک دوسرے پر لگایا گیا۔ مقامی اور بین الاقوامی مبصرین نے لکھا کہ الزامات اکثر حقیقت اور پروپیگنڈا کے امتزاج تھے۔ فریقین اپنی نااہلی یا داخلی خلفشار چھپانے کیلئے سیاسی مہر لگاتے رہے، اور عوامی رائے کو اپنی جانب مبذول کرانے کی کوشش کی گئی۔

پاکستان نے دکھ سے دیکھا، وہ، جو سب کا خیر خواہ تھا، اب تماشائی بننے پر مجبور ہو گیا۔ اسلامی دنیا کے دیگر ممالک، جو کبھی افغان جہاد کے حامی تھے، اس انتشار سے افسردہ ہو کر خاموشی اختیار کر گئے مگر پاکستان؟ نہیں۔ وہ پیچھے نہیں ہٹا۔ وہی زخمی ہاتھ، وہی تھکا ہوا دل، مگر وہ اب بھی افغان بھائیوں کی پشت پر کھڑا رہا، امن کے پیغامبر کی طرح، قربانی کے علمبردار کی طرح۔

یہاں تاریخی دامن کے اس سچ سے آنکھیں نہیں چرائی جاسکتیں کہ پاکستان وہ واحد ملک تھا جو افغان عوام کے دکھوں کا حصہ بنا رہا۔ پاکستان کے صبر، مستقل مزاجی اور افغانوں کے رویے کے باوجود دنیا نے جب افغانستان سے منہ موڑا، تو پاکستان وہ واحد ملک تھا جس نے امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ ہم نے ان کیلئے اپنی معیشت کو قربان کیا، ان کے مہاجرین کو سنبھالا، ان کے زخمیوں کا علاج کیا، اور ان کے مستقبل کیلئے دعا کی مگر وقت کی ستم ظریفی یہ ہے کہ آج وہی افغان قیادت، بھارت جیسے ازلی دشمن کے بہکاوے میں آکر، پاکستان پر الزامات کی بوچھاڑ کر رہی ہے۔ جن ہاتھوں نے پناہ دی، اب انہی پر شک کی انگلیاں اٹھ رہی ہیں۔ اور اس سب کے باوجود پاکستان کا رویہ وہی ہے بردباری، صبر اور امن کی خواہش۔

پاکستان نے اپنے زخموں کو چھپایا مگر افغان قیادت نے شاید یہ قربانیاں بھلا دیں۔ آج جب پاکستان دہشتگردی، معیشت اور سرحدی مسائل کے بھاری دباؤ میں ہے، تو اسی افغان سرزمین سے دشمنی کے تیر بر سائے جارہے ہیں۔ کبھی ٹی ٹی پی کے حملے، کبھی افغان حکومت کا خاموش تعاون، اور کبھی بھارت کے ساتھ سفارتی قربت پاکستان کیلئے ایک گہرا زخم ہیں۔ یہ کیسی ناقدری ہے کہ جس ملک نے چالیس برس افغان بھائیوں کیلئے ماں کی طرح سینہ کھولا، آج وہی ملک ان کے طعنوں کا نشانہ بن رہا ہے؟ کیا یہ اسلامی اخوت کا صلہ ہے؟ کیا خانہ کعبہ کے سامنے اٹھائی گئی قسمیں بھول گئیں؟ کیا تاریخی میزبانی

، وہ قربانیاں، اور وہ اخلاص مٹی کے برابر بھی نہیں رہے؟
 "وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلَامِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ".

اور اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کی طرف مائل ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔ (الانفال: 61)
 پاکستان نے ہمیشہ اس قرآنی اصول پر عمل کیا کہ جنگ نہیں، امن بہتر ہے؛

اور اس وقت ایک تلخ مگر مشہور محاورہ تاریخ میں نقش ہوا۔ جو آج بھی افغان سیاست کی نفسیات بیان کرتا ہے:
 ”آپ افغانوں کو خرید نہیں سکتے، مگر ان کی خدمات کرایے پر لے سکتے ہیں۔“ یہ جملہ چاہے کسی نے کہا یا نہ کہا ہو، مگر اس میں ایک گہری سچائی چھپی ہے۔
 یہ فقرہ اکثر عوامی محاورے یا مباحث میں ہلکی تبدیلیوں کے ساتھ آتا ہے، اور بعض سوشل پوسٹس یا اقوال مرکب میں کئی افغان رہنماؤں سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس کے پس منظر، صورتِ تعبیر اور نسبت کے بارے میں چند باتیں واضح کرنا ضروری ہیں:
 یہ محاورہ / کہادت بین الاقوامی اور استعماری تاریخ میں چلتی رہی۔ انگریز اور بعد کے بیرونی مداخلت کنندگان کے تجربات سے جڑا ایک عوامی محاورہ یہ رہا کہ قبیلوں یا مقامی جنگجوؤں کی وفاداری مستقل نہیں ہوتی؛ لہذا بیرونی حکومتیں انہیں ”خرید“ نہیں سکتیں، محض عارضی طور پر پیسے یا مدد دے کر ”کرایے“ پر سروس حاصل کر لیتی ہیں۔ کئی مغربی تجزیاتی مضامین اور تاریخ دان اس جملے کو حوالہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

یہ کہادت ایک تلخ حقیقت کی عکاسی کرتی ہے۔ یعنی بیرونی طاقتیں وقتی مفاد کیلئے مقامی گروہوں کو مالی و عسکری مدد دیتی ہیں، مگر مستقل وفاداری اور ملکی مفاد کا حصول ان پیسوں سے ممکن نہیں۔ اس سہولت کرایے پر بر مبنی تعلق نے افغانستان میں متعدد ادوار میں جہادی کمانڈروں کو غلط طریقے سے مسلح کر کے طویل، غیر منظم تشدد کو ہوا دی۔ اور آج موجودہ طالبان رجیم نے بھارت کی گود میں بیٹھ کر ان کے ایجنڈے کو جو گلے لگایا ہے، ملا متقی کا دورہ ہند میں طالبان کے بانی اور روحانی رہنماء ملا عمر کے اقوال کے جس طرح پر نچے اڑائے ہیں، اس کے بعد کثرتِ اذہان تو اس کہادت پر یقین کرنے لگے ہیں۔

افغان تاریخ ہمیں ایک سبق دیتی ہے کہ طاقت کے حصول کی جنگ میں ایمان، وعدے اور دوستی قربان ہو جاتے ہیں۔ وفاداری، بھائی چارے کے شگوفے باہمی احترام سے پھوٹتے ہیں، پاکستان کا شکوہ محض سیاسی نہیں، ایک جذباتی زخم ہے۔ مگر پاکستان آج بھی یہی کہتا ہے کہ امن کا راستہ جنگ سے نہیں، ہم نے افغان بھائیوں کو کبھی غیر نہیں سمجھا، مگر ان کے رویے نے ہمیں خود پر نظر ثانی پر مجبور کر دیا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ کابل یہ مانے کہ پاکستان دشمن نہیں، بلکہ وہ واحد ملک ہے جس نے ہر طوفان میں افغان قوم کا ہاتھ تھاما اور اگر آج افغانستان اپنی زمین بھارت جیسے ازلی دشمن کیلئے نرم گوشہ رکھے اور پاکستان کیلئے شک و شبہات تو یہ محض سیاسی غلطی نہیں، بلکہ اخوتِ اسلامی کے تصور پر ایک کاری ضرب ہے۔

چالیس برس کی قربانیاں، لاکھوں جانوں کی قیمت، اربوں روپے کی میزبانی، یہ سب پاکستان کی تاریخ کے ماتھے کا جھومر ہیں۔ ہم نے افغانوں کیلئے خون بھی بہایا اور اشک بھی بہائے۔ ہم نے دنیا کے طعنوں کے باوجود ان کا ساتھ نہیں چھوڑا، اور آج جب افغان قیادت بھارت کی بانہوں میں جا بیٹھی ہے، پاکستان کا دل زخمی ضرور ہے، مگر خالی نہیں۔ اس کے دل میں آج بھی امید کا چراغ جل رہا ہے۔ یہ چراغ آج بھی اپنے افغان بھائیوں سے کہتا ہے: ہم نے تمہیں کبھی دشمن نہیں سمجھا۔ ہم نے تمہیں اپنے دل کا حصہ جانا۔ اگر تم بھٹک گئے ہو تو ہم شکوہ ضرور کریں گے، مگر نفرت کبھی نہیں کریں گے۔
 پاکستان آج بھی وہی ہے جو خانہ کعبہ کے سائے میں امن کی قسم کھانے والوں کو جوڑنے والا ملک تھا۔ جو تب بھی بھائیوں کے درمیان پل تھا، اور آج بھی ان کے بیچ امن، اخوت اور ایمان کا رشتہ بنائے رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

کاش ایک دن تاریخ پھر وہی منظر دیکھے جب کابل کی فضاؤں میں توپوں کی گھن گرج نہیں، بلکہ اذانوں کی صدا گونجے۔ اور مکہ میں اٹھائی گئی قسم، افغانستان کے امن کی بنیاد بن جائے۔ بھائی چارے کا وہ خواب جو مجھ جیسے بے شمار افراد نے دیکھا ہے کاش ایک دن پھر وہی منظر لوٹ آئے جب افغان مجاہدین خانہ کعبہ کے سائے میں حلف اٹھا رہے تھے، اور پاکستان ان کے پیچھے دعا گو تھا۔

کاش ایک دن دونوں برادر ممالک دوبارہ ایک دوسرے کو دشمنوں کی آنکھ سے نہیں، امت مسلمہ کے آئینے میں دیکھیں۔ افغانستان کو یاد رکھنا چاہیے کہ پاکستان کی قربانیاں تاریخ کے دامن میں محفوظ ہیں۔ اور پاکستان کو بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اخوت کبھی یک طرفہ نہیں رہ سکتی۔ امن کی امید، ٹھکڑے کی چھن، اور بھائی چارے کا خواب — یہی ہماری کہانی ہے۔ یہی پیغام ہے، یہی خواب اور یہی پاکستان کی ابدی پکار۔

بروز منگل 17 جمادی الثانی 1447ھ 9 دسمبر 2025ء

سیاسی خواب، تاریخی زخم

کشمیر کا مسئلہ برصغیر کے دو اہم ممالک، پاکستان اور بھارت، کے درمیان ایک دیرینہ اور پیچیدہ تنازع ہے، جس پر وقتاً فوقتاً عالمی قوتوں کی توجہ رہی اور کبھی محض تماشائی کی حیثیت سے ہے۔ ان میں سرفہرست امریکا ہے، جو کبھی ثالثی کے روپ میں، کبھی سٹریٹیجک شراکت دار کے طور پر، کردار ادا کرتا رہا ہے۔ یہ مقالہ اس تاریخی پس منظر کو بیان کرتا ہے جس میں امریکا کی ثالثی کی پیشکشیں، پاکستانی ریاست کی توقعات، اور ان کے نتائج کا گہرا تجزیہ شامل ہے۔

تاریخ ایک خاموش مؤرخ ہے جو کبھی جھوٹ نہیں بولتی، بشرطیکہ اسے سننے والا اہل فکر و دانش ہو۔ جنوبی ایشیا کی سیاسی تاریخ، بالخصوص پاکستان اور بھارت کے باہمی تنازعات کے تناظر میں، امریکی کردار ایک ایسا باب ہے جو بارہا امید کے سراب میں لپٹا، مایوسی کی دھند میں گم ہو کر ابھرتا رہا ہے۔ یہ رپورٹ اس تاریخ کے پیچ و خم کو بیان کرتی ہے جو امریکی ثالثی، پاکستانی توقعات، اور بھارتی مصلحتوں کے بیچ الجھی ہوئی ہے۔

تاریخ اس بات کی بھی چشم دید گواہ ہے کہ عالمی سیاست میں کوئی مستقل دوست یا دشمن نہیں ہوتا، مفاد ہی اصل میزان ہے۔ مگر اگر اس کسوٹی پر دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت اور طاقتور ریاست یعنی امریکا کو پرکھا جائے، تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ امریکا اپنے مفادات کے حصول کے بعد انہی دوستوں کی قربانی دینے میں دیر نہیں لگاتا جنہوں نے اُس کیلئے خطرات مول لیے ہوتے ہیں۔

دنیا کی سفارتی بساط پر بعض چالیں شطرنج سے بھی زیادہ مہلک اور پیچیدہ ہوتی ہیں۔ جب امریکا جیسا سوداگر امن، اپنے ہاتھ میں مفادات کی ترازو و تھام کر ثالثی کا لبادہ اوڑھتا ہے، تو مظلوم کو بسا اوقات وہی کچھ ملتا ہے جو ذی روح کو کسی بے ضمیر تاجر کی تجویز کردہ سوداگری میں نصیب ہوتا ہے: "چپ رہو، زمین دے دو، باقی ہم دیکھ لیں گے۔"

اہل نظر جانتے ہیں کہ برصغیر کی تاریخ کا ہر ورق اس المناک حقیقت سے لبریز ہے کہ پاکستان نے جب جب امریکا کی جانب اُمید و استقامت کے چراغ جلانے، تو ہوا کا رخ یوں بدلا کہ نہ چراغ بچے نہ تیل۔ ماضی کا ہر سنگ میل گواہ ہے کہ ہم نے ہر مرتبہ انکل سام کے دل لبھانے کیلئے اپنا تن، من، دھن پیش کیا، اور جب صلہ مانگا تو کچھ جملہ معترضہ اور چند 'مشورے' ہاتھ آئے۔

یادش بخیر، 1962 کی خزاں میں جب ہمالیہ کی چوٹیوں پر ہندوستان اور چین کی توپیں گرج رہی تھیں، تو عقل و تدبر کی بعض جگنو صفت آوازیں پاکستان کے ایوانِ اقتدار میں یہ کہہ کر ابھریں کہ "اب وقت ہے، کشمیر حاصل کرنے کا"، دانش مندی نے بھی بارہا اکسایا کہ انڈیا اور چین کی 1962 کی جنگ پاکستان کیلئے ایک سنہری موقع تھا کہ وہ کشمیر پر کوئی فیصلہ کن قدم اٹھا سکے۔ اور کئی عسکری ماہرین اور سیاسی مبصرین نے اس وقت پاکستان کی عسکری قیادت کو مشورہ دیا کہ یہ وقت بھارت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر کشمیر کی بازیابی کا ہے۔

شنید یہ بھی ہے کہ چین کی طرف سے بھی خاموش سفارت کاری کے ذریعے اس پیش بہا قیامی لمحات سے فائدہ اٹھانے کا پیغام بھی دیا گیا مگر اُس وقت خود ساختہ فیلڈ مارشل ایوب خان نے امریکا کی کینیڈی انتظامیہ کی یقین دہانیوں پر بھروسہ کرتے ہوئے غیر جانبداری اختیار کی، یہ سوچ کر کہ کل کینیڈی

ثالث بنے گا، انصاف کی میزان تھامے گا اور کشمیر ہمارے ہاتھ آجائے گا۔ ثالثی کر کے پاکستان کے حق میں فیصلہ کرے گا اور یوں خود ساختہ فیلڈ مارشل ایوب خان نے ناقابل معافی فحش اور ظالمانہ غلطی کر کے واشنگٹن کے وعدہ فردا پر یقین کرتے ہوئے بدوق نیام میں ڈال دی۔ مگر تاریخ نے یہ دکھایا کہ امریکا نے یہ وعدہ کبھی وفا نہیں کیا۔ لیکن نتیجہ؟ امریکی ثالثی ایک خواب نکلی جو آنکھ کھلتے ہی بکھر گیا۔ اس طرح 1962 کی انڈیا-چین جنگ کے بعد پاکستان کی بے سود امیدیں آج بھی پاکستان کے مقتدر کے ایوانوں کی نالائقیوں کا نوحوہ پڑھ رہی ہیں۔

1950ء کی دہائی میں پاکستان نے امریکا کے ساتھ سیٹو اور سینو جیسے دفاعی معاہدوں میں شمولیت اختیار کی۔ ان معاہدات کے تحت پاکستان کو فوجی امداد تو ملی، مگر یہ امداد صرف کمیونسٹ خطرات سے نبٹنے کیلئے مخصوص تھی، نہ کہ بھارت جیسے علاقائی حریف کے خلاف۔ 1959ء کا دفاعی معاہدہ بھی اسی سلسلے کی کڑی تھا جس میں کمیونسٹ ممالک سے تحفظ کا وعدہ تو تھا مگر عملی فائدہ صفر رہا۔ گویا پاکستان کیلئے امریکا کے ساتھ یہ دفاعی معاہدے ایک ایسے یکطرفہ نفع کی شکل اختیار کر گئے جس کا مکمل فائدہ امریکا کے حق میں تھا۔

تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے کہ امریکا اپنے مفادات کی تکمیل کے بعد انہی دوستوں کی قربانی دینے میں لمحہ بھر کی تاخیر نہیں کرتا جنہوں نے اس کی جنگوں اور جارحانہ عزائم کو اخلاقی، عسکری اور سفارتی مدد فراہم کی ہوتی ہے۔ پاکستان اس تلخ تجربے سے سب سے زیادہ گزرا ہے۔ 1950ء کی دہائی میں سیٹو اور سینو کے خواب دکھا کر پاکستان کو ایک ایسے راستے پر گامزن کیا گیا جہاں منزل محض ایک سراب تھی۔ دفاعی معاہدات کی چھتری تلے سوویت مخالف اقدامات کیلئے پاکستان کو آلہ کار بنایا گیا۔

مگر پھر جب 1965ء کی جنگ میں ہم نے اپنی سرزمین کے دفاع کیلئے اسلحہ اٹھایا، تو امریکا نے وہی مہیا کردہ ہتھیار بند کر دیے۔ امریکا نے واضح کیا کہ فراہم کردہ دفاعی ساز و سامان بھارت کے خلاف استعمال کیلئے نہیں دیا گیا تھا جبکہ 1965ء کی جنگ میں امریکا سے عملی مدد کی امید کی گئی تو ہتھیاروں کی فراہمی روک کر امریکا نے پاکستان کو اس غلط فہمی سے نکال دیا کہ وہ کبھی بھارت کے خلاف پاکستان کا مددگار ہو سکتا ہے۔ تاریخ نے ان سنگین لمحات کو اپنے سینے میں محفوظ کر لیا ہے جب پاکستان کو بتایا گیا کہ "یہ تمہیں کمیونسٹوں سے بچانے کیلئے دیے تھے، دہلی سے نہیں!" اب یہ کوئی نئی بات تو نہ تھی، مگر ہماری امیدیں ہمیشہ وفا کی قاصد رہیں، بھلے وفا کا مسکن واشنگٹن کی پالیسیوں میں کبھی نہ ملا۔ تاہم ایوب خان کو کینیڈی انتظامیہ نے یہ تاثر ضرور دیا کہ بھارت کے خلاف کوئی عسکری اقدام غیر ضروری ہے، اور وہ ثالثی کا کردار سنجیدگی سے ادا کریں گے۔ نتیجہ؟ مسئلہ وہیں کا وہیں رہا۔ یہ پاکستان کیلئے ایک تلخ یاد دہانی تھی کہ وہ امریکا کے مفادات کا مہرہ رہا ہے، نہ کہ ایک خود مختار سٹریٹیجک حلیف۔

پھر جب 1971ء کی شام ستم ڈھا کہ میں ڈھلی، تو زخم خوردہ ریاست کو نہ صرف آدھا وجود گونا گونا پڑا بلکہ جنگی قیدیوں کی رہائی کی قیمت میں شملہ معاہدے کی وہ شق مانی پڑی جس نے اقوام متحدہ کی کشمیر کے حق میں منظور کردہ قراردادوں کو تاریخ کی الماری میں بند کر کے اُس پر دھول چڑھنے دی۔ کیا یہ سیاسی حکمت تھی یا مجبوری کی معذرت؟ تاریخ کے ہر مؤرخ کا قلم مختلف جواب دے گا، مگر ہر جواب میں پاکستان کی تنہائی ضرور ہوگی اور اس میں قصور وار ہمارے مقتدر افراد ہی نظر آتے ہیں۔

تاہم یہ حقیقت ہے کہ اس معاہدے میں بھارت کا پلہ اس لئے بھاری رہا کہ اس کے پاس ہمارے کئی ہزار سولیلین سمیت فوجی جنگی قیدی کے طور پر موجود تھے اور دشمن نے اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے شملہ معاہدے میں یہ شرط ڈال دی کہ تمام تنازعات، بشمول کشمیر، دو طرفہ بنیاد پر حل کیے جائیں

گے۔ اس شق نے اقوام متحدہ کی کشمیر پر منظور شدہ قراردادوں کی حیثیت کو کمزور تو کر دیا لیکن ختم نہیں کر سکا، یقیناً یہ پاکستان کا ایک سفارتی نقصان یا مجبوری کہا جاسکتا تھا۔

یاد رہے کہ 1970ء میں بچی خان نے چین اور امریکا کے تعلقات بحال کرانے میں کلیدی کردار ادا کیا تھا مگر اس کی 'اجرت' نہ کشمیر کی صورت میں ملی، نہ مشرقی پاکستان کے تحفظ کی صورت میں۔ نتیجتاً 1971 کی جنگ میں نہ صرف پاکستان دولخت ہوا بلکہ شملہ معاہدے کی وہ شق بھی مانی گئی جس نے اقوام متحدہ کی کشمیر پر قراردادوں کی اہمیت ختم کر دی۔ بھٹو کی سفارتکاری کو عظیم کامیابی کے طور پر پیش کیا گیا مگر وقت نے بتایا کہ اصل کامیابی کاغذ پر تھی، زمینی حقائق میں نہیں۔

1999 کی کارگل جنگ میں بھی پاکستان کو بالآخر امریکا ہی کے دباؤ پر پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ اس جنگ کے دوران دونوں ممالک ایٹمی قوتیں بن چکے تھے، اور امریکا نے ایک بار پھر 'امن' کے نام پر پاکستان کو روکا جبکہ بھارت کی بالواسطہ حمایت جاری رہی۔ نائن الیون کے بعد فاسق کمانڈو مشرف ایک ہی امریکی فون کال پر ڈھیر ہو گیا اور پاکستان نے دہشتگردی کے خلاف جنگ میں امریکا کا اس طرح ساتھ دیا کہ باقاعدہ طور پر دو ملکی ایئر پورٹ امریکا کے حوالے کر دیئے گئے جہاں پاکستانی ادارے کے کسی بھی فرد کو داخلہ کی بھی اجازت نہیں تھی۔ انہی ایئر پورٹس سے امریکی رپورٹ کے مطابق افغانستان پر 57 ہزار فضائی حملے کئے گئے اور تورابور پر بھی مینی ایٹم بم گرانے کیلئے بھی ارض و وطن کے انہی ہوائی اڈوں کو استعمال کیا گیا۔ رسد، انٹیلیجنس، اور زمینی تعاون کے عوض کچھ مالی امداد تو ملی، امریکا کی طرف سے قراردادیں گئی اس دہشتگردی کی جنگ میں پاکستان نے ستر ہزار سے زائد جانیں اور ایک اندازے کے مطابق 110 / ارب ڈالر کا معاشی نقصان بھی برداشت کرنا پڑا اور کئی لاکھ افغانوں کا بوجھ بھی اپنی معیشت پر لا دیا کہ امریکا کو خوش کرنے کی ناکام کوششیں جاری رہیں۔ جبکہ دوسری طرف، امریکا نے بھارت کے ساتھ سول نیوکلیئر معاہدہ کیا اور سٹریٹجک شراکت داری کو مضبوط کیا اور اب تک امریکی تعاون اور پشت پناہی کی بناء پر بھارت پاکستان میں دہشتگردی کی کاروائیوں میں ملوث ہے جس کے درجنوں مرتبہ اقوام عالم کے علاوہ اقوام متحدہ کو ٹھوس شواہد اور ثبوت بھی مہیا کئے گئے لیکن ابھی تک امریکا کی سرپرستی میں چلنے والی لونڈی کا کردار ادا کرنے والی اقوام متحدہ اپنے کردار نبھانے سے منہ موڑ چکی ہے۔

2019 میں جب ٹرمپ، کشمیر پر ثالثی کا عندیہ دے کر وزیراعظم عمران خان کو چکمہ دیا کہ تم ایک مرتبہ پھر 'کرکٹ ورلڈ کپ' کی جیت جیسی خوشی قوم کو دے سکتے ہو اور عمران نے ٹرمپ کی جانب سے ثالثی کی پیشکش کو امید کی کرن سمجھا۔ تاریخ نے ایک بار پھر ہمارے دروازے پر دستک دی لیکن قصر سفید کے فرعون ٹرمپ نے عمران خان پر واضح کر دیا کہ کشمیر پر مودی کو یکطرفہ چیک کیش کروانے کی اجازت دے دی گئی ہے اور اب یہ تمہارا کام ہے کہ اپنے اقتدار میں رہنے کیلئے اپنی قوم کے ساتھ کیا ڈرامہ رچانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عمران خان نے اپنے اقتدار کے دوام کو اس لئے بھی ترجیح دی کہ اس وقت کا فوجی سپہ سالار قمر باجوہ کو بھی سینٹا گون نے اپنے ہاں بلا کر بظاہر 18 گز کا سیلوٹ پیش کر کے کشمیر کے معاملہ پر فیصلہ پر عملدرآمد کا حکم صادر کر دیا تھا جس کا اظہار باجوہ نے دو درجن صحافیوں کو بلا کر کشمیر پر اپنی بزدلی کا اظہار کر دیا تھا۔ اس طرح ٹرمپ نے امریکا میں مودی کی طرف سے اس کی انتخابی مہم میں دوڑے جلسوں کے خطاب کے نتیجے میں انڈین امریکی ووٹروں کی حمایت وصول کرنے کا حق ادا کر دیا اور مودی نے باقاعدہ امریکی شہر پر آرٹیکل 370 کو منسوخ کر کے کشمیر کو ہندوستان کا حصہ قرار دے دیا۔



عمران خان نے اپنے اقتدار کو بچانے اور امریکی دورے کو کامیاب ثابت کرنے کیلئے بھٹو کی نقل کرتے ہوئے اپنی پارٹی کے مقامی سربراہان کو بڑی تعداد میں لوگوں کو چک لالہ ایئر پورٹ پہنچنے کا کہا جنہیں وہ اپنے امریکی دورہ سے فاتح کے طور پر خود کو پیش کرنے کا ڈرامہ رچایا گیا۔ ہم نے تاریخ سے سبق سیکھنے کی بجائے ٹرمپ کا کشمیر پر ثالثی کا دھوکہ قبول کر لیا۔ جب عمران خان اور اُس وقت کے آرمی چیف امریکا جا کر لوٹے تو ان کے لبوں پر فخر و انبساط تھا، جیسے قوم نے کوئی سفارتی معرکہ مار لیا ہو۔ اسی سازش کے تحت چک لالہ ایئر پورٹ پر وطن واپسی پر ان کا استقبال ایک فاتح کی مانند کیا گیا۔ عمران خان کی امریکی واپسی پر، چک لالہ کا استقبال گویا ایک فتح کا جشن تھا، مگر وہ فتح چند ہفتوں بعد 5 اگست کو اس وقت شکست میں بدل گئی جب مودی نے آرٹیکل 370 کا خاتمہ کر کے اقوام متحدہ کی ساری قراردادوں کو بھارتی آئین کی دفعہ میں تحلیل کر دیا۔ بھارت نے یکطرفہ طور پر کشمیر کی خصوصی حیثیت ختم کر دی، اور امریکا نے خاموشی اختیار کی۔

یہ کیسا ثالث تھا جو ایک طرف ثالثی کی بات کرتا ہے اور دوسری طرف دشمن کو کشمیر کو ہڑپ کرنے کا سیاسی آئینہ دکھاتا ہے؟ کیا یہ ثالثی تھی یا زمین کی نئی نیلامی کا مقدمہ؟ اگر یہی ثالثی ہے، تو پھر فلسطین کیلئے ان کا حل بھی سامنے ہے: غزہ کو امریکا کے حوالے کر دیا جائے، امریکا اسے دنیا کے سیاحوں کیلئے ایک خوبصورت علاقہ بنا کر یہاں جنگ کا مکمل خاتمہ کر دیا جائے گا اور یہاں رہنے والے تمام فلسطینیوں کو پڑوسی عرب ممالک اپنے ہاں آباد کاری کیلئے اجازت دیں۔ آخر ہم کب سمجھیں گے کہ یہ کون لوگ ہیں جن سے اب بھی مسلمانوں کو وفا کی امید ہے؟

تاریخ کا جائزہ لیں تو امریکا نے دوسری جنگ عظیم کے بعد سے اب تک تقریباً تین درجن سے زائد ممالک میں براہ راست یا بالواسطہ مداخلت کی ہے۔ کوریا، ویتنام، افغانستان، عراق، لیبیا، شام، اور یمن جیسے ممالک امریکی مداخلت کی بھینٹ چڑھے اور آخر کار امریکا کو ان خطوں سے یا تو بے عزتی کے ساتھ نکلنا پڑا یا شکست کو نیم فتح کے پردے میں چھپانا پڑا۔ افغانستان میں طالبان کی واپسی اور ویتنام میں ساگون کے زوال کے مناظر اس حقیقت کے ناقابل تردید ثبوت ہیں۔

ٹرمپ نے انتخابی مہم کے دوران یہ اعلان کیا تھا کہ وہ امریکا کو غیر ضروری جنگوں سے نکالیں گے۔ مگر صدارت کے منصب پر فائز ہونے کے بعد ان کے طرز عمل میں نہ صرف تبدیلی آئی بلکہ کینیڈا، گرین لینڈ اور چین کے خلاف دھمکی آمیز لب و لہجہ اختیار کیا گیا۔ نیٹو اتحاد کے خلاف شکوہ و شکایت اور یورپی یونین پر دباؤ ڈالنا امریکی خارجہ پالیسی میں تناؤ کی علامت بن کر ابھرا۔ فلسطین کے مسئلے پر اسرائیل کو کھلی چھوٹ دینا اور غزہ میں انسانی حقوق کی پامالی پر خاموشی، نہ صرف ٹرمپ کے دوہرے معیار کو آشکار کرتی ہے بلکہ انتخابی وعدوں کی صریحاً نفی اور انحراف کی بدترین مثال ہے۔

ٹرمپ نے چین کے ساتھ تجارتی جنگ میں بالآخر پسپائی اختیار کی۔ چینی اقتصادی ماڈل کی پائیداری اور عالمی سطح پر اس کی توسیع نے امریکا کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ دوسری جانب حالیہ پاک-بھارت جنگ میں مغربی اسلحے کی برتری کا بیانیہ بھی دم توڑ گیا۔ بھارت اور اسرائیل کا گھج جوڑ عالمی سطح پر عیاں ہو گیا۔ موجودہ جنگ میں جس طرح پاکستان نے اسرائیلی ہاروپ ڈرونز کو نہ صرف مارا بلکہ ان کے آپریٹر زاور بیس اسٹیشنز کو بھی تباہ کیا، اس سے امریکا اور اسرائیل کی عسکری برتری کا طلسم ٹوٹا دکھائی دیا۔ اس فتح کے بعد امریکا نے، اسرائیل کی ایما پر، فوری جنگ بندی کیلئے مداخلت کی تاکہ بھارت کو

مکمل ہزیمت سے بچایا جاسکے۔

اسرائیلی ہاروپ ڈرونز، جنہیں ناقابل شکست قرار دیا گیا تھا، پاکستانی دفاعی قوت کے سامنے ناکام ہو گئے۔ پاکستان نے نہ صرف ان ڈرونز کو مار گرایا بلکہ بھارت میں ان کے آپریشننگ مراکز کو بھی تباہ کر دیا۔ اسرائیل کے 18 ہلاک شدہ ماہرین کی واپسی خفیہ انداز میں ہوئی، مگر دنیا جان چکی تھی کہ اسرائیل اور بھارت کی عسکری برتری کا افسانہ محض جھوٹ کا غبارہ تھا۔

اس شکست کے بعد امریکا کو جنگ بندی کیلئے ہنگامی مداخلت کرنا پڑی۔ اسرائیل اور بھارت کی اپیل پر امریکا نے فوری طور پر ثالثی کا کردار ادا کرنے کی کوشش کی تاکہ اپنے اتحادیوں کو بچایا جاسکے۔ مگر پاکستان کیلئے یہ تجربہ نیا نہ تھا۔ 1962، 1965، 1999 اور پھر 2019 کے بعد، ہر بار امریکا نے پاکستان کو وقتی وعدوں اور لالی پاپوں سے بہلایا مگر زمینی حقائق وہی کے وہی رہے۔ کشمیر کی صورت حال میں کوئی جوہری تبدیلی نہ آئی بلکہ صورتحال مزید الجھ گئی۔

اب امریکا نے ایک مرتبہ پھر پاکستان کو کشمیر پر ثالثی کا لالی پاپ دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکا بھارت کو چین کے خلاف بطور ایک 'جو کر کارڈ' استعمال کرنا چاہتا ہے۔ کوڈا اتحاد میں بھارت کی شمولیت اسی حکمت عملی کا حصہ ہے، لیکن امریکا دوبارہ اس کمزور اور غیر مستحکم شراکت دار پر بھروسہ کرنے کی غلطی کر رہا ہے۔

امریکا نے ویتنام، افغانستان، لیبیا، شام، عراق اور اب یوکرین وغیرہ میں جو کردار ادا کیا، وہ اس کی ثالثی کی ساکھ پر سنگین سوالات اٹھاتا ہے۔ ٹرمپ نے یوکرین کو مشورہ دیا کہ وہ اپنا 20% علاقہ روس کو دے دے اور بدلے میں امریکا امن قائم کرے گا۔ غزہ میں ثالثی کا مطلب یہ تجویز نکلا کہ اگر فلسطینی علاقہ خالی کر دیں تو جنگ خود بخود ختم ہو جائے گی۔ یہ وہ طرزِ ثالثی ہے جو درحقیقت جبر کی نئی شکل ہے۔

مودی کی انتخابی مہم میں پاکستان کو مسلسل دھمکیاں دینا، اسی پرانے بیانیے کی تجدید ہے جس کے ذریعے بھارت میں ہندو قوم پرستی کو جلا دی جاتی ہے۔ اس کا مقصد صرف الیکشن میں فتح حاصل کرنا نہیں، بلکہ چین کے خلاف امریکی منصوبے کو اڈا میں بھارت کی فعالیت کو یقینی بنانا بھی ہے۔ مگر امریکا اس حقیقت کو نظر انداز کر رہا ہے کہ بھارت نہ 1962 میں چین کا مقابلہ کر سکا اور نہ آج اس قابل ہے۔ امریکا کا 'انگٹرا گھوڑا' بھارت اپنی فوجی اور تزویراتی کمزوریوں کے سبب عالمی طاقتوں کے مہرے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

امریکا کی ماضی کی روش، حالیہ اقدامات اور مستقبل کے اشارے اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ یہ عالمی طاقت محض مفادات کی اسیر ہے۔ اس کے وعدے، معاہدے، اور ثالثی کی پیشکشیں صرف وقتی فائدے کیلئے ہوتی ہیں۔ وقت آگیا ہے کہ پاکستان اپنی خارجہ پالیسی کو از سر نو تشکیل دے اور خود انحصاری کی راہ اختیار کرے۔ ٹرمپ یا کسی بھی امریکی صدر کی ثالثی پر انحصار کرنا اس فریب کے سوا کچھ نہیں کہ "وہ سایہ جسے ہم منزل سمجھتے ہیں، سراب نکلتا ہے"۔

سی پیک، چین اور پاکستان کی نئی سمت کا مظہر ہے۔ پاکستان نے چین کے ساتھ سی پیک منصوبہ شروع کیا، جسے 'گیم چینجر' قرار دیا گیا۔ چین نے حالیہ دنوں میں بھی کشمیر کے معاملے پر پاکستان کی سفارتی حمایت کی، مگر پاکستانی اشرافیہ اب بھی امریکا سے کسی معجزاتی ثالثی کی امید باندھے ہوئے ہے، گویا پرانے زخموں پر مرہم ڈالنے کی تمنا ہو۔

اگر فرض کریں کہ امریکا ثالثی کے کسی فارمولے پر عملدرآمد کرتا ہے، جیسے کہ کشمیر کو دو حصوں میں بانٹ دیا جائے، یا گلگت بلتستان پاکستان کو دے کر باقی انڈیا کو، یا پورے کشمیر کو غیر مسلح ریاست بنادیا جائے۔ تو کیا یہ تجاویز کسی فریق کو قابل قبول ہوں گی؟ اور اگر نہ ہوں، تو ٹرمپ کا رچھ نما غصہ کس پر گرے گا؟

پاکستان کو یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ خارجی ثالثی، خصوصاً امریکا کی ثالثی، ایک سراب ہے جو ہر بار مایوسی کی چٹان سے ٹکرا کر بکھر جاتا ہے۔ قوموں کے مسائل دوسروں کے رحم و کرم پر نہیں، اپنی خودی، حکمت اور استقلال سے حل ہوتے ہیں۔ کشمیر کا مسئلہ ہو یا کسی اور قومی مفاد کا سوال، پاکستان کو اپنی قوت فیصلہ، سفارتی حکمت اور اندرونی اتحاد کو بنیاد بنانا ہو گا کیونکہ ثالثی کی خوش فہمیاں بالآخر قومی وقار اور تاریخی سچائی کے سامنے سرنگوں ہو جاتی ہیں۔

واشنگٹن کی وہی کہانی ہے، جسے ہم بار بار نئے کرداروں کے ساتھ دہراتے ہیں۔ کل ضیاء الحق نے مارشل لا کو جائز دکھانے کیلئے امریکا کی آشر بادلی، آج کوئی اور واشنگٹن کے استقبال پر اپنی سیاست کی قلعی چکاتا ہے۔ مگر انکل سام کی انگلی تھامنے والا ہر راہرو، بالآخر اُس بازارِ سیاست میں بے لباس پایا گیا جہاں سودے صرف طاقت کے ہوتے ہیں۔

آج بھی اگر ٹرمپ کی ثالثی پر بھروسہ کیا جائے تو ممکنہ تجاویز یہی ہوں گی کہ جو کشمیر جس کے پاس ہے، اسے ہی تسلیم کر لو، یا اسے پٹے پر ہمیں دے دو، بیس سال بعد بات کرنا! "کیا یہ کسی خود مختار ریاست کیلئے قابل قبول ہے؟ اور اگر نہ مانا گیا تو؟ ٹرمپ کا غصہ، جیسا کہ دنیا نے دیکھا، رچھ کے جیسے جیسا ہوتا ہے، جس سے ٹکنا محال اور سانس لینا دشوار۔ امریکا ایسا ثالث ہے جو صرف نفع کا سودا کرے چاہے اس کیلئے دنیا بھر کے تمام مسلمانوں کو ختم ہی کیوں نہ کر دیا جائے۔

جنہیں سراب دکھا کر خوابوں میں الجھایا جائے، وہ یا تو خام خیالی کے اسیر ہوتے ہیں یا تاریخ سے نابلد۔ پاکستان کو اب یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ مسئلہ کشمیر کا حل نہ تو امریکا کے کسی ثالث کے ذریعے ممکن ہے اور نہ کسی بین الاقوامی پلیٹ فارم سے، جب تک قوم خود اپنی خارجہ پالیسی میں خود مختاری، عزم، اور داخلی اتحاد پیدا نہ کرے۔ امریکا کے ہر وعدے میں ایک پنہاں مفاد ہے اور ہر ثالثی میں ایک پوشیدہ سودا۔ وقت آچکا ہے کہ پاکستان اپنی جغرافیائی حیثیت، دفاعی صلاحیت، اور نظریاتی اساس کے بل پر اپنی راہ متعین کرے، بصورت دیگر، ہر بار کی طرح تاریخ فقط ایک اور فریب کا اضافہ کرے گی۔

آخری بات، مگر سب سے کڑوی ہے کہ قومیں جو خواب بار بار دیکھتی ہیں، وہ یا تو نشے کی لت بن جاتے ہیں یا پھر مایوسی کی دہلیز پر لے جا کر چھوڑ دیتے ہیں۔ ہم نے ہر بار یہ گمان کیا کہ کوئی آئے گا، ہمارا مقدمہ لڑے گا، ہماری شہ رگ چھڑائے گا مگر جو شہ رگ اپنے ہی ہاتھوں کی بے توجہی سے زخمی ہو، اسے کوئی غیر کیسے سہارا دے سکتا ہے؟ تاریخ کے ماتھے پر لکھی تحریر واضح ہے کہ ثالثی کے خواب صرف وہی دیکھتا ہے جسے اپنی دلیل، اپنی قوت، اور اپنی حکمت پر یقین نہ ہو۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ماضی سے سبق لیں، دوستوں اور دشمنوں کو صرف جذبات کی بجائے حقیقت کی کسوٹی پر پرکھیں اور قومی مفاد کو اولین ترجیح دیں۔ ورنہ ہر بار لالی پاپ کی چمکدار پینلنگ میں زہر ہمیں چکھنا پڑے گا۔

اندھیروں سے روشنی تک: ایک خطے کی داستان

آج یہ محفل فکر اس لیے آباد ہے کہ زمانہ اپنے اوراق بدل رہا ہے، دنیا طاقت کی نئی کروٹ لے رہی ہے، اور ممالک کے فیصلے اب صرف ایوانوں میں نہیں، بلکہ عالمی دباؤ، اقتصادی چابک اور سیاسی جبر کی بھٹی میں تپ کر سامنے آتے ہیں۔ قوموں کی تقدیر کبھی کبھی ایک قطرہ تیل سے بندھ جاتی ہے، اور کبھی ایک غلط فیصلہ انہیں صدیوں پیچھے دھکیل دیتا ہے۔ آج ہم جس منظر نامے پر نگاہ ڈال رہے ہیں، اس کے خطوط صرف بھارت کی سیاست تک محدود نہیں، یہ پوری خطے کی صبح و شام سے تعلق رکھتا ہے۔

دنیا نے دیکھا کہ جب مغرب کے ابرگماں نے دہلی کے آسمان کو ڈھانپا، جب واشنگٹن کی آنکھوں میں شک کی چمک پیدا ہوئی، تو بھارت نے روسی تیل کی شاہراہ پر اپنے قدم ڈمگاتے محسوس کیے۔ وہ خریداری جو کبھی بہتے دریا کی مانند تھی، اب قطرہ قطرہ کم ہوتی چلی گئی۔ بلوم برگ کی رپورٹ نے گویا وہ آئینہ دنیا کے سامنے رکھ دیا جس میں دہلی کی نئی مجبوری صاف جھلک رہی تھی۔ یوں بھارت اور روسی تیل — ایک بھتی شمع کی داستان کو ساری دنیا نے سن لیا۔

جب مغربی دنیا کی آنکھوں میں شک کی سرخی اور واشنگٹن کے ایوانوں میں پابندیوں کی سرگوشیاں بڑھنے لگیں تو بھارت کی سیاسی نبض بے ترتیبی سے دھڑکنے لگی۔ مغربی دنیا کے دبیز بادل، پابندیوں کے خدشات اور واشنگٹن کی سرد آہنی نگاہ نے جب دہلی کے صحن پر سایہ کیا تو بھارت نے روسی تیل کی ندی میں اپنا چراغ گل کرنا ہی مناسب سمجھا۔

روسی تیل، جو کل تک بھارت کی اقتصادی روح کی مانند تھا، اب کسی گناہ کی طرح محسوس ہونے لگا۔ وہ خریداری، جو کبھی یوں رواں تھی جیسے گنگا کناروں پر شام کی پوجا، اچانک مدھم پڑ گئی اور دنیا نے محسوس کیا کہ دہلی اب ماسکو کے نعموں سے نیم جان ہوتا جا رہا ہے۔ اپنے ہی فیصلوں کی الجھن میں بھارت نے ماسکو کی راہ سے قدم سمیٹنا شروع کیے، اور وہ خریداری جو کبھی دریا کی طرح بہتی تھی، اب نالی کی دھار بن کر رہ گئی۔ یہ صرف تجارت نہیں تھی، بلکہ طاقت کی شاعری تھی جو خاموشی سے اپنا وزن بدل رہی تھی۔

امریکی جریدہ بلوم برگ نے وہ خبر لکھی جس نے دہلی کے ایوانوں میں برپا معاشی زلزلے کا پردہ چاک کر دیا اور مودی جنتا لاکھ کوشش کے باوجود چھپانے میں ناکام رہی۔ بلوم برگ اپنی روایت کے مطابق شفاف آئینے کی مانند خبر لایا کہ دسمبر کیلئے روسی خام تیل کے سودوں میں بھارت نے نمایاں کمی کر دی ہے۔ گویا بازار سیاست میں کوئی پوشیدہ لرزش بھارتی قدموں میں در آئی ہو۔ دسمبر کی روسی خریداری، جسے بھارت نے ہمیشہ ترجیح دی، اب ہاتھ سے یوں پھسل رہی ہے جیسے کوئی خوف زدہ انسان جلتی ہوئی لکڑی چھوڑ دیتا ہے۔ دنیا نے سمجھ لیا کہ دہلی کے فیصلے اب خود مختار نہیں رہے؛ کوئی اور ہاتھ اس کے قلم کو چلا رہا ہے۔

پانچ بڑی ریفرنسز یوں کی خاموشی، جو ہمیشہ کی طرح ماسکو کی طرف اپنے آرڈر روانہ کرتی تھیں، اس بار رک گئی۔ یہ خاموشی سیاست کی چیخ تھی، مودی کا تکبر یہ خوفناک شور دنیا بھر کی سماعتوں سے جا ٹکرایا کہ بھارت کے فیصلے اب آزاد نہیں رہے۔ اسی شفاف آئینے کے ایک اور رخ پر یہ انکشاف بھی جھلکایا کہ بھارت کی پانچ بڑی آئل ریفرنسز، جو ہر ماہ کی دسویں تاریخ سے قبل روس کو اپنے آرڈر بھیجنے میں دیر نہیں لگاتیں تھیں، اس بار موت کی

خاموشی میں گم ہو گئیں، جیسے کسی نے ان کے ہاتھوں سے قلم چھین لیا ہو، متحرک زندگی کو موت نے آدبوچا ہوا حالات نے انہیں نئے فیصلوں پر مجبور کر دیا ہو۔ یہ خاموشی محض کاروباری مصلحت نہیں تھی؛ یہ خوف اور مجبوری کی گواہی بھی تھی۔ سیاست کی زبان میں بعض اوقات خاموشی سب سے بلند چیخ ہوتی ہے۔

ادھر ہندوستان کی سرکاری ریفرنسری آئی اوسی نے اعلانِ دہلی کی سیاست کا نیا رخ واضح کیا کہ اب وہ صرف وہی روسی تیل خریدے گی جو پابند یوں کے دائرے سے باہر ہو۔ گویا سیاسی بھنور میں تیرتی ایک کشتی نے اپنا رخ بدل لیا ہو، محض اس خوف سے کہ سمندری طوفان کہیں اس کے توازن کو تہہ و بالا نہ کر دے۔

یہ اعلان نہیں، اعتراف تھا۔ یہ وہ لمحہ تھا جب ایک بڑی ریاست نے اپنے فیصلوں پر باہر کے ہاتھوں کا سایہ محسوس کیا اور اوپر سے امریکی ٹیرف، وہ بھی پچاس فیصد گویا اقتصادی کوڑے کی ایسی ضرب، جس نے دہلی کے نہ صرف پیر ہلا دیے بلکہ جلا کر رکھ دیئے۔ اس پس منظر میں صدر ٹرمپ کے کلمات کسی آندھی کی گرج کی مانند تھے۔ انہوں نے کہا کہ بھارت اچھا تجارتی شریک نہیں، اور ماسکو سے اس کی تیل کی خریداریاں یوکرین کے میدانِ جنگ کو ابندھن فراہم کرنے کے مترادف ہیں۔

اس پس منظر میں ٹرمپ کے جملے دہلی کے کان میں نہیں، اس کی سیاست کے رگ و پے میں اتر گئے۔ یہ گویا ایک اخلاقی و سیاسی فردِ جرم تھی جس پر دنیا کی نظریں جم گئیں۔ یہ جملہ نہیں تھا، ایک سفارتی فیصلہ تھا، اور فیصلہ بھی وہ جو قوموں کو پابندِ سیاست بنادیتا ہے۔ یاد رہے کہ روس سے تیل خریدنے نے بھارت پر پچاس فیصد ٹیرف عائد کر کے یہ پیغام دیا تھا کہ اقتصادی دنیا میں دو کشتیوں پر سوار رہنا ممکن نہیں۔ ایک طرف واشنگٹن کی لوہے پر امریکا کی صورت فشار، دوسری جانب ماسکو کی توانائی کا دریا۔ بھارت ان دونوں کے درمیان پھنسا نظر آیا۔

آئی اوسی کی طرف سے یہ بیان کہ ہم صرف غیر پابندی یافتہ سپلائرز سے روسی تیل لیں گے، درحقیقت ایک سیاسی اعتراف تھا۔ یہ انکار نہیں تھا؛ یہ نیم قبولیت تھی کہ مودی بھیڑیا جو شیر کی کھال پہن کر خطے کے ممالک پر گرج رہا تھا، ٹرمپ کے بیانے کے سامنے گیدڑ کی طرح دم دبا کر عالمی دباؤ کے سامنے نہ صرف جھکنے پر مجبور بلکہ اوندھے منہ گر کر خاک چاٹنے پر مضبور ہو گیا ہے جیسے کوئی سپاہی ڈھال تو رکھے مگر تلوار مقابل کے قدموں میں گرا دے۔

امریکا کا بھارت پر 50 فیصد ٹیرف لگانا گویا اس معاشی داستان کا سب سے سخت باب تھا۔ یہ اعلان نہیں، بلکہ چابک تھا اور وہ بھی ایسے وقت پر جب بھارت خود کو عالمی منڈیوں میں ابھرتی طاقت سمجھنے لگا تھا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ واشنگٹن نے دہلی کے کان میں وہ جملہ پھونکا جو غلامی کے عہد میں بھی حکمران سنایا کرتے تھے "فیصلہ ہمارا چلے گا، تم صرف حکم کی تعمیل کرو گے"۔ امریکی ٹیرف کی ضرب نے بھارت کے ایوانوں میں ہلچل مچادی، اور بالآخر مودی نے واشنگٹن کو یقین دہانی کرائی کہ روسی تیل کی راہیں اب رفتہ رفتہ بند کی جائیں گی۔ جیسے کسی بڑے حلیف کے سامنے چھوٹے شریک کو اپنا دامن صاف دکھانا پڑتا ہو۔ ٹرمپ کے کلمات نہ صرف ایک تنبیہ تھے بلکہ بھارت کی پالیسیوں پر ایک تیشہ بھی جو پوری دنیا نے سنا اور یہ جملہ بھارت کی سفارتی کتاب کے حاشیے اور مودی کے متکبر چہرے پر سیاہ داغ کی طرح ثبت ہو گئے۔

یہاں سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا مودی سرکار کی پالیسیوں کے نشیب و فراز نے خود بھارت کو معاشی بھونچال کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے؟ دانشور حلقوں میں یہ آواز سنائی دیتی ہے کہ غلط فیصلے، سفارتی بے تدبیری اور حماقت سے لبریز جارحانہ بیانیہ کسی بھی قوم کی اقتصادی بساط الٹنے کی سکت رکھتا ہے۔

بھاری ٹیرف کے دباؤ کے بعد بھارت نے وہی کیا جو کسی کمزور ریاست کیلئے ناگزیر ہوتا ہے یعنی یقین دہانی دے دی کہ روس سے تیل کے دروازے بند کیے جارہے ہیں۔ یہ وہ مقام تھا جہاں بھارت نے اپنی خود مختاری کے بجائے مجبوری کو اپنا مشیر بنالیا۔ انہی پالیسیوں کے بطن سے وہ ہولناک صورت حال بھی جنم لیتی ہے جس کا حوالہ مئی 2025ء کے عسکری تناؤ میں بھی کھل کر سامنے آگیا۔ جنگی تصادم، چاہے مختصر ہو یا طویل، کسی بھی ریاست کے سیاسی پندار اور عسکری اعتماد پر گہری ضرب لگاتا ہے۔ بھارتی طیاروں کی تباہی اور اس پر عالمی سطح پر ہونے والے تبصرے، خواہ کسی بھی زاویے سے دیکھے جائیں، دہلی کے عسکری منصوبہ سازوں کیلئے سوالیہ نشان چھوڑ گئے۔ اس کے باوجود پاکستان کے خلاف دوبارہ کشیدگی کی فضا قائم کرنا اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ شاید مودی جیسا متعصب اور اس کے جنگی مافیاءندی سیاست دان تاریخ کے مکتب سے وہ سبق سیکھنے کو تیار نہیں جو شکست اور شرمندگی رقم کر چکی ہے۔

یہ سوال آج دہلی کے ہر محقق اور ہر اقتصادی مبصر کے ذہن میں گردش کر رہا ہے۔ مودی سرکار کی پالیسیوں میں جارحیت زیادہ اور حکمت کم ہے اور یہ سوال بھی آج ہر دانشور کے ذہن میں بجلی کی مانند لپکتا ہے کہ کیا خود مودی حکومت کی نادانیاں بھارت کی معاشی تپش کی ذمہ دار اور گراؤ کا سبب ہیں؟ کیا مودی پالیسیوں نے خود بھارت کو معاشی دلدل میں دھکیل دیا ہے؟ بازاروں میں بے چینی، سرمایہ کاروں میں بے اعتمادی، اور سیاسی دباؤ کے سامنے بار بار جھکنا یہ سب کچھ کسی بڑے معاشی طوفان کی آمد کا پتہ دیتا ہے۔ جارحیت کا نشہ، سفارت کی کمزوری، اور پڑوسیوں کے خلاف مسلسل محاذ کھولنے کی روش یہ وہ راہ ہے جس پر چلنے والے آخر کار تھک بھی جاتے ہیں اور ڈوب بھی جاتے ہیں۔ یہی وہ طرز عمل ہے جس کے ثمرات آج دہلی کو شک، خوف اور اقتصادی بے بسی کی شکل میں بھگتنے پڑ رہے ہیں۔ قومیں تباہی سے تب دوچار ہوتی ہیں جب ان کے رہنما حقیقت کے بجائے خوابوں پر حکومت کرنے لگیں۔

ان حالات میں مودی حکومت کا جنگی مافیاء اگر دوبارہ حماقت کرنے پر آمادہ ہو تو یہ محض سیاسی نادانی نہیں، بلکہ قومی خود کشی کے مترادف ہوگی۔ خود بھارتی ریٹائرڈ جرنیلوں کا اعتراف کہ ”اگر بھارت نے نئی جنگ چھیڑی تو ٹوٹ بھی جائے گا اور برباد بھی ہوگا“۔ دراصل دہلی کے ایوان اقتدار کیلئے وہ آئینہ ہے جس میں مستقبل کی شکست کا عکس صاف دکھائی دیتا ہے مگر افسوس کہ بعض حکمران آئینہ دیکھنے کی بجائے اسے پردے سے ڈھانپ کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔

دنیا کی سیاست کبھی جامد نہیں رہی۔ کبھی طاقت کے ایوانوں میں ایک پھونک پڑتی ہے تو برا عظموں کے نقشے بدل جاتے ہیں، اور کبھی کسی صدر کے ایک جملے سے پوری معیشتیں کانپ اٹھتی ہیں۔ انہی گردابوں کے بیچ آج بھارت کی سیاسی بساط بھی ایسے الٹ پھیر سے گزر رہی ہے جس نے دہلی کے چانکیائی ذہن کو بھی متحیر بلکہ انتہائی مشکل میں مبتلا کر دیا ہے۔

جنگ — تاریخ کی وہ کتاب جس کا ہر صفحہ خون سے لکھا جاتا ہے۔ ہمارے سامنے وہ تجزیات اور بیانات بھی ہیں جن میں بعض مبصرین نے مستقبل کے ممکنہ تصادمات کو نمایاں کیا۔ جنگ کا باب ہمیشہ تلخ ہوتا ہے — چاہے کسی بھی ملک کیلئے ہو اور عسکری شکستوں یا ناکامیوں کی خبریں، خواہ مبالغہ ہوں



یا تحقیق کا نتیجہ، دلوں میں وہ لرزہ پیدا کرتی ہیں جو قوموں کو سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ جنگ کا ہر باب تلخ ہوتا ہے۔ مئی 2025ء کا عسکری تصادم — تاریخ کا چھٹا ہوا وہ شرمناک سبق ہے جس نے بھارت کی عسکری قیادت کا وہ سارا پردہ چاک کر دیا جو وہ برسوں سے چھپائے بیٹھی تھی۔ طیاروں کی تباہی، عالمی سطح پر ہونے والی جگ ہنسائی، اور طاقتور حلیفوں کی ملامت — سب کچھ دہلی کی عسکری منصوبہ بندی کی کمزوریوں کو بے نقاب کر گیا لیکن حیرت یہ ہے کہ شکست کے باوجود بھارت کی سیاسی قیادت نے وہ عاجزی نہیں اپنائی جو ہوش مند اقوام کو بچا لیتی ہے۔

کیا مودی حکومت دوبارہ جنگ کی حماقت کر سکتی ہے؟ یہ سوال آج سب سے اہم ہے۔ یہ سوال آج نہ صرف پاکستان بلکہ خود بھارت کے سنجیدہ حلقوں میں گردش کر رہا ہے۔ جو قیادت داخلی کمزوری، بیرونی دباؤ اور معاشی بے چینی کا شکار ہو، وہ کبھی کبھار اپنی ناکامیوں سے توجہ ہٹانے کیلئے جنگ کا سہارا لیتی ہے۔ تاریخ میں یہی قوموں کی تباہی کا آغاز رہا ہے۔ اگر کسی بھی ریاست میں جنگی مافیاسیاست پر غالب آجائے تو سمجھ لیجیے کہ تباہی دستک دے رہی ہے۔ اور اگر عقل و دانش سیاست سے رخصت ہو جائیں، تو پھر جذبات قوموں کیلئے بچھتاوے کے آنسوؤں سے آگے کچھ نہیں چھوڑتے۔

دنیا کے عسکری مبصرین نے بارہا کہا ہے کہ جنوبی ایشیا میں جنگ کبھی حل نہیں، ہمیشہ مسئلہ ہی بنتی ہے اور خود بھارت کے ریٹائرڈ جرنیلوں نے اس پر مہر ثبت کر دی ہے کہ اب بھارت کا باپ بھی پاکستان سے جنگ نہیں جیت سکتا بلکہ اگر نئی جنگ چھیڑی گئی تو ریاست ٹوٹ بھی سکتی ہے اور برباد بھی اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ بھارت میں 32 سے زیادہ علیحدگی کی تحریکیں مودی کے ہاتھوں انڈیا کم از کم دو درجن حصوں میں تقسیم ہو کر رہے گا اور یہ تمام علیحدگی کی تحریکیں اپنی منزل مراد پالیں گی اور جس طرح دنیا کی ایک سپر طاقت سوویت یونین نصف درجن حصوں میں تقسیم ہو گئی اور اس کے مقابلے میں ہندوستان کی حقیقت کیا ہے اور یہ محض الفاظ نہیں؛ یہ تاریخ کا منعکس شدہ عکس ہے۔ جنگیں ملکوں کو بڑا نہیں کرتیں — صرف قبریں بڑی کرتی ہیں۔ بھارتی ریٹائرڈ جرنیلوں کا واضح اعتراف محض رائے نہیں، ایک عسکری حقیقت ہے۔ جنگیں نعروں سے نہیں جیتی جاتیں؛ عقل، حکمت اور تدبیر سے جیتی جاتی ہیں۔ اور یہ تینوں آج بھارت کی موجودہ سیاسی قیادت سے کوسوں دور دکھائی دیتے ہیں۔ مودی حکومت کا جنگی مافیا اگر دوبارہ سر اٹھانے کی کوشش کرتا ہے تو یہ سیاسی حماقت ہی نہیں مودی کے ہاتھوں یہ ایسی خود کشی ہوگی جس کے اثرات نسلوں تک رقم ہوں گے۔

قوموں کا راستہ جنگ کے دھوئیں نہیں، امن کی روشنی سے بنتا ہے۔ ہم اس خطے کے رہنے والے ہیں جس نے پہلے ہی بہت دکھ سہے، بہت زخم اٹھائے۔ یہ سرزمین امن، حکمت، صلح اور ترقی کی متقاضی ہے۔ جنگیں وہ لکیر ہیں جو قوموں کو دو حصوں میں بانٹ دیتی ہیں مگر امن وہ دریا ہے جو سب کو ایک پل میں جوڑ دیتا ہے۔ قائدین آتے رہتے ہیں، حکومتیں بدلتی رہتی ہیں، مگر قوموں کی زندگی اس روشنی سے بنتی ہے جو حکمت، انصاف اور امن کے آسمان سے اترتی ہے اور یہی پیغام آج بھی ہمارے لیے سب سے زیادہ ضروری ہے۔

یاد رکھیں، قیادت اگر تدبیر سے خالی ہو، عقل سے دور ہو، طاقت کے نشے میں بدمست ہو، جنگ کو کھیل سمجھ لے یا اپنے عوام کو جنگ کی آگ میں دھکیل کر اپنے اقتدار کیلئے اس مکروہ عمل کیلئے جنگ میں دھکیل دے تو ایسی قیادت قوم کا سرمایہ نہیں — تہرہ ہوتی ہے۔ اور تاریخ یہ کہتی ہے کہ جنگیں لیڈر نہیں

جیتنے... قومیں ہارتی ہیں۔ سرحدیں نہیں جلتی... گھر جلتے ہیں۔ آج وقت ہمیں پکار رہا ہے، تاریخ ہمارے دروازے پر دستک دے رہی ہے، اور خطے کا مستقبل ہماری عقل، تحمل، اور بصیرت کے فیصلوں پر قائم ہے۔ جنگیں راستے نہیں بناتیں، جنگیں راستے بند کرتی ہیں۔ امن راستے کھولتا ہے۔ حکمت قومیں بناتی ہے اور عقل قوموں کو بچاتی ہے۔ آج ہم میں سے ہر شخص پر فرض ہے کہ جنگ کے دھوئیں میں مستقبل نہ تلاش کرے؛ بلکہ امن کی روشنی میں راستہ دیکھے۔ یہ خطہ جنگ کا متحمل نہیں، بلکہ یہ خطہ امن کا مستحق ہے۔

آج دنیا کا ہر دانشور، ہر جرنیل، ہر مبصر یہ کہہ رہا ہے کہ جنگ نئی بساط نہیں بچھاتی، پرانی بساط الٹ دیتی ہے۔ جنگ کا فیصلہ بند کمروں میں نہیں، قوموں کے ضمیر میں ہوتا ہے اور ضمیر کہتا ہے، عقل کو اپناؤ، فتنوں کی آگ نہ بھڑکاؤ۔

اب میں براہ راست مودی کے جنگی مافیائے اور ہندوستان میں بسنے والے لوگوں کو مخاطب کرنا چاہتا ہوں کہ تاریخ تم سے وعدہ مانگتی ہے اور مستقبل تمہارے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑا ہے۔ فیصلہ آج دو میں سے ایک ہے، یا تو طاقت کے گھمنڈ میں آگ بھڑکائی جائے یا عزت، حکمت اور امن کے ساتھ دنیا میں سراٹھا کر چلا جائے۔ قومیں جنگ سے نہیں... اتحاد سے بنتی ہیں، سرزمینیں توپوں سے نہیں...

انصاف سے بچتی ہیں، خوشحالی خون سے نہیں... عقل سے جنم لیتی ہے۔ اس خطے کو جنگ نہیں، امن کی ضرورت ہے، مزید زخم کی نہیں بلکہ مرہم کی ضرورت ہے، اندھیروں کی نہیں، روشنی کی ضرورت ہے۔ یہ وقت جنگ کا نہیں، غیرت کے ساتھ امن کا ہے۔ لیکن اگر مودی کو اب بھی سینہ دور کے سینہ دور کو بھڑکانے کی خواہش ہے تو یاد رکھے کہ پاکستانی قوم اپنی بہادر افواج کے شانہ بشانہ سپہ سالار ہوئی دیوار کی طرح کھڑی ہے اور جو قوم گرج کر اٹھتی ہے، اسے کوئی طوفان شکست نہیں دے سکتا۔

اب میں اسی مضمون کے تناظر میں غیور بلوچی نوجوانوں سے مخاطب ہونا چاہتا ہوں:

اے بلوچستان کی دھرتی کے غیور نوجوانو اور نونہالوں:

تم وہ چراغ ہو جن کی لو پہاڑوں کی وسعت سے بھی اونچی اور سمندر کے سینے سے بھی گہری ہے۔ تمہاری رگوں میں اس سرزمین کی خنک ہوا بھی دوڑتی ہے اور اس کے گرم لہو کی حرارت بھی۔ تمہاری تاریخ صدیوں کے صحرا میں کھڑے اس قدیم درخت کی مانند ہے جو طوفانوں میں بھی جھکا نہیں، جس کی جڑیں صبر، غیرت اور وقار میں پیوست ہیں۔ دنیا آج کروٹیں بدل رہی ہے۔ طاقتیں نئے دائرے کھینچ رہی ہیں، اور وقت کی آندھیاں کبھی کبھی سچ اور فریب کے بیچ لکیر دھندلا دیتی ہیں۔ ایسے میں نوجوان ذہن سب سے زیادہ آزمائے جاتے ہیں۔ یہی وہ گھڑی ہے جب شعور تلوار بنتا ہے، اور بصیرت ڈھال۔ یاد رکھو—جو قومیں اپنی منزل کا چراغ دوسروں کے ہاتھ میں دے دیتی ہیں، وہ سفر میں بھٹک جاتی ہیں۔ راستے ہمیشہ وہی دیکھ پاتے ہیں جن کی نگاہ اپنی دھرتی کے دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہوتی ہیں۔

بلوچ نوجوانو،

تم وہ نسل ہو جس کے دل میں پہاڑوں جیسی غیرت، سمندر جیسی وسعت اور صحرا کی ہوا جیسی آزادی بسی ہوئی ہے۔ تمہاری تاریخ بہادری، وفاداری اور عزت نفس کی وہ عظیم داستان ہے جس نے ہمیشہ اس خطے کو وقار بخشا مگر آج کا زمانہ پہلے سے کہیں زیادہ پیچیدہ، تیز رفتار اور بے رحم ہے۔ دنیا بدل رہی

ہے، طاقتیں اپنے رخ تبدیل کر رہی ہیں، اور عالمی سیاست ایسے دائرے کھینچ رہی ہے جن کے اثرات دور دراز کے لوگوں تک پہنچتے ہیں۔ ایسے میں تمہاری نسل پر پہلے سے بڑھ کر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ تم صرف جذبات نہیں بلکہ دانش، شعور اور بصیرت سے فیصلے کرو۔

تمہاری دھرتی دولت سے مالا مال ہے؛ تمہارا کل، تمہارا ہنر، تمہاری تعلیم وہ کنجی ہے جو آنے والی نسلوں کے دروازے کھول سکتی ہے۔ تمہاری اصل طاقت تمہاری یکجہتی ہے۔ وہ یکجہتی جو ریگزاروں میں بکھرے ریت کے ذروں کو بھی آندھی بننے کی قوت دیتی ہے۔ تمہاری قوت تمہاری تعمیر ہے، تمہاری سوچ تمہاری معراج، اور تمہاری امن پسندی تمہاری پہچان۔ یہ سر زمین اب مزید زخموں نہیں۔ مرہموں کی طلب گار ہے۔ مرہم علم ہے، ہنر ہے، محبت ہے، اور وہ اعتماد ہے جو قومیں خود پر کرتی ہیں۔ تمہارے ان اوصاف کو دشمن تباہ کرنے کیلئے اس لئے درپے ہے کہ اسے خود اپنے ملک کی 32 علیحدگی پسند تحریکوں نے مشکل میں ڈال رکھا ہے اور وہ اپنے عوام کی توجہ ہٹانے کیلئے تمہیں جھوٹے خواب دکھا رہا ہے۔

آج کا نوجوان اگر اپنے مستقبل کا معمار بننا چاہتا ہے تو اسے سب سے پہلے یہ جاننا ہو گا کہ بیرونی دنیا کا ہر اشارہ خیر کا نہیں ہوتا۔ قومیں تب کمزور پڑتی ہیں جب ان کے نوجوانوں کے دلوں میں شکوک پیدا کر دیئے جائیں، اور وہ اپنی راہ خود تلاش کرنے کی بجائے دوسروں کے الفاظ کی گونج میں فیصلہ کریں۔ اپنے راستے کا انتخاب تمہیں خود کرنا ہے۔ اپنی عقل، اپنے ضمیر اور اپنی اجتماعی بھلائی کو سامنے رکھ کر۔ دنیا میں کہیں بھی کوئی قوم تب آگے نہیں بڑھتی جب وہ کسی اور کے اشاروں پر جیسے ترقی ہمیشہ ان لوگوں کا مقدر بنتی ہے جو اپنے قدم خود اٹھاتے ہیں۔

بلوچ نوجوانو، تمہاری دھرتی وسائل کی امیر، تہذیب کی شاندار اور مستقبل کی روشن صلاحیتوں سے بھری ہے۔ تمہارے ہاتھ علم سے مزین ہوں، تمہاری سوچ تعمیر سے سرشار ہو، اور تمہاری کوششیں اپنی سر زمین کیلئے وہ بنیاد رکھیں جو آنے والی نسلوں کو مستحکم راستہ دے۔ تمہاری طاقت تمہارے اختلاف میں نہیں، بلکہ تمہاری یکجہتی، تمہاری تعلیم اور تمہارے کردار میں ہے۔

وقت تمہیں آواز دیتا ہے کہ اپنے اندر کے اندھیروں کو شکست دو، اپنے حوصلے کو آسمان کا ہم قدم بنادو، اور اپنی دھرتی کیلئے وہ سمت تراشو جس پر کل کے چراغ روشن ہوں۔ طاقتور وہ نہیں جو تلوار اٹھائے، بلکہ وہ ہے جو آئندہ نسلوں کیلئے امید کا دروازہ کھولے۔ اٹھو، کہ تمہارے قدم اس مٹی کا حوصلہ ہیں۔ اٹھو، کہ تمہاری فکر مستقبل کی بنیاد ہے۔ اٹھو، کہ بلوچستان تم سے روشنی مانگتا ہے اور روشنی ہمیشہ انہی دلوں سے پھوٹتی ہے جو خواب دیکھنے اور انہیں تعمیر کرنے کی جرات رکھتے ہیں۔ تمہاری دھرتی تم سے روشنی مانگتی ہے اور روشنی ہمیشہ انہی کے ہاتھ میں پیدا ہوتی ہے جو مستقبل کو امید کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ یہ خطہ زیادہ تنازعات، نا اتفاقی یا غیروں کے کھیل کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس کے پاس پہلے ہی بہت زخم ہیں؛ اب اسے مرہم کی ضرورت ہے۔ مرہم علم ہے، ہنر ہے، مکالمہ ہے، امن ہے، اور وہ عزت ہے جو انسان ایک دوسرے کو دیتا ہے۔

میرے غیور نوجوان بلوچ بھائیو! تم وہ نسل ہو جو اگر چاہے تو بلوچستان کو ترقی، امن اور خود اعتمادی کی نئی مثال بنا سکتی ہے۔ ہر دور کا سب سے مضبوط جوان وہ ہوتا ہے جو دشمنوں کو نہیں، اپنے اندر کے خوف، جہالت اور انتشار کو شکست دے۔ وقت تمہیں آواز دے رہا ہے کہ دانش کو اپنا ساتھی بناؤ، مستقبل کو اپنا امید ان بناؤ، اور اپنے لوگوں کیلئے وہ چراغ بنو جو راستے روشن کرتا ہے۔

مغرب میں فکرِ اقبالؒ — ضرورت و اہمیت

(ایک تاریخی، تحقیقی اور ادبی لیکچر)

خواتین و حضرات

آج کی یہ نشست محض ایک علمی گفتگو نہیں، ایک روحانی سفر بھی ہے۔ ہم یہاں جس شخصیت کی فکر کا چراغ ہاتھ میں لیے بیٹھے ہیں وہ صدیوں کے اندھیروں میں روشنی بانٹنے والی ایسی آواز ہے جس کے اشعار نے غلام قوموں کے سینوں میں حرارت بھری، اور جس کے افکار نے مغربی مفکرین کے علمی ایوانوں میں سوالات کی نئی کونپلیں اُگادیں۔ یہ وہی مردِ دانا ہے جسے دنیا ایک شاعر، ایک مفکر، ڈاکٹر محمد اقبالؒ کے نام سے جانتی ہے۔

آج کی اس نشست میں ہم ایک ایسے مردِ دانا، ایک ایسی روحِ تاباں، اور ایک ایسے شاعرِ حکیم کی فکری معنویت پر گفتگو کے لیے جمع ہوئے ہیں جس کا ذکر محض تاریخ کا حوالہ نہیں بلکہ آنے والے زمانوں کا فکری دستور ہے۔ ڈاکٹر محمد اقبالؒ — وہ شاعر جس نے قوموں کے زوال میں امید کے چراغ جلائے، تہذیبوں کی کھوکھلی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا، اور انسان کے ضمیر میں وہ صدائے بازگشت پیدا کی جس کے نقوش ابھی تک مٹ نہیں سکے۔

اقبالؒ کی عظمت صرف اس بات میں نہیں کہ وہ اردو یا فارسی ادب کے بڑے شاعر ہیں، بلکہ اس میں ہے کہ وہ فلسفے، تاریخ، مذہب، سیاست، تہذیب اور روحانیت کو ایک وحدت میں پرو کر ایک ایسی ہمہ گیر آواز بن جاتے ہیں جو مشرق اور مغرب دونوں کے لیے فکر کا نیازاویہ پیش کرتی ہے۔ اقبالؒ کی تحریریں ایک ایسی صدا ہیں جو انسان کے باطن میں چھپے ہوئے امکانات کو بیدار کرتی ہیں۔ انہوں نے کہا تھا:

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق

بہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

یہ صرف ایک شاعر کی لکار نہیں، یہ ایک تہذیب کی از سر نو تعمیر کا پیغام تھا۔

مغرب کے علمی ایوانوں میں فکرِ اقبالؒ کی ضرورت کیوں ہے؟ یہ سوال بظاہر سادہ اور اندر سے ایک تہذیبی بھونچال ہے۔ اس کا جواب محض ادبی یا فلسفیانہ نہیں، بلکہ انسانی تاریخ کے پورے تناظر میں پوشیدہ ہے۔ مغرب اپنی سائنس، ٹیکنالوجی اور سیاسی غلبے کے باوجود ایک فکری خلا، ایک روحانی بے چینی، اور ایک تہذیبی بے وزنی کا شکار ہے۔ ایسے میں اقبالؒ کی آواز کسی دور دراز صحرائیں گونجنے والی بازگشت نہیں بلکہ ایک مینارِ نور ہے جو انسان کو اس کی اصل کی طرف بلاتا ہے۔ یہ سوال کہ مغرب میں فکرِ اقبالؒ کی ضرورت کیوں ہے؟ بظاہر سادہ ہے، مگر اس کے اندر پوری انسانی تاریخ کا شور پوشیدہ ہے۔ اگر یورپ کی تاریخ پر نگاہ دوڑائی جائے تو وہ دور بھی آتا ہے جب فکرِ یونان اس کے کاندھوں پر سوار تھی، پھر مسیحی کلیسا نے اس پر حکمرانی کی، اور پھر سائنس نے مذہب کو گہری نیند سلا دیا۔ برطانوی استعمار اپنے عروج پر، جرمنی فلسفے کے میدان میں سبقت لیے ہوئے، اور فرانس سیاسی افکار کی تجربہ گاہ بنا ہوا تھا۔

اقبالؒ نے مغرب کے اس پورے فکری سفر کو نہ صرف دیکھا بلکہ اس کی روح میں جھانکا۔ وہ جانتے تھے کہ مغرب کی ترقی اور اس کے زوال دونوں کے بیچ اسی کی مادی فکر میں چھپے ہیں۔ اقبالؒ — مشرق و مغرب کے فکری سنگم پر کھڑا ایک مردِ دانا ہے!

جب اقبالؒ یورپ پہنچے تو اس وقت یورپ صنعتی انقلاب کے نشے میں تھا۔ یہاں انسان ایک مشین ہے، اور روح ایک بے معنی اصطلاح۔ یہاں زندگی کا پیمانہ منافع اور طاقت ہے، انسانیت نہیں۔ یہاں آزادی کا نعرہ ہے، مگر روح قید ہے۔ اس فضا میں اقبالؒ نے محض مغرب کی ظاہری ترقی نہیں دیکھی، اس کے باطن میں اتر گئے۔ وہ لکھتے ہیں:

میں نے یورپ کی اصل روح کو اس کے کتب خانوں میں نہیں، اس کے بازاروں میں دیکھا—جہاں انسان کی قیمت اشیاء سے بھی کم تھی۔ یہ ایک فلسفی کا تجزیہ ہے، محض سیاح کا مشاہدہ نہیں۔ اقبالؒ بار بار کہتے ہیں کہ مغرب کی پوری تہذیب ”انسان“ کو کھو چکی ہے۔ وہ انسان جس کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ اللہ نے اسے زمین پر اپنا نائب بنایا۔

اقبالؒ اس بحران کو یوں بیان کرتے ہیں:

ٹھیک ہے تجھ کو پرستارِ مکاں کچھ بھی نہیں
فکرِ انساں ہے مگر تیری نگہبانی سے محروم

یہی وہ جگہ ہے جہاں اقبالؒ مغرب کو ایک نئی راہ دکھاتے ہیں، خودی، عشق، روحانی ارتقاء اور انسانی مرکزیت کے ذریعے سوال یہ ہے کہ مغرب میں اقبالؒ کی ضرورت — کیوں ہے؟ اور یہی آج کا موضوع بھی ہے۔

مغرب کی موجودہ فکری حالت کو سمجھنے کے لیے تین نکات انتہائی اہم ہیں:

(Spiritual Vacuum) روحانی خلا

(Civilizational Confusion) تہذیبی بے سستی

(Existential Crisis) فرد کی تنہائی اور وجودی بحران

ٹیکنالوجی نے انسان کے ہاتھ مضبوط کیے مگر دل کمزور کر دیا۔ سائنس نے کائنات کو کھول دیا مگر روح کو بند کر دیا۔ جمہوریت نے آزادی دے دی مگر مقصد نہیں دیا۔ سرمایہ داری نے دولت بڑھادی مگر تعلق چھین لیا۔ اقبالؒ نے اس صورتِ حال کو یوں بیان کیا:

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

یہ وہ جملہ نہیں جو محض مشرقی شاعر کی تنقید ہو — یہ مغربی تہذیب کے اس اندرونی بحران کا تجزیہ ہے جسے آج خود امریکی اور یورپی مفکرین بھی مانتے ہیں کہ ان کے ہاں آج ترقی ہے، سکون نہیں، دولت ہے، محبت نہیں، طاقت ہے، مقصد نہیں، آزادی ہے، روح نہیں، اقبالؒ انہی کھوئے ہوئے خزانوں کا نام ہیں۔ اقبالؒ انسان کو دوبارہ مرکزیت دیتے ہیں، روح کو جلا دیتے ہیں، تہذیب کو اخلاق دیتے ہیں، اور عقل و عشق کو اتحاد عطا کرتے ہیں۔ اقبالؒ کے نزدیک یہ تمام بحران انسان کی گمشدگی کا بحران ہے — اور یہیں سے آغاز ہوتا ہے فکرِ اقبالؒ کی مغرب میں ضرورت کا سفر۔ اقبالؒ نے کہا تھا:

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی

جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائدار ہو گا

جب اقبالؒ نے یہ شعر کہا تھا تو یورپ پہلی جنگِ عظیم کے زخم بھر رہا تھا۔ آج جب مغرب سیاسی انتشار، تہذیبی تصادم، معاشرتی بے سستی، اور نوجوانوں کی ذہنی تنہائی کے طوفان میں کھڑا ہے، تو اقبالؒ کے یہ اشعار ایک پیش گوئی سے کم نہیں لگتے۔



1- روحانی تشنگی اور اقبالؒ کی خودی

مغرب مذہب سے دور ہو کر ایک ایسے صحرائیں کھڑا ہے جہاں عقل تو موجود ہے مگر دل گم ہے۔ مذہب سے بیزاری نے انسان کو تنہا کر دیا ہے۔ مغرب میں انسان کی روح پیاسی ہے۔ چرچ کے زوال نے مذہب کو کمزور کیا اور فلسفہ اس کا متبادل نہ بن سکا۔ نفسیات نے انسان کو لیبارٹری کا نمونہ بنا دیا اور آرٹ نے حقیقت سے گریز کی راہیں نکال لیں۔ اس کے مقابلے میں اقبالؒ کا تصور خودی مغربی ذہن کے لیے ایک تازہ ہوا کی لہر ہے۔ اقبالؒ کہتے ہیں:

یہی ہے رُخِ خزاں، اور یہی ہے رُخِ بہار

نہ خدا کی جستجو، نہ مجھے اپنی خبر

اور پھر وہ اس بحران کا جواب دیتے ہیں:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے

خدا بندے سے خود پوچھے، بتا تیری رضا کیا ہے

یہ وہ تصور ہے جو وجودیت کے سارے سوالوں کو ایک دھڑکتے ہوئے جواب میں سمیٹ دیتا ہے۔ اقبالؒ اس پیاس کا واحد جواب رکھتے ہیں:

اقبالؒ کا فلسفہ خودی، وہ روحانی مرکز ہے جو انسان کو اس کے رب سے جوڑ کر ایک زندہ وجود بناتا ہے۔ یہی وہ پیغام ہے جو مغرب کے نوجوانوں،

پروفیسروں، اور مفکروں کے کانوں میں نئی معنویت کے ساتھ پڑ رہا ہے۔ کیونکہ جب انسان اپنی اصل کھودیتا ہے تو پہلا سوال یہی ہوتا ہے: میں کون

ہوں؟ اقبالؒ کہتے ہیں:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے

خدا بندے سے خود پوچھے، بتا تیری رضا کیا ہے

یہ شعر مغرب کے ان ذہنوں کے لیے نئی کائنات کا دروازہ ہے جو آج عصبيت اور وجودیت کے بوجھ تل پس رہے ہیں۔

2- مغرب کا سماجی بحران اور اقبالؒ کا اخلاقی نظام

خاندانی نظام ٹوٹ چکا، نسلیں ایک دوسرے سے اجنبی ہو گئیں، اور انسان مشینوں کا ساتھی بن گیا۔ سرمایہ داری نے خاندان کو بازار کے اصولوں پر لا

کھڑا کیا۔ اقبالؒ اس صورت حال کو دیکھتے ہیں اور خبردار کرتے ہیں:

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو

جد اہودیں سیاست سے تورہ جاتی ہے چنگیزی

یعنی اخلاقیات کے بغیر جمہوریت بھی ظلم بن جاتی ہے۔ اقبالؒ کے نزدیک سماج تبھی بنتا ہے جب فرد خود شناس ہو، اخلاقی بنیادوں پر قائم ہو، مقصد سے

جڑا ہو، اور روحانی طور پر زندہ ہو۔ یہ وہ چار ستون ہیں جن کی آج مغرب کو سخت ضرورت ہے۔

مغرب میں خاندانی نظام کی شکست انسانی تاریخ کا ایک بڑا سانحہ ہے۔ یساریت اور دہریت نے اخلاقیات کا دامن کھینچ لیا۔ سرمایہ داری نے انسان کو چیزوں کا غلام بنادیا۔ ایسے میں اقبالؒ سماجی نظام کو دوبارہ انسانی بنیادوں پر استوار کرنے کا منصوبہ دیتے ہیں۔ ان کے ہاں انسان محض اقتصادی اکائی نہیں، بلکہ ایک اخلاقی، روحانی اور سماجی وجود ہے۔ وہ اپنی قوم کو تو مخاطب کرتے ہیں لیکن پیغام پوری انسانیت کے لیے دیتے ہیں:

نگاہ بلند، سخن دلنواز، جاں پر سوز

یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کے لیے

یہ وہ معیار ہے جس پر کسی بھی تہذیب کی بنیاد ڈالی جاسکتی ہے، مغربی تہذیب بھی۔

3- استعمار کے خلاف فکری مزاحمت اور بغاوت

اقبالؒ کا یہ کارنامہ بھی حیران کن ہے کہ انہوں نے مغرب کی علمی دنیا کے سامنے کھڑے ہو کر مغرب ہی کی کمزوریوں کو بے نقاب کیا، مغرب میں اقبالؒ کی اہمیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ ایک ایسی آواز ہیں جو مغرب کے فکری استعمار کو چیلنج کرتی ہے مگر دشمنی کے بغیر، نفرت کے بغیر، تلخی کے بغیر، سچائی اور وقار کے ساتھ، بلکہ تہذیبی وقار کے ساتھ۔ وہ کہتے ہیں:

نہ ستاروں میں ہے پنہاں، نہ تقدیر میں ہے

جو ہمارے ہاتھ میں ہے، وہ ہماری ہمت ہے

یہ پیغام صرف ایشیا یا افریقہ کے غلاموں کے لیے نہیں تھا بلکہ یہ پیغام غلام قوموں کے لیے تحرک تھا مگر آج مغرب میں بھی وہ قومیں جو سرمایہ دارانہ نظام کے شکنجے میں جکڑی ہوئی ہیں، اس پیغام سے قوت حاصل کر رہی ہیں۔ اقبالؒ کی شاعری سے نئی قوت حاصل کر رہے ہیں۔

4- اقبالؒ کا مغرب کے علمی حلقوں میں مقام۔ مغربی علمی دنیا کی گواہی

کہیں بھی آپ جائیں، وہاں اقبالؒ کی فکر پر گفتگو ہوتی ملے گی۔ یقیناً یہ بات حیرت انگیز نہیں کہ آج آکسفورڈ، ہارورڈ، سوربون، برلن، ویانا، اور کیمبرج جیسے اداروں میں اقبالؒ پر تحقیقی مقالے لکھے جا رہے ہیں۔ کورس پڑھائے جا رہے ہیں، اور ان کی شاعری کے تراجم مغرب کے کتاب گھروں میں جگہ پا رہے ہیں۔ برطانوی اسکالر ریمنڈ ڈوسن نے کہا تھا

“Iqbal is the voice of Eastern revival.”

جرمن فلسفی این میری شیمیل نے کہا:

“He is one of the few poets whose words seem to speak beyond centuries.”

یہ آواز کوئی معمولی آواز نہیں، یہ وہ نغمہ ہے جو زمانوں کو عبور کرتا ہے۔

اس میں کوئی حیرت نہیں۔ اقبالؒ نے یورپ کو محض دیکھا نہیں، اس کے ذہن کو پڑھا تھا۔ اس کے طاقتور پہلوؤں کو سراہا اور اس کی کمزوریوں کو بے نقاب کیا۔ انہوں نے کہا تھا:

میں یورپ کے چہرے سے حیرت زدہ تھا مگر اس کے دل سے غافل نہ ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب کے مفکرین اقبالؒ کو ایک ایسے نقاد تہذیب کے طور پر دیکھتے ہیں جس نے انصاف سے کام لیا۔ نہ غیر ضروری تعریف کی نہ بے جا تنقید۔

اقبالؔ — مستقبل کی سمت متعین کرنے والی آواز

انسان کے پاس طاقت ہے مگر منزل نہیں۔ دنیا نئے دور کے دہانے پر کھڑی ہے۔ دنیا مصنوعی ذہانت، جینو کمس، روبو کمس اور نیو کلیئر قوت کے دور میں داخل ہو چکی ہے۔ سوال یہ نہیں کہ انسان کیا کر سکتا ہے، اصل سوال یہ ہے کہ کیا کرنا چاہیے؟ یہ وہ سوال ہے جس کا جواب مغرب ابھی تک تلاش نہ کر سکا۔ مگر اقبالؔ نے برسوں پہلے کہہ دیا تھا:

عقل عیار ہے، سو بھیس بدل لیتی ہے

عشق بے چارہ نہ ملا ہے، نہ زاہد، نہ حکیم

اقبالؔ عقل کو رد نہیں کرتے، بلکہ عقل اور عشق کی ہم آہنگی چاہتے ہیں۔ یعنی صرف عقل راستہ نہیں دکھا سکتی، روحانی شعور لازمی ہے۔ اگر مغرب اقبالؔ کے اس توازن کو سمجھ لے تو وہ نہ صرف اپنے روحانی بحران سے نکل سکتا ہے بلکہ انسانیت کو بھی نئی جہت دے سکتا ہے۔ اقبالؔ کے نزدیک اصل تہذیب وہ ہے جس میں علم اور روح دونوں ہم آہنگ ہوں۔ اگر یہ پیغام مغرب سمجھ لے تو وہ نہ صرف اپنے بحران سے نکل سکتا ہے بلکہ انسانیت کو ایک نئی سمت دے سکتا ہے۔

اقبالؔ مغرب کو کیا سکھاتے ہیں؟

اقبالؔ مغرب کو پانچ بڑی تعلیمات دیتے ہیں

انسان کائنات کا مقصود ہے، انسان خدا کی زمین پر اس کا نائب ہے — کوئی بے مقصد بھٹکا ہوا ایٹم نہیں۔

مقصدیت کے بغیر آزادی تباہی اور اخلاقیات کے بغیر آزادی فریب بن جاتی ہے

سائنس ضرورت ہے مگر روح اس کی رہنما ہو۔ روحانی استحکام کے بغیر سائنس خطرناک ہے۔

اخلاقیات کے بغیر جمہوریت فریب ہے۔ سرمایہ داری اور سوشلزم دونوں انسان کے بغیر ادھورے ہیں۔ سرمایہ داری کے بغیر سماجیت ظلم ہے، اور

سماجیت کے بغیر آزادی غلامی ہے۔

زندگی ارتقاء کا نام ہے — حرکت، جستجو اور مسلسل تخلیق، مسلسل ارتقاء، اور مسلسل بلند

پروازی کا نام ہے۔ اقبالؔ فرماتے ہیں:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

یہ مغرب کے لیے پیغام ہے کہ ترقی کا سفر ختم نہیں ہوا، اسے صحیح سمت دینا باقی ہے۔ یہ اسباق ہر تہذیب کو درکار ہیں، مگر مغرب کو ان کی ضرورت کہیں

زیادہ ہے۔ اس لئے مغرب میں فکرِ اقبالؔ کی اشد ضرورت جتنی آج ہے، اس سے قبل نہیں تھی اور یہ اعتراف مغرب کے علمی حلقوں میں کیا جا رہا ہے

کہ: مغرب ایک دورا ہے پر ہے۔ اسے سائنس تو ملی، مگر سکون نہیں۔ آزادی ملی، مگر تعلق نہ ملا۔ دولت ملی، مگر محبت نہ ملی۔ طاقت ملی، مگر مقصد نہ

ملا۔ اقبالؔ اسی مقصد کا نام ہیں۔ وہ انسان کو دوبارہ مرکزیت دیتے ہیں۔ وہ روح کو دوبارہ زندگی دیتے ہیں۔ وہ تہذیب کو دوبارہ اخلاق دیتے ہیں۔ وہ عقل و

عشق کو ہاتھوں میں ہاتھ دے کر آگے بڑھنے کی راہ دکھاتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ پیغام مغرب کو بتاتا ہے کہ ترقی کا سفر ختم نہیں ہوا، مگر اس کی سمت درست کرنی ضروری ہے۔

خواتین و حضرات!

اقبالؒ مشرق کے شاعر نہیں۔ اقبالؒ کی فکر محض مسلمانوں کی میراث نہیں، وہ انسانیت کے شاعر ہیں۔ ان کی نگاہ زمین کے کناروں تک محدود نہیں، آسمانوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ ان کا درد عالمی ہے، ان کی نگاہ کائناتی، ان کا پیغام ازلی۔ وقت آگیا ہے کہ مغرب اقبالؒ کو محض "پیوٹ آف ایسٹ" نہ کہے بلکہ "آرکیٹیکٹ آف ہیومن" کے طور پر پہچانے۔ اقبالؒ نے کہا تھا:

آئیے آخر میں اقبالؒ کے چند اشعار کے ساتھ اس گفتگو کو سمیٹتے ہیں:

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ

مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

اس جلوہ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ

ایام جدائی کے ستم دیکھ، جفا دیکھ

ایک اور جگہ اقبالؒ فرماتے ہیں:

نئے نیاز مانہ، نئے صبح و شام پیدا کر

خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی

نہ ہو تو مردِ مسلمان بھی کافر و زندیق

مغرب آج انہی سچائیوں کا محتاج ہے، اور اقبالؒ اسی عظیم سچائی کا نام ہیں۔ یہ سوچ زمین کی نہیں، آسمان کی بھی ہے۔ اور شاید اسی لیے مغرب کو آج اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

(اقبالؒ اکیڈمی لاہور کے زیر اہتمام سپارز کالج چوینیاں میں صدارتی خطاب)

خطرے کی گھنٹی یا حوصلے کا پرچم؟

پہلگام کے سائے میں ہندوپاک کی نئی داستان

جب تاریخ قلم اٹھاتی ہے، تو محض واقعات کا ردیف قافیہ مرتب نہیں کرتی، بلکہ زمانے کے دھڑکتے ہوئے نبضوں کو الفاظ کے قالب میں ڈھالتی ہے۔ جب تاریخ کی زلف پریشاں میں خون کی مہک بسی ہو اور سیاست کی پیشانی پر بارود کی لکیر ابھر آئے، تب ایک معمولی واقعہ بھی تاریخ کا رخ موڑ دیتا ہے۔ پہلگام حملہ، جس نے دونوں ملکوں کو کشیدگی کے نازک پل پر لا کھڑا کیا، محض ایک عسکری جھڑپ نہیں بلکہ اس کے پس منظر میں کئی تہیں چھپی ہیں۔ پہلگام کے دھماکہ خیز لمحے نے ایک بار پھر برصغیر کے دو ایٹمی ہمسایوں — بھارت اور پاکستان — کو اس موڑ پر لا کھڑا کیا جہاں ایک لفظ، ایک گولی یا ایک پرچم کی جنبش پوری دنیا کے امن کو لرزاسکتی ہے۔ یہ صرف سرحدوں کی گرج نہیں تھی، بلکہ دلوں کے دھڑکنے، ذہنوں کے جلنے اور بیانیوں کے بننے بگڑنے کا موسم تھا۔ گزشتہ دنوں ایک ٹل جانے والی قیامت کا ہر نکتہ نہ صرف حالیہ تناظر کا احاطہ کرتا ہے بلکہ ماضی کی گواہی بھی ساتھ لیے ہوئے چیخ چیخ کر عبرت دلارہا ہے۔

مئی 2025ء کے آغاز پر ہونے والے اس چار روزہ تنازع میں پاکستانی فوج نے نہ صرف اپنے دشمن کو منہ توڑ جواب دیا بلکہ یہ یقین بھی دلادیا کہ وہ اب محض دفاعی قوت نہیں بلکہ حکمت عملی سے لیس ایک مربوط عسکری ادارہ ہے۔ یہ مظاہرہ پہلی بار نہیں تھا۔ 1965 اور 1999 کی جنگیں اس حقیقت کا بین ثبوت ہیں کہ پاکستانی فوج، عددی لحاظ سے بڑے دشمن کے خلاف بھی مؤثر دفاع کر سکتی ہے۔

اس بار بھی، بھارت کو جس برق رفتاری، ٹیکنالوجی، اور غیر متوقع ردِ عمل کا سامنا کرنا پڑا، وہ عسکری اصطلاح میں جنگی مہارت میں "حیران کن کارکردگی" ثابت ہوا ہے جس سے پاکستانی فوج کے عسکری اعتماد نے جہاں بھارت اور اسرائیل کو ناکوں چنے چبوائے وہاں اس کے اتحادیوں کیلئے بھی حیران کن ثابت ہوا ہے۔

پاکستانی عسکری قوت نے اس جھڑپ میں وہ کچھ دکھایا جو بسا اوقات عسکری نظریے کی نصابی کتابوں میں بھی صرف تصور ہی کی حد تک موجود ہوتا ہے۔ فوجی توازن کے عالمی بیانیوں پر اگرچہ پاکستان کو عددی برتری حاصل نہیں، مگر جس جرأت، چابکدستی اور حکمت عملی سے اُس نے بیک وقت کئی محاذوں پر اپنی موجودگی کا احساس دلایا، وہ بھارت کیلئے ناقابلِ تصور تھی۔ اس عسکری رسوخ نے داخلی طور پر بھی ایک نئی جہت کو جنم دیا۔

جنرل عاصم منیر، جو کبھی سیاسی پس منظر کی دھند میں تنقید کے نشتر سہہ رہے تھے، آج اسی فوجی کامیابی کے صدقے ایک مقبول قومی علامت کے طور پر ابھرے ہیں۔ اُن کی قیادت میں پاکستانی افواج نے نہ صرف دشمن کی عسکری پیش قدمی کو روکنے میں کامیابی حاصل کی، بلکہ عالمی سطح پر پاکستان کے موقف کو اجاگر کرنے کی مہم میں بھی پیش پیش رہی۔

ادھر دوسری طرف چین کی خارجہ پالیسی کی بنیادی روح "توسیع نہیں، تسلط" پر مرکوز ہے۔ وہ براہِ راست مداخلت کی بجائے اپنے اتحادیوں کے ذریعے طاقت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ پاکستان اس پالیسی میں اس کا سب سے بڑا تزییناتی ہتھیار ہے۔ اس واقعہ کے جغرافیائی اثرات محض دہلی اور اسلام آباد تک محدود نہیں رہے۔ چین، جو پہلے ہی لداخ کے دُھند لکوں میں بھارت سے نبرد آزما ہے، اب پاکستان کی دفاعی کارکردگی کو اپنے حق میں ایک مضبوط دلیل

کے طور پر دیکھ رہا ہے۔ لداخ میں بھارت سے تناؤ، تائیوان میں امریکی حمایت یافتہ خود مختاری کی تحریک، اور بحیرہ جنوبی چین میں نیوی کی مشقیں۔ ان تمام محاذوں پر چین اب ایک نئی "ملٹری ٹیکنالوجی پاور" کے طور پر ابھر رہا ہے۔

چین، جو خطے میں اپنی بالادستی کے خواب کو حقیقت میں ڈھالنے کیلئے کوشاں ہے، پاکستان کی عسکری مستعدی کو اپنے لیے تقویت سمجھتا ہے۔ لداخ اور گلوان میں بھارت کے ساتھ پہلے ہی اس کا تناؤ جاری ہے۔ ایسے میں پاکستانی فورسز کا حوصلہ، بہادری، تجربہ کاری کا دفاعی رد عمل چین کیلئے جہاں ایک تزویراتی اتحادی کی حیثیت رکھتا ہے وہاں چین کی قوت کو تقویت اور عالمی طاقتوں کی نئی صف بندی کے وکٹری سٹیڈ پر برتری کے درجے پر کھڑا کر دیا ہے۔ پاکستان کی دفاعی حکمت عملی، چین کے اس مفروضے کو تقویت بخشتی ہے کہ جنوبی ایشیا میں بھارت کی عسکری بالادستی اب ایک خواب نیم شب ہو چکی ہے۔

بیلٹ اینڈ روڈ منصوبہ ہویاسی پیک، چین کی سوچ معاشی راستوں سے فوجی راہداری تک جا پہنچی ہے۔ اس حالیہ تنازع میں پاکستان کی مستعدی نے چین کو ایک ایسا دفاعی "کلیموور" فراہم کیا ہے جو نہ صرف بھارت کی توسیع پسندی کو چیلنج کرتا ہے بلکہ امریکا کو بھی یہ پیغام دیتا ہے کہ ایشیا بیک قطبی نہیں رہا۔ یہ وہی مثلث ہے جو 1971 میں امریکا، چین اور پاکستان کے درمیان دکھائی دی تھی، جب ہنری کسنجر نے پاکستان کے ذریعے چین کا دورہ کیا تھا۔ آج بھی وہی رشتہ نئی شکل میں قائم ہے۔ یوں یہ تنازع صرف دو ہمسایہ ممالک کے درمیان ایک وقتی کشیدگی نہیں، بلکہ عالمی طاقتوں کی صف بندی کا ایک آئینہ بھی ہے۔

یاد رہے کہ بھارت نے گزشتہ کئی برسوں میں پاکستان سے سفارتی فاصلہ رکھنے کی پالیسی اختیار کی تھی لیکن حالیہ کشیدگی نے اسے ایک بار پھر اس دائرے میں کھینچ لیا ہے جہاں اسے پاکستان کو براہ راست جواب دینا پڑتا ہے۔ یہ خارجہ پالیسی کی وہ لغزش ہے جس کا اندازہ نہرو کے دور میں بھی ہوا تھا جب 1962 کی چین-بھارت جنگ میں بھارت کو عالمی حمایت حاصل کرنے کیلئے عجلت میں فیصلے کرنے پڑے۔

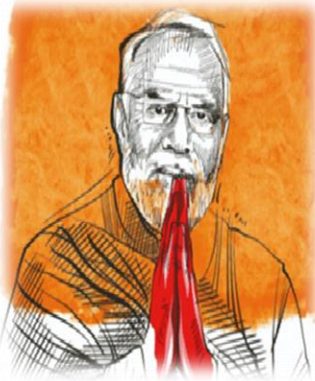
سیاست میں لفظ بھی ایک ہتھیار ہے، اور بیانیہ وہ میزائل جو دلوں اور اذہان کو نشانہ بناتا ہے۔ اس کشمکش میں جہاں بھارت کے وزیراعظم نریندر مودی اپنی تقریروں میں "سندور" کی قسم کھا کر قوم پرستی کے دیوتا کو پکار رہے تھے، وہیں پاکستان نے اقوام عالم کے سامنے اپنا موقف پیش کیا کہ دہلی خود خطے کو جنگ کے دہانے پر لا رہا ہے۔ مودی کا یہ کہنا کہ "میری رگوں میں سندور بہتا ہے" ایک مذہبی علامت سے زیادہ، سیاسی اسلحہ تھا جس سے بھارت کی داخلی سیاست کو گرما یا گیا لیکن سوال یہ ہے کہ کیا قومی مفادات کے محافظین کے ہاتھ میں جذبات کی شعلہ بیانی ایک محفوظ ہتھیار ہے؟

نریندر مودی کا انتخابی جلسے میں وہ بیان کہ "میری رگوں میں سندور بہتا ہے..." سکھ چین سے روٹی کھاؤ ورنہ میری گولی تو ہے ہی، صرف ایک سیاسی نعرہ نہیں بلکہ خطے کی ایٹمی سلامتی کے منہ پر ایک کھلا طمانچہ ہے جس کے ذریعے مذہبی جذبات کو ہوا دے کر قوم پرستی کا پرچم بلند کیا گیا لیکن نہ تو یہ طرز خطاب تاریخ میں نیا نہیں بلکہ اس کا شرمناک انجام بھی تاریخ نے محفوظ کر رکھا ہے تاکہ دنیا اس سے عبرت حاصل کرے۔ اس طرح کی دہمکی آمیز، بازاری اور معاندانہ زبان نہ صرف بین الاقوامی آداب سیاست کی توہین ہے بلکہ اقوام متحدہ کے چارٹر کی روح کی بھی منافی ہے۔ ایسی زبان، ایسی سنگینی، ایک ایسے وقت میں جب خطے پہلے ہی کشیدگی کے شعلوں میں گھرا ہو، غیر معمولی تشویش کا باعث بن گئی ہے۔ عالمی میڈیا، سفارتی حلقے، اور امن پسند قویوں اس طرز بیان پر حیران ہیں کہ ایک ایٹمی ریاست کا وزیراعظم کس بے باکی سے جنگی ترانے گاتا ہے۔

تاریخ میں اگرچہ سیاست دانوں نے جرات آمیز الفاظ کہے ہیں، مگر کبھی بھی اس حد تک شخصی انتقام کی آگ کو انتخابی ایندھن نہیں نایا گیا۔ اندرا گاندھی نے 1971 میں مشرقی پاکستان کے خلاف جنگ سے قبل بھی اسی قسم کی تقاریر کی تھیں اور 1971 میں اندرا گاندھی نے بنگلہ دیش کے تناظر میں تلخ بیانات ضرور دیے تھے، مگر ایسی دہمکی آمیز زبان استعمال کرنے سے انہوں نے بھی گریز کیا تھا۔ مودی کی تقاریر، اس کے برعکس، ہندو تو انظریے، نفرت، اور ذاتی غرور کا پرچار بن چکی ہیں۔ انتخابات جیتنے کیلئے مودی کا یہ نیا ڈرامہ کوئی نیا نہیں، اس سے قبل بھی وہ گجرات کے قصاب کے نام سے مشہور ہے جب اس نے بطور انڈین گجرات کے وزیر اعلیٰ ہوتے ہوئے مسلمانوں کے قتل عام کا نہ صرف حکم دیا بلکہ ایک سازش کے تحت اب بھی انڈیا میں مسلمانوں کے خاتمے کیلئے کھلم کھلا بیان بازی کرتا رہتا ہے۔

مودی کی گولی والی دھمکی نہ صرف اسی سیاسی سکرپٹ کا حصہ ہے بلکہ اس کی مکاری اور ذہنی بیماری کی نشاندہی بھی کرتی ہے کہ ایٹمی ملک کے ایسے شدت پسند سربراہ سے دنیا کو کس قدر شدید خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔ بھارت کے اندر کانگریس جیسی جماعتیں اس موقع پر بی بی جے پی کی خارجہ پالیسی کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے اس ساری صورتحال کو بی بی جے پی کی خارجہ پالیسی کی ناکامی سے تعبیر کر رہی ہیں۔ وہ یہ دعویٰ کر رہی ہیں کہ بھارت کی سفارتکاری، جو کبھی ایک عالمی مثال ہو کر تھی، آج ردِ عمل اور اشتعال انگیزی کی راہوں پر گامزن ہے اور بھارت کی جارحانہ پالیسی درحقیقت اس کے عالمی تنہائی کا باعث بن رہی ہے۔ یہ احتجاج اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ معاملہ صرف عسکری یا سفارتی نہیں، بلکہ داخلی سیاسی حرکات کا بھی عکاس ہے۔ خارجہ پالیسی کا ناکام ہونا درحقیقت اندرونی سیاسی کشمکش کا اظہار ہے۔ 2002 میں گجرات فسادات کے بعد بھی بھارت کو سفارتی سطح پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا اور آج تک بھارت کے چہرے کی بدترین کالک کے طور پر تاریخ میں رقم ہو چکا ہے۔

پاکستان اور بھارت دونوں جوہری طاقتیں ہیں اور ان کے درمیان بڑھتی ہوئی کشیدگی دنیا بھر کیلئے لمحہ فکریہ ہے۔ کارگل جنگ کے دوران بھی عالمی برادری نے بروقت مداخلت کی تھی تاکہ دو ایٹمی ریاستیں کسی حماقت میں نہ پڑ جائیں۔ کیا ہم آج بھی اسی دہلیز پر کھڑے ہیں؟ کیا برصغیر ایک بار پھر تاریخ کی بھیٹی میں جھونکا جائے گا؟



رافال "بمقابلہ" "جے 10 سی" کا موازنہ دراصل صرف طیاروں کا نہیں بلکہ دو نظریات کا ہے۔ فرانس سے حاصل کیے گئے رافال اور چین سے لیے گئے جے 10 سی اس بات کی علامت ہیں کہ دونوں ممالک ٹیکنالوجی کے میدان میں اپنے اپنے اتحادیوں کے ساتھ وابستہ ہیں۔ جہاں ایک طرف "رافال" بمقابلہ "جے 10 سی" کی ہوائی جھڑپوں پر دنیا کی نظریں مرکوز ہیں، وہیں سوال یہ بھی جنم لیتا ہے کہ آیا یہ سب ایٹمی جنگ کے دہانے کی طرف پیش قدمی ہے؟ کیا برصغیر کی فضاؤں میں گونجتی ہوئی جنگی گرج مستقبل کی امن فاختاؤں کو ہمیشہ کیلئے خاموش کر دے گی؟

پاکستان میں گرائے گئے اسرائیلی ساختہ ہاروپ کامی کا ڈرون ہو یا براہموس میزائل کا راستہ بھٹک جانا یہ سب نئی جنگی حکمت عملی کا حصہ ہیں، جہاں انسان کم اور مشینیں زیادہ بولتی ہیں۔ یہ دراصل چوتھی نسل کی جنگ (فور تھ جنریشن وارفیئر) ہے جہاں دشمن کا چہرہ دھند میں چھپا ہوتا ہے اور حملہ خاموش ہوتا ہے۔ ہاروپ ڈرون اب محض جاسوسی نہیں کرتے بلکہ وہ "لوٹیرنگ ایمنیشن" جیسے خفیہ ہتھیاروں میں تبدیل ہو چکے ہیں جو فضا میں

شکار کی تلاش میں گردش کرتے ہیں۔ یہ حکمت عملی نہ صرف دفاع بلکہ نفسیاتی برتری کا بھی ایک آلہ بن چکی ہے۔ ان ڈرونز کے ناقابل تخیل ہونے کے اسرائیلی جنگی مافیا کو شدید دھچکا پہنچا جب اس کا سارا جنگی غرور خاک میں مل گیا اور پاکستان نے نہ صرف درجنوں ڈرون مار گرائے بلکہ نصف درجن ڈرونز کو جام کر کے زمین پر اتار لیا گیا اور اب ان کے ماتھے پر خطرات کا پسینہ خشک ہونے کا نام نہیں لے رہا کہ اس طرح ان کی یہ ٹیکنالوجی بھی پاکستان کے ہتھے لگ گئی ہے۔

اسرائیل اور بھارت تو یہ سمجھتے تھے کہ یہ ڈرون دشمن کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا کر اسے لاغر کر دیتا ہے لیکن اسرائیل کا یہ دعویٰ بھی اقوام عالم کے دفاعی تجزیہ نگاروں کیلئے مذاق کا نشانہ بن گیا ہے۔ پاکستان کی جانب سے گرائے گئے اسرائیلی ساختہ ڈرونز، براہموس میزائل کا بھٹک جانا، اور فضائی حدود کی خلاف ورزیاں صرف عسکری معاملات نہیں، بلکہ جدید ٹیکنالوجی کی اس جنگ کا حصہ ہیں جو مستقبل کے محاذوں کی نقشہ کشی کر رہی ہیں۔ عسکری سائنس میں اب یہ ممکن ہے کہ کسی فضائی حملے یا دراندازی کو الیکٹرانک سنگینجر سے پرکھا جائے۔ یہ طریقہ کار نیٹو افواج نے 1991 کی خلیجی جنگ میں استعمال کیا تھا۔ پاکستان اور بھارت کے دعوے اسی جدید اصول پر پرکھے جا رہے ہیں۔

یاد رہے کہ پاکستانی فضائیہ نے بالاکوٹ کی فضائی ڈاگ فائٹ کے بعد نہ صرف ایک مرتبہ پھر نئی فضائی تاریخ رقم کی، بلکہ عالمی میڈیا کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ اس سے قبل بالاکوٹ کی جھڑپ میں پاکستانی فضائیہ نے نہ صرف بھارتی فضائیہ کے دو اہم طیارے مار گرائے تھے بلکہ اپنی فضائی حدود میں واضح برتری کا عملی مظاہرہ بھی کیا۔ آزاد ذرائع، سیٹلائٹ فوٹیج اور آزاد مبصرین کی رپورٹس نے تصدیق کی تھی کہ بھارت کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔

اب ایک مرتبہ پھر بھارت کو پہلے سے بھی کہیں زیادہ نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ مودی مسلسل اپنے گودی میڈیا پر اپنی جھوٹی فتح کے نعرے لگو اتار رہا، کبھی لاہور پر مکمل فتح اور کراچی کی بندرگاہ پر قبضہ کی خبریں نشر کروا رہا اور کبھی بلوچستان کی علیحدگی اور پاکستانی فوج کے سربراہ سمیت موجودہ حکومت کے اہم سرکردہ سیاستدانوں کی گرفتاری کی خبریں چلائی گئیں لیکن جب اس سے اگلے دن پاکستانی حملے نے مودی کے پروپیگنڈے کے غبارے کو پھوڑ کر رکھ دیا اور رافیل سمیت دوسرے جہازوں کی ارنٹھی اسی کی سرزمین پر سجادی تو مودی اور اسرائیل کو اپنے آقا امریکی صدر ٹرمپ کے پاؤں پکڑنے پڑے تو تب جا کر خود رافیل کمپنی کو بھی اپنے جہازوں کی تباہی کو تسلیم کرنا پڑا۔

اس مبینہ ڈاگ فائٹ پر انڈین حکام نے تاحال کوئی تبصرہ نہیں کیا جبکہ پاکستانی فضائیہ کے ڈپٹی چیف آف ایئر آپریشنز ایئر وائس مارشل اورنگزیب کا کہنا تھا کہ "یہ ایک بی وی آر (ہیٹ ویڈیو ریل رنچ) لڑائی تھی جس میں انڈیا کے 70 جنگی طیاروں اور پاکستان کے 40 جنگی طیاروں نے حصہ لیا، یعنی کل 100 سے زیادہ طیارے تھے جو کہ ہوا بازی کی تاریخ میں پہلی بار ہوا ہے۔ پاکستانی فضائیہ کی طرف سے اس کارروائی میں جے ایف 17 اور جے 10 طیاروں نے حصہ لیا تاہم انہوں نے اس حوالے سے تبصرہ نہیں کیا کہ آیا پاکستان نے چینی ساختہ پی ایل 15 استعمال کیا۔

ان کا کہنا تھا کہ پاکستان کا فضائی دفاعی نظام بہت مؤثر ہے اور "ایک کل اسی (زمین سے فضا میں مار کرنے) کی بدولت ممکن ہوا"۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ یہ کارروائی ایک گھنٹے تک جاری رہی۔ انڈین طیاروں کے رونا ہونے کے بعد پاکستانی فضائیہ نے اپنا ملٹی ڈومین آپریشن شروع کیا"۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ 6 مئی کی شب ایک گھنٹے تک جاری رہنے والی اس ڈاگ فائٹ میں انڈین فضائیہ کے 72 طیاروں میں سے 14 رفال طیاروں کی الیکٹرانک نشانہ بندی کی

گئی تھی جبکہ پاکستان نے اس آپریشن میں 42 جنگی طیارے استعمال کیے۔ ان کا کہنا تھا کہ 'لاہور، اسلام آباد اور دیگر فضائی حدود میں سولین ایئر ٹریفک کی حفاظت کیلئے اس کا راستہ تبدیل کروایا گیا۔'

ایئر وائس مارشل اور نگزیب احمد کے مطابق جیسے ہی انڈین طیاروں نے اپنے ہتھیار استعمال کیے تو پاکستانی فضائیہ کے طیاروں نے "ہو امیں رولز آف دی گیم تبدیل کر لیے۔" انڈیانے پچھلی بار کہا تھا کہ اگر ان کے پاس رفال ہوتے تو نتیجہ کچھ اور ہوتا۔ تو ہم نے رفال طیاروں کو نشانہ بنایا۔ ہمارے پاس مزید نمبرز ہو سکتے تھے مگر ہم نے تحمل دکھایا۔"

پاکستانی فضائیہ نے دعویٰ کیا کہ تین رفال طیارے بھنڈے، جموں اور سرینگر کے قریب مار گرائے گئے جبکہ 29 مگ اور 30 کو سرینگر کے پاس مار گرایا گیا۔ بعد ازاں عالمی میڈیا پر ان کی تباہی کے ویڈیو نے انڈین گودی میڈیا کو منہ بند رکھنے پر مجبور کیا۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ خود بھارتی ایئر چیف مارشل کی سطح پر اس نقصان کا اعتراف کیا گیا۔ ان کا کہنا تھا "ہمیں کچھ نقصانات ضرور ہوئے ہیں جن پر نظر ثانی کی جا رہی ہے۔" یہ اعتراف گویا اس خفت کا عکس تھا جو انڈین فضائیہ کو بالاکوٹ کے بعد پہلے ہی برداشت کرنا پڑا تھا۔ اُس وقت بھی پاکستان نے نہ صرف دو بھارتی جہاز گرائے تھے بلکہ ونگ کمانڈر بھی نندن کوزندہ گرفتار کر کے عالمی سطح پر اخلاقی و عسکری برتری حاصل کی تھی۔

یاد رہے، بالاکوٹ کے بعد ہی انڈیانے یہ شکوہ کیا تھا کہ اگر ہمارے پاس رافیل طیارے ہوتے تو نتیجہ مختلف ہوتا مگر آج، رافیل کی موجودگی کے باوجود نتائج وہی رہے، بلکہ اس بار پاکستانی جے-10 سی طیاروں نے نہ صرف مقابلہ کیا بلکہ فضائی حدود میں دشمن کے عزائم کو ملیا میٹ کر دیا۔ یہ نئی کامیابی پاکستانی فضائیہ کیلئے ایک ایسا تمغہ ہے جس نے 1965 کے ایم ایم عالم کے کارنامے کی یاد تازہ کر دی۔ بین الاقوامی دفاعی جریدے "جیزڈ ایفیس ویکی" اور "دی نیویارک ٹائمز" سمیت عالمی اداروں نے تسلیم کیا کہ اس ڈاگ فائٹ میں پاکستان نے عسکری، تزویراتی اور ٹیکنالوجیکل اعتبار سے بازی اپنے نام کی۔

امریکا جنوبی ایشیا میں ہمیشہ سے ایک متذبذب نگران کا کردار ادا کرتا آیا ہے۔ امریکا کی آئندہ حکمت عملی یقیناً ہمارے سامنے ہے اور امریکا کی سلامتی کونسل میں اسرائیلی مظالم کو روکنے کیلئے سلامتی کونسل میں جو قرارداد لائی گئی، اس کو امریکا نے ویٹو کر کے مسترد کر دیا جس کی ساری دنیا میں مذمت کی جا رہی ہے اور اس وقت انڈیا کو اسرائیل کی مکمل پشت پناہی حاصل ہے بلکہ دوسرے لفظوں میں وہ انڈیا میں آکر پاکستان کا ہمسایہ بن چکا ہے تاہم موجودہ حالات میں واشنگٹن کی توجہ تائیوان، یوکرین اور مشرق وسطیٰ کی جانب بھی منقسم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خطے میں اس کا کردار اب محض ثالث یا تماشائی کا نہیں رہے گا بلکہ وہ چین کے خلاف "اسٹریٹجک کمنٹینمنٹ" کے تحت بھارت کو دفاعی ہتھیار، سیٹلائٹ ڈیٹا اور عسکری تعاون فراہم کرے گا اور اسرائیل بھی انڈیا کو جدید اسلحہ فروخت کر کے اپنا مال بھی بناتا رہے گا۔

یہی حکمت عملی سرد جنگ کے زمانے میں پاکستان کے ساتھ اپنائی گئی تھی، اور آج وہی نکتہ نظر بھارت کے ساتھ دہرایا جا رہا ہے۔ امریکا چین کو روکنے کیلئے بھارت کی عسکری مضبوطی کو ضروری سمجھتا ہے، مگر اس کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پاکستان مکمل طور پر چین کے بلاک میں چلا جائے۔ یوں خطہ ایک نئی سرد جنگ کے دہانے پر آکھڑا ہوا ہے۔

یہ سوال ہنوز قائم ہے: کیا برصغیر اپنی تاریخ کے المیوں سے کچھ سیکھ پائے گا؟ یا ماضی کی طرح پھر کوئی لمحہ، کوئی سیاست، کوئی فقرہ ایک ایسی جنگ کو جنم دے گا جس کا کوئی فاتح نہ ہو گا؟ تاریخ کی راہوں پر جب قومیں اپنے نظریات، عسکری بصیرت، اور تہذیبی شعور کے ساتھ چلتی ہیں، تو صرف جنگ نہیں جیتی جاتیں، بلکہ نسلیں محفوظ ہوتی ہیں۔ یہ تنازع ہمیں ایک بار پھر یاد دلاتا ہے کہ طاقت صرف بندوق کی گرج میں نہیں، دانش کی گہرائی اور گفتار کی بلاغت میں بھی پنہاں ہوتی ہے۔

یہ خطہ، جو کبھی شاعروں کی نغمہ سنجی، صوفیوں کی نرمی اور مفکرین کی حکمت کا گہوارہ رہا، کیا دوبارہ خون کی چھینٹوں سے لت پت ہو گیا امن کی امید بن کر جگمگائے گا؟ جواب ہمارے بیانے میں ہے، ہماری قیادت میں ہے، اور ہماری دعا میں ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ دشمنی کے خیمے لپیٹے جائیں اور امن کے دیئے روشن کیے جائیں۔ مودی اگر سندور میں خون گھول دے، تو امن کی ہر دعا رد ہو جاتی ہے۔

انتخاب ہمارا باقی ہے۔ اب سوال یہ نہیں رہا کہ جنگ کون جیتے گا؟ بلکہ، "اسے روکنے کی ہمت کون کرے گا؟ اس سر زمین کی تقدیر کا اگلا باب، غصہ نہیں، حکمت کو لکھنے دیں، لیکن مجھ جیسے لاتعداد امن پسندوں کو اس بات کا خوف کیوں ہے کہ امن کے بدنام زمانہ دشمنوں سے اس خوبصورت دنیا کو چھڑانے کی امیدیں دم توڑ رہی ہیں؟ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ امن دشمن اپنی آنے والی نسلوں کے لیے کیا پیغام چھوڑ کر جائیں گے؟

بروز جمعہ المبارک 27 جمادی الثانی 1447ھ 19 دسمبر 2025ء

مودی کے بیانات: خطے میں آگ یا راکھ؟

دنیا کے سیاسی افق پر کچھ خطے ایسے ہوتے ہیں جو تاریخ کے ہر موڑ پر آزمائش کی بھٹی میں تپتے ہیں۔ جنوبی ایشیا انہی سرزمینوں میں سے ایک ہے، جہاں سرحدیں فقط جغرافیہ کی لکیر نہیں بلکہ نظریات، عقائد اور احساسات کی خونچکاں تاریخ کا استعارہ بن چکی ہیں۔ ایسے میں جب ایک ریاست کا متعصب اور شدت پسند سربراہ، جس کے ہاتھ میں ایٹمی بٹن بھی ہے اور اقتدار کا زعم بھی، اپنے سیاسی جلسے میں کروڑوں پاکستانیوں کے "گولی سے اڑا دینے" کی کھلی دھمکی دے، تو سوال صرف اخلاقیات یا سفارت کا نہیں رہتا۔ بلکہ یہ انسانی تہذیب کے اجتماعی شعور، بین الاقوامی قوانین، اور عالمی اداروں کی بقا کا سوال بن جاتا ہے۔

مودی کا یہ حالیہ بیان، جو گجرات کی زمین پر گونجا، محض ایک انتخابی نعرہ نہیں بلکہ ایک نظریاتی جنون کا اظہار ہے۔ ایک ایسا جنون جو اپنی ہی تاریخ کے آئینے میں شرمندہ نظر آتا ہے، مگر اپنے آس پاس کے دشمنوں پر لاکار کے ذریعے خود کو زندہ رکھنے کی کوشش کرتا ہے مگر یہ لاکار اب ہنسی میں نہیں اڑائی جاسکتی، کیونکہ یہ اس خطے میں بسنے والے دو ایٹمی طاقتوں کے کروڑوں انسانوں کے مستقبل کو جھونکنے کی ایک شعوری کوشش ہے۔

مودی کی گجرات کے ایک جلسے میں پاکستان کے شہریوں کو گولیوں سے اڑانے کی دھمکی نے نہ صرف بین الاقوامی سفارتی آداب کی کھلم کھلا خلاف ورزی کی ہے بلکہ ایک ایسے ذہنی پس منظر کو آشکار کیا ہے جو خطے میں امن کے امکانات کو زائل کرنے میں مصروف ہے۔ یہ دھمکی، جو اخلاقیات اور انسانی حقوق کے اصولوں کے برعکس ہے، نہ صرف ایک جنگی جنون کی علامت ہے بلکہ اس سے بھارت کی داخلی سیاسی صورت حال کا بھی پتہ چلتا ہے جس میں جارحیت کو سیاسی سرمایہ بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ بیان، جو انسانی اقدار کے منافی ہے، ایک ایسے ذہن کی ترجمانی کرتا ہے جو جارحیت اور تفرقہ اندازی میں یقین رکھتا ہے، اور جو خطے کی سلامتی و استحکام کیلئے شدید خطرہ ہے۔

دراصل مودی کے حالیہ تشدد بیان کے پیچھے اس کا شکست خوردہ ضمیر اسے مکاری کے سفر کی طرف لے گیا جہاں وہ ووٹوں کیلئے بڑھکیں مار کر دجل و فریب سے کام لے رہا تھا کیونکہ ایک عالم جان چکا ہے کہ در دیار ہند، جہاں غرور قوم پرستی کا شعلہ ایوانوں میں بلند ہوتا ہے اور دہلی کے ایوان اقتدار میں تکبر، جاہ و منصب کا لباس پہنے بیٹھا ہے، وہاں رافیل نامی وہ پرندے، جن پر خزانہ ملت کے خزف و گوہر لٹائے گئے، طیارہ تقدیر کے دوش پر پاکستان کے جوان ہمت صاعقہ برداروں کے سامنے خاک و خون میں گر گئے۔ جب رافیل کی شکست پر فرانس کی کمپنی نے تین پرندوں کی ہلاکت کا اقرار کیا، تو دہلی کی فسیل غرور پر ایسا سناٹا طاری ہوا، گویا آگرہ کے قلعہ لال پر سیاہ پرچم لہرا نہیں بلکہ آنسو بہا رہا ہو۔

وہی ایڑ مار شل اے کے بھارتی، جن کے بیانات سے پیشتر بادل گر جتے تھے، اب کہنے لگے کہ "جنگ میں نقصان معمول ہے"۔ گویا شکست کو بسکی میں ملفوف کر کے پیش کیا جائے، اور خون کے رسنے کو لفظوں کے رومال سے چھپایا جائے مگر تاریخ کی نگاہ تیز ہے، وہ زخم دیکھ لیتی ہے، وہ چیخ سن لیتی ہے۔ پاکستانی شاہین، جن کی پرواز پاک سرزمین کے افق تک محدود رہی، مگر جن کے فولادی تیر دشمن کی فضاؤں کو کاٹتے ہوئے عبرت کا نشان بنے، محض عسکری چابک دستی نہ تھے، بلکہ پاک و چین کے باہمی تدبر کا مجسمہ بنے۔ اس معرکہ کی جیت، پاکستان کی ہمت سے زیادہ، چین کی تجارتی حکمت اور عسکری فن کا غیر اعلانیہ اعلان تھی۔

در اصل مودی کے شعلہ انگلتے ہوئے بیان کی ایک وجہ یہ بھی ہے جب سیز فائر کی راکھ میں چینی حکمت نے ایک چنگاری رکھی — جب بھارت کی توجہ مغرب میں پاکستان پر تھی، بیجنگ نے مشرق میں اروناچل پردیش کے ۲ مقامات کے نام، چینی و تبتی زبان میں بدل کر یہ پیغام دیا کہ "نقشہ فقط کاغذ پر نہیں بنتے، وہ ذہنوں، دعووں اور قوت ارادہ میں نقش ہوتے ہیں"۔ یہ تبدیلی فقط زبان کی تکرار نہ تھی، بلکہ زمین کی ملکیت کا ادبی اعلان تھا اور جب بھارت نے مشرق کی جانب نظر کی، تو وہاں پہاڑوں کے نام بدلے جا چکے تھے، وادیاں بیگانہ ہو چکی تھیں، اور نقشہ، اُس کا اپنا نہ رہا تھا۔

بھارت کی تینوں سمتوں پر تین دیواریں — چین، پاکستان، نیپال — تناؤ کی تین چٹانیں، جن میں ہندوستان ایک فریب زدہ خواب کی مانند محصور ہو چکا ہے۔ نیپال، چھوٹا سہی، مگر اس کی خودداری نے بھارتی غرور کے قلعے میں دراڑیں ڈال دیں۔ پاکستان، جو اب صرف فوجی نہیں بلکہ فکری قوت بھی ہے اور چین، جس کی طاقت صرف عسکری نہیں بلکہ تمدنی بھی ہے۔ یہ ایسے ہے، جیسے ایک کمزور پروانہ تین شیروں کی کمین گاہوں میں جا گرے، اور سمجھے کہ یہ رات کا بادل ہے، جس سے سلامت گزر جائے گا۔ بس یہی شکست خوردہ مودی کی حالت ہو چکی ہے۔

مودی کے اس بیان کا پس منظر ایک نہایت پیچیدہ اور کشیدہ خطے میں ہے، جہاں بھارت اور پاکستان کے مابین فضائی جھڑپیں، سرحدی کشیدگی، اور نفسیاتی جنگ جاری ہے۔ گزشتہ دنوں بھارتی فضائیہ کے فرانسیسی ساختہ رافیل طیاروں کی تباہی، پاکستان کی عسکری حکمت عملی اور پاک چین تعاون کی بدولت، بھارت کی عسکری اور سیاسی حالت کو ایک نئے سنگ میل پر لے گئی ہے۔

مودی کی دھمکی اسی تناظر میں سامنے آئی ہے، جہاں ایک طرف بھارت نے سر تاج کی طرح اپنی عسکری طاقت کا مظاہرہ کرنے کی ناکام کوشش میں بری طرح منہ کی کھائی ہے اور جہاں عالمی طور پر شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا ہے وہاں دوسری طرف، بھارت کی داخلی اور خارجی پالیسیوں میں شدید الجھن عدم استحکام کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ اور

مودی کے اس جارحانہ بیان کا پس منظر ایک ایسے خطے میں ہے جہاں کشیدگی عروج پر ہے اور حالیہ دنوں میں بھارت اور پاکستان کے مابین فضائی جھڑپیں اور میزائلوں کی بازگشت سنی گئی ہے۔ بھارت نے اس دوران عام طور پر ایک خاموشی کا مظاہرہ اس لئے کیا گیا کہ مودی کو پاکستان کی طرف سے ایسے جواب کا قطعی اندازہ ہی نہیں تھا مگر مودی کی اس تازہ تقریر نے اس خاموشی کی نقاب کشائی کر دی ہے اور بے لاگ جارحانہ بیانیہ سامنے لا دیا ہے۔ یہ تضاد، خاموشی اور دھمکی کے درمیان، بین الاقوامی سیاست میں ایک پرانا المیہ ہے۔ کیا خاموشی واقعی فتح کی علامت ہے یا یہ شکست کا پردہ ہے؟

عالمی سیاست میں خاموشی کو اکثر حکمت اور صبر کی علامت سمجھا جاتا ہے، لیکن تاریخ اس بات کا بھی درس دیتی ہے کہ حکمت صرف اسی وقت کامیاب ہوتی ہے جب وہ بروقت ہو، مناسب ہو اور مثبت نتائج دے۔ اگر دشمن تمہاری حدود میں گھس آئے اور تم زبان سے بھی جواب نہ دے سکو تو یہ خاموشی حکمت نہیں، بزدلی کے سوا کچھ نہیں۔ مودی کے بیان سے قبل، بھارت نے چینی فوج کی سرحدی پیش قدمیوں کے سامنے تو ہمیشہ خاموشی اختیار کی، جو حکمت عملی کی بجائے خوف اور غیر یقینی کی علامت تھی۔ اس کے برعکس، پاکستان نے اپنی عسکری کارروائیوں اور سفارتی حکمت عملیوں سے خطے میں اپنا مقام مستحکم کیا جبکہ چین نے اپنے جغرافیائی دعووں کو عملی جامہ پہنا کر خطے کی سیاست میں نئی جہتیں پیدا کیں۔

تاریخ نے ہمیں بار بار سکھایا ہے کہ حکمت صرف تب ہوتی ہے جب وقت کی نزاکت کو سمجھ کر جواب دیا جائے، اور وہ جواب فتح کی جانب لے جائے۔ سفارتی خاموشی کو اکثر طاقت کی علامت تصور کیا جاتا ہے، لیکن جب یہ خاموشی دشمن کے سامنے گھبراہٹ اور نااہلی کی شکل اختیار کر لے تو پھر یہ

بہادری کے بجائے بزدلی کے سوا کچھ نہیں۔

بھارت کی جانب سے چین کی سرحدی پیش قدمیوں اور سرحد پار داخلوں پر جو رد عمل نظر آیا، وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس خاموشی کے پیچھے کمزوری اور حکمت کی کمی ہے۔ جبکہ پاکستان کے خلاف ہر وقت جارحانہ بیانات دینے والے بھارتی میڈیا اور عسکری حلقے چین کے خلاف مکمل طور پر خاموش ہیں، جو ان کے فکری الجھن اور حکمت کی کمی کو ظاہر کرتا ہے۔

بھارتی سیاسی نظریہ اور حکمت عملی میں جہاں قدیم سیاسی مصلحتوں کا رنگ غالب نظر آتا ہے وہاں چانکیہ کے اصولوں کی جھلک نمایاں ہے، جہاں طاقتور کی فوری تعظیم اور اس کو فوراً خد امان کر سجدہ کیا جاتا ہے اور کمزور کی بے دریغ تنقید شامل ہے، اور اس کو بلا توقف توڑا جاتا ہے۔ اس اصول پر چلتے ہوئے بھارت

بھارت اپنے خداؤں کی تعداد میں بے شمار دیوتا رکھتا ہے، جن میں چوہے اور سانپ بھی شامل ہیں، مگر جب یہ دیوتا کمزور پڑتے ہیں تو ان کے پجاری انہیں بے دردی سے توڑ پھوڑنے میں دیر نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت کا مذہبی و سیاسی منظر نامہ بظاہر متضاد اور الجھا ہوا ہے۔ جہاں خداؤں کی تعداد کروڑوں میں ہے، مگر ہر وقت اپنے ہی دیوتاؤں کے پجاری ان کے خلاف بھی نکلنے کو تیار رہتے ہیں۔

مودی کی طرف سے رائیل طیاروں کی ناکامی کے باوجود ان کے دفاع میں مذہبی رسومات اور پوجا کا سہارا لینا اس مصلحت کی عکاسی کرتا ہے، جو طاقت کے خد اؤں کے سامنے جھکاؤ اور اندرونی کمزوری کی داستان سناتا ہے۔ مودی کے زیر استعمال ”رائیل“ جنگی طیاروں کی پوجا، اور ان کے جنگی ناکامیوں کے باوجود اس رسومات کو عالمی میڈیا پر دکھایا جانا، اس داخلی تضاد کا عکاس ہے جو بھارتی معاشرے میں طاقت اور کمزوری، عقل اور جہالت کے بیچ جھول رہا ہے۔

مودی کے متعصبانہ جارحانہ بیانات نہ صرف پاکستان کے ساتھ تعلقات کو زہر آلود کرتے ہیں بلکہ پورے خطے اور جنوبی ایشیا میں عدم استحکام کے اندیشے کو بڑھا دیتے ہیں۔ پاکستان اور چین کی جانب سے دکھائی جانے والی صبر و تحمل اور حکمت عملی بھارت کی جارحیت کے مقابلے میں ایک پختہ حکمت عملی کی نشاندہی کرتی ہے، جو مشرقی ایشیا میں طاقت کے توازن کو بدل رہی ہے۔ اور دوسری طرف وہ خطے میں طاقت کے توازن کو تبدیل کر رہی ہے، اور بھارت کو سیاسی اور سفارتی محاذوں پر تنہا کر رہی ہے۔ مودی کی دھمکیوں کے نتیجے میں بھارت عالمی سطح پر بھی خود کو تنہا کر رہا ہے، جہاں امن و تعاون کے تقاضے بڑھتے جا رہے ہیں۔ مودی کی دھمکیوں نے عالمی برادری میں بھارت کی ساکھ کو نقصان پہنچایا ہے، جہاں اب امن، تعاون اور معاشی ترقی کیلئے تعاون کی ضرورت بڑھ رہی ہے۔

مودی کا پاکستان کے شہریوں کو گولیوں سے اڑانے کی دھمکی دینا نہ صرف اخلاقی، قانونی اور سفارتی اصولوں اور آداب کی سنگین خلاف ورزی اور پامالی ہے بلکہ یہ عالمی انسانی حقوق کی تشویشناک صورت حال کی بھی نمائندگی کرتا ہے۔ اس قسم کے بیانات دنیا کے امن پسند طبقات میں گہرے خدشات کا باعث ہیں، اور اس سے خطے میں انسانی المیہ کے امکانات مزید بڑھ جاتے ہیں۔

مودی کی تقریر نے بھارت کی حکمت عملی پر سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔ کیا یہ جارحیت واقعی حکمت کی علامت ہے یا حماقت کی؟ یا پھر یہ محض ایک غصے اور کمزوری کا اظہار ہے؟ تاریخ بتاتی ہے کہ حکمت وہی ہوتی ہے جو نہ صرف زبانی ہو بلکہ عملی طور پر مسائل کا حل نکالے اور دیر پا امن کی بنیاد رکھے۔



پاکستان اور چین نے ایک ایسی حکمت عملی اپنائی ہے جو خاموشی میں طاقتور ہے، جہاں صرف توپوں کی گڑگڑاہٹ نہیں بلکہ سیاسی، اقتصادی اور نفسیاتی محاذوں پر بھی کامیابی حاصل کی گئی ہے۔ اسی حکمت کی وجہ سے پاک چین تعلقات آج خطے کے امن اور استحکام کیلئے ستون کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس ساری کشیدگی میں اسرائیل کا کردار ایک نیا اور نہایت نازک موڑ ہے معتبر اطلاعات کے مطابق، بھارت میں موجود اسرائیلی عسکری ماہرین نے ہاروپ ڈرونز کو آپریٹ کیا، اور پاکستانی میزائل حملے میں وہ نشانہ بنے۔ یہ پہلا اس جنگ کو صرف پاک-بھارت تنازعہ نہیں رہنے دیتا بلکہ اسے بین الاقوامی عسکری خطرناک حصہ بنادیتا ہے، جس میں امریکا، اسرائیل، اور بھارت ایک طرف ہیں۔ اور پاکستان، چین، اور خطے کے مقتدر امن پسند عوام دوسری طرف۔

اسرائیلی آپریٹرز کی موجودگی اور حملے کی حقیقت آشکار ہونے کے بعد—کیا اسرائیل بھی اس جنگ کا فریق بن چکا ہے؟ یہ نکتہ اس پوری کشیدگی کا سب سے اہم اور حساس پہلو ہے۔ معتبر ذرائع کے مطابق، بھارت نے اسرائیل سے "ہاروپ" خودکش ڈرون حاصل کیے جنہیں کنٹرول کرنے کیلئے درجنوں اسرائیلی عسکری ماہرین بھارتی بیسز پر موجود تھے۔ پاکستان کی جوابی کارروائی میں ایک ایسا بیس نشانہ بنا جس میں ان اسرائیلی آپریٹرز کی موجودگی رپورٹ ہوئی—اور اسی حملے میں ان کی ہلاکت کی اطلاعات سامنے آئیں۔

غیر سرکاری اطلاعات کے مطابق اسرائیلی آپریٹرز کی لاشیں خفیہ طور پر تابوتوں میں بھارت سے اسرائیل منتقل کی گئیں۔ اسرائیل اور بھارت دونوں نے اس خبر کو دبانے کی کوشش کی۔ جب پاکستان کی طرف سے اسرائیل کی براہ راست مداخلت کو حملے کا جواز بنا کر جوابی کارروائی کا فیصلہ کر لیا گیا جو کہ عالمی قوانین کے مطابق پاکستان کا جائز جوابی حق ہے۔ یہی وہ نکتہ تھا جس پر امریکا، جو ابتدا میں اس جنگ سے "لا تعلق" نظر آ رہا تھا، اچانک سیز فائر کیلئے متحرک ہو گیا۔ اس ساری صورتحال نے اس جنگ کو صرف بھارت اور پاکستان کے درمیان تنازعہ نہیں رہنے دیا، بلکہ اسے عالمی جنگی طاقتوں کے درمیان پر کسی نیابتی جنگ کا آغاز قرار دیا جانے لگا جس کو روکنا امریکا کی اپنی بقاء کیلئے ضروری ہو گیا تھا۔

ٹرمپ نے پہلے سیز فائر کی کوششوں کے تحت ایک "بظاہر غیر جانبدار" کردار ادا کرنے کی کوشش کی۔ تاہم ان کی خاموشی—بلکہ بے نیازی—مودی کے حالیہ جارحانہ بیانات پر جہاں کئی اہم سوالات کو جنم دیتی ہے وہاں ٹرمپ کی ثالثی اور اس پر سوالیہ نشان مزید گہرے ہو گئے ہیں۔ اگر امریکا واقعی امن کا خواہاں ہے تو کیا وہ مودی کی اس دھمکی کی مذمت کرے گا؟ اگر وہ خاموش رہتا ہے تو کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ امریکا درپردہ بھارت کو تحفظ دے رہا ہے؟

کیا یہ سچ ہے کہ سیز فائر کی آڑ میں امریکا نے بھارت اور اسرائیل کو عسکری شکست سے بچانے کی کوشش کی تھی؟ سفارتی ذرائع اور کچھ عسکری تجزیہ کاروں کے مطابق، سیز فائر سے قبل بھارتی فضائیہ اور اسرائیلی ٹیکنالوجی کو بدترین نقصان کا سامنا کرنا پڑا، اور یہ اندیشہ بڑھ گیا تھا کہ پاکستان، بھارت کے ساتھ ساتھ اسرائیل کی جارحیت کا بھی جواب دے گا۔ ایسے میں امریکی مداخلت کا مقصد نہ امن تھا نہ مصالحت—بلکہ بھارت اور اسرائیل کو مزید رسوائی سے بچانا تھا۔

اگر ٹرپ انتظامیہ واقعی غیر جانبدار ہوتی تو مودی کے بیانات پر نہ صرف ناراضی کا اظہار کرتی بلکہ دفاعی و سفارتی سطح پر کارروائی بھی کرتی۔ مگر اس کی خاموشی عالمی برادری میں امریکی پالیسی پر عدم اعتماد کو جنم دے رہی ہے، اور مسلمان ممالک میں یہ تاثر گہرا ہوتا جا رہا ہے کہ امریکا "امن" کے نام پر صرف اپنے اتحادیوں کو بچانے کی حکمت عملی پر گامزن ہے۔ اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ سیز فائر کی اصل نیت بھارت اور اسرائیل کی عسکری ہزیمت پر پردہ ڈالنا تھا۔

اب جبکہ مودی ایک بار پھر دھمکیوں پر اتر آیا ہے، یہ سوال شدت سے ابھر رہا ہے کہ کیا خطے میں ایک نئی جنگ چھڑنے والی ہے؟ کیا اسرائیل ایک بار پھر بھارت کے ذریعے جنوبی ایشیا میں دخل اندازی کرے گا؟ اور کیا امریکا دوبارہ کسی "نام نہاد ثالثی" کے پردے میں اسرائیل اور بھارت کو بچانے کی کوشش کرے گا؟ مودی کی دھمکی کے بعد اگر امریکا نے اب بھی خاموشی اختیار کی تو یہ شک نہیں، بلکہ یقین میں بدل جائے گا کہ امن کی ثالثی محض سفارتی چال تھی۔ جس کا مقصد بھارت کو مزید رسوائی سے بچانا تھا۔

اقوام متحدہ اور انسانی حقوق کی تنظیمیں جن کے دفتر کی دیواروں پر انسانیت کے عظیم اصول آویزاں ہیں، وہ مودی کے ان بیانات پر یا تو خاموش ہیں یا ایسے دیکھ رہی ہیں جیسے کسی ناول کے کردار جو مکالمہ نہیں، فقط تماشا کرتے ہیں۔ حالانکہ اقوام متحدہ کے چارٹر کی شق 2(4) واضح طور پر کسی بھی ملک کو دوسرے ملک کے خلاف طاقت یا اس کی دھمکی سے باز رہنے کا پابند بناتی ہے۔ مگر یہاں سوال اخلاقی جرات کا ہے۔ اور تاریخ گواہ ہے کہ طاقتور کے خلاف زبان کھولنا ہمیشہ کمزور دلوں کے بس کی بات نہیں رہی۔

اگر یہ بات دنیا کے سامنے پوری صداقت کے ساتھ لائی جاتی ہے تو یہ صرف مودی کا نہیں، بلکہ اسرائیل کے عسکری جنون اور امریکی خاموشی کا بھی پردہ چاک کرنے کا لمحہ ہوگا۔ اس سے قبل کہ اسرائیل کی مداخلت — جنگ کا نیا محاذ کھول دے تو اس وقت تک بہت دیر ہو جائے گی اور اس جنگ کو سنبھالنا کسی کے بس میں نہ ہوگا۔

جب دشمن کھلی دھمکی دے اور دنیا خاموش رہے، تو خاموشی کا تقاضہ یا مزاحمت کا بھرپور مظاہرہ اس لئے ضروری ہے کہ یہ خاموشی فقط حکمت نہیں بلکہ بزدلی کی چادر اوڑھے ہوئے ظلم کی خاموش ساتھی بن جاتی ہے۔ پاکستان، جس نے ہمیشہ امن کی بات کی، اور عالمی سطح پر سفارتی وقار کے ساتھ اپنے اصولی موقف کو اجاگر کیا۔ سوال یہ ہے کیا عالمی برادری مودی کی دھمکیوں پر نوٹس لے سکتی ہے؟

مودی کی جانب سے پاکستانی شہریوں کو گولیوں سے اڑانے کی کھلی دھمکی بین الاقوامی قوانین، اقوام متحدہ کے منشور، اور بنیادی انسانی حقوق کے تمام معیارات کی صریح خلاف ورزی ہے۔ یہ بیان کسی سیاسی اختلاف کا اظہار نہیں بلکہ ایٹمی ہتھیاروں سے لیس ملک کی جانب سے دوسرے ملک کے شہریوں کے خلاف نسلی و ریاستی دہشتگردی کا کھلا اعلان ہے۔ اقوام متحدہ کے چارٹر کی شق 2(4) ہر ملک کو اس بات سے روکتی ہے کہ وہ کسی دوسرے ملک کے خلاف طاقت کے استعمال کی دھمکی دے۔ اسی طرح انسانی حقوق کا عالمی اعلامیہ اور جنیوا کنونشنز بھی اس قسم کے بیانات کو نسل کشی، اشتعال انگیزی اور جنگی جرائم کے زمرے میں شمار کرتے ہیں۔

تاہم سوال یہ ہے: کیا اقوام عالم ایسے بیانات پر کوئی عملی قدم اٹھائیں گی؟ ماضی کا تجربہ بتاتا ہے کہ جب ایسے جارحانہ بیانات کسی بڑے تجارتی یا دفاعی اتحادی ملک کی جانب سے آتے ہیں — جیسے بھارت امریکا، اسرائیل اور یورپی طاقتوں کے ساتھ ہے — تو "عالمی ضمیر" اکثر مصلحت کا شکار ہو جاتا ہے

۔ اس کے باوجود اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے ہنگامی اجلاس میں اس معاملے کو اٹھایا جاسکتا ہے۔ انسانی حقوق کی تنظیمیں اس پر رپورٹس جاری کر سکتی ہیں۔ یورپی پارلیمنٹ میں قرارداد پیش کی جاسکتی ہے۔ عالمی عدالت انصاف میں اسے جنگی نفرت انگیزی قرار دیا جاسکتا ہے لیکن اس سب کیلئے پاکستانی سفارت کاری، میڈیا، اور سول سوسائٹی کو فوری، متحد اور سنجیدہ کوشش کرنی ہوگی تاکہ عالمی رائے عامہ کو مودی کے جنگی جنون سے آگاہ کیا جاسکے۔ عالمی میڈیا میں مودی کے بیانات کو جنگی اشتعال انگیزی کے طور پر پیش کرے اور سب سے بڑھ کر، قوم کے اندر سیاسی استحکام، یکجہتی، اور داخلی ہم آہنگی کو فروغ دے تاکہ ہر دھمکی، ہر وار، ہر حملہ — صرف قوم کی یکجہتی سے ہی پسپا ہو۔

مودی کے حالیہ بیانات محض انتخابی جلسوں کی لفاظی نہیں بلکہ خطے کے امن کو تہہ وبالا کرنے والا ذہنی و نظریاتی خاکہ ہے۔ اقوام عالم کو اگر واقعی خطے میں امن عزیز ہے، تو انہیں اس اشتعال انگیزی کا نوٹس لینا ہوگا، ورنہ ایٹمی ہتھیاروں سے لیس یہ دو ممالک اگر جنگ کی جانب بڑھتے ہیں تو اس کا ابندھن صرف جنوبی ایشیا نہیں بلکہ ساری دنیا بن سکتی ہے۔

پاکستان کو چاہیے کہ سفارتی سطح پر مودی کے بیانات کو اقوام متحدہ، او آئی سی، یورپی یونین اور عالمی میڈیا کے سامنے بھرپور انداز میں اٹھائے۔ اسی طرح امریکا، اسرائیل اور بھارت کے درپردہ گٹھ جوڑ کو بے نقاب کر کے دنیا کو بتایا جائے کہ یہ "امن کی ثالثی" نہیں بلکہ "جنگی جرائم پر پردہ ڈالنے" کی کوشش ہے۔

مستقبل کی راہ میں جارحیت اور نفرت کی بجائے حکمت، تحمل اور سفارتی آداب کو اپنانا ضروری ہے۔ سیاسی قائدانہ صلاحیت اسی میں ہے کہ کشیدگی کو کم کیا جائے، بات چیت کے دروازے کھلے رکھے جائیں اور خطے کی بھلائی کیلئے مشترکہ حل تلاش کیے جائیں۔

مودی کے دھمکی آمیز الفاظ شاید عارضی طور پر قومی جذبے کو جلا بخشیں، مگر تاریخ انہیں یاد رکھے گی یا تو طاقت کی علامت کے طور پر یا ایک ایسی دھنک کے طور پر جو طوفان کے بعد غائب ہو جاتی ہے۔ خاموشی تب ہی سنہری ہوتی ہے جب وہ طاقت کی علامت ہو، ورنہ وہ زوال کی پیشگی خبر ہوتی ہے اور کسی بھی ملک کی خودداری یا سلامتی کیلئے نقصان دہ ہے۔

☆ بین الاقوامی برادری کو چاہیے کہ وہ بھارت کو سفارتی اور اخلاقی طور پر جو ابداہ بنائے۔ اقوام متحدہ اور دیگر عالمی فورمز پر ایسے بیانات کی مذمت اور امن کے فروغ کیلئے مشترکہ حکمت عملی اپنائی جائے۔

☆ اب اقوام عالم کی ذمہ داری اور ایک بڑا امتحان ہے کہ وہ بھارتی قیادت کو خبردار کرے کہ آئندہ وہ ایسے متنازعہ بیانات سے گریز کرے اور خطے میں امن قائم رکھنے کی کوشش کرے۔

☆ خطے کے ممالک میں اعتماد سازی کی کوششیں تیز کی جائیں۔ بات چیت کے ذریعے اختلافات کو کم کرنے اور دیرپا امن قائم کرنے کی کوششوں کو بڑھایا جائے۔

☆ بھارت، پاکستان اور چین کے درمیان اعتماد بڑھانے کیلئے مثبت اقدامات کیے جائیں۔

☆ پاکستان اور چین کی حکمت عملی ماڈل سے استفادہ کیا جائے۔ حکمت عملی اور تحمل کے ذریعے خطے میں سیاسی استحکام اور معاشی ترقی کو ممکن بنایا جائے۔ عالمی برادری سے تعلقات بہتر بنائے جائیں تاکہ خطے میں استحکام ممکن ہو سکے۔

☆ بھارت کو چاہیے کہ وہ پاکستان اور چین کے ساتھ بات چیت کو ترجیح دے تاکہ دیر پا امن کا راستہ کھلے۔
 ☆ عوام میں امن اور رواداری کے فروغ کیلئے تعلیمی اور میڈیا کی سطح پر پروگرام ترتیب دیے جائیں۔ تاکہ نفرت اور جارحیت کی فضا کو کم کیا جاسکے۔
 مودی کے حالیہ بیانات محض انتخابی جلسوں کی لفاظی نہیں بلکہ خطے کے امن کو تہہ وبالا کرنے والا ذہنی و نظریاتی خاکہ ہے۔ اقوام عالم کو اگر واقعی خطے میں امن عزیز ہے، تو انہیں اس اشتعال انگیزی کا نوٹس لینا ہو گا، ورنہ ایٹمی ہتھیاروں سے لیس یہ دو ممالک اگر جنگ کی جانب بڑھتے ہیں تو اس کا ایندھن صرف جنوبی ایشیا نہیں بلکہ ساری دنیا بن سکتی ہے۔

پاکستان کو چاہیے کہ سفارتی سطح پر مودی کے بیانات کو اقوام متحدہ، او آئی سی، یورپی یونین اور عالمی میڈیا کے سامنے بھرپور انداز میں اٹھائے۔ اس طرح امریکا، اسرائیل اور بھارت کے درپردہ گٹھ جوڑ کو بے نقاب کر کے دنیا کو بتایا جائے کہ یہ "امن کی مثال" نہیں بلکہ "جنگی جرائم پر پردہ ڈالنے" کی کوشش ہے۔

اور آخر میں، ایک حکایتِ دانش:

وقت جب بولتا ہے، تو قوموں کو تاریخ بنادیتا ہے۔ اور جو قومیں اس کی آواز کو نظر انداز کریں، وہ عبرت کا افسانہ بن جاتی ہیں۔
 پاکستان اور چین نے اُس لمحے کو پہچان لیا۔ اور جو لمحے کو پہچان لے، وہ زمانے کا بادشاہ ہوتا ہے۔

رومیؒ کی محبت سے اقبالؒ کی خودی تک: روحانی بیداری کا سفر

(ایک تاریخی، تحقیقی اور ادبی لیکچر)

خواتین و حضرات، اربابِ فکر و دانش، اور نظریاتی بصیرت کے امین ساتھیو

انسانی تاریخ محض سلطنتوں کے عروج و زوال، جنگوں کے شور، اور سیاست کے ہنگاموں کا نام نہیں؛ یہ دراصل روح کی اس مسلسل جستجو کی داستان ہے جو خاک سے اٹھ کر افلاک کی طرف دیکھتی ہے۔ کبھی یہ جستجو عشق کے لباس میں جلوہ گر ہوتی ہے اور کبھی خودی کے شعور میں ڈھل کر ایک نئی دنیا کی بنیاد رکھتی ہے۔ آج ہم جس موضوع پر جمع ہوئے ہیں وہ محض ماضی کی ایک یادگار داستان نہیں، بلکہ حال کی بے چینی اور مستقبل کی سمت کا تعین ہے۔ یہ گفتگو رومیؒ اور اقبالؒ کے ناموں سے عبارت ضرور ہے، مگر اس کا اصل مخاطب ہم خود ہیں—ہمارا دل، ہماری عقل، اور ہماری اجتماعی روح۔

اس کا مقصد نہ وجدانی سرشاری کی محض ایک ساعت فراہم کرنا ہے اور نہ ہی ماضی کی عظمت کے قصے دہرا کر حال کی ذمہ داریوں سے فرار حاصل کرنا۔ یہ نشست دراصل ایک فکری احتساب ہے—اپنے انفرادی شعور کا بھی اور اپنے اجتماعی فہم کا بھی۔ ہم یہ سوال اٹھانے آئے ہیں کہ مسلمان فکر کی وہ روح کہاں گم ہو گئی ہے جو کبھی عشق سے جنم لیتی تھی اور خودی پر منبج ہوا کرتی تھی؟

اسی سوال کا سراغ ہمیں مولانا جلال الدین رومیؒ کی محبت اور علامہ محمد اقبالؒ کی خودی کے فکری رشتے میں ملتا ہے۔ یہ رشتہ محض شاعرانہ عقیدت نہیں، بلکہ ایک مسلسل نظریاتی ارتقاء ہے—ایک ایسا فکری سفر جو انسان کو باطن کی گہرائیوں سے اٹھا کر تاریخ کے دھارے میں ذمہ دار کردار ادا کرنے کے قابل بناتا ہے۔ اسی تسلسل کا ایک درخشاں باب مولانا جلال الدین رومیؒ کی محبتِ حقیقی سے شروع ہو کر ہمیں علامہ محمد اقبالؒ کی خودی کے توانا اور مضبوط قلعے میں لاکھڑا کرتا ہے۔

ہمارے معزز دانشوروں نے ہمیں اس روحانی بیداری کی داستان سے روشناس کروایا جو تیرہویں صدی کے قونیہ میں عشق کی صورت ظاہر ہوئی اور بیسویں صدی کے برصغیر میں خودی کے شعور میں ڈھل کر ایک فکری تحریک بنی۔ ایسا سفر جو قونیہ کی خاموش گلیوں سے اٹھ کر برصغیر کے فکری افق تک پھیل جاتا ہے، اور جس میں صوفیانہ وجد، تاریخی شعور، اسلامی فکر، اور ادبی جمالیات ایک دوسرے میں گھل مل جاتی ہیں۔ یہ وہ سفر ہے جس میں محبت، معرفت، تاریخ، سیاست، اور تہذیب ایک دوسرے میں مدغم ہو کر ایک زندہ پیغام بن جاتے ہیں۔ گویا آج کی مجلس اسی روحانی اور فکری سفر کیلئے سجائی گئی ہے۔

آج کا مسلمان شدید فکری انتشار کا شکار ہے۔ ایک طرف مادہ پرستی ہے، دوسری طرف جذباتی مذہبیت۔ رومیؒ اور اقبالؒ ہمیں ایک تیسری راہ دکھاتے ہیں—عشق اور خودی کی راہ۔ یہ راہ نہ فرار سکھاتی ہے، نہ تصادم؛ بلکہ تعمیر، توازن اور مقصدیت کا شعور دیتی ہے۔

اگر تاریخ کو محض واقعات کا انبار سمجھا جائے تو وہ محض یادداشت بن کر رہ جاتی ہے اور یہ دل کو چھو نہیں سکتی مگر جب تاریخ کو فکر کے تسلسل کے طور پر دیکھا جائے، روح کی تلاش کی کہانی کے طور پر پڑھا جائے تو ہر صدی ایک زندہ انسان بن جاتی ہے اور وہ رہنمائی کا سرچشمہ بن جاتی ہے۔ رومیؒ اور اقبالؒ

اسی تسلسل کے دورِ روشن مینار اور فکری سنگِ میل ہیں۔ ان کے درمیان چھ صدیوں کا فاصلہ ضرور ہے، مگر سوال ایک ہی ہے: انسان اپنی حقیقت کو کیسے پہچانے؟

رومیؒ نے انسان کو یہ سکھایا کہ وہ اپنے اندر کے صحرا میں محبت کا چشمہ پیدا کرے، اور اقبالؒ نے یہ راز کھولا کہ اسی چشمے سے خودی کی نہر بہا کر تمدن کو سیراب کیا جاسکتا ہے۔

مولانا جلال الدین رومیؒ کا نام آتے ہی دل پر ایک غیر مرئی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ وہ محض شاعر نہیں، نہ ہی صرف صوفی؛ وہ عشق کے وہ معلم ہیں جنہوں نے انسان کو اس کے باطن سے روشناس کرایا۔ رومیؒ کے ہاں عشق کوئی جذباتی پیمانہ نہیں بلکہ ایک ہمہ گیر کائناتی اصول ہے۔ ان کے نزدیک عشق وہ قوت ہے جو خاک کو زور، اور انسان کو انسانِ کامل بناتی ہے۔

مثنوی معنوی کے اوراق پلٹتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تاریخ نہیں، روح خود گفتگو کر رہی ہو۔ رومیؒ فرماتے ہیں کہ عشق وہ آگ ہے جو ہر شے کو جلا کر بھی زندہ رکھتی ہے۔ یہ وہی عشق ہے جو انسان کو خود فراموشی سے نکال کر خدا آشنائی تک لے جاتا ہے۔

قونیہ، ترکی کا وہ شہر ہے جہاں رومیؒ کی محبت آج بھی سانس لیتی ہے۔ آج بھی قونیہ دنیا بھر کے متلاشیوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ رومیؒ کا مزار محض ایک قبر نہیں بلکہ ایک خاموش زندہ درگاہ ہے جہاں مشرق و مغرب کے زائرین یکساں طور پر سر جھکاتے ہیں۔ جہاں مذہب، نسل اور زبان کے فرق مٹ جاتے ہیں اور دلوں کی دھڑکن ایک ہو جاتی ہے۔ یہاں آکر انسان محسوس کرتا ہے کہ اصل عبادت دل کا جھک جانا ہے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں عشق "مذہب، قوم، اور جغرافیہ" کی سرحدوں کو توڑ دیتا ہے۔ قونیہ کی فضا میں آج بھی مثنوی کے اشعار گونجتے محسوس ہوتے ہیں، اور یوں لگتا ہے جیسے زائرین اپنے اندر کے کھوئے ہوئے انسان کو ڈھونڈنے آئے ہوں۔ قونیہ محض جغرافیہ نہیں، ایک فکری علامت ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ محبت جب مرکز پالیتی ہے تو سرحدیں مٹ جاتی ہیں۔ رومیؒ کے مزار پر عقیدت سے جھکنے والا سرا اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ فکر کی اصل منزل انا نہیں، انکسار ہے۔ یہی قونیہ بعد میں اقبالؒ کے فکری تخیل میں ایک روحانی مرکز بن کر ابھرتا ہے۔ ایسا مرکز جہاں سے عشق کی روشنی خودی کے سفر کو منور کرتی ہے۔ یہی مقام بعد میں اقبالؒ کیلئے بھی ایک ایسی علامت جس نے ان کی فکر کو بین الاقوامی اور آفاقی بنایا۔

یاد رہے کہ رومیؒ کے عہد میں مسلم دنیا سیاسی انتشار اور فکری جمود کا شکار تھی۔ صلیبی جنگوں کی گونج، تاتاری یلغار کا خوف، اور مذہبی رسمیت نے روحانی زندگی کو محدود کر دیا تھا۔ رومیؒ نے اس جمود کو توڑنے کیلئے عشق کو مرکز بنایا۔ اقبالؒ کے زمانے میں استعمار، فکری غلامی اور تہذیبی مرعوبیت نے مسلم ذہن کو مفلوج کر دیا تھا۔ اقبالؒ نے اسی جمود کو توڑنے کیلئے خودی کا نعرہ بلند کیا۔

اکثر یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ رومیؒ کا عشق اور اقبالؒ کی خودی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ عشق خودی کو وہ مقصد دیتا ہے، اور خودی عشق کو سمت عطا کرتی ہے۔ عشق کے بغیر خودی انا بن جاتی ہے، اور خودی کے بغیر عشق محض جذبہ رہ جاتا ہے۔ یہ دونوں مل کر ایک متوازن اسلامی شخصیت تشکیل دیتے ہیں۔ اگر رومیؒ عشق کے شاعر ہیں تو اقبالؒ عشق کے حکیم۔ اقبالؒ نے رومیؒ سے محبت کی، مگر تقلید نہیں کی؛ انہوں نے رومیؒ کے چراغ سے اپنی خودی کا چراغ جلایا۔ اقبالؒ کے نزدیک عشق کا مقصد فنا نہیں بلکہ بقا ہے۔ ایسی بقا جو انسان کو عمل، جرات، اور تخلیق کی راہ پر ڈال

دے۔

اقبالؒ نے رومیؒ کو اپنا مرشد معنوی کہا:

پیر رومیؒ خاک را اکسیر کرد

از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد

یہ محض عقیدت کا اظہار نہیں بلکہ فکری رشتہ ہے۔ رومیؒ نے اقبالؒ کو عشق دیا، اور اقبالؒ نے اس عشق کو خودی کی شکل دے کر امت کو عمل کا پیغام دیا۔ خودی اقبالؒ کے نزدیک انسان کی داخلی قوت کا نام ہے۔ وہ قوت جو اسے تقدیر کا غلام نہیں بلکہ تقدیر کا خالق بناتی ہے۔ یہ خودی انسان کو ذمہ داری کا شعور دیتی ہے۔ یہاں اقبالؒ کا تصوف رومیؒ کے تصوف سے جڑتا ضرور ہے مگر آگے بڑھ جاتا ہے۔ رومیؒ عشق کے شاعر ہیں، اقبالؒ عشق کے مجاہد۔ اقبالؒ کی خودی کوئی انا پرستی نہیں بلکہ ذمہ داری کا شعور ہے۔ یہ وہ خودی ہے جو خدا کے سامنے جھکتی ہے مگر باطل کے سامنے نہیں۔ اقبالؒ کی خودی انسان کو اس کی اصل پہچان دلاتی ہے۔ وہ پہچان جو اسے نائبِ خدا بناتی ہے۔

یہاں اقبالؒ صوفی بھی ہیں اور مصلح بھی، شاعر بھی اور مفکر بھی۔ ان کے کلام میں جہاں فکری تمکنت اور تاریخی وقار جھلکتا ہے، وہاں ان کی فکر کا اسلامی آہنگ بھی سنائی دیتا ہے۔

خودی اقبالؒ کے ہاں محض نفسیاتی اصطلاح نہیں، بلکہ ایک مکمل نظریہٴ انسان ہے۔ یہ انسان کو کائنات میں ایک فعال کردار عطا کرتی ہے۔ خودی انسان کو یہ شعور دیتی ہے کہ وہ محض حالات کا شکار نہیں، بلکہ حالات کا معمار بھی ہے۔ یہاں اقبالؒ کا اختلاف اس تصوف سے ہے جو انسان کو عمل سے کاٹ دے۔ اقبالؒ کا انسان سجدہ بھی کرتا ہے اور جہد بھی؛ دعا بھی مانگتا ہے اور تدبیر بھی کرتا ہے۔

رومیؒ اور اقبالؒ کے درمیان صدیوں کا فاصلہ ہے، مگر روحانی مکالمہ مسلسل جاری ہے۔ رومیؒ کی محبت اقبالؒ کی خودی میں ڈھل کر ایک نئی تہذیبی روح پیدا کرتی ہے۔ یہ مکالمہ ہمیں سکھاتا ہے کہ عشق بغیر شعور کے محض جذبہ ہے، اور شعور بغیر عشق کے محض خشک عقل۔ رومیؒ کے ہاں عشق کوئی ذاتی واردات نہیں، بلکہ ایک ہمہ گیر نظریہٴ حیات ہے۔ وہ عشق کو علم، اخلاق، سیاست اور عبادت — سب کا محور بناتے ہیں۔ ان کے نزدیک وہ علم جو دل کو منور نہ کرے، بوجھ ہے؛ اور وہ عبادت جو انسان کو انسان سے نہ جوڑے، رسم ہے۔

مثنوی معنوی دراصل ایک فکری دستاویز ہے جو انسان کے باطن، معاشرے اور کائنات کے باہمی تعلق کو واضح کرتی ہے۔ رومیؒ کا انسان جامد نہیں، متحرک ہے۔ وہ ہر لمحہ بن رہا ہے، ٹوٹ رہا ہے، سنور رہا ہے۔ عشق اس عملِ تخلیق کا ایندھن ہے۔ رومیؒ کے نزدیک عشق محض ذاتی کیفیت نہیں، بلکہ کائنات کا قانون ہے۔ وہ عشق کو وہ قوت سمجھتے ہیں جو جمادات کو نباتات، نباتات کو حیوانات، اور حیوانات کو انسان بناتی ہے۔ ان کی مثنوی محض شاعری نہیں، بلکہ روح کی سانس ہے۔ رومیؒ فرماتے ہیں کہ انسان کا اصل وطن اس کی روح ہے، اور عشق اس وطن کی زبان۔ یہی وجہ ہے کہ رومیؒ کی بات صدیوں بعد بھی نئی محسوس ہوتی ہے۔ ان کا عشق انسان کو انسان سے جوڑتا اور انسان کو خدا سے ملا دیتا ہے۔ بقول رومیؒ:

مادل اندر راہ جاں انداختیم

غلغلہ اندر جہاں انداختیم



ماز قرآن برگزیدم مغز را
استخوان پیش سگال انداختیم

یعنی رومی صاف صاف کہہ رہے ہیں کہ میں نے قرآن میں سے مغز برآمد کر کے
مثنوی میں بھر دیا۔ یہی رومی اور اس کے کلام کا راز ہے۔ اسی وجہ سے ان کی
مثنوی کو دنیا کی تمام مثنویوں پہ شرف ملا اور اسی لئے مولانا جامی نے ان کی مثنوی
کے بارے میں کہا:

مثنوی معنوی مولوی

ہست قرآن در زبان پہلوی

لیکن دوسری طرف اقبال رومی کے عاشق ضرور ہیں، مگر ان کی شخصیت محض تقلید کا سایہ نہیں۔ اقبال نے رومی سے عشق کیا اور اسے خودی کے قالب
میں ڈھالا۔ وہ جانتے تھے کہ محض وجد امت کو نہیں جگا سکتا، اس کیلئے شعور، عمل اور مقصد درکار ہے۔ اقبال نے رومی کو اپنا روحانی رہنما کہا اور اپنی
شاعری میں انہیں بار بار مخاطب کیا۔ یہ دراصل صدیوں پر محیط روحانی مکالمہ ہے۔

رومی کے ہاں عشق کوئی ذاتی واردات نہیں، بلکہ ایک ہمہ گیر نظریہ حیات ہے۔ وہ عشق کو علم، اخلاق، سیاست اور عبادت — سب کا محور بناتے ہیں۔ ان
کے نزدیک وہ علم جو دل کو منور نہ کرے، بوجھ ہے؛ اور وہ عبادت جو انسان کو انسان سے نہ جوڑے، رسم ہے۔ مثنوی معنوی دراصل ایک فکری دستاویز
ہے جو انسان کے باطن، معاشرے اور کائنات کے باہمی تعلق کو واضح کرتی ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ رومی نے انسان جامد نہیں، متحرک ہے۔ وہ ہر
لحہ بن رہا ہے، ٹوٹ رہا ہے، سنور رہا ہے۔ عشق اس عمل تخلیق کا ایندھن ہے۔

رومی کی زندگی میں شمس تبریز کا ورود ایک روحانی انقلاب تھا۔ شمس تبریز کی آمد رومی کی زندگی میں محض ملاقات نہیں تھی، یہ ایک زلزلہ تھا۔ شمس
تبریز، رومی کی زندگی میں ایک فرد سے زیادہ ایک نظریاتی تصادم تھے۔ شمس نے رومی کے منجمد علم کو حرکت دی۔ شمس محض ایک شخص نہیں بلکہ ایک
کیفیت، ایک آتش عشق تھے۔ شمس کی صحبت نے رومی کے باطن میں وہ طوفان برپا کیا جس نے انہیں مدرسے کی خاموشی سے نکال کر محبت کے رقص
میں ڈال دیا۔

شمس نے رومی کے علم کو عشق میں بدل دیا، اور کتابی دانش کو وجدانی بصیرت میں ڈھال دیا۔ شمس نے رومی کو بتایا کہ خدا کو صرف پڑھا نہیں جاتا، جیا جاتا
ہے۔ انہوں نے سوال اٹھایا، جمود کو چیلنج کیا، اور رومی کو یہ احساس دلایا کہ سچائی محفوظ خانقاہوں میں نہیں، بلکہ جلتے ہوئے دلوں میں رہتی ہے۔ یہی وہ
لحہ تھا جب رومی کے قلم سے آگ نکلنے لگی، اور ان کی شاعری میں وہ حرارت آئی جو آج بھی دلوں کو گرماتی ہے۔

یہاں ہمیں ایک اہم فکری نکتہ ملتا ہے: ہر بڑی فکری تحریک کسی نہ کسی شمس کی محتاج ہوتی ہے۔ ایسے سوال اٹھانے والے کی، جو مروجہ فکر کے آرام دہ
خول کو توڑ دے۔ اقبال کی خودی محض انفرادی اصلاح تک محدود نہیں۔ یہ جہاں ایک سیاسی اور تہذیبی شعور ہے وہاں قوموں کی تقدیر بدلنے کا نسخہ ہے
۔ اقبال کا پیغام یہ ہے کہ روحانی کمزوری سیاسی غلامی کو جنم دیتی ہے۔ جب دل آزاد ہو تو قومیں بھی آزاد ہو جاتی ہیں۔ اقبال کے نزدیک غلام قومیں پہلے

فکری طور پر غلام ہوتی ہیں۔ اسی لیے وہ تعلیم، فلسفے اور مذہبی فکر پر اتنا زور دیتے ہیں۔ یہاں ہمیں اقبالؒ کی تاریخ فہم یاد آتی ہے، جو یہ باور کراتی ہے کہ قومیں نعروں سے نہیں، فکر سے بنتی ہیں۔

اقبالؒ نے رومیؒ کو محض مرشد نہیں بنایا، بلکہ ایک فکری ماڈل کے طور پر اختیار کیا۔ اقبالؒ کے نزدیک رومیؒ وہ صوفی ہیں جنہوں نے عشق کو بے عمل وجد سے بچایا۔ اسی لیے اقبالؒ انہیں اپنا ہنما کہتے ہیں، مگر اندھی تقلید سے انکار کرتے ہیں۔ اقبالؒ جانتے تھے کہ ان کا اصل معرکہ برصغیر کے اس مسلمان سے ہے جو تقدیر پرست، مقلد اور مرعوب ہو چکا تھا چنانچہ انہوں نے رومیؒ کے عشق کو خودی کے سانچے میں ڈھال کر ایک نظریاتی پروگرام تشکیل دیا۔

اسی لئے ہمارے زمانے کے بہت بڑے اسلامی اور علمی مجتہد نے رومیؒ کے عشق، اقبالؒ کی خودی اور اجتماعی فکر کو ایک ہی زنجیر کی کڑیوں سے تشبیہ دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ تصوف فرار نہیں، ذمہ داری ہے، یہ عبادت گوشہ نشینی نہیں، تعمیر حیات ہے۔ خودی اگر اجتماعی نظام میں نہ ڈھلے تو اس کا اثر محدود رہ جاتا ہے۔ رومیؒ کی مثنوی میں مستور جلال، اقبالؒ کے فکر کا وقار اور فکری سفر یہ سب مل کر ایک ایسا اسلوب بناتے ہیں جو محض سنایا نہیں جاتا، محسوس کیا جاتا ہے۔ آج کا انسان مشینوں میں الجھا ہوا، مگر اپنے آپ سے کٹا ہوا ہے۔ رومیؒ اسے دل کی طرف بلاتے ہیں، اور اقبالؒ اسے عمل کی طرف۔ یہی توازن آج کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔

معزز سامعین!

رومیؒ کی محبت اور اقبالؒ کی خودی دراصل ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ ایک دل کو جلاتی ہے، دوسری کردار کو بناتی ہے۔ جب یہ دونوں جمع ہو جائیں تو انسان محض فرد نہیں رہتا، وہ تاریخ بن جاتا ہے۔ آج کی گفتگو سے جو میں سمجھا ہوں کہ عشق کو خودی میں ڈھالو، اور خودی کو خدا کی رضا میں فنا کر دو۔ یہی روحانی بیداری کا سفر ہے۔ قونیہ سے لے کر ہمارے دلوں تک۔ اگر رومیؒ اور اقبالؒ کی فکری روایت کو نشر کا جامہ پہنایا جائے تو ان دونوں کے کلام کا اسلوب خود بخود یہ سامنے آتا ہے۔ وہی شکوہ بیان، وہی وقار، وہی تاریخ سے مکالمہ۔ ان کی ساری تعلیمات کا مقصد محض اطلاع نہیں بلکہ بیداری ہے۔

اے اہل فکر و دانش!

اپنی گفتگو یہاں ختم کرتے ہوئے یہ بنیادی سوال چھوڑ کر جا رہا ہوں کہ ہم رومیؒ کو پڑھ کر کیا بنتے ہیں، اور اقبالؒ کو سمجھ کر کیا کرتے ہیں؟ اگر عشق ہمارے اندر انسان دوستی نہ پیدا کرے، اور خودی ہمارے اندر ذمہ داری نہ جگائے، تو یہ سب محض علمی مشق رہ جائے گی۔ فکر وہی زندہ ہے جو عمل میں ڈھلے، اور عمل وہی بابرکت ہے جو عشق سے روشن ہو۔

آج کی یہ علمی مجلس دلوں سے شروع ہو کر میدان عمل میں ہر کسی کو اپنے کردار ادا کرنے کی دعوت بھی دے رہی ہے۔ اگر رومیؒ کی بات نے دل کو نرم کیا ہے اور اقبالؒ کی صدا نے غیرت جگائی ہے تو سمجھ لیجیے کہ یہ سفر کامیاب رہا۔ عشق کے بغیر خودی اندھی ہے، اور خودی کے بغیر عشق بے سمت۔ جب یہ دونوں مل جائیں تو انسان خدا کا رازدار بن جاتا ہے۔

اے خداے بصیرت!

ہمیں وہ دل عطا فرما جو رومیؒ کا سا سوز رکھتا ہو، اور وہ عقل بخش جو اقبالؒ کی سی خودی سے روشن ہو۔ ہمیں فکری غلامی سے نجات دے، ہماری زبان کو صداقت، ہماری فکر کو توازن، اور ہمارے عمل کو اخلاص اور مقصدیت عطا فرما۔ ہمیں تاریخ کے حاشیے پر نہیں، اس کے متن میں جگہ دے۔ اور ہماری امت کو وہ بصیرت عطا کر جس سے ہم تاریخ کے تماشائی نہیں بلکہ معمار بن سکیں۔
آمین یا رب العالمین۔

بدھ 3 رجب المرجب 1447ھ 24 دسمبر 2025ء
یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی لاہور میں سیمینار: خصوصی خطاب

طاقت، اسلحہ اور لیبیا — پاکستان ایک فیصلہ کن موڑ پر

لیبیا: ایک حادثہ، ایک معاہدہ، اور عالمی سیاست کی لرزتی بساط

لیبیا کی عسکری تاریخ ایک بار پھر حادثے اور سانحے کے سیاہ حاشیے میں رقم ہو گئی، جب ملک کے آرمی چیف اور چیف آف جنرل اسٹاف جنرل محمد علی احمد الحداد دیگر سینئر جرنیلوں سمیت ایک فضائی حادثے میں ہلاک ہو گئے۔ لیبیا گزشتہ ڈیڑھ دہائی سے سیاسی انتشار، عسکری تقسیم اور بین الاقوامی مداخلتوں کا شکار ہے۔ 2011 میں معمر قذافی کی حکومت کے خاتمے کے بعد ریاستی اقتدار ایک مرکز پر قائم نہ رہ سکا، جس کے نتیجے میں مشرق اور مغرب میں متوازی طاقت کے ڈھانچے وجود میں آئے۔ اسی غیر مستحکم پس منظر میں حالیہ فضائی حادثہ اور پاکستان کے ساتھ دفاعی معاہدہ غیر معمولی اہمیت اختیار کر گئے ہیں۔

اطلاعات کے مطابق لیبیا کے چیف آف جنرل اسٹاف جنرل محمد علی احمد الحداد ایک فالکن 50 جٹ طیارے میں سفر کر رہے تھے۔ طیارے نے ٹیک آف 16 منٹ بعد ہنگامی لینڈنگ کی درخواست کی، تاہم اس کے فوراً بعد جہاز ریڈار سے غائب ہو گیا جیسے تاریخ کے اوراق میں دفن ہو گیا ہو۔ حادثے کے میں صرف ایک فرد نہیں بلکہ لیبیا کی عسکری کمانڈ کا ایک مکمل حلقہ ختم ہو گیا۔ اس المناک پرواز میں محض ایک جنرل نہیں بلکہ لیبیا کی عسکری قیادت کا ایک پورا باب سوار تھا۔ جنرل الحداد کے ہمراہ لینڈ فورسز کے کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل فوٹوری گریل، ملٹری مینوفیکچرنگ کارپوریشن کے کمانڈر بریگیڈیئر جنرل محمود الکتاوی، چیف آف جنرل اسٹاف کے مشیر محمد العسوی دیاب اور جنرل اسٹاف کے فوٹو گرافر محمد عمر احمد محجب بھی موجود تھے۔ یہ سب وہ نام تھے جو لیبیا کے عسکری ڈھانچے کی ریڑھ کی ہڈی سمجھے جاتے تھے۔ اس نوعیت کا نقصان کسی بھی ریاست کے عسکری نظم و نسق کیلئے فوری خلا پیدا کرتا ہے۔

جنرل محمد علی احمد الحداد پانچ سال سے زائد عرصے تک لیبیا کے چیف آف جنرل اسٹاف رہے۔ ان کی شخصیت نظم و ضبط، ادارہ جاتی وفاداری اور عسکری وقار کی علامت اور نسبتاً غیر سیاسی عسکری شخصیت سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ ان کی ابتدائی زندگی پردہ اخفا میں رہی، تاہم یہ مسلم ہے کہ وہ 2011 کی بغاوت سے قبل لیبیا کی فوج میں مختلف ذمہ داریوں پر فائز رہے۔ ترکی کے ساتھ فوجی و اسٹریٹجک تعلقات کو فروغ دینے میں ان کا کردار نمایاں تھا۔ یہی تعلقات تھے جو نئے لیبیا کی عسکری سمت متعین کر رہے تھے۔

ان کا سب سے نمایاں کردار ترکی کے ساتھ لیبیا کے عسکری اور تکنیکی تعاون کو وسعت دینا تھا، جو مغربی لیبیا کی عسکری حکمت عملی کا اہم ستون رہا۔ یہ حادثہ محض ایک تکنیکی ناکامی نہ تھا بلکہ تاریخ کے تسلسل میں ایک علامتی لمحہ بھی تھا۔ وہ لیبیا، جس پر 1969 سے معمر قذافی نے حکمرانی کی، 2011 میں عرب بہار کی آندھی میں بہہ گیا۔ نیٹو کی حمایت یافتہ مداخلتوں نے طرابلس کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور ملک کو اقتدار کے متحارب مراکز میں تقسیم کر دیا۔ یہی تقسیم آج تک لیبیا کی بد نصیبی پر ثبت ہے۔ معمر قذافی کی 42 سالہ حکمرانی (1969-2011) نے لیبیا کو ایک مضبوط مگر مرکزیت یافتہ ریاست بنایا۔ عرب بہار کے دوران نیٹو کی حمایت یافتہ مداخلت نے اس مرکزیت کو توڑ دیا، مگر اس کے متبادل میں کوئی مستحکم قومی ڈھانچہ قائم نہ ہو سکا۔ نتیجتاً، لیبیا مسلسل خانہ جنگی، مسلح دھڑوں اور بیرونی اثر و رسوخ کی زد میں رہا۔

فالکن 50، جو 1988ء کی پیداوار تھا، لیبیا کی سرکاری ملکیت نہیں بلکہ مالٹا میں قائم ایک افریقی کمپنی سے لیز پر لیا گیا تھا۔ یہ حقیقت لیبیا کی عسکری لاجسٹکس میں نجی کنٹرولنگ پر بڑھتے انحصار کو ظاہر کرتی ہے، جو شفافیت اور سلامتی کے حوالے سے پالیسی سوالات کو جنم دیتا ہے۔ ترک حکام کے مطابق اس تباہ جہاز کا ملبہ انقرہ سے تقریباً 105 کلومیٹر دور ایک دیہی علاقے میں دو کلومیٹر کے وسیع رقبے پر بکھرا ہوا ملا۔ یہ پھیلاؤ حادثے کی شدت اور ممکنہ تکنیکی ناکامی کی نشاندہی کرتا ہے۔ یوں جیسے سازشی طاقت کا غور زمین پر بکھر گیا ہو۔

لیبیا کی عالمی سطح پر تسلیم شدہ قومی اتحاد کی حکومت کے وزیر اعظم عبدالحمید دبیبہ نے اس سانحے کو قوم کیلئے ”بڑا نقصان“ قرار دیا۔ ان کے الفاظ میں، لیبیا نے وہ افراد کھو دیے جو وفاداری اور دیانت کے ساتھ ریاست کی خدمت کر رہے تھے۔ یہ ایک ایسی گواہی تھی جو سیاست سے بلند اور دکھ سے لبریز تھی۔ یہ بیان نہ صرف تعزیتی تھا بلکہ اس میں ریاستی تسلسل اور قومی وحدت کا پیغام بھی مضمر تھا، جو ایسے وقت میں اہم ہے جب لیبیا پہلے ہی ادارہ جاتی کمزوری کا شکار ہے۔

یہ حادثہ ایک ایسے وقت میں پیش آیا جب عالمی سیاست کے افق پر ایک اور خبر گردش کر رہی تھی: پاکستان اور لیبیا کے درمیان چار ارب ڈالر سے زائد مالیت کا دفاعی معاہدہ۔ یہ محض ایک تجارتی سودے کی خبر نہ تھی بلکہ طاقت کے عالمی توازن میں ایک نیازاویہ تھا۔

حادثے سے محض دو دن قبل پاکستان اور لیبیا کے درمیان چار ارب ڈالر سے زائد مالیت کے دفاعی معاہدے کی خبر سامنے آئی۔ یہ معاہدہ پاکستان کی دفاعی برآمدات کی تاریخ کے بڑے سودوں میں شمار ہوتا ہے اور شمالی افریقہ میں پاکستان کی عسکری موجودگی کیلئے ایک نیا دروازہ کھولتا ہے۔ اس معاہدے کے تحت، جس کی مدت ڈھائی سال بتائی جاتی ہے، پاکستان لیبیا کو زمینی، بحری اور فضائی دفاعی ساز و سامان فراہم کرنے پر آمادہ ہوا۔ جن میں زمینی، بحری اور فضائی جے ایف 17 لڑاکا طیارے، ملٹی رول فائٹر طیارے اور سپر مشاق ٹریزر طیارے شامل ہیں۔ یہ وہی طیارے ہیں جو پاکستان اور چین کے اشتراک سے تیار ہوئے اور کم لاگت مگر ہمہ جہت عسکری صلاحیت کی علامت بنے۔ اگرچہ جے ایف 17 کی حتمی تعداد پر ابہام باقی ہے۔

چار پاکستانی حکام کے مطابق یہ معاہدہ پاکستان کی دفاعی برآمدات کی تاریخ کے بڑے سودوں میں سے ایک ہے، جسے مشرقی لیبیا کے شہر بن غازی میں فیلڈ مارشل عاصم منیر اور ایل این اے کے ڈپٹی کمانڈر انچیف صدام خلیفہ حنقر کے درمیان ملاقات کے بعد حتمی شکل دی گئی۔ مشرقی لیبیا کے شہر بن غازی میں معاہدے کو حتمی شکل دینے میں جہاں پاکستان کے فوجی سربراہ فیلڈ مارشل عاصم منیر اور ایل این اے کے ڈپٹی کمانڈر انچیف صدام خلیفہ حنقر کی پر اعتماد ملاقات شامل ہے وہاں یہ ملاقات خود اس بات کا اشارہ ہے کہ پاکستان نے عملی طور پر مشرقی لیبیا کے ساتھ براہ راست مضبوط عسکری روابط قائم کیے ہیں۔

دفاعی امور سے وابستہ پاکستانی حکام نے معاہدے کی حساسیت کے باعث شناخت ظاہر کرنے سے انکار کیا، جبکہ وزارت خارجہ اور وزارت دفاع نے سرکاری تبصرے سے گریز کرتے ہوئے خاموش حکمت عملی اختیار کی ہے۔ یہ خاموشی بے سبب نہ تھی، کیونکہ لیبیا 2011ء سے اقوام متحدہ کی اسلحہ پابندی کی زد میں ہے۔ اگرچہ دسمبر 2024ء میں اقوام متحدہ کے ماہرین نے اس پابندی کو ”غیر موثر“ قرار دیا، مگر قانونی اور اخلاقی سوالات اب بھی اپنی جگہ قائم ہیں۔ یہ طرز عمل اس امر کی عکاسی کرتا ہے کہ معاملہ محض تجارتی نہیں بلکہ اسٹریٹجک نوعیت کا ہے۔

لیبیا 2011ء سے اقوام متحدہ کی اسلحہ پابندی کا شکار ہے، جس کے تحت کسی بھی عسکری سامان کی ترسیل کیلئے اقوام متحدہ کی منظوری درکار ہے۔ دسمبر

2024 میں اقوام متحدہ کے ماہرین نے اس پابندی کو ”غیر مؤثر“ قرار دیا، تاہم قانونی حیثیت اب بھی برقرار ہے۔ ایل این اے کے سرکاری میڈیانے پاکستان کے ساتھ دفاعی تعاون کی تصدیق کی، جس میں ہتھیاروں کی فروخت، مشترکہ تربیت اور فوجی تیاری شامل ہے۔ حفتر نے اسے پاکستان کے ساتھ ”اسٹریٹجک فوجی تعاون کے نئے مرحلے“ کا آغاز قرار دیا۔

اقوام متحدہ کے پینل کے مطابق متعدد غیر ملکی ریاستیں پابندیوں کے باوجود مشرقی و مغربی لیبیا میں عسکری تربیت اور مدد فراہم کر رہی ہیں۔ اس تناظر میں پاکستان کا موقف ہے کہ اس نے کسی پابندی کی خلاف ورزی نہیں کی۔ دوسری جانب، مغربی لیبیا میں عبدالحمید دبیبہ کی حکومت اقوام متحدہ کی حمایت یافتہ ہے، جبکہ حفتر کی ایل این اے مشرق اور جنوب، بشمول بڑے تیل کے ذخائر کو کنٹرول کرتی ہے۔ یہ تقسیم دفاعی معاہدوں کی قانونی اور اخلاقی حیثیت پر سوالات اٹھاتی ہے اور یہ دو اقتدار، ایک ملک، اور ایک نہ ختم ہونے والا بحران ہے۔



ایل این اے کے میڈیا چینل نے پاکستان کے ساتھ دفاعی تعاون کی تصدیق کی، جبکہ حفتر نے اسے ”اسٹریٹجک فوجی تعاون کے نئے مرحلے“ کا آغاز قرار دیا، جس میں ہتھیاروں کی فروخت، مشترکہ تربیت اور فوجی تیاری شامل ہے۔

پاکستانی حکام کا موقف ہے کہ اس معاہدے سے اقوام متحدہ کی

پابندی کی خلاف ورزی نہیں ہوئی، اور یہ کہ پاکستان واحد ملک نہیں جو لیبیا کے ساتھ دفاعی تعاون کر رہا ہے۔ ان کے بقول، بڑھتی ہوئی تیل برآمدات نے بن غازی کو مغربی دنیا کے قریب لاکھڑا کیا ہے۔ پاکستان گزشتہ چند برسوں سے دفاعی برآمدات کو وسعت دینے کی حکمت عملی پر عمل پیرا ہے اور دفاعی منڈیوں میں اپنے قدم مضبوط کر رہا ہے۔ اس کی دفاعی صنعت طیارہ سازی، بکتر بند گاڑیوں، جنگی ساز و سامان اور بحری تعمیرات پر محیط ہے۔

انسداد بغاوت کی دہائیوں پر محیط تجربہ، ملکی دفاعی صنعت کی خود کفالت، اور مئی میں بھارت کے ساتھ جھڑپوں میں فضائیہ کی کارکردگی — یہ سب پاکستان کی عسکری مارکیٹنگ کا سرمایہ بن چکے ہیں۔ فیلڈ مارشل عاصم منیر کے بقول، پاکستانی قیادت نے مئی میں بھارت کے ساتھ جھڑپوں میں فضائیہ کی کارکردگی کو بطور مثال پیش کیا ہے۔ اس جھڑپ نے پاکستان کی جدید عسکری صلاحیتوں کو عالمی سطح پر اجاگر کیا۔ بھارت کے ساتھ حالیہ جنگ نے دنیا کو پاکستان کی جدید عسکری صلاحیتوں کا عملی مظاہرہ دکھا دیا۔ یہی اعتماد برآمدات میں ڈھل رہا ہے۔

پاکستان نہ صرف چین کے ساتھ دفاعی شراکت کو آگے بڑھا رہا ہے بلکہ خلیجی ریاستوں — خصوصاً سعودی عرب اور قطر — کے ساتھ بھی سکیورٹی تعلقات کو وسعت دے رہا ہے۔ ستمبر 2025 کا سعودی عرب کے ساتھ دفاعی معاہدہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ جے ایف 17 کو پاکستان ایک کم لاگت، ملٹی رول فائٹر اسٹریٹجک پروڈکٹ کے طور پر پیش کرتا ہے، جو مغربی سپلائی چین سے باہر تربیت، دیکھ بھال اور آپریشنل خود مختاری فراہم کرتا ہے۔ یہی پہلو اسے ترقی پذیر ریاستوں کیلئے پرکشش بناتا ہے۔ لیبیا کے ساتھ معاہدہ شمالی افریقہ میں پاکستان کے اثر و رسوخ کو بڑھا سکتا ہے، جہاں عالمی طاقتیں تیل، سلامتی اور سیاست کیلئے صف آرا ہیں۔

خلیجی ریاستوں کے ساتھ دفاعی روابط، پاکستان سعودی عرب اور قطر کے ساتھ دفاعی تعاون کو وسعت دے رہا ہے۔ ستمبر 2025 میں سعودی عرب کے ساتھ دفاعی معاہدہ اسی رجحان کی مثال ہے، جو پاکستان کو ایک علاقائی سیکورٹی شراکت دار کے طور پر پیش کرتا ہے۔

لیکن ایک سوال ابھر کر سامنے آتا ہے: کیا عالمی اسلحہ ساز اجارہ داریاں اس سودے کو اپنے لیے چیلنج سمجھیں گی؟ تاریخ گواہ ہے کہ جہاں طاقت کا توازن بگڑتا ہے، وہاں سازشوں کے سائے بھی گہرے ہو جاتے ہیں۔ اوریوں، ایک طیارہ جو ریڈار سے غائب ہوا، شاید محض ایک حادثہ نہ تھا۔ بلکہ عالمی سیاست کے افق پر ایک ایسی لکیر تھی جو طاقت، مفاد اور تاریخ کے پیچیدہ رشتے کو عیاں کر گئی۔ بین الاقوامی سیاست میں یہ امر بعید از قیاس نہیں کہ بڑی اسلحہ ڈیلز کے بعد سیاسی دباؤ، قانونی پیچیدگیاں یا بالواسطہ مزاحمت سامنے آئے۔ تاریخ ایسے واقعات کی مثالوں، سازشی بیانیے اور تاریخی نظائر سے خالی نہیں۔

شمالی افریقہ میں پاکستان کا ابھرنا تکرار۔۔۔ لیبیا کے ساتھ معاہدہ شمالی افریقہ میں پاکستان کے قدم جمانے کی کامیاب کوشش ہے، جہاں عالمی اور علاقائی طاقتیں تیل، سلامتی اور اثر و رسوخ کیلئے مسابقت میں ہیں۔ یہ معاہدہ عالمی اسلحہ ساز کمپنیوں کیلئے ایک ممکنہ چیلنج بن سکتا ہے، خصوصاً ان کمپنیوں کیلئے جو روایتی طور پر افریقی منڈیوں پر حاوی رہی ہیں۔

لیبیا کے عسکری سانحے اور پاکستان۔ لیبیا دفاعی معاہدے نے خطے کی سلامتی، عالمی اسلحہ سیاست اور اقوام متحدہ کی پابندیوں کی افادیت پر نئے سوالات کھڑے کر دیے ہیں۔ پاکستان کیلئے یہ معاہدہ ایک معاشی اور اسٹریٹجک موقع ہے، مگر اس کے ساتھ قانونی شفافیت، سفارتی توازن اور طویل المدت علاقائی اثرات پر مسلسل نظر رکھنا ناگزیر ہو گا۔

لیبیا میں عسکری قیادت کے حالیہ فضائی حادثے اور پاکستان۔ لیبیا دفاعی معاہدے نے بیک وقت علاقائی سلامتی، عالمی اسلحہ سیاست، اور اقوام متحدہ کی پابندیوں کی عملی حیثیت کو ایک نئے زاویے سے نمایاں کر دیا ہے۔ یہ پیش رفت پاکستان کیلئے معروف معاشی، اسٹریٹجک اور سفارتی مواقع بھی رکھتی ہے اور قانونی، سیاسی اور خطے میں تیزی سے ابھرتی ساکھ جیسی نوعیت کے خطرات بھی۔

پاکستان کی دفاعی صنعت پہلی بار شمالی افریقہ میں ایک نمایاں اور براہ راست اسٹریٹجک کھلاڑی کے طور پر ابھر رہی ہے، تاہم لیبیا کی داخلی تقسیم، بین الاقوامی اجارہ دار اسلحہ ساز کمپنیوں کے مفادات، اور اقوام متحدہ کی غیر مؤثر مگر موجود پابندیاں اس عمل کو حساس بنادیتی ہیں۔ فیصلہ سازوں کیلئے بنیادی چیلنج یہ ہے کہ اقتصادی فائدے اور عالمی قانونی ذمہ داریوں میں توازن قائم رکھا جائے۔ عسکری برآمدات کو سفارتی تنہائی کا سبب نہ بننے دیا جائے اور پاکستان کو ایک ذمہ دار، قابل اعتماد اور اصولی دفاعی شراکت دار کے طور پر پیش کیا جائے۔

یقیناً اس نئی صورتحال پر دفاعی مقتدر ادارے بڑی تندہی سے موجودہ حالات میں اپنی پالیسیوں کی تشکیل میں مصروف کار ہوں گے مگر ان حالات میں قانونی شفافیت اور دستاویزی تحفظ پر چند آراء پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

☆: اس کیلئے ضروری ہے کہ پاکستان کو دفاعی معاہدوں کے ہر مرحلے میں اقوام متحدہ کی اسلحہ پابندیوں سے متعلق قانونی رائے کو تحریری صورت میں محفوظ رکھنا چاہیے تاکہ مستقبل میں کسی بھی بین الاقوامی فورم پر موقف کمزور نہ ہو۔ قانون اگرچہ پابندی کو غیر مؤثر قرار دیا جا چکا ہے، تاہم پاکستان کو اقوام متحدہ کے متعلقہ اداروں کے ساتھ بیک ڈور ڈپلومیسی چینل کے ذریعے پیشگی رابطہ رکھنا چاہیے تاکہ کسی ممکنہ تنازعے سے بچا جاسکے۔

☆: معاہدوں کو ریاستی نہیں بلکہ ادارہ جاتی بنانے کیلئے دفاعی تعاون کو شخصیات یا دھڑوں کے بجائے اداروں سے منسلک رکھا جائے، تاکہ لیبیا کی داخلی سیاست میں تبدیلی کی صورت میں معاہدے غیر مؤثر نہ ہوں۔

☆: پاکستان کو مشرقی لیبیا "ایل این اے" کے ساتھ تعاون کے ساتھ ساتھ مغربی لیبیا کی اقوام متحدہ کی تسلیم شدہ حکومت سے سفارتی توازن برقرار رکھنا چاہیے، تاکہ کسی ایک فریق کا حلیف تصور نہ کیا جائے۔

☆: دفاعی برآمدات کے ساتھ "صلاحیت کی تعمیر" کیلئے صرف ہتھیاروں کی فروخت کے بجائے تربیت، مینٹیننس، تکنیکی معاونت کو پیکیج کا حصہ بنایا جائے، تاکہ پاکستان کا کردار طویل المدت شراکت دار کا بنے۔

☆: جے ایف 17 محض طیارہ نہیں بلکہ اسٹریٹجک برانڈ کے طور پر پیش کرنا ضروری ہے اور حالیہ پاک بھارت جھڑپ نے اقوام عالم کو انہی طیاروں کے استعمال سے پاکستانی عسکری تربیت اور برتری نے ورطہ حیرت میں ڈال دیا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ پاکستان ان طیاروں اور دیگر فوجی وسازو سامان کو کم لاگت کے ساتھ خود انحصاری کی علامت کے مارکیٹ کیا جائے۔

☆: لیبیا سے متعلق پالیسی کو سعودی عرب، قطر اور متحدہ عرب امارات کے ساتھ غیر رسمی مشاورت کے ذریعے ہم آہنگ رکھا جائے تاکہ علاقائی تضادات سے بچا جاسکے۔

☆: پاکستان کو ایک واضح دفاعی برآمدات کیلئے "نیشنل آرمز ایکسپورٹ پالیسی فریم ورک" قومی فریم ورک تشکیل دینا چاہئے جہاں انسانی حقوق، داخلی استحکام اور بین الاقوامی قانون کو باضابطہ معیار بنایا جائے۔

☆: عالمی میڈیا اور تھک ٹینکس میں پاکستان کے کردار کو ذمہ دار، قانونی اور استحکام پسند کے طور پر اجاگر کرنے کیلئے اسٹریٹجک کمیونیکیشن پلان تشکیل دیا جائے۔

☆: غیر ریاستی دباؤ کے امکانات کی پیش بندی اور عالمی اسلحہ ساز اجارہ داریوں کے ممکنہ دباؤ کے پیش نظر قانونی ٹیم، سفارتی نیٹ ورک اور تجارتی اتحادی کو پیشگی متحرک رکھا جائے۔

مندرجہ بالا تمام بروقت اقدامات کے ساتھ ساتھ ہمیں ان رسک اسسمنٹ کی طرف بھی توجہ دینے کی اشد ضرورت ہے۔ ہمیں اقوام متحدہ کی پابندیوں کی تشریح، تحریری قانونی تحفظ کے ساتھ ساتھ سفارتی خطرات یعنی مغربی طاقتوں یا انسانی حقوق گروپس کی تنقید کا بھی سامنا کرنا پڑ سکتا ہے جس کیلئے پیشگی مؤثر بیانیہ سازی اور سفارتی وضاحت کی مکمل تیاری از حد ضروری ہے۔

لیبیا میں اقتدار کی تبدیلی کو سیاسی خطرات کے طور پر پیش کر کے اس معاہدے کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کی جائے گی جس کیلئے ادارہ جاتی معاہدے، یکطرفہ وابستگی سے گریز کیلئے ہتھیاروں کا غیر ریاستی عناصر تک پہنچنے کا واویلا کیا جائے گا جبکہ دنیا بھر میں ہونے والی دہشتگردی میں استعمال ہونے والا اسلحہ کن ممالک کا استعمال ہو رہا ہے، اس کا بھی ہم سب کو علم ہے۔ دور نہ جائیں، ہمارے پڑوس افغانستان سے آنے والے خوارج اور فتنہ الہند کے تمام دہشتگردوں کے پاس برآمد ہونے والا تمام جدید ترین امریکی اسلحہ اس بات کا عملی ثبوت ہے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ اس طرح کے عالمی سودوں کی ادائیگی کیلئے بین الاقوامی مالیاتی اداروں کا پلیٹ فارم استعمال کیا جاتا ہے اور عین ممکن ہے کہ عالمی

مالیاتی ادارے عالمی طاقتوں کے دباؤ کے تحت پہلے تو معاہدے کی معطلی پر زور ڈالیں، اور اگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکیں تو ادائیگیوں میں تاخیر کر کے ان معاہدوں کو غیر معمولی نقصان پہنچانے کی پالیسی اختیار کر لیں۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ پاکستان مرحلہ وار ڈیلیوری کے ساتھ ساتھ ایسا مالی ضمانتوں کا بھی لائحہ عمل تیار رکھے جس سے ان معاہدوں کی افادیت کو متوقع نقصان سے محفوظ رکھا جاسکے۔

ماضی کے تجربات سے ہمیں یہ بھی سیکھنے کی ضرورت ہے کہ ہمارا دشمن ہمیشہ کی طرح ایک دفعہ پھر پاکستان کا نام غیر مستحکم ریاستوں سے جوڑنے کی کوشش کرے گا اور پاکستان کے متعلقہ اداروں کو ابھی سے پیشگی طور پر ایک ذمہ دار ریاست کا مضبوط بیانیہ تیار رکھنا ہو گا۔ اس اہم کام کیلئے انہیں عالمی طاقتوں کی پر کسی سیاست کے مقابلے اور تدارک کیلئے غیر جانب دار، کثیر جہتی سفارت کاری کیلئے مکمل تیاری کے ساتھ میدان میں اترنے کیلئے ابھی سے پوری تیاری کی ضرورت ہے۔

لیبیا کا سانحہ اور دفاعی معاہدہ محض ایک حادثہ یا ایک سودا نہیں، بلکہ یہ اکیسویں صدی کی اسلحہ سیاست، ریاستی خود مختاری، اور عالمی طاقت کے بدلتے توازن کی علامت ہے۔ پاکستان کیلئے یہ ایک موقع بھی ہے اور امتحان بھی۔ اگر دانش مندی، قانونی احتیاط اور سفارتی توازن کے ساتھ قدم اٹھایا گیا تو یہ معاہدہ پاکستان کو ایک ذمہ دار عالمی دفاعی شراکت دار کے طور پر مستحکم کر سکتا ہے۔ بصورت دیگر یہ عالمی سیاست کی ناہموار زمین پر ایک لغزش بھی ثابت ہو سکتا ہے۔

تاریخ کے ترازو پر عدل اور سیاست

جب دل کی بستیوں میں اضطراب ٹھہر جائے، جب شہروں کی گلیاں صدائے فریاد بن جائیں، اور جب امت مسلمہ کے چہرے پر فکر کی سلوٹیں گہری، تو تاریخ خاموش نہیں رہتی۔ وہ پکار بن کر بول اٹھتی ہے۔ آج بنگلہ دیش اور بھارت کے درمیان ابھرتی ہوئی کشیدگی محض بین الاقوامی ہو جائیں سیاست کا باب نہیں، بلکہ دلوں کے زخموں، یادوں کے کرب اور معاہدوں کے بکھرے ہوئے کاغذوں کی کہانی ہے۔

یہ وہ سرزمین ہے جس نے کبھی اخوت کے نغمے گنگنائے تھے، مگر آج نفرت کی گرد نے ان نغموں کی لے کو گھٹا دیا ہے۔ معصوم جانوں کا ناحق بہتا خون، سفارتی ایوانوں کی بے چین فضا، اقلیتوں کے لرزتے ہوئے دل، اور سیاست کے بازی گر۔ سب مل کر ہمیں اس حقیقت کا احساس دلاتے ہیں کہ جب عدل اٹھ جاتا ہے تو زمین کانپتی نہیں، دل کانپنے لگتے ہیں۔

قرآن ہمیں یاد دلاتا ہے

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا۔۔۔ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ نہ ڈالو۔

مگر افسوس، ہمارے عہد کی سیاست نے اسی رسی کو چھوڑ کر اختلافات کے خاردار جھاڑ جھکار کو تھام لیا ہے۔ اس رپورٹ کا مقصد کسی نفرت کے شعلے کو ہوا دینا نہیں، بلکہ ضمیر کے دروازوں پر دستک دینا ہے۔ کہاں گرے ہم؟ کب بھٹکے ہم؟ اور کب ہم پھر سے قرآن و سنت کی چھاؤں میں عادلانہ معاشروں کی طرف پلٹیں گے؟

بنگلہ دیش میں حالیہ شورش محض ایک واقعہ نہیں بلکہ کئی برسوں سے پلتے شکووں، تحفظات اور باہمی بدگمانیوں کا برآمدہ ہے۔ مظاہرے، ہنگامے، سفارتی احتجاج اور الزام تراشیوں نے دونوں ملکوں کے تعلقات کے کچے دھاگے کو مزید نازک بنا دیا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ماضی کی رفاقت کا قافلہ راہوں میں تھک گیا ہے اور نئی سیاسی ہوائے دوستی کے چراغ کو لرزادیا ہے۔ سوال یہ نہیں جاٹھرتا ہے کہ کیا یہ تعلقات محض وقتی دھند ہیں یا دائمی خلیج میں بدل جائیں گے؟

یہی وجہ ہے کہ بنگلہ دیش میں حالیہ پر تشدد مظاہروں نے دونوں ممالک کے درمیان پہلے سے موجود کشیدگی کو اور زیادہ گہرا کر دیا ہے۔ الزام تراشی کا یہ تبادلہ صبح ازل سے شروع نہیں ہوا، مگر آج صورتحال اس نہج تک آن پہنچی ہے کہ دونوں ہمسایہ ممالک ایک دوسرے کے سفارتی عملے کو طلب کر کے احتجاج ریکارڈ کراتے اور عوامی سطح پر سخت بیانات جاری کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جو کبھی رفاقت کے سائے تلے ساتھ ساتھ چلتے تھے، کیا وہ پھر کبھی تاریخ کے کسی موڑ پر شانہ بشانہ کھڑے ہو سکیں گے؟

ڈیپو چندرا کی ہلاکت نے نہ صرف انسانی دلوں کو دہلادیا بلکہ فرقہ وارانہ حساسیت کو بھی جھنجھوڑ ڈالا۔ چندرا کی ہلاکت نے فضا میں مزید بارود گھول دیا اور اس حادثے کی بازگشت ہندو تنگ نظر حلقوں میں سخت رد عمل کی صورت سنائی دی۔ دوسری طرف عثمان ہادی کا قتل اپنے ساتھ سیاسی معانی اور تہہ در تہہ سوال لے آیا۔ عثمان ہادی کے قتل پر برپا ہونے والے پُر تشدد مظاہرے پہلے ہی شہر در شہر بے قراری پھیلا چکے تھے۔ قاتل کے مبینہ بیرون ملک فرار کی خبر خواہ درست ہو یا بے بنیاد، اس نے عوامی اذہان میں غصے اور بدگمانی کے بیج بودیے۔ معاشرے کی نبض نے اسی لمحے بتا دیا کہ

جذباتی اضطراب ریاستی بیانیے سے کہیں آگے نکل چکا ہے۔ الزام یہ بھی ابھرا کہ مبینہ قاتل کا تعلق عوامی لیگ سے تھا اور وہ بھارت فرار ہوا، اگرچہ پولیس نے اس کی تردید کی۔ مگر جذبات کا دریا جب طغیانی پر ہو تو دلیل کی کشتی ہلکی پڑ جاتی ہے۔ اسی تلخ فضا میں ویزا سروسز کی معطلی گویا دونوں کے درمیان کھڑی نئی دیوار بن گئی۔ دونوں طرف سے سفارتی مشنز کی سکیورٹی پر اعتراضات اٹھے، اور کمشنرز کی طلبی اس بے چینی کی علامت بن گئی۔ ویزہ سروسز کی معطلی محض سفارتی اقدام نہیں ہوتی، یہ دراصل لوگوں کے ملنے ملانے کے پل منہدم کر دیتی ہے۔ طالب علموں، تاجروں، مریضوں اور اہل خاندان کیلئے یہ ایک نفسیاتی دیوار کھڑی کر دیتی ہے۔ سفارتی کمشنروں کی طلبی گویا رسمی لفاظی نہیں بلکہ اس تلخی کی علامت ہے جس نے دونوں حکومتوں کے اعصاب کو بوجھل کر دیا ہے۔ یوں دکھائی دیتا ہے کہ سفارت کاری کی شطرنج میں اب نرم مہروں کی جگہ سخت چالیں چلائی جا رہی ہیں۔ سابق سفارت کاروں کی تشویش بھی اسی حقیقت کی غماز ہے کہ حالات کس رخ جا پڑیں، کہنا دشوار ہو چلا ہے۔

ہنگلہ دیش میں بھارت مخالف جذبات نئی پود نہیں؛ یہ شجر پرانا ہے جس نے نئی شاخیں نکالی ہیں۔ شیخ حسینہ کے طویل دورِ اقتدار میں بھارت کے اثر و نفوذ کی شکایتیں کچھ حلقوں میں پہلے ہی پل رہی تھیں۔ بھارت مخالف جذبات محض وقتی ردِ عمل نہیں بلکہ تاریخ کے طویل سلسلے کی پیداوار ہیں۔ 1971 کے بعد کی سیاست، سرحدی معاملات، پانی کی تقسیم، تجارتی توازن اور سیاسی مداخلت کے شبہات نے اس جذباتی فضا کو ہمیشہ نمناک رکھا۔ شیخ حسینہ کے دور کو بعض حلقوں نے بھارت نوازی سے تعبیر کیا، جس کے نتیجے میں یہ تاثر راسخ ہوا کہ قومی خود مختاری کا جذبہ کہیں دب کر رہ گیا ہے۔

معزولی کے بعد ان کی بھارت میں پناہ نے ان جذبات کو اور بھڑکا دیا۔ ڈھاکہ کی طرف سے بارہا درخواستوں کے باوجود حوالگی نہ ہونا عوامی حلقوں میں سوالات چھوڑ گیا اور شکوک کی آگ میں نیا ایندھن پڑ گیا۔ اقتدار سے علیحدگی کے بعد بھارت میں قیام نے سیاسی بیانیے میں نئی گرہیں ڈال دیں۔ عوامی رائے عامہ کے کچھ حلقوں نے اسے ”بیرونی سرپرستی“ کی علامت کے طور پر دیکھا۔ حوالگی سے متعلق مطالبات کا رد ہونا قانون و سفارت کے دائرے میں ہو سکتا ہے، مگر عوامی جذبات کی عدالت میں فیصلے اکثر اور طرح سے لکھے جاتے ہیں۔

نوجوان قیادت کا لب و لہجہ قوم کے باطن کی دھڑکن ہوتا ہے۔ جب زبان میں شعلہ اور دل میں انگارہ اتر آئے تو سیاسی اعتدال پیچھے رہ جاتا ہے۔ بھارت مخالف تقاریر اور نعرے اسی دبے ہوئے غصے کی علامت ہیں جو برسوں تک سیاسی ادب و آداب کے پردوں میں چھپا رہا۔ عثمان ہادی کے قتل کے بعد بعض نوجوان رہنماؤں کے سخت بیانات نے فضا میں گرمی پیدا کی۔ زبان جب شعلہ بن جائے تو کان جلنے لگتے ہیں اور عقل دبک کر ایک طرف ہو بیٹھتی ہے۔

ہائی کمیشنوں کے باہر جمع ہوتے ہجوم محض افراد کا ہجوم نہیں، یہ جذبات کی مجتمع صورت ہوتی ہے۔ ڈھاکہ سے چٹاگانگ تک، انڈین مشنز کے قریب احتجاج اور پتھر اڑانے کے واقعات سامنے آئے۔ پتھر اڑاؤ اور اس کے بعد گرفتاری و رہائی کا سلسلہ یہی بتاتا ہے کہ ریاستی ادارے جذباتی طغیان کے سامنے خود کسی حد تک دفاعی پوزیشن میں دکھائی دیتے ہیں۔ سرحد کے دونوں جانب ریلیوں کا مقابلہ دراصل بیانیوں کی جنگ کا مظہر بن گیا۔ ڈھاکہ سے چٹاگانگ تک، انڈین مشنز کے قریب احتجاج اور پتھر اڑانے کے واقعات سامنے آئے۔ گرفتاریاں ہوئیں، رہائیاں ہوئیں، اور ”غیر منصفانہ“ احتجاج کے الفاظ دونوں طرف کے جملوں میں درآئے۔ سرحد کے دونوں جانب ریلیاں نکلیں اور فضا میں بدگمانیوں کے پرندے منڈلانے لگے۔

بد اعتمادی وہ دیمک ہے جو مضبوط سے مضبوط رشتوں کو بھی اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہے۔ سابق سفارتکاروں کے تجزیات اسی داخلی سڑن کی نشاندہی کرتے ہیں۔ بین الاقوامی اصولوں کا تقاضا ہے کہ سفارتی مشن مقدس امانت ہوتے ہیں، مگر جب جذبات غالب آجائیں تو امانتیں بھی خطرے میں محسوس ہونے لگتی ہیں۔ سابق سفارتکار کے بقول ایسی بد اعتمادی پہلے کبھی نہ تھی۔ بین الاقوامی تعلقات کا طوائی اصول یہی ہے کہ سفارتی مشن کا تحفظ اولین ذمہ داری ہے۔ اور یہی اصول اس وقت آزمائش گاہ میں کھڑا نظر آتا ہے۔

درخت سے باندھ کر آگ لگا دینا یہ جملہ ہی انسانی روح کو لرزادیتا ہے۔ اس واقعے نے نہ صرف ہندو حلقوں میں اضطراب بڑھایا بلکہ ریاستی رٹ، قانون کی عمل داری اور اقلیتوں کے حقوق کے باب میں نئے سوال اٹھادیے۔ سوشل میڈیا نے اس سانحے کو لحوں میں سرحدوں سے آزاد کر کے انسانی ضمیر کے

دروازوں پر دستک دے ڈالی۔



ہندو ملازم داس کی المناک ہلاکت، درخت سے باندھ کر آگ لگا دینے کا اندوہناک منظر اور اس کی ویڈیو کا پھیلاؤ یہ سب کچھ غصے اور اشتعال کے شعلوں کو بلند تر کر تا چلا گیا۔ اس سانحے نے اقلیتوں کے تحفظ کے باب میں نئے سوالات کو جنم دیا۔ ساتھ ہی مختلف حلقوں کی جانب سے طرح طرح کی نسبتیں اور اشارے سامنے آتے رہے جنہیں ذمہ دارانہ تحقیق اور عدالتی طریقہ کار کی کسوٹی پر پرکھنا ناگزیر ہے۔

عبوری حکومت کے سربراہ کا بیان امید کی شمع ضرور ہے، مگر تاریخ کا کاتب یہ بھی لکھتا ہے کہ صرف بیان کافی نہیں ہوتا۔ قانون کو طاقت سے عبوری حکومت کے سربراہ محمد یونس نے نہیں، انصاف سے وقعت ملتی ہے۔ اب نگاہیں اس پر ہیں کہ یہ وعدہ عمل کی صورت کس طرح ڈھلتا ہے۔ صاف الفاظ میں کہا کہ نئے بنگلہ دیش میں اس قسم کے تشدد کی کوئی گنجائش نہیں۔ قانون کی برتری کا وعدہ اسی وقت معتبر ہو گا جب انصاف کی ترازو دونوں پلوں میں یکساں ٹھہر سکے۔

گرفتاریاں اپنی جگہ، مگر سوال اپنی جگہ قائم ہے کہ کیا اقلیت خود کو محفوظ سمجھ رہی ہے؟ جمہوری معاشرے کا حسن یہی ہے کہ کمزور طبقات سب سے زیادہ محفوظ ہوں۔ اگر وہ لرزاں ہوں تو ریاست کا وقار مجروح ہوتا ہے۔ داس کے قتل میں ملوث متعدد افراد کی گرفتاری کے باوجود سوال اپنی جگہ یہ ہے کہ کیا اقلیتوں کے دلوں میں بیٹھا خوف کم ہو سکا؟ کیا یہ تشدد وقتی ہجائ ہے یا کسی گہرے سماجی اضطراب کا مظہر؟

کچھ بیانیوں کے مطابق مذہبی انتہا پسند عناصر کی شمولیت کے شکوک ظاہر کیے گئے ہیں، جن کے نتیجے میں اخبارات و ثقافتی اداروں پر حملوں کی خبریں آئیں۔ یہ صورتحال اس سوال کو پھر سے زندہ کرتی ہے کہ قلم اور ثقافت پر وار کرنے والے دراصل معاشرے کے کس زاویے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اخبارات اور ثقافتی اداروں پر حملے اس امر کی علامت ہیں کہ سماج کے اندر ایک ایسا طبقہ موجود ہے جو اختلاف کو مکالمے سے نہیں، طاقت سے جواب دینا چاہتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں تہذیبی روایت، رواداری اور دل آویزی کا امتحان شروع ہوتا ہے۔

کچھ بیانیوں کے مطابق مذہبی انتہاپسند عناصر کی شمولیت کے شکوک ظاہر کیے گئے ہیں، جن کے نتیجے میں اخبارات و ثقافتی اداروں پر حملوں کی خبریں آئیں۔ یہ صورتحال اس سوال کو پھر سے زندہ کرتی ہے کہ قلم اور ثقافت پر وار کرنے والے دراصل معاشرے کے کس زاویے کی نمائندگی کرتے ہیں۔

سول سوسائٹی کی آواز ریاست کی سماجی روح ہوتی ہے۔ اُس روح نے واضح کہا کہ عبوری انتظامیہ امن بحال کرنے میں پسپا دکھائی دی۔ سماج کی یہ آواز محض شکایت نہیں بلکہ اصلاحِ حال کی دعوت بھی ہے۔ سول سوسائٹی کی آوازیں پُر شکوہ احتجاج میں ڈھل گئیں کہ امن وامان کے قیام میں عبوری انتظامیہ ناکام رہی۔ گویا ریاست کے ہاتھ میں تھامی ہوئی شمع لرزاں دکھائی دی۔

بین الاقوامی ماہرین نے بجا کہا کہ میڈیا کا کردار آگ بھی بھڑکا سکتا ہے اور پانی بھی ڈال سکتا ہے۔ اگر خبر تحریر بن کر تعصب اوڑھ لے تو معاشرے کی آنکھوں میں دھواں بھر دیتی ہے۔ اس لیے ذمہ دارانہ رپورٹنگ اس وقت ناگزیر ہو چکی ہے۔ بین الاقوامی محققین نے اس جانب بھی توجہ دلائی کہ بعض بھارتی ذرائع ابلاغ بنگلہ دیش کی صورتحال کو ایسے انداز میں پیش کر رہے ہیں جس سے فرقہ وارانہ تاثر گہرا ہو۔ ساتھ ہی یہ حقیقت بھی اجاگر ہوئی کہ بنگلہ دیش کا استحکام خطے کی مجموعی سلامتی سے جڑا ہوا ہے۔

انتخابات بنتے بھی ہیں، بگاڑتے بھی ہیں۔ 12 فروری کے انتخابات کی آمد نے سیاسی فضا کو مزید سنجیدہ بنا دیا ہے۔ عبوری سربراہ کیلئے چیلنج یہی ہے کہ وہ انتخابی

مرحلے سے قبل امن و اطمینان کی فضا ہموار کر سکیں۔ اس لئے 12 فروری کا انتخاب صرف اقتدار کی تبدیلی نہیں بلکہ استحکام اور بے چینی کے درمیان فیصلہ کن لکیر ثابت ہو سکتا ہے۔ عبوری حکومت کا اصل امتحان تشدد کی آگ بجھانا اور رائے دی کیلئے پُر امن فضا فراہم کرنا ہے۔

عوامی لیگ کی غیر حاضری نے سیاسی بساط کو نئی ترتیب دی ہے۔ عوامی لیگ کی عدم شرکت کے باعث بنگلہ دیش نیشنلسٹ پارٹی کے امکانات روشن دکھائے دیتے ہیں، البتہ مذہبی سیاسی قوتیں بھی ایک مؤثر چیلنج کے طور پر سامنے آسکتی ہیں اور مذہبی سیاسی قوتوں کی متحرک موجودگی سیاسی معاملات کو مزید پیچیدہ بنا سکتی ہے۔ سیاست کا دریا سیدھی لکیر میں نہیں بہتا۔ سیاست کا شطرنجی کھیل اپنے پتے ابھی مکمل طور پر نہیں کھولتا کہ نتائج کسی اور منظر نامے کی طرف بڑھ جاتے ہیں۔

بھارت کے پالیسی ساز اس صورتحال کو محض بیرونی مسئلہ نہیں، بلکہ داخلی سلامتی سے جڑا معاملہ سمجھ رہے ہیں۔ دانا دل یہی کہتے ہیں کہ ہمسائے آگ لگنے پر تماشائیں دیکھتے۔ وہ پانی ڈھونڈتے ہیں۔ بھارت کے سیاسی و دفاعی حلقوں میں بھی اس صورتِ حال کو بڑا اسٹریٹجک چیلنج سمجھا جا رہا ہے۔ سابق سفارتکار اس امر پر متفق ہیں کہ زمینی حقائق کو تسلیم کرتے ہوئے اعتماد سازی کی نئی بنیاد ڈالنا وقت کی ضرورت ہے۔ کہ پڑوسی دیوار نہیں، سایہ دار درخت ہوا کرتے ہیں لیکن بد نصیبی یہ ہے کہ مودی حکومت سایہ دار درختوں کی نہ صرف کٹائی بلکہ کانٹوں کی افزائش پر عملدرآمد ہے۔

انتخابی نتائج کچھ بھی ہوں، منزل ایک ہی ہونی چاہیے: امن، احترام اور باہمی اعتماد۔ الزام تراشی سے سیاسی زمین بخر ہو جاتی ہے؛ گفٹ و شنید سے اس میں فصل اگتی ہے۔ آج کی ضرورت یہی ہے کہ خطے کے رہنما ان کے میناروں سے اتر کر عقل اور انصاف کے فرش پر بیٹھیں۔ بھارت کی جانب سے منتخب حکومت کے ساتھ مکالمے کی بات بھی سامنے آئی ہے۔ اور اسی کے ساتھ یہ تلخ نوٹ بھی سنائی دیتا ہے کہ باہمی بد اعتمادی کی یہ آگ کسی ایک بیان یا فیصلے

سے نہیں بچھے گی۔ اس وقت سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ الزامات کی گولہ باری کے بجائے عقل و تدبر، تحمل و برداشت اور انصاف و اعتدال کے چراغ روشن کیے جائیں لیکن صد افسوس کہ مودی سرکار کے تمام اقدامات اس کے برعکس ہیں اور تکبر کی آگ ایک دن سب کچھ بھسم کر کے رکھ دے گی اور دنیا کی بڑی جمہوریت کے دعوے کا قلعہ کھل کر سامنے آجائے گی لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی ہوگی۔

تاریخ ہمیں یہی سبق دیتی ہے کہ سرحدیں زمین پر کھینچی ہوں یا دلوں پر۔ انہیں پار کرنے کا واحد راستہ مکالمہ، انصاف اور باہمی احترام ہے۔ بنگلہ دیش اور بھارت کے تعلقات کا یہ باب بظاہر ابھی بند نظر آرہا ہے لیکن قلم چل رہا ہے، سیاہی آج بھی گیلی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آنے والی سطریں صلح و آشتی کی خوشبو سے لبریز ہوتی ہیں یا بدگمانیوں کی گردان پر چھا جاتی ہے۔

یہ تمام واقعات محض خبریں نہیں، تاریخ کے صفحات پر لکھی جانے والی سطور ہیں۔ آنے والے دن طے کریں گے کہ یہ سطور آنسوؤں سے لکھی جائیں گی یا مسکراہٹوں سے۔ اختیار انسان کے ہاتھ میں ہے۔ اور فیصلہ وقت کی عدالت میں محفوظ ہے۔ تاریخ اپنی آنکھوں میں آنسو لیے کھڑی ہے اور وقت اپنی مٹھی میں ایک سوال سنبھالے ہوئے ہے، کیا انسان پھر انسان بنے گا؟ بنگلہ دیش ہو یا بھارت — زمین کے یہ ٹکڑے ہماری آزمائش ہیں، ورنہ اصل سرحدیں تو دلوں میں بنتی اور ٹوٹتی ہیں۔ معصوم عثمان ہادی — اس کے خون کے ہر قطرے نے آسمان تک رسائی پالی ہے اور عدل کے پیمانوں کو پکارا ہے۔

اسلام ہمیں سکھاتا ہے:

”إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ“ بیشک مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

مگر ہم نے اس بھائی چارے کو سیاسی نعروں کے ہجوم میں کہیں گم کر دیا ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ حکمران ہوں یا عوام، دانشور ہوں یا رہنما — سب اپنے گریبانوں میں جھانکیں اور یہ عہد دوبارہ تازہ کریں کہ ظلم کسی قسم کا ہو، کسی رنگ کا ہو، اور کسی سرحد کے اندر ہو — ہم اس کے خلاف کھڑے ہوں گے۔ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر یہ سوال پوچھنے کی ضرورت ہے کہ ہم نے عثمان ہادی کو اپنا بھائی سمجھا، اپنے جسم کا حصہ سمجھا تو پھر اس کے ناحق قتل پر ہم نے بطور ریاست پاکستان کس قدر احتجاج کیا؟

ہمیں یہ سمجھنا ہو گا کہ سفارتی تعلقات کی بحالی سے پہلے قلوب کی مرمت ضروری ہے۔ نفرت کے خیمے اکھاڑ کر انصاف کے خیمے نصب کرنا ہوں گے۔ سیاست کو انتقام کی بجائے خدمت کا لبادہ اوڑھنا ہو گا لیکن جب تک پڑوس میں متعصب ہندو تو آریس ایس کے نمائندے مودی کی حکومت ہے، اس خطے میں امن کا حصول محض ایک خواب بنتا جا رہا ہے۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ امت مسلمہ کے تمام پلیٹ فارمز پر متحد ہو کر اس خطرے کی نشاندہی کر کے متعصب ہندو تو کو تکلیف ڈالی جائے۔

دعا یہی ہے کہ اے رب کائنات!

جن دلوں میں نفرت نے بسیرا کیا ہے وہاں محبت اُتار دے، جہاں نا انصافی نے ڈیرے ڈالے ہیں وہاں عدل کا سورج طلوع کر، اس خطے کے مسلمانوں کو وہ بصیرت عطا فرما کہ وہ تفرقے کی راہوں سے نکل کر اخوت اور ایمان کی شاہراہ پر آجائیں۔ آخر کار فیصلہ سیاست دانوں کا نہیں، ضمیر اور اللہ کی عدالت کا ہے۔

تدبیر کا زوال، تقدیر کا ظہور

تاریخ کی بساط پر جب قومیں اپنی چالیں چلتی ہیں تو بعض لمحات ایسے بھی آتے ہیں جب تقدیر خود مہرہ بن کر کھیلتی ہے۔ تاجکستان میں عینی ایئر بیس کی خالی ہونے کی کہانی — انڈیا کی سٹریٹجک ناکامی، تقدیر کی کروٹ ہے یا مودی کے تکبر کا بدترین نتیجہ؟ تاریخ کے صفحات جب اپنے سینے پر نئی لکیریں کھینچتے ہیں قوموں کی تدبیریں اکثر تقدیر کے ہاتھوں شکست کھا جاتی ہیں۔ تاجکستان میں انڈیا کے واحد بیرون ملک فضائی اڈے عینی ایئر بیس کی داستان بھی کچھ تو ایسی ہی ہے — جہاں سیاست نے عسکریت کو، اور جغرافیہ نے حکمتِ عملی کو مات دی۔

تاجکستان کی بلند و بالا وادیوں میں انڈیا کا عینی ایئر بیس کبھی وسطی ایشیا میں دہلی کے بڑھتے قدموں کی علامت سمجھا جاتا تھا — مگر آج وہی ایئر بیس مودی حکومت کی سب سے بڑی سٹریٹجک ناکامی کے عنوان سے یاد کیا جا رہا ہے۔ دہلی کی سیاست میں اس پر شور و غوغا ہے، حزب اختلاف کی جماعتیں اسے سفارتی شکست، عسکری پسپائی قرار دے رہی ہیں، جبکہ عالمی دفاعی ماہرین اسے ایک غلط تدبیر کی منطقی سزا بتاتے ہیں۔ یہ وہ لمحہ ہے جب سیاست کی تدبیریں وقت کے بوجھ تلے دب گئیں اور طاقت کا غرور مٹھی بھر گرد میں بدل گیا۔ گویا تاریخ نے ایک بار پھر انسان کو اس ازلی حقیقت کی یاد دہانی کرائی:

قُلِ اللّٰهُمَّ مَلِكَ الْمَلِكِ تُؤْتِي الْمَلِكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمَلِكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ طِبِّدَكَ الْخَيْرُ ط
اِنَّكَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔

کہو خدا یا مالک کے مالک! تُو جسے چاہے، حکومت دے اور جس سے چاہے، جھین لے۔ جسے چاہے، عزت بخشے اور جس کو چاہے، ذلیل کر دے۔ بھلائی تیرے اختیار میں ہے۔ بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ (العمران: 26)

تاریخ کے صفحات پر بعض فیصلے ایسے ہوتے ہیں جو وقت کے گزرنے کے باوجود قوموں کے شعور پر داغ بن جاتے ہیں۔ تاجکستان میں انڈیا کے عینی ایئر بیس کا خالی ہونا ایسا ہی ایک فیصلہ ہے جسے آج نئی دہلی کے ناقدین سٹریٹجک ناکامی قرار دے رہے ہیں۔ یہ وہ مقام تھا جہاں سے انڈیا وسطی ایشیا کے افق پر اپنی موجودگی کا پرچم لہرا رہا تھا۔ مگر جب وقت نے کروٹ بدلی تو تدبیر کا چراغ بجھ گیا۔ ﴿وَمَا تَشَاءُونَ اِلَّا اَنْ يَّسْئَلَ اللّٰهُ﴾ اور تم کچھ نہیں چاہتے مگر وہی جو اللہ چاہتا ہے۔ (الانسان: 30)

انڈیا نے تقریباً 25 برس قبل تاجکستان کی سرزمین پر عینی ایئر بیس قائم کیا — یہ اس کا واحد بیرونی فوجی اڈہ تھا۔ افغانستان، پاکستان اور چین کے سنگم پر واقع یہ خطہ، انڈیا کیلئے نہ صرف جغرافیائی لحاظ سے بلکہ سیاسی اعتبار سے بھی نہایت اہم سمجھا جاتا تھا۔ یہاں سے وسطی ایشیا کی فضاؤں تک پرواز محض عسکری نہیں بلکہ سفارتی بالادستی کی علامت تھی۔

یہ اڈہ انڈیا کی بیرون ملک عسکری موجودگی کی واحد علامت تھا۔ گزشتہ دو دہائیوں میں انڈیا نے اس اڈے کی تعمیر و تزئین پر دس کروڑ ڈالر صرف کیے۔ سوویت دور کی بنیادوں پر تعمیر شدہ اس مقام پر انڈین انجینئروں نے ایک وسیع رن وے، ایندھن کے ذخائر اور ایئر ٹریفک کنٹرول ٹاور قائم کیے — گویا ایک ایسا قلعہ جہاں سے نئی دہلی اپنی فضائی شوکت کا پرچم لہرا سکے۔ 25 برس قبل جو سفر تاجکستان کی فضاؤں سے شروع ہوا، آج مایوسی کے افق پر ختم ہوا۔ یہ بندش نہ صرف عسکری پسپائی ہے بلکہ انڈیا کی علاقائی حکمتِ عملی کی کمزوری کا مظہر بھی ہے۔ عینی بیس دراصل انڈیا کے طاقت کے مظاہرے

کا ایک ذریعہ تھا۔ یہ صرف عسکری نہیں بلکہ نفسیاتی برتری کا مرکز تھا مگر وقت کی دھول نے نہ صرف اسے مٹا دیا بلکہ مودی کو ندامت کی خاک چاٹنے پر بھی مجبور کر دیا۔

تاجکستان کا مقام محض ایک ملک کا نام نہیں بلکہ افغانستان، چین اور پاکستان کے درمیان ایک حساس مثلث ہے۔ یہاں سے وسطی ایشیا کی راہ کھلتی ہے، جہاں سے انڈیا اپنی موجودگی کو پاکستان کے گرد گھیر اڑانے کے ایک منصوبے کے طور پر دیکھتا تھا مگر تاریخ نے یہ واضح کر دیا کہ جغرافیہ صرف نقشے پر نہیں، سیاست کی نبض پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ جب خبر آئی کہ انڈیا نے یہ اڈہ خالی کروا لیا گیا ہے تو دہلی کے ایوان سیاست میں ہلچل مچ گئی۔ حزب اختلاف کی جماعت کانگریس کے جنرل سکریٹری نے اس فیصلے کو انڈیا کی شرمناک سٹریٹجک ناکامی قرار دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ وہی ایئر بیس ہے جہاں سے انڈیا وسطی ایشیا میں اپنی موجودگی مستحکم کرنے کے خواب دیکھتا تھا۔

گزشتہ 20 برسوں میں انڈیا نے تقریباً 10 کروڑ ڈالر اس اڈے کی تعمیر و توسیع پر خرچ کیے۔ یہ وہ مقام تھا جو سوویت دور میں بنایا گیا، مگر انڈیا نے اسے از سر نو بنایا۔ ایک لمبارن وے، ایندھن ذخیرہ کرنے کے ڈپو اور جدید ایئر ٹریفک ٹاور تعمیر کیا مگر سوال یہ ہے کہ اتنے سرمایے اور منصوبہ بندی کے باوجود انجام اتنا شرمناک اور عبرت ناک کیوں ہوا؟

باوثوق اطلاعات کے مطابق تاجکستان نے چار برس قبل ہی اشارہ دے دیا تھا کہ انڈیا رفتہ رفتہ اپنی موجودگی ختم کرے۔ باوجود اس کے کہ انڈیا نے لاکھ جتن و تدبیریں کیں، مگر آخر کار اسے بے آبرو ہو کر کوچ کرنا پڑا۔ دفاعی ماہرین نے اسے مودی حکومت کیلئے ایک سفارتی دھچکا اور عسکری پسپائی قرار دیا۔ انڈیا نے اس اڈے کو صرف عسکری مرکز نہیں بلکہ اپنی سٹریٹجک خود اعتمادی کا نشان بنایا مگر تاریخ کا قانون یہ ہے کہ جو طاقت توازنِ عدل سے خالی ہو، وہ پائیدار نہیں رہتی۔ یہی وہ مقام تھا جہاں غرورِ اقتدار نے بصیرت کی جگہ لے لی۔

انڈین وزارت خارجہ کے ترجمان رندھیر جیسوال نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے تاجکستان کے ساتھ ایک فضائی اڈہ بنانے کا دو طرفہ معاہدہ کیا تھا، جو اپنی مدت پوری ہونے پر ختم ہوا۔ اب ہم نے وہ اڈہ تاجک حکومت کے حوالے کر دیا ہے۔ یہ بیان گویا ایک سفارتی چادر ہے جس میں ناکامی کو لپیٹ دیا گیا ہے تاکہ مودی کے چہرے پر ان کی غلط پالیسیوں کی کالک چھپائی جاسکے مگر سیاسی مبصرین کے نزدیک یہ بیان دراصل سفارتی پردہ پوشی ہے، حقیقت یہ ہے کہ انڈیا کو علاقائی دباؤ کے تحت وہاں سے نکلنا پڑا۔

یہ اڈہ محض عسکری مرکز نہیں بلکہ ایک تاریخی یادگار تھا۔ 2000 کی دہائی میں یہاں انڈیا نے ایک ہسپتال بھی قائم کیا تھا، جو شمالی اتحاد کے زخمیوں کی امداد کا مرکز بنا۔ یہ ایئر بیس اُس وقت قائم ہوا جب طالبان پہلی مرتبہ افغانستان میں برسرِ اقتدار آئے۔ اس وقت انڈیا نے تاجکستان کے ساتھ ایک معاہدے کے تحت نہ صرف ایئر بیس بلکہ ایک ہسپتال بھی تعمیر کیا۔ یہ منصوبہ دراصل درپردہ شمالی اتحاد کی مدد کیلئے تھا، جو طالبان مخالف قوت تھی۔

نائن ایون سے دو روز قبل القاعدہ نے شمالی اتحاد کے رہنما احمد شاہ مسعود پر حملہ کیا۔ احمد شاہ مسعود کو زخمی حالت میں لایا گیا، جہاں ایک انڈین ڈاکٹر نے ان کی موت کی تصدیق کی۔ یہی وہ وقت تھا جب دہلی نے اپنے لیے وسطی ایشیا میں ایک نیاباب کھولا، مگر وقت کی گرد نے اسے بھی دھندلا دیا۔ یہ وہ لمحہ تھا جب انڈیا کی افغان پالیسی کی بنیاد رکھی گئی۔ مگر آج وہ بنیاد اپنی جگہ سے بری طرح پھٹ کر ہٹ چکی ہے۔



عینی ایئر بیس کی خالی ہونے کی خبر پر کانگریس نے حکومتِ وقت کو آڑے ہاتھوں لیا۔ ان کے مطابق یہ فیصلہ سٹریٹجک ناکامی اور سفارتی پسپائی ہے۔ ان کے بیانات سے واضح ہوا کہ انڈیا کے اندرونی سیاسی حلقوں میں بھی یہ فیصلہ قوم کی دفاعی کمزوری سمجھا جا رہا ہے۔ تجزیہ کار راہول بیدی کے مطابق یہ بیس انڈین فضائیہ اور بارڈر ووڈز آرگنائزیشن کا مشترکہ منصوبہ تھا، جسے حکومت نے اپنی غفلت کے باعث انجام بد تک پہنچا دیا۔ سنجیو شرما استونے یاد دلایا کہ یہ اڈہ اُس وقت قائم ہوا جب طالبان پہلی مرتبہ افغانستان میں برسرِ اقتدار آئے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ افغانستان میں انڈیا کے حلیفوں، خصوصاً شمالی اتحاد کو مدد فراہم کی جائے۔

نائن الیون کے حملوں کے بعد امریکا نے طالبان حکومت کا خاتمہ کیا تو خطے کی بساط بدل گئی۔ افغانستان میں طاقت کا توازن بدلا اور انڈیا نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی موجودگی کو مزید مضبوط کیا لیکن جب 2021ء میں طالبان دوبارہ اقتدار میں آئے، تو انڈیا کے تمام منصوبے اپنی سیاسی بنیادوں سے محروم ہو گئے اور وہ تمام منصوبے جو طالبان مخالف حکمتِ عملی پر مبنی تھے، یکسر بے معنی ہو گئے۔ آج حالات اس نہج پر ہیں کہ انڈیا اور طالبان کے درمیان روابط بحال ہو چکے ہیں۔ وزیر خارجہ امیر خان متقی کا حالیہ دورہ ہند اسی تغیر کی نشانی ہے۔

کانگریس رہنماؤں کے مطابق عینی ایئر بیس کا محل وقوع ایسا تھا جہاں سے انڈیا پورے خطے پر نظر رکھ سکتا تھا۔ یہاں سے افغانستان کے راستے وسطی ایشیا تک رسائی ممکن تھی۔ یہی وجہ تھی کہ دہلی نے یہاں اپنی عسکری موجودگی بڑھانے کے بڑے منصوبے رکھے۔ مگر زمانے نے ایک مرتبہ پھر کروٹ لی اور اب مودی سرکار کے وہ تمام خواب شکستہ شیشے کی مانند بکھر گئے۔

﴿وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ﴾ یہ دن ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں (العران: 140)
تاریخ کے یہی گردش کرتے دن انڈیا کو اپنے ہی چمٹا کے منصوبے کی راکھ پر بیٹھنے پر مجبور کر گئے۔

اطلاعات کے مطابق چار برس قبل تاجکستان نے انڈیا کو نرم انداز میں یہ اشارہ دے دیا تھا کہ وہ رفتہ رفتہ اپنی سرگرمیاں سمیٹ لے۔ انڈیا کی کوششوں، مالی پیشکشوں اور مذاکرات کے باوجود، بالآخر اسے وہاں سے رخصت ہونا پڑا۔ دفاعی ماہرین کے مطابق یہ مودی حکومت کیلئے ایک بڑا سفارتی دھچکا ہے، جس نے انڈیا کی عالمی ساکھ پر سوال کھڑے کر دیے۔

22 / اپریل کو پہلگام کشمیر میں ہونے والے حملے کی طالبان حکومت نے مذمت کی۔ یہ بیان اس نئی حکمتِ عملی کا مظہر ہے جس کے تحت طالبان انڈیا کے ساتھ نرم رویہ اختیار کر رہے ہیں۔ ایک ایسا تغیر جس نے خطے کے سیاسی افق پر کئی سوالات اٹھا دیے۔ امیر خان متقی کا ہفتہ بھر کا دورہ انڈیا کی پالیسی میں تبدیلی کا اشارہ ہے۔ جو ملک کبھی طالبان کو خونخوار درندوں سے تشبیہ دیتا تھا، طالبان مخالف قوتوں کا حامی تھا، آج انہی سے تعلقات بڑھا رہا ہے۔ یہی سیاست کی وہ کروٹ ہے جو دوستوں کو دشمن اور دشمنوں کو سفارتی حلیف بنا دیتی ہے۔ اب طالبان اور انڈیا کے درمیان تعلقات بہتر ہوتے جا رہے ہیں۔ وزیر خارجہ امیر خان متقی کا انڈیا کا دورہ اس کا ثبوت ہے۔

اطلاعات کے مطابق انڈیائی طالبان کو مالی و عسکری امداد دے کر دریائے کابل پر ڈیم بنانے میں مدد فراہم کرنے کی پیشکش کی ہے تاکہ پاکستان کیلئے پانی کی رسد کم کر کے آبی دباؤ بڑھایا جاسکے۔ یوں عینی ایئر بیس کے زوال کے ساتھ ساتھ انڈیائی اپنی پالیسی کا رخ بدلنے کی کوشش کی۔ مگر طاقت کی بساط پر چال بدلنے سے تقدیر نہیں بدلتی۔

راہول کے مطابق عینی بیس انڈین فضائیہ اور بارڈر روڈز آرگنائزیشن کی مشترکہ کاوش تھی۔ یہ دونوں ادارے انڈیا کے دفاعی ڈھانچے کی ریڑھ کی ہڈی سمجھے جاتے ہیں۔ مگر حکومت نے اس منصوبے کو سیاسی ترجیح نہیں دی، نتیجتاً ایک قیمتی اثاثہ کھو دیا۔ اہم ذرائع کے مطابق روس اور چین دونوں نے تاجک حکومت پر دباؤ ڈالا کہ وہ انڈیا سے ایئر بیس خالی کروائے۔ انڈیا کی مالی پیشکشیں بھی رد کر دی گئیں۔ گویا تاجکستان نے ایشیا کی نئی طاقتوں کے زیر اثر فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ دراصل اس بات کا اعلان ہے کہ ایشیا کی طاقت کا محور بدل چکا ہے۔ اب دہلی نہیں، بلکہ ماسکو اور بیجنگ کی سانسوں پر خطے کی سیاست چلتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انڈیا کی سٹریٹجک خود مختاری کا نقاب اُتر گیا۔

راہول بیدی نے کہا کہ یہ ایئر فورس کا مسئلہ نہیں، یہ حکومت کا مسئلہ ہے۔ انہوں نے نشاندہی کی کہ حکومت نے اس موقع کو اپنی قوتِ عمل دکھانے کیلئے استعمال نہیں کیا۔ یہ وہی روش ہے جو قوموں کو افلاسِ تدبیر کی جانب دھکیلتی ہے۔

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ﴾ بیشک اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدلے۔
(الرعد: 11)

تاجکستان کی وادیوں میں جہاں کبھی انڈین فضائیہ کے طیارے گرجا کرتے تھے، آج وہاں خاموشی بولتی ہے۔ انڈیائی وسطی ایشیا میں اپنی موجودگی کو بڑھانے کا جو خواب دیکھا تھا، وہ سفارتی نزاکتوں اور سیاسی کمزوریوں کی بھینٹ چڑھ گیا۔
فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِيَ الْأَبْصَارِ -- اے دیدہ و بینا لوگو! پس عبرت حاصل کرو (الحشر: 2)

انڈیائی وسطی ایشیا میں اپنی موجودگی بڑھانے کی کوشش کی، مگر غلط پالیسیوں اور سفارتی کمزوریوں نے اس کوشش کو ناکام بنا دیا۔ مودی حکومت نے جس تیزی سے معاشی تعلقات کو فوقیت دی، اسی شدت سے دفاعی سطح پر کمزوری دکھائی۔

عینی ایئر بیس کا خالی ہونا محض ایک فوجی اڈے کی بندش نہیں، بلکہ ایک فکری و سٹریٹجک ناکامی کی علامت ہے۔ یہ واقعہ انڈیا کیلئے وہ آئینہ ہے جس میں وہ اپنی علاقائی سیاست کی حقیقت دیکھ سکتا ہے۔ کہ طاقت صرف ہتھیار سے نہیں، بلکہ اعتماد، توازن اور بصیرت سے قائم ہوتی ہے۔ یوں تاجکستان کی فضاؤں میں گونجتا ہوا ایک سوال باقی رہ جاتا ہے: کیا یہ محض ایک اڈے کا خاتمہ تھا، یا ایک خواب کا جنازہ؟

عینی ایئر بیس کی بندش محض ایک عسکری تنبیہ نہیں، بلکہ ایک دورِ اقتدار کی فکری کمزوری کی علامت ہے۔ مودی حکومت کی یہ سٹریٹجک ناکامی انڈیا کے اس خواب پر لکیر کھینچتی ہے جو وسطی ایشیا میں بالادستی کے تصور پر مبنی تھا۔ آج دہلی کے ایوانوں میں خاموشی ہے، مگر اس خاموشی میں تاریخ کی سرگوشی سنائی دیتی ہے کہ طاقت کا غرور ہمیشہ تدبیر کے زوال سے شروع ہوتا ہے۔

عالمی دفاعی ماہرین کہتے ہیں کہ عینی ایئر بیس کا زوال دراصل انڈیا کی خارجہ پالیسی کے توازن کے بکھرنے کا آغاز ہے، اور اپوزیشن اسے مودی عہد کا سب سے بڑا اثر مناک سٹریٹجک سانحہ قرار دیتی ہے۔

﴿فَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ﴾ اور عنقریب وہ ظالم جان لیں گے کہ وہ کس انجام کی طرف لوٹائے جائیں گے۔
(الشعراء: 227)

یوں تاجکستان کی وادیوں سے اٹھتی ہوئی خاموشی میں ایک پیغام چھپا ہے کہ طاقتکار خ ہمیشہ ان ہی کی طرف ہوتا ہے جو تدبیر کو تدبیر پر غالب رکھتے ہیں، اور غرور کی بجائے بصیرت کا پرچم اٹھاتے ہیں۔

عینی ایئر بیس کی بندش ایک عسکری واقعہ نہیں بلکہ تقدیر کا اشارہ، جھوٹی انا، طاقت و تکبر کا لمحہ فکر یہ ہے۔ یہ وہ لمحہ ہے جب طاقتور قوموں کو یہ سمجھنا چاہیے کہ:

وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمُ اللَّهُ۔۔ جو کچھ اللہ نے تمہیں دیا ہے اس پر اتراؤ نہیں (الحمدید: 23)

انڈیا کی یہ سٹریٹجک ناکامی دراصل ایک سبق ہے کہ دنیا کے نقشے پر وہی قوم باقی رہتی ہے جو دانش عمل کے ساتھ فکر عمیق کو بھی لازم رکھے۔ جو حکمت کار کے ساتھ بصیرت دل کو بھی ہمراہ رکھنے کے ساتھ ساتھ فراست عمل اور دور اندیشی کو اپنا شعار بنائے لیکن وائے افسوس کہ مودی اپنے اقتدار کے نشے اور لالچ میں اکھنڈ بھارت کو بحر ہند میں ڈبونے کی پالیسیوں پر گامزن ہے۔

فضائی حادثات اور اقتدار کا المیہ

تاریخ کے اوراق پر جب ہم نگاہ ڈالتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ آسمان کبھی کبھی صرف بادل نہیں گراتا۔ قیادتیں بھی گرا دیتا ہے۔ فضاؤں میں اڑتے ہوئے یہ طیارے جب تباہ ہوتے ہیں تو محض لوہا نہیں ٹوٹتا، قوموں کے حوصلے بھی چکنچور ہو جاتے ہیں۔ ان تباہ حال ملکوں کے درمیان صرف لاشیں نہیں ملتیں، ادھورے خواب، نامکمل منصوبے اور ٹوٹی ہوئی امیدیں بھی ملتی ہیں۔

عصر حاضر کی سیاست کا ایک کڑوا سچ یہ بھی ہے کہ عالمی طاقتیں اور استعمار اپنے مفادات کیلئے ایسی راہوں پر بھی چل پڑتے ہیں جن پر اخلاق، انسانیت اور قانون ساتھ نہیں دیتا۔ تاریخ کے صفحات گواہ ہیں کہ جب تیسری دنیا کی قیادتیں خود مختاری، معاشی آزادی اور قومی وقار کی بات کرتی ہیں تو ان کے گرد سازشوں کے بادل گہرے ہونے لگتے ہیں۔ کہیں حادثہ کہہ دیا جاتا ہے، کہیں تکنیکی خرابی کا عنوان دے دیا جاتا ہے، مگر سوال زندہ رہتا ہے، کیا یہ سب کچھ محض اتفاق ہے؟ یا طاقت کی عالمی شطرنج پر چلی جانے والی وہ خاموش چالیں ہیں جو فائیکوں میں محفوظ رہتی ہیں اور زبانوں پر نہیں آتیں؟

ان فضائی سانحات نے خاص طور پر ایشیا، افریقا اور مسلم دنیا کی سیاسی و عسکری قیادت کو نشانہ بنایا۔ تیسری دنیا کی قومیں بار بار اس المیہ سے گزریں۔ کبھی صدر رخصت ہوا، کبھی سپہ سالار، کبھی پوری قیادت ایک ساتھ۔ نتیجہ ہمیشہ ایک رہا: انتشار، غیر یقینی صورتحال، کمزور حکومتیں اور عوام کی ٹوٹی ہوئی کمر۔

آج کی تیسری دنیا انہی زخموں کے ساتھ زندہ ہے۔ وہ جانتی ہے کہ اس کی کمزور معیشتیں، اس کے قرضوں میں جکڑے ہوئے نظام اور اس کی منتشر سیاست کو عالمی طاقتیں اپنے مفادات کی تجربہ گاہ بنائے ہوئے ہیں۔ مگر اسی دنیا میں بیداری کی لہر بھی جنم لے رہی ہے۔ قومیں سوال پوچھ رہی ہیں، تاریخ کو نئے سرے سے پڑھ رہی ہیں، اور اپنی قسمتوں کو دوسروں کے اڈوں اور ایوانوں کے بجائے اپنے ہاتھوں میں لینے کی کوشش کر رہی ہیں۔ یہ تحقیقی مطالعہ انہی کہانیوں کا مجموعہ ہے جہاں حادثات صرف حادثے نہیں لگتے، اور جہاں آسمان کے نیچے صرف پرندے ہی نہیں گرتے، کبھی کبھی پوری تاریخ گر پڑتی ہے۔

تاریخ انسانیت میں اقتدار اور موت کا باہمی تعلق ہمیشہ سے غیر معمولی دلچسپی اور تجسس کا موضوع رہا ہے۔ قیادتیں عموماً زمین پر پروان چڑھتی مگر کثیر تعداد میں اختتام آسمانوں میں ہوا کے سپرد ہوا۔ ہوائی سفر۔ جو جدید تہذیب کی علامت ہے۔ بعض اوقات تاریخ کے مہلک ترین موڑ بھی لے آتا ہے۔ یہ مقالہ انہی سانحات کا تحقیقی مطالعہ ہے جن میں سربراہان ریاست، فوجی سپہ سالار، حکومتی اعلیٰ قیادت، شاہی خاندان کے افراد، فضائی حادثات کے نتیجے میں جاں بحق ہوئے۔ یہ مطالعہ محض حادثات کی فہرست نہیں بلکہ ان کے تاریخی پس منظر، تکنیکی و موسمی عوامل، سیاسی اثرات اور پیدا شدہ سازشی نظریات کا تطبیقی جائزہ بھی پیش کرتا ہے۔

23 دسمبر 2025 کی سرد صبح ترکی کی فضاؤں میں ایک ایسا سانحہ ظہور پذیر ہوا جس نے جہاں اہل خرد کو چوکا دیا وہاں اس نے عالم اسلام اور اہل لیڈیا کے دل دہلا دیے۔ قومی اتحاد کی حکومت کے فوجی سربراہ جنرل محمد الحداد ایک فضائی حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔ اجل نے پرواز کے دوران ان کو آلیا اور وہ اپنے رب کے حضور حاضر ہو گئے اور سفر زمینی نہ رہا، آخرت کا ہو گیا۔ تقدیر کی ہوائ نے ان کیلئے پرواز کو سفر آخرت بنا دیا۔

انقرہ سے طرابلس کی جانب گامزن یہ پرواز ابھی آسمان سے ہم کلام ہی ہوئی تھی کہ رابطے کے تار ٹوٹ گئے۔ چند ساعتوں کے بعد انقرہ سے 105 کلومیٹر دور ایک دیہات کی خاموش زمین کی مٹی نے اس بکھرے بلے کو گواہی کے طور پر سینے سے لگا کر اس حادثے کی گواہی دے دی کہ جانے والے دوبارہ اس دنیا میں واپس نہیں آتے۔

یہ صرف ایک فرد کی نہیں، قیادت کے ایک قافلے کی رخصتی تھی۔ اس پرواز میں صرف ایک سپہ سالار نہیں بلکہ قیادت کے کئی چراغ فروزاں تھے۔ لیبیا کے بری افواج کے چیف آف اسٹاف لیفٹیننٹ جنرل الفتوری، ملٹری مینوفیکچرنگ اتھارٹی کے سربراہ بریگیڈیئر جنرل محمود القطاوی، اور چیف آف جنرل اسٹاف کے مشیر محمد العسوی دیاب — سب اسی پرواز میں سوار تھے، اور سب کے سب اجل کے بلاوے پر لیک کہتے ہوئے شربتِ شہادت نوش کر گئے۔

یہ حادثہ ایک تنہا واردات نہ تھا، یہ حادثہ گویا دواشتوں کے درپچوں پر دستک تھا، اس نے ماضی کے اُن المیوں کی یاد تازہ کر دی جن میں عظیم عسکری و سیاسی شخصیات پرواز کے دوران تقدیر کے سپرد ہو گئیں۔ اس نے ماضی کے اُن سانحات کو بھی بیدار کر دیا جن میں سیاسی قائدین، عسکری رہنما اور شاہی خاندانوں کے افراد آسمانوں ہی میں وقت کی امانت کے طور پر لوٹ گئے۔ پرواز کے فوراً بعد رابطہ منقطع، انقرہ سے تقریباً 105 کلومیٹر کے فاصلے پر گر کر تباہی، بلے کے پھیلاؤ سے طیارے کے شدید دھماکے کا عندیہ، فوجی و سیاسی قیادت کا اکٹھا جاں بحق ہونا، یہ واقعہ لیبیا کے پہلے ہی غیر مستحکم سیاسی ماحول میں طاقت کے توازن کو متاثر فیصلہ سازی کے تسلسل کو منقطع اور بین الاقوامی دلچسپی کو مزید گہرا کر گیا۔

مئی 2024 میں ایران کے صدر ابراہیم رئیسی بھی فضائی حادثے کے نتیجے میں اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ اُن کا ہیلی کاپٹر آذربائیجان کی سرحد کے قریب پہاڑی خطے میں گر کر تباہ ہوا، جس میں وزیر خارجہ اور دیگر رفقاء بھی سوار تھے۔ جب وہ مشترکہ ڈیم کے افتتاح کے بعد واپسی کے سفر میں تھے۔ قومی سطح پر وسیع سوگ، قیادت کے تسلسل میں وقتی خلل، عوامی بیانیے میں سازش کے عناصر کی شمولیت، خطے کی سیاست پر فوری ردِ عمل، یہ حادثہ “سیاسی قیادت کی ناپائیداری” کے مباحث کو دوبارہ زندہ کر گیا۔

تبریزی کی سمت سفر کا ارادہ تھا، مگر تقدیر نے اور ہی سمت متعین کر رکھی تھی۔ اس منصوبے کے افتتاح سے واپسی پر تبریز پہنچنے سے پہلے ہی ہیلی کاپٹر حادثے کا شکار ہوا۔ تحقیقات نے کہا — شدید دھند سبب بنی۔ مگر اہل نظر اور اعلیٰ اہلکاروں کے مطابق موسم صاف تھا۔ تاریخ کی نظر میں گویا سوال باقی اور فضا میں معلق رہ گیا۔

نقادوں نے تکنیکی خرابیوں کی نشاندہی اور عالمی سیاسی عیوب اور خدشات کا درپچہ کھولا، عوامی گفتگو میں شکوک و شبہات کے چراغ جل اٹھے۔ حکومت پر حقائق دبانے کے الزامات، اور عوامی سطح پر قیاس آرائیاں ہوتی رہیں، اور امر واقعہ کو چھپانے کے الزامات بھی اٹھتے رہے۔ حادثہ خبر نہ رہا، معمہ بن گیا۔

اگست 2023 میں روس کے شہر ماسکو کے قریب ایک طیارہ حادثے میں یوگینی پریگوزن اپنے دس ساتھیوں سمیت ہلاک ہو گیا۔ وہی شخص جو یوکرین کی جنگ میں کرائے کے جنگجوؤں کے طاقتور گروہ کی قیادت کر رہا تھا اور جس نے دو ماہ قبل پوتن کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر کے دنیا کو چوکا دیا۔ نیٹو اور

امریکا جلد ہی فتح کی نوید کیلئے بے چین دکھائی دینے لگے مگر اچانک حادثے کے پہلو، دس ساتھیوں سمیت ہلاکت، حادثہ یا گرا دیا جانا؟ ریاستی ردِ عمل کی خاموشی، اس واقعہ نے عالمی سیاست میں طاقت کے استعمال اور اس کے انجام پر گہری بحث چھیڑ دی۔

پاکستان کی تاریخ بھی بہاولپور کے آسمان کی تلخ گواہی رکھتی ہے۔ 1988 میں فوجی صدر جنرل ضیاء الحق طیارہ حادثے میں جاں بحق ہوئے، امریکی سفیر آرئلڈ رافیل سمیت دیگر کئی اعلیٰ افسران بھی ساتھ تھے۔ پاکستان کی تاریخ میں بھی بہاولپور کی فضائیں اس غم سے واقف ہیں اور بہاولپور کے آسمان کی تلخ گواہی بھی موجود ہے۔ 1988 میں پاکستان کے فوجی صدر جنرل محمد ضیاء الحق ایک طیارہ حادثے میں جاں بحق ہوئے۔ امریکی سفیر آرئلڈ رافیل سمیت کئی پاکستان کے اعلیٰ فوجی افسران بھی اسی حادثے میں خالق حقیقی سے جا ملے۔ اس حادثے پر بین الاقوامی ذرائع نے بے شمار نظریات پیش کیے، نظریات و قیاس آرائیوں کا دروا کر دیا۔ کبھی میزائل کا شائبہ، کبھی بیرونی ہاتھ کا شائبہ اور کبھی عالمی سازش کے اشارے۔ مگر قطعی فیصلہ تاریخ کے قلم نے نہ لکھا اور آج تک حقیقت کے پردے کو کوئی مکمل چاک نہ کر سکا اور ان دبیز پردوں میں ہمیشہ کیلئے ان حقائق کو مستور کر دیا گیا۔

جنرل ضیاء الحق کے بڑے بیٹے اعجاز الحق نے آم کی پیٹیوں میں دھماکہ خیز مواد کی بات کی، مگر آج تک یہ الزام تصدیق کی منزل نہ پاسکا اور شبہ کے ہاتھوں آج بھی انجام کی خاک چاٹ رہا ہے۔ آج تک اعجاز الحق کے اس الزام کو تاریخ کے دفتر سے ثابت شدہ سچائی کا درجہ نہ مل سکا۔

تاہم جنرل اسلم بیگ کی سوانحِ اقتدار کی مجبوریاں اس حادثے کی فضائی روداد سناتی ہے۔ جنرل اسلم بیگ نے اپنی کتاب 'اقتدار کی مجبوریاں' میں اس دن کی روداد لکھی۔ فضائیں معائنہ، نیچے اٹھتا دھواں، گرتا ہوا طیارہ، اور پھر فیصلہ کہ جائے حادثہ نہیں، سیدھا راولپنڈی لوٹا جائے۔ کیونکہ بعض فیصلے موقع پر نہیں، تقدیر کے بڑے صحیفے میں لکھے جاتے ہیں۔

13 / اگست 1988 کو بہاولپور کی سرزمین پر وہ المناک لمحہ آیا جو بیک وقت سیاسی، عسکری اور قومی تاریخ کا اہم موڑ بن گیا۔ جب ایک مبینہ فضائی حادثے نے پاکستان کے سیاہ و سفید کے مالک صدر جنرل ضیاء الحق، چیئرمین جوائنٹ چیفس آف اسٹاف جنرل اختر عبدالرحمن اور امریکا کے سفیر آرئلڈ لوئیس رافیل سمیت لگ بھگ تیس انسانوں کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔ یہ حادثہ محض افراد کی موت نہ تھا، ایک پورے عہد کے اختتام کا اعلان تھا۔ تحقیقات کی پرتیں، اس واقعے کے بعد کے تمام مراحل ٹینک الخالد کی کہانی، عسکری فیصلوں کے پس منظر، آئینی تقاضوں کی پاسداری، اور حادثات کی اسرار انگیزی۔ سب گویا تاریخ کے اوراق میں ثبت ہیں۔

یہ سانحہ اس موقع پر پیش آیا جب پاکستان عسکری اعتبار سے ایک نئے موڑ پر کھڑا تھا، اور علاقائی سیاست کے نقشے بدل رہے تھے۔ جنرل ضیاء الحق سوویت یونین کے ٹوٹنے اور چھ حصوں میں تقسیم کے بعد نئی چار مسلم ریاستوں کے قیام کے بعد ان تمام ریاستوں سمیت پاک افغان کی شمولیت کے ساتھ نہ صرف ایک عظیم مسلم کنفڈریشن کے خواب دیکھ رہے تھے بلکہ دنیا میں ایک نئی توانا مسلم طاقت کے ظہور کیلئے اپنا ہوم ورک مکمل کر کے اس پر عمل پیرا ہونے کیلئے اپنی عملی کوششوں کا آغاز کر چکے تھے کہ حادثے کی گونج سرحدوں سے آگے تک پہنچ گئی۔ حادثے کے بعد پورے ملک میں سوگ کی فضا چھا گئی اور اقتدار کی بساط بھی نئے انداز سے اس طرح بچھائی گئی کہ جنرل ضیاء الحق کا منصوبہ پرواز سے پہلے ہی دفن کر دینے کا پیغام پہنچا دیا گیا۔

تحقیقات کے باوجود حادثے کی حقیقت پر سوالات قائم رہے۔ حادثہ تھا یا سازش؟ یہ عقدہ پوری طرح کبھی نہ کھلا۔ واقعے کے بعد ریاستی اداروں نے

حادثے کے اسباب تلاش کرنے کی سعی کی، مگر ہر رپورٹ کے باوجود ایک سوال اضطراب کی طرح باقی رہا—تحقیقات کے باوجود حادثے کی حقیقت پر سوالات قائم رہے—حادثہ تھا یا سازش؟ یا کوئی پردہ نشین ہاتھ ملوث تھا؟ یا پھر آنے والوں کی اقتدار کی مجبوریوں نے اس کی حقیقت سامنے لانے کی ہمت نہیں کی؟ یہ عقدہ آج تک پوری طرح کبھی نہ کھلا اور نہ ہی مستقبل قریب میں اس کی امید ہے بلکہ وقت کے ساتھ اس واقعے کو عوام کی یادداشتوں سے محو کر دیا گیا ہے۔

عالمی میڈیا نے مختلف امکانات کی نشان دہی کی—مگر سچائی دھوئیں کی طرح اوجھل رہی۔ بین الاقوامی ذرائع ابلاغ نے بھی اس حادثے کے ممکنہ اسباب پر مختلف آراء پیش کیں۔ کہیں مینیکل اور فنی خرابی کا ذکر ہوا، کہیں سازشوں کے تانے بانے بنے گئے مگر تاریخ نے فیصلہ نہ سنایا—یا پھر تاریخ کو بھی ظلمتوں کے راز افشا کرنے کی اجازت نہیں دی گئی اور اس نے بھی ہمیشہ کی طرح صرف سوالات محفوظ کر لیے۔

یہ سانحہ اُس دور میں پیش آیا جب الحالد ٹینک کے تجربات جاری تھے اور عسکری قیادت اسی پس منظر میں بہاولپور پہنچی تھی۔ الحالد ٹینک کی آزمائش کے پس منظر میں فوجی قیادت بہاولپور میں مجتمع تھی۔ اسی تناظر میں یہ فضائی سفر اختیار کیا گیا تھا جس نے اب ابدی سفر کی صورت اختیار کر لی۔ الحالد ٹینک چین اور پاکستان کی مشترکہ سعی کا انتہائی کامیاب نتیجہ تھا اور امریکی ایمون ابراہم اس کا مد مقابل۔ طاقت، ٹیکنالوجی اور سیاست کے دھاگے ایک دوسرے میں گویا الجھے ہوئے تھے۔ جنرل اسلم بیگ بھی اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں کہ اس دور میں پاکستان اور چین کے اشتراک سے الحالد ٹینک کی تشکیل جاری تھی۔ امریکی ایمون ابراہم ٹینک اس کا حریف سمجھا جا رہا تھا۔ طاقت اور ٹیکنالوجی کا یہ مقابلہ بھی پس پردہ حالات کا حصہ تھا۔



ہندوستان نے بھی ٹینک سازی کا خواب دیکھا مگر اس کی تمام کوشش ناکام رہیں۔ اس ناکامی نے یہ سبق دیا کہ تنہا انحصار نہیں، اشتراک اور حکمت کامیابی کا زینہ ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ صنعت تنہا نہیں کھڑی ہو سکتی—حکمت، تجربہ اور اشتراک اس کے ستون ہیں۔ پاکستانی ماہرین نے مختلف ممالک کی ٹیکنالوجی کو جوڑ توڑ اور تدبیر سے یکجا کر کے الحالد کی شکل میں ایک کارگر اور کارآمد ٹینک تیار کیا—یہ محض صرف لوہے کی مشین نہ تھی، جس نے یہ کامیاب رستے نکالے بلکہ ایک قوم کے عزم کی تمثیل تھی۔

جنرل اختر عبدالرحمن نے شکوہ کیا کہ انہیں پہلے گروپ میں کیوں شامل نہیں کیا گیا۔ جواب ملا اصول یہ ہے کہ تمام سینئر افراد ایک ہی طیارے میں سفر نہیں کرتے لیکن تقدیر اور قضاء کو یہ اصول بھی منظور نہ تھا تاہم تقدیر و قضاء کے اصول کچھ اور ہوتے ہیں—زندگی موت کی امانت ہوتی ہے اور اس میں کسی بھی قسم کی تبدیلی گوارہ نہیں ہوتی۔ آخر کار وہ بھی قضاء کی انگلی تھا مے اسی پرواز میں سوار ہو گئے تھے۔

17 اگست کو جنرل ضیاء الحق بہاولپور پہنچے تو جنرل اسلم بیگ پہلے سے منتظر تھے۔ عسکری وغیرہ ملکی شخصیات اس قافلے میں شامل تھیں۔ کسی کو خبر تک نہیں تھی کہ یہ استقبال دراصل ایک الوداعی لمحے کا پیش خیمہ ہے۔ کسی کو اندازہ نہ تھا کہ یہ استقبال، دراصل ایک الوداعی اثبات اور دائمی جدائی کا پیش خیمہ بن جائے گا۔ خود راقم نے جب جنرل بیگ کا تفصیلی انٹرویو جو آج بھی سوشل میڈیا پر موجود ہے، عوام الناس کے ذہنوں میں پائے جانے والے اس حادثے پر کئی سوالات کئے جس کے جوابات آپ وہاں سن سکتے ہیں۔

ٹامے والی فائرنگ رینج میں الٹالڈ اور ایم ون ٹینک کا عملی مقابلہ ہوا۔ الٹالڈ کامیاب رہا۔ گویا ملکی محنت کی لاج رکھ لی گئی۔ اس کامیابی کی خوشی ابھی ذہنوں میں پوری طرح اتری بھی نہ تھی کہ سانحے کی کالی گھٹاؤڈ آئی اور حادثے نے سب آوازیں ساکت کر دیں۔ آزمائش کے بعد قافلہ واپس بہاولپور روانہ ہوا۔ نماز، معمول کی مصروفیتیں جاری تھیں، اور پھر ایئرپورٹ کا قصد۔ زندگی اپنی معمول کی رفتار میں جاری تھی، مگر جہاں وقت کی ریت آخری حد پر پہنچ چکی تھی وہاں تقدیر چپکے چپکے اپنا فیصلہ لکھ چکی تھی جس پر قضاء نے اثبات اور یقین کی مہر لگا دی تھی۔

ضیاء الحق نے رواں لگی سے پہلے مسکراتے ہوئے آخری جملہ کہا۔ ”آپ بھی ساتھ چلیں“۔ گویا ایک خاموش وداع تھا جس کی معنویت بعد میں سمجھی گئی۔ یہ دراصل دنیا کی آخری دعوتِ سفر ثابت ہوئی۔ وہ جہاز میں سوار ہو گئے۔ اور کہانی نے نیا موڑ لے لیا۔ کچھ ہی دیر بعد ”پاکستان ون“ سے رابطہ منقطع ہوا۔ ریڈیو خاموش ہوا اور دلوں میں بے نام سا خوف اور اندیشے جاگ اٹھے۔ وہ خوف جو آنے والے حادثے کی پیشگی آہٹ ہوتا ہے۔ دور کہیں دھواں اٹھتا نظر آیا۔ قریب پہنچ کر معلوم ہوا۔ سی 130 تباہ ہو چکا ہے۔ آگ کے شعلے آسمان سے ہم کلام تھے اور پھر ملہ، پھر شعلے۔ انسانی وجود راکھ ہو کر بکھر چکے تھے۔ اور پھر تاریخ کا ایک باب بند ہو گیا۔

جنرل اسلم بیگ نے فیصلہ کیا کہ اقتدار آئین کے مطابق منتقل ہو۔ ضمیر نے آواز دی اور قدم نے اس پر لبیک کہا۔ جنرل اسلم بیگ کے مطابق فیصلہ کن لمحہ تھا۔ اقتدار سنبھالیں یا آئین کے حوالے کریں؟ ضمیر نے دستک دی، باپ کی نصیحت یاد آئی، اور طے پایا کہ اقتدار عوام کی امانت ہے اور بقول مرزا بیگ کہ انہوں نے اس اہم اور تاریخ ساز موقع پر نصیحت پر لبیک کہنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ آئینی تقاضوں کے مطابق چیئرمین سینیٹ غلام اسحاق خان کو اقتدار منتقل کرنے کا فیصلہ ہوا۔ رات دس بجے قوم سے خطاب ہوا۔ یوں چند گھنٹوں میں نظام حکومت نے خود کو نئے سانچے میں ڈھالتے ہوئے دستوری عمل نے خود کو بحال کر لیا۔

شدید حادثے کے باعث شناخت مشکل ہو گئی تھی۔ جو جسدِ خاکی کے ٹکڑے اور باقیات میسر آئیں، انہیں جمع کر کے امانت سمجھ کر سپردِ خاک کیا گیا۔ بعد کی میڈیکل رپورٹوں میں کسی کیمیکل یا زہریلے مادے کی واضح نشاندہی نہ ہو سکی۔ شکوک مگر باقی رہے تاہم باوجود شکوک کی راکھ کے نیچے کبھی کبھی چنگاری آج بھی سلگتی محسوس ہوتی ہے۔

متعدد انکوائریاں قائم ہوئیں۔ ملٹری انٹیلیجنس، آئی ایس آئی، ایئر فورس۔ سب نے اپنی اپنی آنکھ سے حقیقت کو دیکھنے کی کوشش کی۔ مگر حقیقت نے تو کبھی مکمل چہرہ دکھایا اور تلاش کیا جاسکا اور نہ ہی کبھی مکمل طور پر مسکرائی۔ وہ بس پردے کے پیچھے سے کئی راز آج تک جھلک رہے ہیں مگر ان کی حقیقت شاید ہی کبھی سامنے آ سکے۔ تین ہفتوں کے اندر اندر رپورٹس حکومت کے حوالے کر دی گئیں، اس کے بعد تاریخ نے اپنی گواہی کا باب بند کر دیا، اور سیاست نے اپنا اگلا باب کھول لیا۔

سی ون تھرٹی چونکہ فضائیہ کے سپرد تھا، اس لئے اس کی ذمہ داریاں بھی اسی کے کاندھوں پر تھیں۔ سیکورٹی کے اصول سخت تھے۔ تمام اصول اپنی جگہ۔ حادثہ اپنی جگہ۔۔۔۔۔ مگر حادثات اصول نہیں دیکھتے، صرف موقع دیکھتے ہیں۔ انکوائریوں سے یہ بات سامنے آئی کہ کسی گیس یا کیمیکل کی واضح نشاندہی نہ ہو سکی۔ پائلٹ کی خاموشی، ایس او ایس کانہ دیا جانا، اور اچانک جھکاؤ نے سازش کے شکوک کو زندہ رکھا۔ مگر ثبوت کا ہاتھ خالی رہا۔ تاہم خاموشی کبھی کبھار سب سے بڑا سوال بن جاتی ہے۔ اسی لئے سازش کے خدشات کبھی مکمل ختم نہ ہو سکے۔

بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کے ادوار میں کمیشن قائم ہوئے، بلکہ بے نظیر بھٹو نے بندیاں کمیشن بنایا، نواز شریف نے شفیع الرحمن کمیشن— مگر ہر راستہ جا کر حادثہ ہی ثابت ہوا، اور شاید تاریخ نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ فیصلہ وقت پر چھوڑ دیا جائے، آخری حکم کسی اور عدالت نے سنانا ہے— فیصلہ آخری عدالت پر چھوڑ دیا گیا جہاں بے انصافی کبھی نہیں ہوتی۔

اب رخ اردن کی جانب مڑتا ہے۔ فروری 1977 میں شاہ حسین کی اہلیہ ملکہ عالیہ الحسین بھی ایک ہیلی کاپٹر حادثے میں اس دنیا سے رخصت ہوئیں۔ اس حادثے نے صرف ایک ملکہ نہیں، کئی ریاستی ستونوں کو لرزا ڈالا۔ اس حادثے میں وزیر صحت اور دیگر شخصیات بھی ہلاک ہوئیں— ایک پورا قافلہ لٹا۔ گویا قدرت کا یہ اعلان سامنے آیا کہ حادثات شاہی محلوں کی دیواروں سے بھی نہیں رکتے۔ شاہی خاندان کے محل بھی حادثات کی آندھی سے محفوظ نہیں رہتے۔ اس حادثے نے یہ واضح کیا کہ شاہی پروٹوکول، جدید ٹیکنالوجی اور حفاظتی انتظامات بھی تقدیر کی دیوار نہیں گر سکتے۔ چالیس دن بعد عمان ایئر پورٹ کو ان کے نام سے منسوب کرنا قومی یادداشت کا استعارہ بنا۔ یاد رکھنے کا ایک قومی عہد۔ گویا ایک قومی خراج عقیدت، جو پتھر اور لوہے میں ڈھل کر یادگار بن گیا۔

عراق کے صدر عبدالسلام عارف بھی اپریل 1966 میں ہیلی کاپٹر حادثے کے نتیجے میں انتقال کر گئے۔ بصرہ کے قریب یہ حادثہ ہوا— اور ہر ان کے بھائی عبدالرحمان عارف نے اقتدار سنبھالا، مختصر حکومت، مگر زیادہ دیر نہ ٹھہر سکے۔ بہت سے اہل فکر نے اس حادثے کو پراسرار کہا— تاریخ نے وہاں بھی سوال چھوڑ دیے، جو آج بھی تحقیق کے دروازے پر دستک دیتے ہیں۔ یہ سب حادثات خطے کی سیاست کو براہ راست متاثر کرتے رہے۔

مندرجہ بالا یہ اشاریے نہیں— یہ تاریخ کے بد نصیب چراغ ہیں جن کی حقیقت نہ صرف پراسرار بلکہ ناقابل یقین حد تک دنیا کی نظروں سے مستور رہے گی۔ ہر مقتدر چراغ ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ طاقت عارضی ہے، پرواز محدود ہے اور انجام یقینی ہے۔ ان تمام نکات کی یہ روداد ہمیں بتاتی ہے کہ آسمان کی وسعتوں میں پرواز کرنے والے بھی تقدیر کے ایک اشارے کے محتاج ہیں۔ طاقت، اقتدار، شاہی جاہ و جلال— سب کچھ ایک لمحے کی خطایا ایک جھٹکے کے ساتھ ریزہ ریزہ ہو سکتا ہے۔ ﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ﴾ ﴿سورۃ الرحمن ۲۶﴾ جو بھی روئے زمین پر ہے سب فنا ہو جانے والے ہیں۔

فضائی حادثات میں عموماً درج ذیل عوامل کار فرما پائے جاتے ہیں، موسمی رکاوٹیں دھند، آندھی، برفانی طوفان، مبینی خرابی، انجن فیل، ہائیڈروک نقص، الیکٹرانک نظام کی ناکامی، انسانی غلطی، تربیت و نگرانی کی کمی لیکن جب مسافروں میں عالمی قیادت شامل ہو تو اس فہرست میں ایک اور عنصر شامل ہو جاتا ہے اور وہ ہے سیاسی مفاد، اسی لیے محققین حادثے اور سازش کے درمیان فرق کو ہمیشہ کھلا رکھتے ہیں اور یہی فرق ان تمام حادثات میں دکھائی دیتا ہے۔

جس حادثے میں ریاست کا سربراہ، اٹلی جنس کا چیف یا فوجی کمانڈر ہلاک ہو جائے، وہاں حادثہ محض حادثہ نہیں رہتا۔ عوامی ذہن میں کچھ سوال مستقل جنم لیتے ہیں۔ کس کو فائدہ ہوا؟ کیا حفاظتی نظام ناکام تھا؟ کیا یہ قدرتی واقعہ تھا؟ یا طاقت کی بساط پر چلی گئی چال؟ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ سچ ہمیشہ دستاویز میں محفوظ نہیں رہتا— کبھی قبر میں بھی دفن ہو جاتا ہے۔ اس تحقیق سے چند بنیادی حقیقتیں سامنے آتی ہیں۔ قیادت کی موت قوموں کی تقدیر کا رخ موڑ دیتی ہے، فضائی حادثات جدید سیاست کے اہم موڑ ثابت ہوئے۔ سائنسی تحقیق کے باوجود بعض سوال غیر حل شدہ رہتے ہیں، طاقت کی معراج بھی

انسانی کمزوری کے سامنے بے بس ہو جاتی ہے، تاریخ کے بڑے فیصلے آسمانوں میں بھی لکھے جاتے ہیں۔

بہاولپور کے آسمان سے لے کر عمان کے ہوائی اڈے تک، اردن کی ملکہ عالیہ سے عراق کے صدر عبدالسلام عارف تک — ہر حادثہ ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ اقتدار، قوت اور جاہ و جلال سب پرواز کی مانند ہیں؛ ایک جھوٹکا، اور سب کچھ ریزہ ریزہ۔۔۔ ان سب نکات کو آپ کی فراہم کردہ ترتیب کے مطابق محفوظ کیا گیا ہے۔ کہیں معاملہ عسکری حکمت عملی کا ہے، کہیں سیاست کے تحت و تاج کا، اور کہیں انسانی تقدیر کے اس نہ بدلنے والے قانون کا۔ ان تمام واقعات کو یکجا کر کے دیکھیں تو ایک دل گرفتہ منظر ہماری آنکھوں کے سامنے ابھرتا ہے۔ طیاروں کا ملبہ، سیاہ دھواں، بین کرتی ہوئی مائیں، خاموش ہوتی ہوئی فوجی چوکیاں، اور اقتدار کے ایوانوں میں پھیلی ہوئی سرد وحشت۔ یہ محض افسوسناک حادثات نہیں بلکہ وہ موڑ ہیں جنہوں نے قوموں کی تقدیر بدل دی، سیاسی نقشے الٹ دیے، اور تاریخ کے دھارے کو دوسری طرف موڑ دیا۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ عالمی استعمار نے ہمیشہ طاقت کے توازن کو اپنے ہاتھ میں رکھنے کی کوشش کی۔ کہیں براہ راست جنگ، کہیں اقتصادی شکنجہ، کہیں حکومتوں کی تبدیلی، اور کہیں ایسے پر اسرار حادثات جن کے بارے میں سچ آج تک مکمل ظاہر نہ ہو سکا۔ تیسری دنیا کے بہت سے قائدین جب خود مختاری، وسائل پر ملکیت، یا عالمی معاشی نظام سے بغاوت کی بات کرتے ہیں تو وہ اکثر حادثوں، ہلاکتوں یا سیاسی تنہائی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

یہ سب کچھ محض داستانیں نہیں، یہ وہ دردناک سچائیاں ہیں جو تاریخ کے سینے میں دفن بھی ہیں اور زندہ بھی۔ تاہم تصویر کا دوسرا رخ بھی موجود ہے۔ تباہ حال قومیں ہمیشہ ختم نہیں ہوتیں — وہ اٹھتی بھی ہیں۔ تیسری دنیا آج اپنے زخموں کے ساتھ کھڑی ہے۔ غلامی کے طویل ادوار، سازشوں کے گرداب اور حادثات کے طوفانوں کے باوجود اس کے نوجوان شعور حاصل کر رہے ہیں، دانشور قلم اٹھا رہے ہیں، اور عوام اپنے حق خود ارادیت کا اعلان کر رہے ہیں۔ یہ جدوجہد آسان نہیں، مگر تاریخ گواہ ہے کہ جو قومیں روتے ہوئے بھی چلتی رہیں، وہ آخر کار منزل تک پہنچ گئیں۔

ان فضائی سانحات نے اگر ایک طرف قیادتیں چھین لیں تو دوسری طرف قوموں کو یہ سبق بھی دے دیا کہ آزادی کی قیمت ہوتی ہے، خود مختاری کا راستہ خطرناک ہوتا ہے اور استعمار سے نکلنے والوں کا انجام اکثر ”حادثہ“ لکھا جاتا ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ حادثوں سے تاریخ نہیں رکتی — صرف صفحہ پلٹتا ہے۔

آج تیسری دنیا کے لوگ اپنی بکھری ہوئی قیادتوں کی یاد میں سوگ بھی مناتے ہیں اور اسی یاد کو اپنا حوصلہ بھی بناتے ہیں۔ شاید آنے والی صبح انہی آنسوؤں سے جنم لے — اور پھر آسمانوں میں پروازیں ہوں تو وہ خوف کی علامت نہیں بلکہ آزادی کی نوید بنیں۔ ان سانحات کی واحد مشترکہ روح یہ بتاتی ہے کہ تاریخ صرف واقعات کا سلسلہ نہیں، عبرت کا دفتر بھی ہے۔ قیادتیں جاتی ہیں، مگر سوال چھوڑ جاتی ہیں — طاقت کس کی؟ اختیار کس کا؟ اور انجام کیا؟ ان فضائی حادثات کی یہ ہولناک روداد ہمیں متوجہ کرتی ہے کہ قوموں کی تقدیر کے جہاز صرف آسمانوں میں نہیں، دلوں اور اصولوں کے افق پر بھی پرواز کرتے ہیں۔

نومبر کے دوسرے عشرے کے آخر میں عالمی اقبال کانفرنس کی فکری ساعتیں ابھی جاری تھیں، مکالمے برپا تھے، قافلہ اہل دانش رواں تھا کہ اسی دوران محترم حافظ طاہر صاحب — سابق سیکرٹری ہائر ٹیکنیکل ایجوکیشن صوبہ بلوچستان اور حالیہ ”اولیس ڈی“ نے نہایت محبت و شفقت اور بے حد

اصرار سے مجھے اپنی سرکاری رہائش گاہ پر لے گئے، وہی رہائش گاہ جہاں آج کل وہ اپنی دیانت کی سزا کے بقیہ دن سکوت کے ساتھ کاٹ رہے ہیں۔ وہاں کی فضا میں ایک عجیب و قار، سنجیدگی اور خاموش احتجاج گھلا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے دیواریں بھی گواہ ہوں کہ بعض اوقات سچ بولنے کا سب سے بڑا انجام تنہائی اور جرم ٹھہرتا ہے لیکن جس چیز نے میرے دل کو واقعی ہلا دیا، وہ ان کے دروازے کے باہر آویزاں ایک سادہ سی تختی تھی جس پر یہ آیت لکھی تھی:

﴿وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ﴾

”اور دنیا کی زندگی تو محض دھوکے کا ایک ساز و سامان ہے۔“

میں دیر تک اس تختی کو تکتے ہوئے سوچتا رہا۔ یوں لگا جیسے یہ الفاظ پتھر پر نہیں، میرے دل پر لکھے جا رہے ہوں۔ کاش ہم اس پیغام کو محض پڑھیں نہیں، اس میں اتر کر خود کو پرکھ سکیں؛ شاید تب ہمیں معلوم ہو کہ اصل سزا کیا ہے اور اصل انعام کس کا نام ہے۔ کاش ہم کبھی ٹھہر کر اپنے رب کے اس کلام میں اتر سکیں، اپنے آپ کو تول سکیں، اور جان سکیں کہ ہم نے زندگی کو کس دھوکے کے عوض بیچ رکھا ہے۔ اس ایک جملے نے یوں اندر تک لرزادیا کہ دل نے پہلی بار یہ خواہش کی۔ کاش ہم اپنے رب کے اس پیغام میں اتر کر خود اپنا محاسبہ کر سکیں؛ شاید تب ہمیں معلوم ہو کہ اصل خسارہ کیا ہے اور اصل کامیابی کس کا نام ہے۔

فضائی حادثات میں بکھرتی قیادتیں، ٹوٹی سلطنتیں، بدلتے تخت و تاج، سب اسی ایک سچ کی شرح ہیں۔ اقتدار ہو یا شہرت، سب کچھ ہوا کے ایک جھونکے کا محتاج ہے۔ دل نے آہستہ سے کہا: کاش ہم اپنے رب کے اس پیغام میں اتر کر اپنا محاسبہ کر سکیں؛ کاش ہمیں یہ ادراک ہو جائے کہ اصل پرواز روح کی پرواز ہے، اور باقی سب کچھ صرف دھوکے کی چمک ہے۔ اسی لمحے یہ آیت دل میں گونجی:

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ﴾ ہر جان کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔

اور پھر یہ حقیقت اور بھی روشن ہو گئی کہ تاریخ کے ایوانوں میں گرنے والی قیادتیں، اور آسمانوں میں ٹوٹنے والے جہاز، ہمیں یہ سبق دے جاتے ہیں کہ پروازیں لمبی ہو سکتی ہیں، مگر ابدی نہیں۔

یہ مقالہ دراصل انسانی تقدیر اور طاقت کے رشتے کی روداد ہے۔ فضائی حادثات میں بکھر جانے والی یہ قیادتیں ہمیں یاد دلاتی ہیں کہ پرواز لمبی ہو سکتی ہے مگر ابدی نہیں۔ اقتدار بلند ہو سکتا ہے مگر لافانی نہیں۔ کاش۔۔۔ اے کاش۔۔۔ ہم اس سے عبرت حاصل کر سکیں۔

تاریخ کی کروٹ، وقت کی کڑواہٹ

زمانہ کب کروٹ بدلتا ہے، یہ اہل اقتدار جاننے سے قاصر رہتے ہیں۔ قومیں خوابوں میں جیتی ہیں، اور تاریخ ہوش کی گواہی میں لکھی جاتی ہے۔ تاریخ کی رفتار تیز تر ہو چکی ہے۔ قوموں کی تقدیریں اب فقط معرکہ میدان میں نہیں، بلکہ عسکری بیانیے، سفارتی چالوں، اور جغرافیائی علامتوں میں لکھی جاتی۔ قومیں صرف الفاظ سے نہیں، عمل سے پہچانی جاتی ہیں اور جب قومیں صرف نعرے سناتی ہیں، مگر جب عمل کا میدان سچے تو دم سادھ لیتی ہیں، تو تاریخ ان سے سوال کرتی ہے۔ کیا تم صرف نعرہ فروش تھے؟ یا کچھ کرنے کا بھی ہنر رکھتے تھے؟

برصغیر کی دو بڑی ریاستوں پاکستان اور بھارت کے درمیان حالیہ فضائی جھڑپ جہاں بظاہر ایک علاقائی تناؤ تھا، وہیں ایک عالمی طاقت چین نے اس قضیے میں جس انداز سے خاموشی سے برتری حاصل کی، وہ بذات خود ایک تاریخی وجہ۔ اسٹریٹیجک مطالعے کا تقاضا کرتا ہے۔ ہندوپاک کے مابین حالیہ فضائی کشاکش بظاہر دور ریاستوں کے درمیان تھی، مگر اگر آنکھیں کھلی ہوں اور بصیرت موجود ہو، تو یہ صرف برصغیر کے افق پر نہیں، بلکہ ایشیائی جیو اسٹریٹیجک تصویر پر کندہ ایک فیصلہ کن لمحہ تھا۔ اور اس تصویر کا اصل معمار بیجنگ تھا یا پاکستان؟

یہ محض دو ہمسایہ ایٹمی طاقتوں کی روایتی گرما گرمی نہ تھی، بلکہ یہ معرکہ چینی عسکری صنعت، نظریہ پر جوش قوم پرستی، اور سفارتی ہنر کی کامیاب مشق تھی۔ جس نے نہ صرف ایشیا بلکہ دنیا کو بھی متوجہ کیا کہ اب سپر پاورز کی نئی صف بندی میں فولادی دوست کہاں کھڑا ہے۔ برصغیر میں پاکستان کے خلاف طبل جنگ بجانے والی انڈین فوج جب چین کی برفیلی چوٹیوں پر خاموشی کی چادر اوڑھ لیتی ہے، تو سوال یہ نہیں ہوتا کہ وہ کیوں خاموش ہے، سوال یہ ہوتا ہے کہ کیا یہ خاموشی دراصل شکست کا پردہ تو نہیں؟

یہ مقالہ ان جھڑپوں کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش ہے کہ اصل فاتح چین رہا یا پاکستان۔ نہ فقط عسکری صنعت کے اعتبار سے بلکہ نظریاتی اور سفارتی فضا پر اپنی بالادستی کے ذریعہ۔ میری کوشش ہوگی کہ آج کے آرٹیکل میں بھارت و پاکستان کی حالیہ فضائی جھڑپ کا تاریخی و عسکری تناظر، چین کا غیر اعلانیہ مگر کلیدی کردار، چینی دفاعی صنعت کی عالمی مارکیٹ میں ساکھ، اروناچل پردیش میں ناموں کی تبدیلی کا جغرافیائی مفہوم اور خاص وقت کے تعین اور بھارت کا سہ طرفہ اپنے پڑوسیوں کے ساتھ محاذ کھولنے کا تفصیلی ذکر کروں۔

معرکہ آسمان پر تھا، مگر اس کی گونج بازار دنیا میں سنی گئی۔ پاکستان نے جب چین کے اشتراک سے تیار کردہ جے 10 اور جے 17 طیارے فضا میں بلند کیے، تو یہ صرف لڑاکا پرندے نہ تھے، بلکہ یہ پاک چین کی دفاعی صنعت کے اعتماد کے پر تھے، جنہوں نے دنیا کو بتایا کہ "پاک فوج" اور "چینلر لبریشن آرمی" کی پیداوار اب صرف پریڈ گر اوڈ کی زینت نہیں، بلکہ جنگی میدان کی تسخیر کا ہنر بھی رکھتی ہے۔ چینی کرمل ٹو بونے یہ بات یوں کہی، جیسے تاریخ کے کسی نئے صفحے پر دستخط ہو رہے ہوں۔

یہ لڑائی چین کی دفاعی صنعت کیلئے ایک تشہیر تھی، ایسی تشہیر جو کتب خانوں میں نہیں، بلکہ پاک فوج نے میدان جنگ میں لکھی۔ واقعی، یہ پہلی بار تھا کہ چین کے لڑاکا طیارے حقیقی جنگی صورت حال میں آزمائے گئے، اور بقول مشرقی حکمت، پتھر پر لکیریں تبھی کھینچی ہیں جب فولاد حرکت میں آئے۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان حالیہ کشیدگی اُس وقت شدت اختیار کر گئی جب بھارت نے اپنے فضائی حملے کو "آپریشن سندور" کا نام دیا۔ دونوں جانب

سے ڈرونز، میزائل، اور لڑاکا طیارے استعمال ہوئے۔ بھارت نے فرانسیسی ساختہ رافیل اور روسی طیاروں کو تعینات کیا جبکہ پاکستان نے چین کے تعاون سے تیار کردہ جے-10 اور جے-17 طیاروں سے بھرپور جوابی کارروائی کی۔

پاکستانی فضائیہ نے سرحد پار کیے بغیر میزائل حملے کیے جن میں چھ بھارتی طیاروں کی تباہی کے دعوے شامل ہیں۔ اگرچہ بھارت کی جانب سے باضابطہ تردید کی گئی، لیکن رافیل کمپنی نے تین طیاروں کی تباہی کی تصدیق کر دی، جو بذاتِ خود ایک تاریخی موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ رافیل کمپنی کے سربراہ کو اپنی کمپنی کی سبکی اور خفت مٹانے کیلئے یہ تسلیم کرنا پڑا کہ ہم طیارے فروخت کرتے ہیں، لڑنے کیلئے حوصلہ نہیں لیکن اس کے باوجود عالمی مارکیٹ کے سٹاک ایکسچینج میں اپنی کمپنی کے حصص کی گرتی قیمتوں کو سہارا دینے میں ناکم رہے اور اس کے مقابلے میں رافیل کا شکار کرنے والے پاک چین کی مشترکہ کاوش جے ایف 17 تھنڈر کی حصص کی اچانک بڑھتی قیمت نے عالمی خریداروں تک یہ بھرپور اعتماد کا پیغام پہنچا دیا۔

ہندوستانی میڈیا اور اس کا عسکری بیانیہ جب پاکستان کے خلاف انگارے اگلتا ہے، تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاید اگلے لمحے فتح کا بل و اسلام آباد کا اعلان کر دیا جائے گا لیکن جب یہی سپہ سالار مشرقی لداخ کی برف پوش وادیوں میں چینی سائے دیکھتے ہیں تو زبانیں گنگ، توپیں خاموش، اور بیانات غائب ہو جاتے ہیں۔ سابق سیکرٹری خارجہ شام سرن کا یہ اعتراف، کہ انڈین فوج یا تو کارروائی کرنا نہیں چاہتی یا پھر اس کی سکت نہیں رکھتی، دراصل بزدلی کا سفارتی اعتراف ہے۔ یہ وہی زبان ہے، جو پاکستان پر گرجتی تھی، اب چین کے سامنے لرزاں ہے، آخر کیوں؟

چینی پیپلز لبریشن آرمی کے سابق کرنل ثوبونے عالمی میڈیا سے بات کرتے ہوئے کہا کہ یہ فضائی لڑائی چین کی دفاعی صنعت کیلئے بڑی تشہیر تھی۔ اس سے قبل چین کو کبھی اپنے پلیٹ فارمز کو جنگی صورتحال میں آزمانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ واقعی جے-10 کی میدانِ جنگ میں کامیاب آزمائش کے بعد چینی کمپنی "چنگڈ وائیز کرافٹ" کے حصص میں 40 فیصد اضافہ ہوا، اس تناظر میں فتح و کامیابی کا سہرا پاکستان کے بہادر اور جری کردار کے لائیو ڈیمانسٹریشن کو جاتا ہے جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ معرکہ صرف میدان میں نہیں، بلکہ عالمی اقتصادی منڈیوں میں بھی جیتا گیا۔ یہ کارکردگی چین کے ہتھیاروں کو نہ صرف ایشیا بلکہ افریقا، مشرق وسطیٰ اور لاطینی امریکا کی مارکیٹوں میں معتبر بنا سکتی ہے۔

انڈین فضائیہ کے ترجمان ایئر مارشل اے کے بھارتی کا یہ اعتراف کہ "جنگ میں نقصان معمول کی بات ہے" — دراصل خاموش اعترافِ شکست تھا۔ بھارتی حکومت کا اس معاملے میں محتاط رویہ، عالمی میڈیا کی رپورٹس، اور رافیل کمپنی کی تصدیق — سب مل کر یہ اشارہ دیتے ہیں کہ حقائق اب بیانے سے بڑے ہو گئے ہیں۔ یہی وہ لمحہ ہے جہاں چین نے سفارتی محاذ پر بھی بھارت کو پیچھے چھوڑا۔ نہ بیان، نہ تقاریر، نہ الزامات — فقط نتائج۔ اور یہی خاموشی چینی سفارت کاری کا خاصہ ہے۔

انڈین فضائیہ کے فرانسیسی ساختہ رافیل طیارے، جن کی خرید پر اربوں کے سودے کیے گئے، پاکستانی میزائلوں کے سامنے عاجز نکلے۔ تین طیاروں کی تباہی کی تصدیق رافیل کمپنی کے ترجمان نے کر دی، مگر دہلی کے ایوانِ اقتدار میں سکوت ایسا چھایا جیسے آگرہ کا لال قلعہ ماتم کر رہا ہو۔ ایئر مارشل اے کے بھارتی کا یہ کہنا کہ "جنگ میں نقصان معمول کی بات ہے"، دراصل اعترافِ شکست کا ایسا پردہ ہے جو قوم پرستی کے دبیز ہالے میں لپیٹ دیا گیا۔ یہ بیان چیخ چیخ کر کہتا ہے کہ تم نے زخم چھپانے کی کوشش کی، مگر خون رستا رہا اور دنیا دیکھتی رہی۔

پاکستانی طیارے، جن کی پروازیں پاک سرزمین پر محدود رہیں، مگر جن کے میزائلوں نے سرحد پار دشمن کو نشانِ عبرت بنایا، صرف عسکری مہارت کا مظہر نہیں تھے، بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ، پاک چین حکمت عملی کا غیر علانیہ تجربہ تھا۔ پاکستان کی فتح دراصل چین کی کامیاب عسکری مارکیٹنگ تھی۔ اسی تجربے کے بعد جنگڈو ایئر کرافٹ کمپنی کے حصص میں 40 فیصد اضافہ محض اقتصادی اشاریہ نہیں، بلکہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ اب معرکہ صرف بددق اور بارود کا نہیں، برانڈ اور بیانیے کا بھی ہے۔

یاد رہے کہ جب وزیر دفاع راج ناتھ سنگھ نے خود اعتراف کیا کہ بڑی تعداد میں چینی فوجی ایکچوئل کنٹرول لائن پار کر کے انڈین حدود میں آگئے ہیں، تو یوں محسوس ہوا جیسے ہندوستان کی جغرافیائی خودداری کو بر فانی بوٹوں تلے روند دیا گیا ہو۔ یہ صرف ایک سرحدی خلاف ورزی نہ تھی، بلکہ چینی خود اعتمادی کی فتح اور انڈین دعوؤں کی پسپائی تھی۔ اس پوری پیش قدمی پر اگر کوئی چیز نمایاں نہیں تھی، تو وہ انڈیا کا عسکری ردِ عمل تھا۔ زبانیں جو پاکستان کے خلاف دہکتی تھیں، وہ چین کے آگے سہم گئیں۔

اس سلسلے میں ٹرمپ نے ثالثی کی پیشکش کی، گویا ایک ایسا بادشاہ جسے دو شہزادوں کی لڑائی میں صلح کرانے کا شوق ہو، مگر چین نے اس پیشکش کو یوں مسترد کیا جیسے کوئی کہے ہم اپنے معاملات خود سلجھانے کے قابل ہیں، تم اپنا راستہ لو۔ یہ رد اس بات کا اعلان تھا کہ چین خود مختار بھی ہے، خود کفیل بھی، اور خود مدبر بھی۔ یہی متانت، یہی خود اعتمادی اسے اس خطے کا بلا شرکتِ غیرے قوت بنانے جارہی ہے۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ چین کی اس خود اعتمادی سے پاکستان کے مقتدر بھی سبق حاصل کریں۔ اپنے دل سے عالمی مالیاتی اداروں کا خوف دل سے نکال کر باہر پھینکیں جس طرح پاکستان نے پہلی مرتبہ امریکی اور مغربی اسلحہ ساز کمپنیوں کے سفاکانہ رویے کو دیکھتے ہوئے اپنا رخ مغرب سے مشرق کی طرف کیا جس کے نتائج سب کے سامنے ہیں۔



سیز فائر کے چند دن بعد چین نے ایک نئی سفارتی اور نفسیاتی حکمت عملی اپنائی، جب انڈیا، پاکستان سے نمٹنے میں مصروف تھا، چین نے ایک خاموش مگر فکری حملہ کیا، اروناچل پردیش کے 27 مقامات کے نام چینی اور تبتی زبانوں میں تبدیل کر دیے۔ ان میں پہاڑ، درے، ندیاں،

جھیلیں، بستیاں اور رہائشی علاقے شامل ہیں۔ یہ اقدام نہ صرف انڈیا کے جغرافیائی دعوؤں پر علامتی ضرب تھا بلکہ اس طرح بیجنگ نے دنیا کو ایک بار پھر یہ پیغام دیا کہ نقشے صرف کاغذ پر نہیں، حکمرانی کے ذہنوں میں بنتے ہیں۔ اس عمل سے یہ ثابت ہوا کہ چین اور پاکستان صرف علامتی طاقت نہیں بلکہ سافٹ پاور کے میدان میں بھی پوری قوت سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ یہ ناموں کی تبدیلی فقط لسانی مشق نہیں، بلکہ تاریخی دعوے کا آہنی اظہار تھی، جو اس وقت کی گئی جب انڈیا کی عسکری توجہ مغرب میں پاکستان پر مرکوز تھی۔ یہ عمل گویا ٹرائیکا (انڈیا، اسرائیل، امریکا) کو یہ کہہ رہا تھا جب تم مشرق کی طرف دیکھو گے، تمہیں زمین پر وہ نام دکھائی دیں گے جو تمہارے نہیں۔ اور جب تم نقشہ کھولو گے، تمہارے لفظ تمہارے نہیں رہیں گے۔

نیپال، پاکستان اور چین — یہ تینوں ممالک انڈیا کے تین جانب واقع ہیں، اور تینوں سے اس وقت تناؤ کی کیفیت ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ انڈیا تین طرفہ محاذ کھول کر کس خواب میں اور جغرافیائی خوش فہمی میں مبتلا ہے؟ نیپال ایک چھوٹا سا ملک سہی، مگر اس کی سفارتی خودداری نے انڈین پالیسی سازوں کے

ہوش اڑا دیے۔ پاکستان عسکری و نظریاتی لحاظ سے مضبوط تر ہو چکا ہے، اور چین ایک عالمی طاقت ہے جو معاشی و عسکری ہر میدان میں انڈیا کو مات دے چکا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک چھتر، تین شیر کی کمین گاہوں میں جا گھسے۔ اور سمجھے کہ بادل ہوں، برس کر نکل جاؤں گا۔

بادی النظر میں یہ جھڑپ انڈیا اور پاکستان کے درمیان تھی، مگر درحقیقت یہ پاک چین کی سہ فریقی حکمت عملی کی کامیابی تھی۔ عسکری سطح پر پاکستانی افواج کی میدانِ عمل میں خصوصی سٹریٹجک کارکردگی میں چینی ہتھیاروں کے 10 اور بے 17 کی کامیاب آزمائش کی کامیاب جانچ اور عالمی مارکیٹ میں تشہیر، چینی ایوی ایشن کمپنی کے حصص میں غیر معمولی ایوی ایشن کمپنی کے حصص میں غیر معمولی اضافہ اور دوسرے سفارتی سکوت میں نفسیاتی بالادستی پر بھارت کو دو محاذوں (پاکستان اور وناچل) پر الجھا کر عالمی سطح پر اس کی علاقائی طاقت کی تصویر کو دھندلا کر نا اور تیسرا دنیا کو یہ باور کروانا کہ پاکستان کے عملی مظاہرے کے بعد چین اب نہ صرف صنعتی طاقت ہے، بلکہ جنگی بیانیے کا قائد بھی بن گیا ہے اور یقیناً یہ ٹارگٹ دونوں ملکوں کے اشتراک سے حاصل ہوا ہے۔ یہ تمام پہلو اس امر کا واضح اشارہ ہیں کہ چین نے ایک غیر علانیہ جنگ پاکستان کے میدانِ جنگ میں کارکردگی کی بناء پر بغیر فائرنگ کیے جیتی ہے۔

پاکستان کی عسکری کامیابی، بجا، مگر پاکستان کی اس بہادرانہ کاوش کے بعد اس معرکہ کا کوئی اصل فاتح ہے تو وہ بیجنگ ہے جس نے نہ ہندو قہلائی، نہ ایندھن جلا یا، نہ سپاہی کھپائے۔ مگر اس کی کمپنی کے شیراز آسمان کو چھونے لگے، اس کے ہتھیاروں نے عملی سند حاصل کی، اس کے سیاسی بیانیے کو تقویت ملی، اور اس کے جغرافیائی خوابوں میں نئے رنگ بھرے گئے۔ یہی وہ حکمت ہے جسے سیاست مشرق کہتے ہیں، جہاں خاموشی گولی سے زیادہ مؤثر، اور نقشہ جنگ سے زیادہ کاری ہوتی ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ فتح اس کی جو خاموشی سے بازی لے جائے۔

جنگیں صرف توپ سے نہیں جیتی جاتیں، ان کے پیچھے وہ دماغ ہوتے ہیں جو تاریخ کا مزاج بدل دیتے ہیں۔ پاک چین نے خاموشی سے، حکمت سے، اور وقت کے مزاج کو سمجھ کر شاید یہی کچھ کر دکھایا ہے۔ ایک بصیرت انگیز تمثیل یاد آتی ہے۔ جب وقت فیصلہ دیتا ہے، تو قومیں اُسے تاریخ سمجھ کر محفوظ کرتی ہیں، مگر جو قومیں اُسے نظر انداز کریں، وہ عبرت بن جاتی ہیں۔ پاک چین دوستی کے اشتراک نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا، اور اپنے بیانیے، ہتھیار، اور حکمت کو ایک نئی سطح پر پہنچا دیا۔ اب یہ عالمی منظر نامے کا ایک ناقابل انکار سچ ہے۔ اور شاید ایشیا کا مرکز بھی بدل رہا ہے۔

انڈیا کی خاموشی کو بعض حلقے حکمت کہتے ہیں، مگر تاریخ کہتی ہے کہ حکمت وہی جو وقت پر ہو، جوابی ہو، اور جیت پر منج ہو۔ اگر دشمن تمھاری حدود میں داخل ہو جائے، اور تم زبان سے بھی رد نہ کر سکو، تو یہ خاموشی نہیں، بزدلی ہے۔ پاکستان کے خلاف ہر روز جنگی نغمے گانے والے ٹی وی چینلز اور جرنیل، چین کے خلاف گویا گانے میں ڈبکی لگا کر پرہیز گار ہو گئے۔ یہ خاموشی بتا رہی ہے کہ دشمن کو جانچنے کی نہیں، پہچاننے کی ضرورت ہے۔

انڈیا کی سرحدی شجاعت کا چین کے آگے دم سادھ لینا خاموشی کا جغرافیہ نہیں بلکہ ہندوؤں کے مکار سیاسی گرو چانکیہ کا اصول ہے کہ طاقتور کو فوری خدا مان کر سجدے میں پڑ جاؤ، یہی وجہ ہے کہ دنیا کا یہ واحد مذہب ہے جس کے خداؤں کی تعداد کروڑوں میں ہے جس میں چوہے اور سانپ بھی شامل ہیں اور جو نبی اس کو کمزور دیکھو تو اسی خدا جس کے آگے سجدہ ریز ہوتے رہے ہو، انہیں ٹھوکروں کی زد میں لاتے ہوئے ٹکڑے ٹکڑے کرنے میں ایک لمحہ تاخیر نہ کرو۔ یہی وجہ ہے کہ عالمی میڈیا میں خود مودی کو اسلحے کے ڈھیر کے سامنے خاص قسم کی پوجا اور سجدوں کی تصاویر عام بھی ہوئیں اور رافیل طیاروں کی حفاظت کیلئے پوجا کے طور پر انڈیا کا وزیر دفاع ان جہازوں کے ٹائروں کے نیچے انڈے اور دیگر اشیاء رکھ کر عبادت کرتا رہا اور عالمی میڈیا اب

ایک مرتبہ پھر ان جاہلانہ رسوم کو اپنے ناظرین کو دکھا رہا ہے۔ یہ صرف انڈیا کا مسئلہ نہیں، ہر اس قوم کا ہے جہاں میڈیا مصلحت کا، سیاسی نعرے کا، اور عوام خاموشی کا شکار ہو۔

پاکستان اور چین کی برف پوش وادیوں میں توپیں شاید نہ بولیں، مگر تاریخ اور سچائی برف میں بھی بولتی ہے اور وہ تاریخ یہ کہہ رہی ہے کہ تم وہ ہو جو کمزور کے خلاف بھرے، اور طاقتور کے سامنے سہم گئے۔ تم وہ ہو جو جغرافیہ پر دعویٰ تو رکھتے ہو مگر جغرافیائی حکمت سے نابلد ہو۔ تم وہ ہو جو چین کو چیلنج نہیں، خاموشی میں سلام کرتے ہو اور پاکستان کو کھلے عام دھمکیاں دیکر اپنے اقتدار کا دوام چاہتے ہو۔

انڈیا کا پاکستان کے خلاف عسکری جوش خطے میں عدم استحکام کا باعث ہے، جبکہ چین کے سامنے اس کی خاموشی دو عملی سیاست اور نعرہ فروش عسکریت کی عکاس ہے۔ ان حالات میں برصغیر میں توازنِ طاقت تیزی سے مشرق کی طرف جھک رہا ہے۔ اور پاک چین دوستی وہ آفتاب بن رہا ہے، جس کی روشنی نہ صرف مشرق بلکہ جنوب ایشیا کی تاریخ کو بھی نئے سانچے میں منور اور ڈھال رہی ہے۔

اس مقالے کے تجربے سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ جنوبی ایشیا کی حالیہ فضائی کشیدگی میں جہاں پاکستانی قوم نے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح تمام سیاسی اختلافات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنی یکجہتی کے ساتھ رب تعالیٰ کے سامنے اپنی پوری عاجزی کا اظہار کرتے ہوئے آپریشن بنیان المخصوص کے سائے تلے فتح مبین کا سہرا اپنے سروں پر سجا کر دشمنوں کو یہ واضح پیغام دیا ہے کہ وطن کی حفاظت کیلئے ہم سب ایک ہیں، اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی تسلیم کرنا ہو گا کہ چین نے بھی عسکری صنعت، جغرافیائی سیاست، اور سفارتی فہم کا ایسا امتزاج پیش کیا جو کلاسیکی سیاست میں کم ہی نظر آتا ہے۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ قوم کے اندر اس اتفاق کے ماحول کو مزید طاقتور بنانے کیلئے سیاسی انار کی کو ختم کرنے کیلئے ایسے اقدامات اٹھائے جائیں جس سے قوم میں مزید یکجہتی اور سیاسی نا اتفاقی جو دشمنی کی حدوں کو چھو رہی تھی، ہمیشہ کیلئے اگر ختم نہیں تو اس میں خاطر خواہ کمی لائی جائے۔ جس طرح ہم نے اپنے ہمسایہ ممالک کے ساتھ برادرانہ تعلقات کی نئی بنیاد رکھی ہے، چین اور ترکی کی مدد سے اپنے تمام دوستوں کے ساتھ ایک مرتبہ پھر نہ صرف ہاتھ ملائے ہیں بلکہ گلے لگ کر شکایات کو ہمیشہ کیلئے دور کرنے کیلئے ایسے اخلاص کی ضرورت ہے جس کیلئے رب نے تمام امت مسلمہ کو ایک دوسرے کا بھائی بھائی قرار دیا ہے۔

جب دعائیں قبول ہونے لگیں

یہ مضمون بنگلہ دیش کی داخلی سیاست، انتخابی منظر نامے، بھارت کے بدلتے خدشات، اور پاک-بنگلہ تعلقات کے نئے ابھرتے رجحانات کا تجزیاتی مطالعہ ہے۔ اس میں نہ صرف موجودہ حالات کا جائزہ لیا گیا ہے بلکہ مستقبل کے ممکنہ علاقائی منظر نامے اور پالیسی آپشنز پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

جنوبی ایشیا کی تاریخ کسی جامد سنگ مرمر پر لکھی ہوئی عبارت نہیں، یہ دھڑکتے دلوں، نم آنکھوں اور لہو سے رچی مٹی میں بکھری ہوئی یادوں کا نام ہے۔ بالخصوص جنوبی ایشیا اور بالعموم پاک و ہند اور بنگلہ دیش کی تاریخ صرف سرحدوں، معاہدوں اور اقتدار کی کشمکش کا نام نہیں، یہ دلوں کے رشتوں، لہجوں کے رنگ اور آنکھوں کے آنسوؤں کی داستان بھی ہے۔ جنوبی ایشیا کی سیاست ایک بار پھر تیز رفتار تبدیلیوں کے دورا ہے پر کھڑی ہے۔ خطے کے اہم ملک بنگلہ دیش میں ابھرتے ہوئے سیاسی منظر نامے نے نہ صرف ملکی اقتدار کی حرکیات کو متاثر کیا ہے بلکہ علاقائی توازن، سفارتی ترجیحات اور مستقبل کے معاشی و ترویجی روابط پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ ان حالات میں پاکستان اور بنگلہ دیش کے دوطرفہ تعلقات نئی حرارت کے ساتھ سامنے آرہے ہیں، جہاں دونوں ممالک کے عوام کی دیرینہ خواہشات اور باہمی قربت ایک نئے باب کی صورت اختیار کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ ماضی کی تلخیوں اور تاریخی واقعات کے باوجود عوامی سطح پر دونوں ملکوں کے درمیان دوستی اور اخوت کے جذبات کم نہیں ہوئے۔ جدائی کے دنوں میں دونوں طرف کے عوام نے شدید جذباتی صدمات برداشت کیے اور آج بھی ایک دوسرے کیلئے خیر خواہ ہیں۔

برصغیر کی دو مسلم ریاستیں، پاکستان اور بنگلہ دیش — یہ صرف دو ملک نہیں، ایک ہی روح کے دو بدن، ایک ہی شجر کی دو شاخیں، جن کی جڑیں مشترک ایمان، تہذیب، زبانوں کی ہم آہنگی اور باہمی محبت کی مٹی میں پیوست ہیں۔ یہ ایک ہی آہنگ کے دو نغے، ایک ہی دعا کے دو ہاتھ ہیں۔ تقسیم نے سرحدیں کھینچ دیں، مگر محبت کے راستوں پر کوئی دیوار نہ اٹھ سکی۔ 1971ء کی جدائی نے ریاستی نقشہ تو تقسیم کر دیا لیکن دلوں کی دھڑکنیں کبھی جدا نہ ہو سکیں۔ اس جدائی کے لمحوں میں صرف زمینی نہیں بٹیں، خواب بھی بکھرے، دونوں طرف کے گھروں میں چراغ مدھم پڑ گئے، مائیں روئیں، بیٹیاں سہم گئیں، اور بھائیوں کے دلوں میں ایسا خلا پیدا ہوا جسے لفظ نہیں بھر سکتے اور دونوں طرف کے گھروں میں ایسی خاموشیاں اتر آئیں جنہیں تاریخ نے بھی احترام سے لکھا ہے اور آج ایک مرتبہ پھر یہی عوامی جذبات اب ریاستی پالیسیوں اور سفارتی رویوں میں بھی جھلکتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

تاریخ گواہ ہے کہ اس جدائی کے باوصف دعاؤں کا سفر کبھی رکا نہیں۔ بنگال کی لہراتی دھان کی بالیوں سے لے کر پنجاب کے کھیتوں تک ایک ہی پکار تھی — اے رب! دوبارہ دلوں کو قریب کر دے۔ عام لوگوں کے دلوں میں نہ کبھی نفرت بسی، نہ دشمنی نے گھر کیا۔ بنگلہ دیش کے گاؤں ہوں یا پاکستان کے شہروں کی گلیاں — جدائی کے دنوں میں بے شمار آنکھیں نم تھیں، دعائیں کا پتی ہوئی، تھیلیوں میں سمٹی ہوئی تھیں، اور ایک ہی التجا تھی کہ اللہ مقدر کے اس رستے کو دوبارہ قربت میں بدل دے۔ عوام کے دلوں میں آج بھی یہی تڑپ زندہ ہے کہ ہم دوبارہ ایک دوسرے کے قریب آئیں، ایک دوسرے کے دکھ درد کے شریک بنیں اور ایک دوسرے کیلئے سہارا اور قوت بنیں۔

آج منظر بدل رہا ہے۔ سیاست کے صحرا میں نئی ہوا چل رہی ہے، ماضی کے بوجھ ہلکے پڑ رہے ہیں، غلط فہمیوں کی دیواریں دراڑیں ڈال رہی ہیں اور محبت کے پرانے چراغ دوبارہ جل اٹھنے کو ہیں۔ آج جب خطے کی سیاست نئے موڑ لے رہی ہے، پرانے بیانیے پگھل رہے ہیں اور رشتوں کے بکھرے ہوئے

موتی دوبارہ ہاتھوں میں آنے لگے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وقت کا گردش کرنا پہلے ایک نئی کروٹ لے چکا ہے۔ محبت کے دیے پھر سے روشن ہونے کو ہیں، اور دونوں قومیں پھر وہی پرانی دعا مانگ رہی ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ رہیں، خواہ نقشے الگ سہی، لیکن دل ایک رہیں۔ پاکستان اور بنگلہ دیش کے عوام نے ہمیشہ ایک دوسرے کیلئے خیر مانگی، خیر چاہی، اور ایک دوسرے کیلئے دل کے دروازے کھلے رکھے۔ اب وہ دیرینہ دعائیں قبولیت کے قریب محسوس ہونے لگی ہیں۔ دونوں ملکوں کے نوجوان ایک نئی دنیا کے متلاشی ہیں۔ جہاں ماضی نفرت کا عنوان نہیں بلکہ سبق ہو، اور مستقبل تعاون، بھائی چارے اور مشترکہ ترقی کی شاہراہ بنے۔

یہ مضمون اسی بدلتے موسم اور موجِ احساس کی داستان ہے۔ تاریخ کے زخموں پر مرہم رکھنے کی کوشش، سیاست کے شور میں دوستی کی مگر مضبوط صدا، اور اس یقین کا اظہار کہ اللہ کی بارگاہ میں مانگی گئی محبت کی دعائیں رایگاں نہیں جاتیں۔ ایک ایسی تاریخ کا بیان جس میں سیاست بھی ہے مگر اس سے زیادہ محبت ہے؛ تجزیہ بھی ہے مگر اس سے بڑھ کر امید ہے؛ اور ایسی تمنا ہے کہ دونوں قومیں ایک دوسرے کے ساتھ کھڑی دکھائی دیں، جیسے کبھی ایک جان اور ایک قالب تھیں اور آج پھر اسی وحدت کیلئے دل دھڑکتے ہیں۔

جنوبی ایشیا کی سیاست کبھی بھی جمود کا شکار نہیں رہی۔ یہ دریا ہے جہاں موجیں کبھی خاموش نہیں ہوتیں۔ بنگلہ دیش آج ایک ایسے موڑ پر کھڑا ہے جہاں اقتدار کے ایوان متزلزل ہیں، عوامی اضطراب بیدار ہے، علاقائی قوتوں کا سارا حساب کتاب دوبارہ لکھا جا رہا ہے، طارق رحمن کی واپسی نے اس بساط پر نئی چال، نیا کھیل، نیا سوال رکھ دیا ہے۔

آخر ڈھاکا کے آسمان تلے وہ لمحہ محشر آن پہنچا، جس کا قلم و نظر نے برسوں سے انتظار کیا تھا، 17 برس کی جلاوطنی کے بعد جب طارق رحمن نے ڈھاکا کی دھرتی پر قدم رکھا تو گویا تاریخ نے اپنی کتاب کا نیا باب کھول دیا۔ یہ واپسی محض ایک شخص کی مراجعت نہ تھی بلکہ سیاسی اسٹیٹس کو کے خلاف اعلانِ سوال تھی، بنگلہ دیشی سیاست میں مرکزِ ثقل کی تبدیلی کا اشارہ تھی، اور خطے کی سفارت کاری کیلئے نئے حساب و کتاب کا نقطہ آغاز۔

بی این پی کے ایگزیکٹو چیئرمین طارق رحمن نے 17 سالہ خود ساختہ دورِ جلاوطنی کی قید چھوڑ کر 25 دسمبر ۲۰۲۵ء کو وطن عزیز میں قدم رکھا۔ اُس مٹی کی خوشبو میں گنوا دی گئی شبِ غربت، ہزاروں کارکنوں کی پُر تپاک آوازوں میں بدل گئی، جیسے کسی سوگوار شام نے صبحِ نوید کو جنم دیا ہو۔ ان کی آمد سے یہ تاثر ابھرا کہ ہجرت کا صحرا ختم ہوا، اب آزمائش کا شہر سامنے ہے۔ اسی واپسی نے دہلی کے ایوانِ اقتدار میں تشویش کی لہر دوڑادی۔ کیونکہ شیخ حسینہ کے بعد بنگلہ دیش میں انڈیا کے روایتی تکیوں کا چہرہ نہ صرف بدل چکا ہے بلکہ بری طرح نفرت کی آگ میں بھسم ہو چکا ہے۔

وہاں، دارالحکومت کے دل نیا پلٹن کے دفاتر کی چھتوں سے، اُن کی آواز یوں گونجی کہ اگر خدا نے چاہا تو ہم سب مل کر اپنی اُمیدوں کا بنگلہ دیش تعمیر کریں گے۔ یہ نہ صرف ایک سیاسی نعرہ تھا بلکہ ایک نویدِ عمل بھی ہے، چاہے اس کا تعلق ابھی تک جلاوطنوں کی یادوں سے ہو یا عوامی تشنگی سے۔ یوں طارق رحمن کی وطن واپسی جہاں ایک نئے سیاسی عہد کا طلوعِ امید ہے وہاں تاریخ کے دروازے پر ایک ایسی دستک بھی ہے جو انڈیا کی بے چینی اور جنوبی ایشیا کی سیاست میں نیا موڑ بھی ثابت ہو سکتی ہے۔

سترہ برس کی خود ساختہ جلاوطنی، سیاسی مقدمات، بیماری، ملک سے دوری، اور وطن کی یادوں کے بیابان، یہ سب طے کرنے کے بعد جب طارق رحمن نے ڈھاکا میں قدم رکھا تو عوامی ہجوم نے اس واپسی کو عہدِ نو کا استعارہ بنا دیا۔ پارٹی کارکنان کے نعروں میں امید کی دھڑکن سنائی دی، مخالفین کے دلوں

میں تشویش کی لہریں دوڑ گئیں کیونکہ یہ واپسی محض ایک شخص کی مراجعت نہیں، یہ تاریخ کی واپسی ہے۔ 17 سال بعد واپسی — جلا وطنی کے صحرا سے مادرِ وطن کی گود تک کا یہ سفر جہاں ان کا اعلانِ عزم ہے وہاں امتحان کا پیش خیمہ بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ ڈھاکا کے جلسہ عام میں طارق رحمن نے جو کہا وہ الفاظ نہیں بلکہ ایک عہد نامہ تھا، مستقبل کا ایک فکری بیانیہ تھا جن کا وزن ان کے الفاظ سے ظاہر ہو رہا تھا کہ ہم محنت کریں گے، اپنا بنگلہ دیش تعمیر کریں گے، آنے والے رہنما کی قیادت قبول کریں گے۔ صدر بی این پی کی اس صریح امید نے 12 فروری 2026ء کو ہونے والے عام انتخابات کو ایک تاریخی سنگِ میل میں بدل دیا ہے، جہاں ہر فکری لہجہ، ہر سیاسی موقف، اور ہر رہنما کا قدم جمہوریت و استحکام کی راہوں کی طرف دیکھا جا رہا ہے۔

طارق رحمن نے کہا کہ میرے پاس عوام اور ملک کیلئے ایک منصوبہ ہے، ملک کی ترقی کیلئے اور عوام کی تقدیر بدلنے کیلئے، اس منصوبے کی تفصیل تاحال عوام کے سامنے نہیں آئی؛ گویا ایک راز ہے، جس کے پردے کو ابھی وقت ہی کھول سکتا ہے۔ یہ عبارت، جیسے کسی معنوی سفر کی پہلی منزل ہو، جس نے اپنے اندر امید و فکر کی دو صدائیں سموائی ہیں۔ یہ لہجہ شخصی مرکزیت سے نکل کر اجتماعی قیادت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور یہی جمہوری فکر کا مغز ہے۔ طارق رحمن نے اپنے قومی ترقی کا منصوبہ ہونے کا اعلان کیا کہ میرا منصوبہ تیار ہے مگر تفصیل بیان نہیں کی اور راز ابھی باقی ہے۔ اس ابہام کے کئی معنی ہیں، سیاسی حکمتِ عملی مخالف قوتوں کو غیر واضح رکھنا، انتخابی مہم کیلئے محفوظ کارڈ مگر یقیناً یہ سوال موجود ہے، کیا یہ منصوبہ اقتصادی احیاء کا ہے؟ کیا یہ خارجہ پالیسی کی از سر نو ترتیب ہے؟ یا طاقت کے ڈھانچوں میں توازن؟ 12 فروری انتخابات کے تناظر میں یہ خاموشی دراصل سیاسی حکمت بھی ہے اور پالیسی کا پردہ بھی۔

طارق رحمن نے اپنے خطاب میں کہا اگر خدا نے چاہا تو ہم سب مل کر اُمیدوں کا بنگلہ دیش تعمیر کریں گے۔ یہ جملہ محض نعروں کا جھوم نہیں بلکہ اجتماعی قیادت کے اقرار کا اعلان تھا۔ پر تشدد کا رروائیوں سے اجتناب کی اپیل کی، یہ لہجہ بتاتا ہے کہ سیاست صرف طاقت کا نام نہیں بلکہ اخلاقی ذمہ داری کا نام بھی ہے۔ بنگلہ دیش ایک سیاسی سازشی موسم کی گردش میں ہے جس سے نکلنے کیلئے بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔

مسئلہ کارخ صرف داخلی سیاست تک محدود نہیں رہا۔ انڈیا اور شیخ حسینہ کے بغیر بنگلہ دیش کے سیاسی منظر نامے میں ایک نئی کشمکش ابھری ہے۔ مبصرین کہتے ہیں کہ انڈیا ایک تاریخی گراوٹ سے گزر رہا ہے، کیونکہ شیخ حسینہ کے 13 برس کے اقتدار کے بعد، نئے منظر ناموں میں مناسب دوست نظر نہیں آ رہا۔ مزید برآں، انڈیا کے سیاسی تجزیہ کاروں نے بار بار اسی حلقہ فکر کو دہراتے ہوئے کہا ہے کہ بنگلہ دیش میں اب ایک انڈیا مخالف لہر ہے، خاص طور پر نئی نسل کی سیاسی ذہنیت جس نے نہ صرف تاثر بدلایا ہے بلکہ سوشل میڈیا کی تیز لہروں میں ایک خود مختار شناخت تلاش کرنا شروع کر دی ہے۔ یہ حقیقت سیاسی علم سیاست کی اس کتاب جیسی ہے، جہاں ہر نئے باب نے دوستی، دشمنی، مفاد، اور خود مختاری کو نئے معنوں میں پرکھا ہے۔

ہر آنے والے دن انڈیا کی بے چینی بڑھتی جا رہی ہے اور تاریخی بیانیہ بھی ہے کہ دوست کے بغیر سرحد لمبی لگنے لگتی ہے۔ شیخ حسینہ کے بعد دہلی کو ڈھاکا میں اپنا کوئی واضح دوست دکھائی نہیں دیتا۔ روابط کے پرانے دروازے بند ہوتے محسوس ہوتے ہیں، انڈین پالیسی کا اصل مخمض یہ ہے کہ بنگلہ دیش میں نئی قیادت کون؟ اس کے ساتھ اعتماد کیسے؟ اور ماضی کی مداخلت کا بوجھ کیسے اتارا جائے؟ یہی وہ مقام ہے جہاں سیاست اور اخلاقیات دونوں کے سوال کھڑے ہیں۔

بنگلہ دیش کی نئی نسل نے ایک طویل تاریخی پس منظر کے بغیر اپنے سیاسی احساسات کو پروان چڑھایا۔ اُن کے سامنے 1971ء کی آزادی کی تاریخ ایک

خالی سطر سی ہے — نہ پُرانی، نہ پڑھی، نہ وہ اس کے گہرے معنی تک رسائی چاہتے ہیں۔ اس نئی نسل کا سیاسی رد عمل اگر کچھ ہے، تو وہ انڈین حکمت عملی کی شفافیت پر سوالات اور دشمنی کی کشش ہے، جیسا کہ مقامی مبصرین بتاتے ہیں کہ یہ نسل سیاست کو صرف قائد اور قائدانہ تقریر کی حد سے آگے لے کر ایک سوشل موثر تحریک کی شکل دے رہی ہے، جہاں تصورات اور تاثر ایک دوسرے میں گھلتے ہیں اور نئے خیالات جنم لیتے ہیں اور انہیں انڈین کے اس پروپیگنڈہ کی کوئی پرواہ نہیں کہ بنگلہ دیش کے قیام میں انڈیانے ان کی مدد کی تھی یا انہیں اپنا غلام بنانے کی سازش کی تھی۔

سوال یہ ہے کہ 12 فروری انتخابات کی آمد کا دن کیوں فیصلہ کن ہے؟ دراصل 12 فروری کے عام انتخابات صرف اقتدار کی تبدیلی نہیں، قومی فکر کی سمت کے تعین کا دن ہے۔ اس دن ان سوالات کا فیصلہ ہو گا کہ کون قیادت کرے گا؟ کس کے ہاتھ میں خارجہ پالیسی ہوگی؟ جنوبی ایشیا میں نئی صف بندی یا ہوگی؟ طاقت کے ترازو میں ووٹ بھی رکھا جائے گا اور شعور بھی۔ اس دن خطے کے اندرونی معاملات میں انڈیا کی مداخلت، آئندہ مفاہمت یا دشمنی کے امکانات اور جمود کا فیصلہ ہو گا۔ ہم سب محمد یونس کی عبوری حکومت سے انڈیا کی ناگواری کی وجوہات سے واقف ہیں کہ بنگلہ دیش سے حسینہ کا انڈیا کی طرف ذلت آمیز فرار، اور حسینہ کو پناہ دینا اور بنگلہ دیش کی طرف سے حسینہ کی واپسی کا مطالبہ اب بنگلہ دیش کی عوام کا اولین مطالبہ ہے۔



ادھر دوسری طرف انڈیا عبوری حکومت سے شکی، مذہبی جماعتوں سے خوفزدہ، بی این پی اور طلبہ گروہوں سے محتاط ہے۔ انڈین تجزیہ کاروں نے تو یہاں تک کہا کہ جماعت اسلامی انڈین اسٹیبلشمنٹ کیلئے ڈراؤنا خواب ہے۔ یہ اصطلاح خود اس بات کا اقرار ہے کہ انڈیا مذہبی شناخت سے خوف کھاتا ہے اور خطے میں سیکولر ازم کے نام پر صرف اپنے مفاد کی سیاست کرتا ہے۔

آج جب دو مسلم ریاستیں — بنگلہ دیش اور پاکستان — نئی سیاسی حقیقتیں طے کر رہی ہیں، وہاں انڈیا کے پاس چند ہی آپشنز رہ گئے ہیں۔ ایک آزادانہ، شفاف انتخابات کو اپنی بدنام زمانہ انٹیلی جنس "را"

کے توسط سے سبوتاژ کیا جاسکے، جس میں جماعت اسلامی اور بی این پی کے مضبوط کردار جن کے باہمی تعلقات انتخابات میں یقینی فتح کا سبب بن سکتے ہیں اور دونوں ممالک پاک بنگلہ دیش امن کی راہ پر گامزن ہو سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں انڈیا کی پوری کوشش ہوگی کہ علیحدہ راستوں پر جا کر کشیدگی کو بڑھاوا دے، جس کا خمیازہ دونوں ممالک کو مستقبل میں بھگتنا پڑ سکتا ہو۔ اگر ہندو تو اس کے تعصب کی انا، ضد نظری سے دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید انڈیانے بین الاقوامی سیاست کے سنگ لا پر اپنے آپشنز کو محدود کر لیا ہے، اور اب ہر فیصلہ اس کے سیاسی مفاد، اخلاقی استدلال، اور علاقائی امن کے بیچ کی باریک لکیروں پر منحصر ہے جو مسلسل خطے کے امن کیلئے خطرہ کے طور پر دیکھا جا رہا ہے۔

شیخ حسینہ عدالت سے سزایافتہ، ملک سے باہر عوامی لیگ پر انتخابی پابندی عائد، انڈیا سے ان کی قربت نے انہیں دہلی کی پالیسی کا مرکزی ستون بنا رکھا تھا۔ اب وہ ستون گر چکا ہے۔ اس کے بعد انڈیا کی پالیسی گویا یتیم سی دکھائی دیتی ہے، دوست ڈھونڈتی ہے مگر دوست دستیاب نہیں۔ اس لئے شیخ حسینہ کا باب ابھی تک مکمل طور پر بند نہیں ہوا۔ ادھر دوسری طرف ان انتخابات میں نئی نسل اور انڈین مخالف فضا نے جاری تاریخ کا مزاج بھی بدل کر رکھ دیا ہے۔ پاکستان، بنگلہ دیش اور انڈیا ایک مفادات کی مثلث کے طور پر ان انتخابات پر اثر انداز ہوں گے۔ بنگلہ دیش کی نئی نسل، 1971 کی تاریخ سے جذباتی طور پر جڑی نہیں۔ سماجی میڈیا کے اسیر اور انڈین رویوں سے نالاں یہ نوجوان نسل ہی تو بنگلہ دیش کے اس انقلاب کا سبب بنی ہے۔

جب انڈیا کی طرف سے بار بار کہا جائے تمہارا وجود ہماری دین ہے تو نفس انسانی بغاوت کرتا ہے۔ یہی بغاوت آج سڑکوں پر، دانش گاہوں میں، اور سیاسی مباحث میں آواز بن چکی ہے کہ ہندو متعصب بنیا کبھی بھی اپنے مفاد کے بغیر کسی کی مدد نہیں کر سکتا اور اس متعصب ہندو نیکی کو ہم نے بڑی بھاری قیمت یہ چکانی ہے کہ اس نے نہ صرف ہماری معیشت پر غلبہ پالیا ہے بلکہ ہمیں غلام بنا کر رکھ دیا ہے۔ علاوہ ازیں انڈیا نے طلبہ تنظیموں کو اہمیت نہیں دی، نوجوان قیادت سے رابطہ نہیں رکھا، جبکہ بنگلہ دیش میں طلبہ ونگ ہی سیاسی لیبارٹری ہے، مستقبل کی قیادت وہیں سے نکلتی ہے۔ اعتماد نہ دیا گیا تو بد اعتمادی عروج تک پہنچ گئی اور انڈیا کی سب سے بڑی یہی غلطی رہی کہ اس نے طلبہ سیاست کو حسینہ واجد کے مقابلے میں بری طرح نظر انداز کیا اور بالآخر اس کے ذلت آمیز نتیجہ کا شکار بھی ہوا۔

اب انڈیا کا محض یہ ہے کہ کس کو دوست سمجھے اور کس کا سہارا لے؟ انڈیا کے سامنے اب سوال یہ بھی ہے کہ شیخ حسینہ نہیں—تو کون؟ بی این پی سے مفاہمت یا مقابلہ؟ عبوری حکومت سے ناپسندیدگی کے باوجود تعلق کیسے؟ نئی دہلی کی سیاست آج اسی تذبذب میں گھری ہے اور خدشہ یہی ہے کہ مکار ہندو اس اضطراب میں کسی بھی جارحانہ کاروائی یا سازش کا حصہ بن سکتا ہے۔

نئی نسل کے بدلتے مزاج نے انڈین لہر کے خلاف انتخابات کے ذریعے اقوام عالم کو واضح پیغام دینے کا فیصلہ کر رکھا ہے۔ بنگلہ دیش کی نئی نسل 1971ء کے جذبات سے آزاد، خود آگاہ، سوشل میڈیا کے وسیع کینوس پر پلے ہوئی۔ جب ان سے کہا جاتا ہے، تم ہمارے مرہونِ منت ہو تو وہ جواب دیتی ہے، ہم آزاد ہیں—کسی کے مرہونِ منت نہیں۔ یہی وہ لہر ہے جس نے انڈیا کیلئے مشکلات بڑھائیں اور بنگلہ دیش کی سیاست کا رخ بدلا۔ انڈیا نے یہ سمجھنے میں دیر کی کہ بنگلہ دیش میں طلبہ ونگ ہی اصل سیاسی لیبارٹری ہے، نوجوان ہی کل کی قیادت ہوتی ہے۔ جب طلبہ کو نظام انداز کیا گیا تو بے اعتمادی کے بیج بویے گئے۔ وہی بیج آج تناور درخت بن چکے ہیں۔

کیا عجب منظر ہے کہ جو نہی وقت نے رخ بدلا، دہلی کو اب بی این پی قابل قبول لگ رہی ہے، خالدہ ضیا کے ساتھ خیر سگالی پیغام اسی حکمت کا حصہ تھا مگر تاریخ کی جبر دیکھیے، خالدہ ضیا رخصت ہو چکیں، اب قیادت طارق کے ہاتھ میں ہے۔ انڈیا اب تعلقات کی نئی بنیاد تلاش کر رہا ہے مگر دیر ہو چکی ہے اور فضا پہلے جیسی سازگار نہیں رہی۔ حسینہ واجد انڈیا میں پناہ گزین، سزائے موت کی سزا یافتہ، جماعتوں کے دباؤ میں ان کے بیانات، قوم کے زخموں کو تازہ بھی کر سکتے ہیں اور مستقبل کے تعلقات کو مشکل بھی، انڈیا کیلئے سبق یہی ہے، بیانات کا بازار بھی سفارت کا میدان ہے، یہاں نادان لفظ بھی حادثہ بن جاتا ہے۔ شیخ حسینہ کے جاری بیان بازی کی تلوار اور خطرناک دھار بھی انڈین مخالفت میں اضافہ کر رہی ہے۔

پچاس برس بعد پاک بنگلہ دیش کے تجارتی روابط، عسکری تعاون، تہذیبی و مذہبی رشتوں کا احیاء دوبارہ منظر پر آ رہا ہے۔ یہ قربت اگر تدبیر سے آگے بڑھی تو خطے کا توازن بدل سکتا ہے۔ انڈیا کی اجارہ داری چیلنج ہو سکتی ہے۔ انڈین تجزیہ کاروں کے مطابق بنگلہ دیش کے پاکستان کے ساتھ قربت روز بروز بڑھ رہی ہے۔ بڑی تعداد میں وہ عناصر بھی ابھر رہے ہیں جو پاک بنگلہ مضبوط عسکری، معاشی تعلقات کے حامی ہیں۔ یہ عمل قدرتی ہے کیونکہ زبانوں کا رشتہ، تہذیب کا رشتہ، عقیدہ و تاریخ کا رشتہ، ان رشتوں کی خوشبو دیر تک باقی رہتی ہے۔ حالات نے بی این پی کو سیاسی مرکز، سفارتی محور، انتخابی قوت بنا کر کھڑا کر دیا ہے۔ انڈیا اب اس کے ساتھ مفاہمت کے دروازے کھٹکھٹا رہا ہے مگر دیر ہو چکی ہے، لہجے بدل چکے ہیں، فضا تبدیل ہو چکی ہے۔ خالدہ ضیا کی رحلت نے سیاست میں جذباتی باب بھی شامل کر دیا ہے اور اب قیادت طارق کے ہاتھ میں ہے۔

انتخابات سے پہلے پر تشدد واقعات، انڈیا مخالف مظاہرے، ایک دوسرے پر مداخلت کے الزامات، ایسے ماحول میں انڈیا خود ایک انتخابی نعرہ بن چکا ہے اور شاید دہلی کی پالیسیوں نے یہ نعرہ خود جنم دیا ہے اور انڈین پالیسی کا یہ خمیازہ بھی انڈیا کا مہنگا پڑ رہا ہے۔ اب اصل سوال، پاکستان کیا کرے؟ اگر تاریخ سے سبق لیا جائے تو جواب یہ ہے کہ شعلوں پر تیل نہیں، زخموں پر مرہم رکھے، اتحاد امت کا چراغ روشن کرے۔ پاکستان کیلئے مناسب اقدامات تیز ترین اور مضبوط سفارتی تعاون، تجارتی راہداریوں کی بحالی، تعلیمی و ثقافتی تبادلے، دفاعی رابطوں کا وقار مگر احتیاط کے ساتھ باہمی احترام پر مبنی خارجہ پالیسی، غیر ضروری بیان بازی سے اجتناب اور سب سے بڑھ کر باہم خیر خواہی کی فضا قائم کی جائے نہ کہ محاذ آرائی کی سیاست۔ پاکستان کیلئے درست راستہ یہ ہے کہ وہ محاذ آرائی کی بجائے دانشمندانہ مفاہمت کا راستہ اپنائے۔ دہلی مخالف اشتعال سے گریز کرتے ہوئے انڈین پروپیگنڈہ کا فوری مدلل جواب، سوشل میڈیا پر انتہائی تجربہ کار افراد کے توسط سے کئی عالمی زبانوں میں موثر جوابات، جس کی اشاعت اقوام عالم تک ہو۔ ڈھاکہ کے ساتھ وقار پر مبنی تعلقات، اقتصادی تعاون اولین ترجیح، تعلیمی و ثقافتی تبادلے، دفاعی تعاون مگر شائستگی کے ساتھ، سیاست کے ساتھ ساتھ تہذیب کو بھی بولنا چاہیے کیونکہ تہذیب کے مکالمے کی عمر سیاست سے زیادہ ہوتی ہے۔

موجودہ مقتدر اداروں کیلئے عملی سفارشات اور تجاویز تحریر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح انڈیا اپنے سوشل میڈیا کے ذریعے ہر روز پاکستان کے خلاف آگ اگل رہا ہے، اس کے تدارک کیلئے ہمیں ان اقدامات کی اشد ضرورت ہے۔ غیر اعلانیہ مداخلت سے اجتناب، علاقائی تعاون کی تنظیموں کو فعال کرنا، میڈیا میں ذمہ دارانہ بیانیہ فروغ دینا، طلبہ و نوجوان قیادت سے روابط، اقتصادی اشتراک کو اولین ترجیح، انڈیا مخالف جذبات کو بھڑکانے نہیں، سنبھالنے کی حکمت، اسلامی اخوت کو سیاسی ہتھیار نہیں، تہذیبی رشتہ سمجھا جائے۔ دانشمندانہ سفارت کاری، غیر اعلانیہ مداخلت سے احتراز، مشترکہ اقتصادی کمیشن کی تشکیل، نوجوان قیادت سے روابط، میڈیا بیانیہ میں ذمہ داری، او آئی سی اور سارک پلیٹ فارم کا فعال استعمال اور اسٹیبلشمنٹ۔ سول ہم آہنگی میں اضافہ کا مکمل پلان تیار کر کے میدان عمل میں اترے کہ اب وقت بہت کم ہے۔

مستقبل کے انتخابی منظر نامہ پر ممکنہ صورت حال پر نظر دوڑاتے ہوئے یہ کہنا از حد ضروری ہے کہ اگر بی این پی واضح اکثریت لے آئے، طارق رحمن کے مضبوط ہونے پر دہلی محتاط اور خطے میں نئی صف بندی پر مجبور ہو گا، بی این پی جیتی ہے تو طارق رحمن مرکزی کردار ہوں گے تو بظاہر انڈیا محتاط مفاہمت اپنائے گا لیکن خطے میں نئی صف بندی کیلئے یقیناً بنگلہ دیش میں سیاسی ابتری اور انار کی پھیلانے کیلئے اپنی خفیہ کاروائیاں جاری رکھے گا، اگر مخلوط حکومت بنتی ہے تو پالیسیوں میں توازن لانے کیلئے اپنے حامی گروپوں سے پاک بنگلہ تعلقات میں رخنہ ڈالنے کیلئے دباؤ بڑھانے کی کوششیں کرے گا اور اگر کشمکش بڑھی تو معیشت و امن دونوں متاثر ہوں گے اور انڈیا یقیناً اس کا فائدہ اٹھانے کی بھرپور کوشش کرے گا اور یہی اس کا مطمع نظر ہے کہ بنگلہ دیش میں سیاسی افراتفری، تشدد اور انار کی قائم رہے۔ سب سے روشن امکان یہ ہے کہ بنگلہ دیش ایک نئے سماجی معاہدے کی طرف بڑھ رہا ہے جہاں نئی نسل فیصلہ کرے گی کہ اسے کس کے ساتھ کھڑا ہونا ہے اور سب سے زیادہ امکان یہی ہے کہ نئی نسل اپنی سمت خود متعین کرے گی اور تاریخ کا پھیرے نئے راستے پر چل پڑے گا۔

آج بنگلہ دیش باہمی تعلقات میں پاکستان کے ساتھ اپنی محبت، عسکری و تجارتی رشتوں کو ایک نئے باب میں ڈالنے جا رہا ہے۔ اس سیاسی منظر نامے میں، پاکستان کو چاہیے کہ وہ دونوں مسلم ریاستوں کے درمیان تاریخی و تہذیبی سنگ میل کو تقویت دے، انڈیا کی سیاسی سازشوں و مداخلتوں سے نمٹنے کیلئے مشترکہ حکمت عملی طے کرے، اور ایک مضبوط سول و عسکری ہم آہنگی قائم کرے جو علاقائی سلامتی و ترقی کو فروغ دے۔ یہ وہ وقت ہے جب سیاسی

استقلال، خارجہ حکمت عملی، اور کثیر قطبی تعاون کے اصولوں کو ایک عہدِ نو کے طور پر اپنانے کی ضرورت ہے۔ ورنہ وہ قوتیں جو خود غرضی و طمع کی راہوں پر گامزن ہیں، اس خطے کے امن کو پیچ و خم میں جھونک سکتی ہیں۔

یہ رپورٹ فقط خبروں اور سیاست پر مبنی نہیں، بلکہ یہ تاریخ کے دریا میں پڑی ہوئی ایک نئی لہر ہے جو تاریخ و سیاست کے دھاروں کو ایک فکری توازن میں ڈالنے کی اہم کوشش ہے۔ طارق رحمن کی واپسی، بنگلہ دیش کے سیاسی موسم کی گردش، انڈیا کی منحصر زدہ پالیسی، اور پاک-بنگلہ تعلقات—سب ایک ایسی فکر انگیز لڑی میں بندھے ہوئے ہیں جو نہ صرف ماضی کی بازگشت ہیں بلکہ آنے والی نسلوں کیلئے بصیرت کا منبع بھی بن سکتی ہیں۔ اسی تناظر میں یہ رپورٹ ایک ادبی، تاریخی، تہذیبی اور سیاسی تنزیل ہے۔ جس کے اندر حقائق اور تشریحات ایک فلسفیانہ، تحقیقی، اور معنوی ہم آہنگی میں پروئے گئے ہیں تاکہ ترجمانی محض لفظی نہ رہے بلکہ ایک نیا ادبی تاثر و سیاسی ادراک پیدا ہو۔

یہ کہانی محض اقتدار کی کشمکش نہیں، یہ شعور و سیاست کی بیداری ہے۔ اس میں طاقت کا کھیل بھی ہے، تہذیب کا درد بھی اور ملت کی امید بھی۔ یاد رکھیں قومیں جب اپنی تقدیر کے چراغ خود جلانا سیکھ لیں تو پھر تاریخ ان کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنتی، رہنمائی بنتی ہے۔ قومیں جب ماضی سے سبق، حال سے آگہی، اور مستقبل سے امید جوڑ لیں تو پھر زمانہ ان کا ہو جاتا ہے۔

موجودہ صورتِ حال اس حقیقت کی حامل ہے کہ بنگلہ دیش کے انتخابات اور سیاسی تبدیلیاں صرف ایک ملک کا داخلی معاملہ نہیں رہیں بلکہ پورے جنوبی ایشیا کے سیاسی توازن پر اثر انداز ہوں گی۔ پاکستان اور بنگلہ دیش کے تعلقات میں قربت، اقتصادی تعاون اور عوامی سطح پر دوستی کے جذبات نے ایک نئے سفارتی مرحلے کی بنیاد رکھ دی ہے۔ دونوں ممالک کے درمیان تاریخی، مذہبی اور تہذیبی رشتوں نے اس تعلق کو مزید مضبوط بنانے کیلئے سازگار ماحول فراہم کیا ہے۔ ریاستی سطح پر دانشمندانہ فیصلے، سفارتی سطح پر متوازن حکمت عملی، اور عوامی سطح پر خیر سگالی کے جذبات—یہ تین عناصر آئندہ برسوں میں پاک-بنگلہ تعلقات کی سمت متعین کریں گے۔ اگر دونوں ممالک نے ذمہ داری اور دوراندیشی کا مظاہرہ کیا تو خطے میں تعاون، تجارت، سلامتی اور ترقی کیلئے وسیع امکانات پیدا ہو سکتے ہیں۔

آخر میں بات پھر وہیں آکر رکتی ہے جہاں سے سفر شروع ہوا تھا۔ یہ داستان اپنے اس موڑ پر آٹھرتی ہے جہاں عقل کے حساب کتاب سے زیادہ دلوں کے رشتے اور دلوں کی دھڑکنیں بولتی ہیں۔ پاکستان اور بنگلہ دیش کی تہذیبی اور روحانی قربت کوئی وقتی کیفیت نہیں، یہ تاریخ کی گہرائیوں میں اترا ہوا سچ ہے۔ جدائی کے باوجود نہ ہمارا ایمان بدلا، نہ ہماری دعائیں ایک دوسرے کیلئے کم ہوئیں۔ دونوں ملکوں کے عوام نے دکھ بھی دیکھے، محرومیاں بھی جھیلیں، مگر دل کے ایک گوشے میں ہمیشہ یہ احساس زندہ رکھا کہ ہم ایک دوسرے کے اپنے ہیں۔ پاکستان اور بنگلہ دیش کے درمیان جو رشتہ ہے وہ نہ ماضی کی خطاؤں سے ٹوٹا، نہ سیاست کی کشاکش سے بکھرا—وہ رشتہ ایمان، تہذیب، مشترکہ آنسوؤں اور سانجھی دعاؤں کا ہے۔ ہم جدا ضرور ہوئے، مگر اجنبی کبھی نہیں بن سکے۔ وقت نے گواہی دی کہ دل اپنوں کو پہچان لیتے ہیں، چاہے ان کے درمیان کتنی ہی سرحدیں حائل کیوں نہ کر دی جائیں۔

آج جب بنگلہ دیش کے سیاسی افق پر نئی تبدیلی کے نمایاں آثار اور روشنیاں پھوٹ رہی ہیں۔ پاکستان کے قلوب میں محبت اور خیر سگالی کے چراغ پھر سے جل رہے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ تاریخ کی کڑی دھوپ کے بعد کسی نے آہستہ سے چھاؤں ڈال دی ہو۔ ماضی کی تلخیاں اب سبق بنتی جا رہی ہیں، دشمنی کے سائے سمیٹے محسوس ہوتے ہیں اور بھائی چارے کی نرم سی ہوادلوں کو چھو کر گزر رہی ہے۔ خطے نئے انتخابی و سفارتی منظر نامے کی طرف بڑھ رہا

ہے، تو اس کے ساتھ ساتھ ایک اور خوش آئند حقیقت بھی ابھر رہی ہے۔ پاکستان اور بنگلہ دیش کے تعلقات میں گرمجوشی کا نیا باب رقم ہونے جا رہا ہے۔

دونوں طرف کے عوام کے اندر یہ خواہش پھر سے جاگ اٹھی ہے کہ ہم فاصلے کم کریں، گلے شکوے پیچھے رکھیں، اور محبت و تعاون کے سفر کو آگے بڑھائیں۔ یہ وہ جذبہ ہے جو ریاستی پالیسیوں سے زیادہ مضبوط ہوتا ہے، کیونکہ یہ قوموں کے دلوں میں جنم لیتا ہے اور وہیں پروان چڑھتا ہے۔ اگر دونوں قومیں تدبیر، اخلاص اور باہمی احترام کے ساتھ آگے بڑھیں تو نہ صرف غلط فہمیاں دور ہوں گی بلکہ جنوبی ایشیا میں امن، تجارت، سیاست اور تہذیبی ہم آہنگی کا ایک نیا دور شروع ہو سکتا ہے۔ آنے والا زمانہ ان کیلئے نئی محبتوں، نئے معاہدوں اور نئی کامیابیوں کی بشارت دے سکتا ہے۔ شاید وہ وقت دور نہیں جب بنگلہ دیش اور پاکستان کے عوام پھر پورے یقین سے یہ کہہ سکیں گے: ہم جدا نہیں۔ صرف آزمائے گئے تھے۔

یہ وقت تلخ یادوں کو بھلا کر مشترکہ مستقبل کی بنیاد رکھنے کا ہے۔ ایسا مستقبل جس میں دشمنی کی دیواریں نہیں، اعتماد کے پل ہوں؛ جس میں نفرت کے نعرے نہیں، اخوت کی صدا ہو؛ اور جس میں عوام کی دعائیں صرف یہ کہتی سنائی دیں: ہم ایک تھے، ایک ہیں، اور بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے۔ اس تناظر میں یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ پاکستان اور بنگلہ دیش کے عوام کے دلوں میں موجود قربت، اخوت اور باہمی احترام مستقبل کی سفارتی پالیسیوں کی اصل بنیاد بن سکتے ہیں۔ یہی وہ جذبہ ہے جو جدائی کے باوجود زندہ رہا اور جو آج ایک بار پھر دونوں ملکوں کو قریب لانے کا ذریعہ بن رہا ہے۔

یہ اختتام نہیں، بلکہ دوستی کے ایک نئے عہد نامے کی تمہید ہے۔ تاریخ پلٹ رہی ہے، دعائیں قبول ہو رہی ہیں، اور دل ایک دوسرے کی طرف پھر سے رواں دواں ہیں۔ یہ مضمون اسی آرزو، اسی خواب اور اسی دعا کا تحریری اظہار ہے۔ تاریخ کے دریائے ایک بار ہمیں جدا کر دیا تھا، مگر اب لگا ہے کہ موہیں پلٹ رہی ہیں۔ شاید وہ وقت زیادہ دور نہیں جب دونوں قومیں پھر سے قریب آکر یہ کہہ سکیں گی کہ فاصلے صرف نقشوں میں تھے، دل تو کبھی جدا نہیں ہوئے۔

تاریخ، طاقت اور خودی کا معرکہ

تاریخ کی دبیز چیرہ دستیوں نے جب برصغیر کی پیشانی پر تقسیم کی لکیر کھینچی تھی، تو اس کے ساتھ ہی مقدر کے اوراق پر ایک نہ ختم ہونے والی کشمکش بھی ثبت ہو گئی۔ سرحدوں کے اس پار بکھرے ہوئے خواب، ادھوری کہانیاں، اور خونچکاں یادیں آج بھی نسلوں کے حافظے میں آہیں بن کر گونجتی ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان کا تعلق محض دور یاستوں کا باہمی معاملہ نہیں، یہ تاریخ ہندوپاک کا وہ رزمیہ باب ہے جس میں آنسو بھی ہیں، فخر بھی ہے، شکوہ بھی ہے اور امید بھی۔

آج جب عالمی سیاست کی شطرنج پر نئی چالیں کھیلی جا رہی ہیں، کبھی واشنگٹن کی بساط چھتی ہے اور کبھی بیجنگ کے ایوانوں میں فیصلوں کی گونج سنائی دیتی ہے، تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ برصغیر کے زخم ابھی بھرے نہیں؛ محض مرہم بدلتے رہتے ہیں۔ ثالثی کے نام پر آنے والی آوازیں کبھی ہمدردی کی صورت، کبھی بالادستی کی صورت اور کبھی طاقت کے کرخت لہجے میں سنائی دیتی ہیں۔

سوال مگر اپنی جگہ قائم ہے:

کیا قوموں کی تقدیر کانفرنسوں کے قالینوں پر لکھی جاتی ہے؟ یا یہ تقدیر ان دلوں کے حوصلوں سے جنم لیتی ہے جو اپنی تاریخ کے بوجھ اور اپنی ذمہ داری کے شعور سے آشنا ہوں؟ یہ مقالہ اسی داستان کی گرہیں کھولنے کی ایک عاجزانہ کوشش ہے جہاں الفاظ محض بیان نہیں، عہد رفتہ کی دھڑکنوں کی ترجمانی ہیں؛ جہاں سیاست کا خشک تجزیہ بھی جذبات کی نمی سے خالی نہیں اور جہاں تاریخ صرف ماضی نہیں، مستقبل کی دہلیز پر دستک بھی ہے۔

جنوبی ایشیا کی سیاست ہمیشہ سے تزویراتی کشمکش، قومی بیانیوں، تاریخی تنازعات اور عالمی طاقتوں کے اثر و نفوذ سے مرکب رہی ہے۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان تنازع — خصوصاً کشمیر کا مسئلہ — نہ صرف دونوں ممالک کی خارجہ پالیسی کا محور رہا ہے بلکہ عالمی قوتوں کیلئے بھی دلچسپی کا مرکز بنا رہا۔ ایسے میں جب ٹرمپ نے ثالثی کا دعویٰ کیا اور اس کے بعد چین نے بھی اسی نوعیت کا بیان دیا، تو یہ معاملہ محض سفارتی الفاظ کا کھیل نہ رہا بلکہ علاقائی طاقت کے توازن اور خود مختاری کے سوال سے جا ملکر آیا۔

اس مقالے میں انہی بیانات کے سیاسی و سفارتی اثرات کا علمی مطالعہ پیش کیا جاتا ہے، اور اس امر کی نشاندہی کی جاتی ہے کہ ثالثی کا یہ سلسلہ محض حسن نیت کا اظہار نہیں بلکہ عالمی طاقتوں کی نئی صف بندیوں کا مظہر بھی ہے۔

ٹرمپ کی جانب سے پاکستان اور ہندوستان کے مابین جنگ بندی کرانے کے دعووں نے اگر مودی کیلئے سیاسی بساط پر پہلے ہی ایک پیچیدہ گرہ ڈال رکھی تھی تو اب اسی نوعیت کا دعویٰ جب چین کی وادیِ خموشاں سے گونجا تو اس نے اس گرہ کو مزید الجھا دیا۔ چینی وزیر خارجہ کے اس تازہ بیان نے، جس میں انہوں نے مئی کے تناظر میں دونوں ہمسایہ ممالک کے مابین ثالثی کی بات کہی، سفارتی فضا میں ایک نئی ہلچل پیدا ہو گئی۔ تاریخ نے ایک مرتبہ پھر طاقت کے ایوانوں میں یہ سرگوشی بلند کی کہ جنوبی ایشیا کی سیاست محض سرحدی خط کھینچنے کا نام نہیں، بلکہ مفادات کی ایسی شطرنج ہے جہاں ہر چال کئی معنی رکھتی ہے۔

ٹرمپ کی جانب سے ثالثی کا دعویٰ دراصل اس بات کا اظہار تھا کہ امریکا جنوبی ایشیا کے تنازع میں اپنی موجودگی کو برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ٹرمپ پہلے ہی ثالثی کا دعویٰ کر چکے تھے، جسے اقوام عالم اور خود بھارت کے اندر تمام سیاستدان مودی کی خاموشی کو ٹرمپ کے بیان کی تصدیق سمجھتے ہیں۔

اب چین کی جانب سے اسی نوعیت کا بیان آنا مودی حکومت کیلئے نئی مشکل بن گیا ہے۔ چین کے تازہ دعوے نے یہ واضح کیا کہ اب اس خطے میں طاقت کا ایک نیا محور تشکیل پا رہا ہے۔ چین کی طرف سے کہا گیا کہ مئی میں پاکستان اور بھارت کے درمیان کشیدگی کم کرانے میں اس نے کردار ادا کیا۔ اس بیان نے نہ صرف سفارتی سطح پر نئی بحث چھیڑ دی بلکہ بھارت کی داخلی سیاست میں بھی ہلچل پیدا کی۔

جنوبی ایشیا اب صرف دو طرفہ تنازعات کی حدود میں مقید نہیں رہا، بھارت مستقل یہ موقف دہراتا رہا ہے کہ کشمیر اور پاکستان سے متعلق تمام مسائل دو طرفہ ہیں، کسی تیسرے فریق کی مداخلت قابل قبول نہیں جو کہ یقیناً اقوام متحدہ کی قراردادوں کے بھی خلاف ہے۔

عظیم طاقتیں ثالثی کے پردے میں اپنے مفادات کے جال بچھا رہی ہیں۔ چین کا دعویٰ اس موقف کو چیلنج کرتا ہے، یہ دعویٰ بھارت کیلئے داخلی سیاست میں بھی ایک مشکل بن گیا ہے کیونکہ اپوزیشن سوال اٹھاتی ہے، حکومت کی پالیسی پر شکوک پیدا ہوتے ہیں، سفارتی شفافیت پر بحث چھڑتی ہے۔ بھارت کیلئے یہ چیلنج ہے کہ وہ اپنے دیرینہ ہٹ دھرمی کو کیسے برقرار رکھے، لہذا چین کے بیان نے محض بین الاقوامی نہیں بلکہ اندرونی سیاسی ہلچل بھی پیدا کر دی ہے۔

چینی بیان سامنے آتے ہی بھارت میں اپوزیشن کی آواز بلند ہوئی۔ کانگریس نے وضاحت کا مطالبہ کیا اور وزارت خارجہ کی خاموشی سوال بن گئی۔ اس مسئلے نے سیاسی بساط پر تین چالیں ایک ساتھ چلائیں: حکومت پر شفافیت کے مطالبے میں اضافہ، قومی سلامتی کے بیانیے کی آزمائش اور خارجہ پالیسی کی سمت پر عوامی بحث کے مطالبوں نے زور پکڑ لیا ہے۔ یہ صورتحال اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ خارجہ پالیسی صرف سفارتی خانوں میں طے نہیں ہوتی بلکہ جمہوری معاشروں میں سیاسی جواب دہی کا حصہ بھی بن جاتی ہے۔

چینی دعوے کے بعد ہندوستان کے سیاسی ایوانوں میں سوالوں کی کڑیاں در کڑی جڑتی گئیں۔ اپوزیشن جماعت کانگریس نے حکومت سے وضاحت کا مطالبہ کیا اور وزارت خارجہ کی خاموشی نے اس سوال کو مزید گہرا کر کے اسے محض سیاسی بحث نہیں رہنے دیا بلکہ قومی حکمت عملی کا سوال بنا دیا۔ گویا اپوزیشن کی زبان پر یہ شکوہ تھا کہ "خاموشی بھی کبھی کبھی اعتراف بن جایا کرتی ہے۔"

اس نکتے میں دو اہم باتیں ہیں، اپوزیشن سوال کر رہی ہے، وزارت خارجہ خاموش ہے، اس خاموشی کے چند اسباب ہو سکتے ہیں: حکومت معاملہ طول نہیں دینا چاہتی، اس بیان کی تردید کرنا چین سے تعلقات پر اثر ڈال سکتا ہے، قبول کرنا پالیسی کی تردید بن جائے گا۔ اسی لیے اپوزیشن کیلئے یہ ایک سیاسی موقع ہے، حکومت سے قومی سلامتی اور خارجہ پالیسی کو تنقید کا نشانہ بنا کر حکومت سے شفاف جواب مانگا جائے۔

کانگریس کے رہنما جے رام ریش نے بجاطور پر ایک اعتراض اٹھایا کہ اگر چین کی طرف سے ثالثی کا یہ دعویٰ درست ہے تو یہ نہ صرف سابقہ سرکاری موقف کی نفی ہے بلکہ قومی سلامتی کے حساس باب پر طنز کا بھاری بھر کم طمانچہ بھی بن جاتا ہے۔ اور قومی سلامتی کا باب یہ بوجھ برداشت نہیں کر سکتا،

وہاں ہر لفظ تلوار کی دھار پر رکھا جاتا ہے۔

جے رام ریش کے بیان میں تین باتیں پوشیدہ ہیں، یہ دعویٰ سرکاری موقف سے متصادم ہے، عوام کو اصل صورت حال نہیں بتائی گئی، قومی سلامتی کو سیاسی کھیل نہ بنایا جائے۔ ان کا اصل مدعا یہ تھا کہ اگر ثالثی ہوئی تو بھارت کے دیرینہ موقف کا کیا ہوا؟ عوام کو بتایا جائے، اگر نہیں ہوئی تو چین ایسا دعویٰ کیوں کر رہا ہے؟ اگر نہیں ہوئی تو واضح تردید کیوں نہیں آئی؟ چین کا دعویٰ خاموشی کے ساتھ رہ جائے تو یہ ریاستی موقف کی ساکھ کو متاثر کرتا ہے۔ یہاں خود مختاری کا سوال مرکزی ہے۔ کسی بھی ریاست کیلئے ثالثی قبول یار دکر نامحض سفارتی عمل نہیں بلکہ قومی وقار سے جڑا ہوتا ہے۔ چین کا دعویٰ بھارت کے اسی وقار کے امتحان کے طور پر دیکھا جا رہا ہے۔

اسی سلسلے میں آل انڈیا مجلس اتحاد المسلمین کے صدر اسد الدین اولیٰ نے بھی اپنی مخصوص بے باکی کے ساتھ سوال اٹھایا کہ ایک طرف چین پاکستان کو اسلحہ فراہم کر کے عسکری ترازو کا پلڑا اچھکاتا ہے اور دوسری جانب ثالثی کے منصب پر جلوہ افروز ہونے کا خواہاں ہے۔ ان کے مطابق یہ طرز عمل اس



مسافر کی مانند ہے جو جنگل کو آگ بھی لگائے اور پھر خود کو بارانِ رحمت کا پیا مبر بھی کہلوائے۔ یہ بیک وقت ممکن نہیں۔ اولیٰ کے نکات کو یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ وہ چین کی دوہری حیثیت — شرکت داری، اور ثالثی پر سوال اٹھاتے ہوئے مودی سے پوچھ رہے ہیں کہ چین پاکستان کا بڑا اسلحہ فراہم کنندہ ہے، عسکری تعاون رکھتا ہے۔ ان کا استدلال جو ملک ایک فریق کو اسلحہ دے، اس کی عسکری طاقت بڑھائے اس کے ساتھ حساس آپریشنز میں تعاون کرے، وہ غیر جانبدار ثالث نہیں ہو سکتا، اسی لیے انہوں نے اسے ناقابل قبول قرار دیا۔ سرحدی تنازعات میں خود بھارت کا فریق بھی ہے۔ ایسے ملک کا ثالثی کا دعویٰ نیوٹرل

حیثیت کو خود ہی مشکوک بنا دیتا ہے۔ کیا فریق تنازع "غیر جانبدار ثالث" بھی ہو سکتا ہے؟ یہ وہ نکتہ ہے جہاں سیاست، اخلاقیات اور تزویراتی مفادات کا ملاپ ہوتا ہے۔

سوال یہ ہے کیا چین کا بیانیہ عالمی ثالث کے طور پر ابھرتا ہوا کردار ہے؟ چین نے اپنی تقریر میں واضح کیا کہ اس نے ایران جوہری مسئلہ، ایران سعودی عرب میں یمن کی جنگ، میانمار تنازع، فلسطین۔ اسرائیل معاملہ، کمبوڈیا۔ تھائی لینڈ کشیدگی جیسے مسائل میں کردار ادا کیا۔ یہ اعلان محض اطلاع نہیں بلکہ طاقت کا اظہار ہے۔ چین اب خود کو اقتصادی و عسکری قوت، سفارتی ثالث، تینوں حیثیتوں میں منوانا چاہتا ہے۔

چین کے وزیر خارجہ وانگ یی نے بین الاقوامی صورتحال پر منعقدہ سمپوزیم میں "ہاٹ اسپاٹ" تنازعات کی فہرست میں بھارت و پاکستان کشیدگی کا بھی ذکر کیا۔ چین نے یہ بات واضح کی، وہ دنیا کے مختلف تنازعات میں کردار ادا کر رہا ہے۔ پاکستان و بھارت کشیدگی بھی اس فہرست میں شامل ہے۔ انہوں نے اسے چین کی سفارتی مساعی کا حصہ قرار دیا۔ یہ بیان دراصل چین کو عالمی ثالث کے طور پر پیش کرنا، سفارتی امیج کو مضبوط بنانا، اپنی بڑھتی طاقت کا اظہار کرنا ہے۔ گویا یہ بیان یہ بیان دراصل چین کو عالمی ثالث کے طور پر پیش کرنا، سفارتی امیج کو مضبوط بنانا، اپنی بڑھتی طاقت کا اظہار کرنا ہے۔ اس سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ چین صرف علاقائی طاقت نہیں بلکہ عالمی سیاسی بساط کا سرگرم کھلاڑی ہے۔ عالمی برادری کی محفل میں چین کا یہ کھلا پیغام ہے کہ

ایشیائی سیاست کا محور بدل رہا ہے اور بیجنگ محض تماشائی نہیں بلکہ کردار بن چکا ہے۔

وانگ لی کے مطابق دنیا نئی کشیدگیوں سے گزر رہی ہے، علاقائی جنگوں میں اضافہ ہوا ہے، طاقت کا توازن مسلسل بدل رہا ہے۔ اس سال دنیا میں تنازعات کی لہر دوسری عالمی جنگ کے بعد شاید سب سے بلند رہی۔ انہوں نے پائیدار امن کیلئے "منصفانہ اور متوازن رویے" کو علاج دردتایا۔ یہ الفاظ اپنی جگہ خوبصورت ہیں مگر تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ الفاظ کے صحرائے میں معنی کی نخلستان تک رسائی کیلئے عمل کی بارش بھی ضروری ہوتی ہے۔ انہوں نے چین کے کردار کو منصفانہ توازن برقرار رکھنے والا تنازعات کی جڑ حل کرنے والا بیان کیا۔ تاہم یہ تعبیر خود چین کی پالیسی پر بھی سوال کھڑے کرتی ہے، کیونکہ تنقید نگار کہتے ہیں کہ بعض جگہ چین خود تنازعات کا فریق ہے کئی مواقع پر معاشی دباؤ استعمال کر چکا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ خطے میں انڈیا کے اپنے تمام پڑوسیوں کے ساتھ جارحانہ اور منافقانہ کردار کے مقابلے میں چین کا کردار کہیں شفاف اور بہتر ہے۔

نامور انڈین کالم نگار سوشانت سنگھ کے مطابق چینی بیان کئی اہداف کو بیک وقت حاصل کرتا ہے، وہ پاکستان اور بھارت کو برابری کی سطح پر سمجھتا ہے اور چین کو خطے کا نیا ثالث اعظم بنا کر پیش کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ٹرمپ کے سابقہ دعوے کو بھی وزن عطا کرتا ہے۔ اس تاثر میں بظاہر ایک نرم لہجے میں سخت حقیقت پوشیدہ ہے کہ خود مختاری کا چراغ تبھی روشن رہتا ہے جب اس کی لو اندر سے بھڑکتی رہے، باہر سے پھونکی ہوئی ہوا پر اس کا انحصار نہ ہو۔ اس اصولی موقف پر بھی سب سے پہلے مودی سرکار کو عمل کرنے کی ضرورت ہے۔

دیگر تجزیہ کاروں نے اس نکتے پر روشنی ڈالی کہ چین پاکستان اور بھارت کو جو ایک صف میں کھڑا دکھا رہا ہے، اس سے امریکا کے دعوے کو تقویت مل رہی ہے، بھارت کی خود مختاری زیر بحث آرہی ہے۔ یہ رد عمل اس بات کا ثبوت ہے کہ ثالثی کا موضوع صرف سفارتی کروٹ نہیں بلکہ قومی بیانیے کی بنیادوں تک رسائی رکھتا ہے۔ یہ دراصل سفارتی علامتیں ہیں۔ الفاظ کے پیچھے سیاسی پیغام بیانات کے پیچھے اسٹریٹجک نتائج بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ اسی طرح اسد الدین اویسی نے بھی کہا کہ چین دونوں ممالک کو ایک صف میں لا کر خود کو خطے کی سب سے بڑی قوت کے طور پر منوانا چاہتا ہے۔ کیا یہی وعدہ و پیمان اس وقت طے ہوا تھا جب مودی نے چین کا دورہ کیا؟ گویا یہ سوال محض سفارتی نوعیت کا نہیں بلکہ نیتوں کے آئینے میں جھانکنے کی دعوت بھی دیتا ہے۔

اویسی کا دوسرا سوال اس سے بھی بڑا خطرناک ہے۔ کیا چین خود کو بڑی طاقت ثابت کرنا چاہتا ہے۔ یہ نکتہ اہم ہے۔ چین جنوبی ایشیا میں اثر و رسوخ بڑھا رہا ہے، پاکستان کے ساتھ اس کے تعلقات مضبوط ہیں، بھارت کے ساتھ سرحدی تنازعات موجود ہیں لہذا ثالثی کا اعلان طاقت کے اظہار کا طریقہ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ پیغام بھی ہو سکتا ہے کہ چین خطے کا فیصلہ ساز ہے۔ اویسی کے سوال کا مفہوم یہ ہے کیا مودی حکومت نے کسی سطح پر چین کے ایسے کردار کو قبول کیا تھا؟ اگر ایسا نہیں تو مودی اب تک خاموش کیوں ہے؟

اگرچہ رسمی تردید نہیں ہوئی مگر ذرائع نے کہا چین کا کردار نہیں تھا۔ تاہم میڈیا نے یہ خبر دی کہ ثالثی نہیں ہوئی، تنازع دو طرفہ طور پر حل ہوا یعنی مسئلہ براہ راست ڈی جی ایم اوز کے رابطے سے حل ہوا۔ یہ بھارت کی دیرینہ پالیسی کے مطابق ہے، تیسرے فریق کی گنجائش نہیں، اس سے دو باتیں واضح ہیں، بھارت دو طرفہ اصول سے دستبردار نہیں ہونا چاہتا اور تیسرے فریق کی شمولیت کو پالیسی سطح پر خطرہ سمجھا جاتا ہے۔ انڈیا ٹوڈے کی رپورٹ کے مطابق حکومتی ذرائع نے واضح کیا کہ مئی کے تنازع کے حل میں کسی غیر ملکی طاقت کی مداخلت کا کوئی وجود نہیں تھا۔ اس موقف کے ساتھ یہ تصریح بھی

جڑی ہوئی ہے کہ دونوں ملکوں کے ڈائریکٹر جنرل ملٹری آپریشنز کے مابین براہ راست گفتگو ہوئی، جنگ بندی پر خود اتفاق کیا جو فیصلہ کن ثابت ہوا۔ یہ بیان گویا اس بات کا اعلان ہے کہ اگرچہ دنیا ثالثی کے گہنوں سے خود کو آراستہ کرنا چاہتی ہے مگر اصل فیصلہ وہی ہے جو زمینی حقیقتوں کی میز پر طے ہو۔ اس سے تین باتیں ظاہر ہوئیں، فوجی سطح پر رابطے مؤثر ہیں، سفارت کاری محاذ سے پہلے عسکری اعتماد سازی اہم ہے، بیرونی قوتوں کی ضرورت کم پڑتی ہے

در اصل ان ایام میں کشیدگی بڑھی، تھل کی اپیل سامنے آئی، جنگ بندی ہوئی، ثالثی کا دعویٰ سامنے آیا، نتیجہ یہ نکلا کہ مودی کی مجرمانہ خاموشی کی بناء پر سفارتی تاثر چین کے حق میں چلا گیا، بھارت دفاعی پوزیشن پر آیا اور اپوزیشن نے سوالات تیز کر دیئے۔ 13 مئی کی پریس بریفنگ میں بھی یہی کہا گیا کہ جنگ بندی کی تاریخ، وقت اور اصطلاحات سب فوجی حکام کے درمیان براہ راست رابطے کے ذریعے طے پائیں۔ اس کا مطلب جنگ بندی کسی بیرونی دباؤ سے نہیں ہوئی، چین یا امریکا کا کوئی براہ راست کردار ثابت نہیں، بھارت اپنے موقف پر قائم ہے۔ یہ بات ایک مرتبہ پھر واضح ہوئی کہ جنوبی ایشیا کے تنازعات میں اصل کڑی دونوں ممالک کے مابین اعتماد سازی ہے، چاہے اس کی صورت کبھی تلخ لہروں کی ہو اور کبھی شیریں ندی کی طرح۔

سات اور دس مئی کے درمیان ہونے والے واقعات نے چین کے کردار پر نئے سوالات اٹھائے۔ یہ سوالات اس لیے پیدا ہوئے کہ چین نے تھل کی اپیل کی، سیز فائر ہوا۔ چین نے ثالثی کا دعویٰ کیا، اسی لیے مبصرین نے تعلق جوڑنے کی کوشش کی۔ اپوزیشن نے سوال اٹھائے، چین نے سفارتی فائدہ اٹھایا۔ تاریخ کا سبق یہی ہے کہ تھل کی اپیلیں اگر مفادات کے غلاف میں لپیٹی ہوں تو ان کے معنی بدل جاتے ہیں۔

یوں ان تمام واقعات کا حاصل یہ ہے کہ جنوبی ایشیا کی سیاست اب محض جغرافیہ کا کھیل نہیں رہی بلکہ عالمی طاقتوں کی بساط پر چال در چال کا منظر پیش کر رہی ہے۔ پاکستان اور ہندوستان کے مابین تنازع محض دو ہمسایہ ملکوں کی کشمکش نہیں بلکہ تاریخ، فکر، انا، خود مختاری اور سیاسی بلوغت کے امتحان کا دوسرا نام ہے۔ اصل سوال ثالثی کا نہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ قومیں کب اپنے مسائل کے حل کیلئے بیرونی سہاروں کے بجائے اپنی داخلی حکمت و بصیرت پر بھروسہ کرنا سیکھتی ہیں۔ یہی وقت کی آواز ہے، یہی تاریخ کا تقاضا ہے اور یہی ملتوں کی سر بلندی کا راستہ۔

چین نے ثالثی کا دعویٰ کر کے سفارتی وزن بڑھایا، بھارت نے دو طرفہ پالیسی دہرائی، اپوزیشن نے حکومت کو گھیرنے کی کوشش کی، پاکستان پس منظر میں مگر مرکزی فریق رہا، عالمی سیاست میں طاقت کا توازن نئی کروٹ لے رہا ہے۔ اصل سوال یہ ہے کیا جنوبی ایشیا کے مسائل بیرونی ثالثوں سے حل ہوں گے؟ یا گفتگو، اعتماد سازی اور سیاسی بالغ نظری ہی اصل راستہ ہے؟ یہ سوال ابھی کھلا ہے اور وقت، تاریخ اور قوموں کی بصیرت ہی اس کا جواب دے گی۔

یہ پورا معاملہ اس امر کی گویا علامت ہے کہ جنوبی ایشیا عالمی قوتوں کے تزویراتی تجربہ گاہ بنا ہوا ہے۔ پاک بھارت کے تنازعات دوسروں کے بیانیوں میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ ثالثی کبھی محض خیر خواہی نہیں ہوتی۔ طاقت کی حکمت عملی بھی ہوتی ہے، اصل مسئلہ یہ نہیں کہ ثالثی کون کرے۔ اصل سوال یہ ہے کہ کیا خطے کی قومیں اپنے مسائل خود حل کرنے کا حوصلہ پیدا کریں گی؟ جب داخلی بصیرت بیدار ہو اور سیاسی بالغ نظری جنم لے تو بیرونی ثالثی کی ضرورت خود دم توڑ دیتی ہے۔ مودی جتنا جس قدر جلد سمجھ لے، اسی قدر بہتر ہو گا۔

اس لئے ضروری ہے کہ خطے میں کروڑوں افراد کو غربت کے چنگل سے نکلانے امن و سلامتی اور جاری مسائل کا منصفانہ نظام تشکیل دیا جائے اور یہ اسی صورت ممکن ہے جب ہندوستان میں متعصب آرائیں ایس کے ہندو تو امنصوبے کی بیخ کنی کیلئے اقوام عالم کی امن پسند قوتوں کو مودی کے جارحانہ اور

مکارانہ منصوبوں سے آگاہ کیا جائے کہ کس طرح وہ اپنے اقتدار کیلئے عالمی امن کیلئے ایک شدید خطرہ بن سکتا ہے۔ اس خطرہ سے بچنے کیلئے فوری طور پر پاکستان اور بھارت کے مابین مستقل با مقصد مذاکراتی میکانزم قائم کیا جائے، جنگ بندی کے تمام اصولوں کی دستاویزی اور شفاف نگرانی کی جائے، میڈیا بیانات کے بجائے پارلیمانی اعتماد سازی کا راستہ اپنایا جائے اور عالمی طاقتوں کی ثالثی کی بجائے علاقائی مکالمہ ماڈل تشکیل دیا جائے۔

آخر کار یہ حقیقت ہمارے سامنے سر اٹھائے کھڑی ہے کہ برصغیر کے دونوں کناروں پر بسنے والی قومیں صرف سرحدی فاصلوں سے جدا ہیں، احساس کے رشتوں سے نہیں۔ طاقتوں کے ایوان بدلتے رہتے ہیں، ثالثی کے دعوے آتے اور جاتے رہتے ہیں، مگر قوموں کی اصل آزمائش اس میں نہیں کہ ان کیلئے کون بولتا ہے۔ بلکہ اس میں ہے کہ وہ خود کب بولنا سیکھتی ہیں۔

چین ہو یا امریکا۔ دنیا کی ہر بڑی قوت اپنا مفاد لے کر آتی ہے اور تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ طاقت کے بازار میں ہمدردی کا سکہ نہیں چلتا۔ اصل قوت وہی ہے جو دلوں کے اندر جاگتی ہے، جو قوموں کو خود داری، بصیرت اور حکمت کے چراغ تھما دیتی ہے۔ برصغیر کی مٹی نے بہت خون دیکھا ہے، لیکن اس نے معافی، صبر، قربانی اور حوصلے کے ایسے چراغ بھی دیکھے ہیں جو آج تک بجھ نہ سکے۔

اگر پاکستان اور ہندوستان اپنے مسائل خود بات چیت کی خوشبو سے حل کریں، تو شاید آنے والی نسلیں جنگ کے طبل نہیں بلکہ امن کی بانسری سنیں۔ تاریخ کے طولِ شب میں صبح کی پہلی لکیر ہمیشہ انہی قوموں کیلئے ابھرتی ہے جو دوسروں کے سہارے کی بجائے اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کا حوصلہ رکھتی ہیں۔

یہی اس مقالے کا حاصل ہے، یہی اس کی صدا، کہ ثالثی کے شور میں اپنے ضمیر کی آواز پہچانی جائے، اور سرحدوں سے بلند ہو کر انسانیت کی مشترکہ دھڑکن سنی جائے شاید پھر تاریخ کے صحن میں امن کے شجر پر پہلی کو نیل پھوٹے اور برصغیر کی صبح واقعی صبح امید بن جائے۔

طاقت کٹھڑے میں

تاریخ کبھی خاموش نہیں رہتی، وہ ہر لمحے قلم کے ٹک ٹک میں لکھتی ہے، اور وقت کے مقررہ لمحے پر اس کے فیصلے سامنے آتے ہیں۔ آج تاریخ ایک بار پھر اپنے صفحات پلٹ رہی ہے اور دنیا ایک ایسے موڑ پر کھڑی ہے جہاں طاقت کے دعوے، نظریات کے جال اور علاقائی مفادات کی کشمکش نے عالمی امن و سلامتی کے توازن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ دنیا کی سیاست ایک ایسا دریا ہے جو اپنی موجوں میں طاقت اور اثر و رسوخ کے رنگ بکھیرتا رہتا ہے۔ تاریخ کے صحیفے بار بار یہ سبق دیتے ہیں کہ طاقت کے گھوڑے جو سرحدوں سے باہر دوڑتے ہیں، اکثر اندرونی دیواروں کے رخنے سے ہی شکست کھاتے ہیں۔

کوئی بھی قوم یا ریاست، چاہے وہ کتنی بھی طاقتور نظر آئے، جب تک داخلی یکجہتی، مضبوط قیادت اور نظم و ضبط نہ رکھے، اس کی بنیادیں لرزاں رہتی ہیں۔ طاقت صرف فوجی قوت یا عسکری ہتھیار نہیں، بلکہ داخلی قیادت اور قومی ہم آہنگی کے بغیر عارضی اور غیر پائیدار رہتی ہے۔ طاقت اور قوت محض جسمانی یا عسکری نہیں بلکہ ایمان، حکمت اور عقل کے ساتھ مربوط ہوتی ہے۔ اسی پس منظر میں امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے حالیہ اقدامات نے عالمی سیاست میں ایک نیا ہنگامہ کھڑا کر دیا ہے، جس کی لہریں وینزویلا سے شروع ہو کر ممکنہ طور پر دیگر ممالک تک پہنچ سکتی ہیں۔

ٹائم میگزین کی رپورٹ کے مطابق 2006ء کے آغاز میں ٹرمپ نے وینزویلا میں ایک حیران کن اور متنازع فوجی کارروائی کی، جس میں نیکولس مادورو کو گرفتار کر کے امریکی خارجہ پالیسی میں غیر ملکی مداخلت کے نئے خطرات کو منظر عام پر لا دیا گیا۔ یہ اقدام محض ایک علاقائی واقعہ نہیں، بلکہ عالمی سیاست کے آسمان پر گر جتا ہوا وہ بادل ہے جس کے سائے میں کئی خطرات اور سوالات چھپے ہیں۔ اور جو نہ صرف طاقت کے استعمال بلکہ عالمی نظام، بین الاقوامی قوانین، اور دیگر ممالک کے مستقبل کیلئے ایک غیر معمولی نشان بن گئی ہے۔ یہ واقعہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ طاقت صرف جسمانی یا عسکری نہیں بلکہ حکمت، قیادت اور داخلی نظام کے ساتھ مربوط ہو کر ہی پائیدار رہتی ہے۔

ٹرمپ کی یہ کارروائی ایسے وقت میں سامنے آئی جب انہوں نے 2025 میں نوبل امن انعام نہ جیتنے کے بعد اپنی بین الاقوامی ساکھ کو دوبارہ مستحکم کرنے کی کوشش کی۔ اس اقدام نے ظاہر کیا کہ وہ وہی سخت گیر حکمت عملی اختیار کر رہے ہیں جس کے خلاف ماضی میں خود مہم چلاتے رہے، اور اس سے دنیا میں یہ خدشہ پیدا ہوا کہ دیگر ممالک بھی ممکنہ ہدف بن سکتے ہیں۔ اس کا نتیجہ عالمی برادری میں اضطراب اور غیر یقینی صورتحال کے طور پر نمودار ہوا۔

جنوری 2026 کے آغاز میں، ٹائم میگزین کے مطابق صدر ٹرمپ نے وینزویلا کے رہنما نیکولس مادورو کو گرفتار کر کے ایک متنازع فوجی اقدام کیا۔ یہ اقدام بظاہر ایک ملک کے اندرونی معاملے کی شکل اختیار کرتا ہے، مگر حقیقت میں یہ پوری دنیا کیلئے ایک انتباہ بھی ہے۔ اس کارروائی نے واضح کیا کہ ٹرمپ کی خارجہ پالیسی وہی سخت گیر حکمت عملی اختیار کر رہی ہے جس کے خلاف وہ خود مہم چلاتے رہے۔

کرکس میں یہ کارروائی عالمی تشویش کا سبب بنی، کیونکہ دیگر ممالک، خاص طور پر کولمبیا، کیوبا، اور گرین لینڈ، ممکنہ ہدف بننے کے خوف میں مبتلا ہو گئے۔ خصوصاً کولمبیا کے صدر گستاو وبیڈرو کے تعلقات پہلے ہی کشیدہ ہیں، اور ٹرمپ نے پیڈرو کو منشیات کے غیر قانونی رہنما قرار دے کر کولمبیا میں ممکنہ فوجی

کارروائی کی دھمکی دی۔ کیوبا کے حوالے سے بھی ٹرمپ کے بیانات میں تضاد نظر آیا؛ ایک طرف اسے ناکام قرار دیا، مگر بعد میں کہا کہ مداخلت کی ضرورت نہیں، یہ خود گرجائے گا مگر دوسری طرف تنبیہ اور سابقہ ارادوں کا اشارہ بھی موجود تھا۔ اس کے اثرات عالمی سیاست میں ایک غیر یقینی کیفیت پیدا کر گئے۔ یہ واضح ہے کہ عالمی سیاست میں طاقت صرف فوجی یا اقتصادی نہیں بلکہ سفارتی مہارت، نفسیاتی اثرات، اور غیر مستقیم دباؤ کے ساتھ بھی استعمال ہوتی ہے۔

وینزویلا کے بعد، امریکی خارجہ پالیسی ممکنہ ہدف میں کولمبیا، کیوبا اور دیگر خطوں کو لے کر چلی جا رہی ہے۔ ٹرمپ کی دھمکیاں، فوجی مداخلت کے اشارے، اور اقتصادی اثرات ایک واضح پیغام دیتے ہیں کہ عالمی طاقتیں اب مقامی مزاحمت، قانون اور اخلاقی حدود کو نظر انداز نہیں کر سکتیں۔ وینزویلا کی کارروائی نے ٹرمپ کی گرین لینڈ کو امریکا میں شامل کرنے کی پرانی خواہش کو دوبارہ اجاگر کیا، جس پر ڈنمارک کی وزیراعظم میٹے فریڈرکسن نے سختی سے تردید کرتے ہوئے سختی سے کہا کہ گرین لینڈ کے مستقبل کا فیصلہ وہاں کے عوام اور ڈنمارک کے حکمرانوں کا حق ہے۔ برطانیہ اور فرانس نے بھی اس اقدام کو مسترد کیا۔ برطانیہ کے وزیراعظم سر کیئر اسٹارمر نے کہا کہ گرین لینڈ کے مستقبل کا فیصلہ وہاں کے عوام اور ڈنمارک کے حکمرانوں کا حق ہے، اور ہم ڈنمارک کی وزیراعظم کے ساتھ کھڑے ہیں۔

فرانسیسی وزارت خارجہ کے ترجمان نے کہا کہ سرحدیں طاقت سے تبدیل نہیں کی جاسکتیں۔ گرین لینڈ، گرین لینڈ کے عوام اور ڈنمارک کے عوام کا ہے اور یہ ان پر منحصر ہے کہ وہ اس کے ساتھ کیا کریں۔ ٹرمپ کا کہنا تھا کہ امریکا کو قومی سلامتی کے نکتہ نظر سے گرین لینڈ کی ضرورت ہے، جس پر گرین لینڈ کے وزیراعظم جینس نیل سن نے واضح کر دیا کہ بس بہت ہو چکا، اب ہم مزید دباؤ برداشت نہیں کریں گے۔ مذاکرات مناسب چینل کے ذریعے اور احترام کے ساتھ ہونے چاہئیں۔

یہ بیانات ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ عالمی قوانین اور ریاستوں کی خود مختاری، عسکری طاقت کے باوجود اولین اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ بیانات واضح کرتے ہیں کہ عالمی قوانین اور ریاستوں کی خود مختاری، عسکری طاقت کے باوجود اولین اہمیت رکھتے ہیں۔ طاقت کے مراکز اگر داخلی نظم و ضبط اور قانونی دائرے کی پابندی نہ کریں تو ان کے اقدامات عارضی اور غیر مستحکم رہتے ہیں۔ ایسے جارحانہ اقدامات یہ اشارہ دیتے ہیں کہ عالمی طاقتوں کے بلند بانگ دعوے، اگر مقامی عوام اور قانون کی مخالفت میں ہوں، تو صرف بین الاقوامی سطح پر بحران پیدا کرتے ہیں بلکہ عالمی امن کیلئے خطرناک صورت حال پیدا کر دیتے ہیں یہ بیانات واضح کرتے ہیں کہ عالمی قوانین اور ریاستوں کی خود مختاری، عسکری طاقت کے باوجود اولین اہمیت رکھتے ہیں۔ طاقت کے مراکز اگر داخلی نظم و ضبط اور قانونی دائرے کی پابندی نہ کریں تو ان کے اقدامات عارضی اور غیر مستحکم رہتے ہیں۔

اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل انتونیو گوتیریس نے وینزویلا کے خلاف امریکی کارروائی کو بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی قرار دیا۔ ان کا کہنا تھا، تمام فریق اقوام متحدہ چارٹر کی پاسداری کریں، فریقین جامع اور جمہوری مکالمہ شروع کریں، تاکہ معاشرے کے تمام طبقات اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کر سکیں۔ امن و سلامتی کے تحفظ کیلئے ریاستوں کی خود مختاری، سیاسی آزادی اور علاقائی سالمیت کے اصولوں کا احترام لازم اور ناگزیر ہے، اور دھمکی یا طاقت کے استعمال پر پابندی ضروری ہے۔ یہ موقف واضح کرتا ہے کہ طاقت کے مراکز کی حرکات و سکنات کو سمجھنا اور داخلی نظام کی مضبوطی کے



بغیر کوئی بھی اقدام مستحکم نہیں رہ سکتا۔ یہ موقف اس حقیقت کو اجاگر کرتا ہے کہ عالمی امن اور سلامتی کا تحفظ صرف طاقت یا دھمکی سے نہیں بلکہ قانون، شفافیت اور داخلی ہم آہنگی کے ذریعے ممکن ہے۔

یہ بیان اس حقیقت کی عکاسی کرتا ہے کہ عالمی قوانین اور ریاستوں کی خود مختاری پر کوئی طاقت یکطرفہ قبضہ نہیں کر سکتی، اور ہر اقدام کا قانونی و اخلاقی پہلو موجود ہونا ضروری ہے۔ ٹرمپ کی ویزویلا کارروائی کے بعد دنیا کے کئی ممالک، خصوصاً کولمبیا اور گرین لینڈ، ممکنہ ہدف کے طور پر

دیکھے جانے لگے ہیں۔ امریکا کی اس پالیسی نے عالمی برادری میں اضطراب پیدا کیا کہ طاقت کے مراکز کی حرکات کس حد تک عالمی امن کیلئے خطرہ ہیں۔ یہ کارروائی محض ویزویلا تک محدود نہیں، بلکہ اس کے اثرات خطے اور بین الاقوامی سطح تک محسوس کیے جا رہے ہیں۔ برطانیہ اور فرانس کی جانب سے گرین لینڈ کے حوالے سے سخت رد عمل، اور اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کا ہنگامی اجلاس، اس بات کی غمازی ہے کہ عالمی طاقتیں صرف اپنی حدود میں نہیں بلکہ عالمی قانون اور اخلاقی فریم ورک کے تقاضوں پر بھی نظر رکھتی ہیں۔ ٹرمپ کے اقدامات نے یہ واضح کر دیا کہ طاقت کے مراکز آج بھی فعال ہیں، مگر طاقت کا استعمال قانون کی حدود سے باہر ہو تو نتیجہ عدم استحکام، عالمی اضطراب اور ممکنہ کشیدگی کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ یہ واقعہ واضح کرتا ہے کہ طاقت کے استعمال کا قانونی، اخلاقی اور جغرافیائی دائرہ لازمی ہے، اور طاقت کے مراکز کو داخلی اور بین الاقوامی نظم و ضبط کے مطابق چلنا چاہیے۔

ویزویلا کے واقعہ نے یہ سبق واضح کر دیا کہ طاقت صرف فوجی طاقت، فوجی ہتھیار یا عسکری قوت نہیں، بلکہ داخلی نظم و ضبط، قیادت کی بصیرت، اور شفافیت کے ساتھ مربوط ہو تو ہی پائیدار رہتی ہے۔ تاریخ کے صفحات اس بات کے گواہ ہیں اور ہمیں بارہا یہ سبق سکھاتے ہیں کہ جب بڑی سلطنتیں، چاہے روم ہو، عثمانی خلافت یا سوویت یونین، اندرونی کمزوریوں کی وجہ سے گرتی ہیں، نہ کہ صرف بیرونی جارحیت کی وجہ سے۔ صومالیہ، افغانستان اور ایران کے واقعات اس حقیقت کے عینی شاہد ہیں کہ اداروں کی مضبوطی، قومی اتحاد اور داخلی نظم و ضبط فوجی قوت سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

ٹرمپ کی یہ کارروائی ایک واضح پیغام دیتی ہے امریکا اب صرف عدم مداخلت پر قانع نہیں ہے بلکہ تسلط کا کھلا اعلان کر رہا ہے۔ کولمبیا، کیوبا اور دیگر ممالک کیلئے یہ ایک متنبہ کنندہ سبق ہے کہ طاقت کا استعمال صرف فوجی کارروائی تک محدود نہیں، بلکہ سیاسی و اقتصادی اثرات بھی عالمی سطح پر محسوس کیے جائیں گے۔ ویزویلا میں مادورو کی گرفتاری، امریکی فوجی دباؤ، اور عالمی قوانین کی خلاف ورزی کا نتیجہ ایک ایسا منظر نامہ ہے جو یہ سوال اٹھاتا ہے کہ آیا طاقت سے ریاستوں کی آزادی اور قوموں کی خود مختاری کمزور ہوتی ہے یا صرف بیرونی دباؤ پیدا ہوتا ہے؟ تاریخ بتاتی ہے کہ ریاستیں توپوں سے نہیں بلکہ نظم و ضبط اور اندرونی اتحاد سے قائم رہتی ہیں۔

تاریخی و تحقیقی تمثیلات کی طرف اگر نگاہ دوڑائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کے صفحات خاموش نہیں رہتے، وہ ہر اقدام کا حساب رکھتے ہیں اور وقت کے مقررہ لمحے میں سنا دیتے ہیں اور وہ ہر اقدام کو قلم کی زبان سے محفوظ کر کے رکھتے ہیں اور وقت کے مقررہ لمحے پر اس کا حساب چکا دیتے ہیں۔ اقتدار کی رسہ کشی، جب قانون اور شفافیت کے بغیر ہو، تو ریاست کے مستقبل پر سوالیہ نشان لگتا ہے۔ اس لئے قیادت، داخلی نظم و ضبط، اور بین الاقوامی قانون

کا احترام ریاست کی بقاء کیلئے لازمی ہے۔ یہ تمثیل اور محاورات ہمیں یہ یاد دلاتے ہیں کہ کوئی بھی طاقت، خواہ وہ کتنی بھی جدید ٹیکنالوجی رکھتی ہو، جب تک اندرونی نظام مضبوط نہ ہو، اس کی بنیادیں کمزور رہتی ہیں۔

ویزویلا، افغانستان، صومالیہ، اور ایران کے تاریخی تجربات واضح کرتے ہیں کہ فوجی طاقت کے باوجود وہ قومیں کامیاب نہیں ہوتیں جن کے اندرونی ادارے کمزور ہوں۔ بیرونی دشمن کی سازشیں ہمیشہ رہتی ہیں، مگر سب سے بڑا سوراخ اندر سے ہوتا ہے۔ جیسے قرآن میں ہے:

﴿وَفِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ﴾ (الذاریات 21)

اور اپنی ذاتوں میں بھی غور کرو، کیا تم نہیں دیکھتے؟

یہ آیت ہمیں یاد دلاتی ہے کہ اصل طاقت بیرونی قبضے سے نہیں بلکہ اندرونی نظم و اتحاد سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر چین آف کمانڈ محفوظ اور مستحکم ہو، تو جدید ترین ہتھیار بھی کسی قوم کو شکست نہیں دے سکتے۔

ویزویلا کی کارروائی، گرین لینڈ کے دعوے، اور کولمبیا کے حوالے سے امریکی اقدامات نے عالمی سیاست کے منظر نامے کو متحرک کر دیا ہے۔ یہ واقعہ ہر قوم کیلئے سبق آموز ہے کہ طاقت کے مراکز کی حرکات و سکنات کو سمجھنا، بین الاقوامی قوانین کی پاسداری کرنا، اور داخلی نظم و ضبط قائم رکھنا ضروری ہے۔ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کے الفاظ میں بین الاقوامی قانون میں منشیات کی غیر قانونی اسمگلنگ، وسائل کے تنازعات اور انسانی حقوق سے متعلق مسائل کے حل کے مؤثر ذرائع موجود ہیں۔ یہ رپورٹ اس حقیقت کو اجاگر کرتی ہے کہ عالمی سلامتی و استحکام اور انسانی حقوق کی حفاظت صرف عسکری طاقت سے ممکن نہیں، بلکہ قانون، اخلاق، قیادت اور شفافیت کے مضبوط ستونوں کے بغیر کوئی بھی طاقت حقیقی استحکام قائم نہیں رکھ سکتی۔ یہ رپورٹ اس حقیقت کو بھی اجاگر کرتی ہے کہ عالمی سلامتی، علاقائی استحکام اور انسانی حقوق کی حفاظت صرف طاقت یا دھمکی سے نہیں بلکہ داخلی نظم، قیادت، قانون اور اخلاق کے مضبوط ستونوں کے ساتھ ممکن ہے۔

ویزویلا کی کارروائی، کولمبیا اور گرین لینڈ کے حوالے سے امریکی اقدامات نے یہ واضح کر دیا کہ عالمی سیاست میں طاقت صرف عسکری یا فوجی نہیں بلکہ قیادت، داخلی نظم و ضبط، شفافیت، اور قانون کی پاسداری کے ساتھ مربوط ہو تو ہی حقیقی استحکام قائم رہتا ہے۔ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کے الفاظ میں بین الاقوامی قانون میں منشیات کی غیر قانونی اسمگلنگ، وسائل کے تنازعات اور انسانی حقوق کے حل کے مؤثر ذرائع موجود ہیں۔

یہ تاریخی واقعہ ہمیں کئی اہم اسباق سکھاتا ہے کہ طاقت صرف ہتھیار اور فوجی قوت تک محدود نہیں ہوتی، بلکہ قانون، نظم، اور اخلاقی قیادت بھی بنیادی شرط ہیں۔ ریاستیں توپوں سے نہیں بلکہ اندرونی اتحاد، مستحکم اداروں، اور عوامی اعتماد سے قائم رہتی ہیں۔ بین الاقوامی قوانین کی پاسداری اور قومی خود مختاری کے احترام کے بغیر کسی بھی ملک کی سلامتی خطرے میں رہتی ہے۔ حقیقی فتح وہ ہے جو دل جیتنے، انصاف قائم کرنے، اور داخلی طاقت مضبوط کرنے میں حاصل ہو، نہ کہ صرف بیرونی دباؤ یا جارحیت سے۔

یاد رکھیں کہ تاریخ خاموش نہیں رہتی۔ آج کے فاتح کل کے محاسبے میں کھڑے ہو سکتے ہیں، اور اصل طاقت وہ ہے جو عدل و انصاف کے ترازو میں قائم رہ سکے۔ ویزویلا کا واقعہ، امریکا کی خارجہ پالیسی، اور عالمی رد عمل ہمیں یہ سبق دیتے ہیں کہ عالمی سیاست میں حقیقی کامیابی داخلی استحکام، عوامی وفاداری، اور اداروں کے مضبوط کردار سے ہی ممکن ہے۔

یہ رپورٹ اس حقیقت کو اجاگر کرتی ہے کہ عالمی سلامتی، علاقائی استحکام اور انسانی حقوق کی حفاظت صرف طاقت یا دھمکی سے نہیں بلکہ داخلی نظم، قیادت، قانون اور اخلاق کے مضبوط ستونوں کے ساتھ ممکن ہے۔

اتوار 28 رجب المرجب 1447ھ 18 جنوری 2026ء

تاریخ کبھی خاموش نہیں رہتی

تاریخ کبھی خاموش نہیں رہتی، تاریخہ لمحے قلم کی زبان میں لکھتی ہے، اور وقت کے مقررہ لمحے پر اس کے فیصلے سامنے آتے ہیں۔ آج دنیا ایک ایسے موڑ پر کھڑی ہے جہاں طاقت کے دعوے، نظریات کے جال اور علاقائی مفادات نے عالمی امن و سلامتی کے توازن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ تاریخ بار بار یہ سبق دیتی ہے کہ طاقت کے گھوڑے جو سرحدوں سے باہر دوڑتے ہیں، اکثر اندرونی دیواروں کے رخنے سے شکست کھا جاتے ہیں۔ کوئی قوم یاریاست، چاہے کتنی بھی مضبوط نظر آئے، جب تک داخلی یکجہتی اور مضبوط قیادت نہ رکھے، اس کی بنیادیں لرزاں رہتی ہیں۔

تاریخ کبھی بہری نہیں رہتی، ہر لمحہ اس کی قلم کاری کی گونج سنتے ہوئے انسانی اعمال کے فیصلے سامنے آتے ہیں۔ ہر قوم کی عظمت یا زوال کی کہانی صفحاتِ تاریخ میں محفوظ ہے، اور عالمی طاقتوں کی حرکات و سکنات ہمیشہ ایک سبق کے طور پر باقی رہتی ہیں۔ تاریخ کے طویل و پیچیدہ کارواں میں بعض ایسے موڑ آتے ہیں جہاں کمزور سمجھی جانے والی اقوام بھی قوت و جرأت کی ایسی داستان رقم کر جاتی ہیں کہ سپر پاورز کی پیشانی پر شکن اور دلوں میں اضطراب پیدا ہو جاتا ہے۔

یہ بھی یاد رہے کہ تاریخ کبھی خالی ہاتھ بھی نہیں رہتی، اور نہ ہی طاقت کے مراکز اپنی ہر حرکت کا حساب چھپاتے ہیں۔ ہر اقدام، ہر فیصلہ، اور ہر محاذ کی کہانی قلم کی زبانی محفوظ رہتی ہے۔ برصغیر کے اس خطے میں قائم پاکستان نے نہ صرف اپنی خود مختاری کی حفاظت کی بلکہ عالمی طاقتوں کیلئے ایک ایسا سبق قائم کیا جسے صرف علم و حکمت کے ترازو میں ناپا جاسکتا ہے۔ طاقت محض عسکری یا جسمانی نہیں بلکہ ایمان، حکمت اور عقل کے ساتھ مربوط ہوتی ہے۔ یہی سبق نائن الیون کے واقعہ کے بعد پاکستان نے تاریخ میں رقم کیا کہ آج خود مغرب اور امریکی دفاعی و سیاسی تجزیہ نگار بھی پاکستان کی اس حکمت عملی پر انگشت بدنداں ہیں۔

برصغیر کے اس خطے میں قائم اسلامی جمہوریہ پاکستان کی تاریخ بھی کچھ ایسی ہی داستانِ عزیمت سے عبارت ہے۔ یہ وہ ملک ہے جس نے محض وسائل کی کمی کے باوجود، عزم و ارادہ اور حکمت و تدبیر کے ہتھیار سے دنیا کی عظیم طاقتوں کے حساب سود و زیاں میں ہلچل پیدا کر دی۔ پاکستان کی تاریخ کا یہ باب خاص اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ اس نے نہ صرف اپنی خود مختاری کی حفاظت کی بلکہ عالمی طاقتوں کو ایسے سبق سکھائے جو تاریخ کے صفحات میں سنہری حروف سے رقم ہوں گے۔ افغانستان کی جنگ، ایٹمی دھماکے، اسامہ بن لادن کا معاملہ، شمالی کوریا کے میزائل، اور ایبٹ آباد میں سٹیلٹھ ہیلی کاپٹر کا واقعہ — یہ سب ایسے مواقع ہیں جہاں پاکستان نے عالمی طاقتوں کے دباؤ کو ناکام بنایا اور قومی مفاد کو مقدم رکھا۔

یہ رپورٹ ان حکمت عملیوں، سیاسی تدابیر اور عسکری و اقتصادی فیصلوں کا مفصل تجزیہ ہے جس نے پاکستان کو خطے میں ایک مستحکم اور محفوظ ایٹمی طاقت کے طور پر قائم رکھا۔

یہ بات تاریخ کے اوراق میں کسی مبالغے کے بغیر درج کی جاسکتی ہے کہ جس قدر اسٹریٹجک اور نفسیاتی نقصان پاکستان نے امریکا جیسی متکبر طاقت کو پہنچایا، اس کی مثال کسی اور ریاست کے ہاں مشکل ہی سے ملتی ہے۔ پاکستان نے اس لحاظ سے تاریخ رقم کی کہ پاکستان نے دنیا کی کسی بھی ریاست کے برعکس

امریکا کو وہ نقصان پہنچایا جس کا تصور بھی مشکل تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہو گا کہ جس قدر نقصان سپر پاور امریکا کو پہنچایا، وہ کسی اور ریاست کے بس کی بات نہیں۔ کہیں وہ میدان سیاست میں مہرہ بنا، کہیں معرہ؛ کہیں اتحادی کہلا کر بھی امتحان بنا رہا۔

سرد جنگ کے بعد امریکا عالمی سیاست میں بالادستی کا دعویٰ کرتا تھا، مگر پاکستان نے افغانستان میں گڈ اور بیڈ طالبان کے کھیل سے امریکا کی منصوبہ بندی کو ناکام بنایا۔ کھربوں ڈالر امریکی خزانے سے خرچ ہوئے، مگر نتائج صرف پاکستان کے حق میں گئے۔ یہ اسٹیبلشمنٹ کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ وہ چھوٹے مگر عسکری دانشمندانہ اقدامات سے عالمی طاقتوں کی حکمت عملی کو کس طرح ناکام کر سکتے ہیں۔

تاریخ کا آئینہ جب ہم پر پڑتا ہے، تو ایک حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ طاقت کے بلند مینار بھی ایک عاقل دشمن کی حکمت عملی کے سامنے لرز سکتے ہیں۔ پاکستان نے یہ ثابت کیا کہ کسی بھی عالمی سپر پاور کو صرف طاقت اور وسائل کے ذریعے شکست دینا ممکن نہیں، بلکہ عقل، حکمت اور داخلی استحکام کی ضرورت ہے۔

1979ء سے شروع ہونے والی سرد جنگ کی کشمکش میں امریکا نے پاکستان کو افغانستان میں ایک اہم کھلاڑی کے طور پر استعمال کیا۔ امریکا کا مقصد محض صرف سوویت یونین کے مقابلہ کیلئے پاکستان کو استعمال کرنا نہیں تھا بلکہ اس خطے کی معدنیات اور پٹرول پر اپنا تسلط قائم کرنا مقصود تھا مگر پاکستان نے اس جنگ میں امریکی دہمکی کے بعد شمولیت تو اختیار کر لی مگر امریکی منصوبہ بندی کو اپنے قومی مفاد کے مطابق موڑ دیا۔ طالبان کے دودھڑے گڈ طالبان اور بیڈ طالبان — کے کھیل میں پاکستان نے امریکی منصوبوں کو الجھا کر کھربوں ڈالر امریکی خزانے سے ضائع کر دیے۔

گویا امریکا کی طاقت کا کمرہ سیاست ایک خالی کمرے میں گونجتا رہا، اور پاکستان نے ہر کمرے کی دیوار پر اپنے نقوش ثبت کر دیے۔ امریکا کی طاقت کے بلند مینار کے سائے میں پاکستان کی حکمت عملی نے خاموشی سے اپنی بنیادیں مضبوط کیں، اور ہر قدم پر امریکی منصوبوں کی دیواریں کھچیاں کھاتی رہیں۔ امریکی عوام اور کانگریس میں حیرت و اضطراب پیدا ہوا کہ اتنے بڑے وسائل کے باوجود کامیابی حاصل کیوں نہیں ہو رہی۔ عالمی تجزیہ نگاروں نے پاکستان کی حکمت عملی کو "اسٹیل تھ سٹریٹجی" قرار دیا، یعنی ایسی حکمت عملی جو نظر نہ آئے مگر اثر ڈالے۔

1979ء میں سوویت یونین کے افغانستان پر قبضے کے بعد امریکا نے پاکستان کو ایک اہم کھلاڑی کے طور پر استعمال کیا۔ امریکی منصوبہ یہ تھا کہ پاکستان کے ذریعے "گڈ طالبان اور بیڈ طالبان" کی سازش کے ذریعے سوویت اثر کو کم کیا جائے، مگر پاکستان نے اس کھیل کو اپنے قومی مفاد کے مطابق موڑ دیا۔ گویا امریکی منصوبہ خود ان کے گلے پڑ گیا اور پاکستان نے امریکا کو افغانستان میں "گڈ طالبان، بیڈ طالبان" کے کھیل میں الجھا کر اربوں ڈالر خرچ کروائے اور عالمی مقروض بنا دیا۔ پاکستان کی اس حکمت عملی نے نہ صرف امریکا کو ناکام بنایا بلکہ اس کے خزانے سے کھربوں ڈالر خرچ کروا دیے، جس سے عالمی مالیاتی توازن بھی متاثر ہوا۔

چین نے امریکی بانڈز خرید کر امریکا کو مزید اقتصادی طور پر کمزور کیا مگر اس کارنامے میں پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ کا کردار سب سے اہم رہا۔ عالمی میڈیا نے پاکستان کی حکمت عملی کو "خطرناک استاد" قرار دیا۔ امریکی تجزیہ نگار حیران تھے کہ اتنے بڑے وسائل کے باوجود افغانستان میں کامیابی کیوں حاصل نہیں ہو رہی۔ گویا ایک تجربہ کار شاگرد نے استاد کے کھیل میں چھپی چالوں کو سمجھ کر مات دے دی۔ پاکستان کی خاموش حکمت نے امریکی منصوبوں کو الجھا دیا اور عالمی منظر نامے پر گہرا ناقابل تلافی اثر چھوڑا۔

چین نے اگر اربوں ڈالر کے امریکی بانڈز خرید کر اسے اپنا مقروض بنایا تو اس داستان کا ایک باب پاکستان کے اسٹیبلشمنٹ کے ہاتھوں بھی لکھا گیا۔ یہ بھی پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ کے طویل مدتی کھیل کی کامیابی تھی۔ دودہائیوں تک افغانستان کے دشت و کوہ میں گڈ طالبان اور بیڈ طالبان کی شطرنج نے امریکا کو اس قدر الجھائے رکھا کہ اس کی جھولی سے خزاں کی برگ گل کی طرح کھربوں ڈالر جھڑ گئے۔ پاکستان نے دودہائیوں تک امریکا کو افغانستان میں الجھایا اور معاشی بوجھ ڈالا۔ امریکا قرض لیتا رہا، چین اس کا فائدہ اٹھاتا رہا، اور پاکستان نے اپنے قومی مفاد اور ملک سلامتی کیلئے اس کھیل کو بخوبی کھیلا۔

پاکستان نے ایک قومی حکمت عملی کے تحت سب سے بڑا مالی اور سیاسی فائدہ حاصل کیا۔ لیکن دوسری طرف نتیجہ یہ نکلا کہ طاقت کا توازن ایک روز اچانک پلٹ گیا۔ گویا امریکا ایک میدان میں خالی ہاتھ کھیلنے آیا، مگر پاکستان کی عمدہ تدابیر نے ہر قدم پر ایسا الجھایا کہ چین کی سرمایہ کاری نے امریکی طاقت کے پاؤں تلے زمین کھینچ دی۔

امریکی عوام اور کانگریس میں یہ بات زیر بحث رہی کہ پاکستان اور چین نے امریکا کے عالمی منصوبوں پر کس حد تک اثر ڈالا۔ عالمی تجزیہ نگاروں نے کہا "پاکستان نے نہ صرف اپنی پوزیشن مضبوط کی بلکہ چین کے ذریعے امریکا کو مقروض کر کے عالمی طاقت کے توازن کو بدل دیا۔ چین نے امریکی بانڈز میں اربوں ڈالر کی سرمایہ کاری کی، جس سے امریکا کی مالی آزادی محدود ہو گئی۔ جیسے شیخ سعدی کے مطابق کار دانا کو بادشاہ بھی اپنا فرمانبردار مانے، مگر کھیل عقل و حکمت سے ہی جیتا جاسکتا ہے۔

جب امریکا کو ہوش آیا تو اقتصادی منظر نامہ بدل چکا تھا۔ وہ قرض خواہ نہیں، مقروض بن چکا تھا، اور چین بالفعل ایک اقتصادی سپر پاور کے طور پر افق پر ابھر آیا تھا۔ اسی اثنا میں جنوبی ایشیا میں ایک اور باب رقم ہوا، بھارت نے ایٹمی دھماکے کیے، اور پاکستان نے پوری جرات اور خود اعتمادی سے جواب دیا۔ تمام تر عالمی دباؤ کے باوجود، طاقت کے تمام حربے آزما لیے گئے، مگر پاکستان نے اپنا راستہ خود متعین کیا۔

2000ء کے عشرے میں جب امریکا اپنی طاقت کے عروج پر تھا، پاکستان کی حکمت عملی اور چین کی سرمایہ کاری نے عالمی توازن کو بدل دیا، مگر پاکستان اور چین کی حکمت عملی نے اسے مقروض بنادیا۔ اس منظر نامے نے عالمی طاقتوں کے مفاہمت کے اصول کو دوبارہ سے واضح کیا۔ امریکی خزانے پر قرضوں کے بوجھ اور معاشی دباؤ نے امریکا کو سیاسی و اقتصادی طور پر محتاط بنادیا۔ عالمی مالیاتی تجزیہ نگاروں نے کہا کہ پاکستان اور چین کی یہ مشترکہ حکمت عملی امریکا کی عالمی حکمرانی کیلئے ایک محتاط نشان ہے۔ عالمی میڈیا میں پاکستان کو "ایشیائی شطرنج کا ماہر" قرار دیا گیا، امریکی طاقت کے بلند و بالا میناروں کے سائے میں پاکستان کی خاموش لیکن مستحکم حکمت عملی نے اپنا چراغ روشن رکھا، پاکستان نے عالمی سیاست میں خاموش مگر موثر حکمت عملی دکھائی جو چپکے سے میدان میں اپنی حکمت عملی چلا رہا ہے۔

امریکا نے ایٹمی صلاحیت روکنے کیلئے ہر ممکن تدبیر آزمائی، کہیں این پی ٹی کا جال اور کہیں سی ٹی بی ٹی کا دام مگر پاکستان کے عسکری و سیاسی دماغ بھی کم زیرک نہ تھے؛ ہر گرہ کو گرہ ہی سے کھولا اور اپنے قومی مفاد پر کوئی آنچ نہ آنے دی۔ امریکی دباؤ اور دھمکیوں کے باوجود پاکستان نے اپنے قومی مفاد کو مقدم رکھا اور شدید ترین دباؤ کے باوجود پاکستان نے ثابت قدمی سے اپنی پوزیشن برقرار رکھی۔ بھارت کے ایٹمی دھماکوں کے بعد پاکستان نے اپنے ایٹمی پروگرام کو عملی جامہ پہنادیا۔ 28 مئی 1998ء کو پاکستان نے ایٹمی دھماکے کر کے عالمی طاقتوں کو واضح کر دیا کہ قومی خودداری پر کوئی سمجھوتہ نہیں کیا



جائے گا۔ یہ دن پاکستان کیلئے نہ صرف عسکری بلکہ سیاسی فتح بھی ثابت ہوا۔ گویا پاکستان نے اپنے قومی مفاد کے علم کو بلند کیا اور دنیا کے طوفانی سمندر میں اپنی کشتی کو مضبوط رکھ کر طوفان کا مقابلہ کیا۔

امریکا نے ایٹمی صلاحیت روکنے کیلئے ہر ممکن تدبیر آزمائی، مگر پاکستان کے عسکری و سیاسی دماغ بھی کم زور نہ تھے؛ ہر چال کا حکمت سے جواب دیا اور اپنے قومی مفاد پر کوئی آنچ نہ آنے دی۔ جنرل اسلم بیگ نے تاریخی مہارت دکھاتے ہوئے دستخط بھارت کے ساتھ مشروط کر دیے، خاص طور پر امریکا کے دباؤ کو ناکام بنایا۔ یہ سیاسی چال ایک تاریخی شاہکار تھی جیسے صحرا میں ایک درخت نے طوفان کے مقابلے میں سر نہ جھکایا، پاکستان نے عالمی دباؤ کے سامنے اپنی شاخیں مضبوط رکھیں۔ عالمی طاقتیں حیران تھیں کہ پاکستان نے اپنے ایٹمی پروگرام کو کیسے محفوظ رکھا۔

جب دباؤ حد سے بڑھا تو بظاہر رضامندی ظاہر کی گئی، مگر کس چابک دستی سے، سی ٹی وی ٹی، این پی ٹی پر دستخط انڈیا کے دستخط سے مشروط کر دیے گئے، یوں گویا بازی اپنے ہاتھ میں رکھی گئی اور انہی کی چال انہی کے نام سے چلائی گئی۔ امریکا نے ڈاکٹر شکیل کی حوالگی کیلئے ہر حربہ استعمال کیا، مگر پاکستان نے اپنی مضبوط اسٹیبلشمنٹ نے اسے بالکل کامیاب نہیں ہونے دیا اور بری طرح ناکام بنایا۔ طالبان اور حقانی نیٹ ورک کے خلاف کارروائی نہ کرنے سے امریکی منصوبے نہ صرف ناکام ہوئے بلکہ ردی کی ٹوکری میں گئے۔ گویا دشمن کا جال تنہا ہوا اور قومی طاقت نے اپنی دھات سے ہر دھاگے کو توڑ دیا۔ گویا دشمن کے جال کو پاکستانی حکمت عملی نے نہ صرف توڑ دیا بلکہ اسے اپنی چھاؤں میں محفوظ کر لیا۔ آخر وہ دن آگیا جب بھارت نے دوبارہ دھاگے کر کے عالمی بساط الٹ دی۔ پاکستان کو گویا آسمان سے موقع ملا۔ چاغی کی پہاڑیوں نے 28 مئی کے دن وہ ولولہ دیکھا جب قوم نے اپنی حمیت کا اعلان زمین سے آسمان تک سنا دیا۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے حوالے سے پابندیوں، دباؤ اور عالمی پروپیگنڈے کی آندھیاں چلتی رہیں، مگر ریاست نے اپنے اس اثاثے کی ایسی حفاظت کی کہ امریکا دانت بھیجتا رہ گیا۔ امریکی پابندیوں اور دباؤ کے باوجود پاکستان نے ڈاکٹر قدیر کی حفاظت کو ممکن بنایا۔ پاکستان نے جنرل مشرف اور جنرل باجوہ کے باوجود ڈاکٹر شکیل کی امریکا حوالگی کامیاب نہ ہونے دی، امریکی ہر حربہ آزما چکے تھے مگر پاکستان کا داخلی انفراسٹرکچر کامیاب رہا۔ یہ ایک واضح اشارہ ہے کہ قومی اثاثوں کی حفاظت میں عالمی دباؤ ناکام رہتا ہے اور قومی اثاثے صرف ہتھیار یا وسائل سے نہیں، بلکہ حکمت عملی اور داخلی نظم سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ امریکی دباؤ کے باوجود قومی مفاد کے تحفظ نے عالمی تجزیہ نگاروں کو حیرت میں ڈال دیا۔ پاکستان کی داخلی مضبوطی اور قومی قیادت کی حکمت عملی نے ایک مثال قائم کی۔

امریکی کوششوں کے باوجود پاکستان نے کونہ شوریٰ یا حقانی نیٹ ورک کے خلاف کارروائی نہیں کی، جس سے داخلی نظم و ضبط کے تحفظ کی مثال قائم ہوئی۔ طالبان اور حقانی نیٹ ورک کے خلاف کارروائی نہ کرنا، ایک عاقلانہ حکمت عملی تھی جس نے امریکا کی فوجی کوششوں کو ناکام بنایا، امریکا نے پابندیاں لگائیں اور ہر حربہ استعمال کیا، مگر داخلی سکیورٹی کے باعث ڈاکٹر قدیر محفوظ رہے۔ خود کش حملوں کی آگ بھڑکانے کی کوششیں ہوئیں، بازو مروڑنے کی تدبیریں اختیار کی گئیں، مگر پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ نے فیصلہ اپنے ہاتھ میں رکھا، نہ کونہ شوریٰ پر کاری ضرب لگی، نہ حقانی نیٹ

پر۔

گویا ایک شیر نے اپنے بچوں کو شکار کی دنیا سے محفوظ رکھا اور دشمن کو صرف خالی دانت دکھائے۔ محترمہ بینظیر بھٹو کے دور میں پاکستان نے شمالی کوریا کے ساتھ ایسا سٹریٹجک تبادلہ کیا جس نے خطے کے توازن کو نئی کروٹ دی، میزائل ٹیکنالوجی ادھر آئی، ایٹمی فہم و فراست اُدھر گئی۔ محترمہ بینظیر بھٹو کے دور میں شمالی کوریا سے میزائل ٹیکنالوجی حاصل کی گئی۔ پاکستان نے نہ صرف اپنی فوجی استعداد بڑھائی بلکہ شمالی کوریا کے ساتھ تبادلہ عمل میں بھی عالمی طاقتوں کو حیران کیا۔ پاکستان نے شمالی کوریا سے میزائل پروگرام کی ڈرائنگز حاصل کیں، اور ساتھ ہی انہیں "بریف کیس" تحفے کے طور پر فراہم کر کے عالمی سیاسی بازیگری میں اپنی مہارت دکھائی۔ پاکستان نے نہ صرف میزائل ٹیکنالوجی میں اپنی فوجی استعداد بڑھائی بلکہ شمالی کوریا کے ساتھ تبادلہ عمل میں بھی عالمی طاقتوں کو حیران کر دیا۔

اسامہ بن لادن کی مجبوری کے پس منظر میں شکیل آفریدی کی حوالگی کا معاملہ ہو یا بین الاقوامی دباؤ، امریکا نے ہر در کھٹکھٹایا، مگر ریاستی ڈھانچے نے اسے ملکی خود داری کے ترازو میں تولا اور فیصلہ ملکی وقار کے حق میں ہوا۔ اس اقدام نے خطے میں طاقت کے توازن کو برقرار رکھا اور امریکی دباؤ کو حکمت سے کمزور کیا۔

پاکستان کے پاس ایٹمی ہتھیار، جدید ٹیکنالوجی اور مضبوط قیادت موجود ہے۔ شام، عراق یا لیبیا کی طرح تباہی کا خطرہ یہاں نہیں۔ قومی مفاد کے تمام اقدامات داخلی اور بین الاقوامی نظم و ضبط کی بنیاد پر ہیں۔ جیسے پہاڑ اپنی جڑوں کی مضبوطی سے طوفان کو برداشت کرتے ہیں، پاکستان بھی اپنی داخلی قوت سے ہر خطرہ سہتا اور برداشت کرتا ہے۔

پاکستانی عسکری حکمت عملی نے یہ کمال بھی دکھایا کہ امریکا کے جدید ترین اسلحے کے بہاؤ کو کنٹرول کر کے اس کی فوجی حکمت عملی میں خلل ڈال دیا۔ امریکا نے افغانستان میں جدید ترین اسلحہ اور فوجی ساز و سامان کنٹینرز کے ذریعے پہنچائے، مگر پاکستانی اداروں نے راستے میں ہی ہر چیز کو چیک کیا۔ راستے میں رک کر نہ صرف اشیاء کی جانچ کی جاتی بلکہ غیر قانونی اور "نامعقول" سامان روک لیا جاتا۔ امریکی اسلحہ جب کنٹینرز میں افغانستان کی طرف روانہ ہوتا تو راستوں کی گرد بہت کچھ اپنے اندر سمیٹ لیتی۔ چیک پوسٹیں جاگتی رہتیں، اور "مخصوص افراد" اپنا حصہ لے جاتے۔ یوں ہر قافلہ منزل تک پہنچنے سے پہلے تاریخ کا ایک اور قصہ بن جاتا۔ یہ حکمت عملی امریکی منصوبوں کو ناکام کرنے کا اہم ذریعہ بنی۔ جدید ہتھیار بھی پاکستان کی حکمت عملی کے سامنے بے بس ہو گئے۔

امریکی تجزیہ نگار حیران تھے کہ اتنے جدید اور وسیع وسائل کے باوجود منصوبے کس طرح ناکام ہو گئے۔ عالمی ذرائع نے پاکستان کی داخلی نگرانی اور سٹریٹجک مہارت کی تعریف کی۔ گویا ایک چالاک میزبان نے اپنے گھر میں آنے والے مہمان کی ہر حرکت پر نظر رکھی، اور اپنی قومی سلامتی کیلئے ہر قدم پر اسے راستے سے ہٹا دیا۔

2011ء میں امریکی جدید سٹیلٹھ ہیلی کاپٹر ایبٹ آباد میں گرایا گیا، امریکی حکمت عملی مکمل طور پر ناکام ہوئی۔ ایبٹ آباد میں گرایا گیا سٹیلٹھ ہیلی کاپٹر امریکی ٹیکنالوجی کا ناز تھا۔ اس کی واپسی کیلئے ہر کوشش کی گئی، مگر تاریخ نے مسکرا کر لکھ دیا: ہیلی کاپٹر غائب ہو گیا۔ اور سراخ آج تک نہ ملا۔ ہیلی کاپٹر کی واپسی کیلئے امریکا نے ہر حربہ آزمایا، مگر پاکستان کی داخلی نگرانی نے اسے روک دیا۔ مگر پاکستان نے اپنی حکمت عملی سے اس کی ٹیکنالوجی محفوظ کر لی۔

یہ واقعہ عالمی طاقتوں کیلئے ایک سبق بن گیا کہ جدید ترین ٹیکنالوجی بھی داخلی نظام کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ امریکی حکمت عملی کو شکست کے طور پر دیکھا گیا اور پاکستان نے عالمی منظر نامے میں اپنی سٹریٹجک اہمیت دوبارہ ثابت کی۔ عالمی میڈیا نے بھی اس واقعہ کو "ٹیکنالوجی کا سبق اور پاکستان کی عظیم کامیابی" قرار دیا گو یاد دشمن کی چالوں کو سرنگوں کرنے میں پاکستان نے اپنے ہاتھ کی چالوں کو روشن رکھا جیسے ایک مضبوط قلعہ اپنے دیواروں میں چھپی حکمت عملی سے دشمن کے حملوں کو ناکام بنادے، پاکستان نے بھی اپنی داخلی نظم و ضبط سے عالمی طاقتوں کو حیران کر دیا۔

پاکستان نہ شام، نہ عراق اور نہ لیبیا اور نہ ہی وینزویلا ہے، اس کے پاس ایٹمی صلاحیت بھی ہے، میزائل ٹیکنالوجی بھی اور حوصلہ بھی؛ اور اگر کبھی وقت نے پکارا تو ہزاروں میل تک مار کرنے والے میزائل کا تجربہ بھی کوئی بعید امکان نہیں۔ ایک ہفتے کے اندر دس ہزار کلومیٹر تک مار کرنے والے میزائل کا تجربہ کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ افغانستان، عراق یا شام کی طرح پاکستان کو تباہ کرنا ممکن نہیں، کیونکہ یہاں داخلی نظم، مضبوط قیادت اور عوامی حمایت موجود ہے۔ گویا ایک مضبوط درخت کی جڑیں زمین میں گہری اور مضبوط ہوں، طوفان کتنے ہی شدید ہوں، وہ درخت نہ ہل سکے گا۔

پاکستان نے افغانستان میں امریکا کی کامیابی کو مسلسل ناممکن بنایا۔ امریکی جدید ہتھیار راستے میں روک لیے گئے، فوجی قافلے لوٹ لیے گئے، اور داخلی نگرانی نے منصوبے ناکام کیے۔ امریکی عوام اور تجزیہ نگار حیران رہ گئے کہ اتنے بڑے اور فول پروف منصوبے ناکام کیسے ہوئے۔ عالمی سطح پر یہ عسکری اور ٹیکنیکل قوت پاکستان کی سٹریٹجک مہارت کی علامت تصور کیے جاتے ہیں۔ گو یاد دشمن کی ہر حرکت پر ایک نامرئی ہاتھ نے راہ میں رکاوٹیں ڈالیں اور منصوبوں کو ناکام بنایا جس کو مغرب اور امریکا کے دفاعی ماہرین بھی تسلیم کرتے ہیں۔

پاکستان نے نہ صرف ایٹمی ہتھیار محفوظ رکھے بلکہ اپنی ٹیکنالوجی اور میزائل پروگرام کو بھی مستحکم کیا۔ اگر شمالی کوریا سے حاصل شدہ میزائل ڈرائنگز اور ٹیکنالوجی نے پاکستان کی دفاعی قابلیت کو بڑھایا تو وہاں شمالی کوریا بھی پاکستان کی ان خدمات کو تحسین کی نگاہوں سے دیکھتا ہے جہاں وہ آج امریکا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ عالمی طاقتیں، خاص طور پر امریکا، پاکستان کے اس سٹریٹجک موقف پر حیران رہ گئیں۔ پاکستان نے ثابت کیا کہ داخلی نظم اور حکمت عملی کے بغیر طاقت کا استعمال ناکام ہو جاتا ہے۔ جیسے خزانے کو مضبوط قلعے میں رکھا جائے، چاہے دنیا کے سب چور آجائیں، خزانہ محفوظ رہتا ہے۔

ڈاکٹر قدیر۔ ڈاکٹر شکیل کے تحفظ، ایٹمی دھماکوں کی حکمت عملی، اور شمالی کوریا سے ٹیکنالوجی کا حصول اس بات کا ثبوت ہیں کہ داخلی نظم و حکمت عملی کے بغیر کوئی طاقت حقیقی اثر نہیں رکھتی۔ امریکا کے کئی ادارے حیران ہیں کہ پاکستان نے اتنے دباؤ کے باوجود عالمی فول پروف منصوبوں کو ناکام بنایا۔ عالمی طاقتیں یہ سبق لے چکی ہیں کہ داخلی نظم، شفافیت اور قیادت کے بغیر طاقت کا استعمال ناکام ہوتا ہے۔ پاکستان نے امریکا کے دباؤ، بھارت کے ایٹمی منصوبوں، اور عالمی معاشی حکمت عملی کے باوجود اپنی خود مختاری کو قائم رکھا۔ گویا ایک ماہر کاشت کار نے اپنے کھیت کو مضبوط نہریں اور محفوظ دیواریں بنا کر دشمن کے طوفانوں کو ناکام اور نامراد بنادیا ہے۔

پاکستان کے اقدامات یہ واضح کرتے ہیں کہ عالمی قوانین اور ریاستی خود مختاری کی پاسداری بنیادی شرط ہے۔ کسی بھی طاقت کا یکطرفہ قبضہ یا دباؤ بین الاقوامی امن کیلئے خطرہ بن سکتا ہے۔ پاکستان کی یہ حکمت عملی دیگر ممالک کیلئے سبق آموز رہی۔ عالمی تجزیہ نگاروں نے تسلیم کیا کہ پاکستان نے دکھادیا کہ قانون اور اخلاق کے دائرے میں رہ کر بھی طاقت استعمال کی جاسکتی ہے جیسے ایک تجربہ کار بحری کپتان نے طوفانی سمندر میں اپنی کشتی کیلئے محفوظ

راستہ تلاش کیا، پاکستان نے عالمی دباؤ کے طوفان میں اپنی پوزیشن محفوظ رکھی۔

حقیقی فتح وہ نہیں جو بیرونی دباؤ یا جارحیت سے حاصل ہو، بلکہ وہ ہے جو عوام کا اعتماد، قومی اتحاد، اور داخلی قوت مضبوط کرے۔ پاکستان نے تاریخی اور موجودہ تجربات سے یہ سبق دیا کہ طاقت کے مراکز داخلی نظم، شفاف قیادت، اور قانون کی پابندی کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتے۔ گویا فتح وہ ہے جو صرف میدان جنگ میں نہیں بلکہ دلوں، اداروں اور قوم کے ایمان میں فتح حاصل کرے۔ پاکستان کی حکمت عملی نے دکھایا کہ طاقت صرف ہتھیار اور فوجی قوت نہیں، بلکہ قیادت، داخلی نظم، شفافیت اور قومی اتحاد کے ساتھ جڑ کر ہی واقعی مؤثر ہوتی ہے۔

پاکستان کی ان تدابیر کے بعد یقیناً امریکا، بھارت، اسرائیل اور دیگر عالمی طاقتوں نے یہ ضرور سیکھا ہو گا کہ اگر داخلی بنیادیں مضبوط نہ ہوں تو سب وسائل اور ہتھیار بے اثر رہ جاتے ہیں۔ پاکستان کے اقدامات ثابت کرتے ہیں کہ عالمی قوانین اور ریاستوں کی خود مختاری کی پاسداری طاقت کے مراکز کیلئے اولین شرط ہے۔ طاقت کا حقیقی استعمال داخلی نظم، قیادت، شفافیت اور قانون کے دائرے میں رہ کر ہی مؤثر ہوتا ہے۔ پاکستان کی مثال یہ واضح کرتی ہے کہ اگر داخلی بنیادیں مضبوط ہوں تو عالمی دباؤ اور طاقت کے طوفان بھی ناکام رہ جاتے ہیں۔

آخر میں اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ قومیں حجم سے نہیں، حوصلے سے بڑی ہوتی ہیں اور پاکستان کی داستان ابھی ختم نہیں ہوئی، تاریخ کا قلم ابھی حرکت میں ہے۔ یہ تاریخی اور تحقیقی جائزہ واضح کرتا ہے کہ عالمی سلامتی، علاقائی استحکام، اور انسانی حقوق کی حفاظت صرف طاقت یا دھمکی سے ممکن نہیں بلکہ داخلی نظم، قائدانہ بصیرت، قانون اور اخلاق کے مضبوط ستونوں کے ساتھ ہی ممکن ہے۔ طاقت صرف ہتھیار یا اقتصادی دباؤ سے نہیں، بلکہ حکمت، داخلی نظم، قیادت اور شفافیت سے مستحکم ہوتی ہے۔

یاد رہے کہ ریاستیں توپوں سے نہیں، بلکہ اتحاد، اداروں کی مضبوطی اور عوامی اعتماد سے قائم رہتی ہیں۔ پاکستان کی تاریخ، خصوصاً امریکا کے ساتھ تعلقات، ایک ایسا تاریخی باب ہے جو آنے والی نسلوں کیلئے سبق آموز ہے کیونکہ تاریخ خاموش نہیں رہتی۔ آج کے فاتح کل کے محاسبے میں کھڑے ہو سکتے ہیں، اور اصل طاقت وہ ہے جو عدل و انصاف کے ترازو میں قائم رہ سکے۔ پاکستان نے عالمی منظر نامے پر یہ ثابت کیا کہ حقیقی طاقت صرف داخلی استحکام، عوامی وفاداری، اور مضبوط اداروں سے پیدا ہوتی ہے۔ جیسے ایک مضبوط قلعہ اپنی دیواروں اور اندرونی نظام سے ہر حملے کو ناکام بناتا ہے، اسی طرح ایک قوم کی داخلی طاقت، قیادت، اور عوامی وفاداری ہی اسے عالمی طوفانوں سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔ اگر غیر جانبداری کی عینک لگائی جائے تو یہ نتیجہ ناگزیر ہے کہ نائن الیون کے بعد پاکستان ہی وہ واحد ملک ہے جس نے اپنی حکمت عملی سے نہ صرف پاکستان کو امریکی جنگی تباہی سے محفوظ رکھا اور آج بالخصوص مئی کی پاک بھارت جنگ میں اقوام عالم کو اپنی صلاحیتوں سے مہبوت کر دیا اور بھارت جیسا مکار دشمن اسرائیل کی مکمل پشت پناہی کے باوجود اپنے زخم چاٹ رہا ہے بلکہ اس نے تاریخ کا وہ باب بھی رقم کیا ہے جو آنے والی صدیوں تک زیر بحث رہے گا۔

ایک خواب، ایک چیخ، اور ایک امت کا نوحہ

آج کی یہ محفل کوئی رسمی اجتماع نہیں، یہ الفاظ کا کھیل نہیں، یہ وقتی جوش کی آگ نہیں، بلکہ یہ دلوں کے دروازے کھٹکھٹانے کی ایک عاجزانہ کوشش ہے۔ آج میں آپ سے وہ بات کرنے آیا ہوں جو سنی نہیں جاتی، محسوس کی جاتی ہے۔ جو عقل کو نہیں، روح کو جھنجھوڑتی ہے۔ جو صرف کانوں تک نہیں جاتی بلکہ دل کی گہرائیوں میں اتر کر ضمیر کو بے چین کر دیتی ہے۔ آج میں کوئی خبر نہیں سنارہا، نہ ہی تجزیہ کرنے آیا ہوں، آج میں کوئی نعرہ بھی نہیں لگانے آیا بلکہ آج میں آپ کے سامنے ایک خواب رکھنا چاہتا ہوں۔ آج میں آپ سے سوال کرنے آیا ہوں، اور خبر دار، کہ یہ سوال آسان نہیں، یہ سوال آرام دہ نہیں، یہ سوال نیند حرام کر دینے والا ہے۔ آج میں آپ کے سامنے کوئی تقریر نہیں کرنے آیا بلکہ آج میں آپ کے سامنے ایک آئینہ رکھ رہا ہوں، جس میں اگر ہم نے خود کو دیکھ لیا تو شاید ہم چین سے نہ سو سکیں۔

میرے عزیزو! اگر آپ سمجھتے ہیں کہ یہ اجتماع ایک نارمل پروگرام ہے، تو آپ غلط ہیں، یہ ایک احتسابی عدالت ہے اور اس عدالت میں ملزم کوئی اور نہیں ہم خود ہیں۔ آج میں آپ کو کہانی نہیں سناؤں گا، بلکہ خواب سنانے اور اس کے نتائج دکھاؤں گا لیکن ایسا خواب جو دنیا کے لاکھوں مسلمانوں کیلئے ڈراؤنا خواب نہیں، روزمرہ کی حقیقت ہے لیکن ایسا خواب جو دراصل ہماری اجتماعی حقیقت ہے، ایک چیخ جو صدیوں سے دبائی جا رہی ہے، اور ایک نوحہ جو پوری امت کی سانسوں میں گھلا ہوا ہے۔ سوچئے! اگر آج رات آپ کے گھر کی چھت نہ بچے، اگر آپ کے بچوں کے بستروں پر میزائل برسیں، اگر آپ کی ماں کی چیخٹی وی اسکرین تک نہ پہنچے تو کیا تب بھی آپ کہیں گے یہ ہمارا مسئلہ نہیں؟ اس لیے میں آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ چند لمحوں کیلئے دنیا کی آوازوں کو خاموش کر دیجیے، موبائل بند کر دیجیے، دل کو حاضر رکھیے اور ضمیر کو جگا لیجیے کیونکہ آج کی بات سننے کی نہیں، محسوس کرنے کی ہے۔ اور تاریخ کے کٹہرے میں ہم سب کا نام پکارنے والی ہے۔

یہ خطاب غزہ کے بچوں کی طرف سے ہے، یہ فریاد کشمیر کی ماؤں کی طرف سے ہے، یہ آہیں ان یتیموں کی ہیں جنہوں نے اپنے باپ نہیں، صرف کفن دیکھے ہیں اور آج یہ سوال پوری طاقت سے آپ کے ضمیر پر دستک دے رہا ہے کیا ہم واقعی ایک امت ہیں؟

آج میں آپ کے سامنے کوئی سیاسی تقریر کرنے نہیں آیا، کوئی جذباتی نعرہ لگانے نہیں آیا، کوئی وقتی جوش پیدا کرنے نہیں آیا۔ آج میں آپ کے سامنے ایک خواب رکھنے آیا ہوں۔ ایسا خواب جو دراصل ہماری اجتماعی حقیقت ہے۔ ذرا ایک لمحے کیلئے، وہ تمام لوگ جن کے سینوں میں اب بھی دل دھڑکتا ہے، میں آپ سے گزارش کرتا ہوں، بس ایک لمحے کیلئے اپنی آنکھیں بند کر لیجیے۔ اور میرے ساتھ اُس لمحے میں آئیے جہاں ایک فرد نہیں، ایک پوری امت جاگ اٹھی تھی۔ سوچئے، رات کا آخری پہرہ ہے۔ دن بھر کی تھکن کے بعد، خاموشی پورے گھر پر چھائی ہوئی ہے۔ کمرے میں مدھم روشنی ہے، ایسی روشنی جو نیند کو اور گہرا کر دیتی ہے، خاموشی ایسی ہے جیسے وقت رک گیا ہو۔ بچے اپنے بستروں میں گہری نیند سو رہے ہیں۔ ایسی خاموشی کہ اگر سانس ڈراتیز ہو جائے تو خود ہی سنائی دے۔ پرسکون چہروں پر معصوم مسکراہٹیں ہیں، سانسوں کی آمد و رفت زندگی کی علامت بن کر چل رہی ہیں جو زندگی کی سب سے بڑی کامیابی ہوتی ہیں، وہ مسکراہٹیں جو ایک باپ، ایک ماں، ایک دادا، ایک نانا کی زندگی کا سرمایہ ہوتی ہیں اور ایک ناقابل یقین خوشی کی گھڑیاں بھی جب ان کی اولاد بڑے پرسکون انداز میں خوبصورت خوابوں کی طرح، ان کی دعاؤں کی قبولیت کے بدلے میں ان کو دکھائی دے رہی ہوتی ہیں۔

اچانک آنکھ کھلتی ہے۔ اور آنکھ سب سے پہلے بچوں کے چروں کو ڈھونڈتی ہے لیکن جو نظر آتا ہے، وہ خواب نہیں، قیامت کا منظر ہوتا ہے۔ گرد میں اٹے چرے، خون میں تر معصوم صورتیں، زخموں سے چور بدن، ٹوٹا ہوا ملبہ، گرتی ہوئی دیواریں، سرد ہوا میں کانپتا وجود۔ دل چیخنا چاہتا ہے، لیکن چیخ حلق میں پھنس جاتی ہے۔ ہاتھ کانپ رہے ہیں، انگلیاں بچوں کو چھونا چاہتی ہیں، یہ یقین کرنے کیلئے کہ شاید وہ زندہ ہوں لیکن دل ڈر رہا ہے کہ کہیں یہ لمس آخری نہ ہو۔ جسم میں درد ہے، ہڈیاں ٹوٹی ہوئی محسوس ہوتی ہیں، سانس بھاری ہے، مگر ان سب سے بڑھ کر ایک ہی فکر ہے، میرے بچے کہاں ہیں؟

پھر اچانک آنکھ پوری طرح کھلتی ہے۔ کمرہ اپنی جگہ ہے۔ دیواریں سلامت ہیں۔ چھت موجود ہے۔ بچے صبح سلامت ہوتے ہیں، بچے اپنے بستروں میں گہری نیند سو رہے ہیں۔ ان کے چہرے صاف ہیں، پرسکون ہیں، محفوظ ہیں۔ اور اسی لمحے انسان ٹوٹ جاتا ہے۔ چیخ چیخ کر رونے کو دل چاہتا ہے، اس لیے نہیں کہ خواب برا تھا، لیکن جسم بری طرح کانپ رہا ہے۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔ دل کانپنے لگتا ہے۔ ہاتھ خود بخود عاقلانہ اٹھ جاتے ہیں، زبان سے نکلتا ہے یا اللہ یہ تو صرف ایک خواب تھا، پھر دل کہتا ہے یا اللہ کہیں یہ خواب کسی کی حقیقت تو نہیں؟

یہ ایک فرد کا خواب نہیں تھا، یہ کسی فلم کا سین نہیں۔ یہ کسی افسانے کا پلاٹ نہیں۔ یہ غزہ کے باپ کا جاگتا ہوا خواب ہے، یہ غزہ کا جاگتا ہوا نوحہ تھا۔ یہ کشمیر کی ماں کی سسکتی رات ہے۔ یہ شام، یمن، لیبیا، سوڈان کی وہ کہانی تھی جو ہر رات کسی نہ کسی مسلمان کے خواب میں اتر آتی ہے۔ یہ شام، یمن، فلسطین کے بچوں کی روز کی کہانی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں جب آنکھ کھلتی ہے، سب صبح سلامت ہوتے ہیں، بچے گہری نیند سو رہے ہوتے ہیں، کمرہ محفوظ ہوتا ہے، تو احساس ہوتا ہے یہ تو محض ایک خواب تھا، مگر جن کیلئے یہ حقیقت ہے، کیا ان کے بارے میں بھی جانتے ہیں؟

یہ خواب کس کی حقیقت ہے؟ یہ غزہ کے باپ کی حقیقت ہے، جو ہر رات بمباری کے شور میں اپنے بچوں کو سینے سے لگاتا ہے۔ یہ فلسطین کی ماں کی حقیقت ہے جو بچے کو سلاتے وقت یہ نہیں جانتی کہ صبح وہ زندہ ہو گا یا نہیں۔ یہ کشمیر کے اس بچے کی حقیقت ہے جو رات کو سوتے وقت یہ نہیں جانتا کہ صبح آنکھ کھلے گی بھی یا نہیں، یہ خواب ان بچوں کا ہے جنہوں نے کھلونے نہیں، بندوقیں دیکھی ہیں۔ یہ شام، یمن، سوڈان کے ان بچوں کی حقیقت ہے میزائل دیکھے ہیں، یہ ہر اس کونے کی حقیقت ہے جہاں مسلمان ہونا جرم بن چکا ہے۔ ہم خواب دیکھ کر ایک رات نہیں سو جنہوں نے کھلونے نہیں، پاتے، روز، ہر دن۔ جو رات کو سوتے وقت یہ نہیں جانتے کہ صبح آنکھ کھلے گی بھی یا نہیں۔ ہم خواب دیکھ کر لرز جاتے ہیں اور وہ حقیقت جیتے ہیں۔

سوچئے سوال جو دل چیر دیتا ہے، جن والدین کے سامنے یہ سب خواب نہیں، روز کا معمول ہے، جو اپنے بچوں کی کٹی پھٹی لاشیں اٹھائے ادھر سے ادھر بھاگ رہے ہیں، جنہیں نہ دفنانے کا حوصلہ ہے، نہ سینے سے لگانے کی اجازت، ان کے دلوں پر کیا گزرتی ہوگی؟ اگر مصیبت کو چلتا پھرتا دیکھنا ہو تو غزہ کی ویڈیوز دیکھ لیجیے اور اگر درد کو سانس لیتا محسوس کرنا ہو تو فلسطین کی تصاویر کافی ہیں۔ یہ محض جنگ نہیں، یہ انسانیت کے ضمیر کا قتل ہے۔ خاموشی سے بہتا ہوا خون کشمیر بھی چیخ چیخ کر اب بھی پکار رہا ہے۔ وہ تو "ہم ہیں پاکستانی، پاکستان ہمارا ہے" پکارتے ہوئے پاکستانی پرچم میں تہہ خاک ہو گئے اور ہم کہاں کھڑے ہیں؟ قدرت کا ایک اٹل قانون ہے، جب تک مظلوم زندہ ہے، ظالم ظالم ہے۔ اور جب مظلوم بولنا چھوڑ دے، ظالم بے لگام ہو جاتا ہے۔ ہم برسوں سے موت کو رقص کرتے دیکھ رہے ہیں، اور زندگی کو سسکتے ہوئے۔ سوال یہ نہیں کہ ظالم کون ہے، سوال یہ ہے کہ ہم کہاں ہیں؟

ہم یہ سمجھ رہے ہیں کہ شاید خطرہ ٹل گیا ہے۔ ہم یہ سوچ رہے ہیں کہ شاید یہ سب "دور کہیں" ہو رہا ہے لیکن سچ یہ ہے ہم مشکل مرحلے میں نہیں، مشکل دور میں داخل ہو رہے ہیں، یہ کہنا خود کو دھوکہ دینا ہے کہ خطرہ گزر چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ مرحلہ کسی بھی صبح کسی بھی دروازے پر دستک

دے سکتا ہے۔ کون سی سرحد محفوظ ہے؟ کون سا شہر محفوظ ہے؟ کون سا گھر محفوظ ہے؟ آج ہم غزہ پر گرتے ہیں، کل کشمیر میں، اور پرسوں؟ تاریخ گواہ ہے ظلم خاموشی سے رک نہیں جاتا، وہ بڑھتا ہے۔

محمد بن قاسم سے کربلا تک، تاریخ کا آئینہ ہمیں کیا دکھا رہا ہے؟ جب سندھ کی ایک بیٹی کی پکار اور فریاد پر محمد بن قاسم نے سمندر پار کر لیا تھا۔ نہ پاسپورٹ، نہ ویزا، نہ اقوام متحدہ کا انتظار، نہ قراردادوں کا سہارا۔ صرف ایک بات، امت ایک تھی اور کربلا؟ نو اسد رسول ﷺ اور اہل بیت کے ساتھ ظلم اور بربریت کی تاریخ لکھی جا رہی تھی، تو تاریخ پوچھتی ہے اس وقت باقی مسلمان کہاں تھے؟ آج اس سوال کا جواب واضح ہو چکا ہے۔ آج اس سوال کا جواب ہمارے رویوں میں موجود ہے۔ ہم مسلمان ہیں لیکن صرف اپنی سرحدوں تک۔ کبھی تو صرف اپنے گھروں تک اور کبھی صرف اپنے مفادات تک۔

جدید دنیا میں امت کے تصور کا قتل ہماری آنکھوں کے سامنے جاری ہے۔ آج ہمیں سکھایا گیا ہے کہ قوم اہم ہے، امت نہیں۔ سرحد مقدس ہے، انسان نہیں۔ مفاد اولین ہے، اخلاق نہیں، یوں امت کے تصور کو بڑی خاموشی اور نہایت خوبصورتی سے دفن کر دیا گیا۔ آپ اپنی سرحد دیکھیں، ہم اپنی سرحد دیکھیں۔ غزہ جلتا رہے، کشمیر سکستار ہے، ہم اسکرین پر آنسو بہا کر پھر اپنی زندگی میں لوٹ جائیں۔



عالمی طاقتیں اور منافقت کا عریاں چہرہ اب کھل کر سامنے آ گیا ہے۔ ساری دنیا جانتی ہے کون ظالم ہے، کون مظلوم۔ ظالم کو مظلوم بنایا جا رہا ہے مگر پھر بھی امریکا اپنے بحری بیڑوں کے ساتھ اسرائیل کے شانہ بشانہ کھڑا ہے، امریکی وزیر خارجہ خود کو یہودی کہہ کر ظالم کو مظلوم بنا دیتا ہے، جو بائیڈن دھمکیاں دینے پہنچ جاتا ہے، ٹرمپ اسرائیل سے محبت میں تمام حدیں پار کر چکا ہے، برطانیہ، فرانس، سب اس ظلم میں شریک اور ہم؟ ہم کرکٹ میں مصروف ہیں۔ ہم اقتدار کی رسہ کشی میں الجھے جاتے ہیں، غزہ میں سب ہیں۔ یوکرین میں بجلی بند ہو تو انسانی حقوق یاد آ کچھ مٹا دیا جائے تو خاموشی کیونکہ شاید مسلمان انسان ہی نہیں سمجھے جاتے

یہاں سب سے زیادہ شرمناک بات دشمن کی طاقت نہیں، بلکہ اصل المیہ ہماری بے حسی اور یہ بزدلانہ رویہ تاریخ میں لکھا جا چکا ہے۔ ہم کھیل میں مصروف ہیں، ہم اپنے ہاں بڑی بڑی اسکرینوں پر کرکٹ سے لطف اندوز ہو رہے تھے، اپنے پسندیدہ کھلاڑیوں کے چوکوں چھکوں پر خوشی اور دیوانگی میں ناچ رہے تھے، مخلوط پارٹیوں میں بے ہنگم ڈانس کر کے اپنے کھلاڑیوں کو داد و تحسین فراہم کر رہے تھے، یا ہم ہم اقتدار کی لڑائی میں الجھے ہوئے ہیں۔ سوشل میڈیا پر جھوٹ، بد تمیزی، فریب، میں قوم کے نوجوانوں کو گمراہ کر کے دشمن کے ایجنڈے پر عمل پیرا ہیں، بغیر تحقیق کے ہر قسم کے جھوٹ کو آگے پھیلا کر تفرقہ کی آگ کو پھیلانے میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔

یہ خاموشی، یہ بزدلی، یہ بے حسی یہ سب تاریخ میں لکھا جا چکا ہے۔ اور آنے والی نسلیں ہم سے سوال کریں گی جب امت جل رہی تھی، آپ کیا کر رہے

تھے؟ جب ٹرائیکا غزہ، کشمیر اور دیگر مسلمانوں کو گاجر مولیٰ کی طرح کاٹ رہے تھے تو آپ کہاں تھے؟ متعصب ہندو مودی نے تو اپنے مربی اسرائیل کی مدد اور غزہ کے معصوم، بے گناہ بچوں، عورتوں بوڑھوں اور نوجوانوں کو تہ تیغ کرنے کیلئے، ان کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کیلئے اپنے ہاں سے ایک ملین سے زیادہ ریٹائرڈ فوجی اور دیگر افراد کو بھیجا تھا تو تم کہاں تھے؟ قیامت کے دن یہ عذر قبول نہیں ہوگا کہ سرحدیں دور تھیں، ذمہ داری زیادہ تھی۔ ہم کمزور تھے۔

میں نے جن مصائب، ظلم و ستم، بے انصافی کا آپ سب کے سامنے تذکرہ کیا ہے، اس سے آپ پہلے بھی بخوبی واقف تھے اور یہ جانتے ہیں کہ میں نے کوئی نئی یا عجیب و غریب کہانی آپ کے سامنے بیان نہیں کی، ہم ہر روز اسے میڈیا میں سنتے اور پڑھتے ہوئے دیکھ رہے ہیں اور اپنی بے بسی کا بھی ہمیں علم ہے لیکن کیا ہم خود کو اور اپنے بچوں اور آنے والی نسل کیلئے ورثہ میں مایوسی اور غلامی کے پہاڑ چھوڑ کر جائیں گے؟ یہ فیصلہ اب ہمیں خود کرنا ہے۔ ہمیں اس کا حل خود تلاش کرنا ہے، کوئی باہر سے آکر ہمارے آنسو نہیں پونچھے گا۔

یاد رکھیں اس کا حل نہ نیٹو میں ہے نہ اقوام متحدہ میں، اور نہ ہی عالمی طاقتوں کے وعدوں میں حل ہے۔ اس کا واحد اور فقط حل وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا میں ہے۔ قرآن ہمیں اتحاد سکھاتا ہے، سنت ہمیں قربانی سکھاتی ہے، اور سیرت ہمیں جرات۔ جب امت ایک ہو تو بدر بھی جنت لیتی ہے اور جب بکھر جائے تو کربلا تہارہ جاتا ہے۔

امت مسلمہ سے شاید یہ آخری پکار آرہی ہے کہ یہ وقت تماشائی بننے کا نہیں، یہ وقت تقریروں کا نہیں، یہ وقت خود احتسابی کا ہے۔ اپنے ایمان کو جگائیے۔ اپنے ضمیر کو زندہ کیجیے۔ فرقوں، قومیتوں، مفادات سے اوپر اٹھیے۔ کیونکہ اگر آج ہم نہ جاگے تو کل یہ خواب ہماری حقیقت بن جائے گا۔

یہ جو کچھ آپ نے سنا، یہ محض ایک خطاب نہیں تھا، یہ تاریخ کا نوحہ تھا جو آج کی زبان میں آپ سے ہم کلام ہوا۔ یہ سوال اب صرف غزہ کا نہیں، یہ سوال صرف کشمیر کا نہیں، یہ سوال صرف فلسطین، شام، یمن یا سوڈان کا نہیں، یہ سوال ہم سب کا ہے۔ تاریخ کا قلم رکنا نہیں، وہ لکھتا ہے اور آنے والی نسلیں ہم سے پوچھیں گی جب امت لہو میں ڈوبی ہوئی تھی تو تم کہاں تھے؟ جب بچوں کے کفن چھوٹے پڑ گئے تھے تو تم کس اسکرین پر مصروف تھے؟ جب قبلہ اول جل رہا تھا تو تم کس مفاد کی حفاظت کر رہے تھے؟ جب سرینگر، شویپاں، جموں اور راجوری میں مظلوم کشمیری "ہم ہیں پاکستانی اور پاکستان ہمارا ہے" کے نعرے لگانے کی پاداش میں گولیوں سے بھون دیئے گئے تھے، تو تم ہمیں کیوں بھول گئے؟

یاد رکھیے قیامت کے دن نہ پاسپورٹ کام آئے گا نہ قومیت، نہ جھنڈے، نہ اتحادوں کی رکنیت۔ وہاں صرف یہ پوچھا جائے گا کہ تم نے مظلوم کے ساتھ کیا کیا؟ آج بھی وقت ہے، لیکن وقت بہت کم ہے۔ یہ گھڑی تماشائی بننے کی نہیں، یہ گھڑی خود احتسابی کی ہے، یہ گھڑی لوٹ آنے کی ہے، اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لینے کی ہے۔ قرآن آج بھی وہی ہے، سنت آج بھی وہی ہے، قبلہ آج بھی ایک ہے، فرق صرف یہ ہے کہ ہم بکھر چکے ہیں۔

آئیے آج عہد کریں کہ ہم خبر پر نہیں، حق پر کھڑے ہوں گے، ہم مفاد پر نہیں، ایمان پر فیصلہ کریں گے، ہم خاموشی نہیں، ذمہ داری کو ورثہ بنائیں گے۔ آج تاریخ ہماری طرف دیکھ رہی ہے اور تاریخ کے ہاتھ میں کوئی سفید کاغذ نہیں بلکہ فیصلے کا قلم ہے۔ یاد رکھنا تاریخ یہ نہیں لکھے گی کہ تم نے کیا کہا، تاریخ یہ لکھے گی کہ تم نے کیا کیا؟ آج اگر ہم نے خاموشی کو چنانچہ توکل ہماری خاموش قبروں سے ہمارے بچے سوال کریں گے، جب امت کٹ رہی تھی تو آپ کہاں تھے؟ آج پھر وقت پکار رہا ہے۔ یا تو ہم اپنے اپنے ایمان کا بوجھ اٹھائیں یا تاریخ ہمیں بزدل قوم کے نام سے یاد رکھے گی۔ اگر آج ہم نے اپنے

دلوں کو نہ جگایا تو کل یہ خواب ہمارے گھروں کی حقیقت بن جائے گا۔ یہ وقت ٹوٹ کرنے کا نہیں، یہ وقت صرف اسٹیٹس لگانے کا نہیں، یہ وقت آنسو بہانے کا نہیں، یہ وقت کھڑا ہونے کا ہے۔ یہ وقت ہے قوم، نسل، زبان، پارٹی سب کو ایک طرف رکھ کر صرف ایک پہچان اپنانے کا کہ میں مسلمان ہوں۔

اب تقریر ختم ہو رہی ہے لیکن یاد رکھنا فیصلہ اب شروع ہو رہا ہے۔ آج یہ محفل ختم ہوگی، کرسیاں خالی ہو جائیں گی، اسٹیج خاموش ہو جائے گا لیکن سوال باقی رہے گا: کیا ہم نے صرف سنا؟ یا ہم بدلنے کا ارادہ لے کر اٹھ رہے ہیں؟ آج امت کو ایک اور تقریر نہیں چاہیے، امت کو ایک اور بیدار ضمیر چاہیے۔ امت کو تالیاں نہیں چاہئیں، امت کو کھڑے ہونے والے نوجوان چاہئیں۔ یاد رکھو قومیں اس دن مرتی ہیں جس دن ان کے نوجوان ظلم پر خاموش ہو جائیں اور قومیں اس دن زندہ ہوتی ہیں جس دن ان کے نوجوان حق کیلئے کھڑے ہو جائیں۔

میرے نوجوانو! اگر آج بھی تم نے یہ کہہ کر خود کو بچا لیا کہ ہم مجبور ہیں تو یاد رکھنا کل تمہارے بچے تمہاری قبروں پر کھڑے ہو کر تمہیں مجرم کہیں گے۔ یہ وقت ہے ڈر کو دفن کرنے کا، یہ وقت ہے خاموشی کو توڑنے کا، یہ وقت ہے سوشل میڈیا کے مجاہد نہیں، عمل کے سپاہی بننے کا۔ یہ وقت ہے فرقوں سے اوپر اٹھنے کا، قومیتوں سے باہر آنے کا، پارٹیوں، مفادات، عہدوں سے نکل کر صرف ایک پہچان اپنانے کا، ہم مسلمان ہیں اس لیے بے حس نہیں ہو سکتے، اس لیے مظلوم کو تنہا نہیں چھوڑ سکتے۔ ہم مسلمان ہیں اس لیے حق کے بغیر زندہ رہنا ہمیں قبول نہیں۔

اگر آج ہم نے اپنے ضمیر کو نہ جگایا تو یاد رکھنا یہ آگ جو آج غزہ میں جل رہی ہے، جس کے شعلے مقبوضہ کشمیر کے خوبصورت چناروں کی انسانی بستیوں کو جلا کر رکھ رہے ہیں، کل ہمارے دروازوں پر ہوگی۔ یہ خون جو آج فلسطین میں بہہ رہا ہے، کل ہماری گلیوں میں ہوگا اور متعصب ہندو جو بارہا اپنے ناپاک سندھ کو مسلمان پاکستانیوں کے پاکیزہ خون سے سجانا چاہتا ہے، وہ اپنی سازشوں پر شب و روز عمل درآمد کر رہا ہے۔ ہمیں اپنے عمل سے جواب دینا ہے کہ اگر معاملہ یہاں نہ رکا تو پھر جوابی وار سے نہ کوئی اقوام متحدہ بچے گی، نہ کوئی سپر پاور اور نہ کوئی معاہدہ۔ آج بھی وقت ہے، آج بھی موقع ہے، آج بھی رب موجود ہے اور قرآن آج بھی یہی کہہ رہا ہے: **وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا**

آئیے اس لمحے، اس مجمع میں، اس اسٹیج کے سامنے ہم اللہ سے عہد کریں:

اے اللہ، ہمیں تماشائی نہ بنانا، ہمیں بزدل نہ بنانا، ہمیں خاموش قوم نہ بنانا، ہمیں وہ نوجوان بنا جو حق کیلئے کھڑے ہوں، جو ظلم کے سامنے جھکیں نہیں، جو امت کا بوجھ اٹھانے سے نہ ڈریں۔ ہماری بے حسی کو بیداری میں بدل دے، ہماری کمزوری کو اتحاد میں بدل دے، ہماری خاموشی کو جرات میں بدل دے، اور ہمیں پھر سے ایک امت بنادے، تماشائی قوم نہیں، بلکہ حق کی گواہ قوم اور مجاہد حق بنادے، ہمیں بکھری ہوئی بھیڑ نہیں، ہمیں خاموش نہیں سچ بولنے والا بنادے۔

اے اللہ اگر تاریخ ہمیں پکارے تو ہمیں شرمندہ نہ ہونا پڑے بلکہ ہم سینہ تان کر کہہ سکیں یا اللہ ہم سوئے نہیں تھے، ہم کھڑے تھے:

اَللّٰهُمَّ اَشْهَدُ، اَللّٰهُمَّ اَشْهَدُ، اَللّٰهُمَّ اَشْهَدُ

آمین یا رب العالمین۔

حریم سے عالم اسلام تک: ایک دفاعی عہد

تاریخ کے صفحات گواہ ہیں کہ جب قومیں اپنے وجود کے دفاع کیلئے باہمی اعتماد اور مشترکہ بصیرت کی بنیاد رکھتی ہیں تو محض معاہدے نہیں بنتے، بلکہ تاریخ کے دھارے بدلتے ہیں۔ بین الاقوامی تعلقات کی تاریخ میں یہ اصول مسلمہ ہے کہ انفرادی سلامتی کبھی پائیدار نہیں ہوتی جب تک اجتماعی سلامتی کا حصار موجود نہ ہو۔ پاکستان اور سعودی عرب کے مابین طے پانے والا حالیہ دفاعی معاہدہ اسی نوع کی ایک غیر معمولی پیش رفت ہے، جس کے ریاستوں کے تحت کسی ایک ملک کے خلاف جارحیت کو دونوں ریاستوں کے خلاف جارحیت تصور کیا جائے گا۔ یہ شق محض الفاظ کا مجموعہ نہیں بلکہ دو مابین مشترکہ تقدیر کا اعلان ہے۔ یہ شق محض دفاعی نہیں بلکہ سیاسی، نفسیاتی اور اسٹریٹجک ڈیٹرنس رکھتی ہے جو دشمن کے حملے کو سوار سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔

پاکستان اور سعودی عرب کے درمیان طے پانے والا یہ اسٹریٹجک دفاعی معاہدہ اسلامی دنیا میں اجتماعی سلامتی کے تصور کی جانب ایک غیر معمولی پیش رفت ہے۔ یہ معاہدہ نہ صرف دوطرفہ دفاعی تعاون کو ادارہ جاتی شکل دیتا ہے بلکہ خطے میں طاقت کے توازن، مسلم ریاستوں کی خود مختاری، اور عالمی سلامتی کے بدلتے ہوئے منظر نامے میں ایک نئے اجتماعی مسلم سکیورٹی فریم ورک کی بنیاد رکھتا ہے۔ پاکستان اور سعودی عرب کے مابین طے پانے والا دفاعی معاہدہ اسی اصول کی عملی تعبیر ہے، جس کے تحت کسی ایک ملک کے خلاف جارحیت کو دونوں ممالک کے خلاف جارحیت تصور کیا جائے گا۔ آنے والے دنوں میں ترکیہ اور ایران کی ممکنہ شمولیت اس اتحاد کو ایک وسیع تر اسلامی دفاعی معاہدہ میں تبدیل کر سکتی ہے۔

قومی سلامتی سے اجتماعی سلامتی تک کے اس سفر کا آغاز ایک مشترکہ دفاعی اصول کی طرف گامزن ہونے کی وجہ یہ ہے کہ عالمی سلامتی کا نظام اس وقت شدید عدم توازن کا شکار ہے۔ مشرق وسطیٰ میں جاری تنازعات، غزہ میں انسانی بحران، جنوبی ایشیا میں ایٹمی کشیدگی، مسلم ریاستوں پر سیاسی و عسکری دباؤ نے اسلامی دنیا میں ایک ایسے اجتماعی دفاعی ماڈل کی ضرورت کو اجاگر کیا ہے جو نیٹو کی طرز پر ہو مگر عالمی سیاسی بالادستی سے آزاد ہو۔

پاکستان اور سعودی عرب کے مابین طے پانے والا دفاعی معاہدہ اس اصول پر مبنی ہے کہ کسی ایک ریاست کے خلاف جارحیت کو اجتماعی جارحیت تصور کیا جائے گا۔ یہ تصور جدید عالمی سلامتی کے نظام میں ایک تسلیم شدہ حقیقت کی شکل میں سامنے آچکا ہے جیسے نیٹو آرٹیکل 5 کی واضح شق نہ صرف عسکری تحفظ فراہم کرتی ہے بلکہ دشمن قوتوں کیلئے مشترکہ اسٹریٹجک ڈیٹرنس بھی پیدا کرتی ہے۔

سعودی ولی عہد شہزادہ محمد بن سلمان اور وزیراعظم پاکستان میاں محمد شہباز شریف کے دستخطوں سے وجود میں آنے والا یہ اسٹریٹجک باہمی دفاعی معاہدہ اس عزم کا مظہر ہے کہ دونوں ممالک اپنے تاریخی تعلقات کو رسمی دوستی سے نکال کر عملی دفاعی شراکت داری کی سطح پر لے آئے ہیں۔ یہ وہ لمحہ ہے جہاں سفارت کاری نے عسکری بصیرت سے ہاتھ ملایا ہے۔ ولی عہد محمد بن سلمان اور وزیراعظم شہباز شریف کے مابین اسٹریٹجک ہم آہنگی نے اس معاہدے کو محض علامتی نہیں بلکہ ایک عملی حقیقت میں تبدیل کیا ہے۔ اعلیٰ سطح کی قیادت میں یہ فیصلہ علاقائی عدم استحکام، بڑھتے ہوئے جیو پولیٹیکل خطرات اور مسلم دنیا کے خلاف بڑھتے ہوئے دباؤ کے تناظر میں ایک پیشگی اسٹریٹجک عملی اقدام کے طور پر سمجھا جا رہا ہے۔



ولی عہد محمد بن سلمان اور وزیراعظم شہباز شریف کی قیادت میں طے پانے والا یہ معاہدہ اس حقیقت کا اعلان ہے کہ اسلامی دنیا میں اب محض ردِ عمل نہیں بلکہ پیش بندی کا شعور جنم لے چکا ہے۔ یہ وہ لمحہ ہے جب قیادت نے وقتی سفارتی مصلحت کی بجائے طویل المدتی سلامتی کو ترجیح دی ہے۔ پاک سعودی دفاعی معاہدہ اس اصول پر قائم ہے کہ کسی ایک ریاست کے خلاف جارحیت، دونوں کے خلاف جارحیت تصور ہوگی۔ یہ شق نیٹو کی آرٹیکل 5 سے مماثلت رکھتی ہے اور مشترکہ دفاعی ردِ عمل کے طور پر ممکنہ جارح قوتوں کیلئے مشترکہ ڈیٹرس پیدا کرتی ہے۔

یہ معاہدہ نہ صرف دونوں ممالک کی قومی سلامتی کو مضبوط بنانے کا ذریعہ ہے بلکہ خطے

اور دنیا میں امن کے قیام کیلئے مشترکہ ارادے کی عکاسی بھی کرتا ہے۔ اس کا بنیادی مقصد دفاعی تعاون کو فروغ دینا اور کسی بھی ممکنہ جارحیت کے خلاف مشترکہ تحفظ کو موثر بنانا ہے۔ یوں یہ معاہدہ طاقت کے توازن کو جارحیت کی بجائے امن کے حق میں موڑنے کی ایک سنجیدہ کوشش ہے۔

اس معاہدے کا بنیادی مقصد دفاعی تعاون کو ادارہ جاتی شکل دینا، مشترکہ خطرات کے خلاف متحدہ ردِ عمل، خطے اور دنیا میں امن کے قیام میں فعال کردار ادا کرنا ہے۔ یہ تصور بعینہ وہی ہے جو یورپ نے دوسری جنگ عظیم کے بعد نیٹو کی صورت میں اختیار کیا تھا۔ پاک سعودی دفاعی معاہدے کے بھی بنیادی مقاصد اور کلیدی اہداف میں یہ شامل ہے کہ مشترکہ خطرات کے خلاف دونوں ممالک دفاعی تعاون کی ادارہ جاتی تشکیل کرتے ہوئے خطے اور عالمی سطح پر امن و استحکام میں مشترکہ کردار ادا کریں گے۔ یہ اہداف اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ معاہدہ صرف دو طرفہ نہیں بلکہ یہ ریجنل سیکورٹی فریم ورک کی بنیاد بھی فراہم کرتا ہے۔

معاہدے کے بنیادی اہداف میں دفاعی تعاون کو رسمی اور مستقل ڈھانچے میں تبدیل کرنا، موجودہ اور مستقبل کے خطرات کے خلاف مشترکہ تیاری، علاقائی اور عالمی امن کیلئے مشترکہ کردار، عسکری، انٹیلی جنس اور دفاعی صنعت میں تعاون مہیا کرنا ہے۔ یہ اہداف اسے محض دفاعی نہیں بلکہ مشترکہ اسٹریٹجک دفاعی معاہدہ کی شکل منسلک کر گیا ہے۔

مشترکہ اعلامیے میں واضح کیا گیا کہ پاکستان اور سعودی عرب کی شراکت داری کوئی وقتی مفاد نہیں بلکہ آٹھ دہائیوں پر محیط ایک مستحکم، آزمودہ اور بااعتماد تعلق ہے۔ مشترکہ اسٹریٹجک مفادات، قرہبی دفاعی تعاون اور عالمی چیلنجز کے تناظر میں یہ معاہدہ دونوں ممالک کی سلامتی اور عالمی امن کیلئے مشترکہ عزم کی توثیق کرتا ہے۔ آٹھ دہائیوں پر محیط شراکت داری محض سفارتی نہیں بلکہ عسکری تربیت، دفاعی مشاورت، خفیہ تعاون پر مبنی رہی ہے۔ یہ معاہدہ اسی تاریخی رشتے کو قانونی و اسٹریٹجک تحفظ فراہم کرتا ہے۔ یہ معاہدہ ایک مضبوط اور طویل المدتی طویل شراکت داری کو ایک قابل اعتماد بھائی چارے کی بنیاد بھی فراہم کرتا ہے جہاں اقوام عالم کو یہ پیغام دینا بھی مقصود ہے کہ پاکستان حرمین کی حفاظت کو نہ صرف اپنا ایمان سمجھتا ہے بلکہ اسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی خوشنودی کا وسیلہ بھی سمجھتا ہے۔

یہ معاہدہ پاک۔ سعودی اسٹریٹجک شراکت داری کی گہرائی اور دفاعی تعاون کی مضبوطی کا عملی ثبوت ہے۔ پاکستانی عسکری قیادت، بالخصوص آرمی چیف

فیلڈ مارشل سید عاصم منیر، نے معاہدے کو عملی شکل دینے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اس معاہدے کے بعد پاکستان حرمین شریفین کے تحفظ میں باضابطہ شراکت دار، اسلامی دنیا میں ایک ذمہ دار سکیورٹی ریاست کے طور پر بھی ابھر رہا ہے۔ اس معاہدے کے بعد پاکستان، حرمین شریفین کے تحفظ میں سعودی عرب کا باقاعدہ دفاعی شراکت دار بن گیا ہے۔ اور یہ اعزاز تاریخ میں کم ہی کسی غیر عرب ریاست کو حاصل ہوا ہے۔ یہ کردار پاکستان کو اسلامی دنیا میں ایک مرکزی دفاعی ستون بناتا ہے اور یہ ذمہ داری محض عسکری نہیں بلکہ عقیدتی، تہذیبی اور تاریخی ہے۔

پاک سعودی دفاعی معاہدہ کے علاقائی اور عالمی مضمرات کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ یہ معاہدہ مشرق وسطیٰ میں طاقت کے توازن کو مستحکم کرتا ہے، جنوبی ایشیا میں سکیورٹی ڈائنامکس پر اثر انداز ہوتا ہے۔ مسلم ریاستوں کو مغربی عسکری انحصار سے جزوی آزادی دیتا ہے۔ مشہور زمانہ عالمی ادارہ بوم برگ اور دیگر عالمی ذرائع کے مطابق، اگر ترکیہ اس اتحاد میں شامل ہوتا ہے تو یہ مشرق وسطیٰ سے آگے تک طاقت کے توازن کو متاثر کرے گا۔

اعلامیہ کے مطابق موجودہ اور مستقبل کے خطرات و چیلنجز کے پیش نظر یہ معاہدہ دفاعی تیاریوں، انضمام اور عملی ہم آہنگی کو فروغ دے گا۔ اس کے نتیجے میں دونوں ممالک اپنی علاقائی سالمیت اور سلامتی کو لاحق کسی بھی خطرے کا مشترکہ طور پر مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ یہ معاہدہ موجودہ و آئندہ خطرات، روایتی جنگ، ہائبرڈ وار، سائبر وار، میزائل ٹیکنالوجی، ڈرون ٹیکنالوجی علاقائی عدم استحکام اور ان سب کے مقابلے کیلئے ناگزیر دفاعی تیاری، انضمام اور مشترکہ منصوبہ بندی کی بنیادیں فراہم کرتا ہے۔ ایران اور ترکیہ کی جانب سے معاہدے میں شمولیت کی خواہش اور دلچسپی اس امر کی علامت ہے کہ مسلم دنیا میں اجتماعی دفاعی خلا کا ادراک بڑھ چکا ہے۔ ترکیہ کی شمولیت نیٹو تجربے اور دفاعی صنعت کی بدولت اتحاد کو تکنیکی اور آپریشنل برتری دے سکتی ہے۔ اس تناظر میں یہ نکتہ بھی بہت اہم ہے کہ او آئی سی کو محض سفارتی نہیں بلکہ عسکری ستون کی ضرورت ہے۔

معاہدے کی شقوں کے تحت کسی بھی ملک پر بیرونی مسلح حملہ دونوں ریاستوں پر حملہ تصور ہوگا، جہاں یہ شق نیٹو اتحاد کے آرٹیکل فائیو سے مشابہ ہے، وہاں اسلامی دنیا کے تناظر میں اس کی معنویت کہیں زیادہ گہری ہے۔ دہائیوں پر محیط مشترکہ فوجی تربیت، کثیرالجہتی مشقیں اور دفاعی صنعتی تعاون اس معاہدے کی مضبوط بنیاد ہیں۔

یہ معاہدہ عملی طور پر نیٹو کے اجتماعی دفاعی تصور کی اسلامی تعبیر کے اسلامی تناظر میں منطبق ہوتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ نیٹو مغربی سیاسی و معاشی مفادات کا محافظ ہے اور یہاں اسلامی دفاعی اتحاد امت کے وجود، خود مختاری اور مقدمات کا تحفظ کا محافظ ہو سکتا ہے۔ یہ وہ خلا ہے جسے یہ معاہدہ پُر کرنے کی بنیاد رکھتا ہے۔ یہ تقابل اس معاہدے کی معیاری قانونی حیثیت کو مضبوط کرتا ہے۔ تاریخی تجربہ بتاتا ہے کہ نیٹو یورپ کے اجتماعی دفاع کا ضامن بنا، سیٹو اور سیٹو امریکی مفادات کیلئے تشکیل دیے گئے۔ پاک۔ سعودی معاہدہ پہلی بار ایک مسلم۔ مرکوز دفاعی تصور پیش کرتا ہے جو خود مختاری، مقدمات اور امت کے اجتماعی مفاد پر مبنی ہے۔

یہ دفاعی معاہدہ پاکستان اور سعودی عرب دونوں کیلئے سکیورٹی، معیشت اور سفارت کاری کے میدان میں غیر معمولی فوائد کا حامل ہے۔ اس کے تحت کسی ایک ملک کی دفاعی طاقت دوسرے ملک کے تحفظ کیلئے بھی موجود ہوگی۔ یوں گویا دونوں ممالک ایک دوسرے کی ڈھال بن گئے ہیں۔ سکیورٹی، معیشت اور سفارت کاری کے باہمی ربط کو مضبوط بنانے کیلئے مشترکہ دفاع، سرمایہ کاری کا تحفظ، توانائی راہداریوں کی سلامتی، عالمی سفارت کاری کے باہمی انحصار کو بڑھاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نیٹو ممالک میں جنگ کم اور معیشت مضبوط رہی۔ اس دفاعی معاہدہ کے پالیسی مضمرات کا یہ بھی ایک نمایاں

پہلو ہے کہ مسلم ممالک کیلئے دفاعی خود اعتمادی کا ماڈل بن سکتا ہے، غزہ فلسطین اور کشمیر جیسے بحرانوں میں عملی ڈیٹرس فراہم کر سکتا ہے، عالمی طاقتوں کے ساتھ مذاکرات میں مسلم ریاستوں کا وزن بڑھا سکتا ہے۔

یاد رہے کہ الیمامہ پیلس میں ولی عہد محمد بن سلمان نے وزیراعظم شہباز شریف کا پرتپاک استقبال کیا۔ دونوں ممالک کے وفود کی موجودگی میں باضابطہ مذاکرات ہوئے، جن میں شاہ سلمان بن عبدالعزیز کیلئے نیک تمنائوں کا اظہار کیا گیا اور تاریخی واسٹریٹجک تعلقات کا جامع جائزہ لیا گیا۔ مشترکہ دلچسپی کے متعدد اہم امور پر تفصیلی گفتگو ہوئی۔ الیمامہ پیلس میں ہونے والے مذاکرات نے واضح کیا کہ دونوں ممالک کا اعتماد شخصیات سے بڑھ کر اداروں تک پہنچ چکا ہے۔ مشترکہ مفادات اب تحریری معاہدوں میں محفوظ ہو رہے ہیں اور اب تحریری اور قانونی ضمانتوں میں ڈھل رہے ہیں۔ یہ پالیسی تسلسل کی علامت ہے۔

تاہم یہ بات ذہن نشین رہے کہ دشمن قوتیں کبھی بھی مسلم ممالک کے دفاعی معاہدوں کو کامیاب ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتے اور اس ضمن میں یقیناً مسلم ممالک کو بھی اہم چیلنجز اور خدشات کا سامنا بھی ہے اور مسلم دنیا کو داخلی سیاسی اختلافات، عالمی طاقتوں کا ممکنہ دباؤ اور اتحاد کی ادارہ جاتی ہم آہنگی کیلئے ان چیلنجز سے نمٹنے کیلئے شفاف، قانونی اور تدریجی حکمت عملی بھی ناگزیر ہے۔

اب ایران نے بھی اس دفاعی معاہدے میں شمولیت کی خواہش ظاہر کر دی ہے۔ ایرانی پارلیمنٹ کے اسپیکر محمد باقر نے پاکستان کے دورے کے دوران کہا کہ اس معاہدے میں ایران کو بھی شامل کیا جانا چاہیے، اور او آئی سی کو نیٹو کی طرز پر اسلامی ممالک کی مشترکہ فوج تشکیل دینی چاہیے۔ ایرانی پارلیمنٹ کے اسپیکر کی پیشکش اس امر کی عکاسی کرتی ہے کہ مسلم دنیا میں دفاعی خلا کا شعور بڑھ رہا ہے اور او آئی سی کو عسکری ستون کی ضرورت ہے۔ ایران کی شمولیت اتحاد کو پان اسلامک سیکورٹی بلاک میں بدل سکتی ہے۔

ایرانی پارلیمنٹ کے اسپیکر کی پیشکش اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ امت کو ٹکڑوں میں بانٹ کر محفوظ نہیں رکھا جاسکتا اور مشترکہ دفاع اب ناگزیر ہو چکا ہے۔ یہ تجویز اگر آگے بڑھی تو او آئی سی کو عسکری روح مل سکتی ہے۔ پاک-سعودی دفاعی معاہدہ اسلامی دنیا کیلئے ایک اسٹریٹجک مثال، اجتماعی سلامتی کی سمت پہلا عملی قدم، مستقبل کے مسلم دفاعی اتحاد کی بنیاد ہے۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ اتحاد کو کثیر جہتی بنانے کیلئے مشترکہ عسکری مشقیں اور کمان اسٹرکچر تشکیل دیا جائے اور او آئی سی کے تحت ایک دفاعی فریم ورک پر غور کیا جائے کیونکہ اجتماعی دفاع محض عسکری بندوبست نہیں بلکہ سیاسی خود مختاری، اخلاقی وقار اور عالمی توازن کا ضامن ہوتا ہے۔

ایرانی اسپیکر نے زور دیا کہ اسلامی ممالک، خصوصاً پاکستان، فلسطینیوں کے تحفظ اور آمد کیلئے اپنی افواج غزہ بھیجیں، اور کوئی ایسا اقدام نہ کیا جائے جو اسرائیلی تسلط کو مزید تقویت دے۔ غزہ اور کشمیر میں جاری مظالم نے ثابت کیا کہ محض بیانات اور سفارتی مذمت ناکافی ہیں، اجتماعی دفاعی طاقت عسکری ڈیٹرس ہی حقیقی ڈیٹرس فراہم کر سکتی ہے جو مظلوم کو بچا سکتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں اسلامی دفاعی اتحاد کی اخلاقی حیثیت پر کھی جائے گی اور یہ مسئلہ اسلامی دفاعی اتحاد کی اخلاقی بنیاد کو مضبوط کرتا ہے۔ محمد باقر نے اس امر کا اعتراف کیا کہ اسرائیلی جارحیت کے دوران پاکستان نے جس طرح ایران کا ساتھ دیا، وہ ایرانی قوم کبھی فراموش نہیں کرے گی۔ ان کے مطابق پاکستان امت مسلمہ کیلئے ایک قیمتی اثاثہ ہے۔ پاکستان اور ایران مشترکہ چیلنجز سے دوچار ہیں جن کا مقابلہ مل کر کیا جاسکتا ہے جبکہ طب، توانائی اور بیکاری سمیت متعدد شعبوں میں تعاون کے وسیع امکانات موجود ہیں۔

ایران کی جانب سے پاکستان کے کردار کا اعتراف اس بات کا ثبوت ہے کہ اب پاکستان توازن، عقل اور مزاحمت کی علامت بن چکا ہے۔ پاکستان خطے میں ہی نہیں بلکہ عالمی طور پر بھی ایک مضبوط اور متوازی طاقت کے طور پر تسلیم کیا جا چکا ہے اور ایران اب خطے میں پاک سعودی دفاعی تعاون میں کثیر جہتی شرکت کا متنبی ہے۔

ایک اور اہم پیش رفت کے تحت ترکیے نے بھی پاک۔ سعودی دفاعی اتحاد میں شمولیت کی خواہش ظاہر کر دی ہے۔ عالمی خبر رساں ادارے بلوم برگ کے مطابق، پاکستان، ترکیے اور سعودی عرب پر مشتمل دفاعی اتحاد مشرق وسطیٰ ہی نہیں بلکہ اس سے آگے تک طاقت کے توازن کو تبدیل کر سکتا ہے۔ ترکیہ جدید عسکری ٹیکنالوجی، نیو تجربہ، جدید دفاعی صنعت، جغرافیائی رسائی و اہمیت کے ساتھ اگر اس اتحاد میں شامل ہوتا ہے تو مشرق وسطیٰ، جنوبی ایشیا اور بحیرہ روم میں طاقت کا توازن یکسر بدل سکتا ہے۔ ترکیے کی شمولیت طاقت کے توازن میں عالمی اسٹریٹجک وزن کے باعث تاریخی تبدیلی فراہم کر سکتی ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ سیٹو اور سینو امریکی دفاع کیلئے تشکیل دیئے گئے، یورپ نے نیٹو کے ذریعے خود کو محفوظ کیا تو یہ سوال اب ناگزیر ہو گیا ہے کیا اسلامی دنیا کو اپنے دفاع کا حق حاصل نہیں؟ کیا اسلامی دنیا اپنے اجتماعی دفاع کی حقدار نہیں؟ یہ معاہدہ اسی سوال کا عملی جواب ہے۔ بلوم برگ کے مطابق، ترکیے کو اس دفاعی اتحاد میں شامل کرنے کیلئے تینوں ممالک کے درمیان معاہدہ جلد طے پانے کا امکان ہے۔ اگر ایسا ہوا تو یہ اتحاد محض عسکری ہلاک نہیں بلکہ امت مسلمہ کی اجتماعی خود داری، خود انحصاری اور دفاعی وحدت کی علامت بن جائے گا۔ اگر پاکستان، سعودی عرب، ترکیہ اور ایران ادارہ جاتی دفاع، مشترکہ کمان، مشترکہ مشقیں قائم کر لیتے ہیں تو یہ اتحاد جنگ روکنے کا ذریعہ، امن قائم رکھنے کی قوت، امت کے وقار کی ضمانت بن سکتا ہے اور یہ اتحاد مستقبل کی سمت اسلامی مشترکہ دفاعی ڈھانچے کی صورت میں نہ صرف امت مسلمہ کیلئے بلکہ عالمی امن کیلئے بھی قابل قدر کردار ادا کرنے کے قابل بنادے گا۔

یہ دفاعی اتحاد محض ریاستی مفادات کا معاہدہ نہیں بلکہ ایک تہذیبی اعلان ہے۔ کہ امت جب بیدار ہوتی ہے تو تاریخ کے رخ بدل دیتی ہے۔ اگر یہ اتحاد بصیرت، اعتدال اور اصولی سیاست کے ساتھ آگے بڑھا تو بعید نہیں کہ یہ اسلامی دنیا کیلئے ایک نئے مستحکم دور اور خود مختاری کا پیش خیمہ ثابت ہو۔ یاد رکھیں قومیں ہتھیاروں سے نہیں، کردار اور اتحاد سے زندہ رہتی ہیں۔ اسلامی دنیا کو اب ردِ عمل سے نکل کر پیش بندی مشترکہ دفاع، اسٹریٹجک اتحاد کی طرف بڑھنا ہو گا۔ یہ معاہدہ محض دور یاستوں کا دفاعی بندوبست نہیں بلکہ اسلامی دنیا کیلئے اجتماعی سلامتی کی بنیاد اور مستقبل کے مسلم سیکورٹی آرکیٹیکچر کا آغاز ہے۔ یاد رکھیں طاقت کا حقیقی سرچشمہ اسلحہ نہیں، بلکہ اتحاد، ادارہ سازی اور مشترکہ وژن ہے اور یہ معاہدہ آغاز ہے، انجام نہیں۔ قومیں جب اپنی حفاظت کا فیصلہ خود کرتی ہیں، تو تاریخ ان کے فیصلے کی حفاظت کرتی ہے۔

شور اور سکوت کے درمیان: طاقت کی نئی عالمی زبان

بین الاقوامی سیاست کے موجودہ مرحلے پر طاقت کا استعمال صرف عسکری یا معاشی دباؤ تک محدود نہیں رہا، بلکہ خاموشی، تاخیر اور ردِ عمل سے اجتناب بھی پالیسی کے مؤثر ہتھیار بن چکے ہیں۔ عالمی سیاست ہمیشہ محض بیانات، معاہدات یا جنگی محاذوں کا کھیل نہیں رہی؛ یہ خاموشیوں، توققات اور نظرنہ آنے والے فیصلوں کی تاریخ بھی ہے۔ 2026 کے آغاز میں یہی خاموشی ایک بار پھر عالمی طاقتوں کے بیچ سب سے بلند آواز بن کر ابھری ہے۔ جو امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کی جارحانہ خارجہ حکمت عملی اور روسی صدر پوتن کی غیر معمولی خاموشی اسی بدلتے ہوئے عالمی سیاسی مزاج کی نمائندگی کرتی ہے۔ ٹرمپ کی جارحانہ خارجہ پالیسی اور پوتن کی غیر معمولی خاموشی، بظاہر تضاد معلوم ہوتی ہے، مگر درحقیقت یہ اسی نئی عالمی سیاست کی علامت ہے جس میں طاقت کا اظہار اور ضبط، دونوں یکساں ہتھیار بن چکے ہیں۔ یہ باب اسی خاموشی کو بطور پالیسی سمجھنے کی کوشش ہے۔

عالمی سیاست میں طاقت کا اظہار ہمیشہ ردِ عمل کو جنم دیتا آیا ہے۔ سیاسی تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی امریکی طاقت نے جارحانہ انداز میں اپنے بچے پھیلانے، ماسکو کی جانب سے جواب تلوار کی جھنکار بن کر ابھرا۔ ماضی میں امریکی طاقت کے جارحانہ مظاہرے ماسکو کی فوری اور سخت مزاحمت کو جنم دیتے تھے۔ امریکی طاقت کے جارحانہ مظاہرے خواہ مشرق وسطیٰ ہو یا لاطینی امریکا ماسکو کی جانب سے فوری اور شدید ردِ عمل کا سبب بنتے رہے۔ سرد جنگ کے دور سے لے کر عراق اور شام تک، روس نے ہمیشہ بیانیے اور سفارت دونوں محاذوں پر جواب دیا مگر 2026 کے اوائل میں عالمی منظر نامہ ایک عجیب سکوت کی چادر اوڑھے دکھائی دیتا ہے۔ ویزویلا میں حکومت کی تبدیلی، ایک روسی پرچم بردار جہاز پر قبضہ، اور گرین لینڈ سے متعلق جارحانہ بیانات۔ یہ اقدامات اس بات کی علامت ہیں کہ امریکا اب عالمی نظام کو قانونی اصولوں کے بجائے طاقت کے توازن کی بنیاد پر ترتیب دینا چاہتا ہے۔

مگر ٹرمپ کے غیر معمولی اقدامات کے باوجود روسی خاموشی ایک نئے سیاسی مزاج کی نشان دہی کرتی ہے، جو جذبات کی بجائے مفادات کو مرکز نگاہ بناتا ہے۔ ٹرمپ کی یلغار، ویزویلا میں گرفتاری کا جشن، روسی پرچم بردار جہاز پر قبضہ، اور گرین لینڈ پر قبضے کی للکار سب کچھ ہوا، مگر کرمیلن کی زبان خاموش رہی، جیسے وقت نے خود کو تھام لیا ہو۔ ان تمام واقعات پر مکمل روسی خاموشی اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ ماسکو اب ردِ عمل کی سیاست سے نکل کر مفاد کی سیاست میں داخل ہو چکا ہے۔

ماضی کے برعکس، ماسکو نے نہ فوری مذمت کی اور نہ عسکری دھمکی دی۔ یہ خاموشی کسی کمزوری کا اظہار نہیں بلکہ ایک سوچا سمجھا پالیسی فیصلہ ہے، جس کا مقصد بڑے اسٹریٹیجک اہداف کو وقتی جذبات پر قربان نہ کرنا ہے۔ روس، جو برسوں مغربی مداخلت کو ”حکومتوں کی تبدیلی کی سازش“ کہہ کر رد کرتا رہا، آج خود ضبط و تحمل اور برداشت کا پیکر بناد دکھائی دیتا ہے۔ پوتن کی خاموشی محض اتفاق نہیں، بلکہ ایک سوچا سمجھا توقف ہے۔ پوتن کی عوامی منظر نامے سے غیر موجودگی اور کسی باضابطہ بیان سے اجتناب اس بات کا اشارہ ہے کہ کرمیلن اب بیانات کے بجائے پس پردہ حکمت عملی پر یقین رکھتا ہے۔

پوتن کی جانب سے عوامی منظر نامے سے وقتی غیبت، سیاسی بے خبری نہیں بلکہ دانستہ حکمت عملی ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ پوتن کی خاموشی اکثر بڑے فیصلوں کا پیش خیمہ بنتی ہے۔ آرتھوڈوکس کرسٹس کی تقریب کے بعد ان کا منظر سے اوجھل رہنا دراصل اس امر کی علامت ہے کہ فیصلہ بیانات میں نہیں، سفارتی کمروں میں ہو رہا ہے۔

پوتن کی عوامی منظر نامے سے عارضی غیر حاضری روسی طرز قیادت کی ایک مستقل علامت رہی ہے۔ تاریخی طور پر، پوتن کی خاموشی اکثر بڑے فیصلوں، طویل المدت حکمت عملی اور سفارتی موڑ سے پہلے دیکھی گئی ہے۔ ترجمان کریملن دمتری پیسکوف اور سرکاری نشریاتی اداروں کی خاموشی محض تعطیلاتی سستی نہیں بلکہ ایک شعوری سفارتی حکمت عملی ہے۔ یوکرین پروا شنگٹن سے جاری مذاکرات وجودی نوعیت اختیار کر کے ایسے نازک مرحلے میں داخل ہو چکے ہیں جہاں ایک سخت جملہ بھی کئی مہینوں کی محنت ضائع کر سکتا ہے۔

ترجمان کریملن دمتری پیسکوف کی خاموشی اور سرکاری ٹیلی ویژن کی تعطیلاتی خاموشی دراصل اس نازک مکالمے کی محافظ ہے جو واشنگٹن اور ماسکو کے درمیان یوکرین پر جاری ہے۔ روس اس لمحے کسی ایسی چنگاری سے گریزاں ہے جو سفارتی دھاگے کو جلا دے۔ اس مرحلے پر کسی بھی امریکی اقدام پر سخت رد عمل، اس مکالمے کو سبوتاژ کر سکتا تھا۔ کریملن کی خاموشی دراصل اسی نازک توازن کو برقرار رکھنے کی کوشش ہے۔

ٹرمپ نے 2026 کا آغاز طاقت کے ایسے اعلان سے کیا جو بیسویں صدی کی سامراجی نفسیات کی بازگشت معلوم ہوتا ہے۔ نکولس مادیرو کی گرفتاری اور نیویارک منتقلی محض ایک قانونی کارروائی نہیں، دراصل یہ پیغام تھا کہ امریکا اب سفارت نہیں، گرفت کو ترجیح دے رہا ہے بلکہ عالمی سیاست میں طاقت کے نئے اصول کا اعلان تھا۔ ٹرمپ نے نئے سال کا آغاز طاقت کے بے باک اعلان سے کیا۔ نکولس مادیرو کی گرفتاری اور نیویارک منتقلی، گویا مونرو ڈاکٹر ان کی نئی تفسیر تھی۔ کہ طاقت ہی قانون ہے۔

ٹرمپ نے واضح کر دیا کہ اب بین الاقوامی قانون کی تعبیر طاقت کے ہاتھ میں ہے۔ وہی تصور جسے کبھی روس مغربی سامراجیت کہہ کر رد کرتا تھا۔ روسی خارجہ پالیسی میں یوکرین محض ایک علاقائی تنازع نہیں بلکہ روسی خارجہ پالیسی کی مرکزی ترجیح بن چکی ہے۔ قومی سلامتی، تاریخی شناخت اور سابق سوویت دائرہ اثر کا بنیادی ستون ہے۔ ماسکو اس مسئلے پر کسی بھی قیمت پر امریکی مخالفت کو بڑھانا نہیں چاہتا۔

روسی سرکاری میڈیا میں ابھرنا ہوا یہاں اس امر کی عکاسی کرتا ہے کہ ماسکو اس امر کی جارحیت کو اپنے لیے سفارتی نظیر کے طور پر دیکھ رہا ہے۔ ان کے مطابق اگر امریکا اپنے خطے میں طاقت کا بے جا استعمال کرتا ہے، اپنے خطے میں جبر سے بالادستی قائم کرتا ہے تو روس کو بھی اپنے ہمسایہ علاقوں میں اسی منطق کو بروئے کار لانے کا اخلاقی و سیاسی جواز مل جاتا ہے اور روس کو بھی اپنے دائرہ اثر میں یہی حق حاصل ہو جاتا ہے۔ تاہم پوتن کی خاموشی کی وجہ صرف یہ ہے کہ یوکرین سے متعلق مذاکرات ایک نازک مرحلے میں ہیں۔ اس تناظر میں، وینزویلا یا بحری واقعات پر سخت رد عمل ان مذاکرات کو سبوتاژ کر سکتا تھا۔ جس سے روس کو براہ راست نقصان پہنچتا۔ ان اقدامات کو امریکی قومی سلامتی کی نئی حکمت عملی کا عملی اظہار قرار دیا گیا، جس میں عالمی طاقتوں کے مابین اثر و رسوخ کی حد بندی کو تسلیم کیا گیا ہے۔ ایک ایسا نظریہ جسے روس برسوں سے پیش کرتا آ رہا تھا۔

امریکی قومی سلامتی حکمت عملی اور روسی تائید کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ امریکی قومی سلامتی کی نئی دستاویز، جو خطوں میں اثر و رسوخ کو تسلیم کرتی ہے، روس کے دیرینہ موقف سے ہم آہنگ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روس نے اس پر تنقید کی بجائے خاموش تائید اختیار کی۔ دوسری طرف ٹرمپ

ڈاکٹر ائن نے نکولس مادورو کی گرفتاری سے یہ پیغام دیا ہے کہ بین الاقوامی نظام میں حق، طاقت سے مشروط ہے۔ اس عمل کو امریکی قومی سلامتی کی نئی حکمت عملی کا عملی مظہر کہا گیا۔ وہی حکمت عملی جسے روسی حکام نے خطوں کی سیاست کی بحالی کے سبب سراہا تھا اور یہ اصول روسی سوچ سے متضاد نہیں، مگر اس کے اطلاق کا اختیار روس اپنے مفادات کے تابع رکھنا چاہتا ہے۔

فیودور لویکیانوف کے مطابق ٹرمپ ڈاکٹر ائن نے واضح کر دیا ہے کہ عالمی سیاست کو دوبارہ ”خطوں کی سیاست“ کی طرف موڑ دیا گیا ہے اور عالمی سیاست ایک بار پھر خطوں کے گرد منظم ہو رہی ہے۔ یہ بیان اس حقیقت کو آشکار کرتا ہے کہ سرد جنگ کے بعد قائم ہونے والا لبرل عالمی نظام اب تحلیل کے مرحلے میں داخل ہو چکا ہے۔ یہ بیان محض تجزیہ نہیں بلکہ آنے والے عالمی تصادم کی پیش گوئی ہے۔ روسی سرکاری میڈیا میں اس امر کی اقدام کو ایک ”نظیر“ کے طور پر پیش کیا گیا ہے، ایک ایسی نظیر جو روس کو مستقبل میں اپنے خطے میں زیادہ سخت اقدامات کا اخلاقی جواز فراہم کر سکتی ہے۔

یوگینی پوپوف جیسے تجزیہ کاروں کے نزدیک عالمی انتشار روس کیلئے دباؤ کم کرنے اور سفارتی گنجائش بڑھانے کا موقع فراہم کر رہا ہے۔ طاقتوروں کی باہمی کشمکش میں درمیانی طاقتیں ہمیشہ نئے راستے تلاش کرتی ہیں۔ بادی النظر میں امریکی قومی سلامتی کی نئی دستاویز اور حکمت عملی، جو خطوں میں اثر و رسوخ کو تسلیم کرتی ہے، روسی موقف سے جزوی مطابقت اور ہم آہنگی رکھتی ہے۔ یہی ہم آہنگی روسی خاموشی کی ایک بڑی وجہ ہے۔



یوگینی پوپوف نے اس صورت حال کو وقتی طور پر ناخوشگوار مگر طویل المدت طور پر سودمند قرار دیا ہے۔ یہ وقتی ناخوشگوار طویل المدت فائدے میں ڈھل سکتی ہے۔ ان کے نزدیک عالمی انتشار روس کیلئے سفارتی دباؤ کم کرنے اور نئے مواقع تلاش کرنے کا موقع فراہم کر رہا ہے اور یہ عالمی انتشار روس کیلئے سانس لینے کی گنجائش پیدا کر رہا ہے۔

بعض روسی نواز حلقے امریکی مداخلت پر ناپسندیدگی کے باوجود نیم دلانہ تحسین کے ساتھ اس کی افادیت تسلیم کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ دراصل یہ سوچ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ روس خود یوکرین میں اسی تصورِ طاقت کا اسیر ہو چکا ہے کیونکہ یہی طرزِ عمل روس یوکرین میں اپنا ناپا چاہتا تھا۔ یوکرین میں روسی کارروائی بھی اسی تصورِ طاقت پر مبنی تھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہاں معاملہ ایک طویل جنگ میں بدل گیا۔ ادھر دوسری طرف عالمی سطح پر امریکی جارحیت نے یورپ اور امریکا کے درمیان خلیج کو گہرا کیا ہے۔ یہ صورتحال روس کیلئے سفارتی دباؤ کم کرنے اور نئی گنجائش پیدا کرنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔

مارگریتا سمونیان کا حسد ایک ذاتی تاثر نہیں بلکہ ریاستی کمزوری کا علامتی اظہار اور اعترافِ شکست ہے۔ وینزویلا میں دہائیوں پر محیط روسی سرمایہ کاری، جو کبھی اس کے عالمی اثر و رسوخ کی علامت تھی، اب ایک شکستہ خواب بن چکی ہے اور یوکرین جنگ کے باعث کمزور اور پس منظر میں چلی گئی ہے۔ مادورو کی گرفتاری نے اس زوال کو باضابطہ شکل دے دی۔ جسے ماسکو حقیقت پسندی سے قبول کر رہا ہے۔ ہانانولے کے مطابق روس اس وقت ٹرمپ کو ناراض کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا اور نہ ہی ٹرمپ کو براہِ راست چیلنج کرنے کی پوزیشن میں ہے۔ ٹرمپ کو ناراض نہ کرنے کی حکمت یہ ہے کہ اس کی توجہ بڑے مسئلے یوکرین پر مرکوز ہے۔ یوکرین کے مسئلے پر امریکی رویہ روس کیلئے فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں امریکی غیر جانبداری۔ یا نرم رویہ

—یوکرین کے محاذ پر روس کیلئے قیمتی اثاثہ ہے۔

ماسکو کی اولین ترجیح یہ رہی ہے کہ ٹرمپ کو یوکرین پر یا تو اپنا ہم نوا بنایا جائے یا امریکا کم از کم یوکرین کے معاملے میں روس مخالف اتحاد کا قاعدہ بنے۔ اور اسے روس مخالف اتحاد سے الگ رکھا جائے۔ اب تک یہ حکمت عملی بڑی حد تک کامیاب رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روسی پرچم بردار بحری جہاز مارینار اپر قبضے پر روس نے عسکری جواب نہیں دیا تاہم بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی پر اعتراض کیا۔ یہ رویہ روسی خارجہ پالیسی میں قانونی بیانیے کی واپسی کی علامت ہے۔ اگرچہ روسی بحری اثاثے علاقے میں موجود تھے، مگر طاقت کے استعمال سے اجتناب اور گریز کیا گیا جو کشیدگی کو محدود رکھنے کی حکمت عملی کا حصہ ہے۔

لوکیانوف کے نزدیک وینزویلا جیسے معاملات ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ اصل مسئلہ یوکرین ہے، جو روس کیلئے جغرافیائی ہی نہیں بلکہ تاریخی اور تہذیبی اہمیت بھی رکھتا ہے۔ لوکیانوف کے مطابق، وینزویلا سیاسی طور پر اہم ضرور ہے، مگر یوکرین روس کیلئے تاریخی، تہذیبی اور اسٹریٹیجک مسئلہ ہے۔ جہاں سمجھوتے کی گنجائش کم ہے۔

سخت گیر قوم پرست آوازوں نے فوجی رد عمل کا مطالبہ کیا، مگر کریملن نے انہیں پالیسی کی سطح پر قبول نہیں کیا۔ یہ ریاست اور جذبات کے فرق کو واضح کرتا ہے۔ روس کا نیا عبوری انتظامیہ کو قبول کرنا اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ ماسکو اس وقت نظریاتی بحث سے زیادہ استحکام کا خواہاں ہے۔ روسی وزارت خارجہ کی جانب سے نئی عبوری حکومت کا خیر مقدم اس بات کی علامت ہے کہ ماسکو اس مرحلے پر استحکام کو ترجیح دیتا ہے، خواہ وہ بیرونی دباؤ کے نتیجے میں ہی کیوں نہ حاصل ہو۔ روسی وزارت خارجہ نے نئی عبوری حکومت کا خیر مقدم کر کے یہ پیغام بھی دیا کہ استحکام، چاہے دباؤ میں ہو، انتشار سے بہتر ہے۔

مارینار اہواز پر قبضے پر روس کا رد عمل محتاط رہا۔ نہ دھمکی، نہ لٹاکار، صرف سمندری قانون کی یاد دہانی پر اپنا موقف بیان کیا۔ ماسکو نے عسکری کی بجائے قانونی زبان اختیار کی۔ رد عمل محتاط اور قانونی دائرے میں رہا، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ روس تصادم کے بجائے قانونی موقف کو ترجیح دے رہا ہے۔ اگرچہ عسکری جواب ممکن تھا، مگر روس نے نہ ٹینکر کی واپسی کا مطالبہ کیا اور نہ کسی جوابی کارروائی کا عندیہ دیا، حالانکہ علاقے میں اس کی بحری موجودگی موجود تھی مگر اس نے طاقت کے استعمال سے گریز کیا اور تحمل کو ترجیح دی، جو سفارتی چٹنگی کی علامت ہے۔ ٹرمپ کی ضد نے یورپی اتحاد کی کمزوری کو نمایاں کیا، ایک ایسی کمزوری جس سے روس سفارتی سطح پر فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

قطب شمالی روس کیلئے توانائی، عسکری موجودگی اور عالمی قیادت تینوں حوالوں سے فیصلہ کن خطہ ہے۔ گرین لینڈ پر امریکی نظریں ہوں یا ڈنمارک کی ملکیت، روس نے اسے فی الحال گرین لینڈ کے معاملے کو امریکا-ڈنمارک کا دوطرفہ مسئلہ قرار دے کر خود کو براہ راست تنازع اور تصادم سے دور رکھا ہے۔ گرین لینڈ پر روس کا محتاط موقف دراصل براہ راست تصادم سے بچنے کی کوشش ہے۔

سخت گیر آوازیں ہمیشہ موجود رہتی ہیں، مگر ریاستی پالیسی جذبات نہیں، مفادات سے تشکیل پاتی ہے۔ سخت گیر حلقوں نے اس ضبط کو کمزوری قرار دیا۔ الیکسی ژوراولیوف کے بیانات جذبات کی ترجمانی تو کرتے ہیں، مگر ریاستی حکمت عملی کا بدل نہیں۔ الیکسی ژوراولیوف جیسے سیاستدانوں کے بیانات عوامی

جذبات کی عکاسی تو کرتے ہیں، مگر ریاستی پالیسی ان جذبات سے بلند ہو کر تشکیل پاتی ہے۔ اس موقع پر روسی حکام کے طنزیہ بیانات سخت ردِ عمل کے بغیر پیغام پہنچانے کا مؤثر ذریعہ بنے۔ یہ جدید سفارت کاری کا ایک نرم مگر مؤثر حربہ ہے۔

قوم پرست جماعتوں نے اس اقدام کو بحری قذافی اور اعلانِ جنگ کے مترادف قرار دیا، مگر کریملن نے اس بیانیے کو سرکاری سطح پر ان جنگی الفاظ کو قبول کرنے سے گریز کیا۔ قوم پرست بیانات کو سرکاری سطح پر قبول نہ کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ کریملن جنگی بیانیے سے فی الحال دور رہنا چاہتا ہے۔ روس اس اصول کو اصولی طور پر مانتا ہے، مگر صرف وہاں تک جہاں وہ اس کے اسٹریٹجک مفادات سے متصادم نہ ہو۔

ٹرمپ کی ضد پر روس نواز حلقوں کی مسکراہٹ دراصل یورپی کمزوری پر طنز ہے۔ ٹرمپ کی گرین لینڈ پر ضد روس نواز حلقوں میں خوشی کا باعث بنی، کیونکہ اسے یورپی کمزوری اور مغربی اتحاد میں دراڑ کی علامت سمجھا گیا۔ ٹرمپ کی ضد کو روس نواز حلقے یورپی اتحاد کی کمزوری کی علامت کے طور پر دیکھتے ہیں۔ اگر امریکا گرین لینڈ میں مستقل عسکری ڈھانچہ قائم کرتا ہے تو روسی خاموشی برقرار نہیں رہے گی۔

کیریل دمتریف کا طنزیہ تبصرہ جدید سفارت کاری کی ایک نرم مگر گہری ضرب ہے جو یورپی یونین کے دوہرے معیار کا آئینہ اور سفارتی وار تھا، جو بغیر گولی چلائے اثر چھوڑ گیا۔ روس میں تعطیلات کے اختتام پر صدر پوتن کی جانب سے ایک جامع موقف متوقع ہے، جو اس خاموشی کو باضابطہ حکمتِ عملی میں ڈھال سکتا ہے۔

روس طاقت کے اصول کو مانتا ہے، مگر صرف وہاں تک جہاں وہ اس کے مفاد سے ہم آہنگ ہو۔ جس کی طاقت، اسی کا اختیار اصول روسی سوچ سے ہم آہنگ ضرور ہے، یہ فلسفہ روس کو مرغوب تو ہے، مگر اگر یہی اصول روسی مفادات سے ٹکرائے تو وہ قابلِ قبول نہیں رہتا۔ خصوصاً گرین لینڈ کے تناظر میں امریکی موجودگی اس کے مفاد سے متصادم ہو سکتی ہے۔ روس قلیل المدت تنازعات پر ردِ عمل کم کر رہا ہے، طویل المدت اسٹریٹجک اہداف کو فوقیت دی جا رہی ہے اور خاموشی ایک فعال پالیسی بن چکی ہے۔ قطب شمالی روس کیلئے عسکری، معاشی اور علامتی اہمیت رکھتا ہے۔ پوتن اسے روسی عالمی قیادت کے استحکام کا ستون قرار دے چکے ہیں۔ قطب شمالی روس کیلئے محض جغرافیہ نہیں، مستقبل کی قیادت کا ستون ہے۔

قطب شمالی روس کیلئے آنے والی دہائیوں کی معاشی اور عسکری سیاست کا مرکز ہے اور مستقبل کی جنگ کا پیش خیمہ بھی بن سکتی ہے۔ یہ طرزِ عمل عالمی نظام کو ایک نئے توازن کی طرف لے جا رہا ہے جہاں طاقت، خاموشی اور موقع پرستی ایک دوسرے میں مدغم ہو چکے ہیں۔

ہانانولے کے مطابق یورپ اور امریکا کے بیچ خلیجِ روس کیلئے فائدہ مند ہے، مگر امریکی عسکری کی موجودگی کی توسیع ناقابلِ قبول ہے۔ ہانانولے کے مطابق امریکا اور یورپ کے درمیان خلیجِ روس کیلئے فائدہ مند ہے، مگر اگر امریکا گرین لینڈ میں عسکری ڈھانچہ مضبوط کرتا ہے تو یہ روس کیلئے خطرے کی گھنٹی ہوگی اور روس کی خاموشی برقرار نہیں رہے گی۔ درمیانی طاقتوں کیلئے یہ ایک واضح سبق ہے کہ ہر جارحیت کا جواب فوری مزاحمت نہیں، بعض اوقات انتظار زیادہ سودمند ہوتا ہے۔

تعطیلات کے اختتام پر پوتن کی تقریر کا انتظار ہے، پوتن کی جانب سے کسی جامع بیان اور شاید سب سے گہری تقریر کی توقع ہے، مگر فی الحال خاموشی ہی روس کا سب سے مؤثر بیانیہ اور مبلغِ سفارت کاری ہے۔ کیونکہ تاریخ گواہ ہے کہ بعض اوقات خاموشی، سب سے بلند آواز ہوتی ہے۔ ٹرمپ کی خارجہ

پالیسی اعلان میں ہے، پوتن کی حکمتِ عملی انتظار میں۔ اور موجودہ عالمی سیاست میں، خاموشی اب کمزوری نہیں بلکہ ایک مکمل پالیسی ہے۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ ٹرمپ کی خارجہ پالیسی، شور میں لپٹی ہوئی ہے، اور پوتن کی حکمتِ عملی سکوت میں۔ تاریخ اکثر گواہی دیتی ہے کہ بعض اوقات خاموشی، توپ کے گولے سے زیادہ بھاری ہوتی ہے۔ اور یہی وہ لمحہ ہے جہاں سیاست، تاریخ بننے کے دہانے پر کھڑی ہے۔ ٹرمپ کی خارجہ پالیسی شور میں لپٹی ہے، پوتن کی حکمتِ عملی سکوت میں۔ ایک طاقت کو شور میں ڈھونڈتا ہے، دوسرا سکوت میں، اور تاریخ نہ صرف اکثر اسی سکوت کو یاد رکھتی ہے بلکہ تاریخ اکثر فیصلہ اسی سکوت کے حق میں دیتی ہے۔ کیونکہ بعض اوقات خاموشی، سب سے بڑی للکار ہوتی ہے۔

یہ باب اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ روسی خاموشی وقتی مجبوری نہیں بلکہ ایک منظم اسٹریٹیجک انتخاب ہے۔ جو عالمی طاقت کی سیاست میں ایک نئے باب کا آغاز کر رہی ہے۔

جمعرات ۹ شعبان المعظم ۱۴۴۷ھ ۲۹ جنوری ۲۰۲۶ء

حقیقی شرمندگی: بھارت کا تعلیمی زوال

عصر حاضر کی بین الاقوامی سیاست ایک ایسی کشتی پر سوار ہے جو طوفانی سمندروں میں نہیں بلکہ انسانی ذہنوں، اقتصادی طاقتوں اور نظریاتی لابیوں کے جال میں بہتی ہے اور عصر حاضر کی بین الاقوامی سیاست، جس میں طاقت کے سکہ اور اصولوں کی کتابی حدود ہمیشہ ایک دوسرے سے ٹکرائے، آج ایک اور سنگ میل پر کھڑی ہے۔ دنیا کے نقشے پر جہاں اقتدار کے شعبے اور قانون کے اصولوں کے درمیان خفیہ کشمکش جاری ہے، وہاں اصول صرف کاغذوں تک محدود رہ جاتے ہیں، طاقت کے سکے چلتے ہیں اور اخلاقیات کے چراغ مدھم پڑ جاتے ہیں۔ بھارت میں حالیہ ایچ ون بی ویز اور جعلی ڈگری اسکینڈل نے ایک ایسا آئینہ پیش کیا ہے جو صرف مقامی سطح تک محدود نہیں، بلکہ عالمی افق پر بھی اس کے گہرے اثرات محسوس کیے جاسکتے ہیں۔

اسی روشنی اور سایے کی کشمکش میں بھارت کے ایچ ون بی ویز اور جعلی ڈگری اسکینڈل نے ایک ایسا آئینہ پیش کیا ہے جو نہ صرف قوم کی خودی کا امتحان لیتا ہے بلکہ عالمی سطح پر اعتماد، شفافیت اور تعلیم کے معیار کو بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ قوم کی بقا، جیسے گھر کی بنیاد، مضبوطی اور شفافیت پر منحصر ہے، اور اگر یہ بنیاد کھوکھلی ہو جائے تو بلند و بالا عمارتیں بھی گرنے میں دیر نہیں لگاتیں۔

یہ واقعہ، جو کیرالہ کے ایک چھوٹے سے گروہ کی طرف سے منظم طریقے سے لاکھوں افراد کو جعلی اسناد فراہم کرنے کے انکشاف کے ساتھ سامنے آیا، محض ایک تعلیمی دھوکہ نہیں، بلکہ ایک ایسا تاریخی و فکری سبق ہے، ایک ایسا آئینہ ہے جس میں پوری قوم کی تعلیمی، اخلاقی اور سیاسی کمزوریوں کی عکاسی ہوتی ہے۔ جریدے "دی کمیون" کے انکشافات نے یہ واضح کیا کہ بھارت میں نہ صرف اعلیٰ تعلیمی اداروں کی شفافیت پر سوالیہ نشان لگایا جا رہا ہے بلکہ عالمی ساکھ، ورک فورس کے معیار، اور بین الاقوامی اعتماد بھی شدید متاثر ہوا ہے۔

یاد رہے کہ اس رپورٹ میں ہم انکشافات کے حقیقی اثرات، ذمہ داریوں کی تقسیم، اور بھارت کی بدنامی و نقصان کا تجزیہ کریں گے۔ کس طرح یہ جلسازی نہ صرف ملکی معیشت و تعلیم بلکہ بین الاقوامی تعلقات کو بھی جھنجھوڑ رہی ہے، اور کس طرح یہ اسکینڈل ایک تاریخی اور سیاسی درس کے طور پر سامنے آیا ہے۔

کیرالہ میں ایک منظم گروہ جس نے پورے بھارت میں 10 لاکھ سے زائد افراد کو جعلی ڈگریاں فراہم کیں، جو نہ صرف مقامی ملازمتوں کیلئے بلکہ بیرون ملک، خصوصاً امریکا میں ایچ ون بی ویز کے حصول کیلئے استعمال ہو رہی تھیں۔ یہ ایک ایسا نظامی دھوکہ ہے جو داخلی کمزوریوں اور اخلاقی غفلت کی انتہا کو ظاہر کرتا ہے۔ جریدے "دی کمیون" کی رپورٹ کے مطابق، اس نیٹ ورک نے 22 یونیورسٹیوں کے ایک لاکھ سے زائد سرٹیفکیٹس کے جعلی ریکارڈ اور جعلی مہرین تیار کیں، اور مرکزی ملزم دھنیش عرف ڈینی گھر پر جعلی ڈگریوں کی پرنٹنگ میں مصروف تھا۔ پولیس نے اس مکروہ دھندے میں ملوث کئی افراد کو گرفتار کیا، جبکہ 28 یونیورسٹیوں کی جعلی مہرین اور مارک شیٹس بھی برآمد کی گئیں۔

یہ گروہ نہ صرف اندرون ملک بلکہ بیرون ملک ملازمت کے خواہشمند افراد کو بھی دھوکہ دیتا تھا۔ میڈیکل، نرسنگ، انجینئرنگ سمیت 100 سے زائد شعبوں کی جعلی ڈگریاں فراہم کی گئیں، خاص طور پر امریکا میں ایچ ون بی ویز کے حصول کیلئے بھاری رشوت وصول کرتا تھا۔ بھارتی شہری ایچ ون بی ویز کیلئے بھاری رشوت دینے پر مجبور تھے۔ امریکی سینٹر فار امیگریشن اسٹڈیز کی ڈائریکٹر جسیکا وان نے انکشاف کیا کہ بھارت میں ویزا کے عمل کو ایک



بڑا فراڈ قرار دیا گیا، اور اس گروہ نے 36 ہزار سے زائد جعلی ڈگریاں فروخت کیں، جس کے نتیجے میں یومیہ 200 سے زائد ویزا جاری کیے گئے، جن میں 80 سے 90 فیصد مکمل طور پر جعلی تھے۔ مہوش صدیقی، بھارتی نژاد امریکی سفارت کار، نے بھارتی ریاست چٹنی کے قونصل خانے کو دنیا کا سب سے بڑا ایجنڈا ویزا فراڈ کا مرکز قرار دیا۔

یہ اسکینڈل بھارت کی بین الاقوامی ساکھ پر گہرا دھبہ اور شدید دھچکا پہنچاتا ہے۔ ایک قوم کی بدنامی صرف فوجی شکست یا اقتصادی بحران سے نہیں ہوتی، بلکہ جب علم اور اخلاق کی بنیادیں کھوکھلی ہو جائیں

تو قومی وقار بھی زوال پذیر ہو جاتا ہے۔ جب ایک ملک اپنے شہریوں کو جعلی تعلیمی اسناد کے ذریعے غیر ملکی ملازمتوں میں داخل کرتا ہے، تو نہ صرف اس کی قابلیت پر سوال اٹھتا ہے بلکہ عالمی سطح پر اس کے تعلیمی معیار اور اداروں کی شفافیت پر بھی شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ بھارت میں یہ اسکینڈل قوم کے وقار پر کاری ضرب ہے، کیونکہ علم اور اسناد کے اعتبار پر سوال اٹھنا، عالمی سطح پر اعتماد کی کمی کا سبب بنتا ہے۔ اس واقعے نے یہ ثابت کیا کہ معاشرتی اخلاقیات اور تعلیم کی شفافیت کا فقدان قومی بدنامی کا سب سے بڑا سبب ہے۔

جعلی ڈگریوں کی بنیاد پر بھارت نے متعدد ممالک میں غیر معیاری پیشہ ور بھیجے، جس سے صحت، تعلیم، اور انجینئرنگ کے شعبوں میں منفی اثر اور معیار متاثر ہوا۔ میڈیکل اور نرسنگ کے شعبوں میں ناقص افراد کے داخلے نے انسانی زندگیوں کو خطرے میں ڈال دیا، اور جہاں انجینئرنگ اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں ناقص کام نے معیشت اور انفراسٹرکچر کو نقصان پہنچایا وہاں ان جعلی ڈگریوں کے حامل افراد نے اس شعبے میں کام کی غیر معیاریت اور بنیادی ڈھانچے کو شدید ترین نقصان پہنچایا۔ یہ صورتحال اس قول کی یاد دلاتی ہے کہ قومیں صرف ہتھیاروں اور دعوؤں سے نہیں، بلکہ علم، اخلاق اور اتحاد سے قائم رہتی ہیں۔

اس اسکینڈل کی ذمہ داری محض مرکزی ملزم پر نہیں، بلکہ ایک پورے نظامی خلا کی عکاس ہے۔ ویزا کے حصول اور یونیورسٹیوں کی نگرانی میں حکومت اور انتظامیہ کی کوتاہی اور بدعنوانی کا عنصر شامل ہے۔ تعلیمی ادارے اسناد اور ڈگریوں کی تصدیق میں ناکام ہو چکے ہیں۔ مقامی انتظامیہ کے ساتھ ساتھ حکومتی، اور سیاسی افراد کا اخلاقی ذمہ داریوں سے آنکھیں بند رکھنا اور رشوت کی سیاست کا عام چلن بھی ذمہ دار ہے۔ ویزا کے عمل میں ناکافی نگرانی اور شفافیت کی کمی میں بین الاقوامی ادارے بھی کسی حد تک شامل ہو چکے ہیں۔ یہ تمام عوامل مل کر ایک ایسا بحران پیدا کرتے ہیں جس کے اثرات نہ صرف مقامی بلکہ بین الاقوامی سطح تک محسوس کیے جاتے ہیں۔ یہ تمام عناصر مل کر اس بحران کو جنم دیتے ہیں، اور ظاہر کرتے ہیں کہ صرف مرکزی ملزم کو گرفتار کرنا کافی نہیں، بلکہ نظام کی اصلاح ناگزیر ہے۔

یہ اسکینڈل صرف بھارت کی داخلی بدنامی تک محدود نہیں۔ ایجنڈا ویزا کی فراڈ سرگرمیوں نے عالمی ورک فورس، بین الاقوامی اعتماد، اور امیگریشن سسٹم کی شفافیت کو بھی متاثر کیا۔ امریکا اور دیگر ممالک میں بھرتی ہونے والے افراد کے جعلی اسناد پر سوال اٹھتے ہیں، اور عالمی سطح پر اعتماد کی کمی

پیدا ہوتی ہے۔ اس معاملے سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ بین الاقوامی تعلقات میں شفافیت اور اخلاقی معیار صرف رسمی اقدامات سے قائم نہیں رہتے، بلکہ داخلی نظم و ضبط، احتساب اور اداروں کی مضبوطی سے ممکن ہیں۔

یہ واقعہ ایک تاریخی آئینہ ہے اور بھارتی قوم کی اخلاقی کمزوری اور تعلیمی نظام کی ناکامی بالکل ویسے ہی ہے جیسے ماضی میں کمزور حکومتیں اپنے داخلی عیبوں کی وجہ سے زوال پذیر ہوئیں۔ بھارت کا یہ اسکینڈل واضح کرتا ہے کہ جب یہ عناصر کمزور ہوں، تو بیرونی اور داخلی نقصان اور عالمی بدنامی ناگزیر ہے۔ بھارت میں ایچ ون بی ویزا اور جعلی ڈگری اسکینڈل نے نہ صرف قومی تعلیمی اور اخلاقی معیار کو بدنام کیا، بلکہ عالمی سطح پر جہاں بھارت کی ساکھ، ورک فورس کے معیار، اور بین الاقوامی اعتماد کو شدید نقصان پہنچایا وہاں اخلاقی معیار کو بھی بدنام کیا ہے۔ یہ واقعہ یاد دلاتا ہے کہ ہر قوم کی ترقی اور بین الاقوامی اعتماد کا انحصار صرف سرکاری دعوؤں یا رسمی اسناد پر نہیں، بلکہ اصلاح، خود احتسابی، اور شفاف نگرانی پر ہے۔

اس اسکینڈل نے یہ بھی واضح کیا کہ ذمہ داری کا دائرہ وسیع ہے: حکومت کی کوتاہی، یونیورسٹیوں کی ناقص نگرانی، نجی نیٹ ورکس کی جعل سازی، اور افراد کی اخلاقی غفلت۔ سب نے مل کر اس بحران کو جنم دیا۔ بھارت کیلئے سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ شفافیت اور داخلی استحکام کے بغیر نہ تعلیمی معیار قائم رہتا ہے اور نہ قومی وقار۔ یہ اسکینڈل ہر قوم کیلئے ایک درس ہے کہ طاقت کے مراکز اور بین الاقوامی اثرات سے زیادہ اہم اعتماد، شفافیت، اور داخلی استحکام ہے۔ داخلی قوت مضبوط ہو تو بیرونی خطرات ناکام رہ جاتے ہیں، اور داخلی کمزوری ہو تو سب سے بڑی طاقت کو بھی نقصان پہنچانے میں دیر نہیں لگاتی۔

آخر میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ قومیں تب ہی سر بلند رہتی ہیں جب ان کے ادارے مضبوط، قیادت بیدار، اور اخلاقی بنیادیں مستحکم ہوں۔ یہ رپورٹ ایک تحقیقی و ادبی دستاویز کے طور پر، اسکینڈل کے تمام پہلوؤں، ذمہ داریوں، نقصانات اور سیاسی و تاریخی اثرات کو جامع انداز میں بیان کرتی ہے، اور قارئین کیلئے نہ صرف آگاہی بلکہ فکری و اخلاقی سبق بھی فراہم کرتی ہے۔

دفاع، دانش اور فیصلہ

اکیسویں صدی کی عالمی سیاست اب محض سرحدوں کے تحفظ یا عسکری طاقت کے مظاہرے تک محدود نہیں رہی، بلکہ یہ ٹیکنالوجی، معیشت، سفارت اسلحہ جاتی خود کفالت کے نازک امتزاج کا نام بن چکی ہے۔ آج وہی ریاستیں باوقار سمجھی جاتی ہیں جو اپنی دفاعی ضروریات کے ساتھ ساتھ عالمی اور منڈی میں اپنی عسکری مصنوعات کی اخلاقی، سیاسی اور تزویراتی قدر بھی منوا سکیں۔ اسی بدلتے ہوئے عالمی منظر نامے میں پاکستان کا جے ایف-17 تھنڈر پروگرام ایک غیر معمولی سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہ منصوبہ محض ایک لڑاکا طیارے کی تیاری کا نام نہیں، بلکہ یہ پاکستان کی دفاعی فکر کے اس ارتقائی سفر کی علامت ہے جو درآمدی انحصار سے نکل کر مشترکہ پیداوار، ٹیکنالوجی کی شراکت اور محدود مگر باوقار برآمدات کی سمت بڑھ رہا ہے۔ چین کے ساتھ اس اشتراک نے پاکستان کو نہ صرف عسکری اعتبار سے مضبوط کیا بلکہ اسے عالمی دفاعی سیاست میں ایک ذمہ دار فریق کے طور پر متعارف کرایا جے ایف-17 تھنڈر کی ممکنہ برآمدات سے متعلق حالیہ مذاکرات نے کئی اہم سوالات کو جنم دیا ہے:

☆ کیا پاکستان اپنی پیداواری صلاحیتوں کے مطابق معاہدے کرے گا؟

☆ چین کا کردار کہاں تک فیصلہ کن ہو گا؟

☆ کن ممالک کو یہ طیارہ فراہم کیا جانا چاہیے اور کن کو نہیں؟

☆ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دفاعی تجارت میں قومی سلامتی اور جیو پولیٹیکل توازن کو کیسے برقرار رکھا جائے؟

یہ دفاعی پالیسی پیچیدہ سوالات کے منظم، تحقیقی اور ریاستی نقطہ نظر سے جوابات فراہم کرنے کی ایک سنجیدہ کوشش ہے۔ اس کا مقصد نہ تو محض فنی تفصیلات بیان کرنا ہے اور نہ ہی کسی وقتی سیاسی بیانیے کی توثیق، بلکہ ایک واضح، محتاط اور قابل عمل پالیسی فریم ورک پیش کرنا ہے، جو ریاست پاکستان کو مستقبل کے دفاعی فیصلوں میں رہنمائی فراہم کر سکے۔

پاکستان کی جانب سے جے ایف-17 تھنڈر طیاروں کی فروخت کیلئے متعدد ممالک کے ساتھ مذاکرات کی تصدیق اس حقیقت کی غماز ہے کہ ملک کی دفاعی صنعت اب محض اندرونی ضرورت تک محدود نہیں رہی بلکہ عالمی منڈی میں اپنی جگہ بنانے کی شعوری کوشش کر رہی ہے۔ پاکستان نے دفاعی خود انحصاری کے مرحلے میں داخل ہوتے ہوئے جے ایف-17 تھنڈر کو محض قومی دفاع تک محدود رکھنے کی بجائے بین الاقوامی دفاعی منڈی میں متعارف کرانے کی پالیسی اختیار کی ہے اور پاکستان کی جانب سے اس کا اعتراف دراصل قومی دفاعی صنعت کے اس ارتقائی مرحلے کی علامت ہے جہاں عسکری خود کفالت سفارتی بصیرت سے ہم آغوش ہو رہی ہے۔

اس تناظر میں متعدد ممالک کے ساتھ ابتدائی مذاکرات کی تصدیق ایک منظم برآمدی حکمت عملی کی طرف پیش رفت کی نشاندہی کرتی ہے۔ یہ بات پوری صراحت سے کہی گئی ہے کہ ایسے ہر معاہدے میں چین کی رضامندی شامل ہوگی، جو اس منصوبے کی مشترکہ روح اور اس کے تزویراتی مزاج کا فطری تقاضا ہے۔ یہ وضاحت کہ ان معاہدوں میں چین کی مرضی شامل ہوگی، دراصل اس منصوبے کی مشترکہ نوعیت، تکنیکی انحصار اور منصوبے

کی مشترکہ نوعیت، تکنیکی انحصار اور تزویراتی شراکت کا فطری تقاضا ہے، جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

پاکستانی حکام کے مطابق یہ مذاکرات جاری ہیں، مگر یہ وہ معاملات نہیں جو اخباری سرخیوں میں پلک جھپکتے طے پا جائیں۔ دفاعی معاہدے صبر، اعتماد اور وقت مانگتے ہیں۔ کئی ممالک کی دلچسپی اس طیارے کی ساکھ کا ثبوت ہے، مگر فیصلہ وہی معتبر ہوتا ہے جو خاموشی سے چٹنگی اختیار کرے۔ دفاعی پیداوار کے وزیر کے مطابق یہ مذاکرات جاری ہیں مگر ان میں وقت لگے گا۔ دفاعی معاہدے محض تجارتی سودے نہیں ہوتے بلکہ ان کے پیچھے قومی سلامتی، علاقائی توازن اور عالمی طاقتوں کی رضامندی کا رفرما ہوتی ہے۔ یہ مذاکرات ابتدائی اور درمیانی مراحل میں ہیں اور ان کی تکمیل میں وقت درکار ہو گا۔ دفاعی معاہدوں کی نوعیت کے پیش نظر فوری فیصلوں کے بجائے تدریجی پیش رفت کو ترجیح دی جا رہی ہے۔

جے ایف-17 تھنڈر بلاک تھری محض ایک لڑاکا طیارہ نہیں بلکہ جدید عسکری فکر کا مجسم اظہار اور 4.5 جزیٹیشن کا ملٹی رول فاسٹر کہا جاتا ہے، جو جدید فضائی جنگ کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔ یہ اے ای ایس اے ریڈار، لانگ رینج وی آر صلاحیت، اور 4.5 جزیٹیشن ملٹی رول خصوصیات اسے فضائی جنگ کے بدلے ہوئے منظر نامے میں ایک مؤثر قوت بناتی ہیں، جو دفاعی حکمت عملی کو وسعت اور گہرائی عطا کرتی ہے اور یہ ریڈار جو دشمن کو پہلے دیکھنے اور نشانہ بنانے کی بھرپور صلاحیت کا مالک ہے۔ یہ طیارہ بی وی آر لانگ رینج میزائل، ملٹی مشن کردار (فضا، فضا، زمین، الیکٹرانک وارفیئر) کی صلاحیت کا حامل ہے اور یہ خصوصیات اسے علاقائی اور عالمی سطح پر دیگر لڑاکا طیاروں کے برابر لا کھڑا کرتی ہیں۔

بین الاقوامی ذرائع ابلاغ میں لیبیا، سوڈان، بنگلہ دیش، انڈونیشیا اور سعودی عرب کے ناموں کی تصدیق ہوئی ہے، مگر وزیر دفاعی پیداوار نے کسی ملک کا نام لینے سے گریز اور دانشمندانہ خاموشی اختیار کرتے ہوئے واضح کیا کہ یہ ریاستی راز ہیں۔ ان کا یہ موقف سیاسی طور پر بالکل درست ہے تاکہ سفارتی حساسیت اور مذاکراتی پوزیشن متاثر نہ ہو۔ پاکستانی ترجمان نے بڑے پر اعتماد لہجے میں یہ بتایا کہ جب جہاز روانہ ہوں گے تو دنیا خود جان لے گی کہ اعتماد کن ہاتھوں میں منتقل ہوا۔

جے ایف-17 تھنڈر کو مئی 7 تا 10 کے دوران پاک بھارت کشیدگی میں عملی طور پر آزمایا گیا۔ اس کی کارکردگی وہ آئینہ اور سند بنی جسے دنیا کی فضائی افواج نے خاموشی سے نوٹ کیا اور دنیا کی فضائی افواج نے ایک ابھرتی ہوئی قوت کا حیرت انگیز عکس دیکھا۔ اگرچہ بھارتی طیارے گرانے کے دعوے اپنی جگہ، مگر اصل کامیابی وہ تاثر تھا جو عالمی عسکری حلقوں میں قائم ہوا اور بھارتی طیاروں کی تباہی نے اس جہاز کی جنگی افادیت کو عالمی سطح پر اجاگر کیا۔ مئی میں ہونے والی پاک-بھارت کشیدگی کے دوران جے ایف-17 کی آپریشنل کارکردگی نے اس طیارے کی جنگی صلاحیت کو عملی طور پر ثابت کیا۔ اس تجربے نے عالمی دفاعی اداروں میں اس طیارے کی ساکھ میں خاطر خواہ اضافہ کیا۔

جہاں مغربی ساختہ لڑاکا طیاروں کی قیمت 250 تا 350 ملین ڈالر ہے، وہاں جے ایف-17 کی قیمت 40 تا 50 ملین ڈالر ہے۔ جو ایک متوازن، مؤثر اور قابل اعتماد متبادل بن کر ابھرتا ہے۔ یہ قیمت نہیں، ایک فلسفہ ہے۔ کم وسائل میں زیادہ صلاحیت اور یہ فرق محض عددی نہیں بلکہ دفاعی فلسفے کا فرق ہے۔ کم وسائل میں قابل اعتماد دفاع کا یہی عنصر ترقی پذیر ممالک کو اس طیارے کی طرف راغب کرتا ہے۔

یہ طیارہ پاکستان اور چین کی مشترکہ کاوش ہے؛ کچھ پرزے چین میں بنتے ہیں اور کچھ پاکستان میں۔ لہذا ہر فروختی معاہدے میں چین کی شمولیت ناگزیر ہے۔ یہ شمولیت ٹیکنالوجی کے تحفظ، سفارتی توازن اور عالمی طاقتوں کے رد عمل کے نظم کیلئے ضروری ہے۔ یہ شمولیت محض رسمی نہیں بلکہ تکنیکی، سفارتی



اور تزویراتی نگرانی کا مظہر ہے۔

چونکہ جے ایف-17 ایک مشترکہ پاک-چین منصوبہ ہے، اس لیے ہر برآمدی معاہدے میں چین کی شمولیت لازمی ہوگی۔ چین تکنیکی منظوری، سپلائی چین اور پاکستان ٹیکنالوجی کنٹرول میں کلیدی کردار ادا کرے گا۔ یہ سوال فطری اور بجا ہے کہ آیا پاکستان بڑے پیمانے پر یہ طیارے بروقت تیار کر سکتا ہے یا نہیں۔ مگر ایسے سوالات دفاعی ریاستوں میں کھلے بازار میں زیر بحث نہیں لائے جاتے۔ پالیسی سطح پر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ بڑے پیمانے کے آرڈر کیلئے پیداواری صلاحیت ایک حساس معاملہ ہے۔ تاہم یہ ایک تدریجی

اور قابل توسیع نظام ہے جسے ضرورت کے مطابق بڑھایا جاسکتا ہے۔ مگر دفاعی صنعت میں پیداواری صلاحیت محض فیکٹریوں سے نہیں، ریاستی عزم، منصوبہ بندی اور وقت سے مشروط ہوتی ہے۔

وزیر دفاعی پیداوار کا جواب نہایت معنی خیز تھا: یہ قومی دفاع کا سوال ہے اور قومی راز، راز ہی رہنے چاہئیں۔ انہوں نے مثال دے کر واضح کیا کہ جدید دفاعی نظام وقت، محنت اور تدریج مانگتا ہے۔ یہ جدید دفاعی نظام کسی ایک دن کی تخلیق نہیں۔ پیداواری اہلیت، سپلائی چین اور ڈیلیوری ٹائم لائنز سے متعلق تفصیلات قومی سلامتی کے دائرے میں آتی ہیں۔ ان معلومات کا عوامی سطح پر انکشاف پالیسی کے منافی ہوگا۔ یہ بیان دراصل صنعتی حقیقت اور ریاستی احتیاط کا عکاس ہے۔

دفاعی ماہرین خبردار کرتے ہیں کہ ایسے معاہدے برسوں میں طے پاتے ہیں۔ جذباتی یا جلد بازی پر مبنی فیصلے مستقبل میں مشکلات پیدا کر سکتے ہیں، سپلائی چین، تکنیکی تعاون، سفارتی دباؤ جیسے مسائل پیدا کر سکتے ہیں۔ ڈیلیوری میں تاخیر، سپلائی چین میں رکاوٹ، سفارتی دباؤ پالیسی کے تحت ان خطرات کیلئے پیشگی حکمت عملی تیار کرنا ضروری ہے۔ اس لئے حکمت اور تدبیر لازم ہے۔

چونکہ اس منصوبے کے اہم حصے چین سے آتے ہیں، اس لیے پاکستان کو ایسے معاہدوں سے اجتناب اور گریز کرنا ہوگا جو سپلائی یا ٹیکنالوجی کے حوالے سے پاکستان کی استعداد سے بڑھ کر ہوں یا تکنیکی انحصار میں خلل ڈال سکیں۔ یہ معاملہ صنعتی حقیقت پسندی کا تقاضا کرتا ہے، نہ کہ محض سیاسی جوش کا۔ اس لئے پہلی مرتبہ عالمی منڈی میں کامیابی کا تقاضہ ہے کہ سپلائی چین کیلئے فول پروف نظام مرتب کیا جائے۔

اکثر تجزیہ کار متفق ہیں کہ چین اس منصوبے میں سینئر پارٹنر ہے اور وہ ہر سطح پر فروختی عمل پر گہری نظر رکھے گا۔ یہ فطری بھی ہے اور ناگزیر بھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حتمی منظوری، ٹیکنالوجی کی منتقلی اور برآمدی پالیسی میں چین کا کردار فیصلہ کن ہوگا۔ پالیسی سطح پر یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ چین اس منصوبے میں سینئر پارٹنر ہے۔ برآمدی فیصلے دو طرفہ مشاورت سے ہوں گے اور حتمی منظوری مشترکہ ہوگی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان تمام آرڈرز میں کامیابی کا سہرا ب کریم کی عنایات، پاک فضائیہ اور پاک افواج کے اس دلیرانہ صلاحیت کا ہے جو اس نے مئی میں ہونے والی پاک بھارت جنگ میں ثابت کیا۔

سی آئی جی آئی کے سینئر فیلو اینار تانجن کے مطابق، پاکستان طیارہ فروخت کر سکتا ہے مگر ٹیکنالوجی کا کنٹرول چین کے پاس ہی رہے گا۔ یوں یہ ایک مشترکہ ایکسپورٹ ماڈل ہو گا جس میں چین کی بالادستی مسلمہ ہے۔ اس سے حساس ٹیکنالوجی کے غیر مجاز پھیلاؤ کو روکا جاسکے گا۔ چین اور پاکستان کو یہ اندیشہ بھی لاحق ہے کہ کہیں کسی تیسرے فریق کے ذریعے اس کی حساس ٹیکنالوجی مغربی ممالک تک نہ پہنچ جائے۔ اسی لیے ہر معاہدہ پاک بیجنگ کی نگرانی میں ہو گا۔ یہ خدشہ عالمی طاقتوں کی ٹیکنالوجی وار کا حصہ ہے اور اسی لیے پاک بیجنگ ہر معاہدے پر مشترکہ کڑی نظر رکھیں گے۔ اس خدشے کے پیش نظر برآمدی پالیسی سخت کنٹرول میں رکھی جائے گی۔

وزیر دفاعی پیداوار کے الفاظ میں کوئی بھی ریاست اپنی بدوق دشمن کو نہیں بچتی۔ جے ایف-17 صرف دوست ممالک کیلئے ہے، اور ہر فیصلہ جیو پولیٹیکل تناظر میں کیا جاتا ہے۔ پاکستانی وزیر کے مطابق جے ایف-17 ہر ملک کیلئے نہیں۔ یہ فیصلہ جیو پولیٹیکل حالات، دوستی اور دشمنی کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ یہ ریاستی دانش ہے کہ کوئی قوم اپنی دفاعی قوت دشمن کو منتقل نہیں کرتی۔ پالیسی کے مطابق جے ایف-17 صرف دوست اور ترویجی شراکت دار ممالک کو فروخت کیا جائے گا۔ جیو پولیٹیکل عوامل ہر معاہدے میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

گزشتہ برس ہونے والے پاک-سعودی دفاعی معاہدے کی تفصیلات صیغہ راز میں ہیں۔ یہ معاہدہ اعلیٰ ترین ریاستی سطح پر طے پایا، اور جہاں اس کی نوعیت اس کی حساسیت کی غماز ہے وہاں اس کی ترویجی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے۔ بین الاقوامی میڈیا میں ترکی کے ممکنہ کردار کی بازگشت سنائی دیتی ہے، اگرچہ سرکاری تصدیق نہیں، مگر سرکاری سطح پر خاموشی اختیار کی گئی ہے۔ ترکی، چین، سعودی عرب اور آذربائیجان پاکستان کے وہ شراکت دار ہیں جن کے ساتھ تعاون محض وقتی نہیں بلکہ ترویجی اور فطری ہے اور مستقبل میں مشترکہ منصوبے ممکن ہیں۔

بلومبرگ کی رپورٹ کے مطابق ترکی پاکستان میں ڈرون سازی میں دلچسپی رکھتا ہے۔ وزیر دفاعی پیداوار نے اس کی نہ تردید کی نہ تصدیق، البتہ یہ ضرور واضح کیا کہ پاکستان میں یو اے ویز اور ڈرون ٹیکنالوجی میں نجی شعبہ فعال اور بھرپور کام کر رہا ہے۔ یہ رجحان دفاعی صنعت کی ڈی سینٹرلائزیشن اور ٹیکنالوجی کے پھیلاؤ کی علامت ہے۔ یہ خاموش انقلاب کی علامت ہے۔

اس سلسلے میں پالیسی سفارشات کو مد نظر رکھتے ہوئے ضروری ہے کہ برآمدی معاہدوں میں تدریج اور حقیقت پسندی اپنائی جائے۔ چین کے ساتھ کوآرڈینیشن کو ادارہ جاتی شکل دی جائے۔ پیداواری صلاحیت میں تدریج اضافہ کیا جائے اور صرف قابل اعتماد اور دوست ممالک کو فروخت کی اجازت دی جائے۔ ٹیکنالوجی کنٹرول اور انفارمیشن سکیورٹی کو اولین ترجیح دی جائے۔ جے ایف-17 تھنڈر کی برآمدات پاکستان کیلئے معاشی، عسکری اور سفارتی مواقع پیدا کرتی ہیں، تاہم یہ عمل محتاط پالیسی فریم ورک، چین کے ساتھ قریبی ہم آہنگی اور حقیقت پسندانہ اہداف کا متقاضی ہے۔ درست حکمت عملی کے ساتھ یہ منصوبہ پاکستان کو عالمی دفاعی منڈی میں ایک معتبر شراکت دار بنا سکتا ہے۔

یوں جے ایف-17 تھنڈر محض ایک جنگی لڑاکا طیارہ نہیں، بلکہ پاکستان کی عسکری خود مختاری و خودداری، صنعتی بلوغت، سفارتی حکمت، عالمی سیاست میں محتاط پیش قدمی اور اسلامی دنیا میں اس کے ابھرتے ہوئے کردار کا استعارہ ہے۔ یہ وہ پرواز ہے جو فولاد کے پردوں پر نہیں، بلکہ تدبیر، اعتماد اور تاریخ کے شعور پر بلند ہو رہی ہے۔ یہ منصوبہ اس حقیقت کی یاد دہانی ہے کہ دفاع صرف ہتھیار کا نام نہیں بلکہ تدبیر، شراکت اور وقت کی آزمائش کا مجموعہ ہے۔

جے ایف-17 تھنڈر کی برآمدات سے متعلق بحث دراصل پاکستان کے اس بڑے سوال سے جڑی ہوئی ہے کہ وہ عالمی سیاست میں خود کو محض ایک خریدار ریاست کے طور پر دیکھنا چاہتا ہے یا ایک ذمہ دار، باخبر اور خود مختار دفاعی شراکت دار کے طور پر۔ یہ طیارہ فولاد اور الیکٹرانکس کا مجموعہ ضرور ہے، مگر اس سے وابستہ فیصلے قومی وقار، سفارتی توازن اور مستقبل کی سلامتی سے عبارت ہیں۔

یہ پالیسی پیپر اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ جے ایف-17 کی فروخت پاکستان کیلئے ایک موقع بھی ہے اور آزمائش بھی۔ موقع اس لیے کہ یہ منصوبہ دفاعی معیشت کو مضبوط کر سکتا ہے، دوست ممالک کے ساتھ اسٹریٹجک تعلقات کو گہرا کر سکتا ہے اور عالمی سطح پر پاکستان کی صنعتی ساکھ کو بہتر بنا سکتا ہے۔ اور آزمائش اس لیے کہ کسی بھی غیر محتاط معاہدے کی صورت میں تکنیکی انحصار، سفارتی دباؤ اور پیداواری مسائل قومی مفاد کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ چین کی حیثیت ایک سینئر پارٹنر کے طور پر اس پورے عمل میں مرکزی رہے گی، اور یہ حقیقت پاکستان کو کسی ابہام میں نہیں رکھنی چاہیے۔ اسی طرح، برآمدات کو صرف ان ممالک تک محدود رکھنا جو پاکستان کے دوست اور تزویراتی شراکت دار ہیں، نہ صرف ایک دانشمندانہ فیصلہ ہے بلکہ ریاستی اخلاقیات کا تقاضا بھی۔

بالآخر، جے ایف-17 تھنڈر کی کامیابی کا معیار صرف فروخت ہونے والے طیاروں کی تعداد نہیں ہوگا، بلکہ یہ دیکھا جائے گا کہ آیا پاکستان نے اس عمل میں تدبیر، صبر، حقیقت پسندی اور ریاستی حکمت کو برقرار رکھا یا نہیں۔ دفاعی طاقت وہی معتبر ہوتی ہے جو شور نہیں مچاتی، اور پالیسی وہی پائیدار ہوتی ہے جو وقت کی کسوٹی پر پوری اترے۔ اگر جے ایف-17 کی برآمدات اسی متوازن پالیسی فریم ورک کے تحت آگے بڑھیں، تو یہ منصوبہ محض ایک دفاعی کامیابی نہیں بلکہ پاکستان کی اسٹریٹجک بلوغت کی ایک روشن مثال بن سکتا ہے۔

فراق سے وصال تک: روح کی ازلی جستجو

انسانی زندگی کی سب سے گہری اور پائیدار کیفیات میں ایک کیفیت ایسی ہے جسے نہ مکمل طور پر بیان کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس سے فرار ممکن ہے۔ انسان کی زندگی میں کچھ سوال ایسے ہوتے ہیں جو زبان سے ادا نہیں ہوتے، مگر دل میں مسلسل دستک دیتے رہتے ہیں۔ ایک نامعلوم سی کمی، ایک بے نام سی اداسی، ایک انجانا سا کھنچاؤ۔ جو دولت، رشتوں، کامیابیوں اور آسائشوں کے باوجود ختم نہیں ہوتا۔ انسان کامیاب ہوتا ہے، تعلقات قائم کرتا ہے، ہنستا ہے، آگے بڑھتا ہے۔ مگر اس سب کے باوجود دل کے کسی گوشے میں یہ احساس زندہ رہتا ہے کہ کچھ ہے جو چھن گیا ہے، کچھ ہے جو پیچھے رہ گیا ہے، اور کچھ ہے جس کی یاد روح کو بے چین رکھتی ہے۔

فطری فراق سے روحانی جستجو اور طلب وصال کے سفر کو سمجھنے کی کوشش کرنے سے قبل روح سے وجود تک کے سفر کو سمجھنا ضروری ہے۔ انسان کی ہر روح، جب اس دنیا میں قدم رکھتی ہے، ایک فطری بے چینی کے ساتھ آتی ہے۔ یہ بے چینی، جو فراقِ ازل کی یاد کا شعلہ ہے، جو خاموش رہ کر انسان کی نفسیات کے گوشوں میں حرارت پیدا کرتا ہے۔ یہ حرارت اسے اس بات کی یاد دلاتی ہے کہ اصل وطن اور اصل محبوب کہیں دور ہے، اور اسی کے حصول کیلئے روح کو مسلسل طلب میں رہنا ہو گا۔

انسان جب اس دنیا میں آنکھ کھولتا ہے تو بظاہر وہ ایک مکمل نظام کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ ماں باپ، خاندان، معاشرہ، زبان، مذہب اور تہذیب۔ اسے سکھایا جاتا ہے کہ وہ خود کو انہی نسبتوں کے ذریعے پہچانے، انہی دائروں میں معنی تلاش کرے اور انہی حدود کے اندر اپنی خوشی اور غم کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ مگر ان تمام ظاہری شناختوں کے باوجود، انسان کے باطن میں ایک ایسی کیفیت ہمیشہ موجود رہتی ہے جسے نہ خاندان مٹا سکتا ہے، نہ معاشرہ، نہ علم، نہ دولت، اور نہ ہی اقتدار۔

انسان کے باطن میں بسی ہوئی جدائی ہی دراصل کیفیتِ فراق کا شعور ہے۔ یہ شعور ابتدا میں واضح نہیں ہوتا۔ یہ کسی ایک واقعے، کسی ایک صدمے یا کسی ایک جدائی سے پیدا نہیں ہوتا، بلکہ انسان کی فطرت میں پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ دنیا کی جدائیاں — کسی عزیز کی موت، کسی محبوب سے پھٹنا، کسی وطن سے ہجرت — درحقیقت اسی اندرونی فراق کو بیدار کرتی ہیں، پیدا نہیں کرتیں۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ دنیا کی ہر جدائی، اس ایک عظیم جدائی کا عکس ہے جو انسان نے شعوری یا لاشعوری طور پر پہلے ہی جھیل رکھی ہے۔

انسان جب کسی سے محبت کرتا ہے اور پھر اس سے محروم ہوتا ہے تو اس کا درد محض اس شخص تک محدود نہیں رہتا۔ وہ غم غیر متناسب ہوتا ہے، حد سے بڑھا ہوا، اور بعض اوقات اس تعلق سے بھی بڑا محسوس ہوتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسان حیران ہوتا ہے کہ آخر یہ دکھ اتنا گہرا کیوں ہے؟ اس سوال کا جواب یہی ہے کہ یہ دکھ کسی ایک رشتے کا نہیں، بلکہ اصل محبوب سے جدائی کا ہے، جو کسی ایک چہرے، کسی ایک تعلق یا کسی ایک یاد کے پردے میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا احساس ہے جو بظاہر خاموش رہتا ہے، مگر باطن میں مسلسل بولتا رہتا ہے؛ ایک ایسی کمی جو کسی ظاہری سبب کے بغیر دل میں بسی رہتی ہے؛ ایک انجانی اداسی جو مسرتوں کے ہجوم میں بھی اپنا وجود برقرار رکھتی ہے۔ یہی احساس دراصل اصل وطن کی یاد ہے۔ وہ وطن جو مٹی کا نہیں تھا، وہ وطن جو زمین کا کوئی خطہ نہ تھا، وہ گھر جو اینٹ اور پتھر سے تعمیر نہیں ہوا تھا، وہ قربت جو جسمانی نہیں بلکہ روحانی تھی۔

وہ جو آنکھوں کا تار، دل کی ٹھنڈک، چہرے کا نور اور زندگی کا سہارا ہو جو تپتی دھوپ میں سایہ بن جائے، ڈوبتے سمندر میں کنارہ ہو، تاریک راہوں میں چراغ اور صبح صادق کی پہلی روشنی ہو۔ جس سے تعلق ایسا ہو جیسے پھول کا خوشبو سے، ساز کا نغمے سے، شعر کا شاعر سے، صانع کا صنعت سے، پرندے کا آسمان سے۔ جس کے خیال سے دل کی دھڑکنیں سنبھل جائیں، جس کی موجودگی میں اضطراب سکون میں بدل جائے، جس کا ساتھ پہاڑ کی مانند مضبوط سایہ بھی ہو اور سمت بھی، چراغ بھی ہو اور روشنی بھی..... ہو، جس کا ہاتھ تھام کر قدم بے خوف دوڑنے لگیں، ایسا تعلق جو سکون بھی ہو اور زندگی بھی۔ اور پھر اچانک وہ ہاتھ چھوٹ جائے، اور جب ایسا تعلق اچانک چھن جائے، دل کا شیشہ کرچی کرچی ہو جائے، قدم لرزنے لگیں، راستے اندھیروں میں ڈوب جائیں، پھول مرجھا جائیں اور دل غم کے گہرے سمندر میں اتر جائے تو انسان پہلی بار یہ جانتا ہے کہ جدائی محض فاصلہ نہیں، بلکہ ایک داخلی زلزلہ ہے۔ محبت کا سب سے بڑا امتحان موت نہیں، بلکہ جدائی ہے۔ یہی جدائی ہے، اور جدائی محبت کا سب سے سخت امتحان۔ موت ہو یا زندگی کی کوئی اور آزمائش، محبت کے سب سے کڑے لمحے وہی ہوتے ہیں جب اپنے ان لوگوں سے ہچکڑنا پڑے جن کے بغیر زندگی کا تصور بھی محال تھا۔

کبھی کوئی خاک میں اتر کر جدا ہو جاتا ہے، اور کبھی کوئی زندہ رہ کر بھی دوری کے اندھیروں میں کھو جاتا ہے لیکن محبت کا اصل رشتہ تو جسم سے نہیں، دل سے ہوتا ہے جیسے ایک نادیدہ ڈور ایک دل کو دوسرے دل سے باندھے رکھتی ہے، اور یہی ڈور محبت کو وقت، فاصلے اور موت کے بعد بھی زندہ رکھتی ہے۔ یہی لمحہ فراق کا لمحہ ہے اور فراق ہی انسان کی روح کا سب سے گہرا زخم ہے۔ محبت کا سب سے سخت امتحان موت نہیں بلکہ جدائی ہے۔ موت میں تو یقین ہوتا ہے، موت میں ایک قطعیت ہوتی ہے، مگر جدائی میں انتظار، تجسس، اور امید کا عذاب شامل ہوتا ہے۔ امید اور اضطراب کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شامل ہوتا ہے۔ کبھی کوئی خاک میں اتر کر جدا ہوتا ہے اور کوئی زندہ رہ کر فاصلے کی دھند میں گم ہو جاتا ہے۔

لیکن محبت جسم کی محتاج نہیں، یہ دل سے دل تک بندھا کر محبت بھر رشتہ جو وقت، فاصلہ اور موت کے بعد بھی قائم رہتی ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ جدائی کوئی نئی بات نہیں، یہ انبیاء کا بھی امتحان رہی ہے۔ حضرت یعقوبؑ اپنے نختِ جگر حضرت یوسفؑ کی جدائی میں چالیس برس تک اشک بار رہے، یہاں تک کہ غم کی شدت سے آنکھوں کی بینائی بھی جاتی رہی:

وَتَوَلَّىٰ عَنْهُمْ وَقَالَ يَا أَسْفَىٰ عَلَىٰ يُوسُفَ وَأَبْيَضَّتْ عَيْنَاهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيمٌ۔۔ اور یعقوبؑ نے ان سے منہ پھیر لیا اور کہا ہائے افسوس یوسفؑ پر اور غم کے سبب ان کی آنکھیں سفید ہو گئیں، مگر وہ ضبط کیے ہوئے تھے۔ (یوسف: 84)

حضور نبی کریم ﷺ نے مکہ سے جدائی کا کرب سہا، وہ شہر جہاں بچپن کی یادیں تھیں، حضرت خدیجہؓ کی رفاقت تھی، اور ابوطالب کی شفقت، مگر رسول اکرم ﷺ کی شفقت، مگر رسول اکرم ﷺ نے مکہ مکرمہ سے ہجرت کے وقت جس درد کا اظہار فرمایا، وہ محض ایک شہر سے جدائی نہ تھی بلکہ یادوں، نسبتوں اور روحانی تعلق سے ہچکڑنے کا کرب تھا: اے مکہ! تو مجھے کتنا محبوب ہے، اگر میری قوم مجھے تجھ سے نہ نکالتی، تو میں تیرے سوا کہیں اور سکونت اختیار نہ کرتا۔ یہ الفاظ محض شہر سے محبت نہیں، بلکہ یادوں، نسبتوں اور روحانی وابستگی کا اظہار تھے۔ (صحیح ابن حبان)

یہ الفاظ انسانی زندگی کے ہر لمحے کیلئے سبق ہیں، جدائی اور محرومی کے باوجود، وصال کی امید اور طلب ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ اسی طرح حضرت موسیٰؑ کی والدہ کا اپنے جگر کے ٹکڑے شیر خوار بچے کو ٹوکری میں رکھ کر دریا کے سپرد کرنا صبر اور توکل کی وہ مثال ہے جس پر قرآن خود شاہد ہے:

وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّ مُوسَىٰ أَنْ أَرْضِعِيهِ فَإِذَا خَفَتْ عَلَيْهِ فَأَلْقَيْهِ فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِي وَلَا تَحْزَنِي إِنَّا رَافِقُوهُ وَإِلَيْكَ وَجَعَلُوهُ مِنَ الْمُرْسَلِينَ (القصص: 7) ہم نے موسیٰ کی ماں کو وحی کی کہ اسے دودھ پلا، پھر جب خوف ہو تو اسے دریا میں ڈال دینا، نہ ڈرنا نہ غم کرنا۔ ہم اس کو تمہارے پاس واپس پہنچادیں گے اور (پھر) اُسے پیغمبر بنادیں گے۔

انبیاء کی زندگی بھی طلب وصال کا عملی مظاہرہ ہے۔ حضرت موسیٰؑ کی والدہ نے بچے کو دریا میں چھوڑا، مگر یہ عمل خوف یا صدمے کا نتیجہ نہیں تھا، بلکہ اعتماد اور وصال کی امید کا سبق تھا۔ یہ واقعہ اس بات کی علامت ہے کہ فراق کے بعد بھی طلب، اعتماد اور وصال کی امید پیدا کرتی ہے۔ یہ تمام واقعات اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ جدائی انسانی تجربے کا محض ایک نفسیاتی پہلو نہیں بلکہ گہرا روحانی راز ہے۔ حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ بھی برسوں ایک دوسرے سے جدا رہے، یہاں تک کہ آدمؑ نے پوری دنیا پیدا کر لی تھی تاکہ اپنے محبوب کو پا سکیں۔

ازلی فراق کے شاعر مولانا جلال الدین رومیؒ کے نزدیک انسان کی ساری بے قراری کی جڑ تک ہی ہے، اصل سے جدائی۔ مثنوی کا آغاز ہی فراق کی چیخ اور فریاد سے ہوتا ہے۔ رومیؒ اس فراق کو انسان کی پوری نفسیات کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسان کا ہر سوال، ہر تلاش اور ہر بے قراری اسی ایک حقیقت سے جنم لیتی ہے کہ وہ اپنے اصل سے جدا ہو چکا ہے۔ رومیؒ نے اس راز کو اپنی مثنوی میں نہایت گہرے اور ہمہ گیر انداز میں بیان کیا ہے۔

جب مولانا جلال الدین رومیؒ اپنے مرشد شمس تبریزؒ سے جدا ہوئے تو یہ جدائی انہیں ایسا توڑ گئی کہ وہ دنیا سے بے خبر، دیوانہ وار پھرنے لگے اور اسی فراق نے مثنوی کو جنم دیا۔ مثنوی کا آغاز ہی فراق کی صدا ہے:

بشنوا زنی چون حکایت می کند

از جدائی ہا شکایت می کند

بانسری کی سن، وہ کیا کہانی سناتی ہے، وہ جدائیوں کا شکوہ ہے۔

ہر کسی کو دور ماند از اصل خویش

باز جوید روزگار وصل خویش

جو اپنے اصل سے جدا ہو جائے، وہ ہمیشہ وصال کے دنوں کی تلاش میں رہتا ہے۔

کز نیستان تا مرا بریدہ اند

از نفیرم مردوزن نالیدہ اند

جب سے مجھے نیستان (اصل وطن) سے کاٹا گیا ہے، میری فریاد پر مردوزن سب روئے ہیں۔

یہ نیستان محض ایک استعارہ نہیں بلکہ عالم ارواح کی علامت ہے۔ بانسری کا سوز اس روح کی آواز اور سوز ہے جو اپنے اصل مقام سے کاٹ دی گئی ہو۔ جو اپنے اصل وطن، اپنے حقیقی محبوب سے جدا ہو کر اس دنیا میں آگئی ہے اور اب ہر لمحہ اسی وصال کی جستجو میں سوز و گداز کے ساتھ نالہ زن ہے۔ رومیؒ کے نزدیک انسان اگر اپنی بے چینی کو سمجھنا چاہتا ہے تو اسے اپنی جدائی کو سمجھنا ہو گا، کیونکہ وصال کی طلب فراق کے شعور کے بغیر پیدا نہیں ہوتی۔ رومیؒ کہتے ہیں، یہ بانسری کی آواز دراصل روح کی وہ آواز، سوز اور فریاد ہے، جو اپنے اصل وطن، اپنے حقیقی محبوب، اور اللہ تعالیٰ سے جدائی کا نوحہ ہے۔



قرآن کریم انسان کی اسی باطنی کیفیت کی طرف متوجہ کرتا ہے، جب وہ انسان کی تخلیق کو محض جسمانی واقعہ نہیں بلکہ ایک روحانی تاریخ کے تسلسل کے طور پر پیش کرتا ہے۔ انسان اس دنیا میں محض پیدا نہیں ہوا، بلکہ بھیجا گیا ہے۔ اور بھیجے جانے کا تصور خود اس بات کی دلیل ہے کہ کہیں نہ کہیں سے جدائی واقع ہوئی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن انسان کو بار بار اس بات کی یاد دہانی کرتا ہے جو پہلے معلوم ہو، جو پہلے دیکھی جا چکی ہو، اور جو پہلے تجربے میں آ چکی ہو۔ اگر انسان نے کبھی اپنے رب کو نہ جانا ہو تا تو اسے یاد دلانے کا مفہوم ہی بے معنی ہو جاتا۔ یہ محض

ایک تاریخی واقعہ نہیں بلکہ انسان کی روحانی اساس ہے۔ ہر روح نے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کو پہچانا، اس کی قربت کو محسوس کیا اور اسی قربت میں سکون پایا۔ اسی لیے جب انسان اس دنیا میں آتا ہے تو اس کے دل میں ایک ایسی پیاس موجود ہوتی ہے جو کسی مادی شے سے نہیں بجھتی۔ یہ پیاس دراصل اسی قرب کی پیاس ہے۔ دراصل عالم ارواح اصل وطن ہے، یہ دنیا ہمارا پہلا گھر نہیں، اور نہ ہی یہ دنیا ہم سب کا اصل وطن ہے۔ یہاں ہم مسافر ہیں، پردیسی ہیں۔ ہم ایک ایسے عالم سے آئے ہیں جہاں نہ بھوک تھی، نہ خوف، نہ غم تھا، نہ خواہش، نہ رشتہ، نہ صلہ، بس ایک ذات تھی، اور اسی کی قربت۔ یہ طلب، انسانی زندگی کے تمام تجربات کا محور ہے۔ دنیاوی تعلقات، رشتے، اور خوشیاں سب اس طلب کی آئینہ دار ہیں۔

اگرچہ انسان ان میں سکون تلاش کرتا ہے، مگر وہ سکون عارضی ہوتا ہے۔ اصل سکون وہ ہے جو اصل محبت سے وصال کے لمحے میں محسوس ہوتا ہے۔ قرآن کریم انسان کی اس فطرتی طلب کی طرف بار بار توجہ دلاتا ہے اور اس حقیقت کو قرآن عہد الست کے ذریعے واضح کرتا ہے:

وَإِذْ أَخَذْنَا مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَىٰ شَهِدْنَا (الاعراف: 172)

اور (یاد کیجئے) جب آپ کے رب نے اولاد آدم کی پشتوں سے ان کی نسل نکالی اور ان کو انہی کی جانوں پر گواہ بنایا اور فرمایا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ وہ بول اٹھے ہاں، ہم گواہی دیتے ہیں۔ یہی وہ عہد ہے جو ہماری فطرت میں دفن ہے، اور یہی وہ یاد ہے جو ہمیں چین سے جینے نہیں دیتی۔ یہی وہ عہد ہے جو انسانی فطرت میں پیوست ہے اور یہی وہ یاد ہے جو دل کے کسی نہ کسی گوشے میں ہمیشہ زندہ رہتی ہے، چاہے دنیا کی مصروفیات اسے کتنا ہی دھندلا کیوں نہ دیں۔ یہ آیت انسان کی اندرونی جستجو کی بنیاد ہے۔ انسان کی روح یاد رکھتی ہے، اور وہ عہد جو ازل میں ہوا تھا، ہر زندگی کے لمحے میں اس کو یاد دلاتا ہے۔ یہی شعور طلب کی بنیاد ہے۔ وہ طلب جو روح کو اس کے اصل سے جوڑتی ہے اور دنیا کے رنگ آلود تعلقات سے الگ کر کے روحانی زندگی کی راہ پر گامزن کرتی ہے۔

حضرت سلطان باہوگی صوفیانہ صدائے اسی کیفیت کو سادہ مگر نہایت گہرے الفاظ میں بیان کیا:

اساں پردیسی ساڈا وطن دوراڈھا

باہودم دم غم سوا یاہو

ہم پردیسی ہیں، ہمارا وطن بہت دور ہے، اور ہر سانس کے ساتھ فراق کا غم بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ غم مایوسی کا غم نہیں بلکہ یاد کا غم ہے۔ وہ یاد جو روح کو چین

سے بیٹھنے نہیں دیتی، اور وہی یاد جو آخر کار انسان کو اس کے اصل کی طرف لوٹا دیتی ہے۔ یہ الفاظ اس بات کی عکاسی کرتے ہیں کہ انسان دنیا میں پر دیسی ہے اور روحانی طلب اسے مسلسل اصل کی طرف کھینچتی ہے۔ طلب اور وصال کا یہ سلسلہ انسانی زندگی کا سب سے بنیادی تجربہ ہے۔ یہی انسان کو علم، محبت، اور معرفت کی راہ پر گامزن کرتا ہے۔

طلب وصال کا سب سے مؤثر ذریعہ ذکر الہی ہے۔ قرآن فرماتا ہے: وَإِذْ سَأَلْنَاكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ (البقرہ: 186) اور (اے پیغمبر) جب تم سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں تو (کہہ دو کہ) میں تو (تمہارے) پاس ہوں جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں۔

جب انسان طلب کے ساتھ اپنے رب کی یاد میں ڈوبا رہتا ہے، تو فراق کی کیفیت نرم ہو جاتی ہے اور وصال کے لمحات قریب محسوس ہونے لگتے ہیں۔ یہی شعور ہمیں انبیائے کرام علیہم السلام کی زندگیوں میں بھی نظر آتا ہے۔ حضرت آدمؑ کا دنیا میں آکر جنت کی یاد میں تڑپنا، حضرت یعقوبؑ کی آنکھوں کا سفید ہو جانا، حضور نبی کریم ﷺ کا مکہ سے وداع کے وقت درد بھرے الفاظ کہنا، یہ سب اسی فراق کے مختلف مظاہر ہیں۔ ان ہستیوں کا غم دنیاوی نہیں تھا، بلکہ ایک اعلیٰ درجے کا روحانی شعور تھا، جس میں جدائی محض نقصان نہیں بلکہ امتحان بن جاتی ہے۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ قرآن قرب حق اور وصال کا راستہ، قرب حق جدائی کا دوا، جدائی کے ساتھ ساتھ قرب کی بھی خبر دیتا ہے۔ قرآن مجید انسان کی اس قربت کو اس طرح بیان کرتا ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ (ق: 16)

ہم نے انسان کو پیدا کیا اور اس کے دل میں جو خیالات اٹھتے ہیں، ان سے ہم واقف ہیں اور ہم اس کی رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: بندہ اپنے رب کے سب سے زیادہ قریب سجدے کی حالت میں ہوتا ہے، لہذا تم خوب دعا کیا کرو۔ (صحیح مسلم 482)

اصل وصال نفس کی موت سے شروع ہوتا ہے۔ یہ قرب، جو انسان کے جسم و جان سے بھی زیادہ قریب ہے، اس وقت محسوس ہوتا ہے جب دل کے تمام پردے اٹھ جاتے ہیں اور روح اپنی محدودیتوں سے آزاد ہو کر اصل محبوب کے ساتھ وصال حاصل کرتی ہے۔ اصل جدائی فاصلے کی نہیں، غفلت کی ہے۔ وصال کا راستہ نفس کی موت اور تطہیر سے گزرتا ہے۔ صوفیاء کرام نے انسان کو وصال کی راہ میں عبادت اور ذکر الہی کی تعلیم دی۔ سجدہ، ذکر اور مراقبہ انسان کی روحانی توانائی کو پاک کرتے ہیں، نفس کی خواہشات کو کمزور کرتے ہیں، اور دل کو وصال کیلئے تیار کرتے ہیں۔ جیسے درخت کی جڑیں زمین میں مضبوط ہوں اور پانی اسے زندہ رکھے، اسی طرح روح کی جڑیں ذکر اور فنا میں مضبوط ہوتی ہیں۔

انسان کے اندر موجود فراق کی کیفیت میں ہم نے دیکھا کہ وہ فراق خود طلب کا بیج ہے، جو روحانی ترقی، معرفت، اور وصال کی جستجو کو پیدا کرتا ہے، جو ہمیں یہ سمجھنے کی دعوت دیتا ہے کہ فراق ایک جرم یا نقصان نہیں، بلکہ روح کی بیداری اور طلب کی پہلی کرن ہے۔ جیسے سورج کی پہلی روشنی اندھروں میں روشنی پیدا کرتی ہے، اسی طرح طلب وصال انسان کی روح کے اندھیروں کو منور کرتی ہے۔ آئیے اب ہم اسی طلب کو عملی زندگی، تصوف اور تزکیہ نفس کے تجربات کے ساتھ مزید سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، تاکہ فراق کی کیفیت انسان کو علم، محبت اور روحانی بصیرت کی راہ پر لے جائے۔

انسان کی فطرت میں موجود فراق اور طلب اسے اپنی روحانی منزل کی طرف مائل کرتے ہیں، لیکن یہ مانگی خود بخود وصال کی ضمانت نہیں۔ فراق اور طلب کی شدت کے باوجود، اگر انسان اپنی دنیاوی خواہشات، تکبر، حسد، اور نفس کی ضد سے قابو نہ پائے، تو یہ طلب بے معنی رہ جاتی ہے۔ اسی لیے

صوفیاء کرام نے انسان کو پہچاننے، دل کی صفائی کرنے، اور اپنے اندرونی تضادات کو دور کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ یہ عمل تزکیہ نفس کہلاتا ہے۔ وہ عمل جو انسان کو اپنی حقیقت، اس کی حدود، اور رب کی قربت سے صحیح تعلق قائم کرنے کی طاقت دیتا ہے۔ قرآن کریم تزکیہ نفس کی اہمیت کو اس طرح بیان کرتا ہے: **فَإِذَا فُلِحَ مَنْ تَزَكَّى**۔۔۔ یقیناً وہ کامیاب ہوا جس نے اپنے نفس کو پاک کر لیا۔ (الاعلیٰ: 14)

تزکیہ نفس کا مقصد محض گناہوں سے بچنا نہیں، بلکہ نفس کی وہ تمام عادات، خیالات اور خواہشات دور کرنا ہے جو روح کو اصل محبوب سے جدا رکھتی ہیں۔ صوفیاء کے نزدیک طلب کا حقیقی مرحلہ فنا فی اللہ ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں انسان اپنے وجود کی تمام محدودیتوں، خواہشات، اور فکری بندھنوں سے آزاد ہو کر محض اللہ تعالیٰ کی ذات میں اپنی بقا پاتا ہے۔ **وَمَنْ كَانَ فِي هَذِهِ أَعْمَى فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَى وَأَضَلُّ سَبِيلًا**۔۔۔ جو دنیا میں اندھا رہا، وہ آخرت میں بھی اندھا ہو گا اور راستہ سے بہت دور ہٹے گا۔ (الاسراء: 72)

یہ فرمائش واضح کرتی ہے کہ روحانی بصیرت کے بغیر انسان فراق کے غم میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔ دل کا اندھا ہونا دنیاوی حجاب، غفلت اور نسیان کی وجہ سے ہے۔ یہی حجاب رفع کرنے کا راستہ تزکیہ نفس اور فنا فی اللہ ہے۔ حضرت ابن عربیؒ فرماتے ہیں کہ طلب کے ساتھ ساتھ تزکیہ اور فنا انسان کو اس مقام پر لے آتے ہیں جہاں دل کی صفائی کے بعد روح نور حق میں منور ہو جاتی ہے، حجاب و پردے اٹھ جاتے ہیں، انسان اپنے اصل محبوب کے قرب کو محسوس کرتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسان اپنے اندر واحد ذات کے جلوے دیکھتا ہے اور فراق کا شعور وصال میں بدل جاتا ہے۔ حضرت مولانا رومؒ نے اسے یوں بیان کیا:

عاشقِ باش و عاشقِ راعاشقِ کن

تا کی یابی جان را در وصل جانان

محبت میں ڈوب جا اور دوسرے کو بھی محبت کا طالب بنا دے، تب ہی جان کو وصال محبوب میں پائے گا۔

فنا فی اللہ میں انسان اپنی ذاتی محدودیتوں کو پس پشت ڈال دیتا ہے اور اپنی ذات کے ہر اظہار کو حقیقت وحدت کیلئے قربان کر دیتا ہے۔ اس مقام پر دل کی ہر دھڑکن، ہر سوچ، اور ہر احساس محض اللہ کی یاد اور حضور میں ڈوب جاتا ہے۔ صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ انسان کی روح اور فطری طلب کے اندر ایک خالی پن ہمیشہ موجود رہتا ہے، جو کسی دنیاوی چیز سے نہیں بھرتا۔ حضرت ابن عربیؒ کہتے ہیں:

روح کا اصل سکون اس کی پیدائش کے مقام میں ہے، اور وہ مقام وہی ہے جہاں اس نے اللہ کی قربت کا مزہ چکھا تھا۔

یہی وہ مقام ہے جس کی جستجو انسان کو فطر تارہتی ہے۔ طلب، نہ صرف روحانی ترقی کا ذریعہ ہے بلکہ انسان کے اخلاق، فکر اور محبت کی گہرائی کو بھی بڑھاتی ہے۔ صوفیاء اسے "موتو قبل ان تموتو" یعنی مرنے سے پہلے مر جانا کہتے ہیں۔ یعنی نفس کی موت، تاکہ روح اپنے رب کے قرب کا ذائقہ چکھ سکے۔ یہ قرب ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اصل مسئلہ فاصلے کا نہیں بلکہ احساس کے زائل ہو جانے کا ہے۔ انسان اپنے رب سے دور نہیں ہوا، بلکہ اس قرب کے شعور سے غافل ہو گیا ہے۔ یہی غفلت فراق کو دائمی دکھ میں بدل دیتی ہے، اور یہی بیداری اس فراق کو وصال کے سفر کا نقطہ آغاز بنا دیتی ہے۔

یہ تحریر کسی نئی بات کی دعوت نہیں دیتی، بلکہ ایک پرانی، بھولی بیری یاد کو بیدار کرنے کی کوشش ہے۔ یہ یاد اصل وطن کی ہے، اصل محبوب کی ہے، اور اس ازلی عہد کی ہے جو ہم نے اپنے خالق سے کیا تھا۔ جو اس مضمون کو پڑھے، وہ محض الفاظ نہ پڑھے بلکہ اپنے اندر جھانکے۔ کیونکہ یہ داستان کسی

ایک فرد کی نہیں، بلکہ ہر اس روح کی ہے جو اپنے اصل کی طرف لوٹنے کیلئے بے چین ہے۔ کیونکہ ہم سب پر دیسی ہیں، اور ہماری منزل ایک ہی ہے۔ اب واپسی کی تڑپ نے بے چین کر رکھا ہے۔ ہم سب نے اپنے محبوب کو دیکھا تھا۔ ہم نے اس سے وعدہ کیا تھا۔ پھر ہمیں جدا کر دیا گیا، تب سے یہ دنیا جدائی کی سر زمین ہے۔ ہر محبت، ہر آنسو، ہر کمی اسی ایک عظیم فراق کی یاد دہانی ہے۔

اور ہر سچی روح آخر کار اسی محبوب کی طرف لوٹنے کیلئے بے چین رہتی ہے کیونکہ اصل وطن وہی ہے، اور اصل سکون بھی وہیں ہے۔ یہی شعور جب رفتہ رفتہ طلب میں بدلے گا، اور طلب انسان کو اس راہ پر لے جائے گی جو فراق سے شروع ہو کر وصال پر منتج ہوتی ہے تو انسان کو اپنی اصلی گھر کیلئے مضطرب کر دیتی ہے، کیونکہ فراق اگر نہ ہو تو وصال کی قدر بھی نہیں ہوتی۔

کیونکہ جب تک انسان یہ نہ سمجھے کہ وہ کیوں بے چین ہے، وہ کس چیز سے جدا ہوا ہے اور اس کی روح کس چیز کی متلاشی ہے، اس وقت تک نہ عبادت میں ذوق پیدا ہوتا ہے، نہ دعائیں سوز، اور نہ ہی ذکر میں حلاوت۔ یہ یاد اصل وطن کی ہے، اصل محبوب کی ہے، اور اس ازلی عہد کی ہے جو ہم نے اپنے خالق سے کیا تھا۔ یہ داستان کسی ایک فرد کی نہیں، بلکہ ہر اس روح کی ہے جو اپنے اصل کی طرف لوٹنے کیلئے بے چین ہے۔ کیونکہ ہم سب پر دیسی ہیں، اور ہماری منزل ایک ہی ہے۔

ایمان، فولاد اور ریاست

یہ تاریخ کا اٹل فیصلہ ہے کہ کچھ رشتے زمانے کے کٹھرے میں تولے نہیں جاتے، وہ زمانے کو تولتے ہیں۔ کچھ تعلقات سفارت خانوں کی فائلوں میں نہیں پلتے، وہ دلوں کی دھڑکنوں میں زندہ رہتے ہیں۔ تاریخ اقوام میں کچھ رشتے ایسے ہوتے ہیں جو محض معاہدوں، مفادات یا سفارتی بیانات کے مرہونِ منت نہیں ہوتے، بلکہ وہ ایمان، تہذیب، قربانی اور مشترکہ مقدس اقدار کے تاروں سے بُنے جاتے ہیں۔ پاکستان اور سعودی عرب کا تعلق بھی انہی نادر رشتوں میں شمار ہوتا ہے۔ ایک ایسا تعلق جس کی بنیاد کاغذ پر لکھی سطروں سے نہیں بلکہ دلوں میں مثبت عقیدت سے رکھی گئی ہے۔ پاکستان اور سعودی عرب کا تعلق بھی اسی قبیل کا رشتہ ہے، ایسا رشتہ جو معاہدوں سے پہلے وجود میں آیا اور معاہدوں کے بعد بھی ایمان کی طرح باقی رہے گا۔

حرین شریفین کی حفاظت وہ مرکز ہے جہاں پاکستان کے اجتماعی شعور، قومی غیرت اور ایمانی حمیت ایک نقطے پر آکر سمٹ جاتے ہیں۔ جب مکہ و مدینہ کا نام لیا جاتا ہے تو پاکستان کے طول و عرض میں صرف لب جنبش نہیں کرتے، دل بھی لرز اٹھتے ہیں۔ حرین شریفین کی حفاظت کسی ریاستی پالیسی کا باب نہیں بلکہ ہر پاکستانی کے ایمان کا حصہ ہے۔ یہ محض ایک سفارتی موقف نہیں بلکہ ہر پاکستانی کے دل میں موجزن وہ عہد ہے جس کے تحت حرم مکہ و مدینہ کی طرف اٹھنے والی ہر میلی آنکھ کے مقابل اپنی جان قربان کرنا ایمان کا عین تقاضا سمجھا جاتا ہے۔

حرین شریفین کی حفاظت کسی ریاستی پالیسی کا باب نہیں بلکہ ہر پاکستانی کے ایمان کا حصہ ہے۔ یہ وہ مقدس امانت ہے جس کیلئے جان دینا قربانی نہیں، سعادت سمجھی جاتی ہے؛ اور جس پر آنچ آجائے تو پاکستان کا ہر فرد سپاہی بن جاتا ہے۔ بغیر وردی، بغیر حکم، صرف ایمان کے بل پر۔ ایسے میں جب پاکستان اور سعودی عرب کے درمیان دفاعی تعاون کی بات ہوتی ہے تو وہ محض طیاروں، ہتھیاروں یا مالی معاملات کی گفتگو نہیں رہتی، بلکہ ایک عہد کی تجدید بن جاتی ہے۔ وہ عہد جو خونِ شہداء، دعاؤں، اور قبلہٴ اول و ثانی کی حرمت سے بندھا ہوا ہے۔

اسی تاریخی، ایمانی اور تہذیبی پس منظر میں جب پاک۔سعودی دفاعی تعاون کی بات کی جاتی ہے تو وہ محض اسلحہ، طیاروں یا معاہدوں کی گفتگو نہیں رہتی، بلکہ ایک مشترکہ اسلامی دفاعی شعور کی جھلک بن جاتی ہے۔ جے ایف۔17 تھنڈر جیسے دفاعی منصوبے اسی بڑے تناظر میں اپنی معنویت پاتے ہیں۔ یہ صرف ایک جنگی جہاز نہیں بلکہ اعتماد، خود مختاری اور برادرانہ انحصار کی علامت ہے۔ عالمی سیاست کے بدلتے ہوئے منظر نامے میں، جہاں طاقتیں مفادات کے ترازو میں دوستی تولتی ہیں اور وعدے ضرورت کے موسم تک محدود رہتے ہیں، پاکستان اور سعودی عرب کا تعلق ایک اخلاقی استثنائے کر ابھرتا ہے۔

جے ایف۔17 تھنڈر جیسے دفاعی منصوبے اسی عہد کی جدید تعبیر ہیں۔ یہ فولاد سے بنے پرندے نہیں بلکہ اعتماد، خودداری اور مشترکہ دفاعی شعور کے اڑتے ہوئے استعارے ہیں لیکن تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ جب بھی امتِ مسلمہ نے ایک قدم اتحاد کی طرف بڑھایا، دشمن طاقتیں اضطراب میں مبتلا ہو گئیں۔ آج بھی سوال یہی ہے: کیا مسلم دنیا کے دل ایک ساتھ دھڑکنے دیے جائیں گے؟ کیا اس ابھرتے ہوئے اسلامی دفاعی اشتراک کو وہ قوتیں پہنچنے دیں گی جو مسلم دنیا کے کسی بھی مشترکہ قدم کو اپنے مفادات کیلئے خطرہ تصور کرتی ہیں؟ اور کیا وہ قوتیں، جو مسلم اتحاد کو اپنے مفادات کیلئے خطرہ سمجھتی ہیں، اس ابھرتی ہوئی یکجہتی کو خاموشی سے قبول کر لیں گی؟

کیا پاکستان اور سعودی عرب کا یہ دفاعی اشتراک صرف ایک معاہدہ رہے گا، یا امت مسلمہ کے اجتماعی تحفظ کی بنیاد بنے گا؟ اسی سوال کے گرد یہ تحقیقی مطالعہ گردش کرتا ہے۔ جہاں دفاعی حکمت عملی، عالمی سیاست، اور امت مسلمہ کے اجتماعی مستقبل کے خدوخال باہم گتھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سعودی جدید فضائی طاقت کے ہوتے ہوئے کیا جے ایف۔17 کی ضرورت ہے؟ یہ تزویراتی سوال بظاہر سادہ مگر باطن میں نہایت عمیق ہے کہ جدید ترین لڑاکا طیاروں کے انبار کے باوجود کیا سعودی عرب کو جے ایف۔17 تھنڈر جیسے طیارے کی حاجت محسوس ہو سکتی ہے؟ عسکری تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ محض طاقت کا انبار ہی دفاع کی ضمانت نہیں ہوتا، بلکہ توازن، خود مختاری اور حکمت عملی وہ عناصر ہیں جو اقوام کی سلامتی کا اصل زادِ راہ بنتے ہیں۔ بین الاقوامی دفاعی مطالعات میں یہ اصول تسلیم شدہ ہے کہ کسی ریاست کی عسکری ضروریات کا تعین صرف اس کے موجودہ ہتھیاروں کی ”برتری“ سے نہیں بلکہ تزویراتی خود مختاری، لاگت، رسد، اور سیاسی انحصار سے ہوتا ہے۔

سعودی عرب کے پاس اگرچہ دنیا کے جدید ترین لڑاکا طیارے موجود ہیں، تاہم جے ایف۔17 تھنڈر جیسے 4.5 جزیٹن طیارے کی ممکنہ شمولیت کو محض تکنیکی موازنہ کی سطح پر دیکھنا تحقیقی سطحی پن ہو گا۔ اصل سوال یہ ہے کہ آیا ریاض اپنے فضائی دفاع کو تنوع اور سیاسی پلک دینا چاہتا ہے۔

ہنگامہ دیش کی جانب سے جے ایف۔17 تھنڈر میں دلچسپی کے اظہار کے بعد ذرائع ابلاغ میں یہ سرگوشیاں بھی گونجنے لگیں کہ حرمین شریفین کا امین، سعودی عرب بھی اس پاکستانی ساختہ طیارے کی طرف متوجہ ہے۔ گویا عالمی مارکیٹ میں جے ایف۔17 لڑاکا طیارہ کی ساکھ کو تقویت ملی ہے۔ اسی تناظر میں سعودی عرب کی مبینہ دلچسپی کو دفاعی سفارت کاری کے ایک نئے باب اور نئے زاویہ کے طور پر دیکھا جا رہا ہے۔

پاکستانی ذرائع کے مطابق ریاض، اسلام آباد کو دیے گئے دو ارب ڈالر کے قرض کو دفاعی معاہدے، خصوصاً جے ایف۔17 تھنڈر کی خریداری میں تبدیل کرنے پر غور کر رہا ہے، گویا دو ارب ڈالر کے قرض کو دفاعی معاہدے میں بدلنے کی تجویز اس امر کی علامت ہے کہ دفاع اب محض عسکری نہیں بلکہ مالی و سفارتی آلے کے طور پر بھی استعمال ہو رہا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے سفارت اور دفاع ایک ہی کشتی کے دو مسافر بن گئے ہوں۔

ترجمان دفتر خارجہ پاکستان نے حسب روایت احتیاط کا دامن تھامتے ہوئے کہا کہ پاکستان اور سعودی عرب دفاع سمیت کئی شعبوں میں تعاون کرتے ہیں، تاہم کسی مخصوص پلٹ فارم یا مالی ایڈجسٹمنٹ سے متعلق علم نہیں۔ مگر اسی خاموشی میں سوالات نے جنم لیا۔ کیا سعودی عرب، جس کے پاس پہلے ہی جدید ترین مغربی طیارے موجود ہیں، پاکستان کے جے ایف۔17 میں کیوں دلچسپی لے گا؟ اور جب امریکا ایف۔35 جیسے جدید ترین جہاز دینے پر آمادہ ہے تو پھر یہ کشش کیوں؟

دفتر خارجہ پاکستان کا محتاط موقف اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ اس نوعیت کے معاہدے اسٹریٹجک ابہام کے اصول کے تحت رکھے جاتے ہیں۔ تاہم بھارت اور پاکستان میں یہ سوال شدت سے اٹھایا جا رہا ہے کہ کیا سعودی عرب واقعی جے ایف۔17 جیسے طیارے کی ضرورت محسوس کرتا ہے؟ جب ایف۔35 دستیاب ہو سکتا ہے تو متبادل کیوں؟ یہ سوالات دراصل مغربی عسکری اجارہ داری پر عدم اعتماد کے بڑھتے ہوئے رجحان کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

ان سوالات کے جواب سے قبل ضروری ہے کہ ہم سعودی فضائی قوت کے موجودہ خدوخال اور جے ایف۔17 کی فنی و حربی خصوصیات کا غیر جانب



دارانہ جائزہ لیں، جو جذبات کی بجائے حقائق کی بنیاد پر ہو اور تحقیقی دیانت کا بھی تقاضا ہے کہ کسی بھی نتیجے سے قبل سعودی فضائیہ کی موجودہ ساخت اور جے ایف-17 کی تکنیکی، عملی اور لاجسٹک خصوصیات کا تقابلی مطالعہ کیا جائے، نہ کہ محض نسلی درجہ بندی پر انحصار کیا جائے۔

سعودی فضائیہ کے تاجِ زر میں یوروفائٹر ٹائی فون سرفہرست ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ سعودی عرب کا فضائی بیڑا ایف-15 ایس / سی، اور ٹورناڈو آئی ڈی ایس جیسے طاقتور طیاروں پر مشتمل ہے۔ پانچ اعشاریہ چار جزیں کے یہ ملٹی رول جہاز برق رفتاری، جدید سینسرز اور مہلک وار کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ایف-15 ایس اور ایف-15 سی جیسے چوتھی جزیں کے طیارے بھی موجود ہیں، جن کی قوتِ ضرب سے فضائیں لرزتی ہیں۔ برطانیہ واطلی کے مشترکہ شاہکار ٹورناڈو آئی ڈی ایس بھی اس بیڑے کا حصہ ہیں، جبکہ ہیلی کاپٹر، ایئر ٹینکرز اور تربیتی جہاز الگ داستان سناتے ہیں۔ یہ جہاز تکنیکی لحاظ سے بے مثال ہیں، مگر مکمل طور پر مغربی سپلائی چین پر انحصار کرتے ہیں۔ اپ گریڈ، ایسپیئر پارٹس اور سافٹ ویئر کنٹرول بیرونی ہاتھوں میں ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جہاں عسکری برتری سیاسی کمزوری میں بدل سکتی ہے۔

نومبر میں ٹرمپ نے ففٹھ جزیں سنٹیلٹھ ایف-35 طیارے سعودی عرب کو دینے کی آمادگی ظاہر کی — یہ وہ جہاز ہے جسے جدید فضائی جنگ کا استعارہ سمجھا جاتا ہے۔ انتہائی مہنگا، مکمل امریکی کنٹرول میں ڈیٹا اور آپریشنل خود مختاری محدود۔ مگر اس کے برعکس اس کے مقابل جے ایف-17 تھنڈر بلاک تھری، اگرچہ ففٹھ جزیں نہیں، مگر اے ای ایس اے ریڈار، لانگ رینج بی وی آر میزائلز اور 4.5 جزیں ملٹی رول صلاحیت کے ساتھ ایک متوازن اور موثر پلیٹ فارم ہے، جو محدود وسائل میں زیادہ نتائج دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ کم لاگت، زیادہ دستیابی، قابلیت، بمقابلہ کنٹرول کے موثر فرق کے بنیادی تصور کو واضح کرتا ہے۔ انہی خصوصیات کی بناء پر تمام دفاعی ماہرین موجودہ دور کیلئے اسے ایک بہترین نعم البدل کے طور پر انتہائی موزوں سمجھتے ہیں۔

پاکستان اس طیارے کو آذربائیجان، میانمار اور ناٹجیریا کو فروخت کر چکا ہے، جبکہ عراق اور لیبیا کے ساتھ معاہدے طے پا چکے ہیں۔ یہ معاہدے اس بات کا ثبوت ہیں کہ جے ایف-17 محض نظریاتی نہیں بلکہ عملی، آزمودہ اور قابلِ برآمد پلیٹ فارم ہے۔ وزیر دفاع خواجہ محمد آصف کے بقول، انڈیا کے ساتھ جنگ میں ان طیاروں کی عملی آزمائش اور جنگی ساکھ ثابت ہو چکی ہے، اور طلب کی یہ کیفیت ہے کہ شاید پاکستان کو مستقبل قریب میں آئی ایم ایف کی دہلیز پر بھی نہ جانا پڑے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اسی کامیابی کی بازگشت ریاض تک پہنچی ہے؟

اگرچہ دونوں ممالک نے کسی معاہدے کی تصدیق یا تردید نہیں کی، مگر دفاعی ماہرین کے نزدیک پاکستان اور چین کے اشتراک سے تیار کردہ یہ طیارہ سعودی عرب کیلئے ایک قابلِ عمل آپشن ہو سکتا ہے — جے ایف-17 پاکستان اور چین کے اشتراک کا نتیجہ ہے، جو سعودی عرب کو چین کے ساتھ بالواسطہ دفاعی قربت اور امریکا کے متبادل سپلائی چین فراہم کر سکتا ہے۔ خصوصاً ایسے وقت میں جب عالمی سیاست میں اتحاد عارضی اور مفادات مستقل ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ نکتہ سعودی خارجہ پالیسی میں کثیر القطبی رجحان سے ہم آہنگ ہے۔ دفاعی ماہرین یاد دلاتے ہیں کہ کسی بھی طیارے کی خرید محض نام یا طاقت پر نہیں، بلکہ ضرورت، ہتھیاروں کی ہم آہنگی، لاگت، اور سپلائر کے اعتماد پر ہوتی ہے۔ دفاعی ماہرین کے مطابق کسی بھی خریداری میں

چار عناصر بنیادی ہوتے ہیں۔ مشن کی ضرورت، ہتھیاروں کی مطابقت لاگت اور مینٹیننس، سپلائر کی سیاسی ساکھ۔ پاکستان ان چاروں میں جہاں ایک کم خطرہ کے طور پر ابھرتا ہے وہاں ایک قابل اعتماد شراکت دار کے طور پر ابھرا ہے، جہاں سپلائی میں سیاسی دباؤ یا غیر متوقع رکاوٹوں کا اندیشہ کم ہے۔

اس کے برعکس مغربی طاقتیں اکثر دفاعی ساز و سامان کو دباؤ کے آلے کے طور پر استعمال کرتی ہیں۔ کبھی اپ گریڈ روک لیا جاتا ہے، کبھی اسپیر پارٹس بند کر دیے جاتے ہیں۔ ٹرمپ جیسے غیر متوقع فیصلوں اور پالیسیوں کے حامل رہنماؤں کے دور میں یہ بے یقینی مزید بڑھ گئی ہے، اور عدم اعتماد کو مزید گہرا کر دیا ہے جس نے بیشتر ممالک کو متبادل راستے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔

ایزیو نیورسٹی سے وابستہ دفاعی ماہرین کے مطابق پاکستان اور سعودی عرب کے درمیان حالیہ دفاعی معاہدہ اس امر کی علامت ہو سکتا ہے کہ دونوں ممالک مشترکہ سسٹمز اپنانا چاہتے ہیں۔ بدلتی ہوئی عالمی سیاست، خصوصاً امریکا کے رویے نے کئی ممالک کو اسلحہ جاتی تنوع کی طرف دھکیل دیا ہے، تاکہ کسی ایک طاقت پر انحصار مہلک ثابت نہ ہو۔ ماہرین کے مطابق مشترکہ دفاعی معاہدوں کا مقصد انٹر آپریٹبلٹی، تربیت میں ہم آہنگی اور ہنگامی حالات میں تعاون ہوتا ہے۔ جے ایف-17 اس تناظر میں ایک موزوں انتخاب بن سکتا ہے۔

برمنگھم یونیورسٹی کے ماہرین کے نزدیک اگر یہ معاہدہ طے پا جاتا ہے تو یہ جے ایف-17، پاکستان کے دفاعی صنعتی ڈھانچے اور قومی معیشت کیلئے سنگ میل ہو گا۔ بعض مغربی تجزیہ کاروں کے مطابق سعودی عرب یہ طیارے براہ راست استعمال کی بجائے کسی اتحادی ملک (مثلاً سوڈان) کو منتقل کر سکتا ہے جہاں داخلی سلامتی کے مسائل شدت اختیار کر رہے ہیں۔ یہ خطے میں پر کسی اسٹیبلائزیشن کی حکمت عملی ہو سکتی ہے۔

آخر کار دفاعی ماہرین اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جے ایف-17 تھنڈر کئی حوالوں سے سعودی عرب کو سوٹ کرتا ہے۔ یہ جہاز امریکا پر انحصار کم کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے، اور سعودی خود مختاری میں اضافہ کا باعث بن سکتا ہے۔ جنگ میں آزمودہ پلیٹ فارم حاصل کرنے اور کم لاگت میں مؤثر دفاع کا ذریعہ بن سکتا ہے اور اس کی تربیت پاکستانی فضائیہ فراہم کر سکتی ہے۔ یوں یہ محض ایک جہاز نہیں، بلکہ اعتماد، خود مختاری اور آزمودہ صلاحیت کا استعارہ بن کر ابھرتا ہے۔

تاریخ کے انفق پر ایک حقیقت سورج کی طرح روشن ہے کہ مسلم دنیا کی کمزوری اس کے وسائل کی کمی نہیں، اس کی اصل آزمائش اس کا انتشار رہا ہے۔ یہ حقیقت تاریخ کے اوراق میں بارہا لکھی جا چکی ہے کہ جب بھی مسلم دنیا نے باہمی اتحاد، خود انحصاری اور مشترکہ دفاع کی طرف قدم بڑھایا، اس کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر دی گئیں۔ جب بھی اس انتشار کے خلاف کوئی آواز اٹھی، جب بھی کسی نے خود انحصاری اور مشترکہ دفاع کا خواب دیکھا، سازشوں کے بادل اُٹھ آئے، خدشات کی سرگوشیاں پھیل گئیں، اور خوف کے بیج بودیے گئے۔

آج بھی جب پاکستان اور سعودی عرب کے مابین دفاعی تعاون ایک نئے مرحلے میں داخل ہونے کے امکانات ظاہر کر رہا ہے، تو مسلم دشمن قوتوں کی تشویش محض اتفاق نہیں۔ آج پاکستان اور سعودی عرب کے دفاعی تعلقات پر اٹھنے والی تشویشیں اسی تسلسل کی کڑیاں ہیں۔ اسرائیل کی بے چینی، امریکی نظام دفاع کی اجارہ داری، اور مغربی میڈیا کا فکری اضطراب — یہ سب اس بات کا اعلان ہیں کہ امت مسلمہ کا ایک قدم بھی اگر خود داری کی سمت بڑھ جائے تو طاقت کے ایوانوں میں ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔

اسرائیل کی جانب سے سعودی عرب کو جدید امریکی طیاروں کی فراہمی پر کھلے اضطراب کا اظہار دراصل اسی خوف کی علامت ہے کہ کہیں مشرق وسطیٰ اور جنوبی ایشیا میں ایک ایسا دفاعی محور نہ تشکیل پا جائے جو مغربی اجارہ داری کو چیلنج کر دے۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جے ایف-17 تھنڈر محض ایک جنگی طیارہ نہیں—یہ ایک پیغام ہے۔ یہ پیغام ہے کہ مسلمان اب اپنی سلامتی کے فیصلے خود کرنا چاہتے ہیں۔ یہ اعلان ہے کہ حرمین شریفین کے تحفظ کا عزم کسی ایک ریاست تک محدود نہیں، بلکہ ایک اجتماعی ذمہ داری ہے جسے فولاد، ایمان اور اتحاد سے سینچا جا رہا ہے۔

جے ایف-17 تھنڈر کا ممکنہ سعودی فضائی بیڑے میں شامل ہونا، یا اس سے جڑے کسی بھی دفاعی انتظام کی صورت، محض ایک تکنیکی فیصلہ نہیں بلکہ ایک سیاسی، تہذیبی اور ایمانی اعلان ہو گا۔ کہ مسلم دنیا اب اپنی سلامتی کے فیصلے خود کرنا چاہتی ہے، اور وہ دوسروں کی اجازت یا دباؤ کی محتاج نہیں۔

پاکستان کیلئے یہ شراکت محض معاشی یا صنعتی کامیابی نہیں بلکہ اس تاریخی ذمہ داری کی توسیع ہے جو اس نے اپنے قیام کے وقت سے اوڑھ رکھی ہے، حرمین شریفین کے تحفظ کو اپنی سلامتی سے مقدم جاننے کی ذمہ داری۔ پاکستان کیلئے سعودی عرب کے ساتھ دفاعی اشتراک محض ایک کامیاب معاہدہ نہیں بلکہ اس وعدے کی تجدید ہے جو اس قوم نے اپنے قیام کے دن کیا تھا—کہ حرمین شریفین کی طرف اٹھنے والے ہر خطرے کے مقابل سینہ سپر ہونا ہماری قومی شناخت اور ایمانی فریضہ ہے۔ تاہم یہ راہ آسان نہیں۔ اب سوال یہ نہیں کہ یہ اتحاد کیوں ضروری ہے، بلکہ سوال یہ ہے کہ کیا امت مسلمہ اس تاریخی موقع کو پہچانے گی؟ کیا عالم اسلام اپنی صفوں میں وحدت پیدا کر پائے گا؟ کیا یہ دفاعی تعاون ایک نئے مشترکہ اسلامی دفاعی نظام کا پیش خیمہ بنے گا؟ کیا یہ دفاعی تعاون محض محدود معاہدوں تک رہے گا یا امت مسلمہ کیلئے ایک مشترکہ دفاعی نظام کی بنیاد بنے گا؟ اور کیا مسلم دشمن قوتیں اس اتحاد کو روکنے میں کامیاب ہو سکیں گی؟ اور سب سے بڑھ کر، کیا وہ قوتیں جو مسلم اتحاد کو اپنے مفادات کیلئے خطرہ سمجھتی ہیں، اس خواب کو تعبیر پانے دیں گی؟

ان سوالات کے جواب مستقبل کے درپچوں میں پوشیدہ ہیں، تاریخ گواہ ہے جب ایمان، حکمت اور اتحاد ایک صف میں آکھڑے ہوں—تو کوئی طاقت، کوئی سازش، کوئی دباؤ اس صف کو منتشر نہیں کر سکتا مگر ایک حقیقت اٹل ہے، جب تک حرمین شریفین کی طرف رخ کیے کروڑوں دل ایک ساتھ دھڑکتے رہیں گے، اور جب تک پاکستان اور سعودی عرب کا رشتہ ایمان، قربانی اور اعتماد پر قائم رہے گا—تب تک یہ اتحاد محض ممکن ہی نہیں، ناگزیر بھی رہے گا۔

پاکستان کہاں کھڑا ہے؟

بین الاقوامی سیاست میں کچھ لمحات محض واقعات نہیں ہوتے، وہ قوموں کیلئے آئینہ بن جاتے ہیں۔ ایسے آئینے جن میں ریاستیں اپنے فیصلوں، ترجیحات اور غلطیوں کا عکس دیکھتی ہیں۔ خواہ وہ عکس کتنا ہی تلخ کیوں نہ ہو۔ عالمی سیاست میں بعض خبریں محض اطلاع نہیں ہوتیں، وہ ریاستوں کیلئے لمحہ فکریہ بن جاتی ہیں آج مشرق وسطیٰ، جنوبی ایشیا اور عالمی طاقتوں کے مابین بدلتا ہوا توازن بھی پاکستان کیلئے ایسا ہی ایک آئینہ ہے، جس میں ہمیں بار بار وہ سوال دکھائی دیتا ہے جس سے ہم برسوں سے نظریں چر رہے ہیں، کیا ہم درست سمت میں کھڑے ہیں؟

متحدہ عرب امارات کا بھارت کی طرف تیزی سے بڑھتا جھکاؤ، سعودی عرب اور یو اے ای کے درمیان بڑھتا ہوا خاموش تناؤ، اس کے نتیجے میں سعودی عرب اور یو اے ای کے درمیان خاموش مگر گہرے اختلافات، اور افغانستان میں پاکستان کے اثر و رسوخ کا مسلسل زوال، افغانستان کا وہ منظر نامہ جہاں پاکستان دہائیوں کی جانی و مالی قربانیوں، ابھرتی معیشت اور سفارتی سرمایہ کاری کے باوجود نہ صرف اثر و رسوخ کھو بیٹھا بلکہ آج وہی افغانستان بھارت کے ساتھ قربت اختیار کر کے پاکستان کو علاقائی طور پر کمزور کرنے کا ذریعہ بننا دکھائی دیتا ہے۔

افغانستان وہ ملک ہے جس پر پاکستان نے دہائیوں تک اپنی معیشت، سلامتی اور سفارت کا بوجھ اٹھائے رکھا۔ جانی قربانیاں دیں، مالی نقصان برداشت کیا، عالمی دباؤ سہا۔ مگر نتیجہ یہ نکلا کہ آج وہی افغانستان بھارت کے قریب ہے، اور بھارت وہاں سے پاکستان کو کمزور کرنے کی کوششوں میں سرگرم ہم خلیجی ممالک کے حوالے سے بھی اپناتے رہے۔ جذباتی وابستگی، وقتی ضرورتوں پر مبنی فیصلے، اور معیشت سے کٹی ہوئی خارجہ ہے۔ یہی طرز فکر پالیسی۔ نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ یہ سب واقعات الگ الگ نہیں بلکہ ایک ہی اسٹریٹجک ناکامی کی مختلف شکلیں ہیں۔ بلکہ یہ سب ایک ہی کہانی کے مختلف ابواب ہیں۔

یہ مضمون اسی کہانی کو سمجھنے کی ایک سنجیدہ کوشش ہے۔ خلیج کی بدلتی سیاست، سعودی یو اے ای اختلافات اور یو اے ای بھارت قربت کے ذریعے ایک بڑے سوال کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ محض خلیجی سیاست، یو اے ای۔ بھارت قربت یا سعودی قیادت کے سوال تک محدود نہیں، بلکہ اس بنیادی بحران کی نشاندہی کرتا ہے جو پاکستان کی خارجہ پالیسی، معاشی سمت اور ریاستی فیصلہ سازی کے اندر گہرائی تک سرایت کر چکا ہے۔ سوال یہ نہیں کہ دنیا کیوں بدل رہی ہے، اصل سوال یہ ہے کہ پاکستان کیوں پیچھے رہ گیا ہے؟ کیا ہم نے خود کو بدلنے کیلئے سنجیدگی اختیار کی ہے یا نہیں؟ کیا ہم نے اپنی ان تمام ناکامیوں کا سنجیدگی سے جائزہ لیتے ہوئے ذمہ داروں کو کٹھرے میں کھڑا کر کے انہیں سزا دی ہے؟ اگر نہیں تو اس کی کیا وجہ ہے؟ کیا پاکستان اپنی خارجہ پالیسی حقیقت پسندانہ بنیادوں پر استوار کرنے کیلئے تیار ہے، یا وہ اب بھی ماضی کے سہاروں پر حال کو بچانے کی کوشش میں مستقبل گنوا رہا ہے؟

بین الاقوامی سیاست میں کچھ خبریں محض سرخی نہیں ہوتیں بلکہ وہ آئینہ بن جاتی ہیں۔ ایسا آئینہ جس میں قومیں اپنا اصل چہرہ دیکھتی ہیں، خواہ وہ خوبصورت ہو یا تکلیف دہ۔ متحدہ عرب امارات کے صدر شیخ محمد بن زاید کا بھارت کا اچانک، مختصر مگر غیر معمولی دورہ بھی ایسی ہی خبر ثابت ہوا۔ محض

ایک گھنٹہ پینتالیس منٹ پر محیط یہ دورہ دراصل برسوں پر محیط اسٹریٹجک فیصلوں کا اعلان تھا، جس کے اثرات نئی دہلی سے لے کر ریاض، اسلام آباد اور واشنگٹن تک محسوس کیے جا رہے ہیں۔

یو اے ای اور بھارت کے درمیان دفاعی تعاون 100 ارب ڈالر سے بڑھا کر 200 ارب ڈالر تک تجارتی شراکت، توانائی، خلائی تحقیق، مصنوعی ذہانت، ایٹمی ری ایکٹر ز اور انفراسٹرکچر میں سرمایہ کاری کے اعلانات کسی فوری رد عمل کا نتیجہ نہیں تھے۔ یہ سب ایک گہری، سوچی سمجھی حکمت عملی کا حصہ تھے۔ اصل سوال یہ نہیں کہ یو اے ای بھارت کے قریب کیوں گیا، بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ اس بدلتی تصویر میں پاکستان کہاں کھڑا ہے، اور خلیج کے اندر خود کیا کچھ بدل رہا ہے؟

خلیجی سیاست کو اگر ایک جملے میں بیان کیا جائے تو شاید اس سے زیادہ جامع اور حقیقت کے قریب کوئی جملہ نہیں ہو سکتا کہ یہاں دوستی مستقل نہیں، مفاد مستقل ہے۔۔۔ سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات بظاہر ایک ہی خلیجی خیمے کے ستون اور ایک ہی خلیجی صف میں کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ مشترکہ مذہبی شناخت، تیل پر مبنی معیشت، امریکی اتحاد، علاقائی سلامتی کے مشترکہ بیانیے اور خطے میں استحکام کا دعویٰ یہ سب عناصر انہیں ایک مضبوط اتحاد کی تصویر میں پیش کرتے ہیں۔ مگر حقیقت اس تصویر سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے۔

اس ظاہری ہم آہنگی کے نیچے اختلافات کی ایک ایسی تہ موجود ہے جو وقت کے ساتھ مزید گہری ہو رہی ہے۔ پردے کے پیچھے، ان دونوں ریاستوں کے درمیان اختلافات کی ایک ایسی خلیج پیدا ہو چکی ہے جو محض وقتی نہیں بلکہ ساختی نوعیت کی ہے، یعنی طاقت، قیادت، معیشت اور عالمی صف بندی کے بنیادی سوالات سے جڑے ہوئے یہ اختلافات اب سفارتی سرگوشیوں یا بند کمروں کی گفتگو تک محدود نہیں رہے۔ یہ معیشت، عسکری حکمت عملی، علاقائی قیادت، عالمی اتحادوں اور حتیٰ کہ جنوب ایشیا میں طاقت کے توازن تک پھیل چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اثرات محض ریاض اور ابو ظہبی تک محدود نہیں رہیں گے بلکہ پورے مشرق وسطیٰ، جنوبی ایشیا اور اعلیٰ سیاست پر اثر انداز ہوں گے۔

اگر خلیجی سیاست کو ایک جملے میں سمیٹا جائے تو وہ یہی ہو گا کہ یہاں دوستی مستقل نہیں، مفاد مستقل ہے۔ سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات بظاہر ایک ہی خلیجی خیمے کے مضبوط ستون دکھائی دیتے ہیں، مگر حقیقت میں ان کے درمیان اختلافات کی خلیج دن بدن گہری ہوتی جا رہی ہے۔ یہ اختلافات اب صرف بند کمروں کی گفتگو تک محدود نہیں رہے بلکہ معاشی، عسکری اور جغرافیائی سیاست میں واضح طور پر جھلکنے لگے ہیں۔ یہ تناؤ وقتی یا جذباتی نہیں بلکہ ساختی نوعیت کا ہے، جس کے اثرات آنے والے برسوں میں پورے مشرق وسطیٰ اور جنوبی ایشیا کی سیاست پر مرتب ہوں گے۔

سعودی عرب خود کو خلیجی دنیا کا فطری قائد سمجھتا آیا ہے۔ اس کی بنیاد محض معاشی طاقت یا جغرافیہ نہیں بلکہ ایک گہری تاریخی اور مذہبی حیثیت اور آبادی میں ہے۔ حرمین شریفین کی تولیت، مسلم دنیا میں مرکزی مذہبی مقام، اور دہائیوں پر محیط عرب قیادت اور امریکا کے ساتھ پرانا اسٹریٹجک تعلق یہ سب سعودی بیانیے کا حصہ سعودی قیادت کے دعوے کی بنیاد ہیں۔ اس کے مقابلے میں متحدہ عرب امارات ایک بالکل مختلف ماڈل پیش کرتا ہے۔ یہ ماڈل مذہبی قیادت کی بجائے جدید معیشت عالمی سرمایہ کاری، ٹیکنالوجی، لاجسٹکس، فنانس سروسز اور اسمارٹ گورننس پر کھڑا ہے۔

محمد بن سلمان اور محمد بن زاید دونوں طاقتور، فیصلہ کن اور علاقائی اثر و رسوخ کے خواہاں رہنما ہیں۔ دونوں کا وژن علاقائی نہیں بلکہ عالمی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ایک ہی خطے میں دو مضبوط اور خود مختار قیادتیں طویل عرصے تک بغیر کشمکش اور تصادم کے نہیں رہ سکتیں۔ چاہے یہ کشمکش کھلی جنگ کی صورت

میں ہو یا خاموش سفارتی مقابلے کی شکل میں، یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جہاں سے سعودی-یو اے ای اختلافات کی جڑ پھوٹتی ہے۔ یہی مقابلہ آج خلیجی سیاست کی سمت متعین کر رہا ہے۔

یہ اختلاف سب سے زیادہ واضح اور نمایاں طور پر معاشی میدان میں سامنے آیا ہے۔ سعودی عرب کا وژن 2030 دراصل ایک انقلابی منصوبہ ہے جس کا مقصد تیل پر انحصار کم کر کے ریاض کو علاقائی کاروباری مرکز بنانا، غیر ملکی کمپنیوں کو ریاض میں ہیڈ کوارٹر قائم کرنے پر مجبور کرنا ہے۔ نیوم، ریڈ سی، قدیہ جیسے میگا منصوبوں پر اربوں ڈالر جھونک رہا ہے، اور خود کو خطے کا نیا معاشی مرکز بنانے کی کوشش میں ہے۔ پراجیکٹس کے ذریعے سرمایہ کھینچنا، یہ سب کچھ بالواسطہ طور پر یو اے ای کے قائم کردہ دہائی ماڈل کیلئے براہ راست چیلنج ہے اور سعودی پالیسی کو اپنے لیے براہ راست معاشی خطرہ سمجھتا ہے۔ یو اے ای پہلے ہی دہائی اور ابوظہبی کو عالمی مالیاتی مراکز بنا چکا ہے، لاجسٹکس، ایوی ایشن اور ٹریڈ میں برتری رکھتا ہے۔ خطے کا سب سے کھلا اور لچکدار بزنس ماحول فراہم کرتا ہے، اسی وجہ سے اوپیک پلس میں تیل کی پیداوار، تجارتی مراعات اور سرمایہ کاری کے بہاؤ پر دونوں ممالک کے درمیان اختلافات کھل کر سامنے آئے۔ یہ صرف معاشی مسابقت نہیں بلکہ بلکہ اثر و رسوخ کی بالادستی کی جنگ ہے۔

یمن جنگ وہ پہلا عملی میدان تھا جہاں سعودی عرب اور یو اے ای ایک ساتھ اترے مگر وقت کے ساتھ دونوں کے اہداف مختلف ہوتے چلے گئے۔ اختلافات نمایاں ہونے کی بناء پر ایک ساتھ نکل نہ سکے۔ سعودی عرب یمن میں ایک متحد ریاست اور حوثیوں کی مکمل شکست چاہتا تھا جبکہ یو اے ای کی توجہ جنوبی یمن، بندر گاہوں اور تجارتی راستوں پر مرکوز رہی اور جنوبی یمن میں اپنے اتحادی مضبوط کر کے بندر گاہوں، تجارتی راستوں اور ساحلی پٹی پر اثر و رسوخ چاہتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یو اے ای نے بتدریج اپنا عسکری کردار کم کر دیا، نتیجہ یہ نکلا کہ یو اے ای نے بتدریج اپنا عسکری کردار کم کر دیا جبکہ سعودی عرب خود کو میدان میں نسبتاً تنہا محسوس کرنے لگا۔ یہی وہ لمحہ تھا جہاں اعتماد کا بحران شروع ہوا۔ اور برسوں سے قائم دوستی کے رشتوں میں دراڑ پڑ گئی۔

اسی طرح اخوان المسلمون اور سیاسی اسلام کے معاملے پر بھی دونوں ممالک کے رویے مختلف ہیں۔ یہ اختلاف محض جغرافیائی یا معاشی نہیں بلکہ نظریاتی بھی ہے۔ یو اے ای اخوان المسلمون کو اپنی ریاستی سلامتی اور ساخت کیلئے وجودی خطرہ سمجھتا ہے۔ اسی وجہ سے مصر، لیبیا، تیونس میں اس کا موقف انتہائی سخت رہا ہے۔ سعودی عرب کا موقف حالات کے مطابق بدلتا رہا ہے اور سعودی رویہ اس معاملے میں زیادہ محتاط، لچکدار اور وقتی رہتا ہے۔ کبھی سختی، کبھی مفاہمت — یہ ابہام دونوں ممالک کے درمیان فکری فاصلے کو بڑھاتا گیا۔ یہی نظریاتی ابہام دونوں ممالک کے درمیان فکری فاصلے کو مزید بڑھاتا گیا۔

ایران کے معاملے پر بھی دونوں ممالک کی سوچ مختلف ہے۔ ایران کے حوالے سے سعودی عرب طویل عرصے تک سخت موقف رکھتا رہا جبکہ یو اے ای نے حالیہ برسوں میں خاموش مفاہمت کا راستہ اختیار کیا — تجارت، سفارت اور سیکیورٹی چینلز کھولے گئے۔ اس کے برعکس یو اے ای نے اسرائیل کے ساتھ ابراہیم معاہدہ کر کے نہ صرف ایک نیا علاقائی راستہ کھولا بلکہ خود کو امریکا کا سب سے قابل اعتماد خلیجی اتحادی بھی ثابت کیا جبکہ سعودی عرب اب تک محتاط ہے اور داخلی مذہبی دباؤ کا سامنا کر رہا ہے اور داخلی مذہبی دباؤ اور خطے میں اپنی تاریخی حیثیت اسے فوری قدم اٹھانے سے روکتی ہے۔ یو اے ای کا ایک قدم آگے نکل جانے کا سبب ایک خاموش مگر گہرا پیغام تھا۔ یہ فرق بھی دونوں دارالحکومتوں کے درمیان خاموش تناؤ کا سبب ہے۔ یہ



فرق خلیجی سلامتی کے تصور میں بنیادی اختلاف کو ظاہر کرتا ہے۔ یہی فرق وہ پس منظر فراہم کرتا ہے جس میں یو اے ای کا بھارت کی طرف جھکاؤ سمجھ میں آتا ہے سطحی طور پر یو اے ای۔ بھارت تعلق کو دفاعی تعاون کے طور پر دیکھا گیا، مگر حقیقت میں یہ ایک ہمہ جہت معاشی شراکت ہے۔ گیس کی طویل مدتی فراہمی، اربوں ڈالر کی توانائی سرمایہ کاری، انفراسٹرکچر، زرعی تجارت، مصنوعی ذہانت، خلائی صنعت اور ایٹمی ٹیکنالوجی، یہ سب اس بات کا اعلان ہے کہ یو اے ای بھارت کو مستقبل کا ستون سمجھ رہا ہے۔ یہ انتخاب محض بھارت کے حق میں نہیں بلکہ ایک ریاض اور اسلام آباد دونوں کیلئے بالواسطہ پیغام بھی ہے۔ شیخ محمد بن

زاید کا بھارت کا مختصر مگر غیر معمولی دورہ محض رسمی ملاقات نہیں تھا۔ دفاعی معاہدہ ہو یا 100 سے 200 ارب ڈالر کی تجارتی شراکت۔ اصل نکتہ دفاع نہیں بلکہ معیشت ہے۔ یو اے ای نے بھارت کو مستقبل کا راکٹ دار منتخب کیا، بلکہ پاکستان اس دوڑ میں پیچھے رہ گیا ہے۔

شیخ محمد بن زاید کا بھارت کا مختصر مگر غیر معمولی دورہ دراصل برسوں پر محیط اسٹریٹجک فیصلوں کا اعلان تھا۔ دفاعی معاہدہ ہو یا 100 سے 200 ارب ڈالر کی تجارتی شراکت۔ اصل نکتہ دفاع نہیں بلکہ معیشت ہے۔ یو اے ای نے بھارت کو مستقبل کی منڈی، سرمایہ کاری کا محفوظ مرکز، ٹیکنالوجی پارٹنر کے طور پر منتخب کیا۔ اسی تصویر میں پاکستان کا مقام خاصا معنی خیز ہے۔ یو اے ای کے صدر پاکستان آئے، مگر دارالحکومت کی بجائے فوجی کینٹ گئے، کوئی بڑا تجارتی معاہدہ نہ ہوا، سرمایہ کاری کا کوئی واضح اعلان سامنے نہ آیا۔ یہ محض اتفاق نہیں بلکہ ایک خاموش سفارتی اشارہ تھا کہ پاکستان کے ساتھ تعلق اب زیادہ تر سیکیورٹی تک محدود ہے، معیشت تک نہیں۔ پاکستان خلیجی ممالک کو دفاعی خدمات، فوجی تربیت اور سیکیورٹی فراہم کرتا ہے، مگر اس کے بدلے نہ برآمدات بڑھتی ہیں، نہ سرمایہ کاری، صنعت، ٹیکنالوجی اور طویل مدتی تجارت اس تعلق کا حصہ نہیں بن سکیں۔ یہ توازن خطرناک حد تک یک طرفہ ہو چکا ہے۔

یہاں پاکستان ایک خاموش مگر اہم عنصر کے طور پر سامنے آتا ہے۔ سعودی عرب پاکستان کو دفاعی ستون اور اسٹریٹجک ضمانت سمجھتا ہے جبکہ یو اے ای کا جھکاؤ تیزی سے بھارت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ یہ فرق مستقبل میں خلیجی سیاست کو جنوبی ایشیا کی طاقتوں سے براہ راست جوڑ دے گا۔ یہ سوال یہاں ناگزیر ہو جاتا ہے کہ کیا یو اے ای نے بھارت کا انتخاب سعودی اثر سے توازن پیدا کرنے کیلئے کیا؟ سعودی عرب اور پاکستان کے درمیان دفاعی تعاون کوئی نئی بات نہیں، مگر حالیہ معاہدوں نے اسے مزید مضبوط کیا ہے۔ پاکستان واحد مسلم ایٹمی طاقت ہے، اور یہی حقیقت اسے خلیجی سیاست میں ایک حساس عنصر بناتی ہے۔ یو اے ای اور سعودی عرب کے اختلافات۔ یمن، سیاسی اسلام اور قیادت کے سوال پر۔ یو اے ای کو متبادل راستے تلاش کرنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ بھارت کے ساتھ قربت اسی توازن کی ایک کڑی ہے۔

اس پورے منظر نامے میں امریکا کو نظر انداز کرنا خود فریبی ہوگی۔ واشنگٹن بھارت کو چین کے مقابلے میں مرکزی مہرہ سمجھتا ہے، جبکہ یو اے ای اس کا قریبی اتحادی ہے۔ اسرائیل کے ساتھ تعلقات اور غزہ امن بورڈ میں شمولیت اسی حکمت عملی کا حصہ ہیں۔ یو اے ای کا بھارت کی طرف جھکاؤ بڑی

حد تک امریکی ترجیحات سے ہم آہنگ ہے۔ امریکا، اسرائیل اور بھارت پر مشتمل غیر اعلانیہ ٹرائیکا چین۔ روس ہلاک کے مقابلے میں صف بند ہے۔ پاکستان چونکہ چین کا قریبی اتحادی، سی پیک کا مرکز، روس کے ساتھ بڑھتے تعلقات رکھتا ہے، اس لیے اس پر دباؤ فطری ہے۔ مگر یہاں ایک تلخ حقیقت ہے کہ بیرونی دباؤ تب ہی مؤثر ہوتا ہے جب اندرونی کمزوریاں موجود ہوں۔

گزشتہ برس مئی کی پاک۔ بھارت کشیدگی میں پاکستان کی عسکری صلاحیت کو عالمی سطح پر سراہا گیا، مگر یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ عسکری برتری معاشی کشش کا نعم البدل نہیں۔ دنیا اب یہ نہیں دیکھتی کہ کون بہتر لڑ سکتا ہے، بلکہ یہ دیکھتی ہے کہ کون سرمایہ محفوظ رکھ سکتا ہے، کون طویل مدتی منافع دے سکتا ہے، اور کون عالمی سپلائی چین کا حصہ ہے۔ اس میدان میں پاکستان پیچھے ہے۔

یہ کہنا جذباتی لگ سکتا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ امریکا، اسرائیل اور بھارت پر مشتمل غیر اعلانیہ صف بندی پاکستان کو معاشی طور پر کمزور دیکھنا چاہتی ہے تاکہ وہ آزاد خارجہ پالیسی نہ اپنا سکے مگر بیرونی دباؤ تب ہی کارگر ہوتا ہے جب اندرونی کمزوریاں موجود ہوں۔ پاکستان کی خارجہ پالیسی کا بنیادی بحران یہی ہے کہ وہ آج کو بچانے میں کل کو کھود دیتی ہے۔ قرض، بیل آؤٹ اور وقتی سہارا اس کا محور بن چکے ہیں، جبکہ معاشی طاقت کی تعمیر نظر انداز ہو رہی ہے۔ یہی فرق ہے بھارت اور پاکستان میں۔ اگر پاکستان واقعی خطے میں مؤثر کردار چاہتا ہے تو اسے خارجہ پالیسی کو معیشت سے جوڑنا ہوگا۔ روس، چین اور ممکنہ طور پر ترکی و ایران کے ساتھ دفاعی و سیاسی کے ساتھ اسٹریٹجک ہم آہنگی بڑھانی ہوگی۔ کسی ایک خلیجی کیمپ کا اندھا حصہ بننے کے بجائے توازن کی پالیسی اپنائی جائے۔

سعودی عرب اور یو اے ای کے درمیان بڑھتا ہوا تناؤ، یو اے ای۔ بھارت معاہدہ، اور پاکستان کی سفارتی پوزیشن۔ یہ سب ایک ہی کہانی کے مختلف ابواب ہیں۔ سعودی عرب اور یو اے ای کے درمیان موجود تناؤ کوئی حادثہ نہیں بلکہ طاقت کی نئی تقسیم کا نتیجہ ہے۔ یہ کہانی بتاتی ہے کہ دنیا بدل چکی ہے اور طاقت کا معیار بھی۔ دنیا جذبات سے نہیں، معیشت، حکمت عملی اور مستقل فیصلوں سے چلتی ہے۔ اگر ہم نے اب بھی سبق نہ سیکھا تو آنے والے برسوں میں ایسے معاہدے معمول بن جائیں گے۔ اور ہم ہر بار یہی سوال دہراتے رہیں گے کہ آخر ہمارے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟

اس پورے منظر نامے کا سب سے تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ پاکستان آج خود کو ایک ایسے مقام پر کھڑا پاتا ہے جہاں اس کے پاس شکایات تو بہت ہیں، مگر مؤثر جوابات کم ہوتے جا رہے ہیں۔ افغانستان کا ہاتھ سے نکل جانا، بھارت کا وہاں اثر و رسوخ بڑھانا، خلیجی ممالک کا پاکستان کو محض سیکورٹی پارٹنر سمجھنا، اور سرمایہ، تجارت و ٹیکنالوجی کے دروازے بند ہونا۔ یہ سب کسی ایک بیرونی سازش کا نتیجہ نہیں بلکہ اندرونی کمزوریوں، غلط ترجیحات اور پالیسی کی غیر مستقل مزاجی کا حاصل ہے۔

یہاں یہ سوال مقتدر اثر افیہ، ریاستی فیصلہ سازوں اور پالیسی سازی کے مراکز سے براہ راست پوچھنا ناگزیر ہو چکا ہے کیا ہم واقعی یہ سمجھتے ہیں کہ ریاستیں جذبات، قربانیوں اور ماضی کی خدمات کے اعتراف پر چلتی ہیں؟ یا پھر یہ حقیقت ماننے کو تیار ہیں کہ آج کی دنیا صرف معیشت، ادارہ جاتی استحکام اور مستقل حکمت عملی کو مانتی ہے؟ اب وقت آگیا ہے کہ پاکستان خود سے سچ بولے۔ افغانستان کا ہاتھ سے نکل جانا کسی ایک واقعے یا ایک حکومت کی ناکامی نہیں، بلکہ برسوں پر محیط غلط پالیسیوں، ادارہ جاتی کمزوریوں اور غیر شفاف فیصلہ سازی کا نتیجہ ہے۔ یہی ماڈل اگر خلیجی ممالک کے ساتھ بھی دہرایا گیا تو نقصان صرف سفارتی نہیں بلکہ معاشی اور اسٹریٹجک ہوگا۔

یہ سوال اب ٹالنے کے قابل نہیں رہا کہ کیا پاکستان کی بیوروکریسی آزادانہ طور پر قومی مفاد میں پالیسی سازی کے قابل نہیں رہی؟ یا پھر کچھ نادیدہ قوتیں ہیں جو ریاستی ڈھانچے کو بر غمال بنائے ہوئے ہیں اور ریاستی ڈھانچے کو اس اند میں کنٹرول کر رہے ہیں کہ جہاں ایماندار، باصلاحیت، پیشہ ور اور اصول پسند افسران کو ان کی دیانت کی سزا دلیں ڈی بنا کر دی جا رہی ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل میرے ایک مضمون میں تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے؟ اگر پالیسی وہ لوگ بنائیں گے جن کی اولین ترجیح قومی مفاد کی بجائے کسی مخصوص مافیا، گروہ یا وقتی فائدے کا تحفظ ہو، پالیسیاں مخصوص مفادات کے تابع رہیں، یہی مافیا اپنے فائدے کیلئے ایسی پالیسیاں جاری کریں تو نتیجہ یہی نکلے گا کہ ملک ایک بار پھر معاشی دیوالیہ پن کے دہانے پر جا کھڑا ہو گا۔

آج وقت ہے کہ پاکستان جذباتی خارجہ پالیسی سے نکل کر معاشی خارجہ پالیسی کی طرف بڑھے۔ خلیجی ممالک کے ساتھ تعلقات کو محض دفاع اور سیکیورٹی تک محدود رکھنے کی بجائے تجارت، صنعت، سرمایہ کاری اور ٹیکنالوجی سے جوڑا جائے۔ کسی ایک کیپ کا اندھا حصہ بننے کی بجائے توازن، خود مختاری اور ادارہ جاتی مضبوطی کو بنیاد بنایا جائے۔ بیوروکریسی کو سیاسی اور غیر مرئی دباؤ سے آزاد کر کے فیصلہ سازی کا حقیقی اختیار دیا جائے، ورنہ یہی نادیدہ قوتیں کل ایک بار پھر ملک کو ایسے معاہدوں اور پالیسیوں میں الجھا دیں گی جن کا خمیازہ پوری قوم کو بھگتنا پڑے گا۔

دنیا ب قریبوں کی کہانیاں نہیں سنتی، دنیا سرمایہ، استحکام اور اعتماد دیکھتی ہے۔ عسکری صلاحیت اہم ہے، مگر معاشی طاقت کے بغیر وہ سفارتی اثر نہیں بن سکتی۔ پاکستان اگر واقعی خطے میں باوقار کردار چاہتا ہے تو اسے خلیجی ریاستوں کے ساتھ تعلقات کو صرف سیکیورٹی تک محدود رکھنے کی بجائے تجارت، صنعت، ٹیکنالوجی اور سرمایہ کاری سے جوڑنا ہو گا۔ اسی طرح روس، چین، ترکی اور ایران کے ساتھ توازن پر مبنی اسٹریٹجک ہم آہنگی ناگزیر ہو چکی ہے۔

یہ مضمون ایک داخلی احتساب کی دعوت ہے۔ یہ کسی فرد، دارے یا ریاست پر الزام نہیں، بلکہ ایک تنبیہ ہے۔ دنیا بدل چکی ہے، طاقت کا معیار بدل چکا ہے اگر پاکستان نے اب بھی اپنی ترجیحات درست نہ کیں تو ایسے معاہدے معمول بنتے جائیں گے جن میں ہمارا ذکر صرف ایک ثانوی کردار کے طور پر ہو گا۔ اگر پاکستان نے اب بھی سبق نہ سیکھا تو آئندہ برسوں میں یو اے ای۔ بھارت جیسے معاہدے معمول بنتے جائیں گے، اور ہم ہر بار یہی سوال دہراتے رہیں گے کہ آخر ہمارے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟

ضروری ہے کہ پاکستان اپنی خارجہ پالیسی کو معیشت، تجارت اور شراکت پر استوار کرے، یا پھر وہ بدلتی دنیا میں محض سوال پوچھتا رہ جائے۔ دنیا بد دعاؤں پر نہیں، معاہدوں، معیشت اور مستقل حکمت عملی پر چلتی ہے۔ ریاستیں دعویٰ سے نہیں، فیصلوں سے بنتی ہیں اور فیصلوں میں تاخیر اب پاکستان کیلئے سب سے بڑا خطرہ بن چکی ہے۔ قومیں سوال پوچھنے سے نہیں، جواب تیار کرنے سے آگے بڑھتی ہیں۔ اور یہی وہ امتحان ہے جس میں پاکستان آج کھڑا ہے۔

بورڈ آف پیس: انصاف یا غلبہ؟

معزز صدر اجلاس، قابل احترام معزز مندوبین، دانشوروں اور عالمی برادری کے معزز نمائندوں! میں آج اس بین الاقوامی فورم پر ایک ایسے موضوع پر گفتگو کیلئے کھڑا ہوں جو بیک وقت امن، اقتدار، اخلاق اور تاریخ چاروں کا امتحان ہے۔ میری یہ گزارش محض کسی ایک ملک، کسی ایک خطے یا کسی ایک ادارے کے بارے میں نہیں، بلکہ عالمی نظام کی روح کے بارے میں ہے۔ میں اپنی معروضات کو واضح، مربوط اور تاریخی تسلسل کے ساتھ پیش کروں گا، تاکہ گفتگو جذبات نہیں بلکہ شعور کی بنیاد پر آگے بڑھے۔

تاریخ عالم میں امن ہمیشہ ایک مقدس خواب رہا ہے، مگر اس خواب کی تعبیر اکثر طاقت کے ہاتھوں مسخ ہوتی رہی ہے۔ سلطنت روم سے لے کر جدید اقوام متحدہ تک، ہر عہد میں امن کے نام پر ایسے ادارے قائم ہوئے جو بظاہر انسانیت کے زخموں پر مرہم رکھنے آئے، مگر رفتہ رفتہ خود اقتدار، غلبہ اور مفادات کے استعارے بن گئے۔

حضرات اہل نظر!

قوموں کی زندگی میں کچھ لمحے ایسے آتے ہیں جو محض حال کا حصہ نہیں رہتے، بلکہ مستقبل کی سمت متعین کر دیتے ہیں۔ یہ وہ ساعتیں ہوتی ہیں جب تاریخ اپنے معمول کے بہاؤ کو روک کر سوال کرتی ہے، کیا تم نے طاقت کو چنایا انصاف کو؟ آج ہم ایسے ہی ایک نازک اور فیصلہ کن لمحے کے سامنے کھڑے ہیں، جہاں 'امن' کے نام پر ایک نیا عالمی ادارہ بورڈ آف پیس وجود میں آیا ہے، ایک ایسا ادارہ جسے غزہ میں جنگ بندی، تعمیر نو اور عبوری حکمرانی کی نگرانی کا فریضہ سونپا گیا، مگر جس کے خدوخال ابتدا ہی سے سوالات میں گھرے ہوئے ہیں۔ یہ محض ایک ادارہ نہیں، بلکہ عالمی سیاست کی سمت متعین کرنے کی ایک کوشش ہے؛ ایک ایسا تجربہ جس میں امن، طاقت کے ترازو میں تولی جا رہا ہے۔ اور دنیا تذبذب، امید اور خوف کے سنگم پر کھڑی ہے۔

امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کی جانب سے غزہ کی تعمیر نو اور اسرائیل و حماس کے مابین جنگ بندی کو مستقل شکل دینے کیلئے جس ادارے کا اعلان کیا گیا، وہ بظاہر امن کا پیامبر اور درحقیقت طاقت کے نئے بیانیے کا مظہر ہے۔ ٹرمپ کے الفاظ میں، بورڈ آف پیس کا مقصد اسرائیل اور حماس کے درمیان جنگ بندی کو مستقل بنانا اور غزہ میں ایک عبوری حکومت کی نگرانی کرنا ہے۔ 'بورڈ آف پیس' کا قیام ایک ایسے دور میں عمل میں آیا ہے جب عالمی سیاست میں اخلاقی اصول پس منظر میں اور مفادات پیش منظر میں ہیں۔ انڈیا کو اس بورڈ میں شمولیت کی دعوت دینا محض سفارتی روایت نہیں بلکہ عالمی طاقتوں کے شطرنجی کھیل کی ایک چال ہے، جس میں ہر مہرہ اپنے وزن سے زیادہ بوجھ اٹھانے پر مجبور ہے۔

ٹرمپ کے بیان کے مطابق، اس بورڈ کا مقصد نہ صرف جنگ بندی کی نگرانی بلکہ غزہ میں ایک عبوری حکومت کے قیام کی سرپرستی بھی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا امن بندوق کی نالی سے نکل سکتا ہے؟ اور کیا وہ امن، جو ایک طاقتور صدر کی صوابدید پر کھڑا ہو، دیرپا ہو سکتا ہے؟ تاریخ کے طالب علم جاننے ہیں کہ جب بھی کسی طاقتور ریاست نے کسی کمزور خطے میں عبوری نظم کا اعلان کیا، تو اس کے پیچھے نظم سے زیادہ اختیار اور نگرانی سے زیادہ تسلط

پوشیدہ رہا۔ عالمی تاریخ ہمیں یہ بھی سکھاتی ہے کہ ہر امن کا اعلان لازماً امن پر منتج نہیں ہوتا۔ بظاہر اس بورڈ کا مقصد نہ صرف جنگ بندی کی نگرانی بلکہ فلسطینی علاقے میں ایک عبوری حکومت کی سرپرستی بتایا گیا ہے۔ اور یہی پہلو اسے محض انتظامی نہیں بلکہ سیاسی اور تاریخی مسئلہ بنا دیتا ہے۔

غزہ، جو پہلے ہی محاصرے، بمباری اور انسانی المیوں کی علامت بن چکا ہے، اب ایک نئے عالمی تجربے کی آماجگاہ بننے جا رہا ہے۔ سوال یہ نہیں کہ تعمیر نو کی ضرورت ہے۔ سوال یہ ہے کہ کس کی نگرانی میں، کن شرائط پر، اور کس کے مفاد میں؟

صدر محترم!

امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے غزہ کی تعمیر نو اور اسرائیل و حماس کے درمیان جنگ بندی کو مستقل بنانے کیلئے جس بورڈ کا اعلان کیا، وہ بظاہر انسانیت کا پیامبر ہے، مگر باطن میں اقتدار کی وہی پرانی خواہش موجزن ہے جو تاریخ کے ہر سامراجی دور میں نظر آتی ہے۔ یہ سوال بے محل نہیں کہ کیا امن وہ شے ہے جسے طاقتور عطا کرے؟ یا امن وہ امانت ہے جو انصاف کے بغیر قائم ہی نہیں رہ سکتی؟

مودی ان رہنماؤں میں شامل تھا جسے اس بورڈ کی دعوت دی گئی، یہ دعوت ایک رسمی اقدام نہیں تھی بلکہ انڈیا کے خطے میں آبادی کے لحاظ سے ایک بڑے ملک کی حیثیت سے ذمہ داری عائد کرنے کی کوشش بھی تھی۔ انڈیا کو بورڈ آف پیس میں شمولیت کی دعوت دینا محض سفارتی آداب نہیں، بلکہ ایک بڑا سیاسی امتحان ہے۔ مودی کو بورڈ آف پیس میں شمولیت کی دعوت دینا محض رسمی اقدام بھی نہیں تھا۔ یہ دراصل انڈیا کو ایک ایسے موڑ پر لا کھڑا کرنے کی کوشش تھی جہاں ہر راستہ کسی نہ کسی قیمت کا تقاضا کرتا ہے مگر جب ڈیوس میں 'بورڈ آف پیس' کا باضابطہ آغاز ہوا تو انڈیا کی غیر موجودگی نے کئی سوالات کو جنم دیا۔ یہ خاموشی سفارتی حکمت عملی تھی یا فکری تذبذب؟ اور اس غیر موجودگی نے خود ایک سفارتی بیان کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ انڈیا، جو خود کو ایک ابھرتی ہوئی عالمی طاقت کے طور پر پیش کرتا ہے، اس مرحلے پر فیصلہ کرنے سے گریزاں دکھائی دیتا ہے۔ شاید دہلی کے ایوانوں میں یہ سوال گردش کر رہا ہے کہ یہ بورڈ امن کی شمع ہے یا امریکی مفادات کا چراغ؟

جب ڈیوس میں بورڈ آف پیس کے باضابطہ آغاز پر انڈیا کی غیر موجودگی خود ایک سیاسی بیان بن گئی۔ دہلی کی اس خاموشی میں کئی آوازیں چھپی تھیں۔ ایک آواز مفادات کی اور دوسری اس خوف کی کہ کہیں فیصلہ نہ کرنے کا فیصلہ بھی نقصان دہ ثابت نہ ہو۔ تاہم یہ وہی علامتی تذبذب ہے جو قوموں کے ذہنی انتشار کی چغلی کھاتا ہے۔ مودی کا نام دعوت نامے میں شامل تھا، مگر ڈیوس میں بورڈ کے باضابطہ آغاز پر انڈیا کی غیر موجودگی نے خاموشی سے بہت کچھ کہہ دیا۔ یہ خاموشی شاید اس احساسِ ندامت کا اظہار ہے کہ ہر دعوت عزت نہیں ہوتی، اور ہر پلیٹ فارم غیر جانبدار نہیں ہوتا۔

غزہ، جو پہلے ہی تاریخ کے سب سے طویل محاصروں، بے مثال تباہی اور انسانی کرب کی علامت بن چکا ہے، اب ایک نئے عالمی تجربے کی تجربہ گاہ بنایا جا رہا ہے۔ تعمیر نو کی بات ضرور کی جا رہی ہے، مگر یہ واضح نہیں کہ یہ تعمیر ایٹموں کی ہوگی یا اختیار کی؟ اور عبوری حکومت، اگر قائم ہوئی، تو وہ عوام کی نمائندہ ہوگی یا عالمی طاقتوں کی نگرانی میں چلنے والا ایک انتظامی سایہ؟

پاکستان، ترکی، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات جیسے ممالک کا بورڈ آف پیس میں شامل ہونا ایک طرف تو اس امید کی علامت ہے کہ شاید اس پلیٹ فارم کے ذریعے انسانی ایسے میں کچھ کمی آئے، مگر دوسری طرف یہ حقیقت بھی عیاں ہوتی ہے کہ عالمی سیاست میں شمولیت اکثر اختیار کا نہیں، بقا کا سوال بن جاتی ہے۔ علاوہ ازیں پاکستان، ترکی، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات جیسے ممالک کا اس بورڈ میں شامل ہونا یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ عالمی

سیاست میں اصولوں سے زیادہ جغرافیہ اور معیشت بولتی ہے۔ ٹرمپ کے مطابق 59 ممالک نے دستخط کیے، مگر تقریب میں محض 19 ممالک کی موجودگی اس حقیقت کو بے نقاب کرتی ہے کہ بہت سے دستخط خوف، دباؤ یا مصلحت کے قلم سے کیے گئے ہیں یعنی اس امر کی شہادت ہے کہ بہت سے ممالک نے کاغذ پر شمولیت اختیار کی، مگر دل سے نہیں۔ یہ فرق ہمیں بتاتا ہے کہ عالمی سیاست میں تحریری رضامندی اور عملی شمولیت ہمیشہ ہم معنی نہیں ہوتیں۔

ٹرمپ نے اس موقع پر کہا "آپ دنیا کے سب سے طاقتور لوگ ہیں" دراصل ایک نئے عالمی فلسفے کی ترجمانی کرتا ہے۔ ٹرمپ کا یہ جملہ محض خطاب نہیں، بلکہ ایک نظریہ ہے۔ طاقت کی وہ نئی لغت ہے جس میں اخلاق، قانون اور انصاف ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ جہاں طاقت کا معیار اخلاق نہیں بلکہ اثر و رسوخ ہے۔ ایسی طاقت جس کا تعلق نہ اخلاق سے ہے، نہ قانون سے، بلکہ محض قربت اور وفاداری سے ہے۔ یہ وہ طاقت ہے جو اداروں کو کمزور اور افراد کو مضبوط کرتی ہے۔ یہ جملہ محض تحسین نہیں، بلکہ طاقت کی ایک نئی تعریف ہے، ایسی طاقت جو قانون سے نہیں بلکہ اثر و رسوخ سے جنم لیتی اداروں سے نہیں بلکہ شخصیات سے وابستہ ہوتی ہے۔ آذربائیجان، پیراگوئے اور ہنگری جیسے ممالک کو ایک ہی سانس میں دنیا کے ہے، اور ایسی قوت جو طاقتور لوگوں کی صف میں کھڑا کرنا، اس حقیقت کو آشکار کرتا ہے کہ طاقت اب اصولوں کی نہیں، صف بندی کی مرہونِ منت ہے۔ جہاں چھوٹے ممالک بھی بڑی طاقتوں کے سائے میں خود کو محفوظ سمجھنے لگے ہیں۔

آج انڈیا میں اس سوال پر سنجیدہ بحث جاری ہے کہ آیا اسے بورڈ آف پیس میں شامل ہونا چاہیے یا نہیں۔ کئی سابق سفارتکار اس کی مخالفت کر رہے ہیں، اس بنیاد پر کہ یہ بورڈ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی قرارداد 2803 سے متصادم ہے، جو غزہ کی عبوری انتظامیہ کیلئے پہلے ہی ایک واضح، مدت بند اور جواب دہ فریم ورک فراہم کر چکی ہے۔ اس قرارداد کی مدت، رپورٹنگ کی شرائط اور وقتی حیثیت اس بات کی ضمانت ہیں کہ یہ بندوبست مستقل عالمی ماڈل نہ بنے۔

بورڈ آف پیس اس قرارداد کے بالمقابل ایک ایسا ادارہ ہے جس کی نہ مدت مقرر ہے، نہ جواب دہی کا واضح نظام۔ اس کے برعکس بورڈ آف پیس غیر معینہ مدت کا حامل ہے۔ براہ راست سلامتی کونسل کو جواب دہ نہیں اور اس کے اختیارات ایک فرد کے گرد مرکوز ہیں۔ یہ فرق محض انتظامی نہیں بلکہ فلسفیانہ ہے۔ یہ قانون کی بالادستی اور شخصی اقتدار کے درمیان فرق ہے۔ انڈیا کی یہ خاموشی نہ مکمل انکار ہے، نہ واضح قبولیت۔ یہ اس کشمکش کی علامت ہے جس میں ایک متعصب ہندو طاقت یہ سوچ رہی ہے کہ شامل ہو کر اصول قربان کیے جائیں؟ یا الگ رہ کر اثر و رسوخ کھودیا جائے؟ یہی وہ منحصر ہے جسے تاریخ بار بار دہراتی ہے، اور جس میں قوموں کا قد ناپا جاتا ہے۔ تاہم انڈیا کی خاموشی کی زبان تذبذب کا کھلا اظہار ہے۔

پاکستان، ترکی، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات کی شمولیت اس حقیقت کی غماز ہے کہ عالمی سیاست میں فیصلے ہمیشہ اصولوں کی بنیاد پر نہیں ہوتے۔ کچھ ممالک نے اس بورڈ کو امید کے طور پر دیکھا، کچھ نے خوف کے تحت قبول کیا، اور کچھ نے محض سیاسی مصلحت کے تقاضے پورے کیے۔

سلامتی کونسل کی قرارداد کے تحت قائم نظام کی مدت 31 دسمبر 2027 تک ہے اور اسے ہر چھ ماہ بعد رپورٹ پیش کرنا لازم ہے۔ اس کے برعکس، بورڈ آف پیس کی نہ کوئی مقررہ مدت ہے اور نہ اس کا دائرہ اختیار غزہ تک محدود دکھائی دیتا ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جہاں تشویش جنم لیتی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ادارے مدت کے بغیر قائم کیے گئے، وہ جلد یا بدیر اقتدار کے قلعے بن گئے۔ بورڈ آف پیس کی غیر معینہ حیثیت اسے ایک ایسے تجربے میں بدل دیتی جو



ہے جس کا انجام پیش گوئی سے باہر ہے۔ یہ ادارہ، اپنی ساخت میں، اقوام متحدہ سے زیادہ ایک نجی کلب کا تاثر دیتا ہے، جہاں شمولیت، اخراجات اور اثر و رسوخ سب ایک ہی مرکز سے پھوٹتے ہیں۔

یہ بورڈ، جس کی کوئی معیار مقرر نہیں، محض شراکت داری نہیں بلکہ نجی کلب کا تاثر دیتا ہے۔ تنخواہیں، اخراجات اور مستقل رکنیت سب ٹرمپ کی صوابدید سے جڑے ہیں۔ یہ صورتحال امریکی صدارت کو عالمی سیاست میں غیر معمولی تقویت دیتی ہے، اور یہی امر دنیا بھر میں تشویش کا سبب بن رہا ہے۔

بورڈ کے حامی انڈین سفارتکاروں کا موقف ہے کہ انڈیا کی شرکت گلوبل ساؤتھ کے خدشات کو تقویت دے گی مگر ناقدین یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ اگر فیصلہ سازی کا مرکز واشنگٹن میں ہو، تو دہلی کی آواز کہاں تک سنی جائے گی؟ اندیشہ یہ ہے کہ انڈیا کی موجودگی محض اسرائیلی موقف کی نرم توثیق بن کر نہ رہ جائے۔ بورڈ آف پیس کے چارٹر میں ٹرمپ کو جو غیر معمولی اختیارات دیے گئے ہیں سوئیڈ، تقرری، برطانیہ، تحلیل اور جانشینی—وہ کسی بھی جمہوری یا کثیر القومی ادارے کے تصور سے مطابقت نہیں رکھتے۔ یہ اختیارات ادارے کو نہیں، شخص کو مضبوط کرتے ہیں۔ جہاں چیئرمین مطلق العنان حیثیت کا حامل نظر آتا ہے۔

اقوام متحدہ کے بعض عہدیدار یہ عندیہ دے چکے ہیں کہ بورڈ آف پیس کا ماڈل دیگر تنازعات پر بھی لاگو کیا جاسکتا ہے۔ اسی وجہ سے بہت سے حلقے اسے اقوام متحدہ کے متبادل کے طور پر دیکھ رہے ہیں۔ اور یہ تصور عالمی نظام کیلئے ایک گہرا سوال بن چکا ہے۔ اقوام متحدہ کے بعض عہدیداروں کا یہ اشارہ کہ یہ ماڈل دیگر تنازعات میں بھی استعمال ہو سکتا ہے، اس خدشے کو تقویت دیتا ہے کہ 'بورڈ آف پیس' ایک متوازی عالمی نظام کی بنیاد رکھ رہا ہے۔ خود ٹرمپ کے بیانات اس بورڈ کے کردار پر شکوک کو مزید گہرا کرتے ہیں۔ ایگزیکٹو بورڈ کے ارکان میں ٹرمپ کے ذاتی دوست، سابق برطانوی وزیر اعظم، داماد، اور امریکی کارپوریٹ دنیا کے نمائندے شامل ہیں۔ یہ فہرست غیر جانبداری سے زیادہ قربت کا پتہ دیتی ہے اور ٹرمپ سے وفاداری کا دائرہ کار مضبوط نظر آتا ہے۔

اقوام متحدہ، اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود، ایک اصول کی نمائندہ ہے۔ یہ اصول کہ دنیا صرف طاقت سے نہیں، بلکہ قانون سے چلنی چاہیے۔ سلامتی کونسل کی قرارداد 2803، جس میں غرہ کی عبوری نگرانی کیلئے واضح مدت اور جواب دہی کا نظام موجود ہے، اسی اصول کی مثال ہے۔ بورڈ کے حامی انڈین سفارت کاروں کا کہنا ہے کہ یہ ادارہ اقوام متحدہ کو چیلنج نہیں کر رہا، کیونکہ اس کی نمائندگی محدود ہے۔ وہ اسے جی 20 کے متوازی ایک فورم قرار دیتے ہیں، مگر تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ آج کے محدود فورم کل کے فیصلہ کن مراکز بن جایا کرتے ہیں۔

پاکستان کا موقف بظاہر واضح ہے: جنگ بندی، انسانی امداد اور تعمیر نو مگر چارٹر کی مبہم شرائط—خصوصاً رکنیت کی مدت اور مالی اختیارات—یہ سوال اٹھاتی ہیں کہ آیا یہ شمولیت وقتی ہے یا طویل المدت وابستگی۔ انڈیا کیلئے یہ شمولیت ایک خاص اہمیت رکھتی ہے، کیونکہ اگر بورڈ آف پیس نے مستقبل میں کشمیر جیسے تنازعات پر توجہ دی، تو دہلی کیلئے اس فورم سے الگ رہنا مشکل ہو جائے گا۔ بورڈ آف پیس نہ تو اس قرارداد کا پابند ہے، نہ کسی واضح عالمی فورم

کو جواب دہ، یہی وجہ ہے کہ اسے اقوام متحدہ کا متبادل یا کم از کم اس کے اختیار کو چیلنج کرنے کی کوشش سمجھا جا رہا ہے۔ یہ دلیل بھی دی جاتی ہے کہ انڈیا کی شرکت گلوبل ساؤتھ کے خدشات کو تقویت دے گی۔ مگر ناقدین کا خیال ہے کہ اگر فیصلہ سازی کا محور ایک طاقتور ملک ہو، تو دیگر ممالک کی موجودگی محض علامتی رہ جاتی ہے۔ اور یہی خدشہ انڈیا کے حوالے سے ظاہر کیا جا رہا ہے۔

بورڈ آف پیس کا قیام اس پس منظر میں ہو رہا ہے جب امریکا نیٹو کو غیر مؤثر قرار دے رہا ہے۔ اقوام متحدہ کے درجنوں اداروں سے علیحدگی اختیار کر چکا ہے اور اپنی خارجہ پالیسی کو طاقت، دباؤ اور سودے بازی کی بنیاد پر استوار کر رہا ہے۔ یہ سب مل کر ایک ایسے سامراجی وژن کی تشکیل کرتے ہیں جس میں امن، اقتدار کا تابع بن جاتا ہے۔

حضرات!

تاریخ ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ جو ادارے مدت اور احتساب کے بغیر قائم ہوتے ہیں، وہ جلد یا بدیر طاقت کے قلعے بن جاتے ہیں۔ بورڈ آف پیس کی غیر معینہ حیثیت اسے ایک ایسے ادارے میں بدل دیتی ہے جو امن کی بجائے اثر و رسوخ کو دوام دے سکتا ہے۔ ایک سابق سفارتکار کے بقول، چونکہ بورڈ کے چیئرمین خود صدر ٹرمپ ہیں، اس لیے ان کے لین دین پر مبنی طرز سیاست میں غیر جانب دار انصاف کی توقع رکھنا مشکل ہے۔ یہ بھی واضح نہیں کہ آیا اس بورڈ میں تمام ممالک کی حیثیت یکساں ہوگی یا نہیں۔ ایک سینئر سفارتکار کے مطابق، ٹرمپ کے لین دین پر مبنی رویے میں انصاف کی امید رکھنا سادہ لوحی ہے۔ اس بورڈ میں رکنیت، جس کے اختیارات غیر واضح اور مستقبل غیر یقینی ہیں، انڈیا کیلئے خطرناک ہو سکتی ہے۔

یہ دلیل دی جاتی ہے کہ انڈیا کی موجودگی گلوبل ساؤتھ کے خدشات کو تقویت دے گی، مگر سوال یہ ہے کہ کیا وہ آواز واقعی سنی جائے گی؟ ناقدین کا کہنا ہے کہ انڈیا درپردہ اسرائیلی موقف کا ترجمان بن سکتا ہے، جو اس کی غیر جانبداری پر سوالیہ نشان ہوگا۔ یہ اندیشہ محض سیاسی نہیں بلکہ اخلاقی بھی ہے، کیونکہ فلسطین کا مسئلہ صرف جغرافیہ نہیں، بلکہ انصاف کا سوال ہے۔ اگر انڈیا اس بورڈ میں شامل نہیں ہوتا، تب بھی اس کے اثرات سے وہ محفوظ نہیں رہے گا۔ کیونکہ مغربی ایشیا کا استحکام انڈین توانائی، تارکین وطن اور تجارتی راستوں کیلئے ناگزیر ہے۔

بورڈ آف پیس ایک ایسے وقت میں وجود میں آیا ہے جب امریکا اقوام متحدہ سے کنارہ کشی اختیار کر رہا ہے اور اقوام متحدہ کے متعدد اداروں سے دستبردار ہو رہا ہے۔ یہ ادارہ ایک یک قطبی عالمی نظام کو مضبوط کر سکتا ہے، جس کے برعکس بظاہر انڈیا کثیر قطبی دنیا کا داعی ہے لیکن اندرون خانہ امریکا کے مفادات کیلئے شب و روز کام بھی کر رہا ہے۔ انڈین میڈیا میں یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ کیا رکن ممالک بورڈ کے چیئرمین کے فیصلوں کو چیلنج کر سکیں گے؟ یا یہ ادارہ دعوت، سرمایہ اور ذاتی اثر و رسوخ پر مبنی ایک ماڈل ہوگا؟ اگر نہیں، تو یہ ادارہ محض ایک فرد کی خواہشات کا عکس بن جائے گا۔ بورڈ آف پیس کے چارٹر میں صدر ٹرمپ کو جو اختیارات دیے گئے ہیں، وہ کسی جمہوری ادارے سے مطابقت نہیں رکھتے۔ ویٹو، تقرری، برطرفی، تحلیل اور جانشینی، یہ سب اختیارات ادارے کو نہیں، فرد کو مرکزناتے ہیں، جس کی بناء پر چیئرمین ٹرمپ مطلق العنان حیثیت کے طور پر اپنے ہر حکم کو لاگو کرنے کی پوزیشن میں ہے۔

بورڈ آف پیس کے ایگزیکٹو بورڈ میں شامل افراد اکثر یا تو امریکی شہری ہیں یا ٹرمپ کے قریبی سمجھے جاتے ہیں۔ ایگزیکٹو بورڈ کے ارکان کا پس منظر اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ یہ ادارہ قابلیت سے زیادہ قربت پر قائم ہے۔ یہ ایک ایسا دائرہ ہے جہاں فیصلے عوام کیلئے نہیں، بلکہ طاقت کے تسلسل کیلئے ہوتے

ہیں۔ یہ ترکیب غیر جانبداری پر سنجیدہ سوالات اٹھاتی ہے۔

پاکستان نے بورڈ آف پیس میں شمولیت کو جنگ بندی، انسانی امداد اور غزہ کی تعمیر نو سے جوڑا ہے۔ یہ نیت اپنی جگہ قابل فہم ہے، مگر رکنیت کی مدت اور مالی شرائط کے ابہام نے کئی سوالات کو جنم دیا ہے۔ چارٹر کی مبہم شرائط یہ سوال اٹھاتی ہیں کہ کیانیک نیقی، غیر واضح نظام میں محفوظ رہ سکتی ہے؟ کئی ممالک نے اسے اپنی اہمیت کے اعتراف یا امریکی دباؤ کے تحت قبول کیا ہے۔ ماہرین خارجہ امور کے مطابق، بورڈ کے چارٹر میں یہ واضح نہیں کہ رکن ممالک کن شرائط کے پابند ہوں گے، چارٹر کی تشریح کا اختیار کس کے پاس ہو گا اور اختلاف کی صورت میں کیا راستہ اختیار کیا جائے گا۔

یو اے ای، سعودی عرب، اسرائیل اور ترکی کی شمولیت انڈیا پر دباؤ بڑھا سکتی ہے، مگر تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ دباؤ میں لیا گیا فیصلہ اکثر پائیدار نہیں ہوتا۔ انڈیا کیلئے سب سے بڑا خدشہ یہ ہے کہ اگر بورڈ آف پیس نے مستقبل میں کشمیر جیسے تنازعات کو اپنے دائرے میں لیا، تو انڈیا کی دیرینہ پالیسی — تیسرے فریق کی عدم مداخلت — خطرے میں پڑ سکتی ہے۔

یہ بورڈ ایک ایسے وقت میں وجود میں آیا ہے جب امریکا نیٹو سے غیر مطمئن، اور اقوام متحدہ کے کئی اداروں سے دستبرداری خارجہ پالیسی کو سودے بازی میں بدل چکی ہے، یہ سب ایک سامراجی ذہنیت کی نشانیاں ہیں۔ انڈیا کے معتبر اخبار دی ہندو کے مطابق، نہ اصول اور نہ عملی تقاضے اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ ایسا فیصلہ عجلت میں کیا جائے، انڈیا کو خوف یا ناراضگی کے ڈر سے فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔

ادھر لیک شدہ چارٹر کے مطابق، بعد کی ترامیم میں غزہ کا ذکر تک ختم کر دیا گیا اور بورڈ کو دیگر تنازعات تک پھیلانے کی تجویز شامل کی گئی — جو اقوام متحدہ کے متبادل کا تاثر مضبوط کرتی ہے۔ پاکستان کا اس بورڈ میں شامل ہونا انڈیا کیلئے ایک واضح اشارہ ہے، خصوصاً اس صورت میں اگر مستقبل میں کشمیر جیسے تنازعات کو بھی اس فورم پر لایا گیا۔ خصوصاً کشمیر کے تناظر میں، جہاں ٹرمپ ٹاشی کی خواہش ظاہر کر چکے ہیں۔ یہاں سوال امن کا نہیں، اطاعت کا بنتا جا رہا ہے۔ امن اگر سوال کرنے کی آزادی چھین لے، تو وہ امن نہیں، ظلم ہے۔

حضرات! ٹرمپ کی جانب سے نیٹو اور اقوام متحدہ کے اداروں سے دستبرداری عالمی نظام کو عدم استحکام سے دوچار کر رہی ہے۔ قوانین فیصلوں سے پہچانی جاتی ہیں، اور ادارے اپنے انجام سے۔ بورڈ آف پیس بھی تاریخ کے کٹہرے میں کھڑا ہو گا، جہاں اس سے پوچھا جائے گا کہ کیا تم نے امن کو مضبوط کیا، یا طاقت کو؟ یہ پس منظر بورڈ آف پیس کی نوعیت کو مزید حساس بنادیتا ہے۔

ٹرمپ نے کینیڈا کی دعوت منسوخ کرنے کی وجہ واضح نہیں کی، مگر یہ حقیقت سامنے ہے کہ مارک کارنی نے چند روز قبل امریکی زیر قیادت عالمی نظام پر تنقید کی تھی — اور یہی تنقید شاید ناپسند کی گئی۔ کارنی کی دعوت کی منسوخی شاید ڈیوس میں امریکی زیر قیادت نظام پر کی گئی ان کی تنقید کا رد عمل تھی۔ یہ سوال آنے والی نسلیں ہم سے پوچھیں گی کہ جب امن کو طاقت کے تابع کیا جا رہا تھا، تم کہاں کھڑے تھے؟ مارک کارنی کی دعوت کی منسوخی اس بات کی علامت ہے کہ بورڈ آف پیس اختلاف رائے کو برداشت کرنے کیلئے تیار نہیں۔ یہ واقعہ ادارے کے مزاج کو عیاں کرتا ہے — یہاں شمولیت اطاعت کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ ادارہ ہم آواز چاہتا ہے، ہم خیال نہیں۔ یہ وقت ہے کہ دنیا فیصلہ کرے، اصول کی سیاست یا مصلحت کی سیاست۔ دونوں ایک ساتھ نہیں چل سکتیں۔

چارٹر کے مطابق، ٹرمپ کو فیصلے ویٹو کرنے، ارکان کی تقرری و برطرفی، حتیٰ کہ پورے بورڈ کو تحلیل کرنے اور جانٹین نامزد کرنے کے اختیارات حاصل ہیں۔ جو کسی بھی کثیر القومی ادارے میں غیر معمولی اور جمہوری ادارے کیلئے خطرناک مثال ہیں۔ جہاں انصاف نہیں، وہاں امن محض وقفہ ہوتا ہے۔ بورڈ آف پیس اگر انصاف کو مرکز نہ بنائے، تو وہ محض ایک وقفہ فراہم کرے گا۔ پائیدار حل نہیں۔ یہ بورڈ ایک ایسے سامراجی وژن کے تحت قائم ہو رہا ہے جہاں طاقت، قبضہ اور غلبہ خارجہ پالیسی کے اوزار بن چکے ہیں اور امریکی خارجہ پالیسی میں طاقت، غلبے اور وسائل پر کنٹرول کا تصور نمایاں ہو چکا ہے۔ یہ صرف انڈیا یا پاکستان کا مسئلہ نہیں، یہ عالمی ضمیر کا امتحان ہے۔ کیا دنیا اداروں کو افراد کے تابع کر دے گی، یا افراد کو قانون کے؟

بورڈ آف پیس بظاہر امن کا استعارہ ہے، مگر اس کے باطن میں طاقت کی وہی پرانی سیاست سانس لے رہی ہے جس نے دنیا کو بار بار ختم دیے ہیں۔ تاریخ ہمیں سکھاتی ہے کہ امن وہی پائیدار ہوتا ہے جو انصاف کی بنیاد پر قائم ہو، نہ کہ طاقت کے سائے میں۔ اب سوال یہ ہے کہ تاریخ کس کے حق میں فیصلہ دے گی؟ تاریخ ہمیں بار بار یہ سبق دیتی ہے کہ وہی ادارے دیر پا ہوتے ہیں جو قانون کے تابع ہوں، نہ کہ افراد کے۔ انڈیا ہو یا پاکستان، گلوبل ساؤتھ ہو یا مغربی دنیا۔ یہ فیصلہ سب کو کرنا ہے کہ وہ امن کو اصول کی بنیاد پر چاہتے ہیں یا طاقت کی نگرانی میں۔

آخر میں، میں یہی عرض کروں گا کہ امن کوئی عطیہ نہیں، کوئی معاہدہ نہیں، کوئی بورڈ نہیں، امن ایک اخلاقی عہد ہے۔ اور جب تک یہ عہد انصاف، شفافیت اور جواب دہی کے بغیر قائم کیا جائے گا، تاریخ اسے قبول نہیں کرے گی۔ امن کوئی ادارہ نہیں، کوئی بورڈ نہیں، کوئی قرارداد نہیں، امن ایک اخلاقی عہد ہے، جو انصاف، شفافیت اور جواب دہی کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ اگر بورڈ آف پیس ان اصولوں کا محافظ بنے، تو تاریخ اسے خوش آمدید کہے گی؛ اور اگر یہ طاقت کے تسلسل کا ذریعہ بنا، تو تاریخ اسے بھی اپنے کٹھنرے میں کھڑا کرے گی۔ فیصلہ آج نہیں، مگر فیصلہ ہو گا۔ اور وہ فیصلہ تاریخ کرے گی۔

اسمیش: دفاعی خود انحصاری کا فکری اعلان

عصر حاضر میں قومی دفاع محض سرحدوں کے تحفظ کا نام نہیں رہا بلکہ یہ ریاستی وقار، سیاسی خود مختاری اور فکری استقلال کا آئینہ دار بن چکا ہے۔ اقوام عالم میں وہی ریاستیں باوقار سمجھی جاتی ہیں جو دفاعی اعتبار سے نہ صرف خود کفیل ہوں بلکہ اپنی قوت کے استعمال میں اخلاقی ضبط اور فکری توازن بھی رکھتی ہوں۔ دفاعی ٹیکنالوجی ریاستی خود مختاری، جغرافیائی توازن اور عالمی سیاست کا ایک بنیادی ستون بن چکی ہے۔ اسلام نے طاقت کو نہ جارحیت کا ہتھیار بنایا اور نہ کمزوری کا عذر؛ بلکہ اسے عدل، تحفظ اور امن کے قیام کا ذریعہ قرار دیا۔ قرآن کا یہ ابدی اصول "وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ" (دشمنوں کے مقابلے کیلئے جہاں تک تم سے ہو سکے قوت تیار رکھو۔ ہر دور میں اسلامی ریاست کے دفاعی تصور کی بنیاد رہا ہے۔

یہ آیت محض عسکری تیاری کا حکم نہیں، بلکہ ایک ہمہ گیر فکری منشور ہے، جس میں علم، حکمت، نظم، خود انحصاری اور اخلاقی ذمہ داری سب شامل ہیں۔ تاریخ اسلام گواہ ہے کہ جب امت نے قوت کو علم کے تابع رکھا تو وہ عادل بھی رہی اور غالب بھی؛ اور جب قوت علم و اخلاق سے جدا ہوئی تو وہ فتنہ بن گئی۔ ایسے ہی فکری تناظر میں، سعودی دارالحکومت ریاض میں منعقد ہونے والے ورلڈ ڈیفنس شو 2026 میں پاکستان کی جانب سے اسمیش ہائپر سونک میزائل کی رونمائی محض ایک عسکری خبر نہیں، بلکہ ایک تہذیبی اعلان، ایک فکری دستک اور ایک تاریخی اشارہ ہے۔ کہ پاکستان دفاع کو محض طاقت نہیں بلکہ ذمہ داری سمجھتا ہے۔ پاکستان کی دفاعی صنعت کی جانب سے اسمیش ہائپر سونک میزائل کی تیاری اسی قرآنی تصور کی جدید تعبیر ہے، جس میں ٹیکنالوجی، حکمت اور ذمہ داری یکجا نظر آتی ہے۔

پاکستان کی دفاعی صنعت کی جانب سے ورلڈ ڈیفنس شو 2026 میں اسمیش ہائپر سونک اینٹی شپ و لینڈ ایکٹک سیلنٹک میزائل کی رونمائی محض ایک تکنیکی پیش رفت نہیں بلکہ ایک فکری، تہذیبی اور اسٹریٹجک اعلان ہے۔ زیر نظر مقالہ اسمیش میزائل کی تکنیکی خصوصیات، دوہرے کردار اور عالمی دفاعی تناظر میں اس کی اہمیت کا تجزیہ کرتا ہے، ساتھ ہی اسلامی تصور قوت، ذمہ داری اور دفاعی اخلاقیات کی روشنی میں اس پیش رفت کا تنقیدی مطالعہ پیش کرتا ہے۔

سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض میں منعقد ہونے والے ورلڈ ڈیفنس شو 2026 میں جب پاکستانی ادارہ گلوبل انڈسٹریل اینڈ ڈیفنس سلوشنز (جی آئی ڈی ایس) عالمی اسٹیج پر جلوہ گر ہوا، تو اس کی پیشکش محض ایک ہتھیار کی نمائش نہ تھی بلکہ ایک فکری اعلان تھا۔ اسی موقع پر پاکستان نے اسمیش ہائپر سونک اینٹی شپ سیلنٹک میزائل متعارف کرا کر یہ واضح کر دیا کہ وہ دفاعی صنعت میں محض صارف نہیں بلکہ خالق اور معمار کے منصب پر فائز ہو چکا ہے۔ یہ میزائل سمندری اہداف کے ساتھ ساتھ زمینی اہداف کو نشانہ بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے، جو اسے جدید جنگی تقاضوں کے عین مطابق بناتا ہے۔

عصر حاضر کی دنیا میں دفاعی طاقت صرف بندوق یا میزائل کا نام نہیں، بلکہ اس فکری خود مختاری کا اظہار ہے جو کسی قوم کو دوسروں کی محتاجی سے نکالتی ہے۔ جی آئی ڈی ایس کی جانب سے اسمیش میزائل کی نمائش اس بات کا اعلان ہے کہ پاکستان اب دفاعی صنعت میں صرف پیروکار نہیں بلکہ شریک

مکالمہ بن چکا ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جہاں ایک ریاست اپنی بقا کو درآمد شدہ تصورات کی بجائے اپنے علمی، سائنسی اور تہذیبی سرمائے سے جوڑتی ہے۔ اور یہی اسلامی تصورِ دفاع کی بنیاد ہے۔

اسمیش میزائل کو پاکستانی ادارے گلوبل انڈسٹریل اینڈ ڈیفنس سلوشنز نے ورلڈ ڈیفنس شو 2026، ریاض میں متعارف کرایا۔ یہ میزائل ایک جدید ہائپر سونک اینٹی شپ اولینڈ ایکٹیک سیلسٹک پلیٹ فارم ہے، جو دوہرے کردار کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ پیش رفت اس امر کی علامت ہے کہ پاکستان اب محض دفاعی صارف نہیں بلکہ دفاعی تخلیق کار کے درجے میں داخل ہو چکا ہے۔

قرآن مجید نے اہل ایمان کو قوت کی تیاری کا حکم دے کر دفاع کو محض عسکری سرگرمی کے بجائے ایک فکری اور اخلاقی ذمہ داری قرار دیا ہے۔ اسلامی تاریخ میں دفاعی قوت ہمیشہ علم، نظم اور اخلاق کے تابع رہی ہے۔ جدید ریاستی نظام میں یہ تصور دفاعی صنعت، خود انحصاری اور اسٹریٹجک خود مختاری کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ پاکستان، جو طویل عرصے تک دفاعی ضروریات کیلئے بیرونی ذرائع پر انحصار کرتا رہا، اب بتدریج ایک فعال دفاعی صنعت کی جانب بڑھ رہا ہے۔ اسمیش میزائل اسی ارتقائی عمل کی ایک نمایاں کڑی ہے۔

اسمیش کو جس غیر معمولی رفتار، عمودی زاویے اور درست رہنمائی کے ساتھ تیار کیا گیا ہے، وہ جدید عسکری فلسفے کی علامت ہے۔ ہائپر سونک رفتار اور تقریباً عمودی حملہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ جنگ اب محاذوں پر نہیں بلکہ نظاموں پر لڑی جاتی ہے۔ یہ میزائل جدید فضائی و میزائل دفاعی نظاموں کو چکمہ دینے کی صلاحیت رکھتا ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ پاکستان دفاع کو صرف ردِ عمل نہیں بلکہ پیش بندی ڈیٹرنس کے طور پر دیکھتا ہے۔ اور یہی عقل سلیم کا تقاضا ہے

اکیسویں صدی میں جنگ کا مفہوم تبدیل ہو چکا ہے۔ اب عسکری برتری کا دار و مدار رفتار، درستگی، اور دفاعی نظاموں کو غیر مؤثر بنانے کی صلاحیت پر ہے۔ ہائپر سونک میزائل ٹیکنالوجی اسی تبدیلی کی علامت ہے، جو آواز کی رفتار سے کئی گنا تیز ہو کر ردِ عمل کے وقت کو نہایت محدود کر دیتی ہے۔ مشرق وسطیٰ، جنوبی ایشیا اور بحر ہند کے خطے میں بڑھتی ہوئی جغرافیائی کشیدگی نے طویل فاصلے تک درست حملہ کرنے والے ہتھیاروں کی اہمیت کو دوچند کر دیا ہے۔

کمپنی کے مطابق اسمیش میزائل کو غیر معمولی رفتار، نہایت درست رہنمائی اور تقریباً عمودی زاویے سے حملہ کرنے کی صلاحیت کے ساتھ ڈیزائن کیا گیا ہے۔ یہ خصوصیات اسے جدید فضائی اور میزائل دفاعی نظاموں کیلئے ایک سنجیدہ چیلنج بناتی ہیں۔ یوں یہ میزائل دشمن کی حفاظتی تہوں کو چیر کر اپنے ہدف تک پہنچنے کی وہ صلاحیت رکھتا ہے، جسے عسکری اصطلاح میں اسٹریٹجک سرپرائز کہا جاتا ہے۔

اکیسویں صدی کی جنگیں میدانوں سے زیادہ ذہنوں، رفتار اور نظاموں کے درمیان لڑی جا رہی ہیں۔ عالمی دفاعی تناظر میں ہائپر سونک ٹیکنالوجی نے عسکری توازن کو یکسر بدل دیا ہے، کیونکہ یہ دشمن کے ردِ عمل کا وقت کم کر دیتی ہے، میزائل ڈیفنس سسٹمز کو غیر مؤثر بناتی ہے، محدود مگر فیصلہ کن کارروائی کی صلاحیت فراہم کرتی ہے۔ مشرق وسطیٰ، بحر ہند اور جنوبی ایشیا میں جغرافیائی کشیدگی کے باعث ایسے ہتھیاروں کی طلب میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے، جس نے دفاعی صنعت کو عالمی سیاست کا مرکز بنا دیا ہے۔

اسمیش میزائل کو جی آئی ڈی ایس نے ایک جدید ہائپر سونک۔ سیلٹک پلیٹ فارم کے طور پر متعارف کرایا ہے، جو سمندری اور زمینی دونوں اہداف کے خلاف مؤثر کردار ادا کر سکتا ہے۔ اینٹی شپ ترتیب میں اسمیش میزائل کی رینج 290 کلومیٹر رکھی گئی ہے۔ اس میں 384 کلو گرام وزنی وار ہیڈ نصب ہے جبکہ رہنمائی کیلئے ایچ جی این ایس اسسٹڈ انریژیل نیویگیشن سسٹم کے ساتھ ایکٹو ریڈار سیکر استعمال کیا گیا ہے۔ میزائل میں سنگل اسٹیج، ڈوئل تھرسٹ سالڈ راکٹ موٹر نصب ہے، جو اسے تیز رفتاری اور مستحکم پرواز فراہم کرتی ہے۔

اینٹی شپ ترتیب میں وار ہیڈ اور ایکٹو ریڈار سیکر کے ساتھ اسمیش میزائل بحری جنگ کے اصولوں میں ایک نیا باب کھولتا ہے۔ سمندر، جو تجارت، توانائی اور جغرافیائی سیاست کا مرکز بن چکا ہے، وہاں دفاعی برتری اب ناگزیر ہو چکی ہے۔ کمپنی کے مطابق اس کی درستی "سی ای پی" 10 میٹر یا اس سے کم ہے، جبکہ آخری مرحلے میں اس کی رفتار آواز سے دو گنا زیادہ ہو سکتی ہے، جو اسے سمندری جنگ میں ایک مہلک ہتھیار بناتی ہے۔ یہ خصوصیات اسمیش کو بحری دفاع میں ایک فیصلہ کن ہتھیار بناتی ہیں، خصوصاً ایسے ماحول میں جہاں جدید میزائل ڈیفنس سسٹمز موجود ہوں۔ اسلامی تاریخ میں بحری قوت کو ہمیشہ اہمیت دی گئی ہے۔ چاہے وہ خلافت عثمانیہ ہو یا اندلس۔ اسمیش اسی روایت کا جدید مظہر ہے، جہاں سمندر کو کمزوری نہیں بلکہ تحفظ کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔

اینٹی شپ ترتیب میں اسمیش میزائل کو سمندری اہداف کے خلاف استعمال کیلئے تیار کیا گیا ہے، تقریباً عمودی زاویے سے حملہ کرنے کی صلاحیت اسے جدید بحری دفاعی نظاموں کیلئے ایک سنجیدہ چیلنج بناتی ہے۔ علاوہ ازیں زمینی اہداف کیلئے تیار کردہ ورژن میں بھی میزائل کی رینج 290 کلومیٹر رکھی گئی ہے، تاہم اس صورت میں وار ہیڈ کا وزن بڑھا کر 444 کلو گرام کر دیا گیا ہے جبکہ رینج وہی برقرار رکھی گئی ہے۔ اس ترتیب میں نیویگیشن مکمل طور پر اینٹی ڈی جی این ایس اسسٹڈ انریژیل نیویگیشن سسٹم پر انحصار کرتی ہے، جو اسے بڑی اہداف کے خلاف زیادہ مؤثر بناتی ہے۔ یہ اضافہ اس بات کی علامت ہے کہ اسمیش صرف رفتار ہی نہیں بلکہ ضرب کی قوت میں بھی اپنی مثال آپ ہے اور یہ میزائل محض ہدف کو نشانہ نہیں بناتا بلکہ فیصلہ کن کردار ادا کرتا ہے۔ یہ اعداد و شمار اس میزائل کو محدود مگر فیصلہ کن حملے کیلئے موزوں بناتے ہیں۔ یہاں اسلامی تصور جنگ جھلکتا ہے، غیر ضروری طوالت نہیں، غیر ضروری تباہی نہیں، بلکہ واضح، محدود اور مؤثر اقدام۔

زمینی اہداف والے ورژن میں بھی وہی سنگل اسٹیج ڈوئل تھرسٹ سالڈ راکٹ موٹر استعمال کی گئی ہے جو محض تکنیکی فیصلہ نہیں بلکہ فکری سادگی کا اظہار ہے۔ زمینی اہداف کے خلاف استعمال کیلئے اسمیش کا علیحدہ کنفیگریشن تیار کیا گیا ہے۔ اس کی درستی 15 میٹر یا اس سے کم بتائی گئی ہے، جبکہ رفتار یہاں بھی آواز سے دو گنا زیادہ رہتی ہے۔ یہ ہم آہنگی اس بات کی دلیل ہے کہ میزائل کی ساخت میں سادگی اور کارکردگی کو یکجا کیا گیا ہے، جو جدید دفاعی فلسفے کا بنیادی اصول ہے۔ اسمیش میزائل کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کا دوہرے کردار کا حامل ہونا ہے۔ ایک ہی پلیٹ فارم کا بحری اور زمینی مشن میں استعمال لاجسٹک نظام کو سادہ بناتا ہے، تربیت اور دیکھ بھال کے اخراجات کم کرتا ہے، آپریشنل چلک میں اضافہ کرتا ہے۔

اسلامی تہذیب ہمیشہ پیچیدگی کے بجائے حکمت آمیز سادگی کی قائل رہی ہے۔ چاہے وہ فقہ ہو، سیاست ہو یا عسکری نظم۔ یہی سادگی لاجسٹکس کو مؤثر، اخراجات کو کم اور نظام کو قابل اعتماد بناتی ہے۔ یہ ترتیب اسے حساس تنصیبات، عسکری مراکز اور اسٹریٹجک اہداف کیلئے موزوں بناتی ہے۔ اسلامی تصور نظم و کفایت کے تناظر میں یہ حکمت عملی اسراف کے بجائے دانش مندانہ وسائل کے استعمال کی مثال ہے۔



جی آئی ڈی ایس کے مطابق اسمیش میزائل کو دوہرے کردار کے تحت تیار کیا گیا ہے، تاکہ ایک ہی میزائل کو سمندری اور زمینی دونوں نوعیت کے مشن میں استعمال کیا جاسکے۔ کفایت، خود انحصاری اور نظم جیسے دوہرے کردار کی حکمتِ عملی دراصل جدید اسلامی ریاست کے تین بنیادی اصولوں کی ترجمانی ہے یعنی اسراف سے اجتناب، کفایت شعاری، نظم و ضبط اور خود انحصاری ایک ہی میزائل کا دو میدانوں میں استعمال اس بات کا ثبوت ہے کہ دفاعی طاقت کو عقل اور نظم کے ساتھ برتا جا رہا ہے، نہ کہ محض نمائش کیلئے۔

اس حکمتِ عملی سے نہ صرف لاجسٹک نظام سادہ ہو جاتا ہے بلکہ اخراجات میں بھی نمایاں کمی آتی ہے۔ یوں یہ میزائل عسکری کفایت شعاری اور عملی حکمتِ عملی کا حسین امتزاج بن کر سامنے آتا ہے۔ اسلام میں طاقت کا تصور جارحیت نہیں بلکہ تحفظ اور توازن پر مبنی ہے۔ اسلامی ریاست میں قوت کا استعمال اخلاقی حدود کے اندر رہ کر ہی جائز ہے۔ اسمیش جیسے ہتھیار کی تیاری اسی صورت میں اسلامی فکر سے ہم آہنگ ہو سکتی ہے جب اس کا مقصد دفاع ہو اور اس کا استعمال واضح ضابطوں کے تحت ہو، غیر ضروری تباہی سے اجتناب کیا جائے۔ یہ پہلو اسمیش کو محض ایک عسکری اثاثہ نہیں بلکہ ایک ذمہ دار دفاعی علامت بناتا ہے۔ اسمیش میزائل میں استعمال ہونے والی سنگل اسٹیج، ڈوئل تھرسٹ سالڈ راکٹ موٹر اس کی رفتار، بلندی اور ٹریٹل کنٹرول کو بہتر بناتی ہے۔ یہ ٹیکنالوجی میزائل کو ابتدائی رفتار کے بعد دوبارہ توانائی فراہم کر کے دفاعی نظاموں سے بچ نکلنے میں مدد دیتی ہے۔

دفاعی ماہرین کے مطابق مشرق وسطیٰ اور دیگر حساس خطوں میں طویل فاصلے تک انتہائی درست حملہ کرنے والے ہتھیاروں کی مانگ میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ اسمیش میزائل کو بھی ایسے ہی تنازع اور خطرناک ماحول کیلئے ایک مؤثر ہتھیار کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ میزائل اس حقیقت کی علامت ہے کہ پاکستان نہ صرف اپنے دفاعی تقاضوں کو سمجھتا ہے بلکہ عالمی دفاعی منڈی کے مزاج سے بھی پوری طرح باخبر ہے۔

دفاعی ماہرین کے مطابق مشرق وسطیٰ اور دیگر حساس خطوں میں طویل فاصلے تک درست حملہ کرنے والے ہتھیاروں کی مانگ بڑھ رہی ہے اور ہائپر سونک اور درست حملہ کرنے والے ہتھیاروں کی عالمی طلب میں اضافہ ہو رہا ہے۔ پاکستان کیلئے یہ موقع اقتصادی اور اسٹریٹجک دونوں حوالوں سے اہم ہے، مگر یہاں اصل سوال صرف طلب کا نہیں بلکہ ذمہ داری کا ہے۔ اسلامی ریاست کے طور پر اس پر اخلاقی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے۔ اسلامی فکر میں طاقت امانت ہے، تجارت نہیں۔ اگر پاکستان اس میدان میں قدم رکھتا ہے تو اس کے ساتھ اخلاقی احتساب، ضابطہ اور شعور بھی لازم ہے۔ اور یہی وہ پہلو ہے جو اسمیش کو محض ہتھیار نہیں بلکہ ایک فکری علامت بناتا ہے۔ تاہم اسلامی ریاست ہونے کے ناتے اس پر اخلاقی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ہتھیار تنازعات کو بھڑکانے کیلئے نہ بیچے جائیں، دفاعی تعاون میں شفافیت رکھی جائے، انسانی جانوں کے تحفظ کو مقدم رکھا جائے مگر اپنے دفاع اور دشمن کا مقابلہ کرنے کیلئے جدید ہتھیاروں سے مسلح رہنا اسلامی ریاست کی اہم ذمہ داری ہے جس کا اللہ نے قرآن میں بھی حکم دے رکھا ہے۔

اسمیش کا دوہرے کردار کی حکمتِ عملی اور لاجسٹک فوائد کا تصور جدید عسکری منصوبہ بندی میں ایک نمایاں رجحان ہے۔ اس کے فوائد درج ذیل ہیں: لاجسٹک سادگی، کم تربیتی اخراجات، یکساں میٹیننس نظام، زیادہ آپریشنل لچک، اسلامی فکر میں کفایت شعاری اور نظم کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے، اور یہ تصور اسی اصول کا عملی اظہار ہے۔ اس مطالعے سے درج ذیل نتائج اخذ ہوتے ہیں:

اسمیش میزائل پاکستان کی دفاعی خود انحصاری کی علامت ہے۔ دوسرے کردار کی صلاحیت جدید عسکری تقاضوں سے ہم آہنگ ہے، ہائپر سونک رفتار اور درستی خطے میں ڈیٹرنس کے کردار کو مضبوط اور اسلامی تصورِ دفاع کے تحت اس ٹیکنالوجی کا استعمال اخلاقی نظم کا تقاضا کرتا ہے۔ اسلامی تصورِ دفاع کا فکری و اخلاقی تجزیہ کریں تو یہ واضح ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست میں قوت کا مقصد ظلم کا انسداد، امن کا تحفظ، دشمن کو جارحیت سے باز رکھنا ضروری ہے۔

اسمیش جیسے ہتھیار اسی وقت اسلامی فکر سے ہم آہنگ قرار دیے جاسکتے ہیں جب ان کا استعمال دفاعی حکمتِ عملی کے دائرے میں رہے۔ یہ میزائل ڈیٹرنس کو مضبوط کرتا ہے، غیر ضروری جنگ کو روکتا ہے اور طاقت کے توازن کو برقرار رکھتا ہے اور دوسرے کردار کی حکمتِ عملی و وسائل کے مؤثر استعمال کی علامت ہے، اور اسلامی تصورِ دفاع کے تحت یہ ٹیکنالوجی اخلاقی حدود میں قابلِ جواز ہے۔

اسمیش میزائل کی رونمائی محض ایک عسکری خبر نہیں، بلکہ یہ اس فکری سفر کی علامت ہے جس میں پاکستان نے خود انحصاری، سائنسی مہارت اور دفاعی وقار کو یکجا کر لیا ہے۔ اسمیش میزائل دراصل ایک دھات کا ڈھانچہ نہیں، بلکہ ایک فکری اعلان ہے کہ پاکستان دفاع کو خوف کے بجائے حکمت، جارحیت کے بجائے توازن، اور طاقت کی بجائے ذمہ داری کے ساتھ دیکھتا ہے۔ یہ پیشکش ہمیں یاد دلاتی ہے کہ طاقت کا اصل سرچشمہ محض فولاد اور بارود نہیں، بلکہ وہ فکر ہے جو علم، حکمت اور ذمہ داری کے ساتھ بروئے کار آئے تو دنیا میں امن کی ضمانت بن جاتا ہے۔ اسمیش ہائپر سونک میزائل پاکستان کی دفاعی تاریخ میں محض ایک ہتھیار کا اضافہ نہیں بلکہ ایک فکری اور اسٹریٹجک اعلان ہے۔ اسمیش، اپنے نام کی طرح، دفاعی دنیا میں ایک مضبوط دستک ہے۔ ایسی دستک جو آنے والے برسوں میں پاکستان کے دفاعی تشخص کو نئی سمت عطا کر سکتی ہے۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جدید ٹیکنالوجی اور اسلامی فکر ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ باہم ہم آہنگ ہو سکتے ہیں۔ یوں اسمیش، قوت اور اخلاق، رفتار و ضبط، اور جدیدیت و روایت کے درمیان ایک متوازن مثال کے طور پر سامنے آتا ہے۔ اور یہی توازن اسلامی ریاست کے تصورِ دفاع کی روح ہے۔ یہ پیش رفت ہمیں یاد دلاتی ہے کہ اگر امتِ علم کو ایمان کے ساتھ، اور قوت کو اخلاق کے ساتھ جوڑ دے، تو دفاعِ فتنہ نہیں بنتا بلکہ امن کا محافظ بن جاتا ہے۔ یوں اسمیش، عصرِ حاضر میں اسلامی ریاست کے تصورِ دفاع کا جدید استعارہ ہے۔ خاموش، مضبوط، باوقار اور ذمہ دار۔ اسمیش ہائپر سونک میزائل پاکستان کی دفاعی تاریخ میں ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ پیش رفت اس بات کا ثبوت ہے کہ جدید ٹیکنالوجی، اگر فکری شعور اور اخلاقی ذمہ داری کے ساتھ ہم آہنگ ہو، تو نہ صرف ریاستی سلامتی کا ضامن بنتی ہے بلکہ عالمی نظام میں ایک باوقار مقام بھی عطا کرتی ہے۔ یوں اسمیش، عصرِ حاضر میں اسلامی ریاست کے تصورِ دفاع کا ایک جدید، سنجیدہ اور ذمہ دار مظہر قرار دیا جاسکتا ہے۔

ایک قوم، ایک احتساب، ایک فیصلہ

یہ آرٹیکل کسی ادبی ذوق کی تسکین کیلئے نہیں لکھا گیا، نہ یہ محض الفاظ کی آرائش ہے، اور نہ ہی یہ تاریخ کے کسی باب کا غیر جانبدار خلاصہ ہے۔ یہ مضمون ایک گواہی ہے — ایک زخمی عہد کی، ایک لرزتی ہوئی ریاست کی، اور ایک ایسے مریض کی جس کا نام پاکستان ہے۔ یہ عرضداشت کسی تمہید کی نرمی نہیں رکھتی، یہ ایک اعلان ہے؛ اعلانِ شعور، اعلانِ احتساب، اعلانِ بیداری۔

اے اہل وطن! سن لو! یہ وقت مصلحت کا نہیں، یہ وقت سچ کا ہے۔ یہ وہ لمحہ ہے جب قوموں کے مقدر لکھے جاتے ہیں یا ہمیشہ کیلئے مٹا دیے جاتے ہیں۔ یہ وقت سرگوشیوں کا نہیں، یہ وقت لاکار کا ہے۔ یہ وقت سلامتی کا نہیں، یہ وقت سوال کا ہے۔ یہ وہ لمحہ ہے جب قومیں آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر خود سے سچ بولتی ہیں۔ اور اگر سچ بولنے کی ہمت نہ رہے تو تاریخ ان کی خاموشی کو اعترافِ جرم بنادیتی ہے۔ یہ لمحہ تاریخ کے اس موڑ پر کھڑا ہے جہاں قومیں تھام لیتی ہیں یا پھر صدیوں کی غلامی میں دھکیل دی جاتی ہیں۔ یا تو اپنے مقدر کو

آج یہ دھرتی، جس کے ذروں میں شہداء کا لہو، ماں کی دعا اور بچے کا خواب دفن ہے جس کے سینے میں شہداء کا لہو امانت ہے، ہمارے سامنے ایک ایسے مریض کی مانند پڑی ہے جس کی سانسیں اکھڑ رہی ہیں، نبض ڈوب رہی ہے، آنکھیں امید ڈھونڈ رہی ہیں، اور آنکھیں سوال بن کر ہمیں گھور رہی ہیں۔ ہونٹ لرزتے ہیں مگر آواز نہیں نکلتی۔ یہ مریض کوئی فرد نہیں، کوئی جماعت نہیں — یہ ہمارا اجتماعی وجود ہے، یہ پاکستان ہے۔

یہ کوئی اتفاق نہیں، یہ کوئی حادثہ نہیں، یہ تاریخ کا اندھا کھیل بھی نہیں اور نہ ہی یہ کیفیت کسی اچانک حادثے کا نتیجہ ہے۔ یہ برسوں کی بد اعمالی، نا انصافی، خوف، اور اس خاموشی کا حاصل ہے جو ہم نے ظلم کے مقابلے میں اختیار کی۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب عدل تخت سے اتر جائے اور ضمیر اقتدار کے ایوانوں سے نکل جائے تو ریاستیں اندر سے مرجاتی ہیں، زندہ لاش بن جاتی ہیں۔ آج ہم اسی داخلی موت کے کنارے کھڑے ہیں۔ آج یہی لاش ہمارے کندھوں پر ہے، بازاروں میں مہنگائی چیخ رہی ہے، عدالتوں میں انصاف سسک رہا ہے، تعلیمی اداروں میں مستقبل اندھیرے میں ٹٹول رہا ہے، اور عوام ایک دوسرے سے مل کر بس یہی پوچھتے ہیں: اب کیا ہوگا؟

اے لوگو! صدیوں کی تاریخ گواہ ہے کہ جب ریاستیں بیمار ہوتی ہیں تو ان کے زخم صرف معیشت پر نہیں ہوتے، روح پر ہوتے ہیں۔ جب قومیں سوال پوچھنا چھوڑ دیتی ہیں تو ان کے جواب مٹی میں دفن ہو جاتے ہیں۔ یہ سوال نیا نہیں۔ یہ وہ سوال ہے جو تاریخ کے ہر نازک موڑ پر گونجا ہے۔ یہی سوال بغداد کے جلنے سے پہلے ہوا میں معلق تھا، بغداد جلنے سے پہلے بھی لوگ یہی کہتے تھے: "کچھ نہیں ہوگا"۔ غرناطہ کے سقوط سے پہلے، غرناطہ کے زوال سے پہلے گونجا، ڈھا کہ کے پھٹنے سے پہلے — ہر بار یہی سوال فضا میں معلق رہا۔ غرناطہ ہاتھ سے جانے سے پہلے بھی سوچا گیا تھا کہ "یہ اندھیرا ٹل جائے گا"۔ اور جب اندھیرا مکمل ہوا تو پھر چراغ جلانے والا کوئی نہ رہا۔ آج پاکستان اسی دہانے پر کھڑا ہے — ایک قدم ادھر، تو بقا؛ ایک قدم ادھر، تو تباہی۔ مگر سوال سے زیادہ اہم جواب ہوتا ہے، اور جواب وہی قومیں دیتی ہیں جن میں حوصلہ، کردار اور ایمان زندہ ہو۔ آج پاکستان اس معالج کے در پر کھڑا ہے جہاں صرف مرہم نہیں، جراحی درکار ہے۔ جہاں تسلی نہیں، فیصلہ چاہیے۔ جہاں وقتی سیاست نہیں، دائمی انصاف مانگ رہا ہے۔ اور یہی سوال ہماری اپنی تاریخ کے المناک موڑوں پر سنائی دیا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تاریخ ہر بار جواب مانگتی ہے۔ اور جواب خاموشی نہیں ہوتا۔ خاموشی

ہمیشہ ظالم کے حق میں جاتی ہے۔

جب عدل کمزور پڑتا ہے، سچ دب جاتا ہے، اور طاقت امانت کی بجائے غنیمت بن جائے تو قومیں اندر سے کھوکھلی ہو جاتی ہیں۔ آج یہی کیفیت ہمارے اجتماعی وجود پر طاری ہے۔ بازاروں میں مہنگائی کا شور ہے، گھروں میں خاموش فالتے ہیں، ایوانوں میں بلند دعوے ہیں، اور گلیوں میں ٹوٹی امیدیں بکھری پڑی ہیں۔ لوگ ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو بات سے پہلے آہ نکلتی ہے، جیسے ہر ملاقات کسی جنازے کی تیاری ہو۔ ہر آنکھ سوال ہے: اب کیا ہو گا؟

یہ مریض بول نہیں سکتا، مگر اس کے زخم چنچ رہے ہیں۔ کبھی عدالتوں کی تاخیر، کبھی تعلیم کے ویران کمرؤں اور مدرسوں اور اسکولوں کی بربادی سے، کبھی اسپتالوں کی راہداریوں سے سنائی دینے والی سسکیوں سے، کسان کی خالی مٹھی اور ہتھیلی سے، مزدور کی جھکی کمر اور خالی جیب سے، ماں کی فیس نہ بھر سکے والی آنکھ، نوجوان کی بے روزگاری — یہ سب زخم ہیں۔ یہ چیخیں کسی ایک چہرے یا ایک حکومت کے خلاف نہیں، یہ اس پورے نظام کے خلاف ہیں جس نے طاقت کو قانون اور دولت کو معیار بنادیا، جس نے طاقت کو قانون اور دولت کو تقدیر بنادیا۔ جو طاقتور کو ڈھیل اور کمزور کو دھکیل دیتا ہے، جب ظلم معمول بن جائے تو بیداری فرض ہو جاتی ہے، اور جب بیداری بھی جرم بن جائے تو پھر تاریخ انقلاب کے باب کھول دیتی ہے۔ جب ظلم معمول بن جائے تو انقلاب فرض ہو جاتا ہے۔

یہ تحریر الزام کی سیاست نہیں کرتی، مگر ذمہ داری سے فرار بھی اختیار نہیں کرتی۔ یہ صاحبان اختیار کو یاد دلاتی ہے کہ اقتدار امانت ہے، غنیمت نہیں۔ یہ عوام کو جھنجھوڑتی ہے کہ خاموشی نجات نہیں، شرکت جرم ہے۔ یہ مذہب، تاریخ اور سیاست — تینوں کو ایک ہی سوال کے کٹہرے میں کھڑا کرتی ہے: کیا ہم جواب دہ نہیں؟

اے صاحبان اختیار! تاریخ کہتی ہے: جب قومیں درد کو محسوس کرنا چھوڑ دیں تو ان کی موت قریب آ جاتی ہے۔ اور جب وہ درد کو محسوس کر کے بھی خاموش رہیں تو ان کی موت یقینی ہو جاتی ہے۔ ذرا بٹھرو، کان کھول کر سن لو! یہ جو تم پر ڈٹو کول کے حصار میں بیٹھے ہو، یہ سانسیں تمہارے فیصلوں پر لٹکی ہیں۔ اس مریض کی سانس سنو۔ یہ سانسیں تمہارے فیصلوں کی محتاج ہیں۔ یہ آنسو تمہاری فالتوں کے حاشیے نہیں، یہ تاریخ کے اوراق اور چیختے ہوئے سوال ہیں، جو بر ملا خبردار کر رہے ہیں کہ اقتدار تاج نہیں، امانت ہے۔ اور امانت میں خیانت جہاں قوموں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیتی ہے وہاں قوموں کو تاریخ کے کٹہرے میں کھڑا کر دیتی ہے۔ یہ تحریر مایوسی نہیں، یہ بغاوت شعور ہے کیونکہ جب شعور جاگ جائے تو زنجیریں خود ٹوٹ جاتی ہیں۔ یہ کسی مایوسی کا اعلان نہیں، یہ بیداری کی صدا ہے کیونکہ جس قوم میں درد باقی ہو، وہ ابھی زندہ ہوتی ہے۔ یہ مضمون مایوسی کا اعلان نہیں، بلکہ امید کی آخری دستک ہے کیونکہ وہ قومیں ہی بچتی ہیں جو آخری لمحے میں بھی خود سے بچ بولنے کی ہمت رکھتی ہیں۔ یہ تحریر اسی ہمت کا تقاضا کرتی ہے۔

اے اس دھرتی کے باسیو، اور اے وہ لوگو جن کے ہاتھوں میں اقتدار، اختیار اور فیصلوں کی باگ ڈور ہے: آج اس دھرتی پر ذرا سی بصیرت رکھنے والا ہر شخص حیرت کے عالم میں اضطراب کی تصویر بنا ہوا ہے، چہرے سوال بن چکے ہیں، آنکھیں جواب ڈھونڈ رہی ہیں، اور زبان پر ایک ہی فقرہ گردش کر رہا ہے، ایک دوسرے سے یہی سوال کرتا پھر رہا ہے، کیا ہونے والا ہے؟ اب کیا بنے گا؟ ہم کہاں کھڑے ہیں اور ہمارا مستقبل کس اندھیرے کی طرف بڑھ رہا ہے؟

لوگ ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو گفتگو سے پہلے آہ نکلتی ہے۔ ہر دل کسی اچھی خبر کا پیاسا ہے، ہر آنکھ کسی امید کی تلاشی ہے۔ کیا ہونے والا ہے؟ ہمارا مستقبل کیا ہے؟ ہم کہاں کھڑے ہیں؟ لوگ ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانک کر کسی اچھی خبر کی تمنا کرتے ہیں، جیسے بستر مرگ پر پڑے مریض کے لواحقین کسی معجزے کے منتظر ہوں۔ کسی حکیم کے نسخے، کسی حاذق ڈاکٹر کی دوا یا کسی صاحب نظر کی دعا سے زندگی کی رفق لوٹ آنے کی آس لگائے بیٹھے ہوں۔ آج یہ جاں بلب مریض کی مانند بمشکل ریگتا ہوا معالج کے در تک تو پہنچ گیا ہے، مگر اس میں اتنی سکت باقی نہیں رہی کہ وہ اپنی بیماری کا نام ہی لے سکے، سچ یہ ہے کہ اب مرض اس مرحلے میں داخل ہو چکا ہے جہاں صرف مرہم کافی نہیں، جہاں صرف تسلیاں کام نہیں آتیں، جہاں جرأت مندانہ فیصلہ، کڑوا علاج و کڑا احتساب ناگزیر ہو چکا ہے۔ وہاں آن پہنچا ہے جہاں دعا کے ساتھ جراحی بھی ناگزیر ہو چکی ہے اور جتنی تاخیر ہوگی، اتنا ہی آپریشن طویل، اذیت ناک اور جان لیوا ہوتا چلا جائے گا۔

یہ مریض یہ کوئی فرد نہیں، یہ کوئی جماعت نہیں، یہ پاکستان ہے۔ زخمیدہ، کمزور، کراہتا ہوا، ایک جاں بلب مریض کی مانند آپ کے سامنے پڑا ہے جو بڑی مشکل سے ریگتا ہوا معالج کے در تک تو پہنچ گیا ہے، مگر اس کے جسم میں اتنی طاقت باقی نہیں رہی کہ وہ اپنی بیماری کا نام بھی لے سکے، اتنی طاقت نہیں کہ اپنی تکلیف بیان کر سکے۔ یہ مریض بول نہیں سکتا، مگر اس کے زخم چنچر ہے ہیں۔ یہ بولتا نہیں، بس آنسو بہاتا ہے، اس کے آنسو، کراہتیں اور زخم واضح ہیں۔ زخموں سے چور جسم کے ہر عضو کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ کبھی سر پکڑتا ہے، جیسے سوچ کی قوت چھن گئی ہو۔ کبھی دل پر ہاتھ رکھتا ہے، جیسے انصاف مرچکا ہو۔ کبھی دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ڈھانپ کر پھوٹ پھوٹ کر روتا ہے اور جب معالج ذرا سا حوصلہ دیتا ہے تو وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں رحم، امید اور زندگی کی بھیک مانگنے لگتا ہے۔



برسوں کی محرومیاں، نا انصافیاں اور ٹوٹے خواب اس کے چہرے پر نقش ہیں، مگر زبان گنگ ہے۔ جیسے مستقبل دیکھنے کی ہمت نہ رہی ہو۔ یہ آنسو صرف آنسو نہیں، یہ دہائی ہیں، یہ فریادیں ہیں، یہ سوال ہیں جو وہ اپنے باسیوں اور اقتدار کے ایوانوں سے جواب مانگ رہے ہیں۔ اہل درد کی بے قراری، یہ کیفیت کچھ اور نہیں، یہ اس مریض کے لواحقین کی کیفیت ہے جو بستر مرگ پر پڑا ہو۔ جو کسی معجزے کی آس میں ہو، کسی حکیم کے نسخے، کسی ماہر ڈاکٹر کی دوا، یا کسی صاحب دل کی دعا سے زندگی لوٹ آنے کا منتظر ہو۔

یہ حال صرف انہی کا نہیں جنہیں حالات کی سمجھ عطا ہوئی ہے، مگر انہی کے سینے میں یہ درد آبلہ بن چکا ہے۔ انہی کی نیندیں اڑ چکی ہیں یہی حال آج ان لوگوں کا ہے جن کے سینے میں پاکستان کا دردنا سوز بن چکا ہے۔ جن کے دل چین سے محروم ہیں۔ نیم شب جب وہ اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہوتے ہیں تو ہچکیاں بندھ جاتی ہیں۔ وہ پاکستان کی سلامتی کی دعا مانگتے ہوئے اس دھرتی کے لاکھوں شہداء کا واسطہ دیتے ہیں، وہ شہداء جنہوں نے اس وطن کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دیا اور پھر ایک لرزہ خیز سوال دل کو چیر دیتا ہے: اور سوچتے ہیں، روز قیامت ہم ان پاکیزہ قربانیوں کا کیا جواب دیں گے؟

اے صاحبان اختیار، اے اہل وطن: ذرا تصور کرو، روز قیامت اس دھرتی کے شہداء تمہارے سامنے کھڑے ہوں گے۔ وہ پوچھیں گے، ہم نے جانیں دیں، تم نے کیا دیا؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "وَلَا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظَّالِمُونَ"۔ یہ نہ سمجھو کہ اللہ ظالموں کے اعمال سے غافل ہے۔

(ابراہیم: 42)

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

یہ کیفیت صرف اہل درد کی نہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ جو لوگ آنے والے طوفان کو پہلے دیکھ لیتے ہیں، وہ خاموش نہیں بیٹھتے۔ طوفان کو پہلے دیکھ لینے والوں پر خاموش رہنا حرام ہو جاتا ہے۔ وہ منادی کرتے ہیں، وہ خبردار کرتے ہیں، وہ رات دن، دامے، درمے، ستنے یہی سوچتے ہیں کہ کسی طرح تباہی کو ٹالا جاسکے۔ میرا مقصد نہ مایوسی پھیلانا ہے اور نہ خوف۔ مگر ذرا سوچیے، اگر آپ کا کوئی عزیز جان لیوا مرض میں مبتلا ہو جائے تو کیا آپ چین سے بیٹھ سکتے ہیں؟ کیا آپ دنیا کے بہترین ڈاکٹر، سب سے ماہر سرجن کی تلاش میں دن رات ایک نہ کر دیں گے؟ کیا اپنی استطاعت سے بڑھ کر خرچ نہیں کریں گے؟ اور سب کچھ کرنے کے بعد سجدے میں گر گڑا کر یہ نہیں کہیں گے کہ یارب شفا تیرے ہی ہاتھ میں ہے؟

پھر یہ وطن، یہ تو ہمارا اجتماعی وجود ہے، ہماری شناخت، ہماری پہچان ہے، ہمارا کل ہے، ہمارے بچوں کا مستقبل ہے۔ سیاسی سراب اور بڑھتا اندھیرا، ہر حکومت کے خاتمے پر عوام سکھ کا سانس لیتی ہے کہ شاید اب حالات بدلیں گے، شاید اب اندھیرا چھٹے گا، مگر افسوس، اندھیرا کم ہونے کی بجائے بڑھتا اور گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ مہنگائی نے پہلے ہی جینا دو بھر کر رکھا ہے اور اس پر مستزاد بجلی اور گیس کے بلوں نے کمر توڑ دی ہے۔ وہ جو کل ترقی کے نعرے لگاتے تھے، آج شرمندگی سے نظریں چرا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَإِذَا أَرَدْنَا أَنْ نُهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُنْشَرِّفِيهَا فَفَسَّخُوا فِيهَا﴾ جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو اس کے خوشحال طبقے کو ڈھیل دیتے ہیں، وہ نافرمانی کرتے ہیں، پھر عذاب آ جاتا ہے۔ (بنی اسرائیل: 16) کیا تم نے کبھی سوچا کہ کہیں یہ ڈھیل آزمائش تو نہیں؟ اقتدار امانت ہے، غنیمت نہیں۔

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا "تم میں سے ہر شخص نگہبان ہے، اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہو گا" (بخاری و مسلم)

جب قومیں عدل سے محروم ہو جائیں، ظلم پر آواز بلند اور احتجاج کرنا چھوڑ دیں، ایک دوسرے کے دکھ سے بیگانہ ہو جائیں، اور صرف اپنی ذات کی سلامتی کی دعا مانگنے لگیں تو پھر اصلاح کیلئے اٹھنے والے ہاتھ بھی بے اثر ہو جاتے ہیں تو پھر اللہ کی نصرت بھی رک جاتی ہے۔ عدل، انصاف اور حکمرانی کی ذمہ داری نہیں نبھائی، تو قیامت میں جواب دینا پڑے گا۔

اے فیصلہ کرنے والو یہ قوم تمہاری رعیت ہے۔ اس کے آنسو تمہارے گریبان سے لپٹیں گے۔ یاد رکھو، عدل کے بغیر ریاستیں زندہ نہیں رہتیں۔ اللہ تعالیٰ کا اعلان ہے ﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ﴾ بے شک اللہ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے (النحل: 90) اور رسول ﷺ نے خبردار فرمایا: ظلم سے بچو، کیونکہ ظلم قیامت کے دن اندھیروں کا سبب ہو گا۔ (مسلم)

مایوسی کفر کے قریب لے جاتی ہے، آج قوم کو جان بوجھ کر مایوسی میں دھکیلا جا رہا ہے۔ خبردار یہ سب سے خطرناک ہتھیار ہے۔ اللہ فرماتا ہے:

﴿لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ﴾ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو (الذمر: 53)

آج ایک منظم منصوبے کے تحت پاکستانی قوم کو مایوسی کی جھاڑیوں میں اس طرح پھنسا دیا اور دھکیلا جا رہا ہے کہ پھر خون آشام درندے چھوڑ دیے جائیں۔ یاد رکھیے، مایوسی ایٹمی تابکاری سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ دنیائے دیکھا ہے کہ قومیں ایٹمی تباہی کے بعد بھی امید کے سہارے دوبارہ کھڑی ہو گئیں، مگر مایوسی نے وہ جانیں لی ہیں جو جنگیں بھی نہ لے سکیں۔

امید کا چراغ بجھا دینا دراصل زندگی کی جنگ ہار دینے کے مترادف اور منزل سے دستبرداری ہے۔ درد زندگی کی علامت ہے، خون بہہ تو انسان علاج کی فکر کرتا ہے، بچاؤ کی تدبیر کرتا ہے۔ مریض وہی بچتا ہے جو جینے کی آرزو رکھتا ہو۔ مایوسی شیطانی ہتھیار ہے۔ ابلیس کی پہچان ہی ناامیدی ہے۔ ابلیس صرف شیطان کا نام نہیں، عربی لغت میں مایوس روح کو بھی ابلیس کہا گیا ہے۔ رسول رحمت ﷺ کا فرمان ہے: زندگی پر سوار ہو جاؤ، ورنہ زندگی تم پر سوار ہو جائے گی۔ رسول ﷺ نے فرمایا: طاقتور مومن کمزور مومن سے بہتر اور اللہ کو زیادہ محبوب ہے (مسلم) طاقت صرف بازوؤں کی نہیں، حوصلے، یقین اور کردار کی بھی ہوتی ہے۔

میں نے اپنے وجدان کے بوجھ تلے، پوری دیانت اور درد کے ساتھ یہ صد ابلند کی ہے۔ اب یہ صد اجن ایوانوں تک پہنچنی چاہیے۔ اقتدار والو سے آخری صد ابلند ہے: اب بھی وقت ہے۔ عدل اور انصاف کو زندہ کریں، مایوسی کی بیخ کنی کریں، اقتدار کو امانت سمجھیں، حق داروں کو امانت لوٹائیں، قوم کو امید اور راستہ دیں، اور اللہ کے حضور جھک جاؤ۔ اے صاحبان اختیار، ظلم سزا کی نوید ہے۔ یاد رکھیں، اقتدار غنیمت نہیں، امانت ہے۔ ذرا ٹھہریے، اپنے عہدوں، اپنے اختیارات، اپنی طاقت اور اپنی منصوبہ بندی سے ایک لمحہ نظریں ہٹا کر اپنے انجام کی طرف دیکھیے۔ قرآن اعلان کرتا ہے:

﴿وَقِفُّهُمْ إِنَّهُمْ مَسْئُولُونَ﴾ انہیں روک لیا جائے گا، بے شک ان سے سوال کیا جائے گا (الصافات: 24)

وہ دن آ رہا ہے جب نہ پروٹوکول کام آئے گا، نہ دستاویزات، نہ بیانیے، نہ ادارے، صرف اعمال بولیں گے۔ وہاں یہ سوال گونجے کیا ہمیں اللہ کے حضور جواب دہ نہیں ہونا؟ کیا اقتدار امانت نہیں؟ کیا اس قوم کے آنسو عرش کو نہیں ہلاتے؟ اقتدار عیش نہیں، امانت ہے۔ یہ آنسو، یہ آہیں، یہ سسکیاں عرش تک پہنچتی ہیں۔ اب بھی وقت ہے اگر خوفِ آخرت جاگ جائے، اگر عدل کو زندہ کر دیا جائے، اگر رحم اور دیانت کا اعلان ہو جائے تو یہ مریض سانس لے سکتا ہے، اور ایک بار پھر اسلامی معاشرے کی ایمانی خوشبو اس دھرتی پر لوٹ سکتی ہے۔ عوامی امید کو زندہ رکھو۔

یہ وعظ صرف ایوانوں اور حکمرانوں کیلئے نہیں، یہ تمہارے لیے بھی ہے۔ کیا تم نے ظلم کو صرف اس لیے قبول کر لیا کہ وہ تم پر براہِ راست نہیں آ رہا؟ کیا تم خاموش ہو گئے ہو کہ کہیں تمہاری باری نہ آجائے؟ خاموشی اور مایوسی خود دشمن ہیں۔ اے عوام! حق کہن امت چھوڑو، مایوسی کو ٹھکرا دو، اور اصلاح کا راستہ اپناؤ۔ یاد رکھو خاموش تماشائی بھی جرم میں شریک ہوتے ہیں۔ قرآن خبردار کر رہا ہے:

﴿وَلَا تَرْكُنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَيَمْسَكُوا النَّارَ﴾ ظالموں کی طرف جھکاؤ نہ رکھو، ورنہ آگ تمہیں بھی آلے گی (ہود: 113)

صرف اپنی ذات کی سلامتی مانگنا کافی نہیں، قومیں اجتماعی دعا اور اجتماعی اصلاح سے بچتی ہیں۔

رسول ﷺ نے فرمایا: جب لوگ ظالم کو دیکھیں اور اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو قریب ہے کہ اللہ سب کو عذاب میں مبتلا کر دے (ترمذی)

اگر خوفِ آخرت جاگ گیا، تو یہی مریض پاکستان پھر کھڑا ہو سکتا ہے۔ اور اگر یہ لمحہ بھی گنوا دیا تو تاریخِ معاف نہیں کرے گی، اور رب کائنات تو ہر گز نہیں۔

اے اس دھرتی کے رہنے والو! یہ تحریر اگر دل کو چیر گئی ہے، اگر یہ الفاظ تمہارے سینے میں آگ بن کر اترے ہیں تو جان لو کہ دل ابھی زندہ ہے۔ مردہ قومیں درد محسوس نہیں کرتیں۔ یہ وقت رونے کا نہیں، اٹھ کھڑے ہونے کا ہے۔ اگر آنکھ نم ہوئی ہے تو جان لو کہ امید ابھی مری نہیں۔ قومیں اسی نمی سے سیراب ہو کر اٹھتی ہیں۔ یہ وقت الزام در الزام کا نہیں، یہ وقت سمت درست کرنے کا ہے۔ یہ وقت یہ طے کرنے کا ہے کہ ہم تاریخ کے تماشائی بنیں گے یا اس کے معمار۔ اندھیرا کسی ایک چراغ سے نہیں ڈرتا، وہ چراغوں کے قافلے سے بھاگتا ہے۔

اے اقتدار کے ایوانوں میں بیٹھنے والو! خبردار! تاریخ تمہاری منتظر نہیں رہتی اور نہ ہی تاریخ تاخیر کو معاف کرتی ہے۔ وہ فیصلوں کے لمحے میں لکھی جاتی ہے۔ وہ دن آتا ہے جب نہ وردی کام آتی ہے، نہ عہدے، قلم، نہ مہر، نہ بیان۔ یاد رکھو، تخت و تاج عارضی ہیں، مگر عدل دائمی ہے۔ وہ دن آتا ہے جب نہ پروٹوکول کام آتا ہے، نہ بیانیے، نہ توجیہات — صرف اعمال بولتے ہیں۔ قرآن کی صدا آج بھی گونج رہی ہے: "انہیں روک لیا جائے گا، بے شک ان سے سوال کیا جائے گا"۔ اس سوال کی تیاری کر لو کیونکہ اس مریض کے آنسو بڑی سرعت کے ساتھ عرش تک کو بلانے کیلئے منتظر ہیں۔ اگر آج رحم، دیانت اور انصاف کو زندہ کر دیا گیا، تو یہی مریض سانس لے لے گا، اگر آج عدل زندہ ہو تو ریاست بچے گی، اگر آج بھی ظلم کو دوام ملا تو فیصلہ اللہ کی عدالت میں ہو گا۔ اور اگر آج بھی تاخیر کی گئی تو تاریخ کی سرجری بے رحم ہو گی، اور وہاں کوئی بچ نہیں سکتا۔

اور اے عوام، سن لو! یہ خطاب صرف ایوانوں کیلئے نہیں۔ خاموشی اور مایوسی سب سے خطرناک ہتھیار ہیں۔ خاموش تماشائی بھی جرم میں شریک ہوتے ہیں۔ خاموشی جرم ہے، اور مایوسی کفر کے دہانے پر کھڑا ہونا ہے۔ حق کہنا چھوڑ دو گے تو باطل کو تقویت ملے گی۔ ظلم کو صرف اس لیے قبول نہ کرو کہ وہ ابھی تمہاری دہلیز پر نہیں آیا۔ یاد رکھو، جب آگ لگتی ہے تو وہ گلی نہیں پوچھتی۔ حق کہنا تمہارا فرض ہے، اور باطل کے سامنے جھک جانا تمہاری ہار۔ امید کو زندہ رکھو کیونکہ امید کے بغیر اصلاح ممکن نہیں۔

یہ مریض پاکستان آج بھی زندہ ہو سکتا ہے — بچ سکتا ہے — اگر خوفِ آخرت جاگ جائے، اگر عدل کو شعار اور ہتھیار بنالیا جائے، اگر اقتدار کو امانت سمجھ لیا جائے، اور اگر عوام مایوسی کے خول سے باہر نکل آئیں۔ اگر امید کو سینے سے لگا لیا جائے۔ یہ اختتام کسی داستان کا نہیں، یہ آغاز کی دستک ہے۔ یہ اعلان ہے، یا تو ہم اس اعلان پر لبیک کہیں گے، ہم اس دستک پر دروازہ کھولیں گے، یا پھر تاریخ ہمارے دروازے توڑ کر باعثِ عبرت بنا دے گی۔ فیصلہ اب ہمارے ہاتھ میں ہے۔ اللہ ہمیں سننے، سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق دے۔ آمین یا رب العالمین

طاقت کی بساط اور حکمت کا امتحان

ایران اور امریکا کے درمیان بڑھتی کشیدگی کے تناظر میں پاکستان کیلئے پالیسی آپشنز اور اسلامی دنیا کے ممکنہ ردِ عمل کا جامع تجزیہ پیش کرنے کا مقصد فیصلہ ادا روں کو ایسے قابلِ عمل راستے مہیا کرنا ہے جو پاکستان کو جنگی الجھاؤ سے محفوظ رکھتے ہوئے علاقائی استحکام، داخلی سلامتی اور سفارتی ساکھ کو مضبوط ساز کریں۔ سفارشات کا محور غیر جانبدارانہ حقیقت پسندی، فعال سفارت کاری، دفاعی تیاری (بلا شرکت جنگ) اور اسلامی دنیا میں ثالثی کو مد نظر رکھتے ہوئے لکھی گئی ہیں۔

پاکستان اس ممکنہ تصادم میں براہِ راست فریق نہیں، مگر اس کی جغرافیائی حیثیت—ایران کی ہمسائیگی، افغانستان سے قربت، خلیجی راستوں تک رسائی—اسے ناگزیر طور پر اس بحران کے دائرہ اثر میں لے آتی ہے۔ پاکستان ایران کی ہمسائیگی، افغانستان کے پس منظر، خلیجی راستوں اور بڑی طاقتوں کے مفادات کے سنگم پر واقع ہے۔ کسی بھی عسکری تصادم کی صورت میں ثانوی اثرات براہِ راست پاکستان کی سلامتی و معیشت پر مرتب ہو سکتے ہیں۔

بحر ہند میں یو ایس ایس ابراہم لنکن کی موجودگی محض بحری نقل و حرکت نہیں، بلکہ عالمی سیاست کی اس زبان میں ایک جملہ ہے جو توپوں سے لکھا جاتا ہے۔ اگرچہ امریکی صدر کی جانب سے حتمی فیصلے کی عدم موجودگی وقتی توقف کا تاثر دیتی ہے، مگر تاریخ شاہد ہے کہ طاقتور ریاستیں اکثر فیصلہ کرنے سے پہلے ہی فضا کو فیصلے کے قابل بنالیتی ہیں۔ انتہائی معتبر ذرائع کے مطابق امریکی کیریئر اسٹرائیک گروپ کی مشرق وسطیٰ میں موجودگی ایک ایسے شطرنجی بساط کی مانند ہے جہاں ہر مہرہ اپنی جگہ پر ضرور ہے، مگر بازی ابھی مکمل نہیں ہوئی۔ یو ایس ایس ابراہم لنکن کا بحر ہند میں ہونا بظاہر ایران کے قریب تر امریکی عسکری گرفت کی علامت ہے، تاہم تاریخ ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ سمندر میں لنگر انداز دیو ہیکل جہاز بھی ہمیشہ فیصلہ جنگ کا اعلان نہیں کرتے۔ یہ تعیناتی ایران پر نفسیاتی دباؤ اور خطے کو عسکری اضطراب میں رکھنے کی دانستہ کوشش دکھائی دیتی ہے۔

ٹرمپ کے بیانات اس ابہام کو مزید گہرا کرتے ہیں—غور و فکر جاری ہے، مگر فیصلہ ابھی تقدیر کے پردے میں ہے۔ امریکی کیریئر گروپ سینٹ کام کے دائرہ اختیار میں ہے۔ فوری حملہ ضروری نہیں، مگر ریپڈ رسپانس کی صلاحیت بڑھادی گئی ہے۔ یہ تعیناتی ایران کو سگنل دینے اور اتحادیوں کو یقین دہانی کرانے کیلئے ہے۔ پاکستان، خلیجی ریاستیں اور بھارت اس پیش رفت کو سیکیورٹی الرٹ کے طور پر دیکھ رہے ہیں۔

یہ گروپ جدید جنگی فلسفے کا چلتا پھرتا مظہر ہے۔ جہاں آسمان، سمندر اور الیکٹرانک اسپیس ایک دوسرے میں مدغم ہو چکے ہیں۔ کیریئر اسٹرائیک گروپ دراصل جدید عسکری طاقت کا چلتا پھرتا استعارہ ہے: طیارہ بردار جہاز اس کا دل، میزائل کروزر اس کی آنکھ، اور ڈسٹر انز اس کی ڈھال ہیں۔ فضائی، نیول اور میزائل ڈیفنس سے لیس یہ جنگی کیریئر مکمل فضائی برتری کا حامل نیٹو اور خلیجی اتحادی ممالک پر ایک شدید دباؤ کے طور پر خطے میں شدید تشویش کا باعث بن چکا ہے کہ خطے میں اس کی بھاری سیاسی لاگت ناقابلِ برداشت بھی ہو سکتی ہے۔ تاہم اتحادیوں کا دباؤ اس امر کی یاد دہانی ہے کہ طاقت کے اظہار اور طاقت کے استعمال کے درمیان ایک نازک مگر فیصلہ کن فاصلہ ہوتا ہے۔ اتحادیوں کی جانب سے جنگ سے باز رہنے کا مشورہ اس حقیقت کو اجاگر کرتا ہے کہ عسکری طاقت کی نمائش ہمیشہ سیاسی دانش کے تابع رہنی چاہیے۔

ایران کی گلیاں اور چوراہے اس وقت تاریخ کے خونچکاں ابواب رقم کر رہے ہیں۔ ایران کی سڑکیں اب صرف احتجاج کا نہیں، تاریخ کے کرب کا نقشہ بن چکی ہیں۔ ہزاروں جانوں کا ضیاع کسی بھی ریاست کیلئے محض داخلی معاملہ نہیں رہتا۔ یہ بین الاقوامی ضمیر کو آواز دیتا ہے، اور بیرونی مداخلت کیلئے اخلاقی جواز پیدا کرتا ہے۔ مظاہرین کے خلاف حکومتی کریک ڈاؤن میں بڑھتی ہلاکتیں ایک ایسا نوحہ ہیں جو انسانی ضمیر کو جھنجھوڑتا ہے اور اس معاملہ کو امریکا اور یورپی ممالک انسانی حقوق کی بحران کی طرف موڑ رہے ہیں جہاں ہلاکتوں کے خوفناک اعداد و شمار اقوام عالم کے سامنے رکھے جا رہے ہیں۔ اعداد و شمار، چاہے زیر جائزہ ہوں یا مصدقہ، اس حقیقت کی گواہی دیتے ہیں کہ ریاست اور عوام کے درمیان خلیج خطرناک حد تک وسیع ہو چکی ہے۔ ہلاکتوں کے اعداد و شمار کو جواز بنا کر یورپ اور امریکا انسانی حقوق کے چیمپئن بن کر مداخلت کو جائز بنا سکتے ہیں۔

ٹرمپ کی زبان میں بیک وقت دھمکی اور دعوت گفتگو کا امتزاج امریکی خارجہ پالیسی کے اس دورِ نئی مزاج کی عکاسی کرتا ہے اور یہ امریکی خارجہ پالیسی کا پرانا نہر ہے۔ ایک ہاتھ میں لاٹھی، دوسرے میں مصافحہ، جو کبھی تلوار دکھاتا ہے اور کبھی زیتون کی شاخ۔ ٹرمپ کی زبان میں دھمکی اور دعوت کا یہ امتزاج دراصل طاقت کے توازن کو اپنے حق میں رکھنے کی کوشش ہے۔ ”ہم کاروبار کیلئے کھلے ہیں“ کا جملہ بظاہر سفارت کاری کی پیشکش ہے، مگر اس کے پس منظر میں طاقت کی بازگشت صاف سنائی دیتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایران سے اپنی پیشگی شرائط منوانے کیلئے مذاکرات پر لانے کی کوشش اور بیک ڈور ڈپلومیسی کا ایک نیا باب کھولنے کا اشارہ ہو جو یقیناً ایرانی صدر کی سعودی ولی عہد کے ساتھ حالیہ فون پر گفتگو کے بعد شروع ہونے پر آمادگی کا اظہار ہو

انقلاب اسکوائر کی دیوار پر بنی تصویر صرف فن پارہ نہیں۔ یہ قومی بیانیے کی بصری تفسیر ہے۔ تہران کی انقلاب اسکوائر پر نمودار ہونے والی دیوار نگاری محض رنگ و روغن نہیں، بلکہ ایک نظریاتی اعلان ہے۔ نماز جمعہ کے منبر سے دی گئی وارنگ میں مذہب، ریاست اور مزاحمت ایک ہی آواز میں بولتے نظر آتے ہیں۔ اور صاف دکھائی دیتا ہے کہ جمعہ کے خطبے میں امریکا کو مخاطب کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ ایران میں مذہب اور ریاست ایک ہی اسکرپٹ پڑھتے ہیں۔ یہ وہ زبان ہے جو ایران کی سیاسی ثقافت میں گہرائی سے پیوست ہے اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ یہ ایرانی اقدام گھریلو حوصلے کی تعمیر کے ساتھ ساتھ ممکنہ ایک مذہبی جواز بنا کر امریکا اور اتحادیوں کے خلاف نفسیاتی جنگ کا اعلان ہو جس میں ایرانی بیانیے کو کامیابی ملتی دکھائی دے رہی ہے۔

ایرانی بیانیے کی سختی دراصل دفاعی عزم کی لفظی ڈھال ہے۔ وزارت خارجہ کے ترجمان کالب ولجہ اور الفاظ میں جو اعتماد جھلکتا ہے، وہ یہ پیغام دیتا ہے کہ جنگی جہازوں کی آمد و رفت سے قومی ارادے متزلزل نہیں ہوتے۔ ایران کا یہ رد عمل، اسٹریٹجک پیغام رسانی، میزائل ڈیٹرنس اور فوجی تیاری معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسی قوم کی آواز ہے جو جنگ سے خوف زدہ نہیں، بلکہ اسے اپنی بقا کی قیمت سمجھتی ہے۔

ہر جنگ اپنے بعد ایک نئی جنگ کی تیاری چھوڑ جاتی ہے۔ اسرائیل کے ساتھ تصادم ایران کیلئے عسکری تجربہ گاہ ثابت ہوا۔ جون کی بارہ روزہ جنگ کے بعد ایرانی فوج کے دعوے تاریخ کے اس تسلسل کی یاد دہانی ہیں جس میں ہر تصادم اگلے مرحلے کی تیاری بن جاتا ہے۔ میزائلوں اور ڈرونز کی بارش صرف عسکری کارروائی نہیں تھی، بلکہ ایک سیاسی پیغام بھی تھا۔ کہ حساب ابھی باقی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایران نے اس جنگ کے بعد اپنے میزائل پروگرام کو مزید مضبوط اور ترقی دیتے ہوئے اپنی ڈرون ٹیکنالوجی میں مزید مہارت اور صلاحیت حاصل کرنے کے بعد اپنی جنگی تیاریوں کی رفتار میں

خاصی پیش رفت حاصل کر لی ہے۔

ایران کی اصل طاقت اب توپ سے زیادہ ٹیکنالوجی میں ہے۔ خاموش، دور رس اور مہلک ہتھیاروں کے استعمال میں ان کی مہارت اور تیاری اس بات کی دلیل ہے۔ علاوہ ازیں ایران کامیزائل ذخیرہ اور ڈرون نیٹ ورک اس کی عسکری حکمت عملی کاستون ہیں۔ سرحدوں سے باہر ان کی موجودگی اس امر کی علامت ہے کہ جدید جنگ اب جغرافیہ کی قید سے آزاد ہو چکی ہے۔ میڈیم رینج سیلنک میزائل اور انٹر رینج سیلنک میزائل ٹیکنالوجی جو زیادہ تر غیر روایتی وار ہیڈز سے لیس ہے، اب ممکنہ جنگ میں ایران اپنے دفاع کیلئے استعمال کرنے سے گریز نہیں کرے گا۔ یاد رہے کہ یہ نظام چین، شمالی کوریا، ایران، بھارت اور پاکستان کے پاس بھی موجود ہے۔ علاوہ ازیں اس غیر متناسب جنگی فائدے کیلئے یو اے وی ٹیکنالوجی کو بھی میدان میں لایا جائے گا جس کے بعد جنگ کی صورت میں کرہ ارض پر خوفناک تباہی کا وہ سفر شروع ہو سکتا ہے جو کسی بھی عالمی جنگ کا آغاز بننے کیلئے کافی ہے۔

خاتم الانبیاء ہیڈ کوارٹر کے کمانڈر کا بیان ایک کھلا اعلان ہے کہ جنگ کی صورت میں دائرہ تصادم محدود نہیں رہے گا۔ یہ وہ نقطہ ہے جہاں دفاع، پیش بندی میں بدل جاتا ہے۔ یہ اعلان دراصل جنگ کو خطے کی دہلیز تک کھینچ لانے کی دھمکی ہے۔ جہاں ہر امریکی مفاد ایک ممکنہ ہدف ہے۔ گویا عراق،



اور خلیج میں تمام امریکی اڈے اب ایرانی حملوں کے خطرے سے آزاد نہیں جس کیلئے یقیناً امریکا اور مغرب کو ان اڈوں کے تحفظ کیلئے ایک غیر معمولی فورس کی ضرورت ہوگی اور اس صورتحال میں امریکا اور مغرب پر جنگ کا بے پناہ مالی دباؤ ان ملکوں کی جاری معیشت کو بے شمار مشکلات میں مبتلا کر دے گا۔

ایرانی حکام کی وارنگز خطے کے اتحادیوں کیلئے خطرے کی گھنٹی ہیں۔ خلیج کے عرب ممالک کی جانب سے واشنگٹن پر دباؤ اس حقیقت کو اجاگر کرتا ہے کہ جنگ کا ایندھن اکثر اتحادیوں کی

سرزمین سے لیا جاتا ہے، اتحادی اکثر طاقتور دوستوں کی جنگ میں سب سے پہلے جلتے ہیں مگر بعد ازاں آگ سب کو لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علاقائی عدم استحکام کے بڑھتے ہوئے اس خطرہ کے تدارک کیلئے خلیجی ریاستیں اس ممکنہ امریکی حملے کو روکنے کیلئے شب و روز لابیگ میں مصروف ہیں تاکہ خطے سے اس ممکنہ خوفناک جنگ کے شعلوں کو بھڑکنے سے پہلے خاموش کر دیا جائے۔

علاقائی پراسکیوں کا جال ایران کی اسٹریٹجک گہرائی کا حصہ ہے۔ یہ ایران کا خاموش لشکر ہے۔ جو بظاہر غیر ریاستی ہے مگر ریاستی مقاصد کا امین ہے۔ اگرچہ بعض کمزور ہو چکے، مگر دیگر اب بھی بھاری ہتھیاروں اور نظریاتی وابستگی سے لیس ہیں۔ اور یہی غیر یقینی عنصر سب سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ خطے میں حزب اللہ کو کافی کمزور کیا جا چکا ہے مگر وہ باقی اور برقرار اب بھی ہے اور خطے میں ملٹی خطرات میں پر کسی نیٹ ورک کے جال کا ابھی تک مکمل طور پر ختم نہیں کیا جا سکا جس کی بناء پر معمولی چنگاری بھی آگ کے بڑے گوداموں میں دھماکے کیلئے کافی ہوتی ہے۔

کتاب حزب اللہ کے کمانڈر کا بیان محض لٹاکار نہیں، بلکہ ایک نظریاتی بسیج کا اعلان ہے۔ ”یہ جنگ پارک میں چہل قدمی نہیں ہوگی“۔ یہ جملہ مزاحمت کی نفسیات کو ایک فقرے میں سمو دیتا ہے۔ یہ اعلان جنگ کم اور نظریاتی بسیج زیادہ ہے۔ کتاب حزب اللہ کی یہ اپیل ان تمام گروپوں کو متحرک کر

دینے کیلئے کافی ہے جو اپنی جانیں ہتھیلی پر لئے میدان جنگ میں کودنے کیلئے ایک حکم کے منتظر ہیں جس کے بعد دنیا بھر میں امریکی مفادات کیلئے خطرے کی گھنٹی بج سکتی ہے۔

ہر ریاست اس آگ سے دور رہنا چاہتی ہے، مگر شعلے ہمسایہ ہونے کا لحاظ نہیں رکھتے۔ خلیجی ممالک میں امریکی اڈوں کو نشانہ بنانے کی دھمکی، اور سعودی قیادت سے رابطہ، سفارت کاری اور جنگ کے بیچ جھولتی ہوئی صورت حال کی عکاسی ہے۔ سعودی عرب کی پیشگی علیحدگی ایک محتاط خود حفاظتی حکمت عملی ہے، جبکہ دیگر ریاستوں کی خاموشی سوالیہ نشان ہے۔ اس حوالے سے سعودی کی غیر جانبداری، قطر / یو اے ای کی مبہم پالیسی اور پاکستان پر شدید دباؤ نے خطے کو عجیب صورت حال سے دوچار کر رکھا ہے۔

پاکستان کی فضائی حدود اور بلوچستان کے استعمال سے متعلق افواہیں محض عسکری نہیں بلکہ جغرافیائی سیاست کا حساس باب ہیں۔ پاکستان کیلئے یہ فیصلہ محض ایک ”ہاں یا ناں“ نہیں، بلکہ قومی سلامتی، علاقائی توازن اور داخلی استحکام کا سوال ہے۔ پاکستان کیلئے یہ فیصلہ تاریخ، جغرافیہ اور قوم — تینوں کے سامنے جواب دہ ہے۔ انکار کی صورت میں بلوچستان میں علیحدگی پسندوں کے حوالے سے خدشات تاریخ کے ان سائے دار ابواب کی یاد دلاتے ہیں جہاں بالواسطہ دباؤ براہ راست جنگ سے زیادہ کارگر سمجھا جاتا ہے۔ جب بندوق سامنے سے نہ چلے تو سازش پیچھے سے چلتی ہے۔ امریکی وزیر خارجہ کے ذومعنی اشارے اسی روایت کا تسلسل دکھائی دیتے ہیں۔ بلوچستان کا رد کھیلنے کی پشت پر شورش کا فائدہ اٹھاتے ہوئے باہر ڈنگ کا اڑدھا ایک خطرہ بن کر ڈسنے کیلئے تیار بیٹھا ہے۔

ایران پر حملے کی صورت میں پاک — سعودی دفاعی معاہدہ ایک نازک امتحان سے دوچار ہو گا۔ یہ معاہدہ جنگ میں نہیں، جنگ سے بچنے میں آزمائش کا شکار ہو گا۔ یہاں توازن، خاموش سفارت کاری اور پس پردہ مشاورت فیصلہ کن کردار ادا کرے گی۔ براہ راست فوجی مداخلت کا امکان نہیں لیکن اس کیلئے بھرپور مشاورت کی اہم ضرورت ہو گی جو یقیناً اس وقت پس پردہ جاری ہوں گے۔ ترکی جیسا مضبوط علاقائی کھلاڑی عموماً خاموش تماشائی نہیں رہے گا۔ مگر تلوار کی بجائے ترازو ہاتھ میں رکھے گا۔ اس کا رد عمل غالباً سفارتی دباؤ، علاقائی ثالثی اور اپنے مفادات کے تحفظ کے گرد گھومے گا اور وہ نیٹو کے اہم اتحادی ہونے کے ناطے ایک متوازن کردار ادا کرنے کیلئے ابھی سے سرگرم ہے۔

ادھر دوسری طرف روس کی خاموشی چیخ سے زیادہ معنی خیز ہو سکتی ہے۔ روس کی خاموشی اگر برقرار رہتی ہے تو یہ یوکرین کے بدلے سودے بازی کی ایک اور مثال ہو سکتی ہے۔ تاریخ میں طاقتور ریاستیں اکثر ایک محاذ پر خاموشی کو دوسرے محاذ پر فائدے سے جوڑتی رہی ہیں۔ روس یقیناً خطے میں اس بڑھتی ہوئی کشیدگی میں سٹریٹجک ابہام سے کام لیتے ہوئے یوکرین میں اپنے مفاد کی شطرنج میں فتح کی امید لگائے بیٹھا ہے۔

افغانستان کے بگڑام ہوئی اڈے اور مہینہ سا بھر وار کی کہانی جدید دور کی ”غیر مرئی جنگ“ کا استعارہ ہے۔ یہ جنگ بغیر بارود کے تھی مگر نتائج آتشیں ہو سکتے تھے۔ ایران کی جانب سے بروقت رد عمل اس بات کی علامت ہے کہ آج کی جنگ صرف میدانوں میں نہیں، نیٹ ورکس میں بھی لڑی جاتی ہے۔ حالیہ سا بھر وار میں اسٹارلنک کی سازشوں کو ناکام بنانے میں پاک ایران — چین / روس کو آرٹیفیشیل نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے جس کے بعد ایران میں ہونے والے ہنگاموں سے حاصل ہونے والی منزل کو شدید ترین پسپائی کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔

امریکا کی ناکامی کے بعد براہ راست حملے اور ہمسایہ ممالک پر دباؤ کا امکان ایک خطرناک کھیل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ خطے کے ممالک بظاہر خاموش ہیں، مگر پردہ سیسے کے پیچھے سفارتی شطرنج جاری ہے۔ مقصد ایک ہی ہے: اس آگ کو بھڑکنے سے پہلے بجھا دیا جائے، کیونکہ اس کے شعلے سرحدیں نہیں پہچانتے۔ یہ خطہ ایک بار پھر تاریخ کے دہانے پر کھڑا ہے۔ جہاں ایک غلط قدم صدیوں کا بوجھ بن سکتا ہے۔ اس لئے محفوظ اور پرامن مستقبل کے کیلئے علاقائی کشیدگی، جنگ کی روک تھام کیلئے اجتماعی سفارت کاری کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے۔

امریکا کی جانب سے فضائی یا زمینی سہولتوں کا مطالبہ پاکستان کیلئے ہائی رسک فیصلہ ہو گا۔ اجازت کے فوائد محدود اور خطرات ناقابل حد تک بلند ہیں۔ اجازت کی صورت میں داخلی سلامتی (خصوصاً بلوچستان) اور انکار کی صورت میں سفارتی دباؤ اور ہائبرڈ خطرات بڑھ سکتے ہیں۔ بلوچستان کسی بھی بیرونی عسکری کشیدگی کی صورت میں پر کسی تشدد، اور انفارمیشن آپریشنز کا اولین ہدف بن سکتا ہے۔ ایران-امریکا تصادم کی شدت بڑھنے پر سرحدی دباؤ، اسلحہ و فنڈنگ کی غیر قانونی ترسیل اور علیحدگی پسند بیانیے کے دوبارہ فعال ہونے کا امکان بڑھ جاتا ہے۔

کسی بھی بیرونی عسکری تعاون کا سب سے فوری ردِ عمل بلوچستان میں شدت پسند عناصر کی فعالیت میں اضافے کی صورت میں آسکتا ہے۔ ریاست کو انسدادِ دہشتگردی، انٹیلی جنس کو آرٹینیشن اور سیاسی مصالحت کو یکجا رکھنا ہو گا۔ بلوچستان میں داخلی سلامتی کے چیلنجز کو مد نظر رکھتے ہوئے ریاست کیلئے ناقابل برداشت حدود، واضح سرخ لکیر اور عملی رولز آف انگیجمنٹ کا تعین ناگزیر ہے تاکہ بیرونی مداخلت، ہائبرڈ وار فیئر اور داخلی انتشار کو بروقت اور متناسب انداز میں روکا جاسکے، جبکہ شہری حقوق، سیاسی عمل اور قومی وحدت محفوظ رہیں۔ بلوچستان کیلئے مؤثر سرخ لکیر اور عملی رولز آف انگیجمنٹ کا مقصد محض طاقت کا اظہار نہیں بلکہ ریاستی رٹ، عوامی اعتماد اور قومی وحدت کا بیک وقت تحفظ ہے۔ یہی توازن پاکستان کو بیرونی جنگ کے شعلوں سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔

ایران کے ساتھ طویل سرحد اور توانائی / تجارت کے امکانات پاکستان کو مختلط سفارت کاری کا پابند کرتے ہیں۔ کشیدگی میں اضافہ سرحدی سلامتی اور اقتصادی منصوبوں کو متاثر کر سکتا ہے۔ پاکستان کی پالیسی غیر جانبدارانہ حقیقت پسندی، تعاون برائے امن، نہ کہ جنگ، انسانی امداد، سفارت کاری، ثالثی کی پیشکش اور عسکری شمولیت سے اجتناب پر قائم رہنی چاہیے، خطے میں جنگی فضائی پیک کیلئے خطرات بڑھا سکتی ہے۔ پاکستان کو چین کے ساتھ اسٹریٹجک کمیونیکیشن مضبوط رکھنی ہوگی تاکہ اقتصادی مفادات محفوظ رہیں۔

سعودی عرب اور خلیجی ممالک سے دفاعی و اقتصادی تعلقات اہم ہیں، مگر پاکستان کیلئے کسی بلاک میں کھڑے ہونے کی بجائے پل کا کردار زیادہ سودمند ہے۔ براہ راست جنگ میں شمولیت کے بغیر فضائی و سرحدی نگرانی، سائبر سیکیورٹی، داخلی امن و امان کی مضبوطی کیلئے عسکری تیاریاں مکمل رکھنے کی ضرورت ہے۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ او آئی سی کے رکن ممالک اقوام متحدہ کے منشور اور اسلامی اخوت کے اصولوں کی توثیق کرتے ہوئے، مشرق وسطیٰ میں بڑھتی عسکری کشیدگی پر شدید تشویش کا اظہار کرتے ہوئے، خود مختاری، علاقائی سالمیت اور انسانی جانوں کے تحفظ کو بنیادی قدر مانتے ہوئے فوری طور پر ان چند عملی نکات پر عملدرآمد کیلئے تمام سفارتی دباؤ استعمال کرتے ہوئے اپنا کردار ادا کریں:

☆ او آئی سی کے تحت اعلیٰ سطحی ثالثی کمیٹی کے قیام کی منظوری دی جائے۔

☆ ایران، امریکا تنازعے کے حل کے تمام فریقین سے فوری کشیدگی میں کمی اور طاقت کے استعمال سے گریز کے عملی اقدامات کی ٹھوس تجاویز مرتب کی جائیں۔

☆ براہ راست مذاکرات کی حوصلہ افزائی کیلئے خطے میں جنگ کے خطرات کو ختم کرنے کیلئے عملی اقدامات کئے جائیں۔

☆ خطے میں تمام ممالک کو اپنی سر زمین کسی بھی جارحانہ کارروائی کیلئے استعمال نہ ہونے دینے کا عہد کیا جائے۔

☆ اقوام متحدہ اور او آئی سی کے اشتراک سے قائم کردہ کمیٹی کی مشترکہ کاوشوں سے انسانی حقوق کے تحفظ اور شہری ہلاکتوں کی آزادانہ تحقیقات کی حمایت کی جائے اور ان ہنگاموں کے درپردہ غیر ملکی سازشوں کو بھی منظر عام لا کر اس کا تذکرہ کیا جائے۔

☆ خطے میں علاقائی پر کسی جنگوں کی مذمت اور غیر ریاستی مسلح گروہوں کے عدم استعمال پر زور دیتے ہوئے ان ممالک کے خلاف مشترکہ ٹھوس اقدامات کئے جائیں جو ان پر کسی جنگوں کے شعلوں کو بھڑکانے کیلئے تیل فراہم کر رہے ہیں۔

☆ اقوام متحدہ اور دیگر عالمی فورمز پر مشترکہ سفارتی موقف اپنانے کی ہدایت کی جائے۔

☆ فرقہ واریت یا قومیت کے نام پر مسلح تحریک کی کسی بھی کوشش کو دشمنانہ باہر ڈا پریشن تصور کیا جائے گا۔

☆ کسی بھی غیر ملکی انٹیلی جنس، عسکری اثاثے یا پر کسی نیٹ ورک کی جانب سے سرحد پار دراندازی یا لاجسٹک سپورٹ ناقابل برداشت ہوگی۔

☆ گواہ، سی پیک منصوبے، گیس تنصیبات، بندرگاہیں، اور مواصلاتی انفراسٹرکچر پر حملہ ریاستی رد عمل کو فوری اور فیصلہ کن بنائے گا۔

☆ کسی بھی چینل کے ذریعے غیر ملکی مالی یا عسکری معاونت کی دریافت پر سخت ترین قانونی و سیکوریٹی کارروائی ہوگی۔

☆ اور اختتامی شق کے مطابق او آئی سی اور اقوام متحدہ اس عزم کا اعادہ کرے کہ بالعموم اسلامی دنیا اور بالخصوص اس خطے کو ایک اور تباہ کن جنگ سے بچانے کیلئے اجتماعی حکمت، سفارت کاری اور اتحاد ہی واحد راستہ ہے۔

اسلامی دنیا کیلئے اجتماعی حکمت اور ثالثی ہی وہ راستہ ہے جو خطے کو ایک اور تباہ کن تصادم سے بچا سکتا ہے اور اس ضمن میں پاکستان کیلئے بہترین راستہ امن کی فعال سفارت کاری ہے۔ نہ خاموش تماشائی، نہ جنگی فریق۔ پاکستان کیلئے دانش مندی اسی میں ہے کہ وہ جنگ کے شور میں امن کی آواز بنے، اور اسلامی دنیا کیلئے وقت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ جذبات کے بجائے حکمت کو رہنما بنائے۔ تاریخ گواہ ہے جنگیں طاقت سے شروع ہوتی ہیں، مگر انجام ہمیشہ عقل لکھتی ہے۔

جب تاریخ سائنس رو کے کھڑی تھی

آگ کے دہانے پر عالمی ضمیر

تاریخ کے بعض موڑ ایسے ہوتے ہیں جہاں اقوام کی خاموشی بھی ایک جرم بن جاتی ہے اور بے حسی بھی ایک فیصلہ۔ آج جب مشرق وسطیٰ کی فضا میں بارود کی بو گھل رہی ہے، جب سفارت کی میز پر رکھے ہوئے کاغذات کے نیچے عسکری تیاریوں کی لرزش صاف سنائی دے رہی ہے، تو سوال یہ نہیں کہ ایران اور امریکا کے درمیان کشیدگی کیوں ہے؛ اصل سوال یہ ہے کہ دنیا کی امن پسند قومیں کہاں ہیں؟ وہ آوازیں کہاں گئیں جو دیت نام، عراق اور افغانستان کی جنگوں کے خلاف سڑکوں پر اتر آئی تھیں؟ وہ دانشور کہاں ہیں جو طاقت کے غرور کو لٹا کر کرتے تھے؟

آج اگرچہ بیشتر مغربی ممالک کے اہل قلم، اساتذہ اور دانشور ایک مرتبہ پھر چیخ چیخ کر اپنی حکومتوں کو خبردار کر رہے ہیں کہ جنگ کی آگ پورے عالم کو جلا سکتی ہے، مگر اقتدار کی راہداروں میں یہ صدائیں مدہم پڑ جاتی ہیں۔ امریکی صدر کی قیادت میں واشنگٹن جس طرز سیاست کی جانب بڑھ رہا ہے، وہ نہ صرف ایران بلکہ عالمی امن کیلئے بھی ایک آزمائش ہے۔ اقوام متحدہ جیسے عالمی ادارے کو عملاً نظر انداز کرتے ہوئے یکطرفہ فیصلوں کا رجحان اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ طاقت کی سیاست ایک بار پھر قانون کی بالادستی پر غالب آنا چاہتی ہے۔ اقوام متحدہ کا قیام اسی لیے عمل میں آیا تھا کہ عالمی تنازعات کو گفت و شنید کے ذریعے حل کیا جائے، مگر اگر اسے محض رسمی مہر بنادیا جائے تو پھر عالمی نظم کا ستون متزلزل ہو جاتا ہے۔

بعض مبصرین کے نزدیک یہ صورت حال اس عالمی تصور کی بازگشت ہے جسے کبھی یہودی نژاد ہنری کیسنجر جیسے امریکی مفکرین اور پالیسی سازوں نے عالمی طاقت کے نئے توازن کے طور پر پیش کیا تھا۔ ایک ایسا تصور جس میں طاقت کے مراکز محدود اور فیصلے چند ہاتھوں میں مرکوز ہوں۔ اگر موجودہ امریکی پالیسی واقعی اسی سوچ کی عملی تعبیر ہے تو یہ سوال اور بھی سنگین ہو جاتا ہے کہ کیا عالمی برادری ایک مرتبہ پھر طاقت کی یک قطبی تعبیر کے سامنے سرنگوں ہونے جا رہی ہے؟

ایران اپنی جانب سے اقوام متحدہ کے منشور کے آرٹیکل 51 کے تحت اپنے دفاع اور خود مختاری کے حق کا اعلان کر رہا ہے۔ اس کا استدلال یہ ہے کہ وہ جنگ کا آغاز نہیں کرے گا، مگر جارحیت کا جواب ضرور دے گا۔ یہ موقف خواہ کسی کے نزدیک قابل قبول ہو یا نہ ہو، مگر اس میں ایک قانونی اور خود مختارانہ لہجہ ضرور موجود ہے۔ اگر یہ کشیدگی بڑھتی ہے تو بعید نہیں کہ خطے کی جنگ کسی وسیع تر عالمی تصادم میں تبدیل ہو جائے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ عالمی جنگیں ہمیشہ کسی ایک چنگاری سے شروع ہوئیں۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پورا افق شعلوں کی لپیٹ میں آگیا۔

ایسے میں یہ سوال اور بھی اہم ہو جاتا ہے کہ دنیا کی امن پسند قومیں کیوں خاموش ہیں؟ کیا اقتصادی مفادات نے ضمیر کی آواز کو دبا دیا ہے؟ کیا اسلحہ ساز صنعتوں کا منافع انسانی جانوں سے زیادہ قیمتی ہو چکا ہے؟ یا پھر عالمی سیاست اس مقام پر پہنچ چکی ہے جہاں اصول محض تقریروں کی زینت اور طاقت اصل فیصلہ کن عنصر بن گئی ہے؟ یہ مضمون اسی کرب، اسی سوال اور اسی تاریخی لمحے کی بازگشت ہے۔ جہاں ہمیں یہ طے کرنا ہے کہ ہم تماشائی رہیں گے یا تاریخ کے دھارے کو بدلنے کی جرأت کریں گے۔

عصر حاضر کی سیاست میں بعض لمحات ایسے ہوتے ہیں جب الفاظ محض بیانات نہیں رہتے، بلکہ تاریخ کے سینے پر لکھی جانے والی تحریر کا پیش خیمہ بن جاتے ہیں۔ ایران اور امریکا کے مابین حالیہ کشیدگی بھی ایسا ہی ایک لمحہ ہے۔ جہاں سفارت کی نرم گفتاری اور عسکری قوت کی سخت آہنی چاپ ایک ساتھ سنائی دیتی ہے۔ یہ نزاع محض دوریاستوں کے اختلاف کا عنوان نہیں، بلکہ عالمی طاقت کے توازن، خود مختاری کے مفہوم، اور بین الاقوامی قانون کی عملداری کا امتحان ہے۔

اسلامی جمہوریہ ایران نے اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کے نام ایک باضابطہ خط ارسال کیا، جس میں نہایت دو ٹوک الفاظ میں یہ موقف اختیار کیا گیا کہ اگر ایران پر کسی نوع کی 'فوجی جارحیت' مسلط کی گئی تو وہ اپنے دفاع کا حق استعمال کرے گا اور وہ جواب دینے میں تامل نہ کرے گا۔ اس مراسلے میں اس امر کی بھی صراحت کی گئی کہ تصادم کی صورت میں خطے میں موجود 'دشمن طاقت' سے وابستہ تمام اڈے، عسکری سہولیات اور تزویراتی اثاثے جائز اہداف تصور کیے جائیں گے۔ اس مراسلے کا لب لباب یہ تھا کہ ایران کسی قسم کی جنگ کا آغاز نہیں کرے گا، لیکن اگر اس کی خود مختاری پر ضرب لگائی گئی تو وہ اقوام عالم کے منشور کے تحت اپنے دفاع کا حق استعمال کرے گا۔ تاہم اس بیان عزم کے ساتھ تہران نے یہ بھی باور کرایا کہ وہ نہ کشیدگی کا خواہاں ہے اور نہ جنگ کا آغاز کرے گا۔ گویا تلوار نیام میں ہے، مگر ہاتھ کی گرفت ڈھیلی نہیں۔

یہ بیان محض عسکری عزم کا اظہار نہیں تھا، بلکہ ایک قانونی و اخلاقی استدلال بھی تھا۔ ایران نے اقوام متحدہ کے منشور کے آرٹیکل 51 کا حوالہ دیتے ہوئے دفاع کے حق کو بین الاقوامی قانون میں تسلیم شدہ اصول قرار دیا۔ یہاں تہران نے محض عسکری ردِ عمل کی دھمکی نہیں دی بلکہ ایک قانونی بنیاد بھی فراہم کی۔ گویا وہ عالمی ضمیر کو گواہ بنا کر کہہ رہا ہے کہ اس کا اقدام جارحیت نہیں بلکہ دفاع ہو گا۔ اس طرز استدلال سے ایران عالمی رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرنے کی سعی کر رہا ہے۔ گویا تہران نے اپنی ممکنہ کارروائی کو پیشگی قانونی جواز فراہم کیا۔ ایک ایسا جواز جو عالمی رائے عامہ کو مخاطب کرتا ہے۔

ایران نے امریکی صدر کے بیانات کو محض سیاسی بیان بازی نہیں بلکہ 'فوجی جارحیت' کے حقیقی خطرے کا مظہر قرار دیا۔ تہران کے نزدیک جب طاقتور ریاست کا سربراہ فوجی کارروائی کی بات کرتا ہے تو وہ الفاظ محض الفاظ نہیں رہتے، بلکہ پالیسی کا امکان بن جاتے ہیں صدر ٹرمپ کی زبان میں جو سختی اور جو حتمیت تھی، اس نے تہران کے شبہات کو یقین میں بدل دیا کہ واشنگٹن عسکری آپشن کو سنجیدگی سے زیر غور رکھے ہوئے ہے۔

تہران کے نزدیک یہ لب و لہجہ محض لفظی گھن گرج نہیں بلکہ خطے کی سلامتی اور استحکام کے افق پر ابھرتا ہوا ایک اندیشہ ہے، جو کسی بھی لمحے شعلہ بن سکتا ہے۔ یہاں قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ جدید سفارت کاری میں بیانات خود ایک تزویراتی ہتھیار بن چکے ہیں۔ جب کسی طاقتور ریاست کا سربراہ بُری چیزوں کی بات کرتا ہے تو وہ الفاظ نفسیاتی دباؤ، داخلی سیاست اور خارجی پیغام رسانی — تینوں کا مرکب ہوتے ہیں۔ ایران اس خطرے کو اجاگر کر کے خطے کے ممالک کو متنبہ کرنا چاہتا ہے کہ کسی بھی مہم جوئی کا اثر صرف ایران تک محدود نہیں رہے گا بلکہ پورا مشرق وسطیٰ اس کی لپیٹ میں آسکتا ہے۔

جمہرات کو ٹرمپ نے ایران کو جاری مذاکرات میں 'بامعنی معاہدے' تک رسائی کیلئے زیادہ سے زیادہ 10 دن کی مہلت دی، ٹرمپ کی جانب سے دس دن کی مہلت دینا دراصل ایک نفسیاتی دباؤ کی حکمت عملی معلوم ہوتی ہے۔ یہ طرز بیان مذاکرات کو وقت کی قید میں لا کر فریقِ ثانی کو جلد فیصلہ کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہ اعلان بظاہر ایک سفارتی پیشکش تھا، مگر اس کی ساخت میں دباؤ کی کیفیت نمایاں تھی۔ وقت کی تحدید مذاکرات کو نفسیاتی دائرے

میں قید کر دیتی ہے، جہاں فریق ثانی کو جلدی فیصلہ کرنے پر آمادہ کیا جاتا ہے۔ ایران نے جو ابیورنیم کی افزودگی کو اپنا خود مختاری کا ناقابل تنسیخ حق قرار دے کر یہ پیغام دیا کہ وہ بنیادی اصولوں پر پسپائی اختیار نہیں کرے گا۔ یہ وہ نکتہ ہے جہاں خود مختاری اور عالمی دباؤ کی رسہ کشی پوری شدت سے عیاں ہے۔ یہاں اصل نزاع معاہدے کی شقوں سے زیادہ وقار ریاست کا ہے۔ تہران کے نزدیک یہ معاملہ محض تکنیکی نہیں بلکہ قومی وقار اور دفاعی خود مختاری کا مسئلہ ہے۔ یہاں سوال یہ نہیں کہ کتنی افزودگی ہوگی؛ سوال یہ ہے کہ کون فیصلہ کرے گا؟

اسرائیلی وزیراعظم نیتن یاہو کا بیان اس بحران کو دو طرفہ کشمکش سے نکال کر سرے فریقی تناؤ میں بدل دیتا ہے۔ اسرائیل ایران کے جوہری پروگرام کو اپنے وجود کیلئے خطرہ تصور کرتا ہے۔ چنانچہ اگر امریکا اقدام کرے یا نہ کرے، اسرائیل اپنی سلامتی کے تناظر میں یکطرفہ کارروائی کو بھی خارج ازامکان نہیں سمجھتا۔ اس پہلو سے بحران کی نوعیت زیادہ پیچیدہ ہو جاتی ہے۔ اس تناظر میں اسرائیلی وزیراعظم نیتن یاہو کا بیان بھی نہایت اہم ہے۔ انہوں نے خبردار کیا کہ اگر ایران نے حملہ کیا تو اسرائیل بھرپور جواب دے گا۔ اس بیان نے مشرق وسطیٰ کی فضاؤں میں پہلے سے موجود بارود کی بو کو اور گہرا کر دیا۔ اسرائیل ایران کے جوہری پروگرام کو اپنے وجود کیلئے خطرہ تصور کرتا ہے۔ چنانچہ یہ بحران دو فریقوں تک محدود نہیں رہتا بلکہ ایک وسیع علاقائی معادلے میں تبدیل ہو جاتا ہے، جہاں ہر اقدام کا رد عمل کئی سطحوں میں ظاہر ہو سکتا ہے۔

عمان طویل عرصے سے خلیجی سیاست میں ایک معتدل ثالث کے طور پر جانا جاتا ہے۔ 6 فروری کو عمان کی ثالثی میں امریکا اور ایران کے درمیان بالواسطہ مذاکرات کا آغاز ہوا۔ عمان خطے میں ایک معتدل اور قابل اعتماد ثالث کے طور پر جانا جاتا ہے۔ اس کے بعد جنیوا میں دوسرا دور منعقد ہوا، جس کے اختتام پر دونوں فریقوں نے مذاکرات جاری رکھنے کے عزم کا اظہار کیا۔ یہ مذاکرات اس امر کا ثبوت ہیں کہ سفارت کا دروازہ ابھی بند نہیں ہوا۔ مگر یہ دروازہ نیم وا ہے۔ اس کے ایک طرف امید کھڑی ہے، اور دوسری طرف اندیشہ۔ تاہم شروع ہونے والی بالواسطہ بات چیت اور جنیوا میں ہونے والا دوسرا دور اس امر کی علامت ہے کہ دونوں فریق دروازہ بند نہیں کرنا چاہتے۔ یہ مذاکرات دراصل اس نازک توازن کی علامت ہیں جس میں جنگ کی دھمکی اور امن کی خواہش بیک وقت موجود ہیں۔ سفارت کے اس نرم قالین کے نیچے عسکری اضطراب کی لہریں بدستور رواں ہیں۔

امریکی اخبار وال سٹریٹ جرنل نے رپورٹ کیا کہ ٹرمپ ایران کے خلاف 'محدود فوجی حملے' کے امکان پر غور کر رہے ہیں۔ تاکہ اسے جوہری معاہدے پر آمادہ کیا جاسکے۔ رپورٹ کے مطابق ممکنہ کارروائی مخصوص فوجی یا سرکاری اہداف تک محدود ہوگی، مگر اس میں توسیع کا امکان بھی موجود ہے۔ ٹرمپ کے اس بیان نے بحران کو ایک نیا رخ دے دیا ہے۔ 'محدود فوجی حملہ' کا تصور بظاہر کم شدت کی کارروائی معلوم ہوتا ہے، مگر تاریخ بتاتی ہے کہ محدود کارروائیاں اکثر وسیع تصادم کا پیش خیمہ بن جاتی ہیں اور محدود حملے اکثر وسیع تنازعات کا پیش خیمہ بن جاتے ہیں۔ 1990 کی دہائی میں عراق پر عائد محدود پابندیاں بالآخر ایک مکمل جنگ کی صورت اختیار کر گئیں۔ لہذا 'محدود' کی اصطلاح خود ایک فریب نظر بھی ہو سکتی ہے۔ ایسا اقدام ایران پر دباؤ ڈالنے کا ذریعہ ہو سکتا ہے، مگر اس کا رد عمل بھی محدود رہے، یہ ضمانت کوئی نہیں دے سکتا۔

صدر ٹرمپ کی جانب سے حتمی فیصلہ مؤخر رکھنا اس بات کا اشاریہ ہے کہ واشنگٹن میں عسکری اور سیاسی حلقوں میں مکمل اتفاق رائے نہیں۔ ایک طرف طاقت کے مظاہرے کی خواہش، دوسری جانب ممکنہ جنگ کے نتائج کا خوف۔ یہ دو متضاد رجحانات فیصلہ سازی کو پیچیدہ بناتے ہیں۔ امریکی انتظامیہ کو ایک طرف طاقت کا مظاہرہ کرنا ہے، اور دوسری طرف مشرق وسطیٰ میں ایک نئی جنگ کے نتائج کا اندازہ بھی لگانا ہے۔ افغانستان اور عراق کے تجربات



ابھی تاریخ کے اوراق سے مٹے نہیں۔ تاہم اخبار کے مطابق صدر نے حتیٰ فیصلہ نہیں کیا، بلکہ مختصر مہم سے لے کر وسیع عسکری کارروائی تک مختلف آپشنز زیر غور ہیں۔ گویا شطرنج کی بساط بچھی ہے، مگر آخری چال ابھی پردہ غیب میں ہے۔

امریکی حکام خود تسلیم کرتے ہیں کہ حملہ ایران کو جوابی کارروائی پر آمادہ کر سکتا ہے، جس سے مشرق وسطیٰ وسیع تر تنازعے میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ ایران کے پاس میزائل صلاحیتیں اور خطے میں اتحادی گروہوں کا ایسا نیٹ ورک موجود ہے ج امریکی اڈوں اور اتحادی ریاستوں کو نشانہ بنا سکتا ہے۔ یوں ایک چنگاری پورے خطے کو اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہے۔ اور یہ آگ سرحدوں کی قید میں نہیں رہے گی۔ یوں ایک محدود کارروائی پورے خطے کو جنگی دائرے میں لاسکتی ہے اور محدود چنگاری بھڑک کر خطے کو آگ کی لکیر میں بدل سکتی ہے۔

سینئر امریکی اور ایرانی حکام کے درمیان بات چیت جاری ہے۔ امریکا ایران کے جوہری پروگرام کو محدود کرنے اور سیلینک میزائلوں پر پابندیاں عائد کرنے کا خواہاں ہے، جبکہ تہران جامع معاہدے کو مسترد کرتے ہوئے محدود رعایتوں پر آمادہ ہے جو اس کے نزدیک خودداری اور مفاہمت کے درمیان سکتا ہے۔ یہ اختلاف دراصل اعتماد کے فقدان کا مظہر ہے۔ ایک نازک توازن ہے۔ ایران کے نزدیک جامع معاہدہ اس کی دفاعی خود مختاری کو کمزور کر دونوں فریق ایک دوسرے کی نیت پر مکمل یقین نہیں رکھتے اور یہی بے اعتمادی مذاکرات کو مشکل بناتی ہے۔

خطے میں امریکی افواج کی موجودگی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ جدید لڑاکا طیاروں، کمانڈ اینڈ کنٹرول اینکرافٹ اور طیارہ بردار بحری جہاز کی تعیناتی دراصل ایک خاموش پیغام اور س صف بندی کا حصہ ہیں کہ سفارت کی میز پر بیٹھنے والا فریق عسکری طاقت سے بھی بے نیاز نہیں۔ یہ دباؤ مذاکرات میں فوقیت حاصل کرنے کی کوشش کا حصہ ہے۔ یہ عسکری تیاری سفارت کی میز پر دباؤ کا خاموش مگر مؤثر استعارہ ہے۔ پیغام واضح ہے: اگر الفاظ ناکام ہوئے تو طاقت موجود ہے۔

ٹرمپ کا کہنا کہ دنیا دس دن میں جان لے گی، کہ آیا امریکا ایران کے ساتھ معاہدہ کرے گا یا فوجی کارروائی کی راہ اپنائے گا۔ ان کے الفاظ میں: ہمیں بامعنی معاہدہ کرنا ہو گا، ورنہ برے واقعات ہوں گے، دراصل ایک سیاسی بیانیہ ہے جو داخلی اور خارجی دونوں سامعین کو مخاطب کرتا ہے۔ یہ اعلان عالمی میڈیا میں بحران کی شدت کو بڑھا دیتا ہے اور ایران کو دفاعی پوزیشن میں لے آتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ اعلان داخلی سیاست کیلئے بھی اہم ہے، کیونکہ امریکی عوام اور کانگریس دونوں اس معاملے پر منقسم ہیں۔

امریکا نے حالیہ دنوں میں مشرق وسطیٰ میں اپنے دستے بڑھائے ہیں، جبکہ سوئٹزر لینڈ میں ہونے والی بات چیت میں پیش رفت کی اطلاعات نے امید کی فضا پیدا کی ہے اور امن کی کرن دکھاتی ہیں، مگر فوجی دستوں کا اضافہ اس امید کو سایہ خوف میں بدل دیتا ہے۔ یہی عصر حاضر کی سفارتکاری کا پیراڈکس ہے۔ یہ دوہرا منظر عصر حاضر کی عالمی سیاست کا خاصہ ہے۔ امن کی گفتگو اور جنگ کی تیاری ساتھ ساتھ۔ یوں ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں سفارتی دستاویز۔ یہی عصر حاضر کی مکار سیاست کا دوہرا چہرہ ہے۔

امریکی کانگریس کے ڈیموکریٹک اراکین اور بعض ریپبلکن رہنما بغیر منظوری فوجی کارروائی کی مخالفت کر رہے ہیں۔ امریکی قانون سازوں کی مخالفت اس امر کی یاد دہانی ہے کہ امریکا میں جنگ کا فیصلہ یکطرفہ نہیں۔ یہ داخلی اختلاف امریکی پالیسی سازی کو پیچیدہ بنا سکتا ہے۔ اگر کانگریس کی منظوری کے بغیر اقدام کیا گیا تو داخلی سیاسی بحران بھی جنم لے سکتا ہے۔ یہ پہلو ٹرمپ کی حکمت عملی پر اثر انداز ہو سکتا ہے اور یہ داخلی سیاسی کشمکش امریکی پالیسی سازی کے توازن کو متاثر کر سکتی ہے۔

ٹرمپ نے اپنے خصوصی ایجنٹی سٹیو وٹکوف اور اپنے داماد جیرالد کشنر کی ایران کے ساتھ 'اچھی ملاقاتوں' کا ذکر کیا، مگر ساتھ ہی یہ اعتراف بھی کیا کہ ایران کے ساتھ با معنی معاہدہ آسان نہیں۔ تاہم بیک ڈور چینل کی ملاقاتیں اس بات کا اشارہ ہیں کہ پس پردہ سفارتکاری جاری ہے یہ پس پردہ سفارت کاری بعض اوقات رسمی مذاکرات سے زیادہ مؤثر ثابت ہوتی ہے، کیونکہ اس میں چپک اور رازداری زیادہ ہوتی ہے۔

وائٹ ہاؤس کی پریس سیکرٹری کیرولین لیوٹ کا بیان اس امر کی علامت ہے کہ واشنگٹن تاحال سفارتی حل کو ترجیح دیتا ہے، اگرچہ عسکری آپشن کو میز سے ہٹایا نہیں گیا۔ انہوں نے مزید کہا ایران کیلئے معاہدہ کرنا دانشمندانہ ہو گا، اور صدر اب بھی سفارتی حل کے خواہاں ہیں۔ یہ بیان اس بات کی علامت ہے کہ واشنگٹن عسکری آپشن کو میز پر رکھتے ہوئے بھی سفارت کو ترک نہیں کرنا چاہتا۔ یہ بیان سفارت کی آخری کھڑکی کو کھلار کھنے کی سعی معلوم ہوتا ہے لیکن بعض سیاسی مبصرین ٹرمپ کی سابقہ پالیسیوں کو دیکھتے ہوئے اس بات کا خدشہ ظاہر کر رہے ہیں کہ ٹرمپ کبھی بھی عالمی سیاست میں دھماکہ کر سکتے ہیں۔

ابتداء میں بورڈ آف پیس کا مقصد اسرائیل اور حماس کے درمیان غزہ کی جنگ کا خاتمہ سمجھا جاتا تھا، اسی لئے ابتدا میں بورڈ آف پیس کا مقصد غزہ میں جنگ کے خاتمے کی نگرانی بتایا گیا تھا، مگر اب اس کا دائرہ وسیع ہو چکا ہے اور یہ اس تاثر کو تقویت دیتا ہے کہ امریکا بعض معاملات میں اقوام متحدہ سے ہٹ کر متوازی سفارتی پلیٹ فارم قائم کرنا چاہتا ہے۔ یہ عالمی طاقت کے توازن میں تبدیلی کا اشارہ ہو سکتا ہے۔ بعض مبصرین کے نزدیک یہ اقدام عالمی سیاست میں اقوام متحدہ کو پس پشت ڈالنے کی کوشش بھی ہو سکتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو یہ عالمی نظم میں ایک بڑی تبدیلی کا اشارہ ہو گا۔ نئے اختیارات پر غور اس تسلسل کی کڑی ہے، جو کسی بھی وقت ایک نئے مرحلے میں داخل ہو سکتی ہے۔

گزشتہ برس ایرانی جوہری تنصیبات پر حملہ اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ عسکری کارروائی محض نظری مفروضہ نہیں بلکہ عملی تجربہ بھی ہے۔ گزشتہ برس امریکی میزائلوں اور طیاروں نے ایرانی جوہری تنصیبات کو نشانہ بنایا تھا۔ اطلاعات ہیں کہ وائٹ ہاؤس اس ہفتے نئے حملے کے اختیارات پر غور کر رہا تھا۔ یہ تسلسل ظاہر کرتا ہے کہ عسکری آپشن محض نظریاتی بحث نہیں بلکہ عملی امکان ہے۔ یہ امر ظاہر کرتا ہے کہ عسکری آپشن محض نظری بحث نہیں بلکہ عملی امکان بھی ہے۔

ایران اور امریکا کے درمیان جاری کشمکش دراصل طاقت اور قانون، خود مختاری اور عالمی دباؤ، سفارت اور عسکریت کے درمیان ایک پیچیدہ مکالمہ ہے۔ ایران اور امریکا کے مابین یہ کشمکش محض دوریاستوں کا نزاع نہیں، بلکہ عالمی طاقت کے توازن، خود مختاری کے مفہوم، اور سفارت و عسکریت کے باہمی تعلق کا امتحان ہے۔ تہران کا لہجہ دفاعی خود اعتمادی کا مظہر ہے اور وہ اپنے وقار اور دفاعی حق پر اصرار کر رہا ہے، جبکہ واشنگٹن کی حکمت عملی دباؤ اور

مذاکرات کے امتزاج پر مبنی دکھائی دیتی ہے۔ اسرائیل کا عنصر، علاقائی اتحادیوں کی موجودگی، اور عالمی طاقتوں کی خاموش نظریں اس بحران کو مزید پیچیدہ بناتی ہیں۔

یہ منظر نامہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ تاریخ تو اس کی تپش سرحدوں کی قید میں نہیں رہے گی۔ اور اگر سفارت غالب آئی تو یہ بحران عالمی سیاست کے دفتر میں ایک کامیاب باب کہلائے گا؛ عالمی سیاست کے دفتر میں مشکلات اور آزمائش کے دھارے میں وہی قومیں سرخرو ہوتی ہیں جو تدبر اور توازن کے ساتھ فیصلے کرتی ہیں۔ اور اگر عسکریت غالب آئی تو مشرق وسطیٰ کی سر زمین ایک بار پھر بارود کی بوسے معطر — یا شاید معطر — ہو جائے گی۔ یاد رکھیں کہ اگر جنگ کی آگ اگر بھڑک اٹھی تو ایک اور سیاہ اور مکروہ باب رقم ہو کر رہ جائے گا۔ مکروہ باب بھی ہمیں یہ سکھائے گا کہ طاقت کی منطق کے ساتھ حکمت کی روشنی لازم ہے، ورنہ اندھیرا سب کو اپنی پلیٹ میں لے لیتا ہے۔ تاریخ کی آنکھ اس منظر کو بغور دیکھ رہی ہے — کہ آیا عقل کی روشنی غالب آتی ہے یا طاقت کا غرور۔

تاریخ کے افق پر ابھی دھند چھائی ہوئی ہے۔ مگر اتنا واضح ہے کہ آئندہ چند دن نہ صرف ایران اور امریکا بلکہ پوری دنیا کیلئے فیصلہ کن ثابت ہو سکتے ہیں۔ عقل اور حکمت کی روشنی اگر غالب آئی تو امن کی شمع روشن رہے گی؛ اور اگر طاقت کا غرور غالب آیا تو یہ شمع آندھیوں کے نرغے میں آسکتی ہے۔ آج جب ہم اس بحران کے دہانے پر کھڑے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ تاریخ ایک بار پھر انسانیت کا امتحان لے رہی ہے۔ ایران اور امریکا کی کشمکش محض دو ریاستوں کا نزاع نہیں؛ یہ عالمی نظم، بین الاقوامی قانون اور انسانی بقا کا سوال ہے۔ اگر طاقت کے بل پر فیصلے مسلط کیے گئے، اگر اقوام متحدہ کو محض ایک رسمی ادارہ بنا کر پس پشت ڈال دیا گیا، تو پھر دنیا ایک خطرناک مثال قائم کرے گی — ایسی مثال جو آنے والے برسوں میں ہر طاقتور ریاست کو یکطرفہ اقدام کا جواز فراہم کر سکتی ہے۔

امن پسند قوموں کی خاموشی دراصل اسی لیے تشویش ناک ہے کہ جنگ کبھی سرحدوں میں مقید نہیں رہتی۔ ایک خطے کی آگ دوسرے براعظم کی فضا کو بھی دھواں آلود کر دیتی ہے۔ اگر آج مشرق وسطیٰ سلگ رہا ہے تو کل یورپ اور ایشیا بھی اس کی تپش محسوس کریں گے۔ دانشوروں کی صدائیں اگرچہ بلند ہو رہی ہیں، مگر جب تک عوامی دباؤ حکومتوں کو مجبور نہ کرے، یہ صدائیں اقتدار کے ایوانوں میں گونج کر رہ جاتی ہیں۔ یہ وقت ہے کہ عالمی ضمیر بیدار ہو۔ یہ وقت ہے کہ طاقت کے ایوانوں کو یہ باور کرایا جائے کہ دنیا کسی ایک نظریے، کسی ایک لابی یا کسی ایک ملک کی جاگیر نہیں۔ اگر عالمی سیاست کو ایک قطبی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی تو اس کا ردِ عمل بھی عالمی سطح پر ظاہر ہو گا۔ اور اگر جنگ کی آگ بھڑک اٹھی تو اس کا انجام کسی کے قابو میں نہیں رہے گا۔ تاریخ کی آنکھ ہم سب کو دیکھ رہی ہے۔ آنے والی نسلیں یہ سوال کریں گی کہ جب دنیا ایک اور تباہی کے دہانے پر کھڑی تھی تو امن کے داعی کہاں تھے؟ کیا وہ خاموش تماشائی تھے یا انہوں نے ظلم کے مقابلے میں آواز بلند کی؟

آج ضرورت اس امر کی ہے کہ اقوام عالم، اہل دانش، مذہبی و اخلاقی رہنما اور عوام سب مل کر اس آگ کو بھڑکنے سے پہلے بجھانے کی کوشش کریں۔ کیونکہ اگر اس بار جنگ کی چنگاری شعلہ بن گئی تو شاید اسے بجھانے کیلئے کوئی عالمی ادارہ، کوئی سفارتی میز اور کوئی دانشورانہ اپیل کافی نہ ہو۔ امن کی شمع ابھی بجھی نہیں — مگر اس کے گرد آندھیاں ضرور منڈلا رہی ہیں۔ فیصلہ ہمیں کرنا ہے کہ ہم اس شمع کو اپنے ہاتھوں سے بچاتے ہیں یا اسے طاقت کی آندھیوں کے سپرد کر دیتے ہیں۔

جب خاموشی بولنے لگے

عصرِ حاضر کی عسکری دنیا میں جہاں قوتِ بازو سے زیادہ قوتِ علم اور خاموش تیاری فیصلہ کن سمجھی جاتی ہے، وہاں چین کے جدید اور پراسرار طویل فاصلے تک مار کرنے والے فضاء سے فضاء میں وار کرنے والے میزائل پی ایل-17 کی پہلی جھلک کا منظر عام پر آنا محض ایک تصویر نہیں، بلکہ طاقت کے توازن میں ایک معنی خیز اشارہ ہے، ایسا اشارہ جو بہت کچھ کہہ کر بھی بہت کچھ ناگفتہ چھوڑ دیتا ہے۔

پی ایل-17 کی منظر عام پر آنے والی پہلی جھلک کو مغرب میں محض ایک عسکری تصویر نہیں سمجھا گیا بلکہ اسے چین کی اس طویل المدت حکمتِ عملی کا ایک اور باب تصور کیا گیا ہے جس میں خاموشی، ابہام اور تدریج بنیادی اوصاف ہیں۔ مغربی عسکری ادارے بخوبی جانتے ہیں کہ چین جو کچھ دکھاتا ہے، اس سے کہیں زیادہ چھپا کر رکھتا ہے۔ اور جو چھپا کر رکھتا ہے، وہی اصل پیغام ہوتا ہے۔

پاکستان اس وقت تاریخ کے ایک ایسے موڑ پر کھڑا ہے جہاں عالمی طاقتوں کی کشمکش محض نظری نہیں رہی بلکہ براہِ راست خطے کی فضاؤں، سمندروں اور سرحدوں میں محسوس کی جاسکتی ہے۔ چین کے عسکری عروج اور اس کے جدید ہتھیار، خصوصاً پی ایل-17، پاکستان کیلئے نہ صرف ایک اتحادی کی طاقت کا مظہر ہیں بلکہ ایک نئے تزویراتی ماحول کا اعلان بھی۔ بدلتا ہو عالمی عسکری توازن، خصوصاً چین کی جدید فضائی صلاحیتوں (جیسے پی ایل-17) کا ظہور، جنوبی ایشیا اور بحر الکاہل کے خطے میں طاقت کے روایتی تصورات کو از سر نو تشکیل دے رہا ہے۔ پاکستان، اپنی جغرافیائی حیثیت اور تزویراتی شراکت داریوں کے باعث، اس تبدیلی سے براہِ راست متاثر ہونے والا ملک ہے۔

چین، امریکا اور بھارت۔: اکیسویں صدی کی عالمی سیاست اب دو نہیں بلکہ کم از کم تین ستونوں پر کھڑی دکھائی دیتی ہے: چین، امریکا اور بھارت۔: اکیسویں صدی کی عالمی سیاست اب دو نہیں بلکہ کم از کم تین ستونوں پر کھڑی دکھائی دیتی ہے: ان تینوں کی باہمی کشمکش محض عسکری نہیں بلکہ تہذیبی، معاشی اور نفسیاتی بھی ہے۔ دنیا میں طاقت کا توازن بدل رہا ہے، چین نئی اور بہت طاقتور دفاعی ٹیکنالوجی لا رہا ہے، جس سے امریکا اور بھارت دونوں اپنی حکمتِ عملی پر دوبارہ غور کر رہے ہیں۔ دفاعی تجزیہ نگاروں کی آراء اگرچہ محتاط ہیں، مگر ان میں اضطراب کی ہلکی سی لرزش نمایاں ہے۔ ان کے مطابق پی ایل-17 ممکنہ طور پر دنیا کا سب سے طویل رینج رکھنے والا فضاء سے فضا میں مار کرنے والا میزائل ہو سکتا ہے، اور اگر یہ اندازے درست ثابت ہوئے تو مغربی بحر الکاہل میں امریکی فضائی برتری کیلئے یہ محض ایک نیا ہتھیار نہیں بلکہ ایک نئی حکمتِ عملی کا اعلان ہو گا۔ امریکا اس سہ فریقی مثلث میں اب بھی خود کو عالمی نظم کا نگہبان سمجھتا ہے، مگر چین کی خاموش، مسلسل اور سائنسی پیش قدمی اس تصور کو چیلنج کر رہی ہے۔ پی ایل-17 اسی چیلنج کی ایک مثال ہے۔ ایک ایسا ہتھیار جو اعلان سے زیادہ سوال اٹھاتا ہے۔

امریکی دفاعی حلقوں میں پی ایل-17 کو خاص طور پر گیم چینیجر کے تناظر میں دیکھا جا رہا ہے۔ مغربی بحر الکاہل میں امریکی فضائی حکمتِ عملی برسوں سے طیارہ بردار بحری بیڑوں اور ان کے گرد قائم فضائی تحفظ پر قائم رہی ہے، مگر 400 کلو میٹر یا اس سے زائد رینج رکھنے والا فضاء سے فضا میں مار کرنے والا میزائل اس تصور کی بنیادوں میں دراڑ ڈال سکتا ہے۔

چین اور پاکستان کے مابین دفاعی تعاون محض معاہدوں اور مشقوں تک محدود نہیں، بلکہ ایک مشترک تزویراتی شعور کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ ایسے میں پی ایل-17 جیسے میزائل پاکستان کیلئے بالواسطہ طور پر ایک حفاظتی چھتری کا تصور پیدا کرتے ہیں، خاص طور پر جب خطے میں طاقت کا جھکاؤ بھارت

کی جانب بڑھانے کی کوششیں کی جا رہی ہوں۔ چین کی طویل فاصلے تک مار کرنے والی فضائی صلاحیت خطے میں فضائی بالادستی کے تصور کو محدود کر رہی ہے۔ اس کے نتیجے میں بھارت کی فضائی آپریشنل آزادی متاثر ہو سکتی ہے، جو بالواسطہ طور پر پاکستان کیلئے ایک ڈیٹرنس سٹیبلائزر (بازدار توازن) کا کردار ادا کر سکتی ہے۔ یہ تبدیلی پاکستان کیلئے براہ راست جنگ کا پیغام نہیں، بلکہ ایک موقع بھی ہے کہ خطے میں طاقت کا توازن برقرار رہے اور کوئی ملک بلا روک ٹوک برتری حاصل نہ کر سکے۔

چینی ذرائع ابلاغ کے مطابق یہ تصویر حالیہ ایام میں چینی سوشل میڈیا پر گردش کرتی رہی ہے، مگر اس کے وقت اور مقام کے بارے میں سرکاری سطح پر کوئی تصدیق سامنے نہیں آ سکی۔ گویا یہ تصویر بھی چین کی عسکری روایت کے مطابق خاموشی میں بولنے والی ایک علامت ہے۔ امریکا میں عسکری تجزیہ کار اس نکتے پر متفق دکھائی دیتے ہیں کہ پی ایل-17 کا اصل ہدف محض دشمن طیارے نہیں بلکہ ہائی ویلو ایئر اثاثے ہیں۔ جیسے فضائی ری فیولنگ ٹینکرز، ایئر بورن وارنگ اینڈ کنٹرول سسٹمز "اواکس" اور کمانڈ اینڈ کنٹرول پلیٹ فارمز۔ یہ وہ آنکھیں اور شریانیں ہیں جن کے بغیر جدید فضائی جنگ اندھی اور کمزور ہو جاتی ہے۔

پاکستانی عسکری منصوبہ بندی میں فضائی طاقت ہمیشہ ایک فیصلہ کن عنصر رہی ہے۔ اگر چین خطے میں طویل فاصلے تک مار کرنے والی فضائی صلاحیت میں برتری حاصل کرتا ہے تو اس کا فائدہ پاکستان کو ایک اسٹریٹیجک ڈیپتھ کی صورت میں مل سکتا ہے۔ ایسی گہرائی جو براہ راست تصادم کے بغیر توازن قائم رکھے۔ چین کے ساتھ پاکستان کی دفاعی شراکت داری محض ہتھیاروں کے حصول تک محدود نہیں بلکہ مشترکہ تزویراتی مفادات پر مبنی ہے۔ چین کی بڑھتی ہوئی فضائی برتری پاکستان کو ایک محفوظ اسٹریٹیجک ماحول فراہم کر سکتی ہے، بشرطیکہ پاکستان اپنی پالیسی خود مختاری برقرار رکھے۔ چین کی مضبوطی کا مطلب یہ نہیں کہ پاکستان کو لاپرواہو جانا چاہیے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان کو اپنی دفاعی اور سفارتی پالیسی زیادہ سمجھ داری سے چلانی ہوگی۔

بھارت اس منظر نامے میں خود کو امریکا کا فطری اتحادی تصور کرتا ہے، مگر اس کی جغرافیائی حقیقت اسے چین کے بالکل سامنے لاکھڑا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چینی عسکری ترقی، خصوصاً فضائی طاقت، بھارت میں محض تشویش نہیں بلکہ بے چینی پیدا کر رہی ہے۔ بھارتی اسٹریٹیجک حلقوں میں یہ احساس گہرا ہوتا جا رہا ہے کہ اگر چین فضاؤں میں فیصلہ کن برتری حاصل کر لیتا ہے تو جنوبی ایشیا میں طاقت کا توازن بھارت کے حق میں نہیں رہے گا۔ اور یہی احساس بھارت کو تیز تر عسکری تیاری اور مغربی اتحادوں کی طرف دھکیل رہا ہے۔

تصویر میں ایک پی ایل-17 میزائل یا اس کا ہم قامت ماڈل ایک اسٹینڈ پر رکھا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے سامنے کھڑا شخص، جس کا چہرہ ڈیجیٹل پردے میں چھپایا گیا ہے، خود اس رازداری کا استعارہ بن جاتا ہے جو چینی دفاعی منصوبہ بندی کی پہچان ہے۔ بیشتر عسکری ماہرین کا خیال ہے کہ یہ اصل میزائل نہیں بلکہ اس کا ماڈل ہے، تاہم اس کا حجم بعینہ حقیقی میزائل کے مطابق ہے۔ اور عسکری دنیا میں حجم اکثر سچ بولتا ہے۔

سینٹاگون کے اندر اس میزائل کو چین کی حکمت عملی کا ایک فطری تسلسل سمجھا جا رہا ہے۔ یعنی ایسا ہتھیار مخالف رسائی / علاقے سے انکار جو براہ راست جنگ چھیڑنے کے بجائے دشمن کو میدان میں آنے سے پہلے ہی روک دے۔ اس زاویے سے دیکھا جائے تو پی ایل-17 طاقت کے انظہار سے زیادہ طاقت کے نفسیاتی استعمال کا آلہ بن جاتا ہے۔ پی ایل-17 جیسے نظام امریکا اور بھارت کے دفاعی تعاون کو مزید گہرا کر سکتے ہیں۔ بھارت اور امریکا کے



بڑھتے ہوئے تعلقات خطے میں دباؤ بڑھا سکتے ہیں، اس لیے پاکستان کیلئے ضروری ہے کہ وہ نہ جذبات میں آئے اور نہ ہی تنہائی کا شکار ہو۔ پاکستان اس رجحان کو محض خطرے کے طور پر نہیں بلکہ پالیسی ایڈجسٹمنٹ کے موقع کے طور پر دیکھنا چاہیے، خاص طور پر فضائی دفاع اور الیکٹرانک وار فیئر میں۔ تاہم اس منظر نامے کا دوسرا پہلو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ عالمی طاقتوں کے درمیان بڑھتی ہوئی عسکری مسابقت پاکستان پر دباؤ ڈال سکتی ہے کہ وہ اپنی پوزیشن واضح کرے۔ اور تاریخ گواہ ہے کہ دباؤ کے لمحوں میں غیر جانبدار رہنا سب سے مشکل امتحان ہوتا ہے۔

چینی میڈیا کے مطابق پی ایل سیریز دراصل چین کی پیپلز لبریشن آرمی کیلئے تیار کیے گئے فضاء سے فضاء میں مار کرنے والے میزائلوں کا ایک تسلسل ہے۔ اس سلسلے میں کم فاصلے کیلئے پی ایل-10، درمیانی فاصلے کیلئے پی ایل-11 اور پی ایل-12 جیسے میزائل پہلے ہی چین کے دفاعی منظر نامے میں اپنی جگہ بنا چکے ہیں۔ مغربی عسکری دنیا میں ایک اور تشویش اس امر پر بھی پائی جاتی ہے کہ اگر پی ایل-17 جیسے میزائل بڑی تعداد میں فعال ہو گئے تو امریکی اور اتحادی فضائی قوت کو زیادہ فاصلے سے، زیادہ محتاط اور زیادہ مہنگے آپریشنز کرنا پڑیں گے۔ اور جنگ میں ”مہنگا“ ہونا اکثر اس کے غیر مؤثر ہونے کی علامت بن جاتا ہے۔

پاکستان کیلئے اصل امتحان یہ نہیں کہ وہ کس کے ساتھ کھڑا ہے، بلکہ یہ ہے کہ وہ کس حد تک خود مختار عسکری اور سفارتی فیصلہ سازی برقرار رکھ سکتا ہے۔ چین کی طاقت میں اضافہ موقع بھی ہے اور امتحان بھی۔ موقع توازن کا، امتحان خودی کا۔ پاکستان پر بلاک پولیٹکس کا دباؤ بڑھ سکتا ہے، علاقائی کشیدگی میں اضافہ پاکستان کی معاشی ترجیحات کو متاثر کر سکتا ہے، کسی ایک طاقت پر حد سے زیادہ انحصار اسٹریٹیجک کمزوری بن سکتا ہے۔ امریکا اس سے فریفتی کھیل میں بھارت کو ایک مہرے کے طور پر دیکھتا ہے، مگر تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ بڑی طاقتوں کے کھیل میں مہرے اکثر خود کو بادشاہ سمجھنے لگتے ہیں۔ اور یہی غلط فہمی بڑے سانحات کو جنم دیتی ہے۔ اصل طاقت صرف ہتھیار نہیں ہوتے؛ اصل طاقت یہ ہوتی ہے کہ ملک معاشی طور پر مضبوط ہو، سفارتی طور پر متوازن ہو اور عسکری طور پر ہوشیار۔

رہا ہے، مگر اس کے باوجود سرکاری سطح پر اس کے اطلاعات کے مطابق پی ایل-17 کم از کم گزشتہ ایک دہائی سے تیاری کے مختلف مراحل سے گزر رہی ہے۔ یہ میزائل کسی عظیم الشان فوجی پریڈ کی زینت بنا، نہ کسی مشق کی ویڈیوز میں نمایاں ہوا، البتہ بارے میں معلومات نہایت محدود رکھی گئی ہیں۔ 2016 کے بعد سے چند دور بین نگاہوں نے اسے جے-16 لڑاکا طیارے پر نصب حالت میں دیکھ لیا۔ یورپی دفاعی تجزیہ کار نسبتاً کم شور مچاتے ہوئے، مگر گہری نگاہ سے اس پیش رفت کو دیکھ رہے ہیں۔ ان کے نزدیک پی ایل-17 اس بات کی علامت ہے کہ چین اب صرف علاقائی طاقت نہیں رہا بلکہ عالمی عسکری معیار متعین کرنے کی صلاحیت بھی حاصل کر رہا ہے اور یہی بات یورپ کیلئے طویل المدت تشویش کا باعث ہے۔

اگر پاکستان نے دانش مندی سے اس بدلتے توازن کو پڑھ لیا، تو وہ محض رد عمل دینے والی ریاست نہیں رہے گا بلکہ خطے میں استحکام کی آواز بن سکتا ہے اور اگر یہ موقع ضائع ہو تو طاقتوروں کی کشمکش میں کمزور کی حیثیت ہمیشہ تاریخ کا تلخ باب رہی ہے۔ اگر پاکستان نے دانش مندی سے فیصلے کیے تو بدلتی

دنیا میں وہ کمزور نہیں بلکہ ایک ذمہ دار اور مؤثر ریاست کے طور پر ابھر سکتا ہے۔ فضائی دفاعی نظام اور الیکٹرانک وارفیئر میں سرمایہ کاری، چین کے ساتھ دفاعی تعاون میں ٹیکنالوجی ٹرانسفر پر زور، امریکا اور دیگر عالمی طاقتوں کے ساتھ متوازن سفارتی روابط، خطے میں کشیدگی کم کرنے کیلئے سفارتی کردار کو فعال بنانا نہ صرف وقت کا تقاضہ بلکہ انتہائی اہم ہے۔ چین، اس کے برعکس، براہ راست تصادم سے گریز کرتے ہوئے طاقت کو (بازدار قوت) ڈیٹرنس کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔ پی ایل-17 جیسے میزائل اسی فلسفے کی توسیع ہیں، لڑنے کیلئے نہیں، بلکہ لڑائی سے روکنے کیلئے ہیں۔

انہی محدود تصاویر کی بنیاد پر ایک امریکی عسکری تجزیاتی ویب سائٹ نے اندازہ لگایا ہے کہ پی ایل-17 کی لمبائی چھ میٹر (تقریباً بیس فٹ) سے زیادہ ہو سکتی ہے۔ تجزیہ کاروں کے مطابق یہ ایک ریڈار گائیڈڈ طویل فاصلے تک مار کرنے والا میزائل ہے، جس کی رینج ممکنہ طور پر چار سو کلو میٹر سے تجاوز کر سکتی ہے۔ اور یہی عدد عالمی عسکری حلقوں میں تشویش کا باعث بن رہی ہے۔ جہاں تک بھارت کا تعلق ہے، وہاں پی ایل-17 کو محض ایک دور افتادہ بحر الکاہلی مسئلہ نہیں سمجھا جا رہا۔ بھارتی اسٹریٹیجک حلقے اسے براہ راست سینو-انڈین طاقت کے توازن سے جوڑ کر دیکھتے ہیں، خاص طور پر اس پس منظر میں کہ چین اور بھارت کے درمیان سرحدی تناؤ پہلے ہی ایک مستقل حقیقت بن چکا ہے۔

یوں پاکستان کیلئے پی ایل-17 جیسے ہتھیاروں کی معنویت میزائل کی رینج سے زیادہ، سیاسی بصیرت کی وسعت میں مضمر ہے۔ کہ طاقت کو کیسے دیکھا جائے، کیسے سمجھا جائے، اور کیسے متوازن رکھا جائے۔ اس سہ فریقی طاقت کے توازن میں پاکستان ایک خاموش مگر اہم عامل ہے۔ اس کی جغرافیائی حیثیت، چین کے ساتھ قربت، اور بھارت کے ساتھ تاریخی تناؤ۔ سب اسے ایک ایسے مقام پر لا کھڑا کرتے ہیں جہاں ایک غلط قدم خطے کو عدم استحکام کی طرف دھکیل سکتا ہے۔

پاکستان کیلئے اصل چیلنج کسی ایک ہتھیار یا ملک کا نہیں، بلکہ بدلتی ہوئی عالمی حقیقت کو بروقت سمجھنے اور اس کے مطابق خود کو ڈھالنے کا ہے۔ قومی سلامتی کا تقاضا یہی ہے کہ طاقت، حکمت اور معاشی استحکام کو ایک ہی حکمت عملی میں سمو جایا جائے۔ اگر دانش مندی غالب رہی تو یہی سہ فریقی توازن جنوبی ایشیا کو ایک نئی سرد جنگ سے بچا سکتا ہے۔ اور اگر غرور، خوف یا غلط اندازے غالب آئے، تو تاریخ ایک بار پھر یہی کہے گی کہ طاقت نے عقل پر سبقت لے لی۔ اس کے مقابلے میں اس وقت امریکی فضائیہ کے زیر استعمال سب سے زیادہ رینج رکھنے والا فضا سے فضا میں مار کرنے والا میزائل اے آئی ایم 120 ڈی ہے جس کی زیادہ سے زیادہ رینج تقریباً 160 کلو میٹر بتائی جاتی ہے۔ یہ تقابل خود اپنی زبان میں بہت کچھ کہہ دیتا ہے۔

بھارتی دفاعی تجزیہ کاروں کے مطابق اگر چین پی ایل-17 جیسے طویل فاصلے کے میزائلوں کو اپنے مغربی تھیٹر میں مؤثر طریقے سے تعینات کر دیتا ہے تو بھارتی فضائیہ کی آپریشنل آزادی محدود ہو سکتی ہے۔ خصوصاً ان طیاروں کیلئے جو ری فیلنگ یا فضائی نگرانی پر انحصار کرتے ہیں۔

پینڈا گون کی جانب سے دسمبر میں کانگریس کو پیش کی گئی چین کی فوجی طاقت سے متعلق سالانہ رپورٹ میں اس پہلو کی صراحت کی گئی ہے کہ پی ایل-17 سے لیس جے-16 لڑاکا طیارے کی حملہ آور صلاحیت 1400 کلو میٹر سے زائد ہو سکتی ہے۔ یعنی خطرہ محض میزائل تک محدود نہیں بلکہ پورے فضائی نظام تک پھیلا ہوا ہے۔ اسی تناظر میں بھارت میں اپنی فضائی دفاعی صلاحیتوں، میزائل ٹیکنالوجی اور شراکت داروں کے انتخاب پر اسز نو غور کی آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔ امریکا، فرانس اور اسرائیل کے ساتھ دفاعی تعاون کو محض ہتھیاروں کی خرید و نہی نہیں بلکہ ٹیکنالوجیکل توازن کے ایک ذریعہ کے طور پر دیکھا جا رہا ہے۔

تجزیہ کاروں کے مطابق پی ایل-17 کے سیکر سسٹم میں جدید اے ای ایس اے ریڈار شامل ہو سکتا ہے، جو پہلے ہی پی ایل-15 میزائل میں استعمال ہو چکا ہے۔ پی ایل-15 کو 2015 میں عملی سروس میں شامل کیا گیا تھا اور اس کی ریج 200 کلومیٹر سے زائد بتائی جاتی ہے۔ یوں پی ایل-17 اس ارتقائی سلسلے کی اگلی اور کہیں زیادہ خطرناک کڑی معلوم ہوتا ہے۔ بین الاقوامی طاقت کے توازن کے وسیع تر منظر نامے میں پی ایل-17 ایک واضح اشارہ ہے کہ دنیا اب ایک بار پھر ملٹی پولر عسکری نظام کی طرف بڑھ رہی ہے۔ وہ دور، جب ایک یا دو طاقتیں فضاؤں پر بلا شرکتِ غیرے حاکم تھیں، آہستہ آہستہ تاریخ کے اوراق میں سمٹنا دکھائی دیتا ہے۔

چینی میڈیا کے مطابق پی ایل-17 کی تصویر پہلی مرتبہ 2016 میں منظرِ عام پر آئی تھی، جب اسے جے-16 لڑاکا طیارے پر آزمائشی مراحل کے دوران دیکھا گیا۔ جے-16 چین کا طاقتور ترین ہیوی ملٹی رول فائٹر جیٹ ہے اور اب تک یہی واحد طیارہ ہے جس پر پی ایل-17 کی تنصیب کی تصدیق ہوئی ہے۔ گویا یہ ہتھیار اور یہ طیارہ ایک دوسرے کیلئے ہی تراشے گئے ہوں۔ عسکری تاریخ کے طالب علم جانتے ہیں کہ طاقت کا توازن ہمیشہ ہتھیاروں سے نہیں، بلکہ ان ہتھیاروں کے تصور سے بدلتا ہے۔ پی ایل-17 شاید ابھی پوری طرح عملی صورت میں سامنے نہ آیا ہو، مگر اس کا تصور ہی اتحادی منصوبہ بندی، فضائی مشقوں اور دفاعی بجٹ کی سمت متعین کرنے لگا ہے۔

چین کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو پی ایل-17 نہ جارحیت کا اعلان ہے، نہ جنگ کی دعوت؛ بلکہ یہ اس فلسفے کی توسیع ہے جس میں کہا جاتا ہے "ایسی طاقت حاصل کرو کہ جنگ کی نوبت ہی نہ آئے"۔ یہی وہ نکتہ ہے جہاں عسکری طاقت سفارت کاری کی زبان بولنے لگتی ہے۔ یوں پی ایل-17 کو اگر محض ایک میزائل سمجھا جائے تو یہ اس کے اثرات کو کم کر کے دیکھنے کے مترادف ہو گا۔ درحقیقت یہ ایک علامت ہے۔ اس علامت کی کہ عالمی طاقت کا مرکز بتدریج حرکت میں ہے، اور فضا میں بھی اب اسی حرکت کی گواہ بن رہی ہیں۔

اگر عسکری تاریخ ہمیں کچھ سکھاتی ہے تو وہ یہ کہ خاموش تیاری سب سے بلند اعلان ہوتی ہے۔ پی ایل-17 بھی شاید اسی خاموشی کا نام ہے۔ ایک ایسا نام جو ابھی پوری طرح پکارا نہیں گیا، مگر جس کی بازگشت بحر الکابل کے افق پر سنائی دینے لگی ہے۔ طاقت جب حکمت سے خالی ہو تو فتنہ بن جاتی ہے، اور حکمت جب طاقت سے عاری ہو تو دعارہ جاتی ہے۔ آج کی دنیا کو دونوں درکار ہیں۔ اور پاکستان کو ان دونوں کے بیچ اپنا راستہ خود تراشنا ہے۔ طاقت کا زمانہ شور سے نہیں، توازن سے پہچانا جاتا ہے۔ جو قوم توازن سمجھ لیتی ہے، وہی تاریخ میں اپنا مقام محفوظ رکھتی ہے۔ یہ تحریر خبر نہیں، بلکہ تاریخ کے حاشیے پر لکھی جانے والی وہ سطر ہے جسے وقت آہستہ آہستہ نمایاں کرتا ہے۔ پی ایل-17 شاید آج ایک مبہم سایہ ہے، مگر طاقت کی تاریخ میں سائے اکثر آنے والے طوفانوں کی خبر دیتے ہیں۔

کشیدگی سے تدبیر تک

سرحدیں کبھی صرف نقشے پر کھینچی ہوئی لکیریں نہیں ہوتیں؛ وہ تاریخ کے اوراق پر ثبت وہ نشانات ہوتی ہیں جن کے پیچھے نسلوں کی ہجرتیں، تہذیبوں کی آمیزشیں اور خون و آہن کی کہانیاں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ پاک۔ افغان خطہ بھی ایسی ہی ایک سرزمین ہے جہاں پہاڑ خاموش نہیں، بلکہ عہدوں اور عہد شکنیوں کے گواہ ہیں؛ جہاں ہوا میں صرف گرد نہیں اڑتی، بلکہ ماضی کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے۔

آج جب دونوں ممالک کے درمیان کشیدگی کی لہر سفارتی بیانات سے نکل کر باقاعدہ مسلح تصادم کی صورت اختیار کر چکی ہے اور افغانستان کی جانب سے پاکستان پر کھلے حملوں نے جنگ کا آغاز کر دیا ہے، تو یہ محض دو ریاستوں کا نزاع نہیں، بلکہ ایک ایسے خطے کا امتحان ہے جو صدیوں سے تہذیبی ربط، مذہبی ہم آہنگی اور جغرافیائی وابستگی میں بندھا ہوا ہے۔ ہندو کی آواز اگرچہ لمحاتی فیصلہ سنانے کی ہے، مگر تاریخ کا فیصلہ ہمیشہ تدبیر، اعتدال اور حکمت کے پلڑے میں ہوتا ہے۔ اس پس منظر میں یہ جائزہ نہ کسی فریق کی وکالت ہے، نہ کسی الزام کی ترجمانی؛ بلکہ ایک سنجیدہ کاوش ہے کہ حالات کے دھندلکے میں حقیقت کی کرن تلاش کی جائے، اور اس بحران کو محض خبر نہیں بلکہ فہم کے دائرے میں دیکھا جائے۔ بالخصوص اب جبکہ جنگ کی آگ سرحد کے دونوں جانب بھڑک اٹھی ہے۔

برصغیر اور خراسان کی سرحدیں محض جغرافیہ نہیں، تاریخ کی سلگتی ہوئی سطریں ہیں۔ یہاں پہاڑ گواہ ہیں کہ طاقت کی بازگشت کبھی ہندو ق سے سنائی دی، کبھی معاہدے کی سیاہی سے۔ حالیہ ایام میں جب پاکستان نے افغانستان کے مشرقی صوبوں — ننگرہار، پکتیا اور خوست — میں فضائی ضربیں لگائیں تو یہ اقدام ایک عسکری کارروائی سے زیادہ ایک سیاسی اعلان تھا کہ ریاست اپنی حدود کے تحفظ کے باب میں خاموش تماشائی نہیں رہ سکتی۔

سنیچر (21 فروری) کی شب پاکستان کی جانب سے افغانستان کے صوبوں ننگرہار، پکتیا اور خوست میں کی جانے والی فضائی کارروائیوں نے خطے کی فضا کو ایک بار پھر بارود کی بُو سے آلودہ کر دیا۔ پاکستان کی جانب سے ان کارروائیوں کو محض ایک محدود عسکری آپریشن سمجھنا سادہ لوحی ہوگی۔ یہ دراصل ایک پیغام تھا۔ داخلی بھی اور خارجی بھی۔ داخلی سطح پر یہ باور کرانا مقصود تھا کہ ریاست اپنی رٹ قائم کرنے کی اہلیت رکھتی ہے؛ خارجی سطح پر یہ اشارہ کہ اگر سرحد پار سے حملے جاری رہے تو پاکستان ”حق دفاع“ کے اصول کے تحت پیش قدمی کرے گا۔

سنیچر (21 فروری) کی شب پاکستانی سکیورٹی حکام کے مطابق افغانستان کے مشرقی صوبوں ننگرہار، پکتیا اور خوست میں کالعدم تنظیم تحریک طالبان پاکستان اور دولت اسلامیہ خراسان کے سات مراکز کو نشانہ بنایا گیا جہاں سے پاکستان کے خلاف حملوں کی منصوبہ بندی کی جا رہی تھی۔ اور 80 شدت پسند ہلاک ہوئے۔ اسلام آباد کے مطابق نشانہ وہ مراکز تھے جہاں تحریک طالبان پاکستان اور دولت اسلامیہ خراسان کے مسلح عناصر سرگرم تھے۔ دعویٰ کیا گیا کہ متعدد شدت پسند مارے گئے۔ کابل نے اسے سرحدی خود مختاری کی پامالی قرار دیتے ہوئے عام شہریوں کی ہلاکت کا الزام عائد کیا اور جواب دینے کی تنبیہ کی۔ اور اب وہ تنبیہ عملی اقدام میں ڈھل چکی ہے۔ یوں توپ کی آواز سفارتی لغت میں ایک نئے باب کا پیش خیمہ بنی اور اب وہ باب باقاعدہ جنگی مرحلے میں داخل ہو چکا ہے۔

آج جب دونوں ممالک کے درمیان کشیدگی کی لہر دوبارہ ابھری ہے، تو یہ محض دوریاستوں کا نزاع نہیں، بلکہ ایک ایسے خطے کا امتحان ہے جو صدیوں سے تہذیبی ربط، مذہبی ہم آہنگی اور جغرافیائی وابستگی میں بندھا ہوا ہے۔ بدوق کی آواز اگرچہ لمحاتی فیصلہ سناتی ہے، مگر تاریخ کا فیصلہ ہمیشہ تدبر، اعتدال اور حکمت کے پلڑے میں ہوتا ہے۔ اس پس منظر میں یہ جائزہ نہ کسی فریق کی وکالت ہے، نہ کسی الزام کی ترجمانی؛ بلکہ ایک سنجیدہ کاوش ہے کہ حالات کے دھندلکے میں حقیقت کی کرن تلاش کی جائے، اور اس بحران کو محض خبر نہیں بلکہ فہم کے دائرے میں دیکھا جائے۔

برصغیر اور خراسان کی سرحدیں محض جغرافیہ نہیں، تاریخ کی سلگتی ہوئی سطریں ہیں۔ یہاں پہاڑ گواہ ہیں کہ طاقت کی بازگشت کبھی بدوق سے سنائی دی، کبھی معاہدے کی سیاہی سے۔ حالیہ ایام میں جب پاکستان نے افغانستان کے مشرقی صوبوں — ننگرہار، پکتیا اور خوست — میں فضائی ضربیں لگائیں تو یہ اقدام ایک عسکری کارروائی سے زیادہ ایک سیاسی اعلان تھا کہ ریاست اپنی حدود کے تحفظ کے باب میں خاموش تماشائی نہیں رہ سکتی۔

کابل نے اسے سرحدی خود مختاری کی پامالی قرار دیتے ہوئے سرحدی خلاف ورزی قرار دیا اور دعویٰ کیا گیا کہ عام شہری، حتیٰ کہ خواتین و اطفال بھی اس کی زد میں آئے۔ عام شہریوں کی ہلاکت کا الزام عائد کیا اور جواب دینے کی تنبیہ کی۔ جدید عالمی قانون میں ریاستی خود مختاری ایک مقدس اصول ہے، اور اس کی خلاف ورزی کو اکثر جارحیت کے زمرے میں دیکھا جاتا ہے۔ یوں ایک محدود کارروائی بھی سفارتی بحران میں ڈھل سکتی ہے۔ یوں توپ کی آواز سفارتی لغت میں ایک نئے باب کا پیش خیمہ بن گئی۔

یہ سارا قضیہ دراصل اُس معاہدے کی تعبیر سے جڑا ہے جسے دوہہ معاہدہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ دوہہ معاہدہ بنیادی طور پر امریکا اور افغان طالبان کے درمیان طے پایا تھا، مگر اس کے اثرات پورے خطے پر مرتب ہوئے۔ اس عہد نامے میں افغان سر زمین کسی دوسرے ملک کے خلاف استعمال نہ ہونے کی ضمانت شامل تھی۔ افغان پاکستان کا استدلال یہ ہے کہ افغان طالبان نے دوہہ معاہدہ کی روح کی پاسداری نہیں کی، اس شرط کی روح مجروح ہوئی ہے؛ اور افغان سر زمین پاکستان کے خلاف کارروائیوں کیلئے استعمال ہو رہی ہے اور یہ طرز عمل دوہہ معاہدہ کی روح کے منافی ہے۔ دوسری جانب افغان طالبان کا موقف ہے کہ پاکستان اپنی داخلی شورش کو بیرونی رخ دینے کی کوشش کر رہا ہے جس کا بوجھ دوسروں کے کاندھوں پر نہیں ڈالا جاسکتا۔ یوں معاہدے کی تعبیر اختلاف کا مرکز بن گئی ہے۔ اور اب جنگ نے اس اختلاف کو مزید گہرا کر دیا ہے۔

پاکستان کا موقف ہے کہ تحریک طالبان پاکستان کو افغانستان میں محفوظ پناہ گاہیں میسر ہیں۔ کابل کا جواب یہ ہے کہ ٹی ٹی پی پاکستان کا داخلی مسئلہ ہے۔ یہاں مسئلہ الفاظ کا نہیں، تعبیر کا ہے۔ اور تعبیر ہمیشہ اعتماد کی آغوش میں پلتی ہے، بد اعتمادی کے سایے میں نہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ”عہد“ اور ”الزام“ کے درمیان سچائی کی لکیر دھندلا جاتی ہے، اور تاریخ گواہی دیتی ہے کہ جب معاہدے اعتماد کے بغیر ہوں تو وہ کاغذ کے پرزے بن کر ہوا میں اڑ جایا کرتے ہیں۔ یہاں سوال صرف معاہدے کی تشریح کا نہیں، بلکہ اعتماد کی فضا کا ہے۔ جب نیتوں پر شبہ ہو تو الفاظ اپنی معنویت کھودیتے ہیں۔

صدر پاکستان نے خبردار کیا کہ افغانستان میں موجود غیر تسلیم شدہ حکومت دہشتگرد عناصر کو پناہ دے رہی ہے، جو نہ صرف دوہہ معاہدے کی خلاف ورزی ہے بلکہ دنیا کو ایک نئے ”نائن الیون“ کی دہلیز تک لاسکتی ہے۔ یہ اشارہ یقیناً 11 ستمبر حملوں کی طرف تھا۔ وہ سانحہ جس نے عالمی سیاست کا دھاراموڑ دیا تھا۔ صدر نے جس ”نئے نائن الیون“ کا خدشہ ظاہر کیا، وہ محض خطیبانہ انداز نہیں بلکہ سفارتی حکمت عملی اور سفارتی دباؤ کا حربہ بھی ہے۔ عالمی توجہ کو ایک ایسے بحران کی طرف مبذول کرانا جو بظاہر علاقائی مگر درحقیقت بین الاقوامی نوعیت رکھتا ہے۔

ان کا بیان محض داخلی سیاست کا جملہ نہیں، بلکہ عالمی ضمیر کو جھنجھوڑنے کی ایک کاوش ہے کہ جب سرحدیں بے قابو ہو جائیں تو آگ کی چنگاری دور دراز بستیوں کو بھی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ صدر پاکستان نے حالیہ بیان میں عالمی برادری کو متنبہ کیا کہ اگر غیر ریاستی گروہوں کو محفوظ پناہ گاہیں میسر رہیں تو دنیا ایک نئے سانحے کی دہلیز پر آسکتی ہے جس نے عالمی سیاست کو جھنجھوڑ دیا تھا۔ ان کا بیان دراصل عالمی برادری کو متحرک کرنے کی کوشش سمجھا جا رہا ہے۔ 11 ستمبر حملوں کے بعد عالمی سیاست نے دہشتگردی کے خلاف اجتماعی کارروائی کا تصور اپنایا۔ پاکستان اسی عالمی یادداشت کو جگانا چاہتا ہے تاکہ افغانستان کا مسئلہ عالمی ترجیح بن سکے۔ یہ بیان دراصل عالمی برادری کو مخاطب ہے: اگر آج خاموشی اختیار کی گئی تو کل کا نقصان مشترک ہو گا۔ مگر اب سوال یہ ہے کہ جب جنگ چھڑ چکی ہو تو کیا عالمی برادری محض بیانات تک محدود رہے گی یا عملی سفارت کاری کا راستہ اختیار کرے گی؟ افغانستان کی جانب سے باقاعدہ حملوں کی خبریں آرہی ہیں — سرحدی چوکیوں پر ولہ باری، فضائی حدودی خلاف ورزی کے الزامات، و بعض مقامات پر زمینی جھڑپیں — تو صورت حال ایک محدود تنازع سے بڑھ کر کھلی جنگ کے دہانے پر پہنچ چکی ہے۔ جنگ کا آغاز ہمیشہ تیز ہوتا ہے، مگر اس کا اختتام اکثر طویل اور تھکا دینے والا۔

مگر اس بیچ ایک اور پہلو بھی ہے: تجارت کی بندرہاں، معیشت کی رکی ہوئی سانسیں، اور عوامی اضطراب۔ جب سرحدی گزرگاہیں بند ہوتی ہیں تو بارود سے زیادہ نقصان روٹی کو پہنچتا ہے۔ معاشی تنگی سماجی بے چینی کو جنم دیتی ہے، اور یہی بے چینی شدت پسندی کیلئے نرم زمین بن سکتی ہے۔ گزشتہ کئی ماہ سے اس نئی صورت حال میں سب سے بڑا سوال عسکری نہیں بلکہ معاشی اور انسانی ہے۔ سرحدی گزرگاہوں کی مکمل بندش، تجارت کی معطلی، ایندھن اور خوراک کی قلت، بیانات تند — اور پاکستان میں شدت پسندی کے واقعات میں اضافہ ہو تا جا رہا ہے۔ یہ سب جنگ کے وہ پہلو ہیں جو گولی سے زیادہ دیرپا زخم دیتے ہیں۔ پاک۔ افغان تجارت جو کبھی اربوں ڈالر تک پہنچتی رہی، اب تقریباً منجمد ہے۔ سرحدی آبادیوں میں بے چینی بڑھ رہی ہے، اور مہاجرین کے ایک نئے ریلے کا خدشہ سراٹھار رہا ہے۔ یوں عسکری کشیدگی معاشی بحران کو اور معاشی بحران عسکریت کو جنم دیتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ دونوں ممالک کب تک اس کشیدگی کا بوجھ اٹھا سکتے ہیں؟ کیا مکالمے کی کوئی کھڑکی ابھی باقی ہے، یا تاریخ ایک بار پھر ”رجیم چینج“ کے پرانے نسخے کو دہرانے کی طرف بڑھ رہی ہے؟

ادھر پاکستان اپنے آپ کو دہشتگردی کے مقابل ایک حصار قرار دیتا ہے۔ پاکستان کے مطابق خطرہ صرف کوئٹہ یا لاہور تک محدود نہیں بلکہ اس کی پرچھائیں مغربی دارالحکومتوں تک پھیل سکتی ہیں۔ اس موقف کی تقویت اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی اُن رپورٹس سے بھی ہوتی ہے جن میں افغانستان میں شدت پسند تنظیموں کی موجودگی کا ذکر ملتا ہے، جن میں القاعدہ کا نام بھی شامل ہے۔ چین، ایران، تاجکستان اور ازبکستان جیسے ممالک کی تشویش اس امر کی دلیل ہے کہ معاملہ سرحدی کشمکش سے بڑھ کر علاقائی استحکام کا سوال بن چکا ہے۔

پاکستان خود کو ”فرنٹ لائن اسٹیٹ“ قرار دیتا ہے — یعنی وہ دیوار جس پر پہلی ضرب پڑتی ہے۔ ”دیوار“ والا استعارہ دراصل 2001 کے بعد کی پاکستانی حکمت عملی کی توسیع ہے، جب پاکستان نے خود کو دہشتگردی کے خلاف جنگ میں اولین مورچہ قرار دیا تھا۔ یہ بیانیہ عالمی ہمدردی اور معاونت حاصل کرنے کا ذریعہ بھی ہے — کیونکہ جو دیوار گرتی ہے، اس کے بلے تلے سب دب سکتے ہیں۔ یعنی پاکستان دہشتگردی کے خلاف عالمی حصار ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ خطرہ صرف مقامی شہروں تک محدود نہیں بلکہ بین الاقوامی سلامتی سے جڑا ہوا ہے۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی رپورٹ نے افغانستان میں شدت پسند تنظیموں کی موجودگی کی تصدیق کی ہے، جن میں القاعدہ بھی شامل ہے۔ ہمسایہ ممالک — تاجکستان، ایران، ازبکستان اور چین — سب



تشویش میں مبتلا ہیں۔ یہ وہ لمحہ ہے جب علاقائی سلامتی ایک مشترکہ ذمہ داری بن جاتی ہے۔ حال ہی میں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی رپورٹس میں دولت اسلامیہ خراسان اور القاعدہ کی موجودگی کی تصدیق علاقائی ممالک کے خدشات کو تقویت دیتی ہے۔ سلامتی کونسل کی رپورٹ میں اس علاقائی اضطراب کے واضح ذکر نے خطے میں کشیدگی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ چین کو سکینانگ کے تناظر میں، ایران کو سرحدی سلامتی کے حوالے سے، اور تاجکستان کو غیر ملکی جنگجوؤں کی نقل و حرکت پر تشویش ہے۔ یہ مسئلہ اب محض پاک۔ افغان تنازع نہیں رہا، بلکہ وسطی و جنوبی ایشیا کی مشترکہ سلامتی کا سوال بن چکا ہے۔ اس صورت حال پر چین، ایران، تاجکستان اور ازبکستان سمیت متعدد ممالک تشویش کا اظہار کر چکے ہیں۔

عالمی منظر نامے پر بھی اس جنگ کے اثرات نمایاں ہو سکتے ہیں۔ دنیا پہلے ہی یوکرین اور مشرق وسطیٰ کے تنازعات میں الجھی ہوئی ہے اور اب تو خطے میں ایران پر امریکی و اسرائیلی حملوں نے مزید تشویش پیدا کر دی ہے۔ افغانستان عالمی ایجنڈے پر پیچھے چلا گیا ہے لیکن تاریخ گواہ ہے کہ افغانستان کو نظر انداز کرنے کی قیمت ہمیشہ زیادہ چکانی پڑی ہے۔ چاہے وہ سوویت مداخلت ہو یا بعد ازاں امریکی حملہ۔ اب اگر پاک۔ افغان جنگ طول پکڑتی ہے تو یہ خطہ ایک بار پھر عالمی طاقتوں کی توجہ کا مرکز بن سکتا ہے۔

افغانستان عالمی ایجنڈے پر پیچھے چلا گیا ہے۔ لیکن تاریخ گواہ ہے کہ افغانستان کو نظر انداز کرنے کی قیمت ہمیشہ زیادہ چکانی پڑی ہے۔ چاہے وہ سوویت مداخلت ہو یا بعد ازاں امریکی حملہ۔ پاکستان دہشتگردوں اور دنیا کے مابین ایک دیوار ہے۔ لیکن دیواریں اگر مسلسل ضرب سہتی رہیں تو ان میں دراڑیں پڑ ہی جاتی ہیں۔ ہدف صرف کوئٹہ یا لاہور نہیں، بلکہ لندن اور نیویارک تک پھیلا ہوا ہے۔ شدت پسندی سرحدی پٹیوں سے نکل کر شہری مراکز تک پہنچ چکی ہے، جس سے پاکستان کی برداشت کم ہوتی جا رہی ہے۔ ریاستی ادارے اسے وجودی چیلنج کے طور پر دیکھ رہے ہیں۔

شام کے محاذ کے سرد ہونے کے بعد مشرق وسطیٰ کے جنگجو افغانستان کا رخ کر رہے ہیں۔ عالمی سیاست اس وقت دیگر تنازعات میں الجھی ہوئی ہے، جس کے باعث افغانستان عالمی ترجیحات میں پیچھے چلا گیا ہے۔ یعنی دنیا اس وقت روس۔ یوکرین تنازع اور ایران۔ امریکا کشیدگی میں الجھی ہوئی ہے، مگر افغانستان کی خاموش آندھی کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔ تاہم ماہرین کے مطابق اس بحران کو نظر انداز کرنا مستقبل میں بڑے خطرات کو دعوت دے سکتا ہے۔

وزیر دفاع خواجہ محمد آصف کے بیانات سے پہلے ہی یہ تاثر ابھر اٹھا کہ اگر کابل کی موجودہ انتظامیہ عالمی ذمہ داریوں کو پورا نہ کرے تو متبادل امکانات پر غور کیا جاسکتا ہے۔ مگر اب جنگ کے آغاز نے اس بحث کو مزید پیچیدہ بنا دیا ہے۔ تاہم کئی سفارتی حلقے اس حکمت عملی کو پرخطر قرار دیتے ہیں۔ ”رجیم چیلنج“ کا تصور کاغذ پر جتنا آسان دکھائی دیتا ہے، زمینی حقائق میں اتنا ہی پرخطر ثابت ہوتا ہے۔ عراق، لیبیا اور خود افغانستان کی تاریخ اس کی مثال۔ تاہم فوجی کارروائی مسئلے کا حل نہیں؛ بیک چینل ڈپلومیسی ہی کشیدگی کم کر سکتی ہے جس کیلئے ایسے افراد کی ضرورت ہے جو امت مسلمہ کا درد اور ان دونوں

فریقوں کے درمیان قابل احترام اور اثر و نفوذ رکھنے والے سمجھے جاتے ہوں۔

پاک افغان تعلقات کے ماہرین کے مطابق یقیناً افغانستان میں غیر ملکی جنگجو موجود ہیں، مگر فوجی کارروائی مسئلے کا مستقل حل نہیں۔ وہ ”بیک چینل ڈپلومیسی“ کو ناگزیر قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ توپ کی گھن گرج سے زیادہ دیر پا اثر کبھی کبھی خاموش مکالمہ ڈال جاتا ہے۔ لیکن یہاں بھارت کے مکارانہ سازشی زاویہ اور علاقائی خطر خنچ کو سمجھنا بھی اہم ہے کہ اب یہ شواہد کے ساتھ بات ثابت ہو چکی ہے کہ بھارت افغان سر زمین سے پاکستان مخالف عناصر کی مدد کرتا ہے، جس کی بھارت تردید تو کرتا ہے لیکن پاکستان کی طرف سے دیئے گئے ٹھوس شواہد کے خلاف کوئی ثبوت پیش کرنے میں ناکام ہے۔ بھارت کی یہ مکارانہ سازش خطے کو ”پراکسی سیاست“ کی طرف دھکیل رہی ہے، جہاں براہ راست جنگ کی بجائے بالواسطہ محاذ آرائی کے امکانات بڑھ رہے ہیں جو دو ایٹمی قوتوں کے رد عمل میں ساری دنیا کیلئے خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔

پاکستان کی برداشت اب آخری حدوں کو چھو رہی ہے، کیونکہ شدت پسندی سرحدی علاقوں سے نکل کر دارالحکومت تک پہنچ چکی ہے۔ پاکستان استحکام چاہتا ہے اور اس سلسلے میں چین کی جانب دیکھ رہا ہے۔ گویا مشرق کی سفارت کاری سے مغرب کی بے چینی کا تدارک چاہتا ہو جبکہ دوسری طرف افغان ترجمان ذبیح اللہ مجاہد نے داعش قیدیوں اور شدت پسند قیدیوں کی حوالگی کا مطالبہ کیا، جسے پاکستان نے مسترد کر دیا۔ اس معاملے نے دونوں ملکوں کے مابین اعتماد کی فضا اور سفارتی تناؤ کو مزید متاثر کیا ہے۔

پاکستان کا موقف ہے کہ ایسا کوئی معاہدہ موجود نہیں۔ قیدیوں کا تبادلہ بین الاقوامی قانون اور دوطرفہ معاہدات کا تقاضا کرتا ہے، محض بیانات کا نہیں۔ فی الوقت سفارتی اور تجارتی تعلقات منجمد ہیں۔ پاکستان کا موقف ہے کہ مذاکرات میں ثبوت پیش کیے گئے، مگر قابل مسئلے کے وجود ہی کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں۔ اور جب مرض کا اقرار نہ ہو تو علاج کی راہ کیسے نکلے؟ یاد رہے کہ سفارتی و تجارتی روابط کی معطلی نے عوامی سطح پر بھی منفی اثرات مرتب کیے ہیں۔ طویل جمود دونوں معاشروں میں بد اعتمادی کو گہرا کر سکتا ہے۔ سفارتی ذرائع کے مطابق عسکری راستہ دیر پا استحکام فراہم نہیں کرتا۔ ان کے مطابق پس پردہ مذاکرات اور علاقائی تعاون ہی کشیدگی کم کرنے کا مؤثر ذریعہ ہو سکتے ہیں۔ بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا دونوں ریاستیں طاقت کے استعمال سے آگے بڑھ کر اعتماد سازی اور مکالمے کی راہ اختیار کر سکتی ہیں؟ تاریخ کا سبق یہی ہے کہ پائیدار امن توپ کے دہانے سے نہیں بلکہ تدبیر، صبر اور سیاسی بصیرت سے جنم لیتا ہے۔

اسی تناظر میں ”حکومت کی تبدیلی“ کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے۔ وزیر دفاع کے بیان اور دیگر سرکاری موقف سے یہ تاثر ضرور ابھرا کہ پاکستان افغانستان میں حکومت کی تبدیلی چاہتا ہے اور اس تاثر کو تقویت ملی کہ اگر کابل میں موجود انتظامیہ عالمی ذمہ داریوں کو پورا نہ کرے تو متبادل راستے تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ مگر مبصرین خبردار کرتے ہیں کہ رجم چینج کا نسخہ اکثر زخم کو گہرا کر دیتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ طالبان کے اندر کسی معتدل دھڑے کی تقویت زیادہ قابل عمل راستہ ہو۔ تاکہ تبدیلی اندر سے آئے، باہر سے مسلط نہ کی جائے۔

تاہم سفارتی حلقوں سے وابستہ شخصیات کا خیال ہے کہ عسکری راستہ مزید انتشار کو جنم دے سکتا ہے، اس لیے پس پردہ مذاکرات اور علاقائی ہم آہنگی کو فوجیت دی جانی چاہیے۔ تاہم چند ممکنہ راستے یہ ہو سکتے ہیں کہ بیک چینل مذاکرات کی بحالی، مشترکہ سرحدی نگرانی کا نظام، علاقائی کانفرنس جس میں چین، ایران اور وسطی ایشیائی ریاستیں شامل ہوں، طالبان کے اندر معتدل عناصر کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ یہ راستے مشکل ضرور ہیں، مگر بند گلی سے

بہتر ہیں۔

پاکستان کا دعویٰ ہے کہ بھارت اسرائیل سمیت ایک اور ملک بھی افغان سر زمین سے پاکستان مخالف عناصر کی پشت پناہی کر رہے ہیں، اگرچہ متعلقہ ممالک ان الزامات کی تردید کرتے ہیں۔ یہ پہلو علاقائی سیاست کو مزید پیچیدہ بناتا ہے۔ وسطی ایشیائی ریاستیں بھی افغانستان میں غیر ملکی جنگجوؤں کی موجودگی پر تشویش رکھتی ہیں۔ اس لیے ایک مشترکہ علاقائی حکمت عملی اور ہم آہنگی کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی ہے۔ بعض تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ بیرونی دباؤ کے بجائے افغان قیادت کے اندر معتدل عناصر کی تقویت زیادہ موثر ہو سکتی ہے، تاکہ تبدیلی داخلی سطح پر ابھرے نہ کہ مسلط کی جائے۔ جبکہ پاکستانی حکام کے مطابق شدت پسندی کے خلاف جدوجہد ناگزیر ہے اور اس میں پسپائی ممکن نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ قومی سلامتی اور شہریوں کا تحفظ ہر قیمت پر یقینی بنایا جائے گا۔

پاکستان کا کہنا ہے کہ وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ افغانستان ایک ذمہ دار ریاست کے طور پر اپنے وعدے پورے کرے۔ عسکری کارروائی عوامی غم و غصہ بڑھا سکتی ہے اور بھارت، اسرائیل اور دیگر دشمن قوتیں ان جذبات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ لہذا ضروری ہے کہ بیک چینل رابطے بحال ہوں، تاکہ بد اعتمادی کی برف پگھل سکے۔

اس جنگی مرحلے کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ کیا دونوں ممالک مکمل جنگ کی طرف مزید بڑھیں گے یا محدود تصادم کے بعد سفارتی راستہ تلاش کریں گے؟ جنگ کے ابتدائی بیانات ہمیشہ جذباتی ہوتے ہیں، مگر ریاستیں بالآخر اپنے مفادات کی بنیاد پر فیصلے کرتی ہیں۔ اگر جنگ طویل ہوئی تو دونوں ممالک کی معیشت، داخلی استحکام اور علاقائی تعلقات شدید دباؤ میں آجائیں گے۔ کچھ سفارتی ذرائع کے مطابق پس پردہ رابطے اب بھی منقطع نہیں ہوئے۔ چین اور بعض علاقائی ممالک ممکنہ ثالثی کیلئے سرگرم ہو سکتے ہیں۔ اگر ایسا ہوا تو یہ بحر ان ایک بڑے تصادم میں بدلنے سے قبل روکا جاسکتا ہے لیکن اگر عسکری کارروائیاں بڑھتی گئیں، تو خدشہ ہے کہ غیر ریاستی عناصر اس افراط فوری سے فائدہ اٹھا کر مزید محاذ کھول دیں گے۔

پاکستان کا موقف ہے کہ قومی سلامتی اور شہریوں کا تحفظ ہر قیمت پر یقینی بنایا جائے گا۔ افغانستان کا موقف ہے کہ خود مختاری پر سمجھوتہ نہیں کیا جائے گا۔ دونوں بیانیے بظاہر اپنی جگہ مضبوط ہیں۔ مگر جنگ ہمیشہ بیانیوں سے زیادہ زمینی حقیقتوں سے طے ہوتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ کئی برسوں سے پاکستان نے افغان طالبان کو ان کی سر زمین سے پاکستان میں ہونے والی دہشتگردی کے باقاعدہ مضبوط شواہد کے ساتھ ان کاروائیوں کو روکنے کیلئے لاکھ جتن کئے ہیں لیکن افغان رجیم اس معاملہ پر سنجیدگی سے عمل کرنے کی بجائے اس وقت بھارت اور اسرائیل کے ہاتھوں کٹھ پتلی کا کردار ادا کر رہی ہے۔ آج اس بحر ان کا سب سے نازک پہلو یہ ہے کہ دونوں ریاستیں داخلی دباؤ کا شکار ہیں۔ عوامی جذبات بھڑکے ہوئے ہیں، میڈیا کا بیانیہ سخت ہے، اور سوشل میڈیا پر قومی غیرت کے نعرے گونج رہے ہیں۔ ایسے ماحول میں پسپائی یا مصالحت کا فیصلہ سیاسی طور پر مشکل ہو جاتا ہے۔ مگر تاریخ گواہ ہے کہ دانشمند قیادت وہی ہوتی ہے جو جذبات کے طوفان میں بھی تدبیر کی کشتی کو ڈوبنے نہ دے۔ پاکستان اور افغانستان کا رشتہ محض سیاسی معاہدوں کا نہیں، بلکہ صدیوں کی تہذیبی ہم آہنگی کا امین ہے۔ جنگ اس رشتے کو وقتی طور پر پانسہ بدل سکتی ہے، مگر اسے مکمل طور پر منقطع نہیں کر سکتی۔ سوال یہ ہے کہ کیا دونوں ممالک اس آگ کو محدود رکھ سکیں گے، یا یہ شعلے پورے خطے کو اپنی لپیٹ میں لے لیں گے؟

پاکستان اور افغانستان کا رشتہ محض سیاسی معاہدوں سے نہیں، بلکہ صدیوں کی تہذیبی ہم آہنگی سے جڑا ہے۔ پاکستان اور افغانستان کا تعلق محض دو ہمسایہ ریاستوں کا بھی نہیں، بلکہ تاریخ، تہذیب اور مذہب کے رشتوں کا آئینہ دار ہے۔ مگر جب اعتماد کی ڈور کمزور ہو جائے، جب سیاست حکمت سے عاری ہو جائے تو رشتہ بھی بوجھ بن جاتا ہے اور ہمسائیگی بھی اجنبیت کا روپ دھار لیتی ہے۔

سوال اب بھی قائم ہے کیا مسئلے کا حل بارود میں ہے یا بصیرت میں؟ کیا رجم چیخ استحکام لا سکتا ہے یا انتشار کو دعوت دے گا؟ اور ہاں اصل سوال یہ نہیں کہ توپ چلائی جائے یا نہیں، اصل سوال یہ ہے کہ کیا دونوں ریاستیں اپنے داخلی بیانیوں سے اوپر اٹھ کر مشترکہ مستقبل کی تعمیر کر سکتی ہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو تاریخ ایک نئے باب کی منتظر ہے؛ اور اگر نفی میں، تو اندیشہ ہے کہ یہ کشیدگی محض سرحدی تنازع نہ رہے بلکہ پورے خطے کے امن کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔

یاد رکھیں کہ تاریخ کی عدالت میں وہی قومیں سرخرو ہوتی ہیں جو طاقت کے ساتھ حکمت، اور عزم کے ساتھ اعتدال کو جمع کر لیں۔ اگر مکالمہ بحال ہو جائے تو شاید سرحدوں کی گھن گرج پھر سے بازاروں کی رونق میں ڈھل سکے۔ اور اگر نہیں، تو اندیشہ ہے کہ یہ آگ صرف دو ملکوں تک محدود نہ رہے گی، بلکہ اس کے شعلے دور افق تک لپکیں گے۔

ان تمام پہلوؤں کے بیچ ایک بنیادی سوال ابھرتا ہے: کیا طاقت کے استعمال سے پائیدار امن ممکن ہے؟ تاریخ کا سبق یہ ہے کہ بددعوت راستہ کھول سکتی ہے، منزل نہیں دکھا سکتی۔ اگر کا بل اپنی سرزمین کو مسلح گروہوں سے پاک کرنے کی سنجیدہ کاوش کرے اور اسلام آباد سفارتی مکالمے کی ڈور تھامے رکھے تو شاید برف پگھلنے کا امکان پیدا ہو۔ بصورت دیگر بد اعتمادی کا یہ کوہ گراں پورے خطے پر سایہ فلکں رہے گا۔

پاکستان اور افغانستان کا تعلق محض ہمسائیگی نہیں بلکہ تہذیبی اشتراک کا آئینہ دار ہے۔ پاکستان اور افغانستان کا رشتہ صدیوں کی تہذیبی ہم آہنگی سے بندھا ہے۔ یہ وہ ہمسائیگی ہے جسے دشمنی کے سانچے میں ڈھالنا آسان، مگر امن کے قالب میں ڈھالنا دشوار ہے۔ اگر باہمی ذمہ داریوں کا احساس غالب آجائے تو کشیدگی کی یہ دھند چھٹ سکتی ہے؛ بصورت دیگر یہ بحران نہ صرف دو ملکوں بلکہ پورے خطے کے امن کو اپنی گرفت میں لے سکتا ہے۔ آج فیصلہ صرف دو ریاستوں کا نہیں، آنے والی نسلوں کے مستقبل کا ہے یا تو خطہ باہمی بصیرت سے استحکام کی راہ چنے، یا پھر تاریخ ایک اور بے سکونی کا باب رقم کرے۔

تاریخ ہمیں بار بار یہ سبق دیتی ہے کہ طاقت کے بل پر کھڑی کی گئی عمارتیں دیر پا نہیں ہوتیں؛ پائیدار بنیادیں ہمیشہ اعتماد، انصاف اور باہمی احترام سے استوار ہوتی ہیں۔ پاکستان اور افغانستان کا رشتہ محض سیاسی مصلحتوں کا اسیر نہیں، بلکہ صدیوں کی تہذیبی ہم آہنگی، مشترکہ اقدار اور انسانی روابط کا امین ہے۔ اگر یہ رشتہ کمزور پڑتا ہے تو دراصل پورا خطہ عدم استحکام کے بھنور میں اتر جاتا ہے۔

تاریخ کی عدالت میں وہی قومیں سرخرو ہوتی ہیں جو طاقت کے ساتھ حکمت، اور عزم کے ساتھ اعتدال کو جمع کر لیں۔ اگر موجودہ جنگ کو بروقت سفارتی تدبیر سے روکا گیا تو یہ بحران ایک آزمائش کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔ اگر نہیں، تو اندیشہ ہے کہ یہ تصادم محض سرحدی تنازع نہ رہے بلکہ جنوبی و وسطی ایشیا کے امن و استحکام کو طویل عرصے کیلئے متاثر کر دے۔ انتخاب اب بھی ممکن ہے۔ یا تو تصادم کی راہ کو وسعت دی جائے، یا تدبیر کی شاہراہ تلاش کی

جائے۔ جنگ کا آغاز ہو چکا ہے، مگر اس کا اختتام ابھی تاریخ نے نہیں لکھا۔ یہ فیصلہ آج کی قیادتوں کے ہاتھ میں ہے کہ وہ آنے والی نسلوں کو ایک اور محاذ دے کر جائیں یا ایک مشکل مگر پائیدار امن کی بنیاد رکھیں۔

آج ضرورت اس امر کی ہے کہ جذبات کی تپش کو تدبیر کی ٹھنڈک سے متوازن کیا جائے؛ عسکری دباؤ کو سفارتی بصیرت کے ساتھ ہم آہنگ کیا جائے؛ اور الزام کے شور میں مکالمے کی آواز کو دبے نہ دیا جائے۔ اگر قیادتیں اپنے اپنے بیانیوں سے بلند ہو کر مستقبل کی نسلوں کے حق میں فیصلہ کریں تو یہ بحران بھی تاریخ کے اوراق میں ایک آزمائش کے طور پر درج ہو گا۔ نہ کہ ایک مستقل زخم کے طور پر۔ ورنہ اندیشہ یہی ہے کہ سرحدوں پر اٹھنے والی چنگاریاں کسی ایک دیس تک محدود نہ رہیں، اور وہ آگ جسے بروقت حکمت سے بجھایا جاسکتا تھا، آنے والے کل کے افق کو سرخ کر دے۔ انتخاب آج بھی ممکن ہے—یا تو تصادم کی راہ، یا تدبیر کی شاہراہ۔ تاریخ گواہ رہے گی کہ ہم نے کون سا راستہ چنا۔

منگل 13 رمضان المبارک 1447ھ 3 مارچ 2026ء

طاقت، تدبیر اور تقدیر

تاریخ کے بعض موڑ ایسے ہوتے ہیں جب زمانہ اپنے قدم روک کر سانس لیتا ہے، اور اقوام کی تقدیر چند فیصلوں کے پلڑے میں رکھ دی جاتی ہے۔ آج مشرق وسطیٰ ایک ایسے ہی دہانے پر کھڑا ہے۔ جہاں طاقت کی زبان، نظریے کی آگ، معیشت کی نبض اور سفارت کی سانس ایک دوسرے میں الجھ کر ایک پیچیدہ گرہ بنا چکی ہیں۔ آیت اللہ علی خامنہ ای کے انتہائی بیانات، ٹرمپ کے جارحانہ عزائم، سینٹا گون کی عسکری منصوبہ بندی، اور آبنائے ہرمز و آبنائے مندب جیسے آبی راستوں کی حساسیت — یہ سب مل کر ایک ایسا منظر نامہ ترتیب دے رہے ہیں جس میں صرف گولیاں نہیں چل رہیں، بلکہ عالمی سیاست کی بساط بھی از سر نو بچھائی جا رہی ہے۔

یہ محض ایران اور امریکا یا اسرائیل کا تصادم نہیں؛ یہ نظریاتی اصرار اور عالمی مفادات کی کشمکش ہے۔ ایک طرف انقلاب کا تسلسل ہے، دوسری جانب عالمی برتری کا دعویٰ۔ ایک طرف مزاحمت کا بیانیہ ہے، دوسری طرف "نظام کی تبدیلی" کا اعلان۔ سوال یہ نہیں کہ کس کے پاس زیادہ اسلحہ ہے؛ سوال یہ ہے کہ کس کے پاس زیادہ صبر، زیادہ تدبیر اور زیادہ دوراندیشی ہے۔

اس بحران کی تہہ میں صرف عسکری حکمت عملی نہیں بلکہ داخلی سیاست، عالمی توانائی منڈی، خلیجی ریاستوں کی بے چینی، اور عالمی طاقتوں کی صف بندی بھی شامل ہے۔ اگر آبنائے ہرمز کی موجوں میں اضطراب پیدا ہوتا ہے تو اس کی بازگشت ٹوکیو، بیجنگ، برلن اور نئی دہلی تک سنائی دے گی۔ اگر باب المندب کا دروازہ لرزتا ہے تو یورپ کی منڈیاں بھی کانپ اٹھیں گی۔

یہ مضمون انہی تمام پہلوؤں کو یکجا کر کے پیش کرتا ہے۔ ایسے انداز میں کہ قاری نہ صرف واقعات کی ترتیب سمجھے بلکہ ان کے باطن میں پوشیدہ معنی بھی دریافت کرے۔ یہاں الفاظ محض خبر نہیں سناتے، بلکہ زمانے کی دھڑکن سناتے ہیں؛ یہاں تجزیہ صرف اعداد و شمار نہیں گناتا، بلکہ تاریخ کے آئینے میں حال کا عکس دکھاتا ہے۔ آئیے، اس داستان کو سرسری نگاہ سے نہیں بلکہ غور و فکر کی آنکھ سے پڑھیں — کیونکہ جو کچھ آج رقم ہو رہا ہے، وہ کل کی تاریخ کا عنوان بن سکتا ہے۔

آیت اللہ علی خامنہ ای کی ہفتوں پیشتر جس لہجے میں تنبیہ محض عسکری بیان نہ تھی بلکہ ایک نظریاتی اعلان جو محض سیاسی بیان نہ تھا بلکہ تاریخ کے اوراق پر ثبت ایک پیشگوئی تھی۔ انقلاب ایران کے بعد سے ایرانی قیادت یہ موقف اپنائے ہوئے ہے کہ وہ خود کو محض ایک قومی ریاست نہیں بلکہ ایک انقلابی مرکز سمجھتی ہے۔ آیت اللہ علی خامنہ ای نے جس لہجے میں بیٹنگی خبردار کیا تھا، اس میں محض سیاسی عتاب نہ تھا بلکہ ایک اسٹریٹجک اعلان مضمر تھا۔ انقلاب ایران کی سینتالیسویں سالگرہ پر ان کا یہ اعلان کہ "اگر امریکا نے جنگ شروع کی تو یہ پورے خطے تک پھیل جائے گی" گویا آتش زیر خاکستر پر پھونک تھا۔

چنانچہ جب خامنہ ای نے کہا کہ جنگ پورے خطے تک پھیلے گی تو اس کا مفہوم یہ تھا کہ ایران اپنی جغرافیائی حدود سے باہر بھی اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ خواہ وہ سیاسی نیٹ ورکس ہوں یا مسلح گروہ۔ ایران خود کو محصور نہیں ہونے دے گا۔ یہ اعلان دراصل "جوابی پھیلاؤ" کی حکمت کا اشارہ یہ تھا — یعنی حملہ اگر مرکز پر ہو گا تو ارتعاش محیط تک جائے گا۔ آج جب امریکی و اسرائیلی حملوں کے جواب میں تہران نے اپنے وعدوں کو عملی جامہ

پہنایا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ الفاظ نے بارود کی صورت اختیار کر لی ہے، اور وعید، واقعہ بن چکی ہے۔ ایرانی قیادت نے داخلی سطح پر اس بیانیے کو مزاحمتی وقار کے ساتھ جوڑا، تاکہ قوم کو یہ احساس رہے کہ وہ دفاعی نہیں بلکہ فعال پوزیشن میں ہے۔

ایران کے میزائل جب سعودی عرب، کویت، بحرین، قطر اور متحدہ عرب امارات کی فضا میں گونجے تو یہ محض ردِ عمل نہ تھا بلکہ ایک جغرافیائی پیغام تھا۔ یونائیٹڈ اسٹیٹس ڈیپارٹمنٹ آف ڈیفنس کے مطابق مشرق وسطیٰ میں تقریباً چالیس ہزار امریکی اہلکار تعینات ہیں۔ قطر میں العدید ایئر بیس کمانڈ و کنٹرول کامرکز جو امریکا کیلئے فضائی آپریشنز کا مرکزی اعصابی مرکز ہے، بحرین میں پانچویں بحری بیڑے کی موجودگی، کویت میں بری اور بحری تنصیبات، اور اردن میں ٹاور 22 جیسی چوکیوں کا جال، سعودی عرب میں دفاعی اڈے، ایک ایسا حصار بناتے ہیں جو ایران کو چاروں طرف سے گھیرتا محسوس ہوتا ہے۔ ایران کی نظر میں یہ محض دفاعی انتظام نہیں بلکہ اس کے خلاف ایک مستقل عسکری دباؤ اور ایک وسیع عسکری جال کی مانند پھیلے ہوئے ہیں۔

یونائیٹڈ اسٹیٹس ڈیپارٹمنٹ آف ڈیفنس کی اطلاعات کے مطابق یہ موجودگی محض علامتی نہیں بلکہ فیصلہ کن ہے۔ کویت، سعودی عرب، بحرین، عراق، شام اور مصر میں امریکی اڈے اس امر کا ثبوت ہیں کہ خطہ ایک عسکری شطرنج بن چکا ہے جہاں ہر مہرہ کسی بڑے داؤ کا حصہ ہے جو ایران کیلئے ایک مسلسل نگرانی اور فوری ردِ عمل کا امکان پیدا کرتا ہے۔ اس بندوبست کو تہران "گھیراؤ کی سیاست" کے طور پر دیکھتا ہے۔

یہ سوال کہ ایران خلیجی ممالک کو کیوں نشانہ بنا رہا ہے، دراصل اس بڑے سوال کا جزو ہے کہ جنگ کی حد بندی کون کرے گا؟ ایران شاید یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ اگر اس کے خلاف محاذ کھولا گیا تو اس کی تپش صرف تہران تک محدود نہ رہے گی۔ ایران کی کارروائیوں کو "توازنِ خوف" کی حکمتِ عملی کے تحت سمجھا جاسکتا ہے۔ تہران یہ باور کرنا چاہتا ہے کہ اگر اس کے خلاف حملہ ہو تو اس کی قیمت پورا خطہ ادا کرے گا۔ یہ وہی منطق ہے جو سرد جنگ کے دور میں "ڈیٹرنس" کہلاتی تھی۔ دوسرے فریق کو نقصان کے خوف سے روکنا۔

گویا ایران وہی کر رہا ہے جس کا اعلان کیا تھا۔ "اگر ہمیں گھیراؤ میں لیا گیا تو حصار کی دیواریں بھی محفوظ نہ رہیں گی۔ ایران کی جانب سے خلیجی ریاستوں میں موجود امریکی تنصیبات کی سمت کارروائی دراصل براہِ راست امریکا کو نہیں بلکہ "میزبانوں" کو مخاطب کرنے کا انداز ہے۔ مقصد یہ باور کرانا کہ عسکری شراکت داری کی قیمت مقامی سلامتی سے ادا ہو سکتی ہے۔ یہ ایک طرح کی "بالواسطہ بازگشت" ہے۔ ریاض، ابو ظہبی، قطر، اردن اور دوحہ پر دباؤ دراصل واشنگٹن کو پیغام دیا گیا ہے۔

سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، کویت، بحرین اور قطر۔ ان سب کیلئے معیشت اولین ترجیح ہے۔ ان کی توانائی تنصیبات، بندرگاہیں اور شہری ڈھانچے کسی بھی طویل کشیدگی کے متحمل نہیں۔ خلیجی ممالک کیلئے یہ صورتِ حال دودھاری تلوار ہے۔ ایک طرف وہ امریکی دفاعی چھتری کے محتاج ہیں، دوسری طرف وہ ایران کے ساتھ کھلی جنگ نہیں چاہتے، اگر حملے امریکی اہداف تک محدود رہیں اور تیل کی تنصیبات محفوظ رہیں تو غالب امکان ہے کہ وہ براہِ راست تصادم سے گریز کریں گی۔ اسی لیے بظاہر مذمتی بیانات کے باوجود عملی سطح پر ان کی کوشش یہی ہوگی کہ تصادم کی لکیر ان کے شہروں سے دور رہے جبکہ پس پردہ دفاعی تیاریوں میں اضافہ اور پس پردہ کشیدگی کم کرنے کی سفارتی کوششوں میں مصروف رہ سکتے ہیں۔ یہی متوقع راستہ ہے۔ سیاست میں بعض اوقات خاموشی بھی حکمت ہوتی ہے، اور احتیاط بھی ایک اعلان ہوتا ہے۔

ایران کی کارروائیوں کا فوری اثر عالمی منڈی پر پڑتا ہے۔ اگر رسد میں معمولی خلل بھی آئے تو قیمتوں میں تیزی آسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایرانی اقدام کا پہلا ارتعاش عالمی منڈی میں تیل کی قیمتوں کے اضافے کی صورت نمودار ہوا ہے۔ عراق میں شیعہ مسلح گروہوں کی ممکنہ سرگرمیاں امریکی تنصیبات کیلئے اضافی خطرہ اور اسرائیلی اہداف کیلئے نئی آزمائش بن سکتی ہیں جس سے سرمایہ کاروں کا اعتماد مزید متزلزل ہو گا۔ گویا جنگ کا دائرہ محض سرحدوں تک محدود نہیں بلکہ معیشت کی نبض تک پھیل چکا ہے۔

عالمی توانائی منڈی میں شدید اضطراب کی لہریں دکھائی دے رہی ہیں۔ تیل اور گیس کی رسد میں معمولی خدشہ بھی قیمتوں کو اوپر لے جاتا ہے۔ ایشیا کی صنعتی معیشتیں — خصوصاً چین، جاپان اور جنوبی کوریا — خلیجی رسد پر انحصار کرتی ہیں۔ یورپ، جو پہلے ہی توانائی کے بحرانوں سے گزر چکا ہے، مزید عدم استحکام کا متحمل نہیں ہو سکتا چنانچہ یہ تنازع محض علاقائی نہیں بلکہ بین البراعظمی اثرات رکھتا ہے۔

دراصل ایران نے بیننگی اعلانات کے مطابق مرحلہ وار ردِ عمل اپنایا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تہران نے اپنے بیانیے کو عمل سے جوڑنے کی کوشش کی تاکہ ساکھ برقرار رہے۔ اس حکمتِ عملی سے خلیجی ممالک کے ساتھ تعلقات متاثر ہوں گے، تاہم ایران پہلے ہی خبردار کر چکا تھا کہ اگر وہ امریکی قیادت کو حملوں سے نہ روک سکے تو نتائج کیلئے تیار رہیں۔ بعض تجزیہ کاروں کے نزدیک یہ دباؤ کی سیاست اور ردِ عمل خلیجی ممالک پر سیاسی دباؤ ڈالنے کی کوشش بھی ہو سکتا ہے۔ تاکہ خطے کے ممالک خود جنگ بندی کی وکالت اور واشنگٹن کو جنگ کے خاتمے پر آمادہ کریں۔

دراصل ایران اس تنازع کو صرف امریکا و اسرائیل تک محدود نہیں رکھنا چاہتا بلکہ اس تنازع کو وسیع تر بنانا چاہتا ہے۔ تاکہ جنگ کی قیمت سب ادا کریں، اور جنگ کے خاتمے کی آوازیں خود انہی دارالحکومتوں سے بلند ہوں جو آج محتاط خاموشی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اس حکمتِ عملی کا مقصد یہ ہو سکتا ہے کہ خلیجی دارالحکومت خود امریکا پر دباؤ ڈالیں کہ وہ مہم جوئی ترک کرے۔ ایران کی حکمتِ عملی میں "دائرہ وسیع کرنے" کا عنصر موجود ہے، تاکہ کسی ایک فریق پر انحصار نہ رہے۔ اگر سب متاثر ہوں گے تو سب متحرک بھی ہوں گے۔ یہی اس سوچ کی بنیاد ہے۔

ایرانی حملوں سے اگرچہ خلیجی انفراسٹرکچر کو محدود نقصان پہنچا، تاہم یہ تاثر ابھرا کہ ایران شدید دباؤ میں ہے۔ جب کوئی ریاست یہ محسوس کرے کہ کھونے کو کچھ نہیں رہا تو اس کے اقدامات زیادہ جرات مند بلکہ بعض اوقات مایوس کن ہو سکتے ہیں۔ متحدہ عرب امارات میں رہائشی عمارتوں کو نقصان اور کویت ایئرپورٹ پر حملے نے یہ تاثر پیدا کیا کہ ایران ایک نازک موڑ پر ہے۔ تاہم خلیجی ممالک غالباً براہِ راست جواب دینے کے بجائے دفاعی تیاریوں کو ترجیح دیں گے۔ جنگ کے ہنگام میں بعض اوقات صبر بھی سب سے بڑا ہتھیار ہوتا ہے۔

ایران کی داخلی کیفیت کا یہ عالم ہے کہ ایرانی معاشرہ معاشی پابندیوں، مہنگائی اور سماجی بے چینی سے دوچار ہے۔ بیرونی تصادم بعض اوقات داخلی وحدت پیدا کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ تاہم اگر نقصانات بڑھیں تو یہی حربہ الٹا بھی پڑ سکتا ہے۔ اس لیے تہران کیلئے توازن برقرار رکھنا نہایت اہم ہے۔

ٹرمپ نے واضح کیا کہ ایران میں حکومت کی تبدیلی ان کا ہدف ہے۔ ٹرمپ کا حکومت کی تبدیلی کا اعلان دراصل ایران کے سیاسی ڈھانچے کو چیلنج کرنے کی کوشش ہے۔ حکومت کی تبدیلی کی بات دراصل ایک نفسیاتی دباؤ بھی ہے اور سیاسی عزم کا اظہار بھی۔ ان کا یہ بیان کہ ایرانی عوام سڑکوں پر نکلیں، ایک داخلی بغاوت کی تمنا کا عکاس ہے۔ مگر تاریخ گواہ ہے کہ بیرونی دباؤ سے پیدا ہونے والی تبدیلی جہاں اکثر طویل افرا تفری کا پیش خیمہ

اور ناپائیدار ہوتی ہے وہاں غیر متوقع نتائج لاتی ہے۔ عراق اور لیبیا کی مثالیں سامنے ہیں۔ ایران جیسے مضبوط ریاستی ڈھانچے میں فوری انہدام کا امکان کم، مگر طویل بے یقینی کا امکان زیادہ ہے۔

امریکی ٹھنک ٹینک سٹیمسن سنٹر کی ریسرچ سکالر باربر اسلاون نے خبردار کیا تھا کہ سینئر ایرانی عہدیداران حتیٰ کہ رہبر اعلیٰ بھی نشانہ بن سکتے ہیں، اگر سینئر قیادت کو نشانہ بنایا گیا تو اس کے بعد یا تو مزید سخت گیر قیادت ابھرے گی یا طویل بد امنی جنم لے گی۔ ریاستی ادارے — فوج، پاسداران انقلاب، عدلیہ — ایک مضبوط نیٹ ورک کی صورت موجود ہیں، جو اچانک خلا کو پُر کر سکتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قیادت کی تبدیلی ہمیشہ نظام کی تبدیلی نہیں لاتی۔

امکان ہے کہ امریکا اور اسرائیل ایران کی میزائل و جوہری صلاحیتوں کو محدود اور کمزور کرنے پر توجہ مرکوز رکھیں گے و سنج پیمانے پر عسکری اور سولہین قیادت کو نشانہ بنانا، فوری سیاسی خلا پیدا کرنا اور اندرونی احتجاج کو ہوا دینا، ایک تدریجی حکمت ہو سکتی ہے — مگر یہ راستہ باریک بھی ہے اور پُر خطر بھی۔ پینٹاگون کی منصوبہ بندی بظاہر ایران کی میزائل، ڈرون اور جوہری تنصیبات کی صلاحیت گھٹانے پر مرکوز ہے۔ یہ "صلاحیت کم کرو" کی حکمت ہے، نہ کہ لازماً "نظام بدل دو" کی۔ تاہم دونوں کے بیچ لکیر باریک ہے۔



خلیجی قیادتیں سمجھتی ہیں کہ یہ جنگ ان کے دروازے تک آپہنچی ہے، جبکہ ان کی ترجیح اقتصادی استحکام اور علاقائی ترقی تھی۔ ان کیلئے یہ بحران ایک غیر مطلوب بوجھ ہے۔ خلیجی ریاستیں اگرچہ امریکی سیوریٹی فریم ورک کا حصہ ہیں، مگر وہ یہ بھی سمجھتی ہیں کہ کشیدگی کی قیمت انہیں ادا کرنی پڑتی ہے۔ مشرق وسطیٰ کے ممالک اس جنگ سے ہی نہیں بلکہ ٹرمپ انتظامیہ کی حکمت عملی سے بھی مایوس دکھائی دیتے ہیں۔ تعلقات میں فوری بہتری کی امید کمزور پڑ چکی ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ واشنگٹن کے ہر اقدام کے ہم نوا ہوں گے۔ اسی لیے وہ ایک طرفہ وابستگی کے بجائے متوازن خارجہ پالیسی اپنانے کی کوشش کرتی ہیں — چین اور روس کے ساتھ روابط اسی تناظر میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

حالیہ حملوں نے مذاکرات کی بساط لپیٹ دی ہے۔ سفارت کاری کی شمع مدھم ہو چکی ہے اور خطہ نئی آگ کی لپیٹ میں آتا محسوس ہوتا ہے۔ حملوں کے بعد مذاکراتی عمل قفل کا شکار ہو گیا ہے۔ مذاکراتی راستے وقتی طور پر مسدود ضرور ہوئے ہیں، مگر عمان، قطر اور بعض یورپی ممالک پس پردہ رابطوں میں کردار ادا کر سکتے ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ شدید تصادم کے بعد ہی کبھی کبھی مفاہمت کی کھڑکی کھلتی ہے۔ یاد رہے کہ جب توپیں بولتی ہیں تو سفارت کار خاموش ہو جاتے ہیں — یہ تاریخ کا المیہ ہے۔

ایران میں تبدیلی کی خواہش ایک ایسا جوا ہے جو نہ صرف خود امریکی سیاست میں طوفان اٹھا سکتا ہے بلکہ خود امریکی سیاست میں اختلافات کو ہوا دے سکتا ہے۔ امریکا میں عوامی رائے بیرونی جنگوں کے حوالے سے منقسم ہے۔ اگر جنگ طویل ہوئی، نتائج توقع کے مطابق نہ نکلے تو صدر کی ساکھ مجروح اور

انتخابی سیاست پر اثرات پڑ سکتے ہیں جس سے عوامی حمایت میں کمی آسکتی ہے۔ معاشی دباؤ، بجٹ خسارہ اور افراط زر جیسے مسائل رائے دہندگان کے فیصلوں پر اثر انداز ہوں گے۔

ٹرمپ نے ایک بڑا اڑکھیلایا ہے۔ ٹرمپ کی حکمت عملی فوجی طاقت کے ذریعے خطے کو از سر نو ترتیب دینے کی کوشش اور دیرینہ خواب ہے۔ ایک ایسا خواب جو ماضی میں بھی دیکھا گیا مگر مکمل تعبیر نہ پاسکا۔ جس میں ماضی کے کئی امریکی صدور ناکام رہے۔ مشرق وسطیٰ کو طاقت کے ذریعے "ری انجینئر" کرنے کی سوچ نئی نہیں۔ مگر عراق اور افغانستان کے تجربات یہ بتاتے ہیں کہ عسکری برتری سیاسی استحکام کی ضمانت نہیں ہوتی۔ ایران کا ریاستی ڈھانچہ عراق سے کہیں زیادہ مربوط ہے، اس لیے نتائج بھی مختلف ہو سکتے ہیں۔

اگر فضائی طاقت ایران کی جوہری صلاحیت کو مفلوج کر دے یا اگر ایران کی جوہری پیش رفت عارضی طور پر رک بھی جائے اور تہران میں اقتدار بدل جائے، خواہ بعد کا نقشہ مبہم ہی کیوں نہ ہو تو سوال باقی رہے گا کہ بعد ازاں کیا ہوگا؟ کیا کوئی واضح سیاسی منصوبہ موجود ہے یا صرف عسکری فتح پر اکتفا کیا جائے گا؟ کیا یہ پائیدار حل ہے؟ اور اگر قیادت تبدیل ہو بھی جائے تو کیا نئی قیادت عالمی برادری سے ہم آہنگ ہوگی یا مزید خود مختار راستہ اپنائے گی؟

پینٹاگون نے اس کارروائی کو "آپریشن ایکس فیوری" کا نام دیا ہے۔ اگر یہ آگ پھیل گئی تو نومبر کے وسط مدتی انتخابات میں ریپبلکن جماعت کے امکانات متاثر ہو سکتے ہیں۔ امریکی عوام بیرونی مہمات کے بارے میں منقسم رائے رکھتے ہیں۔ ٹرمپ کا یہ کہنا کہ "امریکی ہیروز کی جانیں جاسکتی ہیں" دراصل اس خطرے کا اعتراف ہے کہ یہ معرکہ طویل بھی ہو سکتا ہے اور مہنگا بھی۔ ایک امریکی اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے امریکی فوجیوں کی ہلاکت کا اعتراف بھی کیا ہے اور ساتھ ہی یہ اعلان کہ وہ آئندہ ایرانی سربراہ سے بات چیت کرنے کیلئے تیار ہیں، دراصل حقائق کو چھپانے کی ایک چال ہے۔

امریکا کو دوبارہ عظیم بنانے کا نعرہ داخلی استحکام پر زور دیتا ہے۔ اگر بیرونی مداخلت اس تصور سے متصادم ہوئی تو صدر کو اپنے حامیوں کو قائل کرنا مشکل ہو سکتا ہے۔ امریکا کو دوبارہ عظیم بنانے کے نظریے کے حامی کیا ایک نئی بیرونی مہم جوئی کو قبول کریں گے؟ مہنگائی اور داخلی مسائل کے بیچ یہ سوال ٹرمپ کیلئے کڑا امتحان بن سکتا ہے۔ جبکہ ٹرمپ انتظامیہ کے بعض سینیٹر ہلکا کر ایران پر بڑے آپریشن سے متحفظ اور حق میں نہ تھے۔ عسکری توسیع اور عوامی دھمکیوں کے درمیان پالیسی اختلافات ابھر آئے تھے۔ جو اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ فیصلہ سازی کے عمل میں مکمل ہم آہنگی نہیں تھی اور فیصلہ یک رائے نہ تھا۔

آبنائے ہرمز کی جغرافیائی و معاشی اہمیت بھی اس جنگ میں فیصلہ کن کردار ادا کرنے میں معاون ہو سکتی ہے۔ خلیج فارس کو بحر عمان سے ملاتی ہے۔ ہرمز ایک عالمی اقتصادی شہر گ ہے۔ یہ تقریباً 21 میل چوڑا تنگ راستہ ہے جس سے یومیہ لاکھوں بیرل خام تیل گزرتا ہے۔ عالمی تیل تجارت کا تقریباً تیس سے تیس فیصد اسی راستے سے گزرتا ہے۔ اور بالخصوص سعودی عرب، کویت، یو اے ای، عمان اور قطر کا 90 فیصد تیل اور دیگر توانائی ایل این پی جی کا روٹ یہی ہے، یہ ممالک کب تک اس کی بندش سے عظیم مالی خسارہ برداشت کر سکیں گے اور اس کے ساتھ ہی ان ملکوں کا مکمل فضائی نیٹ ورکس بھی منجمد ہو گئے ہیں اور روزانہ ہزاروں ملین ڈالر کی آمدن بھی اچانک رک گئی ہے۔ اس کے بند ہو جانے پر عالمی توانائی منڈی میں شدید بحران پیدا ہو سکتا ہے، ایشیائی معیشتیں فوری متاثر ہوں گی اور یورپ کو متبادل راستوں کی تلاش کرنا پڑے گی۔ آخری اطلاع کے مطابق ایران نے اسے بند کر دیا ہے

اور اس عمل سے نہ صرف توانائی کی قیمتیں آسمان کو چھو سکتی ہیں بلکہ عالمی معیشت ایک شدید بحران میں مبتلا ہو سکتی ہے۔ ایشیائی معیشتیں فوری متاثر ہوں گی اور یورپ کو متبادل راستوں کی تلاش کرنا پڑے گی۔

اس کی بندش نہ صرف قیمتوں کو اوپر لے جائے گی بلکہ عالمی شپنگ انشورنس، مال برداری لاگت اور توانائی کی ترسیل پر بھی گہرے اثرات ڈالے گی۔ جاپان، بھارت اور چین جیسے ممالک فوری متبادل تلاش کرنے پر مجبور ہوں گے۔ یہاں خطرہ دوچند ہو جاتا ہے کہ باب المندب جو ایک طرف سویز تک رسائی کا دروازہ اور دوسری طرف بحیرہ احمر کا جنوبی دہانہ ہے۔ حوثی تحریک، جو پہلے ہی بحری جہازوں کو نشانہ بنانے کی صلاحیت دکھا چکی ہے، اگر اس آبی گزرگاہ کو عملی طور پر غیر محفوظ بنا دے تو یہ ایک "غیر ریاستی" فریق کی جانب سے عالمی تجارت پر اثر انداز ہونے کی مثال ہوگی۔

حوثی اس سے قبل کئی مرتبہ عالمی تجارت کے اس اہم روٹ کو بند کرنے میں کامیابی حاصل کر چکے ہیں اور اب ایرانی سربراہ کے قتل کے بعد اس بات کا شدید خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ وہ اپنی استطاعت کے بھرپور استعمال سے اس راستے کو بند کر سکتے ہیں یا خطرات میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہاں خلل کا مطلب ہے یورپ اور ایشیا کے درمیان جہاز رانی کا رخ افریقہ کے گرد طویل سفر کی جانب مڑ جانا۔ اس سے اشیائے صرف کی قیمتوں میں اضافہ اور ترسیل میں تاخیر یقینی ہو سکتی ہے جس سے لاگت اور وقت دونوں بڑھ جائیں گے۔ آئندہ منظر نامہ میں امکانات اور اندیشے بڑھتے جا رہے ہیں جن میں ممکنہ راستے تین ہو سکتے ہیں۔ پہلا محدود مدت کی عسکری کارروائی اور تدریجی سفارت، دوسرا وسیع علاقائی تصادم جس میں بحری راستے اور توانائی رسد متاثر ہوں اور تیسرا داخلی سیاسی ہلچل جو ایران یا امریکا میں پالیسی تبدیلی کا باعث بنے۔

ترکی، مصر اور پاکستان جیسے ممالک براہ راست فریق نہیں مگر اثرات سے محفوظ بھی نہیں۔ ان کی خارجہ پالیسی توازن اور ثالثی کے امکانات کے گرد گھوم سکتی ہے۔ چین اور روس اس بحران کو سفارتی یا اقتصادی فائدے میں بدلنے کی کوشش کر سکتے ہیں لیکن ایرانی سربراہ اور دیگر اہم شخصیات کی ہلاکت کے بعد حالات انتہائی خراب اور تصفیہ کے امکانات محدود ہو گئے ہیں۔ روس اور چین نے امریکا کے اس ظالمانہ عمل کی شدید مذمت اور ایران کی خود مختاری پر امریکی حملہ کو دنیا کے امن کیلئے تباہی کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔

یہ بحران محض دو یا تین ریاستوں کا تصادم نہیں بلکہ ایک پورے خطے کی تقدیر کا سوال ہے۔ ایران کی حکمت عملی، امریکا کی عسکری مہم، خلیجی ریاستوں کی محتاط سفارت، اور عالمی معیشت کی لرزتی نبض — سب ایک دوسرے سے پیوست ہیں۔ یہ بحران محض بندوق اور بیان کا نہیں، بیانیہ اور معاشیات کا بھی ہے۔ ایک طرف نظریاتی استقلال ہے، دوسری طرف عالمی مفادات کا جال۔ اگر حکمت غالب نہ آئی تو خطہ ایک طویل بے یقینی میں داخل ہو سکتا ہے۔ اور اگر عقل سلیم نے راہ نکالی تو شاید یہی بحران کسی نئی سفارتی ترتیب کا پیش خیمہ بھی بن جائے۔ تاریخ کے اس موڑ پر ہر فیصلہ آنے والی دہائیوں کی سیاست و معیشت پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔

یہ معرکہ محض میز انلوں اور بیانات کا نہیں، نظریات اور مفادات کا تصادم ہے۔ ایران اپنے وعدے کی تکمیل میں سرگرم ہے، امریکا اپنی طاقت آزمائی میں مصروف، اور خلیجی ریاستیں توازن کی باریک راہ پر گامزن۔ تاریخ کے اس موڑ پر ایک چنگاری پورے خرمن کو جلا سکتی ہے۔ سوال یہ نہیں کہ آگ لگی ہے یا نہیں؛ سوال یہ ہے کہ اسے بجھانے کا حوصلہ کس کے پاس ہے۔

جب قومیں جذبات کی موج پر سوار ہو کر فیصلے کرتی ہیں تو تاریخ انہیں آزمائش کے کڑے مرحلوں سے گزارتی ہے۔ ایران اور امریکا کے اس تصادم میں محض دوریاتیں آمنے سامنے نہیں؛ بلکہ دو تصورات قوت، دو سیاسی فلسفے، اور دو تاریخی بیانیے ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں۔ اگر طاقت کے استعمال کو ہی آخری دلیل سمجھ لیا جائے تو انجام اکثر وہی ہوتا ہے جو ماضی کی جنگوں نے دکھایا—علاقائی عدم استحکام، معاشی بحران اور نئی صف بندیاں۔ مگر اگر حکمت غالب آجائے، تو شاید یہی بحران کسی نئے توازن کا پیش خیمہ بھی بن سکتا ہے۔

خلیجی ریاستیں اس کشمکش میں توازن کی باریک راہ پر چل رہی ہیں؛ عالمی معیشت لرزاں ہے؛ توانائی کی منڈیاں اضطراب میں ہیں؛ اور عوام اپنے اپنے ملکوں میں اس سوال سے دوچار ہیں کہ کیا یہ قیمت واقعی ناگزیر تھی؟ تاریخ ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ بیرونی مداخلتیں اکثر غیر متوقع نتائج پیدا کرتی ہیں، اور نظریاتی جنگیں صرف میدانِ کارزار میں نہیں بلکہ ذہنوں اور معاشروں میں بھی لڑی جاتی ہیں۔ اگر اس تصادم نے سفارت کے دروازے بند کر دیے تو آنے والی نسلیں اس کی قیمت چکائیں گی؛ اور اگر اسی بحران سے مفاہمت کی کوئی کرن پھوٹ نکلی تو یہی لمحہ ایک نئے باب کی تمہید بھی بن سکتا ہے۔

قارئین! اس تحریر کو محض واقعات کا مجموعہ نہ سمجھیں۔ یہ ایک عہد کی کیفیت کا بیان ہے—ایک ایسا عہد جو ہمیں یہ یاد دلاتا ہے کہ طاقت عارضی ہے، مگر نتائج دائمی۔ مشرق وسطیٰ کی فضا میں اٹھتی ہوئی یہ گرد آخر کب بیٹھے گی؟ یہ فیصلہ صرف میزائلوں سے نہیں، بصیرت سے ہو گا۔ اور شاید تاریخ ایک بار پھر یہی پوچھ رہی ہے: ماضی میں امریکی جارحیت اور اس کے نتائج سے اخذ کیا جاسکتا ہے کہ امریکی جنگی اسلحہ فروخت کرنے والی انڈسٹری کی رگوں میں انسانیت کا تازہ خون ہر وقت جنگوں کے میدان سجائے رکھتا ہے۔

☆ 1955ء سے لیکر 1975ء تک مسلسل 20 سال تک ویتنام جنگ امریکا کی سب سے نمایاں اور متنازع مداخلت تھی۔ طویل جنگ کے بعد امریکی افواج کی ذلت آمیز واپسی آج بھی تاریخ کا حصہ ہے کہ امریکی فوجیوں نے ہیلی کاپٹر سے لٹک کر راہ فرار حاصل کی۔

☆ نائن الیون کے بعد دہشتگردی کے خلاف جنگ کے تحت مداخلت کی گئی۔ طالبان حکومت ختم ہوئی مگر دو دہائیوں بعد امریکی افواج کے انخلا کے ساتھ طالبان دوبارہ اقتدار میں آگئے۔ یہ ایک طویل اور پیچیدہ مہم تھی جس کا اختتام امریکا کیلئے سیاسی طور پر مشکل ثابت ہوا۔ امریکی فوجیوں کو براستہ پاکستان نکلنے میں مدد کی گئی۔

☆ 2003ء اور 2011ء میں صدام حسین کے خلاف کارروائی بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کے دعوے پر کی گئی، جو بعد میں ثابت نہ ہو سکے۔ صدام حکومت ختم ہوئی، مگر ملک طویل بد امنی اور فرقہ وارانہ کشیدگی کا شکار رہا اور اب تک سنبھل نہیں پایا۔

☆ 2011ء میں نیٹو کی مداخلت سے قذافی حکومت ختم ہوئی، مگر ملک سیاسی انتشار میں مبتلا ہو گیا اور اب تک اس کی خوشحالی لوٹ کر نہیں آسکی۔

☆ 2014ء میں داعش کے خلاف کارروائی کے تحت محدود مداخلت، مگر شامی خانہ جنگی ایک وسیع علاقائی تنازع میں بدل گئی۔

☆ 1983ء میں گریناڈا میں مختصر فوجی مداخلت جسے امریکا نے کامیاب قرار دیا اور جلد انخلا پر مجبور ہو گیا۔

☆ 1989ء میں پانامہ میں جنرل نوریکا کی حکومت ختم کی گئی؛ امریکا نے اسے کامیاب آپریشن قرار دیا۔

☆ اوراب ویزویلا کی مہم جوئی بھی ساری دنیا کے سامنے ہے اور اسکے تیل پر مکمل تصرف حاصل کر لیا گیا ہے۔

یہ فہرست طویل ہے اور یہ بھی درست ہے کہ ہمیشہ ان خطوں میں امریکی جارحیت اور مہمات سیاسی طور پر متنازع رہیں، اور خطے میں طویل عدم استحکام کو جنم دیا۔

کیا تاریخ خود کو دہرا رہی ہے؟ یہ سوال اہم ہے: کیا انسان نے ماضی سے کچھ سیکھا ہے؟ ویتنام نے سکھایا کہ مقامی مزاحمت کو کم نہیں سمجھنا چاہیے۔ عراق نے سکھایا کہ ریاستی ڈھانچے کو اچانک گرانا آسان ہے، مگر مستحکم متبادل بنانا مشکل۔ افغانستان نے سکھایا کہ طویل عسکری موجودگی سیاسی کامیابی کی ضمانت نہیں۔ اگر موجودہ کشیدگی وسیع جنگ میں بدلتی ہے تو وہی اسباق دوبارہ سامنے آسکتے ہیں۔

اب اہم سوال یہ ہے کہ مشرق وسطیٰ کا مستقبل اور بربادی کی گرد کب بیٹھے گی؟ یاد رکھیں کہ گرد تب بیٹھتی ہے جب سفارت کاری عسکریت پر غالب آئے، علاقائی طاقتیں تصادم کی بجائے توازن کا راستہ اپنائیں، عالمی طاقتیں محدود اہداف کے بعد مذاکرات کا دروازہ کھولیں۔ طاقت عارضی ہے — یہ بات تاریخ نے بارہا ثابت کی ہے۔ مگر اس کے اثرات نسلوں تک رہتے ہیں۔ اگر بصیرت غالب آئی تو یہ بحران محدود رہ سکتا ہے۔ اگر جذبات غالب آئے تو یہ دہائیوں پر محیط عدم استحکام کا سبب بن سکتا ہے۔

مشرق وسطیٰ کی فضا میں اٹھتی ہوئی گرد میزائلوں سے نہیں، مذاکرات سے بیٹھے گی؟ یہ عسکری کامیابی سے نہیں، سیاسی حکمت سے ممکن ہو گا۔ اور شاید تاریخ ایک بار پھر یہی پوچھ رہی ہے کیا امریکا نے واقعی ماضی سے سبق سیکھا ہے، یا وہ پھر اسی دہانے پر کھڑا ہے جہاں سے کئی بار گر چکا ہے؟

ہفتہ 18 رمضان الکریم 1447ھ 7 مارچ 2026ء

عالمی بساط کا خفیہ کھیل

تاریخ کے اوراق میں بعض حادثات محض واقعات نہیں ہوتے بلکہ زمانے کی تقدیر کا رخ موڑنے والے سنگ میل بن جاتے ہیں۔ مشرق وسطیٰ کی تاریخ میں بعض لمحات ایسے ہوتے ہیں جب زمانہ اپنی سانسیں روک کر کسی بڑے حادثے یا کسی غیر معمولی تبدیلی کا انتظار کرتا محسوس ہوتا ہے۔ مشرق وسطیٰ کی سیاست میں بعض واقعات ایسے ہوتے ہیں جو محض ایک سانحہ نہیں بلکہ تاریخ کے دھارے میں ایک نئے موڑ کی علامت بن جاتے ہیں۔ تاریخ کی کتاب میں بعض ابواب ایسے ہوتے ہیں جنہیں پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ زمانہ ایک نئے موڑ پر کھڑا ہے۔

حالیہ بحران بھی اسی قبیل کا ایک لرزہ خیز باب ہے جسے ایران کے رہبر اعلیٰ سید علی خامنہ ای کی شہادت اور اس کے بعد پیدا ہونے والی کشیدگی کے تناظر میں دیکھا جا رہا ہے۔ امریکا اور اسرائیل کی جانب سے ایران پر بڑھتا ہوا دباؤ گویا ایک ایسے طوفان کا پیش خیمہ بن گیا جس نے پورے خطے کو اضطراب - گویا یہ بحران بھی اسی نوعیت کا ایک لمحہ معلوم ہوتا ہے، جسے بعض حلقوں نے ایران کے رہبر اعلیٰ سید علی خامنہ ای کے مبینہ قتل اور میں مبتلا کر دیا ایران کے خلاف بڑھتی ہوئی امریکی و اسرائیلی جارحیت کے تناظر میں دیکھا، اسی نوعیت کا ایک لرزہ خیز باب معلوم ہوتا ہے۔

ایران کے رہبر اعلیٰ سید علی خامنہ ای کے قتل کی خبر اور اس کے بعد ایران کے خلاف امریکا اور اسرائیل کی جارحانہ حکمت عملی نے خطے کو ایک ایسے دہانے پر لا کھڑا کیا جہاں سے جنگ کے شعلے پورے عالم کو اپنی لپیٹ میں لے سکتے تھے۔ حالیہ بحران بھی اسی نوعیت کا ایک باب معلوم ہوتا ہے۔ سید علی خامنہ ای کی شہادت کے بعد جو سیاسی و عسکری ہلچل پیدا ہوئی اس نے مشرق وسطیٰ کے افق پر خطرے کے سیاہ بادل جمع کر دیے۔ اس واقعے نے خطے کو ایسی آتش فشاں کی کیفیت کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے جس کی تپش شاید آنے والی نسلیں بھی محسوس کریں۔

یہ واقعہ محض ایک شخص کی شہادت نہیں بلکہ ایک ایسے سیاسی بھونچال کی علامت تھا جس نے خطے کی تزویراتی بساط کو ہلا کر رکھ دیا۔ سیاسی افق پر پھیلی ہوئی یہ غیر یقینی کیفیت محض حادثاتی نہیں لگتی؛ اس کے پس منظر میں ایک ایسا شطرنجی منصوبہ کار فرما دکھائی دیتا ہے جس کا مقصد ایران کے دفاعی حصار کو اندر سے کمزور کرنا تھا۔ اس سانحے کے بعد پیدا ہونے والی غیر یقینی فضا کسی اچانک حادثے کا نتیجہ نہیں معلوم ہوتی بلکہ ایک ایسے پیچیدہ منصوبے کی جھلک پیش کرتی ہے جس کا مقصد ایران کے دفاعی حصار کو اندر سے کمزور کرنا تھا۔

اس کے بعد پیدا ہونے والی بے یقینی دراصل ایک ایسے منصوبے کی ابتدا معلوم ہوتی ہے جس کا مقصد ایران کے دفاعی نظام کو اندر سے کمزور کرنا اور اسے سیاسی و عسکری انتشار میں مبتلا کرنا تھا۔ امریکا اور اسرائیل کی طرف سے ایران کے خلاف بڑھتا ہوا دباؤ اس حقیقت کا پتہ دیتا ہے کہ خطے میں طاقت کی بساط پر ایک نئی بازی کھیلی جا رہی تھی۔ اس واقعے کے بعد پیدا ہونے والی بے یقینی محض ایک حادثہ نہیں بلکہ ایک ایسے منصوبے کی ابتدا دکھائی دیتی ہے جس کا مقصد ایران کے دفاعی حصار کو اندر سے کمزور کرنا اور اسے سیاسی انتشار میں مبتلا کرنا تھا۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ عالمی سیاست کے پردوں کے پیچھے ایک ایسی بساط بچھائی جا چکی تھی جس پر مہرے آہستہ آہستہ اپنی جگہ سنبھال رہے تھے۔ اس حقیقت کی جھلک اس بیان میں بھی دیکھی جاسکتی ہے جو روسی صدر ولادی میر پیوٹن نے کچھ عرصہ قبل عالمی برادری کے سامنے پیش کیا تھا۔ ایک ایسا بیان جس کی گونج سفارتی ایوانوں میں دور تک سنائی دی۔ اس منظر نامے کے پس منظر میں روسی صدر کا وہ انتباہ خاص اہمیت اختیار کر جاتا ہے جو انہوں

نے عالمی برادری کے سامنے واضح طور پر بڑی صراحت سے پیش کیا تھا کہ افغانستان کی سرزمین ایک بار پھر دہشتگردی کی زسری بقی جا رہی ہے جہاں افغان سرزمین کو ایک بار پھر خطرناک عسکری کھیل کا میدان بنائے جانے کا امکان ہے۔ ان کے بقول وہاں پچیس ہزار سے زائد تربیت یافتہ جنگجو جمع کئے جا رہے ہیں، جن میں بڑی تعداد اسلامک اسٹیٹ۔ صوبہ خراسان کے عسکریت پسندوں کی ہے، جو شام اور عراق کے میدانوں میں خون آشام تجربات سے گزر چکے ہیں۔

اس پس منظر میں روسی صدر کا وہ انتباہ غیر معمولی اہمیت اختیار کرتا ہے جس میں انہوں نے افغانستان میں جمع ہونے والی شدت پسند قوتوں کی طرف دنیا کی توجہ مبذول کرواتے ہوئے خبردار کیا تھا کہ افغانستان کو ایک بار پھر بڑی طاقتوں کے تصادم کا میدان بنایا جا رہا تھا۔ بیوٹن کے الفاظ گویا ایک نئے ”گریٹ گیم“ کی دستک تھے۔ وہ کھیل جس میں طاقتیں مہرے بدلتی ہیں مگر ہدف وہی رہتا ہے۔ بیوٹن کے اس بیان کو کئی مبصرین نے ایک ایسے نئے عالمی کھیل کی جھلک قرار دیا جس میں افغانستان کو ایک بار پھر بڑی طاقتوں کے تصادم کا میدان بنانے کی تیاری ہو رہی تھی۔

بیوٹن کے اس بیان نے عالمی سفارتی حلقوں میں تشویش کی لہر دوڑادی کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ افغانستان کو ایک بار پھر عالمی طاقتوں کی کشمکش کا میدان بنایا جا رہا ہے۔ خطے کی جغرافیائی سیاست کو از سر نو ترتیب دینا۔ اس تناظر میں ایران کو کمزور کرنا اور پاکستان کو دباؤ میں لانا ایک وسیع تر حکمت عملی کا حصہ دکھائی دیتا ہے۔

اس عالمی شطرنج کے کھیل میں ایک اور اہم موڑ اُس وقت آیا جب ایران پر دباؤ بڑھتے ہوئے بادلوں کے دوران بھارتی وزیراعظم نریندر مودی کا اسرائیل کا دورہ سامنے آیا۔ یہ داستان اُس وقت مزید معنی اور سنسنی خیز رخ اختیار کرتی ہے جب ایران پر دباؤ کے بڑھتے بادلوں سے محض دو دن قبل مودی کا اسرائیل میں غیر معمولی استقبال سامنے آتا ہے۔ اسرائیلی پارلیمنٹ میں ان کی تقریر اور وہاں ہونے والی ملاقاتوں کو بعض دفاعی حلقوں نے محض سفارتی سرگرمی قرار دینے سے انکار کیا۔ ان کے مطابق اس دورے میں خطے کی وسیع تر تزویراتی صورت حال پر تفصیلی مشاورت ہوئی جس میں ایران کے خلاف ممکنہ اقدامات پر بھی بات چیت ہوئی۔

اسرائیلی پارلیمنٹ میں ان کی تقریر نے سفارتی فضا میں ایسی سرگوشیاں جنم دیں جنہیں بعض دفاعی مبصرین محض رسمی آداب نہیں سمجھتے۔ دفاعی جریڈوں اور خفیہ رپورٹوں کے مطابق اس دورے میں ”آپریشنل کوآرڈینیشن“ کے خدوخال زیر بحث آئے۔ مبصرین کا خیال ہے کہ اس حکمت عملی کے تحت افغانستان کو ایک ایسے مرکز میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی جہاں سے ایران کے خلاف دباؤ بڑھایا جاسکے۔ اس کھیل میں اقتصادی مفادات، سی پیک جیسے منصوبوں کو نقصان پہنچانے کی خواہش اور علاقائی اثر و رسوخ کی کشمکش سب ایک دوسرے میں پیوست نظر آتے ہیں۔

اس منظر نامے میں امریکا، اسرائیل اور بھارت کے درمیان ایک ایسی ہم آہنگی کی جھلک دکھائی دی جس کا مقصد خطے میں اپنے سیاسی و عسکری مفادات کو مستحکم کرنا تھا۔ اس تناظر میں یہ تاثر پیدا ہوا کہ امریکا، اسرائیل اور بھارت کے درمیان ایک ایسا تعاون فروغ پا رہا ہے جس کا مقصد خطے میں اپنے سیاسی اور عسکری مفادات کو مضبوط بنانا ہے۔ ان حلقوں کے مطابق امریکا، اسرائیل اور بھارت کے درمیان ایسی حکمت عملی زیر غور تھی جس کے تحت افغانستان کو ایک ایسے مرکز میں تبدیل کیا جائے جہاں سے ایران کے خلاف دباؤ بڑھایا جاسکے۔ اس منصوبے میں اقتصادی مفادات، خطے میں اثر و رسوخ کی جنگ اور چین کے تعاون سے بننے والے منصوبوں خصوصاً سی پیک کو کمزور کرنے کی کوششیں بھی شامل سمجھی جاتی ہیں۔



عالمی سیاست کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ جب بڑی طاقتیں کسی ریاست میں تبدیلی حکومت کا ارادہ کرتی ہیں تو وہ عموماً داخلی شورش کو ہوا دیتی ہیں۔ تاریخ کے اوراق پر نگاہ دوڑائی جائے تو ایک تلخ حقیقت بار بار سامنے آتی ہے: جب بڑی طاقتیں کسی ملک میں ”رجیم چینج“ کا ارادہ کرتی ہیں تو وہ میدان میں ایسی قوتیں تلاش کرتی ہیں جو اندرونی خونریزی کے

ذریعے ریاستی ڈھانچے کو کمزور کر سکیں۔ عالمی سیاست کے تجربات ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ جب بڑی طاقتیں کسی ملک میں تبدیلی حکومت کا ارادہ کرتی ہیں تو وہ براہ راست مداخلت سے پہلے داخلی انتشار پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

گزشتہ دہائیوں میں امریکا کے زیر اثر دنیا کے مختلف خطوں میں ایسے درجنوں واقعات رونما ہو چکے ہیں جہاں مقامی یا غیر ریاستی گروہوں کو استعمال کر کے سیاسی نظام کو عدم استحکام سے دوچار کیا گیا۔ اسی طرز عمل کی مثالیں لیبیا، شام اور عراق میں دیکھی گئیں جہاں شدت پسند گروہوں نے اسی نوعیت کا پیچیدہ کردار ادا کیا تھا۔ ایران کے معاملے میں مسئلہ یہ تھا کہ داخلی سطح پر ایسی کوئی طاقت موجود نہ تھی جو پاسداران انقلاب کا مقابلہ کر سکے۔ ماضی میں مریم رجوی اور رضا پهلوی جیسے ناموں کے ذریعے سیاسی دباؤ بڑھانے کی کوششیں بھی خاطر خواہ نتائج نہ دے سکیں۔ اسی وجہ سے بیرونی عناصر نے ایسے بیرونی جنگجوؤں عناصر کو استعمال کرنے کی حکمت عملی اپنائی جو بیرونی میدانوں میں لڑائی کا تجربہ رکھتے تھے۔

اسی تناظر میں یہ اطلاعات بھی سامنے آئیں کہ شام اور عراق کے میدانوں سے بچے کچھ سرگرم شدت پسند گروہوں کے ہزاروں جنگجوؤں کو افغانستان منتقل کیا گیا۔ ان کے بارے میں کہا گیا کہ انہیں ہرات اور مشہد کے راستوں سے ایران میں داخل ہونے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ منصوبہ یہ تھا کہ ایران کے متعدد صوبوں میں بیک وقت شورش پیدا کی جائے تاکہ ایرانی فوج اور سکیورٹی ادارے داخلی بحران میں الجھ جائیں۔ اس سیاسی افراتفری کے دوران بیرونی طاقتوں کو ایران کی سیاسی سمت پر اثر انداز ہونے کا موقع مل سکتا تھا اور بعد ازاں سیاسی مداخلت کا دروازہ کھل سکتا تھا۔ جب ایک ریاست اندرونی انتشار میں گرفتار ہو جاتی ہے تو بیرونی طاقتوں کیلئے اس کے معاملات میں مداخلت کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ جدید مواصلاتی آلات اور خفیہ راستوں کے استعمال کی اطلاعات بھی اسی منصوبے کا حصہ بتائی گئیں اور گوریلا طرز کی کارروائیوں کا منصوبہ بھی شامل بتایا گیا۔

بعض مبصرین کے نزدیک ان تمام خطرات کے بچ پاكستان کا کردار ایک فیصلہ کن عنصر کے طور پر سامنے آیا کہ اگر سرحدی علاقوں میں سرگرم شدت پسند گروہوں کے خلاف سخت کارروائیاں نہ ہوتیں تو صورت حال کہیں زیادہ بھیانک ہو سکتی تھی۔ ایسے نازک مرحلے پر پاكستان کا کردار نہایت اہمیت اختیار کر گیا۔ افغانستان کے ساتھ پاكستان کی سرحد ہزاروں کلومیٹر پر پھیلی ہوئی ہے اور اس کے بیشتر علاقے دشوار گزار پہاڑی سلسلوں پر مشتمل ہیں۔ جہاں سے دراندازی کے امکانات ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ پاكستانی سکیورٹی اداروں نے ان اطلاعات کے بعد سرحدی علاقوں میں سخت کارروائیاں کیں اور شدت پسند عناصر کے ٹھکانوں کو نشانہ بنایا اور ان کے نقل و حرکت کے راستوں کو محدود کر دیا گیا۔

اس تناظر میں پاكستان کی مسلح افواج کو ایک ایسی رکاوٹ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جس نے ممکنہ دراندازی کے راستوں کو محدود کر دیا۔ دوسری جانب امریکی سیاست میں اس بحران کے حوالے سے بیانات بھی سامنے آئے جن میں ٹرمپ کی سخت زبان اور ایران میں عوامی احتجاج کی اپیلیں شامل تھیں۔

اگر یہ کارروائیاں نہ ہوتیں تو افغانستان میں موجود ہزاروں جنگجو ایران اور پاکستان دونوں کی سرزمین میں داخل ہو کر وسیع پیمانے پر خونریزی کا باعث بن سکتے تھے۔ اس طرح پاکستان ایک ایسی رکاوٹ بن کر ابھرا جس نے اس ممکنہ بحران کو پھیلنے سے روک دیا۔

سرحدی علاقوں میں سرگرم عسکری گروہوں کی فہرست بھی کم ہولناک نہیں بتائی جاتی۔ مبصرین کے مطابق ان میں افغانستان کے مختلف صوبوں میں سرگرم عسکری گروہوں میں اسلامک اسٹیٹ صوبہ خراسان کے علاوہ دیگر شدت پسند تنظیموں کے دھڑے بھی شامل بتائے جاتے ہیں جو جوزجان، ننگرہار، کنڑ اور خوست کے علاقوں میں موجود تھے۔ بعض رپورٹس یہ دعویٰ بھی کرتی ہیں کہ ایران کے صوبہ سیستان و بلوچستان میں کارروائیوں سے منسلک گروہوں کو افغانستان کے بعض علاقوں میں پناہ گاہیں فراہم کی گئیں۔ ان گروہوں کا ہدف نہ صرف ایران بلکہ پاکستان کے حساس علاقوں میں بھی عدم استحکام پیدا کرنا بتایا جاتا ہے۔ اطلاعات کے مطابق ان عناصر کو نہ صرف ایران بلکہ پاکستان کے حساس علاقوں میں بھی دہشتگردی پھیلانے کا ٹاسک دیا گیا تھا۔

اس صورت حال میں پاکستان کیلئے یہ محض ہمسایہ ملک کی مدد کا معاملہ نہیں بلکہ اپنی داخلی سلامتی کا بھی سوال تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سرحدی نگرانی، انٹیلی جنس تعاون اور عسکری کارروائیوں کے ذریعے اس ممکنہ خطرے کو محدود کرنے کی کوشش کی گئی۔ اسی دوران ایک اور محاذ بھی زیر بحث آیا: کرد مسلح گروہوں کی ممکنہ نقل و حرکت۔ بعض اطلاعات کے مطابق ترکی اور عراق کے سرحدی خطوں سے ایسے جنگجوؤں کو ایران میں داخل کرانے کی کوششوں کو روکنے میں علاقائی تعاون نے اہم کردار ادا کیا۔ اس صورت حال میں پاکستان اور ترکی دونوں کے اقدامات کو بعض تجزیہ نگار خطے میں استحکام کی کوشش قرار دیتے ہیں۔ بعض اطلاعات کے مطابق علاقائی تعاون اور خفیہ معلومات کے تبادلے کے باعث ان منصوبوں کو ناکام بنایا گیا۔ اس سلسلے میں پاکستان اور ترکی کے اقدامات کو خطے میں استحکام کیلئے اہم قرار دیا گیا۔ اس پورے منظر نامے میں ایک حقیقت نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے کہ افغانستان میں موجود غیر ریاستی عناصر ایک ایسا بارودی ذخیرہ بن چکے ہیں جو کسی بھی لمحے پورے خطے کو اپنی لپیٹ میں لے سکتا ہے۔

اگر اس پورے منظر نامے کو وسیع تر زاویے سے دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ مشرق وسطیٰ اور جنوبی ایشیا ایک نہایت حساس دور سے گزر رہے ہیں۔ ایسے حالات میں کسی ایک واقعے کا دائرہ صرف ایک ملک تک محدود نہیں رہتا بلکہ پورے خطے کو اپنی لپیٹ میں لے سکتا ہے۔ ایک چھوٹا سا واقعہ بھی بڑی جنگ کا پیش خیمہ بن سکتا تھا۔ بعض تجزیہ نگاروں کے مطابق اگر افغانستان میں موجود شدت پسند عناصر ایران میں داخل ہونے میں کامیاب ہو جاتے تو صورت حال ایک وسیع علاقائی جنگ کی شکل اختیار کر سکتی تھی جس میں عالمی طاقتیں بھی ملوث ہو جاتیں۔

یوں کہا جاسکتا ہے کہ اس پیچیدہ اور خطرناک صورت حال میں پاکستان کی جانب سے سرحدی دہشت گردی کے خلاف سخت اقدامات اور علاقائی تعاون نے ایک ایسے بحران کو پھیلنے سے روکنے میں کردار ادا کیا جو با آسانی وسیع جنگ کا سبب بن سکتا تھا۔ اس پس منظر میں بعض مبصرین پاکستان کو خطے میں استحکام کا ایک اہم ستون قرار دیتے ہیں جس نے نہ صرف اپنی سرزمین بلکہ ہمسایہ ممالک کے امن کیلئے بھی کردار ادا کیا۔ بعض مبصرین کے نزدیک یہ وہ لمحہ تھا جب پاکستان نے محض اپنی سرحدوں کا نہیں بلکہ پورے خطے کے امن کا دفاع کیا۔

تاریخ کے تناظر میں دیکھا جائے تو ایسے مواقع کم ہی آتے ہیں جب کسی ریاست کا ایک فیصلہ پورے خطے کے مستقبل پر اثر انداز ہو۔ اگر حالات ذرا بھی مختلف رخ اختیار کرتے تو ممکن تھا کہ مشرق وسطیٰ ایک ایسی جنگ کی لپیٹ میں آ جاتا جس کے اثرات عالمی سیاست پر بھی مرتب ہوتے۔ اس پس منظر

میں پاکستان کے اقدامات کو بعض حلقے خطے کے استحکام کی ایک اہم کوشش قرار دیتے ہیں۔

اگر اس پورے منظر نامے کو وسیع تر زاویے سے دیکھا جائے تو حاصل کلام یہ معلوم ہوتا ہے کہ مشرق وسطیٰ اور جنوبی ایشیا ایک ایسے تاریخی موڑ پر کھڑے ہیں جہاں چھوٹے سے اقدام کے بھی عالمی اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ وہ محسوس ہوتا ہے کہ مشرق وسطیٰ اور جنوبی ایشیا کی سیاست ایک نئے دور ہے پر کھڑی ہے جہاں طاقت، مفاد اور نظریات کی کشمکش نے پیچیدہ صورت اختیار کر لی ہے۔ اگر اس پورے بحران کو ایک تمثیل میں سمیٹا جائے تو یوں کہا جاسکتا ہے کہ عالمی سیاست کی بساط پر مہرے تو بہت ہیں، مگر اصل بازی وہی جیتتا ہے جو صبر، بصیرت اور تدبیر کے ساتھ اپنے قدم بڑھاتا ہے۔ بعض مبصرین کے نزدیک حالیہ واقعات نے یہ تاثر ضرور پیدا کیا ہے کہ علاقائی تعاون نے ایک ممکنہ بڑے بحران کو ٹالنے میں کردار ادا کیا۔ اور اگر ایسا ہے تو یہ محض ایک سفارتی کامیابی نہیں بلکہ پورے خطے کے امن کیلئے ایک اہم موڑ بھی ہے۔

بعض تجزیہ نگاروں کے مطابق پاکستان کی جانب سے سرحدی دہشتگردی کے خلاف سخت اقدامات نے ایک ایسے بحران کو پھیلنے سے روکنے میں کردار ادا کیا جو با آسانی ایک وسیع علاقائی جنگ کی صورت اختیار کر سکتا تھا۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ عالمی سیاست کی اس پر پیچ بساط پر پاکستان نے کم از کم اس مرحلے پر ایک ایسا کردار ادا کیا جس نے خطے کو مزید بڑے تصادم کی طرف بڑھنے سے روکنے میں مدد دی۔ یہی وہ لمحہ ہے جب تاریخ خاموشی سے اپنا فیصلہ رقم کرتی ہے اور آنے والی نسلیں اس کے اثرات کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہیں۔

تاریخ نگاہ باب ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ عالمی سیاست کی بساط پر کبھی کبھی ایک ریاست کا بروقت اور دانشمندانہ اقدام پورے خطے کی تقدیر بدل دیتا ہے۔ اگر حالات ذرا بھی مختلف رخ اختیار کرتے تو ممکن تھا کہ مشرق وسطیٰ ایک ایسی جنگ کی لپیٹ میں آجاتا جس کے اثرات پوری دنیا پر مرتب ہوتے۔ ایسے میں پاکستان کے اقدامات کو بعض مبصرین ایک ایسے حفاظتی حصار کے طور پر دیکھتے ہیں جس نے اس ممکنہ بحران کو محدود رکھنے میں مدد دی۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ عالمی سیاست کے اس پر پیچ دور میں طاقت کے کھیل کے ساتھ ساتھ حکمت، تدبیر اور بروقت اقدام بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اگر خطے میں بعض ریاستیں بروقت فیصلے نہ کرتیں تو ممکن تھا کہ یہ بحران ایک وسیع جنگ میں تبدیل ہو جاتا۔ اس حقیقت نے ایک بار پھر یہ ثابت کر دیا کہ کبھی کبھی تاریخ کے دھارے کو موڑنے کیلئے ایک مضبوط اور دوراندیش فیصلہ ہی کافی ہوتا ہے۔

ایوان اقتدار کی سرگوشیاں

تاریخ کے صفحات خاموش گواہ بن کر بیٹھے رہتے ہیں، مگر بعض اوقات وہ ہم سے سرگوشیاں کرتے ہیں، چپ چاپ سچائی کی دہائی دیتے ہیں۔ جب وہ دبے لہجے میں قوموں کو آئینہ دکھاتے ہیں تو وہ لمحے اقتدار کے ایوانوں میں کہے گئے جملے، نہ کہے گئے الفاظ اور اختیار کی یہ اہم سرگوشیاں قومی تقدیر کے دھارے کا رخ متعین کر دیتے ہیں۔ بھارت کی سیاسی اور فوجی کشمکش کے تازہ واقعات بھی ایسے لمحے ہیں، جہاں الفاظ، فیصلے اور خاموشیوں کے درمیان قوم کی تقدیر کی دھار جلی ہوئی نظر آتی ہے۔ سابق آرمی چیف جنرل ایم ایم نروا کی غیر مطبوعہ یادداشت "فورسٹارز آف ڈیپسٹیٹی" ایک ایسا آئینہ ہے، جو نہ صرف فوجی قیادت کے حساس فیصلوں کی عکاسی کرتا ہے بلکہ سیاسی قیادت کی ذمہ داریوں اور قومی مفاد کے درمیان نازک توازن کو بھی بے پردہ پیش کرتا ہے۔

بھارت کی حالیہ سیاسی و عسکری کشمکش بھی ایسا ہی ایک باب ہے، جس میں ایک غیر مطبوعہ یادداشت نے پارلیمنٹ کے فرش پر سوالات کی ایسی گرد اڑائی کہ قومی سلامتی، سیاسی ذمہ داری اور جمہوری روایت سب ایک ہی کٹہرے میں کھڑے نظر آنے لگے۔ انڈیا کی پارلیمانی تاریخ میں بعض اوقات ایسے لمحات بھی آئے ہیں جو بظاہر معمولی دکھائی دیتے ہیں، مگر حقیقت میں وہ ملکی سیاست اور عسکری اداروں کے مابین تعلقات کے حساس گوشوں کی کھوج کرتے ہیں۔ 2024 میں پیش آنے والا واقعہ بھی کچھ ایسا ہی ہے، جب سابق آرمی چیف جنرل ایم ایم نروا نے کی غیر مطبوعہ یادداشت "فورسٹارز آف ڈیپسٹیٹی" نے نہ صرف سرکاری محاذ پر ہنگامہ برپا کر دیا بلکہ پارلیمنٹ کے ایوان زیریں میں بھی سیاسی تضاد کی آگ بھڑکادی۔

یہ یادداشت اور اس کے ارد گرد پیدا ہونے والا پارلیمانی ہنگامہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ تاریخ صرف گزرے ہوئے واقعات کا مجموعہ نہیں، بلکہ ایک فکری کشمکش ہے، جہاں ہر فیصلہ، ہر فرمان اور ہر خاموشی ایک قوم کے مستقبل کا نقشہ کھینچتی ہے۔ یہ وہ لمحے ہیں جو قاری کے شعور میں گھس کر سوچ کی کرنیں جگاتے ہیں، اور اسے مجبور کرتے ہیں کہ وہ صرف پڑھے نہیں بلکہ محسوس بھی کرے۔

جنرل ایم ایم نروا نے کی یادداشت فورسٹارز آف ڈیپسٹیٹی 2024ء سے شائع ہونے کی منظوری کی منتظر ہے۔ یہ یادداشت نہ صرف نروا کی ذاتی زندگی اور کیریئر کی کہانی بیان کرتی ہے بلکہ حساس فوجی اور آپریشنل تفصیلات پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔ نروا نے 2019 سے 2022 تک ہندوستان کے آرمی چیف کے طور پر خدمات انجام دیں۔ یادداشت میں ان کی فوجی حکمت عملی، سیاسی معاملات سے تعلق، اور اہم فیصلوں کی عکاسی موجود ہے۔

نرل نروا نے کی یادداشت محض ایک ذاتی سرگزشت نہیں بلکہ ایک ایسے دور کی گواہی ہے جب لداخ کی سنگلاخ وادیوں میں بارود کی بو اور سفارتی خاموشی ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ یہ کتاب ابھی شائع نہیں ہوئی، مگر اس کے اقتباسات نے ایوان زیریں میں ایسا ارتعاش پیدا کیا کہ الفاظ بھی متنازع اور خاموشی بھی معنی خیز بن گئی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں تاریخ واقعات سے آگے بڑھ کر فکری امتحان بن جاتی ہے۔

اس یادداشت کے اقتباسات کے مطابق، 2020 میں لداخ کے ہمالیائی خطے میں چین کے ساتھ فوجی تعطل کے دوران ملک کے اعلیٰ سیاسی رہنماؤں کی ہدایات میں غیر یقینی اور تاخیر پائی گئی، جس کے نتیجے میں 20 ہندوستانی اور کم از کم چار چینی فوجی مارے گئے۔ راہول گاندھی نے پارلیمنٹ میں اس دستاویز کی فوٹوکاپی پیش کرنے کی کوشش کی، جس سے ایوان میں ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ گاندھی کے مطابق، جیسے ہی چینی ٹینک ہندوستانی پوزیشنوں پر آگے

بڑھے، سابق آرمی چیف نروانے کو کہا گیا کہ وہ "جو مناسب سمجھیں وہ کریں"، جس پر وزیر دفاع اور دیگر وزراء نے سخت اعتراض کیا۔

جنرل ایم ایم نروانے 2019 سے 2022 تک بھارت کے آرمی چیف رہے۔ ان کی یادداشت "فورسٹاز آف ڈیٹسٹین" 2024 میں اشاعت کیلئے پیش کی گئی، تاہم حکومتی منظوری اور حساس عسکری مواد کے باعث اب تک شائع نہیں ہو سکی۔ اطلاعات کے مطابق اس میں نہ صرف ان کی ذاتی زندگی اور عسکری کیریئر کا احاطہ ہے بلکہ 2020 کے چین-بھارت تعطل سے متعلق اہم آپریشنل اور انتظامی پہلو بھی درج ہیں۔ ناشر اور وزارتِ دفاع کے درمیان منظوری کے مراحل جاری رہے، اور خود نروانے نے ایک انٹرویو میں واضح کیا کہ ان کا کام کتاب لکھ کر پبلشر کے سپرد کرنا تھا، آگے بڑھانا ناشر اور متعلقہ اداروں کی ذمہ داری ہے۔ اس تاخیر نے کتاب کو ایک غیر مرئی سیاسی دستاویز بنادیا۔ جو چھپی نہ سہی، مگر زیر بحث ضرور آگئی۔

یہ تنازع اس وقت شدت اختیار کر گیا جب کانگریس رہنما راہول گاندھی نے پارلیمنٹ کے ایوانِ زیریں میں اس غیر مطبوعہ یادداشت کے اقتباسات پیش کرنے کی کوشش کی، انہوں نے مبینہ طور پر فوٹوکاپی کے ذریعے ان نکات کا حوالہ دینا چاہا جن میں 2020 کے فوجی بحران کے دوران سیاسی قیادت کی ہدایات پر سوال اٹھایا گیا تھا۔ جیسے ہی انہوں نے پڑھنا شروع کیا، ایوان میں شور برپا ہو گیا اور شدید ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ گاندھی کو بار بار روکا گیا جب انہوں نے پیر کو بحث میں کتاب کے اقتباسات پڑھنے کی کوشش کی۔ بی جے پی نے الزام لگایا کہ انہوں نے ہندوستانی فوجیوں کی توہین کی اور غیر مطبوعہ کتاب کے حوالے سے پارلیمانی قوانین کی خلاف ورزی کی۔ وزیر دفاع راج ناتھ سنگھ اور وزیر داخلہ امتیت شاہ نے گاندھی پر ایوان کو گراہ کرنے کا الزام لگایا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سیاسی اختلافات کس طرح قومی دفاع اور فوجی وقار کے موضوع پر بھی شدت اختیار کر سکتے ہیں۔

کانگریس نے موقف اختیار کیا کہ سابق آرمی چیف کی یادداشت مستند ماخذ ہے اور گاندھی کو اس سے حوالہ دینے کا حق حاصل ہے۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا جب کانگریس نے چین کے معاملے پر حکومت پر تنقید کی، اور اس واقعے نے سیاسی قیادت کے اقدامات پر سوال اٹھانے کا دروازہ کھولا۔ اقتباسات میں دعویٰ کیا گیا کہ 2020 میں چین کے ساتھ فوجی تعطل کے دوران ملک کے اعلیٰ سیاسی رہنماؤں نے واضح ہدایات دینے میں ناکامی برتی۔ یہ اقدام ایوان میں سیاسی اور فوجی معاملات کے درمیان موجود حساس تعلقات کو بے نقاب کرتا ہے۔ حکومتی اراکین نے اعتراض کیا کہ ایک غیر شائع شدہ کتاب کا حوالہ دینا پارلیمانی قواعد کی خلاف ورزی ہے۔ نتیجتاً کارروائی دن بھر کیلئے ملتوی کر دی گئی۔

یہ سارا تنازع 2020 کے موسمِ گرما میں لداخ کے دریائے گالوان کے کنارے پیش آنے والے تصادم سے جڑا ہوا ہے۔ لداخ کے دریائے گالوان کے کنارے بھارت اور چین کے درمیان مہلک تصادم ہوا، جو 1975 کے بعد سب سے مہلک فوجی جھڑپ تھی۔ اس جھڑپ میں 20 ہندوستانی اور کم از کم 4 چینی فوجی ہلاک ہوئے۔ یہ تصادم محض سرحدی جھڑپ نہیں تھی بلکہ دو ایٹمی طاقتوں کے درمیان کشیدگی کا نازک ترین مرحلہ تھا۔ برسوں کی فوجی اور سفارتی بات چیت کے بعد 2024 میں دونوں فریقوں نے متاثرہ سرحدی علاقوں سے مرحلہ وار دستبرداری پر اتفاق کیا، تاہم سیاسی سطح پر اس بحران کی ذمہ داری اور حکمت عملی پر بحث ختم نہ ہو سکی اور سیاسی و عسکری حلقوں میں تشویش اور الزامات کا سلسلہ جاری رہا۔

نروانے کے مطابق، جب چینی ٹیک ہندوستانی پوزیشنز پر آگے بڑھے، انہیں کہا گیا کہ وہ "جو مناسب سمجھیں وہ کریں"۔ نروانے نے وزیر دفاع راج ناتھ سنگھ کو متعدد بار فون کیا، جس کے ذریعے وزیر اعظم مودی کی طرف سے پیغام پہنچایا گیا، لیکن فیصلہ نروانے پر چھوڑ دیا گیا۔ گاندھی نے کہا "میں واقعی میں تنہا محسوس کر رہا تھا۔ مجھے پوری اسٹیبلشمنٹ نے چھوڑ دیا تھا۔" یہ بیان فوجی قیادت کی خود مختاری اور سیاسی قیادت کی تاخیر کے درمیان تضاد کی



واضح تصویر پیش کرتا ہے۔

راہول گاندھی کے مطابق یادداشت میں درج ہے کہ جب چینی ٹینک بھارتی پوزیشنوں کی جانب بڑھے تو جنرل نروانے کو کہا گیا کہ وہ "جو مناسب سمجھیں وہ کریں"۔ اس بیان کی سیاسی معنویت یہ تھی کہ اعلیٰ سیاسی قیادت نے واضح ہدایات کی بجائے فیصلہ عسکری قیادت پر چھوڑ دیا۔ مزید یہ کہ گاندھی نے دعویٰ کیا کہ نروانے نے وزیر دفاع کو متعدد بار فون کیا، جن کے ذریعے مودی کو پیغام پہنچایا گیا، مگر حتمی فیصلہ ان ہی کے سپرد رہا۔ گاندھی نے اس کیفیت کو یوں بیان کیا کہ وہ

خود کو "تہا محسوس کر رہے تھے، گویا پوری اسٹیبلشمنٹ نے چھوڑ دیا ہو"۔ اگرچہ یہ الفاظ نروانے کے مبینہ احساس کی ترجمانی کے طور پر پیش کیے گئے، مگر انہوں نے سیاسی ایوان میں ارتعاش پیدا کر دیا۔

حکومت کا موقف واضح تھا: ایک غیر مطبوعہ مصدقہ کتاب کا حوالہ دینا پارلیمانی آداب کے منافی ہے۔ وزیر دفاع نے کہا کہ جس کتاب کا حوالہ دیا جا رہا ہے اسے ایوان کے سامنے پیش کیا جائے، کیونکہ وہ ابھی شائع ہی نہیں ہوئی۔ پارلیمانی امور کے وزیر کرن راجیو نے بھی تنبیہ کی کہ جو بات سچ ثابت نہ ہو اور قواعد کے تحت جائز نہ ہو، اسے زبردستی ایوان میں نہیں لایا جانا چاہیے۔ تاہم گاندھی کو تقریر جاری رکھنے کی اجازت بھی دی گئی۔ یہ موقف پارلیمانی قوانین اور آئینی حدود کے تناظر میں سیاسی مباحثے کی حفاظتی جہت کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ موقف دراصل پارلیمانی خود مختاری اور قومی سلامتی کے درمیان ایک حد فاصل کھینچنے کی کوشش تھی۔ حکومتی اراکین کا کہنا تھا کہ فوجی معاملات کو سیاسی پوائنٹ اسکورنگ کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیے۔

دوسری جانب کانگریس کا کہنا تھا کہ سابق آرمی چیف کی یادداشت ایک مستند ماخذ ہے، اور اگر اس میں درج نکات قومی سلامتی سے متعلق اہم سوالات اٹھاتے ہیں تو انہیں زیر بحث لانا جمہوری حق ہے۔ یہ بھی واضح کیا گیا کہ چین کے معاملے پر حکومت کو پہلے بھی تنقید کا سامنا رہا ہے اور یہ کوئی نیا موضوع نہیں۔

گاندھی نے پارلیمنٹ کے باہر صحافیوں کے سامنے غیر مطبوعہ کتاب کی ایک کاپی دکھاتے ہوئے کہا کہ قائمہ حکم یہ تھا کہ اگر چینی فوجی اعلیٰ قیادت سے پوچھے بغیر بھارتی حدود میں داخل ہوں تو ان پر گولی نہ چلائی جائے۔ یہ بیان سیاسی سطح پر نہایت حساس سمجھا گیا کیونکہ اس میں عسکری حکمت عملی اور سیاسی احتیاط کے درمیان ایک ممکنہ تضاد کی جھلک تھی اور سیاسی فیصلوں کے درمیان تضاد کی نشاندہی کرتا ہے اور عوامی شفافیت کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔

ہنگامہ صرف ایک دن تک محدود نہ رہا۔ اگلے روز بھی کارروائی متاثر ہوئی اور احتجاج کے باعث ماحول کشیدہ رہا۔ پیر کو کارروائی دن بھر کیلئے ملتوی ہوئی، مگر منگل کو خلل دوبارہ جاری رہا۔ حزب اختلاف نے احتجاج نے ایوان کو غیر متوقع صورت حال سے دوچار کیا اور کانگریس کے 8 ممبران کو بدتمیزی کے الزام میں معطل کر دیا گیا۔ یوں ایک غیر مطبوعہ کتاب نے نہ صرف بحث چھیڑی بلکہ عملی سیاسی نتائج بھی پیدا کیے۔ یہ واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ فوجی اور سیاسی تنازعات کے موضوعات نہ صرف قانونی بلکہ سماجی اور ادبی نقطہ نظر سے بھی حساس ہوتے ہیں۔ یہ صورت حال اس امر کی علامت تھی کہ بھارت کی سیاست میں فوجی معاملات محض دفاعی حکمت عملی کا مسئلہ نہیں بلکہ سیاسی بیانیے کا حصہ بھی بن چکے ہیں۔

اس پورے واقعے نے ایک بنیادی سوال کو اجاگر کیا: عسکری اور سیاسی قیادت کے درمیان ذمہ داری کی حد کہاں شروع ہوتی ہے اور کہاں ختم؟ جمہوری نظام میں فوج سیاسی قیادت کے ماتحت ہوتی ہے، مگر عملی میدان میں فیصلوں کی رفتار اور دباؤ بعض اوقات قیادت کو غیر معمولی صورتحال سے دوچار کر دیتے ہیں۔ اگر واقعی فیصلہ عسکری قیادت پر چھوڑا گیا تو یہ اعتماد کی علامت بھی ہو سکتا ہے اور غیر یقینی کا مظہر بھی — یہ تعبیر سیاسی زاویے پر منحصر ہے۔ اسی لیے یہ یادداشت محض ایک کتاب نہیں بلکہ اقتدار اور اختیار کے تعلق کی عکاس بن گئی ہے۔ یادداشت 2024 میں شائع ہونے کیلئے تیار تھی، مگر پبلشر اور وزارت دفاع کے درمیان مطلوبہ منظوری کی تاخیر نے اسے غیر مطبوعہ رکھا۔ نروانے نے کہا: "میرا کام کتاب لکھنا اور پبلشر کو دینا تھا، اب اسے آگے بڑھانا ان کا کام ہے۔" یہ مؤقف دراصل اسی پیچیدگی کی طرف اشارہ ہے جو ادبی اور تاریخی مواد کی حساسیت، اور منظوری کے مراحل کی پیچیدگی واضح کرتا ہے۔ کتاب کی اشاعت میں تاخیر نے اس بحث کو مزید پیچیدہ بنا دیا۔ ایک طرف عسکری حساسیت اور آپریشنل رازداری کا تقاضا، دوسری طرف تاریخ کے ریکارڈ کا حق — ان دونوں کے درمیان توازن قائم کرنا آسان نہیں۔ غیر مطبوعہ مخطوطہ جب سیاسی مباحثے کا حصہ بن جائے تو وہ محض ادبی متن نہیں رہتا بلکہ طاقت کے توازن کا استعارہ بن جاتا ہے۔

یہ واقعہ فوجی قیادت اور سیاسی قیادت کے تعلقات کے نازک توازن، قومی سلامتی، اور تاریخی ریکارڈ کے درمیان تعلق کی گہرائی کو ظاہر کرتا ہے۔ نروانے کی یادداشت ایک آئینہ ہے جس میں اہم فیصلے، بحران اور ذمہ داری کی تہیں جھلکتی ہیں۔ یہ نہ صرف ایک دستاویزی کتاب ہے بلکہ فکری اور تہذیبی کشمکش کا آئینہ بھی ہے، جہاں ہر لفظ، ہر استعارہ اور ہر محاورہ قوم کی بقا اور قیادت کی ذمہ داری کے درمیان پل کا کردار ادا کرتا ہے۔ یہ واقعہ کئی سطحوں پر اہم ہے۔

اول، اس نے 2020 کے بحران کی یاد تازہ کر دی اور اس کی ذمہ داری کے سوال کو دوبارہ زندہ کیا۔
دوم، اس نے پارلیمانی قواعد اور اظہارِ رائے کی حدود کو موضوعِ بحث بنایا۔
سوم، اس نے عسکری و سیاسی قیادت کے تعلق کو عوامی مکالمے کا حصہ بنا دیا۔

تاریخ میں ایسے واقعات قوموں کے اجتماعی حافظے میں دیرپا اثر چھوڑتے ہیں۔ یہ محض ایک پارلیمانی جھڑپ نہیں بلکہ قومی بیانیے کی تشکیل کا مرحلہ بھی ہے۔ اقتدار کی راہداریوں میں لیے گئے فیصلے اکثر دیر سے سمجھ میں آتے ہیں۔ کبھی ایک جملہ برسوں بعد سوال بن کر ابھرتا ہے، کبھی ایک خاموشی پوری تاریخ کا بوجھ اٹھالیتی ہے۔ یہ واقعہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ طاقت، اختیار اور قومی ذمہ داری کی دنیا میں ہر لمحہ اہم ہے، ہر فیصلہ اثر رکھتا ہے، اور ہر خاموشی بھی فکری جہت رکھتی ہے۔ جنرل نروانے کی غیر مطبوعہ یادداشت اور اس پر اٹھنے والا پارلیمانی طوفان ہمیں یہی یاد دلاتا ہے کہ قومی سلامتی صرف سرحدوں کا تحفظ نہیں بلکہ اعتماد، شفافیت اور ذمہ داری کا نام بھی ہے۔ نروانے کی یادداشت اور پارلیمانی ہنگامہ نہ صرف فوجی و سیاسی تعلقات کی پیچیدگی کو عیاں کرتے ہیں بلکہ یہ بھی دکھاتے ہیں کہ تاریخ کے صفحات محض حقائق کی فہرست نہیں، بلکہ انسانی فیصلے، اخلاقی سوالات، اور قومی تقدیر کی کشمکش کا آئینہ بھی ہیں۔

یہ واقعہ اس حقیقت کا آئینہ ہے کہ جمہوریت میں فوجی اور سیاسی قیادت کے درمیان توازن نہایت نازک ہوتا ہے۔ اگر یہ توازن برقرار رہے تو ریاست مضبوط رہتی ہے، اور اگر اس میں دراڑ پڑ جائے تو سوالات نسلوں تک پیچھا کرتے ہیں۔ یوں یہ داستان ہمیں محض ایک کتاب یا ایک بحث کی خبر نہیں دیتی، بلکہ یہ باور کراتی ہے کہ تاریخ کی عدالت میں نہ الفاظ گم ہوتے ہیں اور نہ فیصلے۔ ہر عہد کو اپنے فیصلوں کا حساب دینا ہوتا ہے — اور یہی تاریخ کا سب سے

بڑا سبق ہے۔

یہ رپورٹ ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم صرف واقعات کا مشاہدہ نہ کریں بلکہ ان کے پیچھے چھپی ذمہ داری، قربانی، اور فکری جہت کو بھی سمجھیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ یادداشت اور اس کے گرد ہونے والا ہنگامہ، تاریخی، سیاسی اور ادبی لحاظ سے، قاری کے دل و دماغ پر دیرپا اثر چھوڑتا ہے، اور اسے ایک قوم کی تقدیر، قیادت کی ذمہ داری اور انسانی شعور کے درمیان تعلق کا احساس دلاتا ہے۔

جمعۃ المبارک 24 رمضان الکرم 1447ھ 13 مارچ 2026ء

بدلتی عالمی بساط اور پاکستان کا امتحان

آج میں آپ کی توجہ ایک ایسی بین الاقوامی پیش رفت کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جو بظاہر ایک تجارتی معاہدہ ہے، مگر درحقیقت جنوبی ایشیا اور عالمی سیاست کے توازن میں ایک معنی خیز تبدیلی کی علامت ہے۔ امریکا اور انڈیا کے درمیان حالیہ تجارتی معاہدہ، جس کے تحت انڈین مصنوعات پر امریکی ٹیرف کو کم کر کے 18% کیا گیا ہے۔ محض معاشی رعایت نہیں، بلکہ ایک واضح تزویراتی پیغام ہے۔ یہ پیغام چین، روس، اور پورے خطے مضمرات پاکستان تک بھی پہنچتے ہیں۔ کیلئے ہے، اور اس کے

امریکا اور انڈیا کے درمیان حالیہ تجارتی معاہدہ ایک معاشی رعایت نہیں، بلکہ فورس ملٹی پلائر ہے۔ اور فورس ملٹی پلائر ہمیشہ میدانِ جنگ سے پہلے معیشت میں تیار کیے جاتے ہیں۔ یہ معاہدہ اس حقیقت کو اجاگر کرتا ہے کہ امریکا اب انڈیا کو محض ایک منڈی نہیں، بلکہ ایک اسٹریٹیجک ستون کے طور پر دیکھ رہا ہے۔ بالخصوص خطے میں پاک چین کے بڑھتے ہوئے اثر کے تناظر میں۔ تاریخ ہمیں سکھاتی ہے کہ جب کسی ایک ریاست کو بیرونی سرپرستی کے ذریعے غیر معمولی تقویت دی جاتی ہے، تو خطے میں عدم توازن جنم لیتا ہے۔ برصغیر کی تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ جب بھی کسی ایک ریاست کو بیرونی سرپرستی کے ذریعے غیر معمولی تقویت ملی، خطے میں عدم استحکام نے جنم لیا۔ موجودہ امریکا۔ انڈیا تجارتی معاہدہ اسی تاریخی تسلسل کی ایک نئی کڑی ہے، جسے محض اقتصادی واقعہ سمجھنا سیاسی سادگی ہوگی۔

عالمی سیاست کے افق پر ایک اور معاہدہ اس شان سے نمودار ہوا ہے کہ گویا الفاظ کم اور مفہوم زیادہ ہیں۔ امریکا اور انڈیا کے مابین تازہ تجارتی معاہدہ محض دوریاستوں کے درمیان معاشی ہم آہنگی نہیں، بلکہ عالمی طاقت کے توازن میں ایک نیازاویہ ہے۔ امریکا اور انڈیا کے درمیان تازہ تجارتی معاہدہ، جس کے تحت انڈین مصنوعات پر امریکی ٹیرف کو کم کرنا محض معاشی پیش رفت نہیں بلکہ عالمی اور علاقائی طاقت کے توازن میں ایک معنی خیز تبدیلی ہے۔ امریکا نے انڈیا سے درآمد کی جانے والی اشیاء پر عائد ٹیرف کو کم کر کے 18 فیصد کر دیا ہے۔ یہ اعلان بظاہر معاشی نوعیت کا ہے، مگر اس کے باطن میں سیاست، حکمتِ عملی اور طاقت کے کئی دھارے بہہ رہے ہیں۔

انڈین مصنوعات پر امریکی ٹیرف کو 18 فیصد تک کم کرنا انڈیا کی برآمدی صلاحیت، زرمبادلہ اور صنعتی بنیاد کو تقویت دے گا۔ یہ تقویت بالواسطہ طور پر دفاعی بجٹ، درمیانی سے طویل مدتی خطرہ، ایسیلی فائر، اور فورس سٹرکچر میں منتقل ہوگی۔ یہ ایک فوری نہیں مگر یقینی تبدیلی ہے۔ یہ معاہدہ، روس۔ یوکرین جنگ، چین۔ امریکا مسابقت، اور جنوبی ایشیا کی جغرافیائی حساسیت کے پس منظر میں غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ پاکستان، جو جغرافیہ، تاریخ اور سیاست کے سنگم پر کھڑا ہے، اس تبدیلی سے غیر متعلق نہیں رہ سکتا۔ ایسے فیصلے براہِ راست نہ سہی، بالواسطہ طور پر خطے کی نبض پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

ٹرمپ اور مودی نے اس فیصلے کا اعلان سوشل میڈیا کے ذریعے کیا۔ یہ بھی ہمارے عہد کی ایک علامت ہے کہ اب تاریخ کے فیصلے ایوانوں سے نکل کر ڈیجیٹل دیواروں پر لکھے جا رہے ہیں۔ ٹرمپ نے ”ٹرو تھ سوشل“ پر واضح کیا کہ امریکا اور انڈیا کے درمیان تجارتی معاہدہ طے پا گیا ہے۔ امریکا انڈیا کو بتدریج ایک اقتصادی، تزویراتی اور عسکری شراکت دار کے طور پر مضبوط کر رہا ہے، جس کا بنیادی مقصد چین کے اثر کو محدود کرنا ہے۔ اس تناظر میں انڈیا کی معاشی تقویت، خطے میں طاقت کے عدم توازن کو جنم دے سکتی ہے، جس کے براہِ راست اثرات پاکستان کی سلامتی پر مرتب ہوں گے۔ ٹیرف

میں کمی انڈین برآمدات کیلئے نئی راہیں کھولے گی، جس سے انڈیا کی معاشی قوت میں اضافہ متوقع ہے۔ تاریخ کا سبق یہ ہے کہ برصغیر میں معاشی برتری اکثر عسکری اور سفارتی خود اعتمادی میں بدل جاتی ہے۔ پاکستان کو اس پہلو سے ہوشیار رہنا ہو گا کہ معاشی عدم توازن کہیں اسٹریٹیجک عدم توازن میں تبدیل نہ ہو۔

امریکا اس وقت تین محاذوں پر بیک وقت سرگرم ہے۔ چین کا پھیلتا ہوا اثر، روس کو یوکرین جنگ کے ذریعے محدود کرنا، انڈیا کو ایک قابل اعتماد علاقائی ستون بنانا، انڈیا کو دی جانے والی تجارتی رعایتیں اسی بڑے فریم ورک کا حصہ ہیں۔ یہ اقدام چین کے خلاف کنٹینمنٹ آرکیٹیکچر کا حصہ ہے۔ انڈیا کو معاشی طور پر مضبوط کر کے امریکا خطے میں ایک ایسا شراکت دار چاہتا ہے جو خود لڑے، خود خرچ کرے اور امریکی اسٹریٹیجک اہداف کو سہارا دے۔ اس تناظر میں پاکستان بنیادی اتحادی نہیں بلکہ حالات کے ساتھی کے درجے میں رکھا جا رہا ہے۔ انڈیا کی ممکنہ معاشی مضبوطی کا براہ راست اثر اس کی عسکری خود اعتمادی اور سفارتی جارحیت پر پڑ سکتا ہے۔ پاکستان کیلئے یہ لمحہ جذباتی رد عمل کا نہیں، بلکہ ٹھنڈے دل اور کھلی آنکھ سے جائزہ لینے کا ہے۔ یاد رہے کہ امریکا-انڈیا معاہدہ ایک یاد دہانی ہے کہ دنیا تیزی سے بدل رہی ہے۔ پاکستان کیلئے راستہ وہی ہے جو توازن، وقار اور بصیرت سے نکلتا ہو۔ اندھی وابستگی، نہ غیر ضروری محاذ آرائی۔

اس معاہدے کے ساتھ ہی انڈیا پر روسی تیل کی خریداری کے باعث اضافی ٹیرف عائد کیا گیا ہے۔ یہ اقدام ہمیں یاد دلاتا ہے کہ عالمی سیاست میں دوستی مستقل نہیں ہوتی۔ صرف مفاد مستقل ہوتا ہے۔ پاکستان کیلئے اس میں واضح سبق ہے کہ توانائی، تجارت اور خارجہ پالیسی کو الگ الگ خانوں میں نہیں رکھا جاسکتا۔ یہ معاہدہ اس امر کی یاد دہانی ہے کہ امریکا، انڈیا کو محض ایک تجارتی شراکت دار نہیں بلکہ چین کے مقابل ایک تزویراتی ستون کے طور پر دیکھتا ہے۔ اس تناظر میں پاکستان کیلئے چیلنج یہ ہے کہ وہ خود کو کسی بلاک کی محض توسیع کی بجائے ایک خود مختار اور قابل اعتماد ریاست کے طور پر پیش کرے۔

اس اعلان کی بازگشت اس لیے بھی غیر معمولی ہے کہ گزشتہ برس کے دوران امریکا اور انڈیا کے تعلقات کئی نشیب و فراز سے گزرے۔ کبھی قربت کی بات ہوئی، کبھی فاصلے کی دھمکی۔ ایسے میں امریکی سفیر سرجیو گورکایہ کہنا کہ ”صدر ٹرمپ وزیر اعظم مودی کو واقعی ایک اچھا دوست سمجھتے ہیں۔“ محض سفارتی جملہ نہیں بلکہ ایک سیاسی پیغام ہے۔ اس معاہدے کے تحت انڈیا نہ صرف امریکا کے ساتھ اپنی ٹیرف اور نان ٹیرف رکاوٹوں کو کم کرے گا بلکہ ’بائے امیریکن‘ پالیسی کے تحت امریکی مصنوعات کی بڑے پیمانے پر خریداری کا بھی پابند ہو گا۔ توانائی، ٹیکنالوجی، زراعت، کونلمہ اور دیگر شعبوں میں 500 ارب ڈالر سے زائد کی خریداری کا عہدہ دراصل امریکی معیشت کیلئے ایک تازہ خون ہے۔

انڈیا کی برآمدی معیشت میں اضافے سے دفاعی اخراجات بڑھنے کا امکان، امریکا-انڈیا قربت کے باعث پاکستان پر سفارتی دباؤ میں اضافہ، خطے میں عسکری بیانیے کی نئی تشکیل، جس میں پاکستان کو محتاط کردار ادا کرنا ہو گا۔ انڈیا اس معاہدے کو عالمی سطح پر اپنی قبولیت، اہمیت اور داخلی سطح پر معاشی کامیابی کے طور پر پیش کرے گا۔ اس کے نتیجے میں عسکری خود اعتمادی میں اضافہ، خطے میں زیادہ جارحانہ پالیسی اور پاکستان کے خلاف بیانیے میں سختی کا امکان موجود ہے۔ علاوہ ازیں انڈیا پر روسی تیل کے باعث اضافی ٹیرف یہ واضح پیغام ہے کہ اسٹریٹیجک خود مختاری کی حد وہیں ختم ہو جاتی ہے جہاں امریکی مفاد شروع ہوتا ہے۔

پاکستان کیلئے سبق واضح ہے کہ توانائی، سپلائی چین اور دفاعی وابستگیوں میں فالتو پن اور تنوع ناگزیر ہے۔ اسی دوران ایک اور فیصلہ سامنے آیا جو اس معاہدے کے مزاج کو سمجھنے میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ امریکا نے روس سے انڈیا کی تیل کی خریداری پر 25 فیصد اضافی ٹیرف عائد کر دیا، جس کے بعد یہ مجموعی طور پر 50 فیصد تک جا پہنچا یہ اقدام بظاہر معاشی دباؤ ہے، مگر درحقیقت یوکرین جنگ کے تناظر میں روس کو تنہا کرنے کی کوشش کا ایک نیا باب ہے۔

انڈیا پر روسی تیل کے باعث عائد اضافی ٹیرف دراصل واشنگٹن کا یہ پیغام تھا کہ اب دوستی بھی شرائط کے ساتھ ہوگی۔ پاکستان کیلئے اس میں یہ سبق مضمحل ہے کہ خارجہ پالیسی میں توانائی، تجارت اور سیاست کو ایک دوسرے سے الگ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا۔ ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ پاک-بھارت کشیدگی کے دوران بعض مغربی بیانیے دفاعی منڈی کی سیاست سے جڑے رہے۔ یہ صورت حال پاکستان کیلئے ایک موقع بھی ہے کہ وہ خود کو محض عسکری طاقت کے طور پر نہیں، بلکہ علاقائی استحکام کے ذمہ دار فریق کے طور پر پیش کرے۔

ماضی قریب میں انڈین فضائی ناکامیوں کا مغربی بیانیہ محض عسکری تجزیہ نہیں تھا۔ یہ اسلحہ سازی کی عالمی منڈی میں امریکی اسلحہ کی برتری کا پیغام بھی تھا جس سے فرانسیسی پلٹ فارمز کی ساکھ کمزور ہوئی، امریکی سسٹمز کو متبادل کے طور پر پیش کیا گیا جبکہ پاکستانی عسکری فتح میں امریکی اسلحہ کا کوئی حصہ نہیں تھا بلکہ پاک چین کی نئی عسکری دانش کا کمال تھا۔



جبکہ دوسری طرف انڈیا آئندہ دفاعی حصول میں زیادہ امریکی انحصار کی طرف جائے گا، جس سے انٹر آپریشنلٹی بڑھے گی، انٹیلی جنس شنیرنگ بڑھے گی اور پاکستان کے خلاف نیٹ ورک میں مدد ملے گی۔ اب یہ واضح ہو گیا ہے کہ پاکستان کا اصل چیلنج صرف انڈیا ہی نہیں بلکہ بدلتی عالمی ترجیحات میں اپنی افادیت کو برقرار رکھنا ہے۔ صرف سلامتی کے دلائل اب کافی نہیں؛ معاشی، سفارتی اور تکنیکی وزن ناگزیر ہو چکا ہے۔ ان حالات میں جہاں پاکستان کیلئے چین کے ساتھ اسٹریٹیجک ہم آہنگی کو مزید گہرائی دینے کا موقع

ضروری ہو گیا ہے وہاں غیر جانبدار اور متوازن سفارت کاری کے ذریعے امریکا اور یورپ میں اعتماد سازی، علاقائی استحکام کے داعی کے طور پر پاکستان کے کردار کو اجاگر کرنے کا امکان بھی میسر آ گیا ہے۔

پاک-بھارت کشیدگی کے دوران انڈین طیاروں اور مغربی اسلحہ کی کارکردگی پر امریکی بیانیہ دراصل دفاعی منڈی کی سیاست تھی۔ پاکستان کیلئے یہ ایک موقع بھی ہے کہ وہ اپنی دفاعی صلاحیت اور عسکری تجربے کو محض طاقت نہیں بلکہ توازن کی علامت کے طور پر دنیا کے سامنے رکھے۔ ٹرمپ نے خود اس فیصلے کے پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا کہ مودی سے بات کرنا ان کیلئے اعزاز کی بات تھی۔ انہوں نے مودی کو ایک طاقتور اور قابل احترام رہنما قرار دیا اور یہ بھی واضح کیا کہ بات چیت میں تجارت کے ساتھ ساتھ روس-یوکرین جنگ کے خاتمے پر بھی گفتگو ہوئی۔

امریکا-انڈیا قربت خود بخود چین-پاکستان اسٹریٹیجک ہم آہنگی کو گہرا کرتی ہے تاہم دانش مندی کا تقاضا ہے کہ یہ تعلق محض رد عمل پر نہیں بلکہ طویل المدت مفاد پر قائم ہو مگر عالمی سطح پر ”ایک بلاک کے حصہ“ کے تاثر سے بچا جائے ورنہ علاقائی خود مختاری کم ہو جائے گی۔ پاکستان کو چین کے ساتھ

معاشی، تکنیکی اور سفارتی تعاون کو ایک ہمہ جہتی حکمت عملی میں ڈھالنا ہو گا۔ چین پاکستان کا فطری اسٹریٹیجک شراکت دار ہے، مگر اس تعلق کو محض عسکری سطح تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ معاشی خود انحصاری کے منصوبوں سے جوڑا جائے۔ چین کے ساتھ تعلقات میں احتیاط اور توازن برقرار رکھا جائے اور آنے والے وقت میں خطے میں پاکستان چین کا محور ہونے جا رہا ہے جس کیلئے ابھی سے تیاری کی ضرورت ہے۔ چین کے ساتھ ہماری شراکت داری ہماری تزویراتی حقیقت ہے، مگر اس تعلق کو ردِ عمل کی بنیاد پر نہیں بلکہ طویل المدت قومی مفاد کی بنیاد پر آگے بڑھانا ہو گا۔ چین کے ساتھ تعاون میں معاشی خود انحصاری، ٹیکنالوجی اور علاقائی رابطہ کاری کو مرکزی حیثیت دینا ناگزیر ہے۔

اسی گفتگو کے نتیجے میں انڈیا نے روسی تیل کی خریداری روکنے اور متبادل کے طور پر وینزویلا سے مزید تیل لینے پر آمادگی ظاہر کی۔ امریکی صدر کے بقول، یہ فیصلہ یوکرین میں جاری خونریزی کو روکنے میں مدد دے سکتا ہے، جہاں ہر ہفتے ہزاروں زندگیاں مٹ رہی ہیں۔ یوں ایک تجارتی معاہدہ اخلاقی جواز کے لبادے میں پیش کیا گیا۔ جس کیلئے ضروری ہو گیا ہے کہ ہم فوری طور پر ان اقدامات کی طرف توجہ دیں:

اسی کے ساتھ، امریکا کے ساتھ ہمارے تعلقات کو بھی از سر نو متوازن بنیادوں پر استوار کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں دفاعی بیانیے سے آگے بڑھ کر تجارت، سرمایہ کاری اور علاقائی استحکام کے نکات کو مرکز گفتگو بنانا ہو گا۔ امریکا کے ساتھ روابط کی از سر نو تشکیل، خارجہ، دفاع اور معیشت پر مشتمل مشترکہ قومی حکمت عملی، امریکا کے ساتھ با مقصد مگر خود ار سفارتی مکالمہ، دفاع کے ساتھ تجارت اور سرمایہ کاری کو مرکزی حیثیت دینی ہو گی۔

پاکستان کو امریکا کے ساتھ تعلقات میں انسداد دہشت گردی کے بیانیے سے آگے بڑھ کر معاشی شراکت داری کی بات کرنا ہو گی اور سفارت کاری کو ادارہ جاتی بنیادوں پر استوار کرنا ہو گا۔ دوسری طرف چین کے ساتھ تعاون میں معاشی اور تکنیکی پہلو کو ترجیح دیتے ہوئے خطے میں کشیدگی کم کرنے کیلئے فعال سفارت کاری کا فوری آغاز کرنا ہو گا۔

اسی تناظر میں ایران کے گرد بڑھتے ہوئے جنگی خطرات میں بظاہر کمی کے اشارے دیے جا رہے ہیں۔ سفارتی زبان میں یہ عندیہ دیا جا رہا ہے کہ معاملہ تصادم کے بجائے گفت و شنید سے حل کیا جائے گا۔ یہ تبدیلی یا تو ایرانی حکومت کو بدلنے کی ناکام کوششوں کے بعد امریکی پسپائی کی علامت ہے، یا پھر مشرق وسطیٰ میں عرب ممالک، بالخصوص سعودی عرب، کی طرف سے ایرانی صدر کو اپنی سر زمین استعمال نہ کرنے کی یقین دہانی کا نتیجہ۔

ایران اور مشرق وسطیٰ کے حوالے ایران پر وقتی سفارتی نرمی، خطے میں آپریشنل اسپیس پیدا کرتی ہے۔ ایران کے حوالے سے امریکی سفارتی نرمی خطے میں ایک عارضی سکون کا عندیہ ہے۔ پاکستان، جو ایران، عرب دنیا اور مغرب تینوں سے تعلقات رکھتا ہے، اس مرحلے پر پل کا کردار ادا کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس کی سفارت کاری فعال اور متوازن ہو۔ اسٹریٹیجک اسپیس کے اس زریں موقع کو مغربی سرحد پر دباؤ کم کرنے توانائی اور لاجسٹکس کے متبادل راستے محفوظ کرنے کیلئے استعمال کرے۔ یہ اسپیس عارضی ہے۔ اسے استعمال کرنا ہو گا۔

یہ معاہدہ پاکستان کیلئے ایک آئینہ بھی ہے کہ عالمی سیاست میں وہی ملک سنا جاتا ہے جو معاشی طور پر قابلِ اعتبار ہو۔ محض جغرافیائی اہمیت اب کافی نہیں۔ پاکستان کو اپنی تجارت، برآمدات اور سرمایہ کاری کے ماحول کو قومی سلامتی کے تناظر میں دیکھنا ہو گا۔ پاکستان کیلئے یہ مرحلہ ردِ عمل کا نہیں بلکہ دور اندیش فیصلوں کا تقاضا کرتا ہے۔ قومی سلامتی کا اصل تقاضا یہی ہے کہ طاقت کو حکمت کے تابع رکھا جائے، نہ کہ حکمت کو طاقت کے تابع۔ ایران کے حوالے سے امریکی چوک پاکستان کیلئے ایک موقع ہے کہ وہ علاقائی رابطہ کاری کو فروغ دے، توانائی اور تجارت کے منصوبوں میں توازن پیدا کرے، خود

کو ایک ذمہ دار ثالث کے طور پر منوائے۔ ایران اور مشرق وسطیٰ کے حوالے سے حالیہ سفارتی اشارے پاکستان کیلئے ایک موقع فراہم کرتے ہیں کہ وہ ایک پل کا کردار ادا کرے۔ نہ محاذ آرائی، نہ لاطعلقی، بلکہ ذمہ دار ثالثی۔

اس تناظر میں ہماری ترجیحات واضح ہونی چاہئیں:

کوالٹیٹیو اتج، الیکٹر انک وارفیز، آئی ایس آر اور ملٹی ڈومین ڈیٹرنس صرف روایتی نہیں بلکہ فضائی اور میزائل دفاع میں اعلیٰ اور برتری کی مثال ہونا ضروری ہیں کیونکہ بیانیے کی جنگ میں خاموشی نقصان دہ ثابت ہوتی ہے اور اس کا عملی اظہار انتہائی ضروری ہے جو گاہے بگاہے اپنے تجربات کی روشنی میں دنیا کو آگاہ کرنا ایک بہترین پالیسی ہے۔

سب سے اہم نکتہ داخلی استحکام بطور تزویراتی ضرورت بن چکا ہے۔ کوئی بھی خارجی یا دفاعی حکمت عملی اس وقت تک بار آور نہیں ہو سکتی جب تک معیشت مستحکم نہ ہو، سیاسی ہم آہنگی موجود نہ ہو، ریاستی بیانیہ واضح اور متفقہ نہ ہو۔ یہ نکات قومی سلامتی کے بنیادی ستون ہیں۔ ہمیں یہ حقیقت کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ قومی سلامتی صرف سرحدوں پر نہیں بنتی۔ یہ معیشت، سیاست اور سفارت کے باہمی توازن سے وجود میں آتی ہے۔ داخلی استحکام، سیاسی ہم آہنگی اور واضح قومی بیانیہ ہی ہماری اصل طاقت ہیں۔

مودی کا یہ کہنا کہ ”جب دنیا کی دو بڑی معیشتیں اور سب سے بڑی جمہوریتیں مل کر کام کرتی ہیں تو اس سے باہمی فائدے کے بے شمار مواقع پیدا ہوتے ہیں“۔ درحقیقت عالمی سیاست میں انڈیا کی اس خواہش کی عکاسی ہے کہ وہ خود کو امریکا کے برابر کاشراکت دار ثابت کرے، نہ کہ محض ایک علاقائی طاقت۔ انڈیا اس معاہدے کو اپنی عالمی ساکھ کے طور پر پیش کرے گا۔ پاکستان کیلئے ضروری ہے کہ وہ دفاعی یا جذباتی رد عمل کی بجائے ایک سنجیدہ، مدلل اور مہذب بیانیہ تشکیل دے۔ ایسا بیانیہ جو اسے خطے میں استحکام کی علامت بنائے۔ جس کیلئے ضروری ہے کہ نیشنل اسٹریٹیجک کونسل کا فعال کردار، خارجہ و معاشی پالیسی کا باہمی انضمام، دفاعی تیاری کے ساتھ سفارتی چمک عالمی بیانیے میں پاکستان کو ”استحکام کی ریاست“ کے طور پر پیش کرنا ہے۔

تاہم اس پوری پیش رفت کو اگر گہرائی سے دیکھا جائے تو یہ محض دوستی کی کہانی نہیں بلکہ ایک نوراکشتی بھی ہے۔ ابتدا ہی میں اس اقدام کو ایک سیاسی چال قرار دیا گیا تھا، جو درست ثابت ہوتی نظر آرہی ہے۔ امریکا ایک طرف پاک۔ بھارت کشیدگی میں انڈین طیاروں کی تباہی کا ذکر دہرا کر خطے میں بیانیہ بناتارہا، اور دوسری طرف فرانسیسی رافیل طیاروں کی مایوس کن کارکردگی کو اجاگر کر کے امریکی اسلحے کی منڈی گرم کرتا رہا۔ یاد رہے کہ کوئی بھی تزویراتی فائدہ اس وقت تک پائیدار نہیں ہو تا جب تک داخلی سیاسی اور معاشی استحکام میسر نہ ہو۔ پاکستان کیلئے سب سے بڑا سبق یہی ہے کہ خارجہ کامیابیاں اندرونی کمزوریوں کی تلافی نہیں کر سکتیں۔ داخلی استحکام بطور قومی طاقت کا اظہار ہوتا ہے۔

اس بدلتی بسات میں روس ایک بار پھر شش و پنج میں ہے۔ یوکرین کے معاملے پر یا تو اسے مزید خاموشی اختیار کرنا ہوگی، یا پھر انڈیا کے ساتھ اپنے دیرینہ تعلقات پر نظر ثانی کرنا پڑے گی۔ تاریخ گواہ ہے کہ روس اور انڈیا کے تعلقات جذبات سے زیادہ مفادات پر قائم رہے ہیں۔ یہ معاہدہ نہ صرف امریکا اور انڈیا کے درمیان تجارت کا باب ہے بلکہ عالمی سیاست میں طاقت کے توازن کی ایک نئی تحریر ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو عین درست ہو گا کہ سیاست کے فیصلے وہ نہیں ہوتے جو کہے جائیں، بلکہ وہ ہوتے ہیں جو سمجھے جائیں۔ یہ فیصلہ بھی اسی قبیل سے ہے۔ ظاہر میں تجارت، باطن میں حکمت عملی، الفاظ میں دوستی، حقیقت میں مفاد۔

یہ مرحلہ رد عمل کا نہیں، پیشگی ہم آہنگی / پیشگی معیار بندی کا مرحلہ ہے۔ اگر ہم نے اس معاہدے کو صرف خبر سمجھا، تو ہم دیر سے جاگیں گے۔ اور اگر ہم نے اسے اسٹریٹیجک سنگنل سمجھا، تو ہم اگلا قدم خود طے کریں گے۔ یہی فرق ہے ری ایکٹو فورس اور اسٹریٹیجک اسٹیٹ میں۔ یہ وقت جذباتی نعروں کا نہیں، یہ وقت شکایت کا نہیں، حکمت و تدبر کا ہے۔ یہ لمحہ شور کا نہیں، یہ لمحہ توازن اور تاریخ سے سیکھنے کا ہے، شعور کا ہے۔ اگر پاکستان نے تاریخ کے اس موڑ پر خود کو سمجھ لیا، تو یہی بدلتی دنیا اس کیلئے موقع بن سکتی ہے۔ اس مرحلے پر درست زاویے سے دنیا کو دیکھا تو بدلتی بساط پر وہ محض مہرہ نہیں رہے گا۔ بلکہ ایک باوقار کھلاڑی کے طور پر پہچانا جائے گا۔ اگر ہم نے بدلتی دنیا کو سمجھ کر فیصلے کیے، تو پاکستان اس نئی عالمی بساط پر محض ایک تماشا بنی نہیں رہے گا، بلکہ ایک باوقار اور موثر کردار ادا کرے گا۔ اور اگر نہ سمجھا، تو یہی معاہدے محض دوسروں کی ترقی کی داستان رہ جائیں گے۔ اللہ ہمیں درست فیصلوں کی توفیق عطا فرمائے۔

اللہم آمین

اتوار 26 رمضان الکریم 1447ھ 15 مارچ 2026ء

ایٹمی قیامت کا اندیشہ

مشرق وسطیٰ کی سرزمین صدیوں سے طاقتوں کی کشمکش کا میدان رہی ہے، مگر حالیہ کشیدگی نے اس خطے کو ایک ایسے دہانے پر لاکھڑا کیا ہے جہاں تاریخ کی سانسیں بھی بوجھل محسوس ہوتی ہیں۔ مشرق وسطیٰ کی سرزمین آج پھر تاریخ کے ایک ایسے موڑ پر کھڑی ہے جہاں زمانے کی سانسیں ختم سی گئی ہیں سیاست کے افق پر بارود کی بو پھیلی محسوس ہوتی ہے۔ اور خطے کی سیاست اس وقت ایک ایسے نازک موڑ پر کھڑی ہے جہاں ہر قدم تاریخ کے دامن اور میں نئی ہلچل پیدا کر رہا ہے۔ امریکا اور اسرائیل کی جانب سے ایران پر پے درپے حملوں کے بعد ایران کی جوانی کارروائیوں نے عالمی منظر نامے کو ایک نئے اضطراب سے دوچار کر دیا ہے۔

گویا مشرق وسطیٰ کی سرزمین آج ایک ایسے اضطراب میں مبتلا ہے جس کی گونج تاریخ کے طویل ایوانوں میں سنائی دے رہی ہے۔ طاقت کی سیاست اپنے تمام ہتھیاروں کے ساتھ میدان میں اتر آئی ہے، اور افق پر جنگ کے بادل اس طرح گہرے ہو رہے ہیں جیسے صدیوں کی خاموشی ایک طوفان میں مشرق وسطیٰ کی فضا اس وقت ایسے اضطراب سے لبریز ہے جیسے تاریخ کسی نئے طوفان کے آنے کی آہٹ سن رہی ہو۔ طاقت کی بساط ڈھلنے کو ہو۔ پر مہرے حرکت میں ہیں، سفارت کاری کے ایوانوں میں بے چینی کی سرگوشیاں ہیں، اور عالمی سیاست کے افق پر اندیشوں کے بادل گہرے ہوتے جا رہے ہیں۔

امریکا اور اسرائیل کی جانب سے ایران پر مسلسل حملوں کے بعد ایران کی جوانی کارروائیاں اس امر کی شہادت دے رہی ہیں کہ تہران نے دباؤ کے سامنے سر جھکانے کی بجائے مزاحمت کا پرچم بلند رکھا ہے۔ ایران کی سخت اور بے باک کارروائیوں نے عالمی سیاست کے آسمان پر ایک ایسا طوفان برپا کر دیا ہے جس کی گھن گرج دور دور تک سنائی دے رہی ہے۔ تہران نے سخت دباؤ، سفارتی دبستانوں کی چالاکیوں، دھمکی، میڈیا کے شور اور پروپیگنڈے کے طوفان کے باوجود ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا ہے۔

تہران نے دباؤ، دھمکی اور سفارتی تنہائی کے باوجود ہتھیار ڈالنے سے انکار کر کے یہ واضح کر دیا ہے کہ وہ اس معرکے کو محض ایک جنگ نہیں بلکہ اپنی خود مختاری کی بقا کا سوال سمجھتا ہے۔ امریکا اور اسرائیل کی جانب سے ایران پر مسلسل حملوں کے بعد ایران کی جوانی کارروائیوں نے اس خطے کو ایک ایسی کشیدگی کے دہانے پر لاکھڑا کیا ہے جس کے مضمرات کا اندازہ لگانا آسان نہیں۔ ایسے میں یہ سوال عالمی ضمیر کو بجلی کی طرح کچوکے لگا رہا ہے کہ کیا امریکا وہی ہولناک راستہ اختیار کر سکتا ہے جو دوسری عالمی جنگ کے اختتام پر اس نے جاپان کے شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرا کر لمحوں میں خاکستر کر دیا تھا؟

یہ سوال محض سیاسی قیاس آرائی نہیں بلکہ انسانی تاریخ کے ایک اندوہناک باب کی بازگشت ہے، جو آج کے عالمی ضمیر کو پھر سے جھنجھوڑ رہی ہے۔ اگر تاریخ کی وہ بھیانک بازگشت دوبارہ سنائی دی تو یہ محض ایک عسکری فیصلہ نہیں بلکہ انسانی تہذیب کے ضمیر پر ایک اور زخم ہو گا۔ تاریخ کی وہ لرزہ خیز داستان آج بھی انسانی یادداشت میں ایک ایسے زخم کی مانند موجود ہے جس کی کسک کبھی مدھم نہیں پڑی۔ اگر وہی سانحہ ایک بار پھر دہرایا گیا تو یہ صرف ایک ملک کی تباہی نہ ہوگی بلکہ انسانیت کی پیشانی پر ایک اور سیاہ دھبہ اور تہذیب انسانی کے ضمیر پر ایک اور زخم کا اضافہ ہو گا۔ تاریخ کی وہ لرزہ خیز

داستان آج بھی انسانی ضمیر پر ایک ایسے نقش کی طرح ثبت ہے جسے وقت کی دھول بھی مٹا نہیں سکی۔ اگر تاریخ کی وہ قیامت ایک بار پھر دہرائی گئی تو یہ صرف ایک عسکری فیصلہ نہیں ہو گا بلکہ انسانی تہذیب کے ضمیر پر ایک اور گہرا نمٹ زخم ثبت ہو جائے گا جس کے بعد موجودہ دنیا اک گہری تاریکی اور دھوئیں میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ اس خطے کی سر زمین ہمیشہ عالمی طاقتوں کی کشمکش کا میدان بنی رہی ہے، مگر آج جو منظر نامہ ابھر رہا ہے اس کی سنگینی پہلے سے کہیں زیادہ گہری اور خوفناک محسوس ہوتی ہے۔

جوہری ہتھیار محض جنگی قوت کے مظاہر نہیں بلکہ انسان کی ایجاد کردہ وہ قیامت ہیں جو لمحوں میں شہروں کو بلے اور زندگیوں کو خاموشی میں بدل دیتی ہیں۔ اگر خدا نخواستہ ایران پر ایٹمی حملہ ہو تو تباہی کا وہ منظر نامہ سامنے آئے گا جسے بیان کرنے کیلئے الفاظ بھی کا نپتے ہیں۔ جوہری ہتھیار محض جنگی قوت کی علامت نہیں بلکہ قیامت کے دروازے کی ایک کنجی ہیں۔ جوہری ہتھیار کی تباہی محض بارود کی گھن گرج نہیں ہوتی؛ یہ ایک ایسی خاموش قیامت ہے جس کے اثرات وقت کے دریاؤں میں دو تک بہتے چلے جاتے ہیں۔ ایک لمحہ آتا ہے جب روشنی کا ایک اندھا کر دینے والا شعلہ آسمان کو چیر دیتا ہے، اور پھر شہر، بستیاں اور زندگی کے چراغ یکا یک بجھنے لگتے ہیں۔

اگر خدا نخواستہ ایسا سانحہ رونما ہوتا ہے تو اس کی تباہی کا اندازہ صرف اعداد و شمار سے نہیں لگایا جاسکتا۔ جوہری ہتھیار کی تباہی ایک ایسی آگ ہے جس کی لپٹیں صرف لمحوں میں لاکھوں زندگیاں نگل لیتی ہیں۔ زمین پر بسنے والی تمام مخلوقات ایک ہی آن میں زندگی کی قندیل بجھا بیٹھیں گے۔ فوری ہلاکتیں تو محض اس قیامت کا پہلا منظر ہوں گی؛ جوہری حملہ ایک ایسی قیامت ہے جو لمحوں میں شہر کو بلے میں اور زندگی کو خاموشی میں بدل دیتا ہے۔ ایٹمی ہتھیار محض جنگی قوت کا اظہار نہیں بلکہ قیامت کا ایک استعارہ ہیں۔

خاکم بد بن ایسا ہولناک حادثہ رونما ہو گیا اور ایران کی سر زمین پر ایسی آگ اتری تو لمحوں میں بستیاں خاکستر اور زندگیاں خاموش ہو جائیں گی۔ ہزاروں انسان ایک ہی آن میں مٹی کی آغوش میں جاسوئیں گے، بلکہ راکھ بن سکتے ہیں، مگر اصل المیہ اس کے بعد شروع ہوتا ہے۔ تابکاری کے زخم نسلوں تک جسموں اور زمینوں میں سرایت کرتے رہیں گے۔ تابکاری کی وہ پوشیدہ آگ نسلوں کے جسموں میں نہ صرف بیماریوں کا بیج بودیتی ہے بلکہ زمین کے ذروں، پانی کے قطروں اور فضا کی لہروں میں سرایت کر کے نسلوں تک اپنا اثر چھوڑتی ہے۔ زمین کی زرخیزی کو ماند کر دیتی ہے اور ہوا میں ایک ایسا زہر گھول دیتی ہے جس کی بازگشت دہائیوں تک سنائی دیتی رہتی ہے۔

گویا ایٹمی تباہی صرف ایک ملک کی بربادی نہیں بلکہ انسانیت کے مشترکہ مقدر پر لکھی جانے والی ایک اندوہناک داستان ہوتی ہے۔ پوری دنیا کا مشترکہ المیہ بن جاتی ہے، کیونکہ اس کے اثرات سرحدوں کی دیواریں پھلانگ کر انسانیت کے اجتماعی مقدر کو متاثر کرتے ہیں۔ یہ وہ زخم ہے جو وقت کے مرہم سے بھی مکمل طور پر نہیں بھرتا۔ یوں ایک ایٹمی حملہ صرف ایک قوم کی بربادی نہیں بلکہ پوری دنیا کی اجتماعی تقدیر پر ایک تاریک سایہ ڈال دیتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ایٹمی حملے کے اثرات صرف ایک قوم یا ایک خطے تک محدود نہیں رہتے بلکہ پوری انسانیت کی اجتماعی تقدیر پر ایک تاریک سایہ ڈال دیتے ہیں۔

یوں ایک ایٹمی حملہ صرف ایک ملک کا نہیں بلکہ پوری دنیا کا مشترکہ سانحہ بن جاتا ہے، کیونکہ اس کے اثرات سرحدوں اور سمندروں سے ماورا ہو کر پوری انسانیت کی تقدیر پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ گویا یہ ایسا پتھر ہے جو اگر عالمی جھیل میں پھینکا جائے تو اس کی لہریں دور دور تک پھیلتی چلی جاتی ہیں۔ اور یہ



بھی یاد رکھیں کہ ایران پر اس کے اثرات محض عسکری یا جغرافیائی حدود تک محدود نہ رہیں گے بلکہ اقوام عالم کو اس غلطی کی بھاری قیمت چکانی پڑے گی۔ گویا ایک شہر کی تباہی دراصل پوری انسانیت کے مستقبل کو لرزادتی ہے۔

ایران کے پڑوس میں آباد ممالک بھی اس قیامت خیز منظر نامے سے محفوظ نہیں رہ سکیں گے۔ ایران کے گرد و پیش پھیلا ہوا جغرافیہ بھی اس سانحے سے محفوظ نہ رہ سکے گا۔ خلیج ریاستیں، جو آج عالمی سیاست کے نازک توازن پر قائم ہیں، جن کی معیشتیں اور بستیاں اسی خطے کی فضاؤں سے بندھی ہوئی اور جو آج سیاسی مفادات

کے نازک سہارے پر کھڑی ہیں، تابکاری کے اثرات سے کیسے بچ سکیں گی؟ ایران کے ہمسایہ ممالک ترکی اور پاکستان بھی اسی جغرافیائی دائرے میں سانس لیتے ہوئے بدن ہیں، جہاں سرحدیں کاغذی لکیروں سے زیادہ کچھ نہیں ہوتیں۔ ہوا کی سمتیں اور تابکاری کے بادل کسی سرحد کو نہیں پہچانتے اور ہوا کے دوش پر سفر کرنے والی آفتیں کسی سیاسی معاہدے کی پابند نہیں ہوتیں۔ اور نہ ہی یہ کسی ویزے یا پاسپورٹ کے محتاج ہوتے ہیں۔ ایسے میں وہ عرب حکمران بھی اس ہولناک حقیقت کا سامنا کرنے پر مجبور ہوں گے جنہوں نے سیاسی قربت کے اظہار میں امریکی قیادت، خصوصاً ٹرمپ اور ان کے خاندان کو ہیرے، موتی، شاہانہ قیمتی تحائف اور اعلیٰ اعزازات سے نوازا۔ اگر آگ بھڑک اٹھی تو اس کی تپش دوست اور دشمن دونوں کو یکساں جھلسا سکتی ہے۔ اگر آگ بھڑک اٹھی تو اس کی تپش صرف ایک ملک کو نہیں بلکہ پورے خطے کو اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہے۔ تاریخ کا سبق یہی ہے کہ جب آگ بھڑکتی ہے تو وہ دوست اور دشمن دونوں کی سرحدوں کو یکساں جلانے لگتی ہے

تاہم اس بحران کا سیاسی پہلو عسکری پہل سے کہیں زیادہ دھماکہ دار لرزہ خیز ہے۔ سیاسی اعتبار سے اس بحران کی گونج اور بھی زیادہ شدید ہو سکتی ہے۔ چند روز قبل ٹرمپ اور روسی صدر پوتن کے درمیان ہونے والی ٹیلیفونک گفتگو اسی اضطراب اور تشویش کی علامت ہے۔ روس نے اس جنگ کے امکانات پر سخت تحفظات کا اظہار اور گہری تشویش ظاہر کرتے ہوئے فوری جنگ بندی کا مطالبہ کیا ہے۔ عالمی سیاست کے ایوانوں میں یہ احساس تیزی سے پھیل رہا ہے اور ان کے ایوانوں میں یہ پیغام صاف سنائی دے رہا ہے کہ اگر اس آگ کو ابھی نہ روکا گیا تو یہ ایک ایسا شعلہ بن سکتی ہے جو پورے عالمی نظام کو بھی اپنی گرفت میں لے سکتی ہیں اور اگر اس شعلے کو ابھی نہ بجھایا گیا تو یہ محض ایک علاقائی بحران نہیں رہے گا بلکہ عالمی نظام کی بنیادوں کو ہلادینے والا طوفان اور معاشی ستونوں کو ہلادینے والا زلزلہ ثابت ہو سکتا ہے۔

اسی تناظر میں یہ اطلاعات بھی گردش کر رہی ہیں کہ روس اور چین اس بحران پر مسلسل رابطے میں ہیں۔ بیجنگ نے واضح الفاظ میں واشنگٹن کو جنگ روکنے کا مشورہ دیا ہے اور ایران کی اعلیٰ قیادت کو ممکنہ امریکی حملے میں نشانہ بنانے کی اطلاعات پر سخت تشویش اور ناراضی کا اظہار کیا ہے۔ چین اور روس کے بیانات اس بات کا عندیہ دیتے ہیں کہ عالمی طاقتیں اس خطرے کو محسوس کر رہی ہیں جو اگر بے قابو ہو گیا تو زمین کی سیاست ایک نئے اور خطرناک موڑ پر پہنچ سکتی ہے۔ عالمی سفارت کاری کے پردوں کے پیچھے ایک خاموش مگر نہایت فیصلہ کن کشمکش اور اہم مکالمہ جاری ہے، سفارت کاری کے ایوانوں میں اگرچہ الفاظ دھیمے ہوتے ہیں، مگر ان کے معنی بہت دور تک سفر کرتے ہیں۔ بظاہر خاموش میزوں کے گرد بیٹھے ہوئے سفارت کار دراصل اس آگ کے گرد حصار باندھنے کی کوشش کر رہے ہیں جو اگر بے قابو ہو گئی تو پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہے۔ جہاں بڑی طاقتیں اس خطرے کو بھانپ رہی

ہیں کہ عقل و تدبر کا چراغ بجھ گیا تو طاقت کی تلواریں دنیا کو اندھیرے میں دھکیل سکتی ہیں، اور اگر طاقت کی سیاست نے عقل کی رہنمائی کھودی تو دنیا ایک نئی تباہی کے دہانے پر جا کھڑی ہوگی۔

بعض تجزیوں میں یہ امکان بھی زیر بحث آ رہا ہے کہ اگر حالات مزید بگڑتے ہیں تو روس ایران کو اپنی جوہری ”چھتری“ کے دائرے میں لے سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ایران پر مزید جوہری حملہ دراصل روس کے خلاف ایٹمی جارحیت تصور کیا جائے گا۔ ایسی صورت میں عالمی سیاست کا توازن لمحوں میں ٹوٹ سکتا ہے اور دنیا ایک بار پھر اس مقام پر پہنچ سکتی ہے جہاں تیسری عالمی جنگ کے سائے نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ یہ وہ لمحہ ہو گا جب انسانیت کو اپنی تاریخ کے آئینے میں جھانک کر فیصلہ کرنا ہو گا کہ آیا طاقت کے غرور کو ترجیح دی جائے یا عقل و تدبر کی روشنی کو۔ یاد رہے کہ جہاں تاریخ ہمیں متنبہ کرتی ہے کہ جنگ کے طبل بجانے والے اکثر اس کی ہولناکیوں سے بے خبر ہوتے ہیں، مگر جب بارود کی بوفضا میں پھیلتی ہے تو انسانیت کا پورا قافلہ اس کی قیمت ادا کرتا ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جہاں تاریخ انسانیت کو خبردار کرتی ہے کہ طاقت کے نشے میں کیے گئے فیصلے اکثر تہذیبوں کو بلبلے میں بدل دیتے ہیں۔

اس تمام منظر نامے میں اصل سوال طاقت کا نہیں بلکہ عقل و انسانیت کا ہے۔ اگر عالمی قیادت نے ہوش کے چراغ کو روشن نہ رکھا تو مشرق وسطیٰ کی یہ چنگاری ایک ایسی آگ میں بدل سکتی ہے جو صرف ایک خطے نہیں بلکہ پوری دنیا کی تقدیر کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔ تاریخ کا سبق یہی ہے کہ جنگ کی راہ بظاہر مختصر دکھائی دیتی ہے، مگر اس کے انجام کی منزل ہمیشہ طویل اندھیروں میں گم ہو جاتی ہے۔

اس تمام منظر نامے کا حاصل یہی ہے کہ دنیا اس وقت ایک ایسے موڑ پر کھڑی ہے جہاں عقل، تدبر اور سفارت کاری ہی انسانیت کو بچا سکتے ہیں۔ اصل سوال طاقت کا نہیں بلکہ عقل و انسانیت کا ہے۔ اگر عالمی قیادت نے تدبر کا چراغ روشن نہ رکھا تو مشرق وسطیٰ کی یہ چنگاری ایک ایسی آگ میں بدل سکتی ہے جس کی لپٹیں صرف ایک خطے نہیں بلکہ پوری دنیا کو اپنی گرفت میں لے لیں گی۔ جنگ کی راہ بظاہر مختصر اور آسان دکھائی دیتی ہے، مگر اس کے انجام کی منزل ہمیشہ طویل اندھیروں میں گم ہو جاتی ہے۔ اگر عالمی قیادت نے دانش مندی کا چراغ روشن نہ رکھا تو مشرق وسطیٰ کی یہ چنگاری ایک ایسی آگ میں بدل سکتی ہے جس کی تپش پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔

تاریخ کا سبق یہی ہے کہ جنگ کی راہ بظاہر مختصر اور پر جوش دکھائی دیتی ہے، مگر اس کے انجام کی منزل ہمیشہ طویل اندھیروں میں گم ہو جاتی ہے۔ تاریخ ہمیں بار بار یہ سبق دیتی ہے کہ جنگ کے فیصلے اکثر جوش میں کیے جاتے ہیں، مگر ان کی قیمت ہمیشہ انسانیت کو ہوش میں آکر ادا کرنا پڑتی ہے۔ انسانیت کی بقا اسی میں ہے کہ طاقت کے ایوانوں میں بیٹھے ہوئے فیصلے کرنے والے یہ یاد رکھیں کہ ایک لمحے کی غلطی کبھی کبھی صدیوں کی پشیمانی بن جاتی ہے۔

آج دنیا ایک ایسے موڑ پر کھڑی ہے جہاں طاقت کے ایوانوں میں بیٹھے ہوئے فیصلے کرنے والوں کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جنگ کی آگ جب بھڑکتی ہے تو اس کی لپٹیں دوست اور دشمن کے درمیان فرق نہیں کرتیں۔ حقیقت یہی ہے کہ دنیا اس وقت ایک ایسے سنگم پر کھڑی ہے جہاں ایک فیصلہ انسانیت کو امن کے ساحل تک لے جاسکتا ہے اور دوسرا فیصلہ اسے تباہی کے گرداب میں دھکیل سکتا ہے۔ اگر عقل و تدبر کا چراغ بجھ گیا تو مشرق وسطیٰ کی یہ چنگاری ایک ایسی آگ میں بدل سکتی ہے جس کی تپش پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔

جنگ کے طبل بظاہر قوت کا اعلان ہوتے ہیں، مگر تاریخ بتاتی ہے کہ ان کی گونج اکثر تہذیبوں کے لمبے میں گم ہو جاتی ہے۔ تاریخ کا سبق یہی ہے کہ طاقت کی راہ بظاہر مختصر دکھائی دیتی ہے، مگر اس کے انجام کی منزل ہمیشہ طویل اندھیروں میں گم ہو جاتی ہے۔ اگر عالمی قیادت نے دانش مندی کا چراغ روشن رکھا تو یہ بحر ان بھی تاریخ کے صفحات میں ایک آزمائش کے طور پر درج ہو جائے گا؛ لیکن اگر جذبات نے عقل پر غلبہ پالیا تو مشرق وسطیٰ کی یہ چنگاری ایک ایسی آگ بن سکتی ہے جس کی لپٹیں پوری دنیا کے آسمان کو سرخ کر دیں۔

انسانیت کی بقا اسی میں ہے کہ دنیا کے رہنما طاقت کے غرور کے بجائے عقل، تدبر اور امن کی راہ اختیار کریں، کیونکہ ایک لمحے کی غلطی کبھی کبھی صدیوں کی پشیمانی بن جاتی ہے۔ ان تمام امکانات اور اندیشوں کے درمیان انسانیت کے سامنے اصل سوال یہی ہے کہ کیا دنیا طاقت کے نشے میں تاریخ کے سب سے بھیانک تجربے کو دوبارہ دہرانے کی متحمل ہو سکتی ہے؟ اگر عالمی قیادت نے دانش، تدبر اور سفارت کاری کا چراغ روشن نہ رکھا تو مشرق وسطیٰ کی یہ چنگاری ایک ایسی آگ میں بدل سکتی ہے جس کی لپٹیں صرف ایک خطے نہیں بلکہ پوری دنیا کی تقدیر کو اپنی گرفت میں لے لیں گی۔

منگل 28 رمضان الکریم 1447ھ 17 مارچ 2026ء

سرخ لکیر کے پار

تاریخ کبھی محض واقعات کا سلسلہ نہیں ہوتی، وہ دراصل قوموں کے عزم، طاقت کے توازن اور عالمی سیاست کے پوشیدہ کھیل کی ایک زندہ دستاویز ہوتی ہے۔ جب مورخ قلم اٹھاتا ہے تو وہ صرف حادثات کو نہیں لکھتا بلکہ اس پردہ غیب کو بھی ہٹانے کی کوشش کرتا ہے جس کے پیچھے عالمی طاقتیں اپنی بساط بچھاتی ہیں۔ جنوبی ایشیا اور مشرق وسطیٰ کی سرزمین بھی صدیوں سے اسی خاموش مگر ہولناک شطرنج کی بازی کا میدان بنی ہوئی ہے جہاں کبھی بادشاہ مات کھاتے ہیں اور کبھی پیادے قربان ہو جاتے ہیں۔

9 مارچ 2026 کو شائع ہونے والے میرے مضمون "عالمی بساط کا خفیہ کھیل" میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا تھا کہ خطے میں جو کچھ دکھائی دے رہا ہے وہ اصل کھیل نہیں بلکہ اس کھیل کا صرف ایک سایہ ہے۔ اس مضمون میں واضح کیا گیا تھا کہ پاکستان نے گزشتہ مہینوں میں خطے میں ایک ایسا تعمیری کردار ادا کیا جس نے نہ صرف ایک ممکنہ تباہ کن بحران کو روکا بلکہ ایران کو اس انجام سے بھی بچا لیا جو کبھی شام کے مقدر میں لکھ دیا گیا تھا۔ عالمی طاقتوں کی ایک خفیہ حکمت عملی یہ تھی کہ ایران کو داخلی انتشار نسلی بغاوتوں اور معاشی دباؤ کے ذریعے کمزور کر کے اسے ایک نئے خانہ جنگی کے میدان میں دھکیل دیا جائے۔ اس مقصد کیلئے منصوبہ یہ تھا کہ افغانستان میں موجود مختلف شدت پسند گروہوں کو استعمال کرتے ہوئے ایران کی سرحدوں پر عدم استحکام پیدا کیا جائے اور پھر اندرونی احتجاج کو ہوا دے کر تہران کی حکومت کو مفلوج کر دیا جائے۔

لیکن تاریخ کے بعض موڑ ایسے ہوتے ہیں جہاں ایک ریاست کی بصیرت پورے خطے کی تقدیر بدل دیتی ہے۔ پاکستان نے نہ صرف سفارتی سطح پر بلکہ خفیہ اور عملی سطح پر بھی ایسے اقدامات کیے جنہوں نے اس خطرناک منصوبے کو ناکام بنادیا۔ اطلاعات کے مطابق افغانستان میں موجود خراسان کے پچیس ہزار سے زائد شدت پسند، تحریک طالبان پاکستان کے بیس ہزار کے قریب جنگجو، اور بعض دیگر عناصر کو ایک وسیع منصوبے کے تحت ایران کے خلاف استعمال کرنے کی تیاری کی جا رہی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ ایران کو اندر سے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا جائے اور خطے میں ایک اور شام جیسی خونریزی پیدا کر کے امت مسلمہ کو ایک اور تاریک شام میں غرق کر دیا جائے۔

اسی سلسلے میں ایک اور منصوبہ بھی تیار کیا گیا تھا جس کے تحت سٹارلنک انٹرنیٹ کے ذریعے پروپیگنڈہ کی جنگ شروع کی جانی تھی۔ اس مقصد کیلئے تقریباً تیرہ ہزار سے زائد خصوصی ڈیوائسز افغانستان کے راستے ایران اور پاکستان کے سرحدی علاقوں میں اسمگل کرنے کی کوشش کی گئی تاکہ سوشل میڈیا اور ڈیجیٹل نیٹ ورک کے ذریعے بڑے پیمانے پر عوامی بغاوت کو منظم کیا جاسکے۔ لیکن پاکستان کی سیکیورٹی اور انٹیلی جنس اداروں نے اس خفیہ منصوبے کو بروقت بے نقاب کر کے اسے ناکام بنادیا۔

یہ وہ لمحہ تھا جب عالمی بساط کے کھلاڑیوں کو احساس ہوا کہ ان کا منصوبہ ناکام ہو چکا ہے۔ جب پر کسی جنگ، اطلاعاتی جنگ اور داخلی بغاوت کے منصوبے ناکام ہو جائیں تو اکثر طاقتیں ایک آخری راستہ اختیار کرتی ہیں۔ اور وہ ہے کھلی محاذ آرائی۔ چنانچہ وہی ہوا جس کا خدشہ پہلے ہی ظاہر کیا جا چکا تھا۔ جب ایران میں حکومت گرانے کا منصوبہ ناکام ہوا تو خطے میں کشیدگی کو ایک نئے مرحلے میں داخل کر دیا گیا۔ افغانستان کی سرزمین سے پاکستان کے خلاف سرگرم مختلف دہشتگرد گروہوں کو دوبارہ متحرک کیا گیا اور سرحدی کشیدگی کو بتدریج عسکری تصادم کی طرف دھکیل دیا گیا۔

آج جو صورتحال ہم دیکھ رہے ہیں — پاکستان کے شہروں پر ڈرون حملوں کی کوششیں، سرحدی کشیدگی، اور پر کسی جنگ کا بڑھتا ہوا سایہ — وہ دراصل اسی عالمی بساط کا اگلا مرحلہ ہے۔ گزشتہ دو ہفتوں میں رونما ہونے والے واقعات اس بات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ خطہ ایک خطرناک دورا ہے پر

کھڑا ہے جہاں ایک معمولی چنگاری بھی ایک بڑی جنگ کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔ یہی پس منظر اس مضمون کو سمجھنے کیلئے نہایت اہم ہے۔ یہ محض چند ڈرونز کی کہانی نہیں بلکہ اس عالمی شطرنج کی ایک نئی چال ہے جس میں خطے کی تقدیر، عالمی طاقتوں کے مفادات اور ایٹمی صلاحیت رکھنے والی ریاستوں کا مستقبل داؤ پر لگا ہوا ہے۔

برصغیر کی تاریخ کے اوراق اس حقیقت کے گواہ ہیں کہ یہاں کی سرزمین ہمیشہ طاقت، سیاست اور نظریات کے تصادم کی آماجگاہ رہی ہے۔ تاریخ کے اوراق جب کبھی سرحدوں کی کہانیاں بیان کرتے ہیں تو ان میں صرف نقشے کی لکیریں نہیں ہوتیں بلکہ قوموں کی تقدیر، سیاست کی نزاکت اور طاقت کے توازن کی داستانیں بھی ثبت ہوتی ہیں۔ جنوبی ایشیا کی جغرافیائی ساخت بھی انہی پیچیدہ حقیقتوں کی آئینہ دار ہے جہاں پہاڑوں کے دامن میں بستے ہوئے قبائل، میدانوں میں آباد ریاستیں اور عالمی طاقتوں کے مفادات ایک دوسرے سے اس طرح الجھ جاتے ہیں کہ کبھی دوستی کی خوشبو فضا میں پھیلتی ہے اور کبھی بارود کی بو فضا کو مگر کر دیتی ہے۔

کبھی یہ خطہ سلطنتوں کے عروج و زوال کا منظر نامہ بنا، کبھی یہاں تہذیبوں کے سنگم نے نئے فکری افق پیدا کیے، لیکن تاریخ کے اس طویل سفر میں ایک حقیقت ہمیشہ نمایاں رہی کہ جب بھی سرحدوں کے پار سے آتش نزاع بھڑکی، اس کے شعلے نہ صرف میدان جنگ کو بلکہ معاشرتی اور سیاسی فضا کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔

افغانستان اور پاکستان کے تعلقات بھی اسی تاریخ کے تسلسل کا حصہ ہیں۔ ایک طرف مشترک مذہبی و ثقافتی رشتہ ہے، دوسری طرف سرحدی سیاست کی تلخ حقیقتیں۔ گزشتہ برسوں میں دونوں ممالک کے درمیان کشیدگی کے بادل وقفے وقفے سے منڈلاتے رہے، مگر حالیہ دنوں میں مبینہ ڈرون حملوں کے واقعات نے اس کشیدگی کو ایک نئے مرحلے میں داخل کر دیا ہے۔

ڈرون ٹیکنالوجی جدید جنگ کا وہ خاموش ہتھیار ہے جو بظاہر ایک چھوٹے پرندے کی مانند دکھائی دیتا ہے مگر اس کے پرواز کرتے ہی عالمی سیاست کے ایوانوں میں تشویش کی لہریں دوڑ جاتی ہیں۔ حالیہ دنوں میں پاکستان کے مختلف شہروں — راولپنڈی، کوہاٹ اور کوئٹہ — میں مبینہ طور پر افغان طالبان کی جانب سے کیے گئے ڈرون حملوں نے ایک بار پھر اس حقیقت کو اجاگر کر دیا ہے کہ جدید دنیا میں جنگ کا چہرہ بدل چکا ہے۔ اب توپ و تفنگ کے ساتھ ساتھ ٹیکنالوجی کے پرندے ڈرون — بھی میدان کارزار میں اتر آئے ہیں۔

یہ حملہ بظاہر محدود نوعیت کے تھے، مگر ان کے سیاسی اور سفارتی مضمرات نہایت گہرے ہیں۔ ایسے ڈرونز کی دراندازی نے صرف عسکری حلقوں ہی نہیں بلکہ سیاسی اور سماجی سطح پر بھی ایک نئی بحث کو جنم دیا ہے۔ یہ رپورٹ انہی واقعات کے پس منظر، اسباب اور ممکنہ نتائج کا تحقیقی و تاریخی جائزہ پیش کرتی ہے۔

ریاستی سیاست میں بعض اصول ایسے ہوتے ہیں جنہیں قومی وقار کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ ان اصولوں کو عموماً سرخ لکیر کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ حد جس کے بعد برداشت کی گنجائش ختم ہو جاتی ہے۔ پاکستان کے مختلف شہروں میں مبینہ ڈرون حملوں کی کوشش کو اسی تناظر میں دیکھا جا رہا ہے۔ پاکستان کیلئے یہ واقعہ محض چند ڈرونز کی دراندازی نہیں بلکہ ایک علامتی پیغام ہے۔ ریاستیں اپنی سلامتی کے حوالے سے کچھ بنیادی اصول وضع کرتی ہیں جنہیں عرف عام میں ریڈ لائن کہا جاتا ہے۔ جب کوئی بیرونی قوت ان خطوط کو عبور کرتی ہے تو یہ محض عسکری چیلنج نہیں بلکہ ریاستی وقار کیلئے بھی امتحان بن جاتا ہے۔ یہ واقعہ اس لیے بھی اہم ہے کہ ماضی میں پاکستان اور افغانستان کے درمیان کشیدگی زیادہ تر سرحدی علاقوں تک محدود رہی لیکن جب کسی تنازع کا سایہ بڑے شہروں کی فصیلوں تک پہنچ جائے تو اس کے معنی بدل جاتے ہیں۔ اس صورت میں مسئلہ صرف فوجی نہیں رہتا بلکہ نفسیاتی اور سیاسی بھی بن جاتا ہے۔ افغان طالبان کی جانب سے کیے گئے ڈرون حملوں کو پاکستان نے اسی تناظر میں دیکھا ہے۔ اسلام آباد کے ایوانوں میں یہ سوال شدت کے ساتھ اٹھ رہا ہے کہ اگر ایک پڑوسی حکومت براہ راست پاکستانی شہروں کو نشانہ بنانے کی جرات کر سکتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ علاقائی سیاست کا منظر نامہ ایک نئے مرحلے میں داخل ہو رہا ہے۔

جمعے کے روز پیش آنے والے واقعات کے بعد پاکستان نے دعویٰ کیا کہ ان ڈرون حملوں کو بروقت ناکام بنادیا گیا، تاہم کچھ شہریوں کے زخمی ہونے کی اطلاعات نے عوامی حلقوں میں تشویش پیدا کر دی۔ اس واقعے نے یہ سوال بھی اٹھایا کہ کیا جدید جنگ کے یہ نئے ہتھیار آئندہ بھی پاکستان کے شہری علاقوں کو نشانہ بنا سکتے ہیں۔ گویا یہ واقعہ صرف ایک عسکری کارروائی نہیں بلکہ ایک علامتی پیغام بھی تھا۔ ایسا پیغام جس نے اسلام آباد کو یہ احساس دلایا کہ خطے کی سیاست ایک نئے موڑ پر پہنچ رہی ہے۔ یہ واقعہ گویا اس مثل کی یاد دلاتا ہے کہ جب سرحدوں کے پہرے کمزور پڑ جائیں تو دشمن کی نگاہیں شہر کی فصیلوں تک پہنچ جاتی ہیں۔

پاکستان نے ان حملوں کی سخت مذمت کرتے ہوئے واضح کیا کہ شہریوں کو نشانہ بنانا ناقابل قبول ہے۔ افغان طالبان نے ایک ایسی حد عبور کر لی ہے جسے برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ پاکستان کے سرکاری بیانات میں چند بنیادی نکات نمایاں تھے۔

- ☆ افغان سرزمین کسی بھی پڑوسی کے خلاف دہشتگردی کیلئے استعمال نہیں ہونی چاہیے۔
- ☆ شہریوں کو نشانہ بنانا قابل قبول ہے۔ پاکستان اپنے شہریوں کے دفاع کا مکمل حق رکھتا ہے۔
- ☆ یہ موقف دراصل عالمی سفارتی اصولوں کی بازگشت اور ریاستی خود مختاری کے اصول کی ترجمانی کرتا ہے۔
- ☆ بین الاقوامی قانون کے مطابق اگر کسی ملک کی سرزمین دوسرے ملک کے خلاف حملوں کیلئے استعمال کرنا دشمنی کے مترادف سمجھا جاتا ہے اور اس صورت میں متاثرہ ریاست کو دفاع کا حق حاصل ہوتا ہے۔

یہاں ایک تاریخی حقیقت بھی قابل ذکر ہے کہ پاکستان نے ماضی میں بھی اس موقف کو بار بار دہرایا کہ افغانستان کی سرزمین کو کالعدم تحریک طالبان پاکستان کیلئے استعمال نہ ہونے دیا جائے۔ لیکن اگر اب افغان طالبان خود پاکستان کے خلاف براہ راست کارروائیوں میں ملوث دکھائی دیں تو صورتحال مزید پیچیدہ ہو جاتی ہے۔ پاکستان کی اس پالیسی میں وہی طرز فکر جھلکتا ہے کہ ریاست کی ذمہ داری صرف سرحدوں کی حفاظت نہیں بلکہ شہریوں کے جان و مال کی پاسبانی بھی ہے۔



پاکستانی فوج کے ترجمان ادارے کے مطابق 13 مارچ کو افغان طالبان نے چند ڈرونز کے ذریعے راولپنڈی، کوہاٹ اور کوئٹہ کو نشانہ بنانے کی کوشش کی۔ فوجی حکام کے مطابق ان ڈرونز کو دو طریقوں سے ناکارہ بنایا گیا۔ فوجی حکام کے مطابق سافٹ کل ٹیکنالوجی کے استعمال سے الیکٹرانک سگنلز کے ذریعے ڈرون کے کنٹرول سسٹم کو جام کر دیا جاتا ہے۔ اور ہارڈ کل ٹیکنالوجی کے استعمال سے ڈرون کو براہ راست نشانہ بنا کر تباہ کیا جاتا ہے۔ اگرچہ ڈرون اپنے ہدف تک نہیں پہنچ سکے، مگر ان کے بلے سے چند شہری زخمی ہوئے جن میں بچے بھی شامل تھے۔ یہ واقعہ اس حقیقت کی یاد دہانی ہے کہ جدید جنگ میں چھوٹے ہتھیار بھی بڑے اثرات پیدا کر سکتے ہیں۔

یہ حقیقت اگرچہ تسلی بخش ہے کہ حملے ناکام بنا دیے گئے لیکن اس سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ یہ ڈرون پاکستانی فضائی حدود تک پہنچے کیسے؟ یہ سوال دراصل اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جدید جنگ میں خطرہ ہمیشہ سرحد پر نہیں بلکہ کبھی کبھی فضا کے راستے خاموشی سے در آتا ہے۔ دوسری طرف افغان طالبان کی وزارت دفاع نے یہ دعویٰ کیا کہ ان کے ڈرونز نے پاکستان کے ایک اہم فوجی کیمپ کو نشانہ بنایا اور وہاں موجود کمانڈ سینٹر کو نقصان پہنچایا۔ یہ دعویٰ بظاہر پاکستان کے موقف سے متضاد ہے۔ ایسی صورت حال میں اکثر یہ امکان ہوتا ہے کہ دونوں فریق اطلاعاتی جنگ کا حصہ بن جاتے ہیں۔ جدید دنیا میں بیانیہ بھی ایک ہتھیار ہے۔ جدید تنازعات میں بیانات اور دعوے اکثر حقیقت سے زیادہ اثر پیدا کرتے ہیں، کبھی کبھی ایک بیان یا دعویٰ میدان جنگ کی کامیابی سے زیادہ اثر رکھتا ہے۔ گویا یہ جنگ صرف میدان میں نہیں بلکہ بیانیہ میں بھی لڑی جا رہی ہے۔

یہ سوال آج پاکستانی معاشرے میں شدت سے زیر بحث ہے کہ آیا افغان طالبان نے واقعی جنگ کو سرحدی علاقوں سے نکال کر پاکستان کے بڑے شہروں تک پہنچا دیا ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مستقبل کی جنگیں روایتی سرحدی لڑائی اور سرحدی چوکیوں تک محدود نہیں رہیں گی بلکہ شہری مراکز بھی ان کی زد میں آسکتے ہیں اور شہری مراکز کو نشانہ بنانے والی غیر روایتی جنگ ہوگی جو باقاعدہ ایک بڑی جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے۔ یہ صورتحال نہ صرف سیوریج اداروں بلکہ شہری دفاع کے نظام کیلئے بھی ایک نیا چیلنج ہے۔ ریڈ لائن عبور کرنے کا مطلب یہی ہے کہ دشمن نے اس حد کو پار کر لیا ہے جہاں سے واپسی مشکل ہو جاتی ہے۔

ماہرین کے مطابق یہ ڈرون زیادہ تر کمرشل ڈرونز ہیں جو مارکیٹ میں آسانی سے دستیاب ہوتے ہیں۔ ان کی خصوصیات یہ ہیں کہ یہ کم قیمت، چھوٹا دھماکہ خیز مواد لے جانے کی صلاحیت، کے ساتھ محدود مگر مؤثر رینج تک حملہ آور ہو سکتے ہیں۔ یہ ڈرونز جدید جنگ میں ایک خطرناک رجحان کی نمائندگی کرتے ہیں کیونکہ انہیں بنانا یا حاصل کرنا نسبتاً آسان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر میں غیر ریاستی عناصر بھی انہیں استعمال کرنے لگے ہیں۔ طالبان حکومت نے دعویٰ کیا کہ یہ کارروائیاں پاکستان کے فضائی حملوں کے جواب میں کی گئیں۔ چونکہ طالبان کے پاس روایتی فضائیہ موجود نہیں، اس لیے انہوں نے ڈرون ٹیکنالوجی کو اپنے دفاعی ہتھیار کے طور پر اختیار کیا ہے۔

طالبان نے دو اقسام کے ڈرون استعمال کیے ہیں۔ خود کش ڈرونز اور دوسرا کوڈ کا پیٹر ز جو چار پروں والے ڈرون ہوتے ہیں جو اسرائیلی ٹیکنالوجی سے متاثر ہیں۔ یہ عام طور پر نگرانی یا مختصر فاصلے کے حملوں کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ گزشتہ برس ممی کی پاک بھارت جنگ میں خود اسرائیلی آپریٹرز نے انڈیا کی سر زمین پر بیٹھ کر یہی ڈرون ٹیکنالوجی استعمال کی تھی جس کے بارے میں اس کا دعویٰ تھا کہ اس جدید ترین ڈرون ٹیکنالوجی کا توڑ قصر سفید کا فرعون، اس کے باپ امریکا کے پاس بھی نہیں کیونکہ یہ کامی کا ز یعنی خود کش ہیں جو اپنی منزل پر پہنچ کر خود بھی تباہ ہو جاتے ہیں اور اس کی ٹیکنالوجی کے شواہد بھی نہیں مل سکتے، اس نے مزید یہ دعویٰ بھی کیا تھا کہ پاکستان کیلئے چار ڈرون ہی کافی ہوں گے لیکن پاکستان نے نہ صرف 69 کے قریب یہ ڈرون تباہ کئے بلکہ کئی ڈرون صحیح سلامت زمین پر اتار کر اسرائیل کے اس متکبر دعوے کو خاک میں ملا دیا تھا اور بعد ازاں جہاں سے یہ آپریٹ ہو رہے تھے، اس مرکز کو بھی تباہ کر دیا جس کے جواب میں رات کے اندھیرے میں ان آپریٹرز کے تابوت حیفہ اسرائیل پہنچائے گئے۔ جو نہی یہ تابوت حیفہ پہنچے تو نیتن یاہو اور مودی کی مشترکہ چیخیں اور مدد کی پکار ان کے سر پرست اعلیٰ اور باپ، قصر سفید کے فرعون امریکی صدر ٹرمپ تک پہنچی تو ٹرمپ نے فوری طور پر شب و روز اپنی کوششوں سے سیز فائر کیلئے پاکستان کو آمادہ کیا اور خود ٹرمپ دو درجن سے زائد مرتبہ پاکستانی شاہینوں کے ہاتھوں بھارتی رافیل طیاروں کی بربادی کا نوہ ساری دنیا کو سنا چکے ہیں۔

ایک غیر ملکی عسکری ماہر کے مطابق ممکن ہے کہ طالبان نے ڈرون کے پرزے بیرون ملک سے حاصل کیے ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پرزے افغانستان میں اسمبل کیے گئے ہوں یا پاکستان میں خفیہ نیٹ ورکس کے ذریعے جوڑے گئے ہوں۔ یہ امکان بھی ظاہر کیا جا رہا ہے کہ اسمگلنگ کے ذریعے ٹیکنالوجی منتقل کی گئی ہو۔ کچھ اطلاعات کے مطابق طالبان کو ڈرون ٹیکنالوجی بہتر بنانے میں بیرونی ماہرین کی مدد حاصل ہو سکتی ہے۔ اگرچہ اس دعوے کی آزادانہ تصدیق مشکل ہے، لیکن جنوبی ایشیا کی سیاست میں انڈیا اور پاکستان کی رقابت ہمیشہ ایک اہم عنصر رہی ہے۔ اگرچہ ان حملوں سے بڑے پیمانے پر تباہی نہیں ہوئی، مگر یہ پاکستان کیلئے ایک نفسیاتی دھچکہ تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی مرتبہ افغان طالبان نے پاکستان کے بڑے شہروں کو نشانہ بنانے کی کوشش کی۔

ابھی حال ہی میں مودی کا اسرائیل کے دورہ کے دوران افغان طالبان کی حمایت کا اعلان بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ ڈرون حملوں کی نئی لہر کا سارا پلان وہی تیار ہوا ہے لیکن انڈیا نے اپنی سر زمین سے ان ڈرون حملوں کی اس لئے جرات نہیں کہ وہ کھلی جنگ میں پاکستان کے ہاتھوں عبرت ناک شکست اور رسوائی سے واقف ہے۔ یہ صورت حال اس کہادت کی یاد دلاتی ہے کہ جب دو ہمسائے لڑتے ہیں تو تیسرا اکثر خاموشی سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ انڈیا اور اسرائیل کے خفیہ ہاتھ اب کسی سے پوشیدہ نہیں رہے، یقیناً پاکستان کے عسکری حلقے اس کا جواب مناسب وقت پر ضرور دیں گے کہ یہ پاکستان کی روایت ہے۔

کچھ اطلاعات کے مطابق طالبان ایک ایسے میزائل پروگرام پر بھی کام کر رہے ہیں جس کی رینج 200 سے 300 کلومیٹر تک ہو سکتی ہے۔ اگر یہ خبر درست ثابت ہوتی ہے تو یہ خطے کے سیوریٹی توازن کو متاثر کر سکتی ہے اور خطے میں طاقت کا توازن مزید پیچیدہ ہو سکتا ہے۔ افغان وزیر دفاع ملا یعقوب نے کہا تھا کہ اگر کاہل پر حملہ ہوا تو اسلام آباد کو بھی نشانہ بنایا جاسکتا ہے۔ یہ بیان دراصل ایک سیاسی پیغام تھا جس نے دونوں ممالک کے درمیان کشیدگی کو مزید بڑھا دیا ہے۔ سب سے اہم سوال یہ ہے کہ ڈرون اسلام آباد تک کیسے پہنچے؟ افغان سرحد اسلام آباد سے کافی فاصلے پر ہے۔ اس کے ڈرونز کا وہاں

تک پہنچ جانا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یا تو انہیں پاکستان کے اندر سے لانچ کیا گیا یا انہیں سرحد پار سے کنٹرول کیا گیا اور ان کی پرواز کاراستہ خفیہ رکھا گیا۔ یہ معاملہ پاکستانی سکیورٹی اداروں کیلئے ایک اہم چیلنج ہے۔

ماہرین کا خیال ہے کہ طالبان روایتی جنگ میں پاکستان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ان کی اصل طاقت، گوریلا جنگ، دہشتگرد گروپس کی حمایت اور خود کش حملہ آور اور غیر روایتی حربوں میں ہے۔ لہذا بڑے پیمانے کی فوجی کارروائی ان کیلئے ممکن نہیں۔ کچھ تجزیہ کاروں کا خیال ہے کہ طالبان کے پاس سینکڑوں ڈرونز ہو سکتے ہیں۔ اگر یہ درست ہے تو مستقبل میں مزید حملوں کا خطرہ موجود ہے۔ یہ امکان پاکستان کیلئے تشویش کا باعث بن سکتا ہے۔

ابتداء میں انڈیا اس تنازع کو زیادہ اہمیت نہیں دے رہا تھا۔ لیکن حالیہ واقعات کے بعد مضبوط شواہد موجود ہیں کہ انڈیا افغان طالبان کے ساتھ روابط بڑھا کر پاکستان میں پر کسی وار کو اپنے تزویراتی مفادات کیلئے استعمال کر رہا ہے تاکہ پاکستان پر دباؤ بڑھایا جاسکے۔ انڈین وزارت خارجہ نے افغانستان میں پاکستانی حملوں کو جارحیت قرار دیتے ہوئے اس پر تنقید کی جبکہ پاکستان نے اس بیان کو غیر ضروری اور منافقانہ قرار دیتے ہوئے سخت رد عمل دیا ہے۔

ماہرین کے مطابق یہ تنازع جلد ختم ہوتا نظر نہیں آتا کیونکہ پاکستان ٹی ٹی پی کے خلاف کارروائی چاہتا ہے، طالبان اس مطالبے کو قبول کرنے پر تیار نہیں، کیونکہ دونوں ممالک اپنے موقف پر قائم دکھائی دیتے ہیں اس لیے کسی تیسرے فریق کی ثالثی ضروری ہو سکتی ہے۔ حالیہ اطلاعات کے مطابق چین نے اس تنازع کو کم کرنے کیلئے سفارتی کوششیں شروع کی ہیں۔ چین اس تنازع میں ثالثی کی کوشش کر رہا ہے۔ چین خطے میں استحکام چاہتا ہے کیونکہ پاکستان اور افغانستان دونوں اس کے اقتصادی منصوبوں کیلئے اہم ہیں۔

پاکستان اور افغانستان کے تعلقات تاریخ کے نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے آج ایک نازک موڑ پر آکھڑے ہوئے ہیں۔ ڈرون حملے بظاہر ایک محدود واقعہ تھے، مگر ان کے مضمرات وسیع ہیں۔ ڈرون حملوں کے یہ واقعات بظاہر چھوٹے ہیں، مگر ان کے اثرات دور رس ہو سکتے ہیں۔ یہ واقعہ اس حقیقت کی یاد دہانی ہے کہ جدید دنیا میں جنگ صرف توپوں اور بندوقوں سے نہیں بلکہ ٹیکنالوجی، بیانیے اور سفارت کاری کے میدان میں بھی لڑی جاتی ہے۔ اگر دونوں ممالک نے دانش مندی سے کام نہ لیا تو یہ تنازع ایک طویل کشمکش میں تبدیل ہو کر ایک ایسی آگ بن سکتا ہے جس کی لپٹیں پورے خطے کو اپنی لپیٹ میں لے لیں۔

لیکن اگر تدبیر اور حکمت کی راہ اختیار کی جائے تو ممکن ہے کہ یہی بحران مستقبل میں امن کی ایک نئی راہ بھی ہموار کر دے۔ کیونکہ تاریخ ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ جنگیں ہمیشہ تلوار سے نہیں بلکہ عقل اور تدبیر سے ختم ہوتی ہیں اور تاریخ ہمیں یہ سبق بھی سکھاتی ہے کہ قوموں کی بقا صرف طاقت میں نہیں بلکہ حکمت اور اعتدال میں پوشیدہ ہوتی ہے۔

تاریخ کے اوراق ہمیں بار بار یہ سبق دیتے ہیں کہ قوموں کے درمیان تنازعات کبھی اچانک پیدا نہیں ہوتے۔ ان کے پیچھے برسوں کی منصوبہ بندی، طاقت کی کشمکش اور عالمی مفادات کی پیچیدہ گتھیاں کارفرما ہوتی ہیں۔ آج پاکستان اور افغانستان کے درمیان بڑھتی ہوئی کشیدگی کو بھی اسی وسیع تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔

افغانستان کی سرزمین سے ہونے والے ڈرون حملوں کی کوششیں بظاہر ایک محدود عسکری واقعہ محسوس ہو سکتی ہیں، لیکن اگر ان کے پس منظر میں

جھانکا جائے تو یہ ایک بڑی سیاسی بساط کی محض ایک چال دکھائی دیتی ہیں۔ وہ بساط جس پر عالمی طاقتیں اپنے مفادات کے مہرے چلاتی ہیں اور خطے کی ریاستیں کبھی دانستہ اور کبھی نادانستہ اس کھیل کا حصہ بن جاتی ہیں۔

پاکستان نے حالیہ برسوں میں خطے میں جو کردار ادا کیا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ایران کو ایک ممکنہ خانہ جنگی سے بچانا، دہشتگرد نیٹ ورکس کے خلاف کارروائیاں کرنا، اور پرانے جنگ کے منصوبوں کو ناکام بنانا۔ یہ سب ایسے اقدامات تھے جنہوں نے عالمی طاقتوں کی بعض خفیہ حکمت عملیوں کو شدید دھچکہ پہنچایا۔ یہی وجہ ہے کہ اب پاکستان کو ایک نئے دباؤ کا سامنا ہے۔

افغانستان میں موجود مختلف شدت پسند گروہوں کی سرگرمیاں، تحریک طالبان پاکستان کی دوبارہ منظم ہوتی ہوئی کارروائیاں، اور جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے ہونے والی دراندازیاں اس بات کی علامت ہیں کہ جنگ کا چہرہ بدل چکا ہے۔ اب لڑائیاں صرف سرحدوں پر نہیں ہوتیں بلکہ فضاؤں میں اڑتے ڈرونز، ڈیجیٹل نیٹ ورکس اور اطلاعاتی بیانیوں کے میدان میں بھی لڑی جاتی ہیں۔

یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ جنوبی ایشیا کے اس خطے میں دو ایٹمی طاقتیں موجود ہیں۔ اگر کشیدگی اسی طرح بڑھتی رہی تو اس کا دائرہ صرف سرحدی جھڑپوں تک محدود نہیں رہے گا بلکہ عالمی سیاست کیلئے ایک خطرناک بحران بن سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض تجزیہ کار اس صورتحال کو ایک ممکنہ ایٹمی تصادم کی طرف بڑھتے ہوئے خطرناک رجحان کے طور پر بھی دیکھ رہے ہیں۔

تاہم تاریخ کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ جب بحران اپنی انتہا کو پہنچتا ہے تو اکثر اسی مقام سے امن کی نئی راہیں بھی جنم لیتی ہیں۔ جنگ کی دھند چھٹنے کے بعد ہی قوموں کو یہ احساس ہوتا ہے کہ طاقت کے مظاہرے سے زیادہ اہم چیز دانش اور تدبیر ہے۔

پاکستان اور افغانستان دونوں ایسے ممالک ہیں جنہیں جغرافیہ نے ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ کر رکھا ہے۔ ان کے درمیان دائمی دشمنی نہ صرف دونوں قوموں کیلئے نقصان دہ ہوگی بلکہ پورے خطے کے امن کو بھی خطرے میں ڈال دے گی۔ اس لیے ضروری ہے کہ جذبات کی آگ کو سفارت کاری کی ٹھنڈی ہوا سے بجھایا جائے اور اس کشیدگی کو ایک ایسے تصادم میں تبدیل ہونے سے روکا جائے جو پورے خطے کو اپنی لپیٹ میں لے سکتا ہے۔

کیونکہ اگر تاریخ کا فیصلہ صرف توپوں اور میزائلوں نے کیا ہوتا تو دنیا آج بھی جنگوں کے اندھیروں میں ڈوبی ہوتی۔ مگر تاریخ کا اصل فیصلہ ہمیشہ عقل، تدبیر اور حکمت نے کیا ہے۔ اور یہی وہ سبق ہے جو اس بحران کی گرد میں بھی پوشیدہ ہے۔ کہ طاقت کی اصل آزمائش میدان جنگ میں نہیں بلکہ اس لمحے میں ہوتی ہے جب ایک قوم جنگ کے دہانے پر کھڑی ہو کر بھی عقل و دانش کا راستہ اختیار کرتی ہے۔

تاریخ کے افق پر جب کبھی قوموں کی تقدیر کے فیصلے لکھے جاتے ہیں تو وہ محض تلواروں کی جھڑپوں کی گرج سے نہیں لکھے جاتے۔ وہ دراصل اس لمحے میں رقم ہوتے ہیں جب ایک قوم آزمائش کے طوفان کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے عزم کی شمع کو بجھنے نہیں دیتی۔ یہ بھی درست ہے کہ تاریخ کے افق پر بعض لمحے ایسے بھی ابھرتے ہیں جو محض واقعات نہیں ہوتے بلکہ زمانے کے ضمیر پر ثبت ہونے والی صدائیں بن جاتے ہیں۔ آج جنوبی ایشیا کے افق پر جو بادل منڈلا رہے ہیں وہ صرف بارود کے بادل نہیں بلکہ اس عالمی سیاست کی دھند ہیں جس میں طاقت کے ایوانوں نے انسانیت کے مستقبل کو شطرنج کے مہرے بنا رکھا ہے۔

لیکن تاریخ کی عدالت میں طاقت کا غرور ہمیشہ قائم نہیں رہتا۔ فرعونوں کے محل بھی مٹی میں مل گئے اور قیصر و کسریٰ کی سلطنتیں بھی وقت کی گرد میں گم ہو گئیں۔ باقی رہتی ہے تو صرف وہ قوم جو اپنے ایمان، اتحاد اور عزم کی قوت سے آزمائش کے اندھیروں میں بھی امید کا چراغ روشن رکھتی ہے۔ آج جنوبی ایشیا کی سرزمین ایک ایسے ہی موڑ پر کھڑی ہے جہاں وقت کا ہر لمحہ آنے والے کل کے فیصلے کو جنم دے رہا ہے۔ افغانستان کی پہاڑیوں سے اٹھنے والی یہ نئی آندھی، پاکستان کے شہروں کی فضاؤں میں منڈلاتے یہ ڈرون، اور عالمی سیاست کے ایوانوں میں بچھائی گئی یہ خفیہ بساط — یہ سب محض حادثات کا سلسلہ نہیں بلکہ ایک ایسے کھیل کے اشارے ہیں جس میں طاقت کے سوداگر اپنے مفادات کے مہرے آگے بڑھا رہے ہیں۔ لیکن تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ جب قومیں آزمائش کے کڑے مرحلوں سے گزرتی ہیں تو ان کے کردار کا اصل جوہر اسی وقت نمایاں ہوتا ہے۔

پاکستان نے گزشتہ برسوں میں جس استقامت اور بصیرت کے ساتھ خطے کے بحرانوں کا سامنا کیا ہے وہ اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ یہ قوم صرف میدانِ جنگ میں ہی نہیں بلکہ حکمت و تدبیر کی آزمائش میں بھی سرخرو ہو سکتی ہے۔ پاکستان کی تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ اس قوم نے ہر دور میں اپنے وجود کو چیلنج کرنے والی قوتوں کا سامنا کیا ہے۔ کبھی اسے دہشتگردی کے عفریت کے حوالے کرنے کی کوشش کی گئی، کبھی اسے اقتصادی دباؤ کے طوق میں جکڑنے کی تدبیریں کی گئیں، اور کبھی اسے عالمی تنہائی کے اندھیروں میں دھکیلنے کے منصوبے بنائے گئے۔ مگر ہر بار اس سرزمین کے لوگوں نے یہ ثابت کیا کہ قومیں صرف ہتھیاروں سے نہیں بلکہ اپنے اجتماعی شعور اور عزم سے زندہ رہتی ہیں۔

ایران کو ایک ممکنہ خانہ جنگی سے بچانا، دہشتگرد نیٹ ورکس کے پیچیدہ جال کو توڑنا، اور خطے میں ایک بڑی سازش کو ناکام بنانا — یہ سب ایسے اقدامات تھے جنہوں نے عالمی بساط کے بعض کھلاڑیوں کو بے چین کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج پاکستان کو ایک نئی آزمائش کے دہانے پر لا کھڑا کیا گیا ہے۔

پاکستان اور افغانستان کے درمیان بڑھتی ہوئی کشیدگی کو اگر صرف سرحدی جھڑپوں یا ڈرون حملوں کے محدود دائرے میں دیکھا جائے تو یہ حقیقت کی توہین ہوگی۔ یہ دراصل اس عالمی بساط کی ایک اور چال ہے جس کے خفیہ کھلاڑی خطے کی تقدیر کو اپنی خواہشات کے مطابق موڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کبھی دہشتگردی کے نام پر، کبھی پر کسی جنگ کے پردے میں، اور کبھی اطلاعاتی یا غار کے ہتھیار کے ساتھ افغانستان کی سرزمین سے اٹھنے والی یہ نئی آندھی بظاہر چند ڈرونز کی پرواز معلوم ہوتی ہے، مگر اس کے پیچھے جو سیاسی طوفان چھپا ہوا ہے وہ پورے خطے کو اپنی لپیٹ میں لے سکتا ہے۔ آگ کو بروقت نہ بجھایا گیا تو یہ محض سرحدی کشیدگی نہیں رہے گی بلکہ ایک ایسی جنگ کا پیش خیمہ بن سکتی ہے جس کے سائے ایٹمی تصادم تک پھیل سکتے ہیں۔

لیکن تاریخ کی ایک اور صداقت بھی ہے — اور وہ یہ کہ ظلم، فریب اور سازش کی قوتیں چاہے کتنی ہی طاقتور کیوں نہ ہوں، آخر کار وہ قومیں ہی سرخرو ہوتی ہیں جو اپنے عزم، اتحاد اور ایمان کی قوت سے آزمائش کے طوفانوں کا مقابلہ کرتی ہیں۔ پاکستان کی سرزمین نے اس سے پہلے بھی کئی آزمائشیں دیکھی ہیں۔ کبھی اسے دہشتگردی کی آگ میں جھونکنے کی کوشش کی گئی، کبھی اسے اقتصادی محاصروں کے ذریعے کمزور کرنے کا خواب دیکھا گیا، اور کبھی اسے عالمی تنہائی میں دھکیلنے کی تدبیریں کی گئیں۔ مگر ہر بار تاریخ نے یہ ثابت کیا کہ اس قوم کے حوصلے کو شکست دینا آسان نہیں۔

آج بھی اگر عالمی بساط کے کھلاڑی یہ سمجھتے ہیں کہ سازشوں اور پر کسی جنگوں کے ذریعے پاکستان کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے تو شاید وہ تاریخ کے اس سبق کو بھول رہے ہیں کہ قوموں کی طاقت صرف ہتھیاروں میں نہیں بلکہ ان کے اجتماعی عزم میں ہوتی ہے۔ یہی وہ لمحہ ہے جب خطے کی قیادت کو یہ

نفرت اور جنگ کے راستے پر آگے بڑھنا چاہتے ہیں یا دانش اور سفارت کی راہ اختیار کر کے آنے والی نسلوں کو ایک محفوظ فیصلہ کرنا ہو گا کہ آیا وہ مستقبل دینا چاہتے ہیں۔

کیونکہ اگر جنگ کا دروازہ کھل گیا تو اس کی آگ صرف سرحدوں تک محدود نہیں رہے گی بلکہ پورے خطے کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔ اور اگر تدبیر کا چراغ جلایا گیا تو یہی بحران شاید اس خطے کیلئے امن کی ایک نئی صبح کا پیش خیمہ بھی بن سکتا ہے۔ تاریخ کی عدالت میں قوموں کا فیصلہ صرف ان کی طاقت سے نہیں بلکہ ان کی بصیرت سے بھی ہوتا ہے۔ اور آنے والے دن یہ طے کریں گے کہ جنوبی ایشیا کی اس شطرنج میں کون سا فریق صرف ایک مہرہ ثابت ہو گا اور کون اپنی حکمت سے تاریخ کی بساط پر ایک نئی داستان رقم کرے گا۔

وقت کی عدالت خاموش نہیں رہتی۔ وہ ہر قوم کے فیصلے کو اپنے اوراق میں محفوظ کر لیتی ہے۔ آنے والے دن یہ طے کریں گے کہ جنوبی ایشیا کی اس بساط پر کون محض ایک مہرہ ثابت ہو گا اور کون اپنی حکمت و بصیرت سے تاریخ کے افق پر ایک نئی داستان رقم کرے گا۔ اور شاید یہی وہ لمحہ ہے جب قوموں کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جنگیں میدان میں جیتنے سے پہلے دلوں میں جیتی جاتی ہیں، اور وہ قوم جس کے دل میں یقین کی آگ روشن ہو اسے شکست دینا تاریخ کے کسی لشکر کیلئے ممکن نہیں ہوتا۔

جمہوریت کے سائے میں خون

تاریخ کے اوراق کبھی کبھار ایسے خون آلود واقعات کے ساتھ رقم ہوتے ہیں، جو انسانی شعور کو جھنجھوڑ دیتے ہیں اور انصاف کے پرانے پیمانوں پر سوالیہ نشان لگاتے ہیں۔ بھارت کی موجودہ سیاست کی تلخ حقیقتیں ان مظالم کا آئینہ ہیں، جن کا سنگین اثر نہ صرف سکھ برادری بلکہ عالمی ضمیر پر بھی پڑا۔ 1984 کا سانحہ سکھ قوم کے دلوں میں آج بھی ایک دردناک زخم ہے، جو کسی لمحے بھی بھلایا نہیں جاسکتا۔ اس سانحے میں دولاکھ سے زائد سکھوں کو محض اس لیے شہید کر دیا گیا کہ وہ اپنے آئینی حقوق کیلئے آواز بلند کر رہے تھے۔

گولڈن ٹیمپل، جو نہ صرف سکھ قوم کی روحانی روشنی بلکہ انسانیت کے پر امن پیغام کا مرکز ہے، اس مقدس مقام پر بمباری کی گئی۔ یہ ایک ایسا عمل، اخلاق، اور انسانی وقار کے سب سے بنیادی اصولوں کو پامال کر دیا۔ ہزاروں سکھ مرد، عورتیں، اور بچے موت کے گھاٹ اتار دیے تھے جس نے مذہب گئے۔ اس مظالم کی تاریخ میں سب سے زیادہ تکلیف دہ پہلو یہ تھا کہ اس آپریشن کیلئے ایک سکھ جنرل کا انتخاب کیا گیا، تاکہ قوم کے اپنے ہی زخموں میں نمک چھڑکنے کا عذاب محسوس ہو۔

لیکن بھارت کا یہ ظلم و ستم صرف اسی سانحے تک محدود نہ رہا۔ اس نے اپنی مکاری اور سازش کی عادت کے تحت کشمیری آزادی کی تحریک کو بھی بدنام کرنے کی کوشش کی۔ امریکی صدر بل کلنٹن کے دورے کے موقع پر جموں کے گوردوارہ چھتی سنگھ پورہ میں سکھوں کو بے رحمی سے گولیوں کا نشانہ بنایا گیا اور یہ سانحہ کشمیری مجاہدوں پر ڈال دیا گیا۔ یہ ایک ایسا بدترین انسانیت سوز اور مکروہ ظالمانہ کھیل تھا جو ریاستی طاقت، سازش اور بین الاقوامی سیاست کے خطرناک امتزاج کی عکاسی کرتا

عالمی دباؤ کے نتیجے میں بھارت نے تین رکنی تحقیقاتی کمیٹی قائم کی، جسٹس (ریٹائرڈ) اجیت سنگھ میٹز پنجاب ہیومن رائٹس آرگنائزیشن کے چیئرمین، جو انسانی حقوق کے تجربہ کار مقرر تھے۔ سردار اندرجیت سنگھ جانیے جو موومنٹ اگینسٹ اسٹیٹ ریپریشن کے کنوینر، جو ریاستی ظلم و ستم کے خلاف سرگرم رہنما تھے۔ لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) کرتار سنگھ گل جو موومنٹ اگینسٹ اسٹیٹ ریپریشن اور پنجاب ہیومن رائٹس آرگنائزیشن (پنجا ب تنظیم حقوق انسانی) کے مشیر، جن کے پاس عسکری اور حقوق انسانی دونوں میدانوں کا تجربہ تھا۔ یہ کمیٹی واقعے کی تحقیق کے بعد واضح طور پر انڈین خفیہ ایجنسی "را" کو ذمہ دار قرار دے چکی ہے، مگر بھارت نے ہر ممکن کوشش کی کہ اس رپورٹ کو دبایا جائے مگر ظلم کا سایہ اتنا گہرا نہیں ہوتا کہ وہ چھپ سکے، اور یہ رپورٹ عالمی سطح پر منظر عام پر آگئی۔

یہ تمام واقعات ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ متعصب ہندو توحکومت کس حد تک جمہوریت کی آڑ میں اپنے سیاسی مقاصد کیلئے انسانیت کو پامال کر سکتی ہے۔ دو لاکھ سکھوں کی قربانی، گولڈن ٹیمپل کی بے حرمتی، چھتی سنگھ پورہ کا خون اور بعد کی بین الاقوامی سازشیں ایک واضح مثال ہیں کہ طاقت، مذہب اور سیاست کے کھیل میں انسانی زندگی کس قدر بے بس ہو سکتی ہے۔ یہ تاریخی فریب اور مجرمانہ سازشیں عالمی ضمیر کیلئے ایک انتباہ ہیں کہ انصاف اور انسانی حق کی حفاظت کے بغیر آزادی محض ایک فریب ہے۔

یاد رہے کہ دنیا کی سیاست ایک سائے دار درخت کی مانند ہے، جس کی شاخوں میں طاقت، سازش اور خفیہ منصوبے پنپتے اور جکڑے ہوتے ہیں۔ دنیا کی سیاست ایک بے رحمانہ میدان اور ایک سنہری کتاب کی مانند بھی ہے، جس کے صفحات پر خون اور انصاف کے درمیان جدوجہد لکھی جاتی ہے۔ جہاں طاقت اور اثر و رسوخ کے کھیل اکثر پردے میں چھپے رہتے ہیں۔ دنیا کی اس سیاسی بزم میں، جہاں طاقت اور سیاست کے کھیل اکثر راز کی چادر میں لپٹے ہوتے ہیں، ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے عالمی ضمیر کو جھنجھوڑ دیا۔

نیویارک کی عدالت میں پیش ہوئے 54 سالہ مکھل گپتانے وہ راز فاش اور اس درخت کی سب سے اندھیری شاخ کو بے نقاب کیا جو پردوں میں چھپا تھا: گپتانے یہ انکشاف کیا کہ انڈیا کی مودی حکومت نے امریکی سر زمین پر باقاعدہ خفیہ منصوبہ بندی کے تحت کرائے کے قاتلوں کے ذریعے قتل کی گھناؤنی سازش تیار کی تھی اور ذرائع مہیا کر کے قتل کا اہتمام کیا تھا۔ یہ انکشاف ایک ایسی پردہ داری کو بے نقاب کرتا ہے جس میں انسانیت کے بنیادی اصول دبی ہوئے ہیں، اور طاقت کی سیاہ موجیں انصاف کی روشنی پر چھا جاتی ہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو انسانی ضمیر کو جھنجھوڑ دیتی ہے۔ یہ سازش جیسے انسانی ضمیر کی آزمائش کا ایک آئینہ پیش کرتی ہے، اور یہ بتاتی ہے کہ طاقت کبھی کبھار انصاف کی روشنی پر سایہ ڈال دیتی ہے۔

مکھل گپتانے تین سنگین جرائم تسلیم کیے: قتل کیلئے مالی امداد لینا، اجرت کے عوض قتل، اور مٹی لانڈرنگ کی سازش۔ مکملہ سزا 40 سال تک کی قید ہے۔ اس سازش کا ہدف امریکی شہری گریپنوت سنگھ پٹوں تھے، جو خالصتان تحریک کے پر جوش حامی ہیں۔ ایک تحریک جو سکھ قوم کیلئے علیحدہ وطن کا خواب سجائے ہوئے ہے۔ یہ تحریک سکھ قوم کیلئے علیحدہ وطن کے خواب کا امین ہے، یہ تحریک سکھ قوم کیلئے علیحدہ وطن کے خواب کی تجلی ہے جس کے رنگ بیرون ملک بھی جھلکتے ہیں جسے اندرون اور بیرون ملک کے لاکھوں حامی بھی دلوں کی گہرائیوں سے سپورٹ کرتے ہیں۔

امریکی وکیل جے کلیٹن نے عدالت میں کہا مکھل گپتانے امریکی سر زمین پر ایک شہری کو قتل کرنے کی سازش کی، صرف اس لیے کہ وہ اپنے اظہار رائے کے جائز حق کو استعمال کر رہے تھے۔ یہ بیان اس بات کی گواہی ہے کہ ایک آزاد ملک میں بھی طاقتور بیرونی قوتیں انسانیت کے بنیادی حقوق کو دبا سکتی ہیں۔ یہ الفاظ اس حقیقت کی آئینہ دار ہیں کہ آزاد ملک بھی بعض اوقات طاقتور بیرونی قوتوں کی چھٹاؤں میں انسانی حقوق کے معیار سے محروم ہو جاتے ہیں۔ یہ الفاظ اس حقیقت کی عکاسی کرتے ہیں کہ آزاد ممالک میں بھی طاقتور قوتیں انسانی حقوق کی دھوپ میں سائے ڈال سکتی ہیں۔

یہ جملہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ آزادی کا روشن چراغ کبھی کبھی طاقت کے سائے میں مدھم پڑ سکتا ہے، مگر انصاف کی روشنی ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ یہ الفاظ اس بات کا بھی ثبوت ہیں کہ آزادی اور انصاف کی روشنی اور حقیقت کی کرن ہمیشہ روشن رہتی ہے۔ گپتا ایک خود ساختہ تحفظ کے شکنجے میں تھا اور خود کو ایک محفوظ خلاء میں سمجھ رہا تھا، اس نے سوچا کہ انجام تک پہنچنے والا عمل اسے کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا اور اس سازش سے کچھ نہ بگڑے گا کہ اس کی۔ لیکن قانون کی روشنی نے اس فریب کی پردہ داری کو فاش کرتے ہوئے اسے اس کے اعمال کے آئینے پر پشت پر مودی جیسا ظالم و سفاک آدمی کھڑا ہے اور انصاف کے دروازے پر کھڑا کر دیا جیسے اندھیری راہ میں چراغ جل جائے۔

عالمی ذرائع ابلاغ نے گپتا کے اعتراف کو عدالتی تصدیق کی سند قرار دیا، جو ثابت کرتی ہے کہ مودی حکومت نے امریکی زمین پر قتل کیلئے منصوبہ بندی کی سازش کی تھی۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو عالمی سیاست کے پیچ و خم کو آشکار کرتی ہے۔ یہ وہ لمحہ ہے جہاں تاریخ کے اوراق پر سچائی کے حروف لکھ دیے گئے۔ بھارت نے پٹوں کو دہشتگرد قرار دے رکھا ہے، لیکن وہ خود اپنے آپ کو محض کارکن کہتے ہیں۔ سکھ برادری بھارت کی مجموعی آبادی کا دو فیصد ہیں



، مگر کچھ حلقے ان کیلئے علیحدہ وطن کی آرزو اور خواب سجائے ہوئے ہیں۔ بیرون ملک مقیم حامی خالصتاً کیلئے آواز بلند کرتے ہیں، جو ایک قومی فطرت کی عکاسی اور تجلی ہے جو صبر و استقامت کی علامت ہے۔

استغاثہ کے مطابق، مئی 2023 میں انڈین حکومت کے ملازم وکاش یادو نے گیتا کو گریپٹونٹ سنگھ پٹوں کو قتل کرنے کی ذمہ داری سوپنی۔ دہلی میں ملاقات کے ذریعے قتل کی ممکنہ منصوبہ بندی کی گئی۔ یادو کابینہ سیکریٹریٹ میں کام کرتے تھے، جہاں انڈین خفیہ ایجنسی "را" کا دفتر بھی موجود ہے۔ یہ منظر سیاسی سازشوں کی کالی جالی کی مانند ہے۔ یادو ششی حکم پر گیتا نے امریکی خفیہ افسر سے رابطہ کیا، جو خود کو قاتل

ظاہر کر رہا تھا۔ اس نے قاتل کا کردار ادا کر کے گیتا کو پٹوں کی معلومات فراہم کیں، جن میں گھر اور فون نمبر شامل تھے۔ یہ ایک تمثیل ہے کہ جہاں دھوکہ اور مکاری چھپی ہو، وہاں انصاف کی آنکھ ہمیشہ جاگتی ہے۔ مبینہ طور پر گیتا نے نجر کے قتل کے بعد مزید اہداف کی فہرست "اجرتی قاتل" کو دی کینیڈا نے ان الزامات کی روشنی میں انڈیا پر تنقید کی، مگر بھارت نے ان کی سختی سے تردید کی۔ یہ واقعہ عالمی سیاست کے پیچ و خم میں اخلاقی امتحان کی ایک دلیل ہے۔

پٹوں نے 1990ء دہائی میں پنجاب یونیورسٹی، ندی گڑھ سے قانون کی تعلیم حاصل کی۔ طالب علمی کے دنوں سے ہی وہ سیاست کے رنگ میں رنگے ہوئے، اور امریکہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد سکھس فار جسٹس کی بنیاد رکھی۔ وہ عوامی طور پر خالصتاً کے قیام کی اپیل کرتے رہے، جو ایک تاریخی جدوجہد کی داستان ہے۔

6 مئی 2024 کو کینیڈا کی پولیس نے تین انڈین شہریوں کو گرفتار کیا، جو نجر کے قتل میں ملوث تھے۔ نجر وینکوور کے گرونانک سکھ گرو دوارے کے صدر تھے اور 18 جون 2023 کو قتل ہوئے۔ گرفتار افراد کرن برار، کرن پریت سنگھ، اور کمل پریت سنگھ ہیں، جو مغربی پنجاب کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ سازش سے پتہ چلتا ہے کہ سازش صرف کسی ایک فرد تک محدود نہیں، بلکہ یہ ایک جالی دار منصوبہ ہے۔

14 ستمبر 2023 کو خالصتائی رہنماؤں کے پراسرار قتل اور تجارتی معاہدے پر جھٹکے کے باعث کینیڈا اور انڈیا کے کشیدہ تعلقات عروج پر پہنچ گئے۔ وزیر اعظم جسٹن ٹروڈو نے انڈین حکومت کے ایجنٹوں کے ملوث ہونے کا الزام لگایا، جس سے دونوں ممالک کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوئی۔ یہ ایک ایسا لمحہ تھا جہاں سیاست اور اخلاقیات کا ٹکراؤ عیاں ہوا۔

اخلاقیات کا ٹکراؤ عیاں ہوا۔ 20 اجلاس میں شریک کینیڈا کے وزیر اعظم ٹروڈو دونوں ممالک کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوئی۔ یہ ایک سبق ہے کہ عالمی سیاست میں بھی ہر کارروائی کے اثرات کی گہرائی کو پہچاننا ضروری ہے۔ مودی اور ٹروڈو درمیان گرم گرم بات چیت ہوئی، اس میں سکھ علیحدگی پسند تحریک اور

فارتی مسائل زیر بحث آئے۔ جی 20 اجلاس میں کشیدہ ملاقات کے دوران مودی اور ٹروڈو کے درمیان گرما گرم بحث میں سکھ علیحدگی پسند تحریک اور سفارتی مسائل زیر بحث آئے۔ یہ منظر سیاسی ڈرامے کی مانند ہے، جس میں ہر لفظ کا وزن ہے۔ مودی حکومت سکھ علیحدگی پسندوں کی بین الاقوامی مقبولیت اور انڈین سفارتکاروں کے خلاف تشدد سے ناخوش تھی۔ یہ ایک تاریخی منظر ہے جہاں طاقت اور مزاحمت کی کشمکش عیاں ہوتی ہے۔

ٹروڈو نے کہا کہ انڈیا کی کارروائیاں کینیڈا کی ملکی سیاست میں مداخلت کے مترادف ہیں۔ یہ ایک عبرت آموز واقعہ ہے کہ یہ تمام واقعات عالمی سیاست اثرورسوخ، اور اقلیتوں کے حقوق کے تناظر میں ایک نیا اور متنازع باب کھولتے ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ دنیا کی سیاست بھی ایک میں طاقت، شطرنج کی طرح ہے، جس میں ہر چال کی قدر دانی ضروری ہے۔ یہ ایک ایسی کہانی ہے جو سچائی اور اخلاقیات کی روشنی میں پڑھی جاتی ہے۔ یہ سلسلہ اس سفارتی طاقتیں انسانی حق و انصاف کے آئینے میں کس طرح جھلکتی ہیں۔ ہر واقعہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ اور بات کا روشن ثبوت ہے کہ سیاسی، مذہبی، آزادی، قانون، اور انصاف کی روشنی میں حقیقت کو چھپایا نہیں جاسکتا، اور عالمی ضمیر ہمیشہ بیدار رہتا ہے۔

یہ خون آلود صفحات، یہ مجرمانہ سازشیں، اور یہ تاریخی مظالم ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ طاقت، سیاست اور مذہب کا کھیل انسانی زندگی کے حقوق اور وقار کو کبھی ختم نہیں کر سکتا۔ ان تمام مظالم کی روشنی میں یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ بھارت کی طاقتور حکومتیں جمہوریت کے نام پر نہ صرف اقلیتوں کے بنیادی حقوق کو دباتی ہیں، بلکہ عالمی سطح پر بھی خوف و دھمکی کے سائے ڈالتی ہیں۔ 1984 کے گولڈن ٹیمپل حملے میں شہید ہونے والے دو لاکھ سکھوں کی قربانی اور چھتی سنگھ پورہ میں بے رحمانہ قتل عام یہ ثابت کرتا ہے کہ ریاستی طاقت کس طرح مذہبی اور نسلی منافرت کے آڑ میں انسانی وقار کو پامال کر سکتی ہے۔ گولڈن ٹیمپل کی بے حرمتی، اور چھتی سنگھ پورہ کا خون تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ زندہ رہیں گے، تاکہ نسل در نسل یاد دلایا جاسکے کہ ظلم کی انتہا کہاں تک جاسکتی ہے۔

یہ سانحات نہ صرف سکھ برادری کیلئے ایک تاریخی زخم ہیں، بلکہ عالم انسانیت کیلئے ایک عبرت ہیں۔ ان مظالم کی حقیقت کو چھپانا، تاریخ کی روشنی کو مسخ کرنے کے مترادف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انڈین خفیہ ایجنسی "را" کی منصوبہ بندی اور ریاستی سازشیں اقلیتوں کی آزادی اور انسانی حقوق کیلئے ایک مسلسل خطرہ رہی ہیں۔ یہ سازشیں، چاہے وہ امریکی زمین پر قتل کی منصوبہ بندی ہو یا کشمیری آزادی کی تحریک کو بدنام کرنے کی کوشش، ایک واضح مثال ہیں کہ طاقت کے غلط استعمال کا انجام صرف ظلم اور خون ریزی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

اقوام عالم کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ بھارت کے اس تعصب اور مکاری کے سائے میں جمہوریت کے مینار جھک گئے ہیں۔ یہ وہ لمحے ہیں جب انسانی ضمیر بیدار ہونا چاہیے، تاکہ آئندہ نسلوں کو ایسے مظالم سے محفوظ رکھا جاسکے۔ تاریخ کی عدالت میں یہ تمام واقعات ہمیشہ ریکارڈ رہیں گے، اور سچائی کے علمبردار کبھی خاموش نہیں رہیں گے۔ دو لاکھ سکھوں کی قربانی، ہزاروں معصوم جانوں کا خون، اور عالمی دباؤ کے باوجود دبائی جانے والی رپورٹیں یہ ثابت کرتی ہیں کہ حقیقت کبھی چھپ نہیں سکتی۔ ہیں کہ ظلم کی جڑیں گہری ہو سکتی ہیں،

یہ سانحات، یہ خون آلود صفحات، اور یہ مجرمانہ سازشیں ایک سبق ہیں: طاقت، سیاست اور مذہب کا کھیل انسانی زندگی کے حقوق اور وقار کو کبھی نہیں عدل و انصاف کی کرن ہمیشہ ظلم کے سائے میں روشنی ڈالتی رہے گی۔ اقوام عالم کو یاد رکھنا چاہیے کہ بھارت کی مکاری اور متعصب ہندو توا کی مٹاسکتا، اور

حکمرانی کے سائے میں جمہوریت محض ایک فریب ہے۔ مگر حقیقت ہمیشہ سامنے آتی ہے، اور انصاف کی کرن ظلم کی تاریکی میں بھی روشنی ڈالتی ہے۔
یہی سبق ہے جو انسانی ضمیر، تاریخ، اور آئندہ نسلوں کیلئے ضروری ہے۔

جمعرات 6 شوال المعظم 1447ھ 26 مارچ 2026ء

آسیہ اندرابی: سوال جو دبایا نہ جاسکا

وہ کہانی جو فیصلہ مانگتی ہے

کشمیر... ایک نام نہیں، ایک زخم ہے۔ ایسا زخم جو وقت کے ساتھ مند مل ہونے کی بجائے اور گہرا ہو تا چلا گیا۔ تاریخ کے اوراق پر اگر کبھی آنسوؤں کی روشنائی سے کوئی داستان لکھی گئی ہو، تو وہ یقیناً کشمیر کی داستان ہے۔ یہاں کی برفانی چوٹیاں صرف حسن کی علامت نہیں بلکہ صدیوں کے دکھوں کی گواہ بھی ہیں۔ یہاں کی ہوائیں جب چلتی ہیں تو وہ محض موسم نہیں بدلتی، وہ اپنے ساتھ چیخوں کی بازگشت، مچھرنے والوں کی صدائیں، اور ادھوری تمنائوں کا بوجھ اٹھائے پھرتی ہیں۔

یہ وہ سرزمین ہے جہاں بچپن خوف کے سائے میں پروان چڑھتا ہے، جوانی سوالوں میں گم ہو جاتی ہے، اور بڑھاپا انتظار کی دلیلیز پر بیٹھا رہتا ہے۔ جہاں ہر دروازے کے پیچھے ایک کہانی ہے، ہر آنکھ میں ایک خواب دفن ہے، اور ہر دل میں ایک بے نام سی کسک۔ کشمیر صرف نقشے کا ایک حصہ نہیں۔ یہ ایک زندہ حقیقت ہے، ایک مسلسل آزمائش، ایک ایسا مقدمہ جو ابھی تک تاریخ کی عدالت میں زیرِ سماعت ہے۔

اور اسی المیے کے بیچ کچھ کردار ایسے ابھرتے ہیں جو وقت کے دھارے کے خلاف کھڑے ہو جاتے ہیں۔ آسیہ اندرابی بھی انہی کرداروں میں سے ایک ہیں۔ ایک نام، جو صرف ایک فرد کی پہچان نہیں بلکہ ایک سوچ، ایک مزاحمت، ایک سوال کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ ان کی کہانی ہمیں اس مقام پر لا کھڑا کرتی ہے جہاں ہمیں فیصلہ نہیں، بلکہ محسوس کرنا پڑتا ہے؛ جہاں ہمیں سننا نہیں، بلکہ دل سے سننا پڑتا ہے۔

کشمیر برصغیر کا وہ خطہ ہے جو گزشتہ سات دہائیوں سے سیاسی، جغرافیائی اور انسانی بحران کا مرکز بنا ہوا ہے۔ کشمیر صرف ایک جغرافیائی خطہ نہیں بلکہ ایک زندہ المیہ ہے۔ ایک ایسا المیہ جس میں نسلیں پلتی ہیں، جوان ہوتی ہیں۔ کشمیر کی برف پوش وادیوں میں جب ہوا چلتی ہے تو وہ صرف درختوں کی شاخوں کو نہیں ہلاتی، بلکہ اپنے ساتھ ایک طویل تاریخ کی آہیں، سکسکیاں اور ادھوری دعائیں بھی بہا لے جاتی ہے۔ یہ وہ سرزمین ہے جہاں خوبصورتی اور کرب ایک ساتھ سانس لیتے ہیں۔ جہاں جھیلوں کا پانی شفاف ہے مگر دلوں کے اندر برسوں کی بے قراری موجزن ہے۔ اس تنازعے نے نہ صرف دو ایٹمی طاقتوں، پاکستان اور

بھارت کے درمیان کشیدگی کو جنم دیا بلکہ لاکھوں کشمیریوں کی زندگیوں کو بھی شدید متاثر کیا۔ اسی پس منظر میں کشمیری حریت پسند قیادت کے چند نمایاں نام سامنے آتے ہیں، جن میں آسیہ اندرابی ایک اہم اور متنازع شخصیت کے طور پر ابھرتی ہیں۔ آسیہ اندرابی — جو کسی کے نزدیک مزاحمت کی علامت ہے، کسی کے نزدیک تنازع، مگر ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ وہ ایک ایسی عورت ہیں جن کی زندگی جدوجہد، قربانی اور دکھوں کی ایک طویل داستان بن چکی ہے۔ آسیہ اندرابی، ان کی زندگی ایک فرد کی کہانی نہیں بلکہ ایک عہد، ایک نظریہ اور ایک مسلسل جدوجہد کی علامت بن چکی ہے۔

آسیہ اندرابی 1960 کی دہائی میں کشمیر میں پیدا ہوئیں۔ ان کا تعلق ایک تعلیم یافتہ گھرانے سے تھا۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم سرینگر میں حاصل کی اور بعد ازاں سائنس کے شعبے میں تعلیم حاصل کی۔ تاہم، ان کی زندگی کا رخ اس وقت تبدیل ہوا جب انہوں نے کشمیر میں بڑھتی ہوئی سیاسی بے چینی اور عوامی رد عمل کو قریب سے دیکھا۔ ان کے ذہن میں جلد ہی یہ خیال مضبوط ہو گیا کہ کشمیر کے مسئلے کو صرف سیاسی نہیں بلکہ نظریاتی بنیادوں پر بھی یہی

سوچ بعد میں ان کی عملی جدوجہد کی بنیاد بنی۔ 1980 اور 1990 کی دہائی میں کشمیر میں بڑھتی ہوئی مزاحمت اور عوامی بے اٹھانے کی ضرورت ہے۔ چینی نے انہیں عملی جدوجہد کی طرف مائل کیا۔ حوالہ جاتی طور پر دیکھا جائے تو اس دور میں کشمیر میں مسلح اور غیر مسلح دونوں طرح کی تحریکیں ابھر رہی تھیں، جنہوں نے نوجوان نسل کو شدید متاثر کیا۔

آسیہ اندرابی نے 1980 کی دہائی میں دختران ملت کی بنیاد رکھی۔ دختران ملت کا قیام آسیہ اندرابی کی زندگی کا ایک اہم موڑ تھا۔ یہ تنظیم بنیادی طور پر کشمیری خواتین کو متحرک کرنے، اسلامی شناخت کو اجاگر کرنے اور بھارت کے خلاف سیاسی مزاحمت کو منظم کرنے کیلئے قائم کی گئی تھی۔ اس تنظیم کا مقصد کشمیری خواتین کو نہ صرف سماجی بلکہ سیاسی شعور دینا بھی تھا۔ یہ تنظیم ایک منفرد ماڈل پیش کرتی ہے جہاں خواتین کو محض متاثرہ فریق نہیں بلکہ فعال مزاحمت کار کے طور پر پیش کیا گیا۔ اس نے کشمیر کی تحریک میں صنفی کردار کو بدلنے کی کوشش کی۔ یہ تنظیم دیگر حریت پسند گروہوں سے اس لحاظ سے مختلف تھی کہ اس نے خواتین کو براہ راست سیاسی اور نظریاتی جدوجہد کا حصہ بنایا۔ آسیہ اندرابی کا ماننا تھا کہ آزادی کی تحریک میں خواتین کا کردار نہایت اہم ہے۔

کشمیر کا مسئلہ 1947 کی تقسیم ہند کے بعد ایک متنازع خطہ بن گیا۔ اقوام متحدہ کی قراردادوں میں کشمیری عوام کو حق خود ارادیت دینے کی بات کی گئی، مگر یہ وعدہ آج تک عملی شکل اختیار نہ کر سکا۔ بین الاقوامی قانون، خاص طور پر اقوام متحدہ کے چارٹر، میں حق خود ارادیت کو ایک بنیادی اصول تسلیم کیا گیا ہے۔ تاہم، اس اصول کا اطلاق اکثر سیاسی مفادات کی نذر ہو جاتا ہے۔ کشمیری قیادت، بشمول آسیہ اندرابی، اس بات پر زور دیتی رہی ہے کہ کشمیری عوام کو اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرنے کا حق حاصل ہے، جو کہ بین الاقوامی قانون اور اقوام متحدہ کے چارٹر کے مطابق ایک تسلیم شدہ اصول ہے۔

بین الاقوامی قانون کے تحت حق خود ارادیت ایک بنیادی انسانی حق ہے۔ آسیہ اندرابی اور ان جیسے دیگر رہنما اسی اصول کی بنیاد پر اپنی جدوجہد کو جائز قرار دیتے ہیں۔ بھارتی حکومت، دوسری جانب، اس تحریک کو علیحدگی پسندی اور ریاستی سالمیت کے خلاف قرار دیتی ہے جو عالمی قوانین کے بھی خلاف ہے۔ اسی تضاد نے کشمیر کو ایک مسلسل تنازعہ بنا دیا ہے۔

بھارتی حکومت نے آسیہ اندرابی کے خلاف مقدمات درج کیے جن کی بنیاد یو اے پی اے اور بھارتی پینل کوڈ کی دفعات مثلاً 120 پر رکھی گئی۔ نیشنل انویسٹی گیشن ایجنسی کے مطابق، ان کی سرگرمیاں ریاستی سالمیت کے خلاف تھیں۔ یو اے پی اے ایک سخت قانون ہے جسے بھارت میں دہشتگردی اور ریاست مخالف سرگرمیوں کے خلاف استعمال کیا جاتا ہے، مگر ناقدین کے مطابق اس کا استعمال اکثر اوقات سیاسی مخالفین کے خلاف بھی کیا جاتا ہے۔

آسیہ اندرابی کی جدوجہد صرف سیاسی نہیں بلکہ نظریاتی بھی تھی۔ ان کی تقاریر میں مذہبی اور قومی شناخت کا گہرا امتزاج نظر آتا ہے۔ آسیہ اندرابی نے کئی دہائیوں تک تقاریر، تحریروں اور احتجاجی سرگرمیوں کے ذریعے اپنی آواز بلند کی۔ وہ اکثر کشمیری عوام کے حق میں ریلیوں اور مظاہروں میں شریک رہیں۔ ان کی تقاریر میں مذہبی رنگ نمایاں ہوتا تھا، جس کی وجہ سے انہیں ایک نظریاتی رہنما بھی سمجھا جاتا ہے۔ ان کی جدوجہد پر کچھ حلقے تنقید بھی کرتے ہیں، جبکہ دیگر انہیں مزاحمت کی علامت قرار دیتے ہیں۔ تاہم یہ پہلو انہیں دیگر حریت رہنماؤں سے ممتاز کرتا ہے، کیونکہ وہ تحریک کو ایک

نظریاتی اور مذہبی بنیاد پر بھی پیش کرتی ہیں اور کشمیر میں نوجوانوں کی اکثریت ان کو اپنے دل کی آواز سمجھتے ہیں۔

بھارتی حکومت نے آسیہ اندرابی پر متعدد مقدمات قائم کیے، جن میں سب سے اہم مقدمہ نیشنل انویسٹی گیشن ایجنسی کی جانب سے درج کیا گیا۔ انہیں یو اے پی اے اور بھارتی پینل کوڈ کی دفعات کے تحت قصور وار قرار دیا گیا۔ عدالت نے انہیں عمر قید کی سزا سنائی، جبکہ ان کی ساتھیوں صوفی فہمیدہ اور ناہیدہ نسرین کو بھی طویل قید تیس سال کی سزا دی گئی۔

آسیہ اندرابی کے شوہر قاسم فلتو بھی ایک معروف کشمیری رہنما ہیں، جو کئی دہائیوں سے جیل میں قید ہیں۔ ان پر بھی بھارت مخالف سرگرمیوں کے الزامات عائد کیے گئے۔ ان کی طویل قید کو انسانی حقوق کے حلقوں میں ایک اہم مسئلہ سمجھا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے جیل میں شدید مشکلات اور تنہائی برداشت کی، مگر اپنے نظریات سے پیچھے نہیں ہٹے۔ ان کی طویل قید انسانی حقوق کے تناظر میں ایک اہم کیس کے طور پر دیکھی جاتی ہے، جہاں طویل قبل از سزا حراست اور منصفانہ ٹرائل جیسے سوالات اٹھتے ہیں۔

جیل صرف ایک قانونی سزا نہیں بلکہ ایک نفسیاتی آزمائش بھی ہے۔ آسیہ اندرابی اور ان کے شوہر دونوں نے جیل میں طویل تنہائی کا عرصہ گزرا ہے لیکن وہ ابھی تک اپنے جائز موقف پر انتہائی استقامت سے ایک چٹان کی طرح کھڑے ہیں۔ رپورٹس کے مطابق، انہیں محدود سہولیات، طبی مسائل اور اہل خانہ سے دوری جیسے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ حالات انسانی حقوق کے عالمی معیار کے مطابق ایک سنجیدہ سوال اٹھاتے ہیں کہ آیا قیدیوں کے ساتھ مناسب سلوک کیا جا رہا ہے یا نہیں۔ ہیومن رائٹس واچ اور ایمنسٹی انٹرنیشنل جیسے ادارے عام طور پر ایسے معاملات کو انسانی حقوق کے تناظر میں دیکھتے ہیں، خاص طور پر جب قید طویل ہو اور حالات سخت ہوں۔ بین الاقوامی انسانی حقوق کی تنظیمیں جیسے ایمنسٹی انٹرنیشنل اور ہیومن رائٹس واچ عموماً ایسے معاملات پر آواز اٹھاتی رہی ہیں، مگر بعض ناقدین کے مطابق آسیہ اندرابی کے معاملے پر ان کی خاموشی یا محدود رد عمل سوالیہ نشان بن چکا ہے۔ یہ خاموشی کئی وجوہات کی بنا پر ہو سکتی ہے، جن میں سیاسی دباؤ، معلومات کی کمی، یا علاقائی حساسیت شامل ہیں۔

یہ ایک اہم سوال ہے کہ عالمی اداروں کا رد عمل کیوں محدود نظر آتا ہے۔ ممکنہ وجوہات، سیاسی حساسیت، علاقائی طاقتوں کا دباؤ، معلومات تک محدود رسائی، تاہم، اصولی طور پر انسانی حقوق کی تنظیموں کو ہر ایسے کیس پر غیر جانبدارانہ آواز اٹھانی چاہیے۔

کشمیر کا مسئلہ صرف ایک علاقائی تنازعہ نہیں بلکہ عالمی سیاست کا ایک پیچیدہ مسئلہ ہے، جہاں بڑی طاقتیں اکثر اپنے مفادات کو ترجیح دیتے ہوئے اکثر اپنے مفادات کے تحت اس مسئلے پر خاموشی اختیار کرتی ہیں۔ اسی وجہ سے انسانی حقوق کے مسائل اکثر پس منظر میں چلے جاتے ہیں، اور متاثرہ افراد عالمی توجہ سے محروم رہ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیری عوام، بشمول آسیہ اندرابی، خود کو عالمی سطح پر تنہا محسوس کرتے ہیں۔

آسیہ اندرابی کی شخصیت متنازع ہے۔ کچھ لوگ انہیں آزادی کی علامت سمجھتے ہیں، کچھ کے نزدیک وہ مزاحمت کی علامت ہیں جبکہ دیگر انہیں شدت پسندی سے جوڑتے ہیں۔ حقیقت شاید ان دونوں کے درمیان کہیں موجود ہے۔ ان کی جدوجہد کو سمجھنے کیلئے جہاں کشمیر کے پیچیدہ سیاسی، مذہبی اور سماجی تناظر کو مد نظر رکھنا ضروری ہے وہاں ایک متوازن تجزیہ کیلئے دونوں نقطہ نظر کو سمجھنا ضروری ہے۔ ایک خاتون رہنما کے طور پر آسیہ اندرابی کی جدوجہد ایک الگ اہمیت رکھتی ہے۔ انہوں نے نہ صرف ذاتی مشکلات برداشت کیں بلکہ اپنے نظریے کیلئے قربانیاں بھی دیں۔ ان کی کہانی صرف سیاست نہیں بلکہ انسانی جذبات، قربانی اور استقامت کی بھی عکاس ہے۔ آسیہ اندرابی کی کہانی کسی عام انسان کی کہانی نہیں۔ یہ ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جس نے



اپنی زندگی کے آرام، اپنے گھر کی سکون بھری دیواریں، اور اپنے خاندان کی قربت سب کچھ ایک نظریے کیلئے قربان کر دیا۔ ایک ماں، ایک بیوی، ایک بیٹی۔ ان سب رشتوں کے پیچھے ایک ایسا دل دھڑکتا رہا جو اپنے لوگوں کے دردس جڑا ہوا تھا۔

جب وہ جوان تھیں، تب شاید ان کے خواب بھی عام لڑکیوں جیسے ہی ہوں گے۔ ایک پرسکون زندگی، ایک خوشحال گھر، بچوں کی ہنسی، اور ایک محفوظ مستقبل۔ مگر کشمیر کی گلیوں میں پھیلی بے چینی، سڑکوں پر گونجتے نعروں کی بازگشت، اور گھروں میں پھیلے خوف نے ان کے خوابوں کا رخ بدل دیا۔ وہ خاموش تماشائی نہ بن سکیں۔ انہوں نے سوال کیا، اور

پھر وہ خود ایک سوال بن گئیں۔ ایسا سوال جس کا جواب آج تک دنیا تلاش نہیں کر سکی اور جو ان کو سمجھ پائے، انہوں نے اسے ایک عظیم مجاہدہ اور مومنہ پایا جنہوں نے اپنی زندگی کو اللہ کے بندوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر دوبارہ اللہ کی غلامی میں دینا اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا ہے۔

دختران ملت کی بنیاد رکھنا صرف ایک تنظیم بنانا نہیں تھا، بلکہ یہ ایک اعلان تھا۔ ایک اعلان کہ کشمیری خواتین صرف گھروں تک محدود نہیں رہیں گی، بلکہ وہ بھی تاریخ کا حصہ بنیں گی۔ آسیہ اندرابی نے عورتوں کو وہ آواز دی جو صدیوں سے دبائی جاتی رہی تھی۔ انہوں نے انہیں سکھایا کہ خاموشی بھی ایک جرم ہو سکتی ہے، اور بولنا ایک فرض۔ مگر ہر آواز کی ایک قیمت ہوتی ہے۔ اور آسیہ اندرابی نے وہ قیمت اپنی آزادی کی صورت میں ادا کی۔

جیل کی سلاخیں صرف لوہے کی نہیں ہوتیں، وہ وقت کی زنجیریں بھی ہوتی ہیں۔ وہ انسان کو اس کے اپنوں سے، اس کے خوابوں سے، اور کبھی کبھی خود اس کی ذات سے بھی جدا کر دیتی ہیں۔ آسیہ اندرابی نے اپنی زندگی کے کئی سال ان سلاخوں کے پیچھے گزارے۔ ہر گزرتا دن ایک صدی کی طرح، ہر رات ایک نہ ختم ہونے والی خاموشی کی طرح۔ سوچیں، ایک ماں جو اپنے بچوں کو اپنے ہاتھوں سے کھانا نہ کھلا سکے، جو ان کے سر پر ہاتھ نہ رکھ سکے، جو ان کے آنسو نہ پونچھ سکے۔ وہ ماں کس کرب سے گزرتی ہوگی؟ جیل کی دیواریں شاید اس کے آنسوؤں کو جذب کر لیتی ہوں، مگر اس کے دل کی چیخیں کہاں جاتی ہوں گی؟

اور پھر ان کے شوہر، قاسم کھٹو۔ ایک اور داستان، ایک اور قید، ایک اور طویل انتظار۔ ایک ایسا شوہر جو برسوں سے جیل کی دیواروں کے پیچھے ہے، جس نے اپنی جوانی، اپنی زندگی کے قیمتی سال، سب کچھ قید میں گزار دیے۔ ایک ایسا رشتہ جو ملّا قاتلوں کے چند لمحوں تک محدود ہو گیا، جہاں باتیں بھی نگاہوں سے کی جاتی ہیں، اور خاموشی بھی ایک زبان بن جاتی ہے۔ یہ صرف ایک خاندان کی کہانی نہیں، یہ ہزاروں خاندانوں کی کہانی ہے۔ مگر آسیہ اندرابی اور ان کے شوہر کی کہانی اس لیے زیادہ گہری محسوس ہوتی ہے کیونکہ اس میں قربانی کی شدت زیادہ ہے، تنہائی کی گہرائی زیادہ ہے، اور انتظار کی لمبائی زیادہ ہے۔

انسانی حقوق کی بات کرنے والی دنیا کہاں ہے؟ وہ آوازیں کہاں ہیں جو ظلم کے خلاف اٹھتی ہیں؟ وہ تنظیمیں کہاں ہیں جو ہر مظلوم کیلئے بولنے کا دعویٰ

کرتی ہیں؟ کیا کچھ کہانیاں اتنی خاموش ہوتی ہیں کہ وہ سنائی ہی نہیں دیتیں، یا کچھ خاموشیاں اتنی بھاری ہوتی ہیں کہ انہیں سننے کی ہمت نہیں ہوتی؟ یہ سوال صرف آسیہ اندرابی کا نہیں، یہ سوال ہر اس انسان کا ہے جو انصاف پر یقین رکھتا ہے۔

کشمیر کی راتیں بہت لمبی ہوتی ہیں۔ برف سے ڈھکی پہاڑیوں کے درمیان جب اندھیرا چھا جاتا ہے، تو لگتا ہے جیسے وقت رک گیا ہو۔ ایسے میں کسی جیل کی کوٹھڑی میں بیٹھی ایک عورت شاید آسمان کی طرف دیکھتی ہوگی، اور سوچتی ہوگی۔ کیا آزادی بھی کبھی اتنی ہی قریب ہوگی جتنے یہ ستارے؟ یہ ایک عجیب تضاد ہے۔ آسمان آزاد ہے، پرندے آزاد ہیں، ہوا آزاد ہے، مگر انسان قید ہے۔ اس کے خواب قید ہیں، اس کی خواہشیں قید ہیں، اس کی زندگی قید ہے۔ آسیہ اندرابی کی کہانی ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم رک کر سوچیں۔ یہ ہمیں جھنجھوڑتی ہے، ہمیں بے چین کرتی ہے، اور ہم سے سوال کرتی ہے۔ کیا ہم واقعی ایک انصاف پسند دنیا میں رہ رہے ہیں؟ یہ مضمون کسی فیصلے کیلئے نہیں، کسی کورسٹ یا غلط ثابت کرنے کیلئے نہیں۔ یہ صرف ایک انسانی کہانی ہے۔ ایک ایسی کہانی جو آنسوؤں سے لکھی گئی ہے، صبر سے سنواری گئی ہے، اور وقت کے ہاتھوں آزمائی گئی ہے۔

جب ایک عورت اپنے نظریے کیلئے سب کچھ قربان کر دیتی ہے، تو وہ صرف ایک فرد نہیں رہتی، وہ ایک علامت بن جاتی ہے۔ آسیہ اندرابی بھی ایک ایسی ہی علامت ہیں۔ کسی کیلئے امید کی، کسی کیلئے مزاحمت کی، اور کسی کیلئے ایک نہ ختم ہونے والے تنازع کی۔ مگر ایک بات طے ہے۔ ان کی کہانی سنی جائے گی۔ کیونکہ سچائی چاہے کتنی ہی دب جائے، ایک دن وہ خود کو ظاہر کر دیتی ہے۔ اور شاید اسی دن، کشمیر کی ہوا میں شامل آہیں دعاؤں میں بدل جائیں، آنسو مسکراہٹوں میں ڈھل جائیں، اور قید کی دیواریں یادوں کا حصہ بن جائیں۔ تب تک، یہ کہانی زندہ رہے گی۔ دلوں میں، لفظوں میں، اور ان آنکھوں میں جو اسے پڑھ کر نم ہو جاتی ہیں۔

اب ضرورت اس بات کی ہے کہ انسانی حقوق کی عالمی تنظیمیں اس معاملے پر فعال کردار ادا کرتے ہوئے درج ذیل اقدامات پر فوری عملدرآمد کریں۔
☆ اقوام متحدہ کے تحت ایک غیر جانبدار تحقیقاتی کمیشن قائم کیا جائے جو آزادانہ تحقیقات کر کے اقوام عالم کے سامنے ظالم اور متعصب ہندو کا چہرہ بے نقاب کر سکے۔

☆ انیمسنسٹی انٹرنیشنل اور ہیومن رائٹس واچ تفصیلی رپورٹس شائع کر کے عالمی توجہ حاصل کر سکتے ہیں۔

☆ عالمی برادری کے ذریعے بھارت پر دباؤ ڈالا جاسکتا ہے کہ وہ قانونی عمل کو شفاف بنائے۔ جیلوں میں قیدیوں کے حقوق اور ان پر ہونے والے مظالم کو روکنے کیلئے عالمی مبصرین بھیجے جائیں۔

پاکستان اس معاملے میں مختلف سطحوں پر کردار ادا کر سکتا ہے۔

☆ اقوام متحدہ اور دیگر عالمی فورمز پر سسڈہ اجاگر کرنے کیلئے سفارتی سطح پر آواز اٹھائی جائے۔

☆ عالمی این جی اوز کے ساتھ مل کر کیس کو نمایاں کرنے کیلئے انسانی حقوق کی مہم چلائی جائے۔

☆ عالمی میڈیا میں اس معاملے کو مؤثر انداز میں پیش کیا جائے۔ بین الاقوامی قانون کے ماہرین کے ذریعے کیس کو عالمی عدالتوں تک لے جانے کی کوشش کی جائے۔

یہ کہانی صرف سیاست کی نہیں، انسانوں کی ہے۔ ایک عورت، جو برسوں سے سلاخوں کے پیچھے ہے۔ ایک شوہر، جو عمر بھر قید میں رہا اور اب بھی جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہے۔ ایک خاندان، جو وقت کے ساتھ بکھر گیا۔ یہ سب ہمیں ایک سوال کی طرف لے جاتا ہے، کیا انصاف واقعی سب کیلئے یکساں ہے؟

آسیہ اندرابی کا معاملہ کشمیر کے وسیع تر مسئلے کی ایک جھلک ہے۔ یہ کہانی ہمیں یاد دلاتی ہے کہ سیاسی تنازعات کے پیچھے انسان ہوتے ہیں، ان کے خواب، ان کے دکھ، اور ان کی امیدیں اور جن کی اپنی کہانیاں، درد اور امیدیں ہوتی ہیں۔ کشمیر کا مسئلہ اس وقت تک حل نہیں ہو سکتا جب تک کشمیری عوام کو ان کا بنیادی حق — یعنی حق خود ارادیت — نہیں دیا جاتا، اور جب تک تمام فریقین سنجیدگی سے مذاکرات کی میز پر نہیں آتے۔ جب تک انصاف، شفافیت اور انسانی وقار کو ترجیح نہیں دی جائے گی، ایسی کہانیاں جنم لیتی رہیں گی — اور دنیا خاموش تماشائی بنی رہے گی۔ یہ مضمون ایک دعوتِ فکر ہے — ایک سوال، ایک آئینہ، اور شاید ایک خاموش چیخ۔

وقت گزر جائے گا... شاید سرحدیں بھی بدل جائیں، شاید نقشے بھی نئے بن جائیں، مگر کچھ کہانیاں ایسی ہوتی ہیں جو کبھی ختم نہیں ہوتیں۔ آسیہ اندرابی کی کہانی بھی انہی میں سے ایک ہے — ایک ایسی داستان جو قید کی دیواروں سے ٹکرا کر بھی زندہ ہے، جو خاموشی میں بھی بولتی ہے، اور جو ہر اس دل میں دھڑکتی ہے جو درد کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ کہانی ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم اپنے ضمیر سے سوال کریں — کیا انصاف واقعی طاقت کا محتاج ہے؟ کیا انسانی حقوق صرف الفاظ ہیں، یا ان کی کوئی عملی حقیقت بھی ہے؟ اور سب سے بڑھ کر، کیا دنیا واقعی ہر مظلوم کی آواز سنتی ہے، یا کچھ صدائیں ہمیشہ کیلئے خاموش کر دی جاتی ہیں؟

کشمیر آج بھی وہیں ہے — اپنی خوبصورتی کے ساتھ، اپنے دکھوں کے ساتھ۔ جھیلیں اب بھی شفاف ہیں، مگر ان میں جھانکیں تو شاید آنسوؤں کی نمی دکھائی دے۔ پہاڑ اب بھی بلند ہیں، مگر ان کے سائے میں دے خواب شاید آج بھی آزادی کے منتظر ہیں۔ اور کہیں، کسی جیل کی تاریک کوٹھڑی میں، ایک عورت اب بھی اپنے یقین کے ساتھ زندہ ہے۔ وقت اسے تھکا نہیں سکا، تنہائی اسے توڑ نہیں سکی، اور قید اس کی سوچ کو محدود نہیں کر سکی۔ یہی اس کی طاقت ہے، یہی اس کی کہانی ہے۔

یہ مضمون کسی فیصلے کا اعلان نہیں، بلکہ ایک احساس کی دعوت ہے۔ اگر اس کہانی کو پڑھ کر دل میں ایک لمحے کو بھی درد کی لہر اٹھے، آنکھوں میں نمی اتر آئے، یا ذہن میں کوئی سوال جنم لے — تو شاید یہی اس کا مقصد تھا۔ کیونکہ کچھ کہانیاں سنی نہیں جاتیں، وہ محسوس کی جاتی ہیں۔

سراب کے پیچھے چھپی ہوئی دنیا

یہ دنیا، جو کبھی تہذیبوں کی آماجگاہ تھی، آج مفادات کے جنگل میں بدلتی جا رہی ہے۔ کبھی یہاں قافلے امن کے ترانے گاتے گزرتے تھے، اور علم و حکمت کے چراغ ہر سمت روشن تھے، مگر اب فضاؤں میں بارود کی بو ہے اور افق پر اٹھتے ہوئے دھوئیں کے بادل انسانیت کے چہرے کو دھندلا رہے ہیں۔ بظاہر سب کچھ معمول کے مطابق ہے۔ خبریں، بیانات، سفارتی لب و لہجہ۔ مگر اس ظاہری سکون کے نیچے ایک ایسی ہلچل برپا ہے جو تاریخ کی کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ معلوم ہوتی ہے۔

یہ عہد محض جنگوں کا نہیں، بلکہ بیانیوں کا عہد ہے۔ وہ بیانے جو حقیقت کو پردہ اخفا میں رکھتے ہیں اور انسان کو اس کی اپنی بصیرت سے محروم کر دیتے ہیں۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ جنگیں امن کیلئے ہیں، مداخلتیں استحکام کیلئے ہیں، اور تباہی دراصل تعمیر کا پیش خیمہ ہے مگر سوال یہ ہے کہ اگر یہ سب کچھ امن کیلئے ہے، تو پھر دنیا کے کونے کونے میں بے چینی کیوں ہے؟ اگر یہ سب استحکام کیلئے ہے، تو پھر انسان کی بنیادیں کیوں ہل رہی ہیں؟

یہاں سے وہ کہانی شروع ہوتی ہے جو بظاہر مختلف واقعات کا مجموعہ لگتی ہے، مگر درحقیقت ایک ہی نقشے کے مختلف رنگ ہیں۔ ایک ایسا نقشہ جس میں طاقت کا ایک مرکز پوری دنیا کو اپنے گرد گھمانا چاہتا ہے۔ ایک ایسا تصور جسے بعض حلقے ”ون ورلڈ آرڈر“ کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ تصور محض ایک سیاسی اصطلاح نہیں، بلکہ ایک ایسا خواب ہے جس میں ایک ہی قوت دنیا کے وسائل، معیشت، اور حتیٰ کہ فکر و شعور پر اپنی گرفت مضبوط کرنا چاہتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں دل لرزتا ہے اور روح سوال کرتی ہے: کیا انسان واقعی اتنا بے بس ہو چکا ہے کہ چند طاقتور ہاتھ اس کے مقدر کا فیصلہ کریں؟ کیا دنیا ایک ایسے موڑ پر کھڑی ہے جہاں انصاف کی جگہ مفاد، اور اخلاق کی جگہ طاقت نے لے لی ہے؟

اگر ہم تاریخ کے اوراق پلٹیں تو یہ کوئی نئی داستان نہیں۔ ہر دور میں کچھ طاقتیں ایسی ابھریں جنہوں نے اپنے اقتدار کو دوام دینے کیلئے دنیا کو اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ مگر آج کا منظر اس لیے مختلف ہے کہ اب یہ عمل زیادہ منظم، زیادہ خاموش، اور زیادہ ہمہ گیر ہو چکا ہے۔ اب جنگیں صرف میدانوں میں نہیں ہوتیں، بلکہ معیشت، توانائی، اطلاعات اور ٹیکنالوجی کے میدانوں میں بھی لڑی جاتی ہیں۔

یہی وہ پس منظر ہے جس میں ہمیں حالیہ عالمی واقعات کو دیکھنا ہو گا۔ یہ محض حادثات نہیں، بلکہ ایک تسلسل کا حصہ ہیں۔ ایک ایسی حکمت عملی کا حصہ، جس کا مقصد دنیا کے وسائل پر بدرجہ کنٹرول حاصل کرنا ہے۔ چاہے اس کیلئے کتنی ہی قربانیاں کیوں نہ دینی پڑیں، چاہے کتنے ہی خطے خاکستر کیوں نہ ہو جائیں۔

صوفیاء کہتے ہیں کہ دنیا ایک سراب ہے۔ جو دکھائی دیتا ہے وہ حقیقت نہیں، اور جو حقیقت ہے وہ اکثر نظروں سے اوجھل رہتی ہے۔ آج کی سیاست بھی اسی سراب کا عکس معلوم ہوتی ہے۔ ہمیں جو دکھایا جا رہا ہے، وہ شاید اصل نہیں۔ اور جو اصل ہے، وہ ہماری نگاہوں سے چھپا دیا گیا ہے۔ یہ تحریر اسی سراب کو چاک کرنے کی ایک کوشش ہے۔ کہ ہم واقعات کو ان کے ظاہری خول سے نکال کر دیکھیں، اور اس حقیقت کو پہچانیں جو ان کے پس پردہ کار فرما ہے۔ کیونکہ جب تک ہم حقیقت کو نہیں سمجھیں گے، ہم نہ اپنی رائے قائم کر سکیں گے، نہ اپنے مستقبل کا درست تعین کر سکیں گے۔ یہ ایک دھند میں لپٹی ہوئی دنیا کا نوحہ ہے جو عدل و انصاف کی تلاش میں در بدر ٹھو کریں کھا رہا ہے۔

ہر دور تاریخ میں جب ایک نئی طاقت کی آمد ہوتی ہے، تو پرانی طاقتیں بے ساختہ رد عمل کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ دنیا کے افق پر جب بھی سیاست کے بادل گہرے ہوتے ہیں تو نگاہیں ہمیشہ بجلی کی چمک پر مرکوز رہتی ہیں، بادلوں کے اندر اٹھنے والی حرارت پر نہیں۔ بلکہ دنیا کے سیاسی افق پر آج ایک نیا طوفان ابھرتا دکھائی دے رہا ہے، جو بظاہر ایران یا اسرائیل کے مسائل کی صورت میں نظر آتا ہے، لیکن حقیقت کی پر تیں کہیں اور چھپی ہیں۔ ہر دور کی طرح، جب ایک ابھرتی ہوئی طاقت اپنی رفتار سے موجودہ عالمی نظام کے کناروں تک پہنچتی ہے، تو پرانی طاقتیں ناخود آگاہ رد عمل کا مظاہرہ کرتی ہیں۔

آج بھی یہی حال ہے۔ کہیں ایران کا ذکر ہے، کہیں اسرائیل کا شور، مگر حقیقت کا قافلہ ان گلیوں سے گزر کر کسی اور سمت جا رہا ہے۔ موجودہ عالمی منظر نامہ اس اصول کا عملی عکس ہے۔ آج کل، بین الاقوامی مباحث کا محور ایران یا اسرائیل دکھائی دیتا ہے، لیکن حقیقت کی تہہ کچھ اور ہی منظر پیش کرتی ہے۔ ہر چراغ جس کی روشنی عوام کی نگاہوں میں پڑتی ہے، کبھی کبھار اصل راہوں کو چھپائے رکھتا ہے۔ تاریخ کا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ عالمی سیاست شطرنج کی وہ بساط ہے جس پر مہرے سامنے چلتے ہیں مگر اصل ارادہ پس پردہ چھپا رہتا ہے۔

میں یہاں دو واقعات کے آئینے میں عالمی حکمت عملی کی اس حقیقت کو آشکار کرنے کا قصد رکھتا ہوں۔ ہم واقعات کو نہیں، ان کے درمیان موجود ربط کو دیکھیں؛ شور کو نہیں، اس کے پیچھے چھپی خاموش حکمت عملی کو سنیں۔ اس رپورٹ کی صداقت کیلئے میں ان جغرافیائی، اقتصادی اور سیاسی پیچیدگی کے پردے کو ہٹانے کی کوشش کروں گا جس کی روشنی میں عالمی طاقتوں کی حکمت عملی، چین کی اقتصادی بالادستی اور توانائی کی عالمی سپلائی کے تعلقات واضح ہو سکیں اور ہم صحیح نتائج اخذ کر سکیں۔

امریکا نے وینزویلا میں ایک متنازعہ آپریشن انجام دیا، جس کے نتیجے میں صدر مادورو گرفتار ہوئے۔ وینزویلا کا واقعہ بظاہر ایک سیاسی تبدیلی تھا مگر درحقیقت یہ اقتصادی شریان پر لگنے والی ایک کاری ضرب تھی۔ جب صدر مادورو کو اقتدار سے ہٹایا گیا تو دنیا نے اسے جمہوریت کی فتح قرار دیا۔ کسی نے تالیاں بجائیں، کسی نے قانونی موٹو گافیاں کیں، مگر اس سوال کی طرف کم ہی توجہ گئی کہ اس تبدیلی کا اصل اثر کہاں پڑا۔ عوامی منظر نامے میں یہ ”آمر کا زوال“ کہا گیا، کچھ نے خوشی کے طور پر تالیاں بجائیں، اور کچھ نے بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی پر اعتراض کیا۔

لیکن اس سوال پر کسی نے غور نہیں کیا کہ وینزویلا کے تیل کا سب سے بڑا صارف کون تھا؟ جواب روشن ہے چین۔ وینزویلا روزانہ 80 ہزار بیرل تیل براہ راست چین کو فروخت کر رہا تھا جس سے چین کا عظیم اقتصادی انجن چل رہا تھا۔ مادورو کے ہٹانے کے ساتھ، چین کی پائپ لائن کاٹ دی گئی اور توانائی کے اس بہاؤ کو یکدم روک دیا گیا۔ وینزویلا کا تیل صرف ایک وسیلہ نہیں تھا، بلکہ چین کے صنعتی بدن میں دوڑنے والا وہ خون تھا جو اس کی معیشت کو زندگی بخشتا تھا۔ روزانہ 8 لاکھ بیرل تیل کا بہاؤ اچانک رک جانا ایسا تھا جیسے کسی دریا کا منبع خشک کر دیا جائے۔

یوں سمجھ لیں کہ تاریخ کبھی شور مچا کر نہیں بدلتی، بلکہ خاموشی سے اپنی سمت بدلتی ہے۔ اور جب انسان کو خبر ہوتی ہے تو نقشہ بدل چکا ہوتا ہے۔ یہ محض سیاسی کارروائی نہیں، بلکہ ایک حکمت عملی کی ابتدا تھی جس میں عالمی طاقتیں چین کے ابھرتے ہوئے اقتصادی کردار کو محدود کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ یہ واقعہ ایک استعارہ کے طور پر بیان کرتا ہے کہ طاقت کی جنگ ہمیشہ محض سیاسی چالوں تک محدود نہیں رہتی، بلکہ اقتصادی قوت کے نشیب و فراز سے بھی منسلک ہے۔

ایران کا واقعہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ امریکا اور اسرائیل نے ایران پر حملہ کیا اور خامنہ ای کے ساتھ ساری اعلیٰ قیادت کو ہدف بنا کر ساری دنیا میں سفاکی اور تشویش کی لہر دوڑادی۔ دنیا کے ایک حصے نے اسے جوہری خطرے کے خاتمے کے طور پر دیکھا، دوسروں نے بین الاقوامی قوانین کی پامالی پر احتجاج کیا مگر سوال پھر وہی تھا اس بحران سے کس کی شہ رگ متاثر ہوئی؟ کسی نے یہ نہیں پوچھا کہ ایران کا سب سے بڑا تیل کا خریدار کون تھا؟ وہ بھی چین۔ ایران یومیہ 1.5 ملین بیرل تیل براہ راست چین کو فراہم کر رہا تھا۔ اس پائپ لائن کی بندش نے نہ صرف توانائی کی سپلائی متاثر کی بلکہ چین کی تجارتی اور اقتصادی حرکت کو بھی محدود کیا۔ چین اچانک ایک غیر یقینی کیفیت میں داخل ہو گیا۔ یوں سمجھ لیجیے کہ چین کے اقتصادی قافلے کے دو بڑے چشمے یکایک خشک کر دیے گئے۔ یہاں ایک تمثیل یاد آتی ہے کہ اگر کسی درخت کی جڑوں میں پانی بند کر دیا جائے تو شاخوں کی ہریالی دیر پا نہیں رہتی۔ چین کی معیشت بھی اسی آزمائش سے گزر رہی ہے۔ یہ دو واقعات، بظاہر الگ الگ، اصل میں ایک حکمت عملی کے جال میں جڑے ہوئے ہیں۔ عالمی طاقتیں چین کی بڑھتی ہوئی اقتصادی سیاسی اور جغرافیائی بالادستی کو محدود اور قابو میں لانے کی کوششیں کر رہی ہیں۔



رائے ڈالو کا نظریہ محض ایک تجزیہ نہیں بلکہ تاریخ کے سینے سے نکلا ہوا ایک اصول ہے، جب ایک نئی طاقت پرانی طاقت کے برابر آکھڑی ہو تو تصادم ناگزیر ہو جاتا ہے۔ جرمنی اور برطانیہ کی کشمکش کے بطن سے پہلی جنگ عظیم کا سانحہ ہوا، جاپان کا بحر الکاہل میں امریکا سے ٹکراؤ دوسری عالمی جنگ کا شاخسانہ بن گیا جہاں پہلی مرتبہ امریکا نے جاپان کے دو بڑے شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرا کر ہر جاندار کو

خاکستر کر دیا اور آج تک اس بہیمانہ ظلم اور سفاکی کے اثرات نمایاں ہیں، اور سرد جنگ کے طویل سائے یعنی سوویت یونین کی امریکا کے مقابلے میں ابھرتی طاقت، جس نے دنیا کا نقشہ ہی تبدیل کر دیا اور سوویت یونین کے بطن سے چھ اور ریاستیں دنیا کے نقشے پر معرض وجود میں آ گئیں۔ یہ سب اسی قانون کے مظاہر ہیں۔ روس ایک مرتبہ پھر آنکھیں دکھانے کے قابل ہو رہا تھا کہ یوکرین کا پھندہ اس کے گلے میں ڈال دیا گیا ہے۔

آج چین اسی راستے پر گامزن ہے۔ اور یہی عمل جاری ہے۔ عالمی طاقتیں اس ابھرتے ہوئے عظیم انجن کی توانائی کی کمزوریوں کی نشاندہی کر رہی ہیں۔ چین کی ابھرتی ہوئی معیشت اور اس کا عالمی تیل کے بازار میں حصہ اسی تاریخی قانون کا جدید عکس ہے۔ عالمی طاقتیں اپنی برتری برقرار رکھنے کیلئے چین کی گاکہ طاقت کا ارتقا محض مادی نہیں ہوتا، بلکہ اس کے توانائی کی سپلائی اور تجارتی راستوں پر اثر انداز ہو رہی ہیں۔ گویا فکری انداز میں یہ کہنا درست ہو ساتھ ایک تہذیبی اور فکری کشمکش بھی جڑی ہوئی ہے۔ یہی کشمکش آج عالمی نظام کو ایک نئے موڑ پر لے آئی ہے۔

چین کو ایک عظیم الشان انجن تصور کیجیے۔ ایسا انجن جو دنیا کی ایک بڑی معیشت کو حرکت دے رہا ہے۔ مگر ہر انجن کی طرح اس کی بھی ایک کمزوری ہے، ایندھن۔ چین دنیا کا 28 فیصد تیل پیدا کرتا ہے، لیکن اپنی صنعتی بھوک مٹانے کیلئے زیادہ تر تیل درآمد کرتا ہے۔ اس کے ایندھن کی چار اہم پائپ لائنیں ہیں ویزویلا، ایران، روس اور سعودی عرب۔ جبکہ ان میں سے دو کاٹ دی گئیں، ایک محدود ہو گئی، اور چوتھی غیر یقینی کا شکار ہو گئی، تو یہ انجن اپنی پوری رفتار برقرار رکھنے سے قاصر ہونے لگا ہے۔

دو ماہ میں چین کی 20 فیصد تیل کی سپلائی منقطع ہوئی، اور عالمی توجہ ایران پر مرکوز ہونے کے سبب اصل حکمت عملی پوشیدہ رہی۔ یہ محض اقتصادی حکمت عملی نہیں بلکہ ایک خاموش جنگ ہے، جس میں گولیاں نہیں بلکہ پابندیاں اور سیاسی فیصلے استعمال ہوتے ہیں۔ اس طرح ایک ظاہری رخ کے پیچھے اصل حکمت عملی پوشیدہ رہی۔

چین کا بیلٹ اینڈ روڈ منصوبہ محض تجارت کا راستہ نہیں بلکہ عالمی اقتدار کی ایک نئی تعبیر ہے۔ بیجنگ سے یورپ تک پھیلا ہوا یہ جال اس بات کی علامت ہے کہ جو تجارت کو کنٹرول کرے گا، وہ دنیا کی نبض پر ہاتھ رکھے گا۔ چین نے اپنے اقتصادی نیٹ ورک کو جدید سلک روڈ کے ذریعے یورپ تک پھیلا رکھا ہے، جس میں ریلوے، بندر گاہیں، اور پائپ لائنیں شامل ہیں۔ اس کا مقصد واضح ہے۔ یورپ کے تجارتی راستوں پر تسلط حاصل کرنا، تاکہ عالمی معیشت کے کنٹرول کا مرکز اپنے ہاتھ میں ہو۔

جرمنی، فرانس، اور اٹلی جیسے ممالک کے جھکاؤ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یورپ آہستہ آہستہ امریکا سے دور ہو کر چین کی جانب بڑھ رہا ہے۔ یورپ کا چین کی طرف جھکاؤ امریکا کیلئے ایک گھنٹی ہے۔ ایسی گھنٹی جس کی آواز خطرے کی خبر دیتی ہے۔ جرمنی، فرانس اور اٹلی جیسے ممالک کا بدلتا ہوا رخ عالمی طاقت کے توازن کو متاثر کر رہا ہے۔

اگر توانائی اس جنگ کا ایندھن ہے تو ٹیکنالوجی اس کی تلوار ہے، اور تائیوان اس تلوار کا دستہ۔ جدید چپس کی پیداوار کا مرکز ہونے کے باعث تائیوان اکیسویں صدی کی معیشت کا دل بن چکا ہے۔ جو اسے قابو میں رکھتا ہے، وہ اکیسویں صدی کی ٹیکنالوجی کے سپرے کا مالک ہوتا ہے۔ امریکا اور چین دونوں اس دل کی دھڑکن کو اپنے اختیار میں لینا چاہتے ہیں۔ امریکا کا موقف واضح ہے، اور چین کی حاکمیت کے دعوے تصادم کو ناگزیر بناتے ہیں۔ کیونکہ یہاں مفاہمت کی گنجائش کم اور مفادات کا ٹکراؤ شدید ہے۔ یہاں تصادم کا امکان سب سے زیادہ ہے، اور یہی نقطہ آخر کار عالمی طاقتوں کے تصادم کا مرکزی میدان ہے۔

یہ صرف چین کو کمزور کرنے کا معاملہ نہیں، بلکہ امریکی صنعتی و دفاعی منافع بھی اس میں مضمر ہے۔ ہر جنگ اپنے ساتھ صرف تباہی نہیں لاتی، بلکہ کچھ قوتوں کیلئے منافع بھی لاتی ہے۔ مشرق وسطیٰ میں ہر دھماکہ اور بحران، خلیجی ریاستوں کے ہتھیاروں کی خریداری میں تبدیلی اور اضافہ اس حقیقت کا واضح ثبوت ہے۔ نتیجہ اربوں ڈالر کی اقتصادی گردش اور عالمی حکمت عملی کی تکمیل امریکی صنعتی سپرے کو چلانے میں مدد معاون ثابت ہو رہی ہے۔ جب دنیا مادہ پرستی کے اصولوں پر چلتی ہے تو انسانیت پس منظر میں چلی جاتی ہے، اور مفاد پرستی میدان میں غالب آجاتی ہے۔

ان تمام واقعات کو یکجا کر کے دیکھیں تو امریکا کا ایک واضح خاکہ اور چھ فوائد کی حکمت عملی سامنے آتی ہے:

☆ چین کی توانائی کی سپلائی کو محدود کرنا

☆ اس کے تجارتی راستوں کو متاثر اور اس میں خلل ڈالنا

☆ خطے پر اثر و رسوخ قائم کرنا

☆ یورپ کو اپنے اثر میں رکھنا تاکہ چین سے تجارت محدود کر دی جائے

☆ جنگی معیشت کو فروغ دینا، ہتھیاروں سے اقتصادی فائدہ اٹھانا

☆ تائیوان کے معرکے سے پہلے چین کو کمزور کرنا
یہ ایک ایسی حکمت عملی ہے جو بظاہر منتشر نظر آتی ہے مگر درحقیقت ایک مرکز کے گرد گھوم رہی ہے۔

دنیا کے نقشے پر بکھرے ہوئے یہ تمام واقعات دراصل ایک ہی داستان کے مختلف ابواب ہیں۔ وینزویلا، ایران، روس، یورپ اور تائیوان مختلف محاذ ہیں، لیکن اصل جنگ ایک ہے، چین کی اقتصادی و جغرافیائی بالادستی اور عروج کو محدود کرنا۔ یہ جنگ بند و قوں سے زیادہ ذہنوں میں لڑی جا رہی ہے، اور اس کا ہدف صرف زمین نہیں بلکہ معیشت، ٹیکنالوجی اور عالمی اقتدار ہے۔ یہ عالمی سیاست کی پیچیدہ کڑیاں ہیں، جو عموماً پردے میں چھپی رہتی ہیں۔ جیسے ایک باکسر اپنے مخالف کا پانی اور خوراک کاٹ کر اس کی طاقت کو کمزور کرتا ہے، عالمی طاقتیں بھی اسی اصول کے تحت عالمی پتھر پر حرکت کر رہی ہیں۔ یہ تجزیہ ہمیں یہ درس دیتا ہے کہ عالمی سیاست میں جو واقعات بظاہر الگ دکھائی دیتے ہیں، وہ ایک ہم آہنگ حکمت عملی کے تحت جڑے ہوئے ہیں، اور جو عالمی منظر نامے میں نمایاں ہوتا ہے، وہ اکثر اصل رخ کا صرف آئینہ ہوتا ہے۔

جب تاریخ اپنے فیصلے سناتی ہے تو وہ کسی کی رعایت نہیں کرتی۔ وہ نہ طاقتور کو معاف کرتی ہے، نہ کمزور کو بخشتی ہے۔ وہ صرف یہ دیکھتی ہے کہ کس نے حق کو پہچانا اور کس نے اسے نظر انداز کیا۔ آج دنیا ایک ایسے ہی فیصلہ کن موڑ پر کھڑی ہے، جہاں خاموشی بھی ایک جرم ہے اور لاعلمی بھی ایک نقصان۔ ہم ایک ایسی دنیا میں سانس لے رہے ہیں جہاں وسائل پر قبضہ صرف اقتصادی معاملہ نہیں رہا، بلکہ اقتدار کا بنیادی ستون بن چکا ہے۔ توانائی، تجارت، ٹیکنالوجی — یہ سب اب محض ترقی کے ذرائع نہیں، بلکہ کنٹرول کے ہتھیار بن چکے ہیں۔ اور ان ہتھیاروں کو استعمال کرنے والے ہاتھ کسی ایک خطے تک محدود نہیں، بلکہ پوری دنیا پر اپنی گرفت مضبوط کرنا چاہتے ہیں۔

یہ کہنا شاید تلخ ہو، مگر حقیقت یہی ہے کہ طاقت کی اس دوڑ میں انسانیت اکثر کچلی جاتی ہے۔ وہ بستیاں جو کبھی زندگی سے بھرپور تھیں، اب لمبے کاڈھیر بن چکی ہیں۔ وہ خواب جو کبھی آنکھوں میں سجتے تھے، اب دھوئیں میں تحلیل ہو چکے ہیں۔ اور اس سب کے درمیان، ایک خاموش سوال فضا میں معلق ہے: کیا یہی وہ دنیا تھی جس کا خواب انسان نے دیکھا تھا؟ جمہوریت، جو کبھی عوام کی آواز سمجھی جاتی تھی، آج کئی مقامات پر محض ایک نقاب بن چکی ہے۔ اس نقاب کے پیچھے وہ پالیسیاں پروان چڑھتی ہیں جو بظاہر عوامی مفاد کے نام پر ہوتی ہیں، مگر درحقیقت چند طاقتور حلقوں کے مفادات کو تقویت دیتی ہیں۔ یہ بے چین کرتا ہے۔ کہ جس نظام کو انسان کی آزادی کا ضامن ہونا چاہیے تھا، وہی بعض اوقات اس کی غلامی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ وہ تضاد ہے جو دل کو

صوفیاء کی زبان میں کہا جائے تو یہ دنیا ایک امتحان گاہ ہے، جہاں ہر انسان کو اپنی بصیرت کا ثبوت دینا ہے۔ جو صرف ظاہر کو دیکھتا ہے، وہ دھوکہ کھا جاتا ہے۔ اور جو باطن کو پہچان لیتا ہے، وہ حقیقت کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس باطنی بصیرت کو بیدار کریں۔ ہم سوال کریں، ہم سوچیں، اور ہم اپنے گرد و پیش کو محض خبروں کی حد تک نہ دیکھیں بلکہ اس کے اندر چھپی ہوئی معنویت کو سمجھیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر اندھیری رات کے بعد صبح ہوتی ہے۔ مگر صبح خود بخود نہیں آتی، اس کیلئے چراغ جلانے پڑتے ہیں، شعور بیدار کرنا پڑتا ہے، اور سچ کو پہچاننے کی ہمت پیدا کرنی پڑتی ہے۔ اگر انسان صرف تماشائی بن کر رہ جائے تو تاریخ اسے بھی اسی خاموشی کے ساتھ روند دیتی ہے جس طرح وہ باقی سب کو روندتی ہے۔

یہ تحریر کسی حتمی فیصلے کا اعلان نہیں، بلکہ ایک دعوتِ فکر ہے۔ ایک پکار ہے کہ ہم اپنے گرد و پیش کو نئے زاویے سے دیکھیں۔ ہم یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ محض اتفاق نہیں بلکہ ایک تسلسل کا حصہ ہے۔ اور اگر یہ تسلسل اسی طرح جاری رہا، تو وہ دن دور نہیں جب دنیا کے وسائل، معیشت، اور حتیٰ کہ سوچنے کا انداز بھی چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جائے گا۔

تاریخ اپنے آپ کو دہراتی نہیں، بلکہ نئے قالب میں سامنے آتی ہے۔ اور جو قومیں اس کے اشاروں کو نہیں سمجھتیں، وہ اس کے دھارے میں بہہ جاتی ہیں۔ یہ تحریر اسی شعور کو بیدار کرنے کی ایک ادنیٰ سی کوشش ہے۔ کہ ہم واقعات کو نہیں، ان کے پیچھے کار فرما قوتوں کو سمجھیں؛ اور شور میں نہیں، خاموشی میں چھپی حقیقت کو پہچانیں۔ یہ مطالعہ ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ عالمی سیاست میں سچائی اکثر پردے میں چھپی رہتی ہے، اور جو واقعات عام نگاہ میں الگ نظر آتے ہیں، وہ ایک ہم آہنگ حکمتِ عملی کے تار میں بندھے ہوتے ہیں۔

آخر میں، یہی کہا جاسکتا ہے کہ انسان کے پاس اب بھی انتخاب باقی ہے۔ وہ چاہے تو اس سراب میں کھو جائے، یا حقیقت کی تلاش میں نکل کھڑا ہو۔ وہ چاہے تو خاموش تماشائی بن جائے، یا بیدار ہو کر اپنی رائے قائم کرے۔ کیونکہ تاریخ صرف طاقتوروں کی نہیں ہوتی، بلکہ ان لوگوں کی بھی ہوتی ہے جو سچ کو پہچان کر خاکستر ہوتے خواب اور بیداری کی صدا کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اور شاید یہی وہ لمحہ ہے۔ جب ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ ہم کس صف میں کھڑے ہیں۔

عہدِ آزمائش

یہ وہ عہد ہے جس میں تاریخ اپنی رفتار تیز کر چکی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے صدیوں کے واقعات برسوں میں اور برسوں کے فیصلے لمحوں میں سمٹ آئے ہوں۔ بظاہر یہ زمانہ ترقی، جمہوریت، انسانی حقوق اور عالمی ہم آہنگی کے سنہرے نعروں سے مزین ہے، مگر اس کے پس منظر میں ایک ایسی خاموش کشمکش جاری ہے جو تہذیبوں، معیشتوں اور نظریات کو اندر ہی اندر کھوکھل کر رہی ہے۔ یہ تضاد ہی اس دور کا سب سے بڑا المیہ ہے کہ روشنی کے دعووں کے درمیان اندھیرے اپنی جڑیں مزید گہری کر رہے ہیں۔

یہ وہ زمانہ ہے جہاں تاریخ صرف لکھی نہیں جا رہی بلکہ جلتی ہوئی سطروں میں رقم ہو رہی ہے۔ یہ وہ عہد ہے جس میں انسان نے چاند کو تسخیر تو کر لیا، مگر زمین پر امن کو محفوظ نہ رکھ سکا۔ بظاہر ترقی، جمہوریت اور عالمی یکجہتی کے خوشنما نعروں سے مزین یہ دور درحقیقت ایک ایسے اضطراب کی تصویر ہے جس کے پس منظر میں طاقت، مفاد اور تسلط کی ایک بے رحم کشمکش جاری ہے۔ اگر تاریخ کو ایک زندہ وجود تصور کیا جائے تو موجودہ زمانہ اس کی دھڑکنوں میں تیزی، اس کی سانسوں میں بے چینی اور اس کی آنکھوں میں ایک انجانا خوف لیے ہوئے ہے۔ عالمی سیاست اب محض اصولوں، معاہدوں اور سفارتی آداب کا کھیل نہیں رہی بلکہ یہ ایک ایسا میدانِ کارزار بن چکی ہے جہاں طاقت، مفاد اور برتری کی جنگ کھلے عام لڑی جا رہی ہے۔ یہاں الفاظ ہتھیار ہیں، بیانیے محاذ ہیں، اور اطلاعات ایک ایسی طاقت بن چکی ہیں جو حقیقت کو بھی اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھال سکتی ہے۔

آج کی دنیا ایک ایسے موڑ پر کھڑی ہے جہاں فیصلے صرف ایوانوں میں نہیں بلکہ میدانوں، منڈیوں اور میڈیا کے پردوں کے پیچھے ہوتے ہیں۔ یہاں سچ کو بیانیے میں ڈھالا جاتا ہے اور جھوٹ کو حکمتِ عملی کا نام دیا جاتا ہے۔ تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ جب بھی طاقت نے اخلاقیات کو پس پشت ڈالا، انسانیت نے اس کی قیمت اپنے خون سے ادا کی۔ یہ تحریر اسی پیچیدہ اور پُر اسرار عالمی منظر نامے کو سمجھنے کی ایک سنجیدہ کوشش ہے۔ اس میں نہ صرف حالیہ سیاسی واقعات کی تہہ تک پہنچنے کی سعی کی گئی ہے بلکہ ان پوشیدہ قوتوں، عزائم اور حکمتِ عملیوں کو بھی بے نقاب کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو بظاہر نظر نہیں آتیں مگر عالمی فیصلوں پر گہرا اثر ڈالتی ہیں۔ یہ محض معلومات کا انبار نہیں بلکہ ایک فکری سفر ہے۔ ایسا سفر جو قاری کو حالات کے ظاہری خدوخال سے آگے لے جا کر ان کے پس پردہ حقائق سے روشناس کراتا ہے۔

زیر نظر تحریر اسی کرہناک حقیقت کی عکاس ہے۔ یہ محض ایک سیاسی تجزیہ نہیں بلکہ ایک فکری صدائے احتجاج ہے، ایک ایسا آئینہ جس میں ہم اپنے عہد کی اصل صورت دیکھ سکتے ہیں۔ یہ تحریر قاری کو صرف حالات سے آگاہ نہیں کرتی بلکہ اسے سوچنے، پرکھنے اور سوال اٹھانے کی دعوت دیتی ہے کیونکہ یہ وقت خاموش رہنے کا نہیں، سمجھنے اور سمجھانے کا ہے۔ یہ تحریر ایک سوال بھی ہے اور ایک انتباہ بھی۔ سوال اس لیے کہ کیا واقعی ہم اس دنیا کو ویسا ہی دیکھ رہے ہیں جیسا ہمیں دکھایا جا رہا ہے؟ اور انتباہ اس لیے کہ اگر ہم نے اپنے عہد کو سمجھنے میں کوتاہی کی، تو ہم نہ صرف حال بلکہ مستقبل سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔

یہ عہدِ آشوب، جس میں سیاست اپنی معنوی روح کھو کر محض قوت کے کھیل میں ڈھل چکی ہے، تاریخ کے اُن نازک موڑوں میں سے ایک معلوم ہوتا ہے جہاں واقعات محض واقعات نہیں رہتے بلکہ آنے والے زمانوں کے مقدرات کا پیش خیمہ بن جاتے ہیں۔ یہ زمانہ جس میں ہم سانس لے رہے ہیں،

بظاہر ترقی، جمہوریت اور عالمی ہم آہنگی کا زمانہ کہلاتا ہے، مگر اس کے باطن میں ایک ایسا اضطراب موجزن ہے جو تہذیبوں کے تصادم، طاقت کی کشمکش اور مفادات کی جنگ سے عبارت ہے۔ اگر تاریخ کو ایک دریا تصور کیا جائے تو موجودہ عہد اس کے اُس موڑ پر واقع ہے جہاں پانی کی سطح پُر سکون دکھائی دیتی ہے مگر نیچے بھنور اپنی پوری شدت کے ساتھ گردش کر رہے ہوتے ہیں۔

زیر نظر موجودہ عالمی سیاسی افراتفری کے تناظر میں ایک ایسی فکری و تحقیقی گزارش پیش کی جا رہی ہے جو نہ صرف معاصر سیاست کی پر تیں کھولتی ہے بلکہ اس کے پس پردہ کار فرما قوتوں، عزائم اور خطرات کی بھی نشاندہی کرتی ہے۔ بلکہ اس تحریر میں ادبی وقار، فکری گہرائی اور تہذیبی لطافت کے ساتھ اسلوب اختیار کیا گیا ہے جو قاری کو محض معلومات نہیں بلکہ شعور بھی عطا کرے گا۔ ایک ایسا

یہ زیادہ پرانی بات نہیں کہ جب عالمی سیاست کے افق پر ٹرمپ کے پہلے دورِ صدارت کا سورج طلوع ہوا تو اس کے ساتھ ہی ایک اضطراب انگیز فضا بھی پیدا ہوئی۔ ٹرمپ کا پہلا دورِ صدارت محض ایک جمہوری انتخاب کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ یہ عالمی طاقتوں کے توازن میں ایک نمایاں تبدیلی کا آغاز تھا۔ راقم نے اسی زمانے میں اپنے مضامین میں یہ خدشہ ظاہر کیا تھا کہ یہ دور محض ایک سیاسی تبدیلی نہیں بلکہ ایک ایسے طوفان کا پیش خیمہ ہے جس کے بطن میں عالمی جنگ کے آثار پوشیدہ ہیں۔ اس دور میں امریکی خارجہ پالیسی نے روایتی سفارتکاری کو پس پشت ڈال کر جارحانہ انداز اختیار کیا۔

ٹرمپ کی جنگجویانہ پالیسیوں میں وہ جنون نمایاں تھا جو عقل و تدبیر کے بجائے قوت و تصادم کو ترجیح دیتا ہے۔ اس کے ساتھ اسرائیل کا مفاداتی کردار، اور خاص طور پر ٹرمپ کے یہودی نژاد اہلاد کی قربت، ایک ایسی مثلث کی تشکیل کر رہا تھا جس کے زاویے عالم اسلام کی سمت متعین تھے۔ ایران کے ساتھ کشیدگی، مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کی غیر مشروط حمایت، اور عالمی اداروں کی تضحیک — یہ سب اس بات کی علامت تھے کہ دنیا ایک نئے طرزِ حکمرانی کی طرف بڑھ رہی ہے۔ یہی وہ لمحہ تھا جب ایک صاحبِ نظر کیلئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ اگر اس روش کو نہ روکا گیا تو یہ دنیا کو ایک بڑے تصادم کی طرف لے جاسکتی ہے۔ ایران کو اس کھیل کا نقطہ آغاز قرار دینا اور پھر سنی ممالک کو مسلکی کشمکش میں الجھا دینا — یہ سب ایک ایسے خطر نگی کھیل کی چالیں تھیں جن کا مقصد مسلم دنیا کو اندر سے کمزور کرنا تھا۔

جب یہ خیالات منظرِ عام پر آئے تو مغربی دنیا، خصوصاً امریکی قارئین کی جانب سے سخت ردِ عمل سامنے آیا۔ ان کے نزدیک یہ تجزیہ محض ایک مبالغہ تھا۔ جب اس تجزیے کو پیش کیا گیا تو مغربی قارئین نے اسے محض ایک سازشی نظریہ قرار دیا۔ ان کے نزدیک ٹرمپ ایک غیر روایتی مگر موثر لیڈر تھا۔ یہاں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ مغربی دنیا اکثر اپنی پالیسیوں کو جمہوریت، امن اور ترقی کے لبادے میں پیش کرتی ہے، جبکہ مشرقی دنیا ان پالیسیوں کے اثرات کو اپنی سر زمین پر محسوس کرتی ہے۔ یہی فرق ادراک، اختلافِ رائے کو جنم دیتا ہے۔

انہوں نے یہ سوال اٹھایا کہ جب پاکستان جیسا ملک ٹرمپ کو نوبل امن انعام کیلئے نامزد کر رہا ہے اور اس کے وزیر اعظم اسے جنوبی ایشیا کو ایٹمی جنگ سے بچانے والا قرار دے رہے ہیں، تو پھر یہ اندیشہ کیوں؟ یہ سوال درحقیقت اس فکری خلج کی نشاندہی کرتا ہے جو مغربی بیانیے اور مشرقی مشاہدے کے درمیان حائل ہے۔

تاریخ کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ وہ جلد یادیر اپنے فیصلے سناتی ہے۔ ٹرمپ نے غزہ میں جاری مظالم کو روکنے کی بجائے اسرائیل کی پشت پناہی کی، اور یوں یہ حقیقت آشکار ہو گئی کہ وہ اور نیتن یاہو ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ جب غزہ میں مظالم اپنے عروج پر پہنچے اور عالمی ضمیر خاموش تماشائی بنارہا،

تو یہ واضح ہو گیا کہ انسانی حقوق کا نعرہ محض ایک سیاسی ہتھیار ہے۔ ٹرمپ کی جانب سے اسرائیل کی کھلی حمایت نے اس حقیقت کو مزید عیاں کر دیا کہ عالمی سیاست میں اخلاقیات کی کوئی مستقل حیثیت نہیں۔ یہ محض مفادات کے تابع ہوتی ہے۔ جب ایران پر ممکنہ حملے کی بازگشت سنائی دینے لگی، اور مشرق وسطیٰ ایک بار پھر بارود کے ڈھیر پر بیٹھا نظر آیا۔ تو امریکی جمہوریت کا حوالہ دے کر یہ کہا گیا کہ صدر تنہا جنگ نہیں چھیڑ سکتا، مگر عملی سیاست نے اس مفروضے کو بھی چیلنج کر دیا اور ٹرمپ نے ان تمام جمہوری اقدار کو ملیامیٹ کرنے میں لمحہ بھر تاخیر نہیں کی۔

ٹرمپ کے دوسرے دور میں جو ٹیم تشکیل دی گئی، وہ اس بات کی غماز تھی کہ اب پالیسی سازی میں اعتدال کی بجائے شدت پسندی کو ترجیح دی جائے گی اور اس جنوبی ٹیم نے اس خدشے کو حقیقت کا روپ دے دیا۔ کانگریس جیسے ادارے، جو جمہوریت کی علامت سمجھے جاتے ہیں، عملی طور پر بے اثر ہوتے دکھائی دیے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے نزدیک جنگ محض ایک آپشن نہیں بلکہ ایک حکمت عملی تھی۔ کانگریس کی منظوری کے بغیر جنگ کا آغاز اس بات کا ثبوت تھا کہ ادارے بھی بعض اوقات شخصیات کے سامنے بے بس ہو جاتے ہیں۔ دو ہفتوں سے زائد جاری رہنے والی جنگ اس بات کا اعلان تھی کہ دنیا ایک نئے دور تصادم میں داخل ہو چکی ہے۔ یہ ایک خطرناک رجحان ہے کیونکہ جب ادارے کمزور ہو جائیں تو فیصلے جذبات اور مفادات کے تابع ہو جاتے ہیں۔

اس جنگی فضا میں کچھ شخصیات کا کردار خاص طور پر نمایاں ہے۔ امریکی وزیر دفاع اور نیشنل انٹیلی جنس کی سربراہ، دونوں سابق فوجی، ایک ایسی سوچ کے نمائندہ ہیں جس میں مذہبی تعصب اور عسکریت پسندی کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ امریکی قیادت میں شامل بعض شخصیات کے بیانات اور نظریات اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ جنگ محض جغرافیائی یا معاشی نہیں بلکہ نظریاتی بھی ہے۔ مسجد اقصیٰ کے حوالے سے خطرناک عزائم اور مسلمانوں کے خلاف کھلی نفرت، اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ محض سیاسی اختلاف نہیں بلکہ ایک تہذیبی تصادم ہے۔ مسجد اقصیٰ کے حوالے سے خطرناک خیالات، اور مسلمانوں کے خلاف نفرت انگیز بیانات، ایک ایسے بیانیے کو جنم دیتے ہیں جو دنیا کو مذہبی بنیادوں پر تقسیم کر سکتا ہے۔

آج کا دور معلومات کا دور ہے، مگر یہ معلومات ہمیشہ سچ پر مبنی نہیں ہوتیں۔ میڈیا کا کردار اس میں نہایت اہم ہے۔ جب مخصوص حقائق کو چھپایا جائے اور مخصوص بیانیے کو فروغ دیا جائے تو عوام کی رائے بھی اسی کے مطابق ڈھل جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب متبادل معلومات سامنے آتی ہیں تو لوگ حیران رہ جاتے ہیں۔ جب ان شخصیات کے پس منظر اور روابط پر روشنی ڈالی گئی تو کئی لوگوں کیلئے یہ انکشافات چونکا دینے والے تھے۔ خاص طور پر آرائیس ایس اور بی جے پی کے ساتھ تعلقات کی تفصیلات نے بہت سے لوگوں کو خاموش کر دیا۔ یہ خاموشی دراصل اس اعتراف کی علامت تھی کہ معلومات کی کمی نے انہیں ایک محدود زاویہ نظر تک مقید رکھا تھا۔

پاکستان میں ٹرمپ کے حوالے سے ایک نرم گوشہ پایا جاتا ہے، جس کی بنیاد زیادہ تر بھارت مخالف بیانات پر ہے۔ مگر یہ سوچ کہ ”دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے“ ہمیشہ درست ثابت نہیں ہوتی۔ عالمی سیاست میں مستقل دوست یا دشمن نہیں ہوتے۔ صرف مفادات ہوتے ہیں۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ جہاں امریکا میں ٹرمپ پر تنقید ممکن ہے، وہیں پاکستان میں اسے ایک دوست کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ سوچ کہ وہ مودی کا مذاق اڑاتا ہے، اس لیے پاکستان کا خیر خواہ ہے، ایک سادہ لوحی پر مبنی مفروضہ ہے۔ درحقیقت عالمی سیاست میں دوستی نہیں، مفادات کا فرما ہوتے ہیں۔



بعد ازاں کئی افراد نے اس بات کا اعتراف کیا کہ میڈیا نے انہیں اصل حقائق سے دور رکھا۔ یہ اعتراف اس بات کی دلیل ہے کہ جدید دنیا میں اطلاعات کی فراہمی بھی ایک ہتھیار بن چکی ہے، اور سچ کو چھپانا بھی ایک حکمت عملی کا حصہ ہے۔ آج کی جنگیں زمین کے ٹکڑوں کیلئے نہیں بلکہ وسائل کیلئے لڑی جاتی ہیں۔ تیل، گیس اور دیگر توانائی کے ذخائر وہ خزانے ہیں جن پر قبضہ عالمی طاقتوں کا اصل ہدف ہے۔ ایران اس حوالے سے ایک اہم ملک ہے، اور اس پر حملہ اسی حکمت عملی کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔ ویزو ویلا پر حملہ اور اس کے بعد ایران کے بارے میں پیشگوئی، دراصل ایک ہی حکمت عملی کا تسلسل تھا۔ توانائی کے ذخائر پر قبضہ، جدید استعمار کی نئی شکل ہے۔ نیشنل سکیورٹی اسٹریٹجی میں درج نکات اس بات کا واضح اشارہ تھے کہ یہ سب کچھ منصوبہ بندی کے تحت ہو رہا ہے۔

جب کسی ریاست کی پالیسی دستاویز میں یہ لکھا ہو کہ وہ اپنے دشمنوں سے وسائل چھین لے گی، تو یہ دراصل ایک اعلان جنگ ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اسے سفارتی زبان میں پیش کیا جاتا ہے۔ جب اس اسٹریٹجی کو بغور پڑھا گیا تو یہ واضح ہو گیا کہ امریکا اپنے دشمنوں سے توانائی کے وسائل چھیننے کا ارادہ رکھتا ہے۔ مارچ 2026 میں ایران پر حملہ اسی پالیسی کا عملی مظہر تھا۔ ایران کے خلاف جنگ محض ایک ملک تک محدود نہیں رہ سکتی ایران کے خلاف جنگ اب پورے خطے کو اپنی پلیٹ میں لے چکی ہے۔ اس کے اثرات پورے مشرق وسطیٰ بلکہ عالمی معیشت پر بھی پڑ رہے ہیں۔ تیل کی قیمتیں، عالمی تجارت، اور سیاسی اتحاد سب اس سے بری طرح شدید متاثر ہو رہے ہیں۔ ادھر دوسری طرف مسجد اقصیٰ کے حوالے سے خدشات اور مسلم ممالک کو جنگ میں شامل کرنے کی کوششیں، ایک بڑے منصوبے کی جھلک پیش کرتی ہیں۔

جدید جنگوں میں صرف ہتھیار نہیں بلکہ فریب بھی استعمال ہوتا ہے۔ فالس فلیگ آپریشنز کے ذریعے ایک واقعے کا الزام کسی اور پر ڈال کر جنگ کا جواز پیدا کیا جاتا ہے۔ یہ ایک خطرناک رجحان ہے کیونکہ اس سے سچ اور جھوٹ کی تمیز مٹ جاتی ہے۔ ایران کی قیادت نے بعض حملوں کو فالس فلیگ قرار دیا ہے۔ ترکیہ اور پاکستان کے حوالے سے خدشات بھی سامنے آرہے ہیں، مگر حکمران طبقہ اب بھی ایک خوش فہمی میں مبتلا ہے۔

امریکی سینیٹ میں پاکستان کے میزائل پروگرام کو خطرہ قرار دینا، جبکہ بھارت کو نظر انداز کرنا، دراصل دباؤ ڈالنے کی ایک کوشش ہے۔ اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ عالمی طاقتیں اپنے مفادات کے مطابق اصول بدلتی رہتی ہیں۔ بھارت کا ذکر نہ کرنا اس دہرے معیار کی نشاندہی کرتا ہے۔ اور یہ دہرا معیار عالمی نظام کی کمزوری کو ظاہر کرتا ہے۔ تلسی گبارڈ کا سیاسی سفر اس بات کی مثال ہے کہ کس طرح شخصیات اپنے مفادات کے تحت نظریات بدلتی ہیں۔ ڈیموکریٹک پارٹی سے علیحدگی اور ریپبلکن پارٹی میں شمولیت، ایک ایسے بیانیے کی تشکیل تھی جو مخصوص مفادات کی تکمیل کیلئے ترتیب دیا گیا۔ آرایس ایس اور بی جے پی کے ساتھ روابط، مالی معاونت، اور سیاسی حمایت یہ سب اس بات کی دلیل ہیں کہ عالمی سیاست میں نظریاتی اتحاد بھی ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

ایران کے خلاف جنگ نے ایک مثبت پہلو بھی اجاگر کیا ہے۔ مسلم دنیا میں فرقہ وارانہ تقسیم کم ہوتی دکھائی دے رہی ہے۔ ایران کے خلاف جنگ نے شیعہ سنی اختلاف کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ عوام اب ایک وسیع تر شناخت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ عوام اب خود کو پہلے مسلمان اور بعد میں کسی مسلک سے وابستہ سمجھنے لگے ہیں۔ مگر دوسری طرف یورپ اس وقت ایک محضے کا شکار ہے۔ ایک طرف وہ امریکا کا اتحادی ہے، دوسری طرف وہ اس جنگ کے نتائج سے خوفزدہ بھی ہے۔ یورپ کی ہچکچاہٹ کے باوجود، ایک مذہبی بیانیہ تشکیل دینے کی کوشش جاری ہے تاکہ جنگ کو جواز فراہم کیا جاسکے۔ اس لیے ایک مذہبی بیانیہ تشکیل دینے کی کوشش کی جا رہی ہے تاکہ عوامی حمایت حاصل کی جاسکے۔

بلوچستان کا خطہ اپنی جغرافیائی اہمیت کے باعث عالمی طاقتوں کی توجہ کا مرکز ہے۔ اگر یہاں کوئی بڑی تبدیلی آتی ہے تو اس کے اثرات پورے خطے پر پڑیں گے۔ خطے میں مستقل فوجی موجودگی کیلئے بلوچستان کو ہدف بنایا جاسکتا ہے۔ یہ منصوبہ اگر حقیقت بن گیا تو خطے کا توازن بگڑ جائے گا۔ تاریخ گواہ ہے کہ بیرونی حملے ہمیشہ اندرونی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اگر کسی معاشرے میں غدار عناصر موجود ہوں تو دشمن کو کامیابی حاصل کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگتا۔ ایران اور لبنان میں نیٹ ورکس کی تیاری، اس بات کی مثال ہے کہ اندرونی کمزوریوں کو کس طرح بیرونی قوتیں استعمال کرتی ہیں۔ چابہار اور سیستان بلوچستان پر قبضہ، ایک ایسے جغرافیائی شے کی صورت اختیار کر سکتا ہے جس میں پاکستان محصور ہو جائے گا۔

ایران کا نظام اس لحاظ سے منفرد ہے کہ وہاں قیادت کا تسلسل برقرار رکھنے کیلئے متبادل انتظام موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شدید دباؤ کے باوجود وہ اپنا نظام برقرار رکھنے میں کامیاب رہا ہے۔ ڈیگو گارشیپر حملہ اور اس کے بعد کی سفارتی سرگرمیاں، ایک پیچیدہ کھیل کی عکاسی کرتی ہیں جس میں ہر چال سوچ سمجھ کر چلی جا رہی ہے۔ حالیہ واقعات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جنگ صرف میدان میں نہیں بلکہ سفارتی سطح پر بھی لڑی جا رہی ہے۔ کبھی حملے، کبھی مذاکرات کی پیشکش۔ یہ سب ایک حکمت عملی کا حصہ ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ پاکستان اس نازک موقع پر کیا حکمت عملی اختیار کرتا ہے۔ اس ساری صورتحال میں پاکستان ایک اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ اگر وہ دانشمندی سے کام لے تو نہ صرف خود کو محفوظ رکھ سکتا ہے بلکہ خطے میں استحکام کا باعث بھی بن سکتا ہے۔ ایران اور چین کے ساتھ تعلقات، اور داخلی استحکام۔ یہ سب عوامل اس کے مستقبل کا تعین کریں گے۔

یہ تمام حالات اس بات کی نشاندہی اور اشارہ کرتے ہیں کہ دنیا ایک نئے دورا ہے پر کھڑی بڑے مشکل امتحان سے گزر رہی ہے۔ اگر مسلم دنیا اور مغربی اقوام نے ہوش مندی، اتحاد اور بصیرت کا مظاہرہ نہ کریں تو تاریخ ایک بار پھر خود کو دہرا سکتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم محض تماشائی نہ بنیں بلکہ حالات کا ادراک کرتے ہوئے اپنی سمت کا تعین کریں، ورنہ وقت کا سیلاب ہمیں اپنے ساتھ بہا لے جائے گا۔ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم جذبات کی بجائے شعور سے کام لیں، اور وقتی مفادات کی بجائے طویل المدتی حکمت عملی اختیار کریں کیونکہ جو قومیں تاریخ سے سبق نہیں سیکھتیں، تاریخ انہیں سبق سکھاتی ہے۔ اور اس کا انداز ہمیشہ سخت ہوتا ہے۔

جب تاریخ اپنے فیصلے سناتی ہے تو وہ کسی عذر کو قبول نہیں کرتی۔ وہ نہ طاقت کو دیکھتی ہے، نہ کمزوری کو۔ وہ صرف یہ دیکھتی ہے کہ انسان نے اپنے اختیار کو کس حد تک شعور، انصاف اور دیانت کے ساتھ استعمال کیا۔ آج کا عہد بھی اسی کسوٹی پر پرکھا جا رہا ہے۔ یہ جو جنگیں ہم دیکھ رہے ہیں، یہ صرف سرحدوں کی حد بندی کا مسئلہ نہیں بلکہ یہ بیانیوں، نظریات اور مفادات کی ایک ایسی جنگ ہے جس میں سچ اور جھوٹ کی تمیز دھندلا چکی ہے۔ یہاں ہر

فریق اپنے آپ کو حق پر ثابت کرنے میں مصروف ہے، اور اس کشمکش میں سب سے زیادہ نقصان انسانیت کا ہو رہا ہے۔ معیشتیں لرز رہی ہیں، معاشرے تقسیم ہو رہے ہیں، اور ایک غیر یقینی فضا پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے چکی ہے۔

یاد رکھیں کہ تاریخ کا پہلی کبھی رکتا نہیں — وہ گھومتا ہے، فیصلے کرتا ہے، اور پھر انسانوں کو ان کے اعمال کا آئینہ دکھاتا ہے۔ آج ہم جس دور میں جی رہے ہیں، وہ محض ایک عارضی ہلچل نہیں بلکہ ایک ایسے عہد کی تمہید ہے جس کے اثرات آنے والی نسلوں کی تقدیر لکھیں گے لیکن ہر تاریکی کے دامن میں روشنی کی ایک کرن ضرور چھپی ہوتی ہے۔ یہی وہ لمحہ ہے جب قوموں کو اپنے اندر جھانکنا چاہیے، اپنی کمزوریوں کا اعتراف کرنا چاہیے، اور ایک نئی فکری بنیاد پر اپنی سمت کا تعین کرنا چاہیے۔ اتحاد، بصیرت اور حکمت — یہ وہ ستون ہیں جن پر ایک محفوظ اور باوقار مستقبل کی عمارت کھڑی کی جاسکتی ہے۔

یہ جنگیں، یہ بیانیے، یہ اتحاد اور یہ دشمنیاں — سب وقتی معلوم ہوتے ہیں، مگر ان کے نتائج دائمی ہوتے ہیں۔ اگر آج بھی انسان نے اپنے مفادات کو انسانیت پر ترجیح دی، اگر طاقت نے انصاف کو روندنا جاری رکھا، اور اگر قومیں شعور کی بجائے جذبات کے پیچھے چلتی رہیں — تو آنے والا کل ماضی سے بھی زیادہ تاریک ہو سکتا ہے۔ اگر ہم نے اس وقت کو محض ایک عارضی بحران سمجھ کر نظر انداز کر دیا، تو یہ ہماری سب سے بڑی بھول ہوگی۔ کیونکہ یہ عہد محض گزرنے کیلئے نہیں آیا — یہ ہمیں آزمانے آیا ہے، ہمیں جگانے آیا ہے، اور ہمیں یہ بتانے آیا ہے کہ دنیا میں بقا صرف اسی کی ہے جو وقت کی نبض کو پہچان لے۔

اگر ہم نے اس وقت کو محض ایک عارضی بحران سمجھ کر نظر انداز کر دیا، تو یہ ہماری سب سے بڑی بھول ہوگی۔ کیونکہ یہ عہد محض گزرنے کیلئے نہیں آیا — یہ ہمیں آزمانے آیا ہے، ہمیں جگانے آیا ہے، اور ہمیں یہ بتانے آیا ہے کہ دنیا میں بقا صرف اسی کی ہے جو وقت کی نبض کو پہچان لے۔ مگر امید کا چراغ ابھی بجھا نہیں۔ ہر عہد آشوب میں کچھ ایسے لوگ، کچھ ایسی آوازیں ضرور ہوتی ہیں جو اندھیروں کے خلاف کھڑی ہوتی ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم خود کو پہچانیں، تاریخ سے سبق سیکھیں، اور اپنی سمت کا تعین شعور، بصیرت اور اتحاد کے ساتھ کریں۔ آخر کار، فیصلہ ہمارے ہاتھ میں ہے، ہم تاریخ کے بہاؤ میں بہہ جائیں گے یا اس کا رخ موڑنے کی ہمت کریں گے۔ کیونکہ آنے والی نسلیں صرف ہمارے اعمال کی وارث نہیں ہوں گی، بلکہ ہمارے فیصلوں کی بھی گواہ ہوں گی — اور تاریخ، ہمیشہ کی طرح، اپنا فیصلہ سننے میں دیر نہیں کرے گی۔ کیونکہ وقت ہمیشہ ایک سوال بن کر سامنے آتا ہے اور جواب ہمیں خود دینا ہوتا ہے۔ اگر ہم نے آج درست فیصلہ نہ کیا، تو کل تاریخ ہمیں معاف نہیں کرے گی۔

ایک گمشدہ سچ کی تلاش

یہ وہ ساعتِ نازک ہے جس کے دہانے پر کھڑے ہو کر انسان کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تاریخ اپنی کروٹ بدلنے کو ہے۔ ایک ایسا موڑ، جہاں واقعات محض خبریں نہیں رہتے بلکہ زمانے کی تقدیر لکھتے ہیں۔ دوستو! جس موضوع پر ہم گفتگو کرنے جا رہے ہیں، وہ اس تنازع کا ایک حقیقی نقطہ انقلاب ہے؛ اور اس سے پہلے کہ ہم اس کے باطن میں اتر کر اس کے تہہ در تہہ حقائق کو آشکار کریں، یہ وضاحت ضروری ہے کہ یہ کوئی قیاس آرائی یا بے بنیاد گمان نہیں۔ جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے، وہ مستند ذرائع سے اخذ کردہ ہے۔ اور ہم آپ کو اس کے ایک ایک پہلو سے روشناس کرائیں گے۔

تاریخ کے وسیع و عریض کینوس پر بعض اوقات ایسے مناظر ابھرتے ہیں جو محض واقعات نہیں ہوتے بلکہ تہذیبوں کے سفر میں سنگ میل کا درجہ رکھتے ہیں۔ اور تاریخ کے اوراق میں بعض لمحات ایسے بھی ہوتے ہیں جو محض واقعات نہیں ہوتے بلکہ عہد ساز موڑ بن جاتے ہیں۔ ایسے موڑ جہاں طاقت کے توازن بدلتے ہیں، بیانیے ٹوٹتے ہیں، اور حقیقت اپنے تمام تر جلال کے ساتھ نقاب الٹ دیتی ہے۔ یہ وہ لمحات ہوتے ہیں جب طاقت کے ایوان لرزتے ہیں، جب فیصلے تقدیر بن جاتے ہیں، اور جب قوموں کی حکمت عملیوں کا اصل چہرہ بے نقاب ہوتا ہے۔ آج کا عالمی منظر نامہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ ہم ایک ایسے ہی لمحہ انقلاب سے گزر رہے ہیں، جہاں مشرق وسطیٰ کی سر زمین ایک بار پھر عالمی سیاست کے دھارے کو نئی سمت دینے کیلئے آمادہ دکھائی دیتی ہے اور ایک ایسا منظر جہاں مشرق وسطیٰ کی خاک آلود سر زمین ایک بار پھر عالمی سیاست کے دھارے کو موڑنے جا رہی ہے۔

یہ بحران کسی ایک ملک، ایک خطے یا ایک وقتی تصادم تک محدود نہیں رہا، بلکہ اب یہ ایک ہمہ گیر تغیر کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ ایک ایسا تغیر جس نے نہ صرف امریکا کی عالمی برتری کو چیلنج کیا ہے بلکہ اس کے اخلاقی جواز کو بھی سوالیہ نشان بنادیا ہے۔ یہ بحران وقتی نہیں، بلکہ تدریجی ارتقا کا نتیجہ ہے۔ ایسا ارتقا جو برسوں سے خاموشی کے پردے میں پنپ رہا تھا اور اب ایک طوفان کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ اس طوفان نے نہ صرف امریکا کی عسکری برتری کو چیلنج کیا ہے بلکہ اس کے اخلاقی جواز کو بھی متزلزل کر دیا ہے۔

صورت حال اس نہج پر پہنچ چکی ہے جہاں واشنگٹن کی گرفت ڈھیلی نہیں بلکہ تقریباً ٹوٹ چکی ہے۔ اس بحران کا مرکز ایک ایسا اتحادی ہے جس پر امریکا نے اپنے علاقائی وجود کی بنیاد رکھی تھی۔ اور عجب ستم یہ کہ عین اُس لمحے جب اسے اس اتحادی کی سب سے زیادہ ضرورت تھی، وہی ہاتھ اس کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ امریکا کی نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ ایک ایسا دھوکہ ہے جس کا شائبہ تک نہ تھا؛ مگر ایران، جو صبر و تدبیر کی طویل حکمت عملی پر کاربند رہا، شاید مدتوں سے اس گھڑی کا منتظر تھا۔

یہ وہی عراق ہے جس پر امریکا نے دو دہائیوں تک اپنی توانائیاں، اپنے وسائل اور اپنی حکمت عملی نچھاور کی۔ 2003 میں امریکا نے عراق پر حملہ کیا۔ ایک ایسا حملہ جسے دنیا کے سامنے ”مہلک ہتھیاروں کے جواز اور ایک ناگزیر اقدام کے طور پر پیش کیا گیا۔ دلیل یہ دی گئی کہ عراق کے پاس ایسے مہلک ہتھیار موجود ہیں جو عالمی امن اور انسانیت کیلئے خطرہ بن سکتے ہیں۔ یہ بیانیہ اس شدت سے پھیلا یا گیا کہ عالمی ضمیر اس کے زیر اثر آ گیا۔ عالمی میڈیا نے اس بیانیے کو اس شدت سے فروغ دیا کہ دنیا کی بڑی تعداد اس فریب کو حقیقت سمجھ بیٹھی۔ مگر جب جنگ کی دھول بیٹھی، تو حقیقت کا چہرہ بالکل مختلف تھا۔ نہ کوئی جوہری یا مہلک ہتھیار ملا، نہ کوئی فوری خطرہ، نہ کوئی عالمی خطرہ۔ البتہ تیل کے بے پایاں ذخائر ضرور دریافت ہوئے جس کیلئے ایک

ہنستا، خوشحال ریاستی ڈھانچے بلبے میں تبدیل ہو چکا تھا۔

اس کے بعد امریکانے عراق کو از سر نو تعمیر کرنے اور اپنے سانچے میں ڈھالنے کا مہنگا ترین منصوبہ شروع کیا۔ ایک ایسا منصوبہ جس پر کھربوں ڈالر صرف کیے گئے، جس میں فوجی تربیت سیاسی نظام کی تشکیل، اور سفارتی ڈھانچے کی تعمیر شامل تھی۔ کھربوں ڈالر خرچ کر کے ایک نئی فوج تشکیل دی گئی، سیاسی ڈھانچہ از سر نو بنایا گیا؛ اور بغداد میں دنیا کا سب سے بڑا سفارت خانہ تعمیر کیا گیا۔ یہ سب اخراجات عراق کے تیل کے ذخائر سے پورے کئے گئے۔ اس بات کی علامت تھا کہ عراق امریکا کیلئے محض ایک اتحادی نہیں بلکہ ایک اسٹریٹیجک ستون تھا۔ یہ سب کچھ اس یقین کے ساتھ کیا گیا کہ عراق ایک وفادار اتحادی بنے گا۔ لیکن آج، یہی ستون نہ صرف لرز رہا ہے بلکہ خوفناک دراڑوں کا شکار ہے۔ اور وہ سرمایہ، وہ عسکری قوت، وہ سیاسی ڈھانچہ، سب اسی طاقت کے خلاف کھڑے دکھائی دیتے ہیں جس نے انہیں تشکیل دیا تھا۔ اطلاعات یہ ہیں کہ وہی اڈے جو امریکانے اپنے دفاع کیلئے تیار کئے، اب امریکی افواج پر حملوں کیلئے استعمال ہو رہے ہیں، اور وہی عناصر جنہیں تربیت دی گئی، دشمن کو نشانے فراہم کر رہے ہیں۔ تاریخ نے ایک بار پھر ثابت کیا کہ قوموں کی وفاداریاں محض جبر اور طاقت کی دھونس سے نہیں خریدی جاسکتیں۔

جہاں امریکانے طاقت، سرمایہ اور عسکری برتری پر انحصار کیا، وہیں ایران نے ایک مختلف راستہ اختیار کیا۔ ایک ایسا راستہ جو بظاہر سست مگر اندر سے نہایت مضبوط تھا۔ خاموش، تدریجی اور تہذیبی اثر و رسوخ پر مبنی۔ ایران نے عراق میں نہ صرف مذہبی و ثقافتی روابط کو مضبوط کیا بلکہ سماجی اور خاندانی سطح پر بھی اپنی جڑیں گہری کیں۔ ایران نے عربوں ڈالر کے معاہدوں سے نہیں، بلکہ تہذیبی رشتوں، مذہبی وابستگیوں، خاندانی تعلقات اور خاموش دراندازی کے ذریعے عراق کے اداروں میں اپنی موجودگی مضبوط کی۔ ایران نے عراق میں ثقافتی، مذہبی اور سماجی روابط کو فروغ دیا۔ جب واشنگٹن عظیم الشان عمارتیں تعمیر کر رہا تھا، تہران دلوں میں گھر کر رہا تھا۔ اور اب یہ خاموش جدوجہد اپنے نتائج دکھا رہی ہے۔ یہ بحر ان ایک اور حقیقت کا بھی بے نقاب کر رہا ہے کہ وفاداریاں محض سرمایہ کاری سے نہیں خریدی جاسکتیں۔ امریکانے عمارتیں بنائیں، ایران نے رشتے بنائے۔ ایک نے ڈھانچہ کھڑا کیا، دوسرے نے دلوں میں جگہ بنائی۔ اعتماد پیدا کیا، اور ایک ایسا نیٹ ورک قائم کیا جو وقت کے ساتھ ساتھ مضبوط ہوتا گیا۔ یہ حکمت عملی کسی فوری نتیجے کی متقاضی نہیں تھی۔ بلکہ یہ صبر تسلسل اور تدبیر کا تقاضا کرتی تھی اور آج، جب حالات بدل رہے ہیں، تو یہی حکمت عملی اپنا اثر دکھا رہی ہے۔ یہ وہ جنگ تھی جو بد وقوں سے نہیں، تعلقات سے لڑی گئی۔ اور آج اس کے نتائج پوری شدت کے ساتھ سامنے آرہے ہیں۔ عراق کی سیاسی قیادت، اس کے سکیورٹی ادارے، اور اس کے داخلی فیصلے اب اس اثر سے آزاد نہیں رہے۔ اور تاریخ گواہ ہے کہ آخر کار فیصلہ دل ہی کرتے ہیں، دیواریں نہیں۔

عراق کی موجودہ پالیسی — خصوصاً اس کی خاموشی — ایک گہرا پیغام رکھتی ہے۔ بغداد کی خاموشی — جو بظاہر سکوت ہے — درحقیقت ایک فیصلہ ہے۔ عراق کی سیاسی قیادت — خصوصاً وزیراعظم — ایسی قوتوں کے زیر اثر ابھری ہے جن کی جڑیں تہران سے جاملتی ہیں۔ عرب لیگ کی ایبلوں کے باوجود عراق کی طرف سے نہ کوئی مذمت آئی، نہ تحقیق کا اعلان، نہ امن کی اپیل۔ اور جو لوگ علاقائی سیاست کے رموز سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ بعض اوقات خاموشی ہی سب سے بلند اعلان ہوتی ہے — ایسا اعلان جسے زبان پر لانا شاید ممکن نہ ہو، مگر جس کے اثرات ناقابل انکار ہوتے ہیں۔



علاقائی سطح پر جب عراق سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اپنی سرزمین سے ہونے والے حملوں کی مذمت کرے، تو بغداد کی خاموشی نے سب کچھ کہہ دیا، نہ کوئی بیان، نہ کوئی تردید، نہ کوئی اقدام—یہ وہ خاموشی ہے جو دراصل ایک اعلان ہے، ایک ایسا اعلان ج زبان پر نہیں آتا مگر حالات میں جھلک جاتا ہے۔ یہ سکوت دراصل اس حقیقت کا مظہر ہے کہ عراق اب اس راستے پر گامزن ہو چکا ہے جہاں سے واپسی آسان نہیں۔ جب عرب دنیا نے اس سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنی سرزمین سے ہونے والے حملوں کی مذمت کرے، تو اس نے سکوت اختیار کیا۔ یہ سکوت محض خاموشی نہیں بلکہ ایک فیصلہ ہے—ایسا فیصلہ جسے زبان پر لانا شاید ممکن نہ ہو، مگر جس کے اثرات واضح ہیں۔ یہ خاموشی اس امر کی علامت ہے کہ عراق اب ایک نئے راستے پر گامزن ہو چکا ہے—ایسا راستہ جہاں اس کی ترجیحات بدل چکی ہیں، اور اس کی وفاداریاں نئی سمت اختیار کر رہی ہیں۔

گزشتہ بہتر گھنٹوں میں امریکی اہداف پر حملوں میں جو شدت آئی ہے، وہ کسی اتفاق یا حادثے کا نتیجہ نہیں معلوم ہوتی۔ ایران نے کھلے عام ان حملوں کی ذمہ داری قبول کی ہے، اور ریاستی ذرائع ابلاغ نے انہیں ایک منظم عسکری حکمت عملی کا حصہ قرار دیا ہے۔ جو کبھی ”باغی گروہوں“ کی کارروائی سمجھی جاتی تھی، اب ایک مربوط فوجی مہم کے طور پر سامنے آرہی ہے۔ جس میں عراقی اور ایرانی قوتیں بظاہر ایک ہی صف میں دکھائی دیتی ہیں۔

اس بدلتی ہوئی فضا کی سب سے واضح علامت وہ حکم انخلا ہے جو عراق میں امریکی سفارت خانے نے جاری کیا ہے—ایسا حکم جو کسی تاخیر کا متحمل نہیں، بلکہ فوری اطاعت کا تقاضا کرتا ہے۔ امریکی سفارت خانے کی تازہ ہدایات اس خطرے کی شدت کو عیاں کرتی ہیں: امریکی شہریوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ وہ نہ صرف عراق چھوڑ دیں بلکہ بغداد میں واقع سفارت خانے اور اربیل میں قونصل خانے سے بھی دور رہیں—کیونکہ یہ مقامات اب براہ راست عسکری اہداف بن چکے ہیں۔ یہ کیسا المیہ ہے کہ ایک ریاست اپنے شہریوں کو اپنے ہی سفارتی مراکز سے دور رہنے کی تلقین کر رہی ہے۔

واشنگٹن کا امریکی شہریوں کو فوری طور پر عراق چھوڑنے کی ہدایت نہ صرف ایک غیر معمولی قدم ہے بلکہ امریکی سفارت خانے کی جانب سے فوری انخلا کا حکم اس بحران کی سنگینی کو عیاں اور متکبر طاقت کی پسپائی کا استعارہ بھی ہے۔ امریکی شہریوں کو ہدایت دی گئی ہے کہ وہ فی الفور عراق چھوڑ دیں۔ فضائی حدود بند ہو چکی ہیں، اور اب خروج کا واحد راستہ خشکی ہے—اردن، کویت، سعودی عرب یا ترکی کی جانب۔ یہ محض ایک انتظامی اقدام نہیں؛ یہ اس حقیقت کا اعلان ہے کہ فضا بھی اب محفوظ نہیں رہی۔ یہ ایک ایسا اعتراف ہے جو کسی بھی سپر پاور کیلئے آسان نہیں ہوتا۔ اس سے پہلے بھی انخلا کے اعلانات ہوتے رہے ہیں، مگر اس بار معاملہ مختلف ہے—یہ ایک غیر معمولی صورت حال ہے، جو اس امر کی غماز ہے کہ خطرہ محض خارجی نہیں بلکہ اندرونی بھی ہو چکا ہے۔

یہ محض احتیاطی تدبیر نہیں، بلکہ ایک ہمہ گیر انخلا ہے—اس اعتراف کے ساتھ کہ جس سرزمین پر برسوں سرمایہ کاری کی گئی، وہ اب مخالف قوتوں کا مورچہ بن چکی ہے۔ اطلاعات یہ بھی ہیں کہ بعض ریاستی عناصر ان حملوں کو روکنے کی بجائے سہولت فراہم کر رہے ہیں؛ دفاعی نظام عین اس وقت

خاموش ہو جاتے ہیں جب ان کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے: کیا یہ سب محض اتفاق ہے، یا ایک منظم حکمتِ عملی کا حصہ؟ یہ وہ لمحہ ہے جہاں طاقتور ریاستیں بھی اپنے قدم پیچھے کھینچنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ اور یہی وہ لمحات ہیں جہاں تاریخ ان کے فیصلوں کا محاسبہ کرتی ہے، جہاں طاقتور ریاستیں اپنی حدود کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ اور ان کی اصل حیثیت سامنے آتی ہے۔

اگر یہ صورت حال مزید بگڑتی ہے تو اس کے اثرات افغانستان سے بھی زیادہ سنگین ہو سکتے ہیں۔ وہاں امریکی انخلا کے وقت جدید اسلحہ پیچھے رہ گیا تھا؛ مگر عراق میں معاملہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ پیٹریاٹ میزائل سسٹمز، انٹیلیجنس ڈھانچے، ریڈ انٹیلیجنس، اور ایک ایسا جغرافیائی محل وقوع جو بے حد قیمتی ہے۔ اگر یہ سب ہاتھ سے نکل گیا تو یہ محض ایک عسکری نقصان نہیں بلکہ آنے والی نسلوں کیلئے ایک تزویراتی سانحہ ہو گا۔

یہ بحران صرف خارجہ محاذ تک محدود نہیں رہا، بلکہ اب اس کی بازگشت خود امریکا کے اندر سنائی دے رہی ہے۔ امریکی سیاسی حلقوں میں ایک بے چینی، غیر معمولی اضطراب، اور ایک گہری تشویش پائی جاتی ہے۔ متعدد امریکی رہنما—خواہ وہ سابق عہدیداران ہوں یا موجودہ سیاسی شخصیات، کھلے عام اس امر کا اظہار کر رہے ہیں کہ موجودہ قیادت نہ صرف عالمی امن کیلئے خطرہ بن چکی ہے بلکہ خود امریکا کی ساکھ کو بھی مجروح کر رہی ہے۔

ٹرمپ، جو خود کو ایک مضبوط اور فیصلہ کن رہنما کے طور پر پیش کرتے ہیں، اب تنقید کا مرکز بن چکے ہیں۔ خصوصاً ٹرمپ کی حالیہ تقریر—جس سے دنیا کو امید تھی کہ شاید وہ جنگ بندی کا اعلان کریں گے—شاید وہ ایک نئے باب کا آغاز کریں گے—مگر ایسا نہ ہو سکا۔ ایک بار پھر مایوسی کا سبب بنی۔ ان کے الفاظ میں امن کا ذکر ضرور تھا، مگر ان کے اقدامات اس کے برعکس دکھائی دیے۔ یہ وہ تضاد ہے جو اب امریکی سیاست کا مستقل وصف بنتا جا رہا ہے۔ بین الاقوامی سیاست میں الفاظ کی اہمیت ہوتی ہے، مگر اس سے کہیں زیادہ اہمیت عمل کی ہوتی ہے۔ جب ایک ریاست اپنے وعدوں سے انحراف کرے، اپنے بیانیے سے پیچھے ہٹے، اور اپنے ہی اصولوں کی نفی کرے—تو یہ صرف سیاسی ناکامی نہیں بلکہ اخلاقی زوال کی علامت بن جاتا ہے۔ ٹرمپ کی تقریر میں امن، مذاکرات اور استحکام کی بات ضرور کی گئی—مگر عملی اقدامات اس کے برعکس نظر آئے۔ ٹرمپ کی پالیسیوں میں یہ تضاد نمایاں ہے اور یہی وہ تضاد ہے جو اب امریکی سیاست کی پہچان بنتا جا رہا ہے۔

ایک طرف امن کی بات، دوسری طرف عسکری کارروائیاں؛ ایک طرف مذاکرات کا اعلان، دوسری طرف پابندیاں—اس دو غلے پن نے نہ صرف عالمی برادری کو ششدر کر دیا ہے بلکہ امریکی عوام کو بھی ایک اخلاقی مخمضے میں مبتلا کر دیا ہے۔ اور آج یہ دو غلا پن نہ صرف عالمی سطح پر امریکا کی ساکھ کو متاثر کر رہا ہے بلکہ اس کے اپنے عوام کو بھی مایوس کر رہا ہے۔ امریکی عوام، جو خود کو جمہوریت، انصاف اور اخلاقی برتری کا علمبردار سمجھتے ہیں، اب ایک ایسے موڑ پر کھڑے ہیں جہاں انہیں اپنے ہی نظام پر سوال اٹھانے پڑ رہے ہیں۔

اس بحران کا سب سے فوری اور شدید اثر عالمی توانائی کی منڈی پر پڑا ہے۔ آبنائے ہرمز—جو دنیا کی توانائی کا ایک اہم راستہ ہے—اب عملی طور پر بند ہو چکی ہے۔ اس بندش نے عالمی توانائی کی فراہمی کو شدید متاثر کیا ہے اور اب اس بحران کا ایک سنگین اور خطرناک پہلو—عالمی توانائی کی منڈی—آبنائے ہرمز کی بندش کے باعث روزانہ گیارہ ملین بیرل تیل عالمی منڈی سے غائب ہو رہا ہے—یہ مقدار ماضی کے بڑے تیل بحرانوں سے بھی دو گنی ہے۔ قیمتی آسمان کو چھو رہی ہیں، اور اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو عالمی معیشت ایک نئے بھونچال سے دوچار ہو سکتی ہے۔ یہ صورت حال نہ صرف صنعتی ممالک کیلئے چیلنج ہے بلکہ ترقی پذیر ممالک کیلئے ایک معاشی بحران بن چکی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ صورت حال ماضی کے بڑے توانائی بحرانوں سے بھی زیادہ سنگین ہے۔ دنیا بھر کی حکومتیں ہنگامی اقدامات کر رہی ہیں۔ کہیں ایندھن کی راشن بندی، کہیں قیمتوں پر کنٹرول، کہیں متبادل ذرائع کی تلاش کی طرف تیزی سے منتقل ہو رہی ہے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ اس بحران نے ایک بار پھر ریاستی کنٹرول کے رجحان کو تقویت دی ہے۔ دنیا بھر کی حکومتیں ہنگامی اقدامات کر رہی ہیں۔ کہیں ایندھن کی راشن بندی، کہیں قیمتوں پر قدغن، کہیں توانائی کے متبادل ذرائع کی جانب تیز رفتار پیش قدمی۔ ریاستی کنٹرول کا بڑھتا ہوا دائرہ۔ جب وسائل محدود ہوتے ہیں، تو ریاستیں اپنے اختیارات کو وسیع کرتی ہیں۔ نقل و حرکت کی پابندیاں، توانائی کے استعمال پر قدغن، اور روزمرہ زندگی میں حکومتی مداخلت۔ یہ سب اس نئے دور کی علامتیں ہیں اور یہ سب اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ بحران کے وقت ریاستیں کس طرح اپنے دائرہ اختیار کو وسیع کرتی ہیں۔ اس منظر میں ایک عجب مماثلت و بانی دور سے بھی جھلکتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس بار خطرہ ایک وائرس نہیں بلکہ ایک جغرافیائی و سیاسی تصادم ہے۔ نقل و حرکت کی پابندیاں، ریاستی ہدایات پر انحصار، اور روزمرہ زندگی کا نظم و نسق حکومتی فیصلوں کے تابع ہو گیا ہے جو بعد ازاں فسطائیت کا راستہ بھی اختیار کر سکتا ہے جو انسانیت کیلئے ایک اور بڑا عذاب بن سکتا ہے۔

جہاں بیشتر ممالک قلیل مدتی حل تلاش کر رہے ہیں، وہیں برطانیہ نے اس بحران کو ایک طویل مدتی موقع کے طور پر لیا ہے۔ متبادل توانائی کے متبادل ذرائع کی طرف پیش قدمی، جیسے شمسی توانائی اور ہیٹ پمپس، ماحولیاتی پالیسیوں کا نفاذ، اور توانائی کی خود کفالت کی کوششوں کو لازمی قرار دے کر وہ ایک طویل مدتی تبدیلی کی راہ ہموار کر رہا ہے۔ دیگر ممالک بھی اپنے اپنے انداز میں اس بحران سے نمٹنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ وہ اقدامات ہیں جو مستقبل کی سیاست کو نئی جہت دے سکتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ تبدیلی اتنی تیز ہو سکتی ہے کہ موجودہ بحران پر اثر انداز ہو؟

جو کچھ آج ہو رہا ہے وہ محض ایک خلل اور بحران نہیں۔ یہ ایک از سر نو تعمیر اور ایک نئی عالمی ترتیب کی تشکیل ہے۔ امریکا کی تزویراتی برتری چیلنج ہو رہی ہے، ایران کی حکمت عملی اپنے نتائج کے لحاظ سے کامیاب دکھائی دے رہی ہے، اور عالمی نظام ایک نئے توازن کی تلاش میں ہے۔ عالمی توانائی کا نظام، جس پر دہائیوں سے انحصار تھا، بکھر رہا ہے۔ مشرق وسطیٰ میں امریکا کی بنائی ہوئی تزویراتی عمارت دراڑوں کا شکار ہے اور بغداد، تہران، واشنگٹن اور بیجنگ میں ہونے والے فیصلے آنے والی دہائی کی سمت متعین کریں گے۔

یہ وہ لمحہ ہے جہاں فیصلے صرف حکومتیں نہیں کر رہیں۔ اور تاریخ لکھی نہیں جا رہی بلکہ تشکیل پا رہی ہے اور خود اپنے لیے ایسا راستہ چن رہی ہے جہاں مستقبل میں ایسے حالات پیدا نہ ہوں کہ فرد واحد کے ہاتھ میں دنیا کی تقدیر کے فیصلے لکھنے کی طاقت ہو۔ اور شاید سب سے اہم سوال یہی ہے، کیا دنیا اس نئے راستے کیلئے تیار ہے؟ یہ وہ لمحہ ہے جہاں تاریخ کا شاید سب سے اہم سوال یہی ہے، کیا انسانیت اس نئی دنیا کیلئے تیار ہے؟

جھوٹ کا نقاب، سچ کا انکشاف

زمانہ اپنی رفتار میں ہمیشہ یکساں نہیں رہتا۔ کبھی یہ امن کی نرم ہواؤں میں سانس لیتا ہے اور کبھی فتنوں کی آندھیوں میں الجھ کر اپنی شناخت کھو بیٹھتا ہے۔ آج کا عالمی منظر نامہ اسی اضطراب کی تصویر ہے جہاں طاقت کے ایوانوں میں بیٹھے کردار بظاہر امن کے پیامبر ہیں، مگر پس پردہ ان کے عزائم ایسے پیچیدہ جال بنتے ہیں جن میں سچائی اکثر الجھ کر رہ جاتی ہے۔ یہ رپورٹ اسی الجھن کو سلجھانے کی ایک کاوش ہے۔ ایسی کاوش جس میں تاریخ کے مستقبل کے خدشات یکجا ہو کر ایک فکری داستان رقم کرتے ہیں۔ اس تحریر میں محض واقعات کا بیان نہیں بلکہ ان کے پس صدائیں، حال کی گونج اور منظر، ان کے اثرات اور ان کے مضمرات کا ایک سنجیدہ و متوازن جائزہ پیش کیا گیا ہے، تاکہ قاری محض خبر نہ پڑھے بلکہ حقیقت کے قریب تر پہنچ سکے۔

عصر حاضر کی سیاست، جسے کبھی توازن و تدبیر کا آئینہ دار سمجھا جاتا تھا، اب شطرنج کی ایسی بساط بن چکی ہے جہاں مہروں کی چالیں خفیہ، نیتیں پیچیدہ اور نتائج انسانیت کیلئے تباہ کن ہوتے جا رہے ہیں۔ عصر حاضر کی عالمی سیاست ایک ایسے گرداب میں داخل ہو چکی ہے جہاں حق و باطل کی تمیز دھندلا گئی ہے اور سفارتی مسکراہٹوں کے پس پردہ خنجر کی چمک نمایاں ہونے لگی ہے۔ طاقت کے ایوانوں میں بیٹھے ہوئے کردار بظاہر امن کے پیامبر نظر آتے ہیں، مگر ان کے ہاتھوں میں سازشوں کے وہ دھاگے ہوتے ہیں جن سے عالمی امن کا کفن بُنا جاتا ہے۔ عالمی سیاست آج ایک ایسے موڑ پر کھڑی ہے جہاں حقیقت اور فریب کے درمیان لکیر دھندلا چکی ہے۔

ایسے میں پاکستان کے حساس اداروں کی جانب سے بھارت کی مبینہ فاس فلگ منصوبہ بندی کو بے نقاب کرنا محض ایک انٹیلی جنس کامیابی نہیں بلکہ غیر معمولی پیش رفت اور تاریخ کے اوراق میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ اقدام محض اس خطے کو ایک بڑی تباہی سے بچانے کا ہی نہیں بلکہ ایک فکری اور سفارتی معرکہ بھی ہے، جس نے خطے کی سیاست میں ہلچل پیدا کر دی ہے۔ جو نہ صرف خطے کی سیاست بلکہ عالمی ضمیر کیلئے بھی لمحہ فکریہ ہے۔ اس مکر وہ اور خطرناک فاس فلگ کا قبل از وقت انکشاف محض ایک خبر نہیں بلکہ ایک پردہ چاک حقیقت ہے، جو سفارتی چالوں کے پیچیدہ جال کو آشکار کرتی ہے۔ یہ انکشاف اس خاموش جنگ کا اظہار ہے جو میدانوں میں نہیں بلکہ ذہنوں، منصوبوں اور خفیہ کمروں میں لڑی جا رہی ہے۔

سیکورٹی ذرائع کے مطابق پاکستانی انٹیلی جنس ایجنسی نے بھارت کی خفیہ کمیونیکیشن کوڈی کوڈ کر لیا ہے۔ یہ عمل کسی معمولی تکنیکی مہارت کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ جہاں برسوں کی تربیت، صبر آزما تحقیق اور فکری ژرف نگاہی کا ثمر ہے وہاں فکری بیداری، قومی غیرت اور پیشہ ورانہ بصیرت کا مظہر ہے۔ یہ عمل اس بات کی علامت ہے کہ جدید دنیا میں معلومات ہی اصل طاقت ہیں۔ گویا اسرار کے دبیز پردے کو چاک کر کے گویا تاریکی کے سینے میں چھپے رازوں کو چراغِ تدبیر سے روشن اور حقیقت کی کرن کو نمایاں کر دیا گیا ہو۔

یہ کامیابی اس امر کی دلیل بھی ہے کہ جدید جنگیں اب بارود سے نہیں بلکہ معلومات سے لڑی جاتی ہیں، اور جس کے پاس معلومات کا خزانہ ہو وہی اصل میدان کا فاتح ہوتا ہے۔ اس تناظر میں پاکستان کی یہ کامیابی نہ صرف دفاعی اور ذہنی برتری کا مظہر ہے بلکہ سفارتی سطح پر بھی ایک مضبوط دلیل فراہم کرتی ہے کہ یہ کامیابی دراصل دشمن کے ارادوں کو قبل از وقت سمجھ کر انہیں ناکام بنا کر اپنی عسکری ٹیکنالوجی کا بھی بہترین اعلان ہے۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ فاس فلک آپریشن کوئی نیا حربہ نہیں، بلکہ تاریخ کا ایک تلخ باب ہیں۔ جہاں جھوٹ کو سچ کے قالب میں ڈھال کر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ حکمت عملی کا مقصد دراصل عالمی رائے عامہ کو گمراہ کر کے اپنے اقدامات کو جائز قرار دینا ہوتا ہے۔ یہ وہ پرانا ہتھیار ہے جسے طاقتور ریاستیں اپنے مذموم عزائم کو جواز دینے کیلئے استعمال کرتی رہی ہیں۔ جو نہی مصدقہ اطلاعات کے مطابق معلوم ہوا کہ بھارت ایک باپھر اسی مکار روش کو استعمال کرنے کی تیاری میں ہے، تاکہ اپنے اقدامات کو جواز فراہم کیا جاسکے تو پاکستانی اداروں نے اسے فوری طور پر ناکام بنانے کیلئے شواہد کے ساتھ اس کو ناکام بنانے کا آپریشن شروع کر دیا۔

یہاں بھی یہی اندیشہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ ایک مصنوعی واقعہ تخلیق کر کے اس کا الزام پاکستان پر ڈالنے کی تیاری کی جا رہی ہے۔ جس کیلئے پاکستانی قیدیوں کو رہا کر کے استعمال کرنے کا ارادہ ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ طرز عمل اس کہادت کی عملی تصویر ہے کہ ”چور چپائے شور“، تاکہ اصل مجرم خود کو پردہ اخفا میں رکھ سکے۔

سیکورٹی ذرائع کے مطابق بھارتی منصوبے میں پاکستانی قیدیوں کو استعمال کرنے کا ارادہ شامل ہے، جنہیں مقبوضہ کشمیر کے سرحدی علاقوں میں لے جا کر کسی کارروائی کا حصہ بنایا جاسکتا ہے۔ یہ عمل نہ صرف بین الاقوامی قوانین کی صریح خلاف ورزی ہے بلکہ انسانی اقدار کی کھلی توہین بلکہ اخلاقی دیوالیہ پن کی بھی عکاسی کرتا ہے۔ قیدی، جو پہلے ہی بے بسی کی علامت ہوتے ہیں، انہیں سیاسی کھیل کا مہرہ بنانا ظلم کی انتہا ہے۔ اس سے بڑھ کر انسانیت کی تضحیک اور کیا ہو سکتی ہے کہ بے بس افراد کو سیاسی کھیل کا مہرہ بنادیا جائے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سیاست اپنی اخلاقی بنیادیں کھودیتی ہے اور محض طاقت کے بے رحم کھیل میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

اس منصوبے کا مقصد ایک مصنوعی واقعہ تخلیق کر کے اس کا الزام پاکستان پر عائد کرنا ہے، تاکہ سرحدی کشیدگی کو ہوا دی جاسکے۔ ذرائع کے مطابق اس ممکنہ کارروائی کے بعد اس کا الزام پاکستان پر عائد کر کے جہاں سرحدی کشیدگی کو ہوا دینے کی کوشش ہوگی وہاں پاکستان میں جاری امن مذاکرات کو سبوتاژ کیا جاکے۔ یہ حربہ اس پرانے اصول پر مبنی ہے کہ ”پہلے جرم کرو، پھر شور مچاؤ“۔ یہ وہی پرانا حربہ ہے جس کے ذریعے جنگوں کو جواز فراہم کیا جاتا رہا ہے۔ ایسی حکمت عملی نہ صرف خطے کو جنگ کے دہانے پر لے جاتی ہے بلکہ عالمی امن کو بھی خطرے میں ڈال دیتی ہے۔ اس قسم کے اقدامات سے نہ صرف دو ممالک بلکہ پوری دنیا متاثر ہوتی ہے، کیونکہ جدید دنیا میں کسی بھی خطے کا عدم استحکام عالمی سطح پر اثر انداز ہوتا ہے یہ حکمت عملی تاریخ کے ان سیاہ ابواب کی یاد دلاتی ہے جہاں جنگ کے شعلے جھوٹ کی چنگاری سے بھڑکائے گئے۔

بھارت کا بنیادی مقصد پاکستان کی فوج کو مشرقی سرحد پر مصروف رکھنا بتایا جا رہا ہے، تاکہ اس کی توجہ تقسیم ہو جائے اور دیگر محاذوں پر اس کی توجہ کمزور کی جاسکے۔ یہ ایک کلاسیکی عسکری حکمت عملی ہے جس میں دشمن کو مختلف محاذوں پر لچھا کر اس کی قوت کو تقسیم کیا جاتا ہے۔ تاہم یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ ایسی حکمت عملی اکثر الٹا اثر بھی ڈالتی ہے اور خطے میں بڑے پیمانے پر تصادم کا سبب بن سکتی ہے۔ یہ اقدام اس بات کا غماز ہے کہ دشمن براہ راست مقابلے کی بجائے بالواسطہ مکروہ سازشوں کو ترجیح دے رہا ہے۔



جہاں تاریخ کے اوراق گواہ ہیں وہاں ماضی کے کئی واقعات اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ فاس فلک آپریشنز کی اس نوعیت کی کارروائیاں نئی نہیں۔ چھٹی سنگھ پورہ کا واقعہ، ممبئی حملے، پٹانکوٹ، اور کشمیر میں حالیہ دہشتگردی سیہ سب ایسے واقعات ہیں جن پر سوالیہ نشان ہمیشہ موجود رہا۔ حتیٰ کہ بین الاقوامی سطح پر بھی بھارت پر الزامات لگتے رہے ہیں، جن میں بیرون ملک سکھ رہنماؤں کے قتل کے واقعات شامل ہیں۔ کھل گپتا کے اعتراف نے بھی اس بحث کو تقویت دی ہے، اور اس بیانیے کو مضبوط کیا ہے کہ خفیہ کارروائیاں عالمی سیاست کا حصہ رہی ہیں جس نے عالمی سطح پر تشویش کو جنم دیا کہ خفیہ ایجنسیاں بعض اوقات اپنے سیاسی مقاصد کیلئے غیر روایتی طریقے اختیار کرتی ہیں۔ یہ تمام واقعات اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ عالمی سیاست میں اخلاقیات اکثر پس منظر میں چلی جاتی ہیں۔

حالیہ بیانات اور اقدامات نے خطے میں نئی صف بندیوں پیدا کر دی ہیں۔ طاقتور ممالک کے درمیان اتحاد اور مخالفت کے نئے زاویے سامنے آرہے ہیں، جس سے عالمی سیاست مزید پیچیدہ ہو گئی ہے۔ یہ صورت حال اس بات کی غماز ہے کہ دنیا ایک نئے جیو پولیٹیکل دور میں داخل ہو رہی ہے، جہاں پرانے اتحاد ٹوٹ رہے ہیں اور نئے تعلقات تشکیل پا رہے ہیں۔ عالمی طاقتیں اپنے مفادات کے تحت نئے اتحاد تشکیل دے رہی ہیں جس سے عالمی توازن متاثر ہو رہا ہے۔ بھارتی عسکری قیادت کی جانب سے ایران کے خلاف اسرائیل کی حمایت میں بیانات نے خطے میں کشیدگی کو نئی جہت دی ہے۔ یہ صورت حال اس امر کی غماز ہے کہ عالمی طاقتیں اپنے مفادات کیلئے علاقائی توازن کو داؤ پر لگا رہی ہیں۔

ایران اور فلسطینی قیادت کی جانب سے پاکستان کے کردار کو سراہنا اس بات کا ثبوت ہے کہ پاکستان ایک ذمہ دار قوت اور معاملہ فہم ریاست کے طور پر ابھر رہا ہے۔ ایران کی جانب سے "بلینک چیک" جیسا اظہار اعتماد سفارتی تاریخ میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ اعتماد محض الفاظ کا کھیل نہیں بلکہ ایک طویل سفارتی جدوجہد کا نتیجہ ہے، جس میں پاکستان نے مسلسل توازن اور اعتدال کی پالیسی اپنائی ہے اور یہ اعتماد سفارتی کامیابی کا اہم سنگ میل ہے۔

پاکستان میں امن مذاکرات کیلئے علاقائی ممالک کی شرکت ایک مثبت پیش رفت ہے۔ سعودی عرب، ترکی اور دیگر ممالک کی شمولیت اس بات کا اشارہ ہے کہ دنیا اب تصادم کی بجائے مکالمے کی طرف بڑھ رہی ہے جو امن و سلامتی کی طرف لیکر جاتا ہے۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو یہ خطے کیلئے ایک نئے دور کا آغاز ثابت ہو سکتا ہے۔

روس اور چین کی جانب سے پاکستان کے اقدامات کی حمایت عالمی سطح پر ایک اہم پیش رفت اور ایک اہم تبدیلی کا اشارہ ہے۔ یہ اس بات کی علامت اور ثبوت ہے کہ عالمی طاقتیں بھی اب یکطرفہ جبر، جارحیت اور ظلم کی پالیسیوں کے بجائے متوازن نقطہ نظر اور حکمت کو اہمیت دی جا رہی ہے۔ خود بھارت میں سیاسی جماعتوں کی جانب سے مودی حکومت کی خارجہ پالیسی پر تنقید اس بات کا ثبوت ہے کہ داخلی سطح پر شدید اختلافات موجود ہیں، جو اس کی عالمی

پوزیشن کو متاثر کر رہے ہیں اور مودی کی مکارانہ پالیسیوں کو قبولیت حاصل نہیں۔ اب تو عام عوام بھی مودی کے اس شرمناک کردار پر انگلیاں اٹھا رہے ہیں کہ ہندوستان کی کبھی ایسی سبکی نہیں ہوئی اور بالخصوص مودی نے ایران اور فلسطین کو دھوکہ دیکر یہ تمثیل "بغل میں چھری اور منہ میں رام رام" درست ثابت کر دی ہے۔

اطلاعات کے مطابق مودی افغانستان کے ذریعے پر کسی جنگ کو دوبارہ فعال کرنے کی کوشش کر رہا ہے، جو کہ اب اس خطے کیلئے نہایت خطرناک ہیں۔ یہ حکمت عملی ماضی میں بھی تباہ کن نتائج کا سبب بنی ہے، اور اگر دوبارہ دہرائی گئی تو اس کے اثرات مزید شدید ہو سکتے ہیں۔ ایران میں داخلی انتشار پیدا کر کے اسے شام جیسی صورت حال میں دھکیلنے کی کوششیں ناکام ہوئیں، اور ایران میں رجیم چینج کی کوششوں کا ناکام ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ داخلی استحکام اور عوامی حمایت کسی بھی بیرونی مداخلت کو ناکام بنا سکتی ہے۔ جس میں پاکستان کی حکمت عملی کا کردار نمایاں رہا۔

امریکی پالیسیوں میں تضادات عالمی سیاست کی پیچیدگی کو ظاہر کرتے ہیں۔ عالمی طاقتیں بھی اب غیر یقینی صورت حال کا شکار ہیں۔ ایک طرف مذاکرات کی بات کی جاتی ہے اور دوسری طرف دباؤ بڑھایا جاتا ہے۔ یہ دوہرا معیار عالمی اعتماد کو مجروح کرتا ہے۔ امریکی صدر کی جانب سے پاکستان کو دوبارہ استعمال کرنے کی کوششیں عالمی سیاست میں ان کی ناکامی کے اعتراف کو ظاہر کرتی ہیں، جبکہ ایران کی جانب سے انکار اس بات کا ثبوت ہے کہ اب ریاستیں زیادہ خود مختار فیصلے کر رہی ہیں۔

سعودی عرب اور دیگر عرب ممالک کے حوالے سے بیانات نے خطے میں بے چینی پیدا کی ہے۔ اور یہ تاثر مضبوط ہو رہا ہے کہ عالمی طاقتیں یکطرفہ مفادات پر مبنی ہیں اور اپنے مفادات کیلئے اسرائیل کو ترجیح دے رہی ہیں۔ یہ صورت حال اس بات کی عکاسی کرتی ہے کہ مشرق وسطیٰ ایک بار پھر بڑی تہدیلیوں کے دہانے پر کھڑا ہے۔

توانائی سپلائی لائنز کو متاثر کرنے کی کوششیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ تنازع صرف عسکری نہیں بلکہ معاشی جنگ بھی ہے۔ چین جیسے بڑے اقتصادی طاقت کو کمزور کرنا عالمی سیاست کا ایک اہم ہدف بن چکا ہے۔ ایران اور وینزویلا کے ذریعے چین کی توانائی سپلائی لائن کو متاثر کرنے کی کوششیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ تنازع محض علاقائی نہیں بلکہ عالمی معاشی جنگ کا حصہ ہے۔ یاد رہے کہ ٹرمپ کے حالیہ بیان کے بعد ایران کے توانائی وسائل اور افزودہ پورینیم پر کنٹرول حاصل کرنے کی کوششیں ایک بڑے تصادم کا پیش خیمہ بن سکتی ہیں یہ صورت حال نہ صرف خطے بلکہ پوری دنیا کیلئے خطرناک ہے ان تمام حالات کے تناظر میں دنیا کو تباہی سے بچانے کیلئے چند بنیادی اقدامات ناگزیر ہیں۔

عالمی سطح پر شفافیت کو فروغ دیا جائے۔

☆ مکالمے اور سفارت کاری کو ہر حال میں جنگ پر ترجیح دی جائے۔

☆ علاقائی تعاون کو فروغ اور اتحاد کو مضبوط بنایا جائے۔

☆ عالمی اداروں کو غیر جانبدار اور موثر بنایا جائے۔

☆ میڈیا کو ذمہ داری کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔

☆ انسانی حقوق کو ہر پالیسی کا مرکز بنایا جائے۔

☆ انسانی حقوق کو سیاسی مفادات پر فوقیت دی جائے۔

☆ میڈیا کو ذمہ دارانہ کردار ادا کرنے کا پابند بنایا جائے۔

دنیا کی تاریخ ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ طاقت کے کھیل ہمیشہ دیر پا نہیں ہوتے، مگر ان کے اثرات نسلوں تک باقی رہتے ہیں۔ یہ دنیا اگرچہ سازشوں، مفادات اور طاقت کی کشمکش میں الجھی ہوئی ہے، کشیدگی اور عدم اعتماد کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہے، مگر تاریخ ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ تاریکی کبھی دائمی نہیں ہوتی، ہر تاریکی کے بعد سویرا ضرور ہوتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ قومیں ہوش کے ناخن لیں، اور قیادتیں ذاتی مفادات سے بالا ہو کر انسانیت کے وسیع تر مفاد کو مقدم رکھیں۔ اگر قیادتیں بصیرت، دیانت اور انسانیت کو اپنا شعابنالیس ت بھی دنیا امن کا گوارہ بن سکتی ہے۔ یوں شاید یہ زمین، جو آج بارود کی بو سے بوجھل ہے، کل امن کے پھولوں سے مہک اٹھے۔ امید کی ایک کرن ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ یہی امید ہمیں یہ یقین دلاتی ہے کہ اور جو آج بھی انسانیت کے چراغ کو روشن رکھے ہوئے ہے۔ کہ کل کا سورج شاید آج کی دھند کو چیر کر ایک نئی روشنی لے کر طلوع ہو۔

پس، ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم محض واقعات کے تماشائی نہ بنیں بلکہ حقیقت کے متلاشی بن کر ایک بہتر اور پر امن دنیا کی تشکیل میں پن کر دار ادا کریں۔ کہ یہی تاریخ کا تقاضا ہے اور یہی انسانیت کا مقدر بھی۔

سوموار 18 شوال المکرم 1447ھ 6 اپریل 2026ء

پاکستان کا جو آ: ایک تیز طوفان میں ثالث

مشرق وسطیٰ ایک بار پھر تاریخ کے اس موڑ پر کھڑا ہے جہاں بارود کی بو، سفارت کاری کی سرگوشیوں کو دبا دینے کی کوشش کر رہی ہے۔ ایران اسرائیل کے حملوں کے بعد شروع ہونے والی یہ جنگ محض ایک علاقائی تنازع نہیں رہی بلکہ اس نے عالمی سیاست، معیشت اور طاقت کے پر امریکا اور توازن کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ ایک ماہ سے زائد عرصے پر محیط یہ کشیدگی اس حقیقت کو آشکار کر رہی ہے کہ اکیسویں صدی میں بھی طاقت کی زبان، دلیل اور مذاکرات پر غالب آنے کی کوشش کرتی ہے۔ مگر اس بار معاملہ کچھ مختلف ہے؛ اس بار میدان جنگ کے ساتھ ساتھ سفارتی محاذ بھی پوری شدت سے گرم ہے۔

یہ تنازع صرف میزائلوں اور بمباری تک محدود نہیں بلکہ اس کے پیچھے ایسے پیچیدہ سیاسی مقاصد اور حکمت عملیاں کار فرما ہیں جنہیں سمجھنا آسان نہیں۔ امریکا کی جانب سے ایک طرف مذاکرات کی پیشکش اور دوسری طرف جارحانہ کارروائیاں، ایک ایسی دوہری پالیسی کو ظاہر کرتی ہیں جسے ماہرین ”کیرٹ اینڈ اسٹک“ کا نام دیتے ہیں۔ اس حکمت عملی کے ذریعے واشنگٹن بیک وقت دباؤ اور ترغیب دونوں کا استعمال کر رہا ہے، لیکن اس کے حقیقی مقاصد آج بھی دھند میں لپٹے ہوئے ہیں۔

دوسری جانب ایران نے غیر معمولی صبر، حکمت اور مزاحمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہ صرف عسکری میدان میں بلکہ سفارتی سطح پر بھی اپنے مخالفین کو چیلنج کیا ہے۔ آبنائے ہر مزجیسے حساس جغرافیائی مقام پر اس کا اثر و رسوخ عالمی معیشت کیلئے ایک فیصلہ کن عنصر بن چکا ہے، جس کے اثرات دنیا بھر میں محسوس کیے جا رہے ہیں۔

اسی پیچیدہ اور نازک صورتحال میں پاکستان ایک ایسے کردار کے طور پر ابھرا ہے جس کی اہمیت غیر معمولی ہے۔ ایک طرف ایران کے ساتھ برادرانہ تعلقات، دوسری جانب امریکا اور خلیجی ممالک کے ساتھ سفارتی روابط۔ یہ توازن پاکستان کو ایک منفرد حیثیت دیتا ہے۔ اسلام آباد میں ہونے والی سفارتی سرگرمیاں اور مختلف ممالک کے وزرائے خارجہ کے درمیان مشاورت اس بات کا ثبوت ہیں کہ پاکستان صرف ایک تماشائی نہیں بلکہ ممکنہ طور پر امن کا ایک کلیدی معمار بن سکتا ہے۔

یہ مضمون اسی تناظر میں اس جنگ کے پس پردہ عوامل، امریکا کے مبہم اہداف، ایران کی حکمت عملی اور سب سے بڑھ کر پاکستان کے ثالثی کردار کا تفصیلی جائزہ لے گا۔ ساتھ ہی یہ بھی جاننے کی کوشش کی جائے گی کہ کیا واقعی سفارت کاری اس آگ کو بجھا سکتی ہے یا دنیا ایک طویل اور تباہ کن تصادم کی طرف بڑھ رہی ہے۔

ایران پر امریکا اور اسرائیل کے حملوں کے بعد مشرق وسطیٰ میں شروع ہونے والی جنگ کو ایک ماہ سے زیادہ ہو گیا ہے۔ پچھلے کچھ عرصے میں ترکی مصر اور سعودی عرب کے ساتھ ساتھ پاکستان خطے میں امن کے قیام کیلئے کام کرنے والے ممالک میں نمایاں طور پر سامنے آیا ہے، پاکستان کے وزیر خارجہ نے کہا ہے کہ ایران اور امریکا دونوں نے سہولت کار کے طور پر پاکستان پر اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ ٹرمپ نے کئی بار پاکستان کے مثبت کردار کے بارے میں بات کی ہے۔

اسی دوران ایک اہم پیش رفت نے اس تنازع کو ایک نئے سفارتی موڑ پر لاکھڑا کیا ہے۔ ٹرمپ نے اعلان کیا ہے کہ وہ پاکستان کے وزیراعظم شہباز شریف اور آرمی چیف فیلڈ مارشل عاصم منیر کی درخواست پر ایران کے خلاف طے شدہ فوجی حملے کو دو ہفتوں کیلئے مؤخر کرنے پر آمادہ ہیں، بشرطیکہ ایران آبنائے ہرمز کو فوری، مکمل اور محفوظ انداز میں کھول دے۔ اس کے ساتھ ہی ایران کی جانب سے یہ تصدیق بھی سامنے آئی ہے کہ امریکہ کے ساتھ دس نکاتی ایجنڈے پر مذاکراتی عمل اسلام آباد میں جیسے سے شروع ہو گا۔ یہ پیش رفت نہ صرف پاکستان کی سفارتی اہمیت کو اجاگر کرتی ہے بلکہ یہ بھی ظاہر کرتی ہے کہ جنگ کے عین بیچ میں بھی مذاکرات کی کھڑکی مکمل طور پر بند نہیں ہوئی۔ تاہم اسرائیل کی جانب سے یہ واضح کیا گیا ہے کہ اس جنگ کا اطلاق لبنان تک نہیں پھیلا یا جائے گا، جو اس خطے میں ممکنہ پھیلاؤ کو محدود کرنے کی ایک کوشش سمجھی جا رہی ہے۔

حال ہی میں انہوں نے یہ بھی کہا کہ امریکا ایران کی نئی حکومت کے ساتھ سنجیدہ مذاکرات کر رہا ہے جن سے ایران میں امریکا کی فوجی کارروائی ختم ہو سکتی ہے لیکن ساتھ ہی اسی شدت سے ایران پر حملے اور دھمکیاں بھی جاری ہیں۔ دوسری طرف ایران کی وزارت خارجہ کے ایک ترجمان نے کہا ہے کہ جنگ ختم کرنے کیلئے امریکا کی طرف سے بھیجے گئے نکات اور شرائط ضرورت سے زیادہ غیر معقول ہیں۔ ایران کے وزیر خارجہ عباس عراقچی کئی بار کہہ چکے ہیں کہ امریکا کے ساتھ کوئی بھی براہ راست مذاکرات نہیں کر رہا۔

اس پس منظر میں آج ایران اور امریکا کی جنگ میں بطور سہولت کار پاکستان کے کردار کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ دو سوالوں کا جواب دینے کی کوشش بھی کریں گے کہ امریکا اور ایران کے درمیان ثالث کیس کردار سے پاکستان کو کیا فائدہ ہو سکتا ہے، اور امریکا ایک ہی وقت میں ایک طرف فوجی جارحیت اور دوسری طرف سفارت کاری کی پالیسی سے کیا حاصل کرنا چاہتا ہے۔

اس جنگ سے امریکا حاصل کیا کرنا چاہتا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب ایک ماہ بعد بھی واضح نہیں اور اس کی ایک وجہ شاید خود ٹرمپ کے مختلف بیانات بھی ہیں۔ وہ کبھی ایران کو تباہ کرنے، ایران کے خارج جزیرے پر وجود تیل پر کنٹرول حاصل کرنے، پانی اور بجلی کے انفراسٹرکچر کو تباہ کرنے کی باتیں کرتے ہیں تو کبھی ایران کی نئی قیادت کی تعریف بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ ایک طرف مطالبہ کرتے ہیں کہ ایران آبنائے ہرمز کو ٹینکرز کیلئے کھول دے تو دوسری طرف دیگر ممالک سے کہتے ہیں کہ وہ خود جاکر آبنائے ہرمز کا کنٹرول سنبھالیں اور اسے استعمال کریں۔ ایران سے مذاکرات کی باتیں بھی کرتے ہیں اور ایران کو بمباری کر کے پتھر کے دور میں پہنچانے کی بھی۔

ماہرین کہتے ہیں کہ یہ دراصل ایران کی طرف امریکا کی کیرٹ اینڈ سنک پالیسی کا حصہ ہے یعنی ایک طرف آپ سامنے والے کو لبھانے کیلئے کچھ پیشکش کریں، ایک کیرٹ یا گاجر اور دوسری طرف اسے ڈرانے کیلئے کچھ دکھائیں، سنک یعنی چھڑی۔ اس وقت گاجر مذاکرات کی پیشکش، ایران کے بجلی اور تیل کی تنصیبات پر ملہ نہ کرنا ہے تو چھڑی مکمل تباہی کی دھمکی ہے۔

ٹرمپ کے اس طرح کے بیانات سے اب عالمی طور پر اعتبار اٹھ گیا ہے۔ جو ابھی تک کی صورت حال ہے اس میں ایران کا جو رد عمل بڑا مضبوط، دانشمندانہ ہے، بڑی حکمت عملی کے تحت ایرانی اپنے قدم بڑھا رہے ہیں۔ ان کے درمیان جو پیغام رسانی ہے، اس کے مطابق پانچویں ہفتے میں داخل ہونے والی اس جنگ میں امریکا کیلئے مشکلات اور مسائل بڑھنا شروع ہو گئے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ امریکا کی مقاصد کو دیکھا جائے تو اس وقت صورتحال اتنی

پیچیدہ نظر دیتی ہے، کوئی نہیں جانتا کہ امریکا کے مقاصد کیا ہیں؟ یہ بھی واضح نہیں، کیا وہ اس وقت جنگ کو بند کرنا چاہتا ہے، وہ آبنائے ہر مز کو کھولنا چاہتا ہے، وہ ایران کو غیر مسلح کرنا چاہتا ہے، دنیا جانتا چاہتی ہے کہ آخر امریکا چاہتا کیا ہے؟؟؟

جس وقت جب یہ تنازع شروع ہوا تو اس وقت سامنے تین مقاصد تھے: ایک تو یہ تھا کہ موجودہ ایرانی ریجیم چینج کی جائے اور وہاں ایک ایسی حکومت لائی جائے جو ان کے مقاصد کے عین مطابق ہو جیسا کہ وینزویلا میں انہوں نے کیا دوسرا یہ تھا کہ ایران کی ایٹمی صلاحیت کو ختم کیا جائے یا اس سطح پر لایا جائے کہ وہ اسے جنگی مقاصد کیلئے استعمال نہ کر سکیں۔ اور تیسرا یہ تھا کہ ان کا جو ملٹری انفراسٹرکچر ہے اس کو اتنا محدود کر دیا جائے کہ وہ علاقے کیلئے خطرہ نہ بن سکے۔ اس میں بہت زیادہ طاقت نہ رہے۔

لیکن جیسے جیسے یہ سلسلہ آگے بڑھتا گیا، ہستہ ہستہ یہ چیزیں نظر آنا شروع ہوئی، ایران کی طرف سے جتنی مزاحمت ہوئی اور ابھی تک ہو رہی ہے تو ان مقاصد کے اندر انہوں نے بڑے ایک سٹریٹیجک طریقے سے وہ امریکا کے مقاصد کو کاؤنٹر کرنا شروع کیا۔ جس میں سب سے پہلے تو اس تنازعہ کو ریجن کے اندر اس خوف کے ساتھ پھیلا دیا گیا کہ اگر آپ کی زمین، ایئر سپیس یا آپ کے کوئی بھی وسائل ایران کے خلاف استعمال ہوئے تو آپ کے اوپر اسی شدت سے حملہ ہو گا، دوسرا اس تنازعہ کو ریجن سے باہر نکال کر گلوبل لیول پر لے آئیں ہیں، جس میں آبنائے ہر مز کا پورا کنٹرول ایران کے حق میں چلا جائے۔ اب تک ایران اپنے ان دونوں مقاصد کو حاصل کر چکا ہے اور ساری دنیا پر اس جنگ کے اثرات نمایاں ہونے شروع ہو گئے ہیں اور "گلوبل سپلائر چین" شدید متاثر ہو رہی ہے۔

یہاں پھر ایک سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ اس سب میں پاکستان کہاں فٹ ہوتا ہے؟ پاکستان نے ایک طرح سے جنگ کے پہلے دن سے اپنی پوزیشن واضح رکھی، مشکل لیکن واضح، ایران کا دوست، امریکا کا اتحادی اور ان تمام ممالک کا بھی دوست جو ایران کے جوابی حملوں کی زد میں آئے ہیں۔ ظاہر ہے اس پوزیشن کو برقرار رکھنا آسان نہیں ہے لیکن فی الحال ایسا لگتا ہے کہ پاکستان اس مشکل راستے کو کافی کامیابی سے نمٹ رہا ہے۔ امریکا اسرائیل اور ایران کے درمیان جنگ جاری ہے، دونوں طرف سے حملے ر کے نہیں ہیں لیکن اچانک سفارتی سرگرمیوں میں بھی تیزی آتی نظر آرہی ہے۔ پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد میں ترکی سعودی عرب مصر اور پاکستان کے وزرائے خارجہ کے درمیان جنگ بندی کیلئے دوروزہ مشاورتی صلاح مشورہ ہوا، ان ملاقاتوں کو جنگ شروع ہونے کے بعد امریکا اور ایران کو براہ راست مذاکرات تک پہنچانے کیلئے سب سے منظم علاقائی کوشش قرار دیا جا رہا ہے۔

اس ملاقات سے چند گھنٹے پہلے پاکستان کے وزیراعظم شہباز شریف نے ایرانی صدر مسعود پڑشکیان کے ساتھ فون پر بات کی، ایک اور اہم بات یہ بھی ہے کہ پاکستان نے پچھلے سال ستمبر میں سعودی عرب کے ساتھ ایک دفاعی معاہدے پر دستخط کیے۔ ماہرین کے مطابق اس کے تحت سعودی عرب اور پاکستان کے درمیان فوجی تعاون تو مزید گہرا ہوا ہی ہے، ساتھ ساتھ خطے میں طاقت کے توازن پر بھی اس کا اثر پڑ سکتا ہے۔ اس معاہدے کی بنیادی شق یہ ہے کہ دونوں میں سے کسی بھی ایک ملک پر حملے کو دونوں ممالک پر حملہ تصور کیا جائے گا۔

ایران پاکستان کا ہمسایہ ملک ہے، دونوں کے درمیان 900 کلومیٹر لمبی سرحد ہے اور پاکستان ایران کو اپنا براہ راست ملک کہتا ہے۔ پھر پاکستان میں کوئی امریکی اڈے بھی نہیں اور ان خلیجی ممالک کے برعکس جو اب تک ثالث کا کردار ادا کرتے آئے ہیں۔ پاکستان فی الحال جنگ کا حصہ نہیں ہے اور شاید سب سے اہم بات کہ پاکستان امریکا اور ایران کے درمیان کردار ادا کرنے کیلئے تیار ہے تو موجودہ صورتحال میں پاکستان کا کردار کتنا اہم ہے اور وہ کس حد تک ڈی



ایسکلیشن یا جنگ کے خاتمے کو حاصل کر سکتا ہے؟

تاہم اگر علاقائی سلامتی اور دفاع کی بات کریں جیسا کہ ابھی گلوبلائزیشن میں جو ملٹی پولیرٹی کی طرف منتقلی ہو رہی ہے، اس میں ریجن کا استحکام بہت ضروری ہے۔ پاکستان اپنے ریجن کا ایک ایسا ملک ہے جس کو اس چیز کا ادراک ہے، اگرچہ اس کے مشرق اور شمال میں مسلسل حالات خراب کرنے کی کوششیں بھی جاری ہیں لیکن پھر بھی وہ اپنے طور پر کوشش کر رہا ہے کہ تمام ممالک کو ساتھ لے کر چلے اور اس

ریجن میں جنگ کے شعلوں کو بجھا سکے۔ اب اگر یہ جنگ طویل ہوتی ہے اور سعودی عرب اس میں براہ راست شامل ہو جاتا ہے تو پاکستان کیا کرے گا؟ جبکہ پاکستان اور سعودی عرب کے درمیان ایک دفاعی معاہدہ بھی ہے۔ میرے خیال میں اس سوال کو تھوڑا سا اگر اس طریقے سے دیکھ لیں کہ اگر سعودی عرب ابھی تک اس تنازعہ میں کیوں نہیں آیا تو وہیں سے جواب مل جائے گا۔ تاہم یہ امن مذاکرات جو اس وقت ہو رہے ہیں اور پاکستان اس میں بہت ہی نمایاں کردار ادا کر رہا ہے، آخر پاکستان کو اس کا کیا فائدہ ہے؟

تو اس کو جواب یہ ہے کہ پاکستان کیلئے تو معاشی، سفارتی اور عسکری، ان تمام چیزوں کو اگر آپ دیکھیں تو پاکستان کیلئے یہ بہت بڑا مسئلہ ہو گا، اگر یہ تنازعہ آگے بڑھتا ہے۔ اس جنگ کو روکنے میں ہی پاکستان کا فائدہ ہے۔ یہ بات واضح ہے جنگ کی وجہ سے پاکستان میں ایک طرف تیل کی قیمتوں میں اضافہ اور بڑھتی ہوئی مہنگائی دوسری طرف یہ خدشہ کہ اگر جنگ بڑھتی گئی اور اگر اس میں سعودی عرب براہ راست شامل ہو گیا تو پاک سعودی دفاعی معاہدے کے پیش نظر پاکستان کا موقف کیا ہو گا؟ اور پھر پاکستانی عوامی رائے جو اس جنگ کے امریکا اور اسرائیلی کاروائی کے شدید خلاف ہے، اس سب کے ساتھ ساتھ عالمی سطح پر پاکستانی ساکھ کا سوال بھی ہے۔ اگر پاکستان کی کوششیں کامیاب ہو جاتی ہیں تو عالمی سفارت کاری کی دنیا میں یہ بہت بڑی فتح ہوگی۔

اسی دوران چین نے بھی پاکستان کی ثالثی کیلئے حمایت کا اظہار کیا ہے۔ پاکستانی وزیر خارجہ اسحاق ڈار کے چین کے دورے کو بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔ پاکستان گزشتہ کچھ عرصے سے کوشش کر رہا ہے کہ وہ ایران اور امریکا کو بات چیت کیلئے راضی کرے اور اسلام آباد میں دونوں کو براہ راست مذاکرات کی میز پر لانے کیلئے اپنے ہاں میزبانی کرے۔ ابھی تک ایسا ہو نہیں پایا لیکن پاکستان اس میں ضرور کامیاب ہوا ہے کہ اس نے ملٹی لیٹرل قسم کا پلیٹ فارم بنانے کی کوشش کی ہے جس میں اس نے پہلے تین مسلم ممالک سعودی عرب، مصر اور ترکی کے وزرائے خارجہ کو اسلام آباد میں مدعو کیا، اس کے بعد پاکستان کے وزیر خارجہ فوراً ہی چین بھی چلے گئے جہاں سے پاکستان کے اس مصالحتی میزبانی کی مکمل حمایت حاصل کی، جس میں چین نے پاکستان کے ساتھ مل کر اس جنگ کو روکنے کی کوششوں کیلئے ایک پانچ نکاتی اعلامیہ جاری کیا۔

اس کے بعد پاکستان کی حکومت کے اوپر کافی نظریں ہیں کہ پہلے تو وہ ایک متوقع ثالث کے طور پر سامنے آیا، لوگ توقع نہیں کر رہے تھے کہ پاکستان ایسا کردار ادا کر سکتا ہے یا کرے گا لیکن اب وہ سامنے آگیا ہے تو کافی نظریں اس کے اوپر ہیں کہ کیا وہ واقعی ایران کو راضی کر پائے گا کہ وہ امریکا سے بات چیت کر لے۔ تو بہت سے ماہرین کا ماننا ہے کہ یہ بہت مشکل ہو گا کیونکہ ایران اور امریکا کے درمیان اعتماد کا فقدان ختم کرنا کسی ایک ملک کیلئے ممکن نہیں

ہو گا کہ وہ اکیلے اس کو کوئی گارنٹی فراہم کر سکے لیکن اگر ایک ملٹی لٹرل قسم کا پلیٹ فارم ہوتا ہے تو شاید اس میں کامیابی کے مواقع زیادہ ہوں گے اور اگر چین کی مرضی اور منظوری بھی اس میں شامل ہو جاتی ہے تو ایران کے اوپر چین کیونکہ ایک انفو لنس رکھتا ہے، سوچ میں کامیابی کے مواقع زیادہ بڑھ جاتے ہیں لیکن اب ساری نظریں پاکستان پر ہیں کہ کیا وہ واقعی ہی ان فریقین کو بات چیت پر راضی کر سکتا ہے اور چین کی مدد سے کیا وہ ضمانت فراہم کر سکتا ہے جو ایران کو چاہیے جس کے بعد کہ اسے کامیابی ہوگی اور وہ دونوں کو اسلام آباد میں ایک میز پر جنگ بندی کیلئے مذاکرات کروانے میں کامیاب ہو جائے گا۔

چین ایرانی تیل کا سب سے بڑا اپورٹر ہے اور ایران پر اقتصادی پابندیوں کے باوجود کسی نہ کسی طرح ایران کا تیل خریدتا رہا ہے۔ چینی وزارت خارجہ کی طرف سے جاری کیے گئے ایک بیان میں کہا گیا ہے کہ ایران اور خلیجی ریاستوں کی خود مختاری، علاقائی سالمیت، قومی آزادی اور سلامتی کا تحفظ کیا جانا چاہیے۔ تنازعات کے حل کیلئے مذاکرات اور سفارت کاری ہی واحد قابل عمل اپشن ہے۔ اپ کو پتہ ہے بیجنگ اور تہران نے 2021 میں 25 سالہ سٹریٹیجک معاہدے پر دستخط کیے تھے جو کئی غیر ملکی مبصرین کے مطابق امریکا کیلئے ایک وارنگ تھا، اس معاہدے میں دفاعی ساز و سامان میں استعمال ہونے والی ٹیکنالوجی کی فروخت سے لے کر کلچرل اسپیجینجز تک شامل تھے۔ بین الاقوامی پابندیوں کی شکار ایرانی معیشت کیلئے چین ایک لائف لائن سمجھا جاتا ہے۔ 2025 میں چین نے ایران سے بھیجے گئے تیل کا 80 فیصد سے زیادہ حصہ خرید اور وہ بھی بہت زیادہ رعایتی داموں پر۔ یو ایس چائنا کنٹراکٹ اینڈ سیکیورٹی ریویو کمیشن کے مطابق چین نے 2025 میں ایران کے ساتھ 9.96 بلین ڈالر کی بائیلیٹرل یا دو طرفہ تجارت کی، ان اعداد و شمار میں 2025 میں چین کو غیر رپورٹ شدہ ایرانی خام تیل کی برآمدات میں تقریباً 31 بلین ڈالر شامل نہیں ہیں جو کہ اگر شامل کیے جائیں تو مجموعی دو طرفہ تجارت کا 75 فیصد سے زیادہ حصہ ہے۔ ان اعداد و شمار سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ چین کیلئے ایران میں جنگ بندی ضروری اور اہم کیوں ہے۔

اس وقت جو صورتحال ہے اس میں کوئی سفارتی حل مشکل ضرور نظر آتا ہے لیکن شاید ناممکن نہیں۔ ایران کی مذاکرات کی لمبی تاریخ ہے۔ انسائڈ 28 فروری کے امریکا اور اسرائیلی حملوں سے پہلے جو مذاکرات جاری تھے ان کے بارے میں کئی سفارتی اہلکار کہہ چکے ہیں کہ ایران بہت اگے تک جانے کو تیار تھا، تو کیا اب یہ سفارت کاری کیلئے کوئی جگہ باقی ہے یا پھر یہ جنگ فی الحال ایسکیٹ ہی ہوتی رہے گی؟

دونوں اطراف کو شش کر رہی ہیں کہ سفارتی ذرائع سے جنگ ختم ہو جائے لیکن دونوں سائڈز فی الحال اپنے اپنے اینڈز پر یہ کوشش بھی کر رہے ہیں کہ وہ زیادہ سے زیادہ فوائد سمیٹ سکیں، مثلاً جو ایرانیز ہیں ان کی کوشش یہ ہے کہ بس اس دفعہ جنگ ختم ہوتی ہے تو کسی طریقے کی گارنٹی بھی دی جائے کہ یہ جنگ دوبارہ نہیں ہوگی اور امریکا کی کوشش ہے کہ وہ جب جنگ ختم کریں تو اس طرح کی صورت حال ہو کہ وہ دنیا کو بتا سکیں کہ انہوں نے جنگ جیت لی ہے۔ لیکن موجودہ صورتحال دیکھیں تو امریکا اور ایران کی جو پوزیشنز ہیں وہ اتنی ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور اتنی ناقابل بھروسہ ہیں، مصالحتی ٹیم میں شامل ممالک سوچ رہے ہیں کہ سفارت کاری اور ڈپلومیسی کی شروعات کہاں سے ہوگی؟

اس مشکل مرحلے کا آغاز یقیناً فریقین کے اس یقین سے ہو گا کہ وہ واقعی جنگ ختم کرنا چاہتی ہیں اور دوسرا مرحلہ پر جہاں امریکا اور ایران شاید اتفاق کرتے ہیں کہ ایران کافی عرصے سے کہہ رہا ہے کہ وہ جوہری ہتھیار نہیں بنانا چاہتے اور سب سے بڑا امریکا کا بھی سٹریٹیجک گول اس جنگ کے اندر یہی تھا کہ ایران نیوکلیر پاور نہ بنے۔ جو اختلافی نکات ہیں وہ تھوڑے ہیں لیکن وہ ایک مسئلہ تو ہوں گے لیکن اگر بات شروع ہوگی تو وہ شاید سب سے پہلے

نیو کلیئر سے ہوگی۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی اہم ہے کہ یہ مذاکرات کی جو بات ہو رہی ہے، جو ڈپلومیسی کا ٹریک چل رہا ہے اس میں چین کا کیا کردار ہے، چین کتنا اہم ہے؟

جنگ کے اندر جو تین چار مختلف کھلاڑی ہیں جیسے کہ عرب ریاستیں ہیں، ایران ہے، امریکا اور اسرائیل ہے تو چین کا کچھ پلیئر زپہ تو انفلوئنس ہے لیکن کچھ پلیئر زپہ چین کا اس طرح انفلوئنس نہیں ہے کہ چین بطور ضامن کوئی رول ادا کر سکے البتہ چین کے آنے کا یہ فائدہ ہو سکتا ہے کہ چین کا ایران پہ کافی زیادہ انفلوئنس ہے تو اگر چاہئے اس پر اس کے اندر اتنا ہے تو شاید ایران کیلئے اس پر اس کی کریڈٹ بیلٹی بڑھ جائے۔ اور جہاں تک پاکستان کے کردار کا سوال ہے، پاکستان کی جس طرح سے ایک نمایاں سفارتی کوششیں ہیں اور اس وجہ سے پاکستان عالمی طور پر توجہ کا مرکز بھی بنا ہوا ہے اور نمایاں طور پر سامنے بھی آیا ہے، چین کو واقعی ایسا لگتا ہے کہ پاکستان ان مذاکرات کو شاید کامیاب بنانے میں کردار ادا کر سکتا ہے۔

چین یہ سمجھتا ہے کہ پاکستان کے عرب ممالک، ایران کے ساتھ اب امریکا کے ساتھ کافی بہتر تعلقات ہی، اور پھر دیکھنا یہ ہے کہ پاکستان اس جنگ سے براہ راست متاثر بھی ہو رہا ہے۔ پاکستان ایران کا ہمسایہ ہے، اگر حالات زیادہ خراب ہوتے ہیں، تو ایران کے ساتھ پاکستان پر بھی ایک اپیکٹ ائے گا تو ان حالات میں پاکستان پر اس جنگ کے مہلک اثرات پڑ سکتے ہیں۔ اس وقت امریکا کی یہ جنگ بہت ہی نازک موڑ پر ہے۔ اگر سفارت کاری ناکام ہو جاتی ہے تو ٹرمپ کے پاس بہت زیادہ آپشنز نہیں بچیں گے ایک آپشن یہ ہے کہ ٹرمپ یہ کہہ کر فتح کا اعلان کر دیں گے کہ انہوں نے ایران کی فوج کو مکمل طور پر تباہ کر دیا ہے اور آبنائے ہرمز کو کھلوانا ان کی ذمہ داری نہیں۔ اس سے عالمی معیشت پر جس طرح کے اثرات پڑ سکتے ہیں، اس کا اندازہ پچھلے تین چار ہفتوں میں ہی ہو گیا ہے یا پھر ٹرمپ اس جنگ میں مزید توسیع کر دیں کیونکہ اب تک ٹرمپ نے اپنے رویے سے ثابت کر دیا ہے کہ وہ کبھی بھی اپنے بیانات سے منحرف ہو کر دنیا کی تباہی کے فیصلے کر سکتے ہیں۔

اس وقت 4 ہزار سے زیادہ امریکی میرینز بحری جہازوں پر خلیج فارس کی طرف بڑھ رہے ہیں، اے جی سیکنڈ ایریون کے پیرک ٹروپس سٹینڈ بائی پر ہیں اور مزید ری انفورسمنٹس کی بات بھی ہو رہی ہے۔ ایک فل سکیل انویژن یا بھرپور زمینی حملہ میں یہ ممکن ہے کہ امریکا خلیج فارس میں خارق سمیت کچھ جزیروں کو قبضے میں لینے کی کوشش کریں۔ یہ آپشن بھی امریکا کیلئے مشکل ثابت ہو سکتا ہے۔ ایران پہلے ہی کہہ چکا ہے کہ وہ ایک لمبی جنگ کیلئے تیار ہے۔ ماہرین یہاں تک کہتے ہیں کہ ایک لمبی جنگ کیلئے ایران شاید امریکا سے زیادہ تیار ہے اور ایران نے گزشتہ ہفتے اسے دہرایا بھی ہے تو اس وقت امریکا کیلئے زمینی جنگ کتنا حقیقی آپشن ہو گا اور کیا امریکا ایسا کر سکتا ہے؟

تو اس سلسلے میں اگر تو ہم افغانستان یا عراق والے تناظر میں سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں تو اس طرح کا کچھ نہیں ہو گا۔ ہاں البتہ اس بات کا قوی امکان ہے کہ امریکا کچھ چھوٹا آپریشن کر سکتا ہے اور یہ معاملہ بھی تینب ممکن ہو گا جب امریکا سٹریٹیجکلی کسی بندگلی میں داخل ہو جائے گا جہاں اس کے پاس انخلاء کا یا وہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ ہو۔ میرے خیال میں اس طریقے سے دیکھنا زیادہ مناسب ہو گا کہ اس طرح کی ایک ایڈ ونچر کرنا کے مقاصد کیا ہیں۔ ممکن تو ہو سکتا ہے لیکن اس سے منسلک جو خطرات ہیں وہ بہت زیادہ ہیں۔

ایران کے اس دعوے کے باوجود کہ اس وقت امریکا کے ساتھ کوئی بھی مذاکرات نہیں ہو رہے، اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دونوں ممالک کے درمیان خاص طور پر پاکستان کے ذریعے رابطے ضرور ہو رہے ہیں۔ امریکا نے اپنی شرائط سامنے رکھی ہیں تو ایران نے اپنی۔ ماہرین کہتے ہیں کہ

امریکا کا لیکڈ 15 نکاتی پلان امن کا منصوبہ کم اور ایران کیلئے ہتھیار ڈالنے کا منصوبہ زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ اسی طرح ایران کے مطالبات جن میں آبنائے ہرمز پر ایرانی کنٹرول، جنگ کے نقصانات کی تلافی اور مشرق وسطیٰ سے امریکا ڈوں کا خاتمہ شامل ہے، جو امریکا کو منظور نہیں ہو گا۔

یہ واضح ہے کہ اگر یہ جنگ لمبی کھینچتی ہے تو اس کے خطے پر پاکستان پر اور پوری دنیا پر تباہ کن اثرات مرتب ہوں گے۔ مضمون کے آغاز میں دو سوال سامنے رکھے تھے کہ امریکا اور ایران کے درمیان ثالث کیس کردار سے پاکستان کو کیا فائدہ ہو سکتا ہے اور امریکا ایک ہی وقت میں ایک طرف فوجی توسیع اور دوسری طرف سفارت کاری کی پالیسی سے کیا حاصل کرنا چاہتا ہے؟؟

جہاں تک پاکستان کا سوال ہے تو آپ اس معاملے کو چاہے پاکستانی معیشت، عوامی رائے عامہ یا عالمی سفارت کاری کے زاویے سے دیکھیں، پاکستان کو اس جنگ کی جاری رہنے سے جتنا نقصان ہو رہا ہے، اس کے خاتمے میں سے اسے اتنا ہی فائدہ ہو گا۔ امریکا کے اہداف اور مقاصد اب بھی غیر واضح ہیں لیکن یہ بات واضح ہے کہ ایران پر اسرائیل اور امریکا کی جنگ نے بہت کچھ بدل دیا ہے۔ جہاں ریجیم چینج کی کھلم کھلا باتیں ہوئیں وہیں خطے میں نئے اتحاد کی طرف اشارے بھی ہونے لگے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا اس مرتبہ پاکستان کی ثالثی کی کوششیں کامیاب ہوتی ہیں یا پھر تاریخ اس امریکا جنگ کو عالمی سیاست میں ایک اہم ٹرننگ پوائنٹ کے طور پر یاد کرے گی۔

یاد رکھیں! جنگیں صرف میدانوں میں نہیں لڑی جاتیں، وہ قوموں کی تقدیروں، معیشتوں اور آنے والی نسلوں کے مستقبل پر بھی گہرے نقوش چھوڑتی ہیں۔ ایران اور امریکا کے درمیان جاری یہ کشمکش بھی محض دوریاستوں کا تصادم نہیں بلکہ ایک وسیع تر عالمی طاقت کے کھیل کا حصہ ہے، جس میں ہر قدم کے دور رس نتائج نکل سکتے ہیں۔ ایک ماہ سے زائد عرصہ گزرنے کے باوجود نہ تو امریکا کے مقاصد پوری طرح واضح ہو سکے ہیں اور نہ ہی یہ جنگ کسی منطقی انجام کی طرف بڑھتی دکھائی دیتی ہے۔

تاہم اس تمام تر غیر یقینی صورتحال میں ایک حقیقت نمایاں ہو کر سامنے آئی ہے: طاقت کے باوجود کوئی بھی فریق مکمل برتری حاصل نہیں کر سکا۔ ایران کی مزاحمت اور امریکا کی دہری حکمت عملی نے اس تنازع کو ایک پیچیدہ ہندگی میں لا کھڑا کیا ہے جہاں سے نکلنے کا راستہ صرف اور صرف سفارت کاری کے ذریعے ہی ممکن نظر آتا ہے۔

یہیں پر پاکستان کا کردار غیر معمولی اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب دنیا کے بڑے کھلاڑی اپنے اپنے مفادات کے جال میں الجھے ہوئے ہیں، پاکستان نے ایک متوازن اور ذمہ دارانہ پالیسی اپناتے ہوئے خود کو ایک ممکنہ ثالث کے طور پر پیش کیا ہے۔ اگرچہ یہ راستہ آسان نہیں — اعتماد کی کمی، متضاد مفادات اور شدید جذباتی ماحول اس عمل کو مزید مشکل بناتے ہیں — لیکن اس کے باوجود پاکستان کی کوششیں ایک امید کی کرن ضرور ہیں۔

پاکستان کیلئے بھی یہ محض سفارتی کامیابی کا معاملہ نہیں بلکہ اس کی اپنی سلامتی، معیشت اور علاقائی استحکام کا سوال ہے۔ بڑھتی ہوئی تیل کی قیمتیں، ممکنہ علاقائی جنگ اور داخلی دباؤ — یہ سب عوامل اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اس تنازع کا خاتمہ پاکستان کے مفاد میں ہے۔ اگر وہ اس نازک مرحلے پر کامیاب ثالثی کر لیتا ہے تو یہ نہ صرف اس کی عالمی حیثیت کو مضبوط کرے گا بلکہ ایک نئی سفارتی تاریخ بھی رقم کرے گا۔

آخر کار سوال یہی باقی رہتا ہے: کیا دنیا طاقت کے بجائے مکالمے کو ترجیح دے گی؟ کیا امریکا اور ایران اپنے اختلافات کو مذاکرات کی میز پر حل کرنے پر آمادہ ہوں گے؟ اور کیا پاکستان واقعی اس تاریخی موقع کو ایک پائیدار امن میں بدلنے میں کامیاب ہو سکے گا؟

تاریخ کے اوراق اس وقت پلٹ رہے ہیں — اور آنے والے دن یہ طے کریں گے کہ یہ جنگ ایک اور تباہ کن باب ثابت ہوگی یا امن کی جانب ایک فیصلہ کن موڑ، تاہم "آج سے پندرہ سال قبل میں نے صوفی برکت صاحب کی اس پیشگوئی کا اپنے کالم میں جب تذکرہ کیا تو بہت مذاق اڑایا گیا تھا کہ "آئندہ دنیا کے اہم فیصلے پاکستان کے مشوروں سے طے ہوں گے"، آج رب العزت نے پاکستان کو وہ مقام عطا فرمایا ہے اور وقت نے ان ناقدین کو غلط ثابت کر کے راہِ راست پر آنے کی تلقین تو کی ہے، اگر وہ اب بھی تائب ہو جائیں۔ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

جمعۃ المبارک 22 شوال المکرم 1447ھ 10 اپریل 2026ء

جنگ کے سائے میں امن کی تلاش

زمانہ اپنی کروٹیں بدل رہا ہے اور تاریخ کے اوراق پر ایک نئی تحریر رقم ہونے کو ہے۔ مشرق وسطیٰ کی سرزمین، جو صدیوں سے تہذیبوں کے عروج و زوال کی گواہ رہی ہے، ایک بار پھر عالمی طاقتوں کی کشمکش کا میدان بنی ہوئی ہے۔ زمانہ اپنی کروٹیں بدل رہا ہے، اور تاریخ اپنے سینے میں ایک نئی کہانی کو جنم دینے کیلئے بے چین دکھائی دیتی ہے۔ مشرق وسطیٰ کی وہ سرزمین، جہاں کبھی تہذیبوں کے چراغ روشن ہوئے اور جہاں سے علم و حکمت کے قافلے روانہ ہوئے، آج پھر بارود اور خون کی مہک سے آلودہ ہے۔ ایران پر اسرائیل اور امریکا کے حملوں نے عالمی سیاست کو ایک ایسے موڑ پر لاکھڑا کیا ہے اور ان حملوں نے اس خطے کو ایک ایسے بھنور میں دھکیل دیا ہے جہاں ہر موج اپنے اندر ایک ایسا طوفان سموئے ہوئے ہے جہاں ہر فیصلہ آنے والے برسوں کی سمت متعین کرے گا۔ یہ محض جنگ نہیں، بلکہ قوت اور اخلاق، مفاد اور اصول، اور جارحیت و مفاہمت کے درمیان ایک فکری معرکہ بھی ہے۔

عالمی سیاست کے افق پر اس وقت ایک ایسا ہنگامہ ہستی پر پا ہے جس میں بارود کی بو، سفارت کاری کی لطافت اور طاقت کے توازن کی کشمکش ایک ساتھ جلوہ گر ہیں۔ ایران پر اسرائیل اور امریکا کے شدید حملوں نے جہاں مشرق وسطیٰ کو ایک آتش فشاں کے دہانے پر لاکھڑا کیا ہے، وہیں اسلام آباد کی خاموش مگر پر اثر سفارت کاری نے عالمی نگاہوں کو اپنی جانب منعطف کر لیا ہے بظاہر یہ ایک جنگ ہے، مگر درحقیقت یہ عالمی قیادت کے نئے معیارات کی تشکیل کا لمحہ بھی ہے۔

اسی ہنگامہ آشوب میں پاکستان کا کردار ایک چراغِ امید کی مانند ابھر رہا ہے۔ ایک ایسا چراغ جو اندھیروں میں راستہ دکھانے کی سکت رکھتا ہے۔ اقوامِ عالم نے یہ تسلیم کیا ہے کہ پاکستان کا کردار ایک ایسے صاحب بصیرت ثالث کے طور پر ابھر رہا ہے جو نہ صرف حالات کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے بلکہ انہیں سنوارنے کی بھی سکت رکھتا ہے۔

اس بحران کے بیچ پاکستان نے ثالثی کی جو سبیل نکالی ہے، وہ محض ایک سفارتی چال نہیں بلکہ ایک فکری و تہذیبی روایت کی بازگشت ہے۔ وہ روایت جو مفاہمت، توازن اور حکمت کی امین رہی ہے۔ ایران کے وزیر خارجہ عباس عراقچی کے بیانات سے اگرچہ یہ عندیہ ملتا ہے کہ فی الوقت تہران مذاکرات کیلئے آمادہ نہیں، تاہم پس پردہ پیغامات کا تبادلہ اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ سفارتی درپے ابھی مکمل طور پر بند نہیں ہوئے۔ اس سارے منظر نامے میں امریکا کی جانب سے پاکستان کی کوششوں کی تائید ایک غیر معمولی پیش رفت ہے، جو اس کے کردار کو محض علاقائی نہیں بلکہ عالمی سطح پر معتبر بناتی ہے۔

ایران اور مغربی طاقتوں کے درمیان کشیدگی کوئی نئی داستان نہیں، ایران اور مغربی طاقتوں کے درمیان کشمکش کی جڑیں گہری ہیں۔ یہ تنازع صرف حالیہ واقعات کا نتیجہ نہیں بلکہ دہائیوں پر محیط عدم اعتماد، نظریاتی اختلاف اور جغرافیائی مفادات کا حاصل ہے۔ اسرائیل کی عسکری کارروائیاں اور امریکا کی غیر مشروط حمایت نے اس آگ کو مزید بھڑکا دیا ہے بلکہ حالیہ تصادم نے اسے ایک فیصلہ کن مرحلے میں داخل کر دیا ہے۔ یہ جنگ محض سرحدوں کی نہیں بلکہ بیانیوں کی جنگ ہے۔ اسرائیل کی عسکری پیش قدمی اور امریکا کی پشت پناہی نے اس تنازع کو محض علاقائی نہیں بلکہ عالمی بحران میں بدل دیا ہے۔ یہ جنگ صرف سرحدوں کی نہیں بلکہ بیانیوں کی بھی ہے۔ ایک طرف طاقت کا غرور، مغربی طاقتوں کا تسلط پسند بیانیہ، اور دوسری طرف ایران کا خود

مختاری اور مزاحمت کا فلسفہ، اس جنگ کو دنیا کی تباہی کی طرف لے جا رہا ہے۔

ایسے نازک وقت میں اسلام آباد کی سفارت کاری ایک غیر معمولی اہمیت اختیار کر گئی ہے۔ اسلام آباد آج محض ایک دارالحکومت نہیں بلکہ ایک سفارتی مرکز کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ پاکستان نے جس حکمت، تحمل اور تدبیر کے ساتھ ثالثی کی راہ اختیار کی ہے، وہ اس کی سیاسی بصیرت کا آئینہ دار ہے۔ یہ وہی سرزمین ہے جہاں کبھی عالمی طاقتوں کے درمیان خاموش معاہدے طے پاتے رہے، اور آج بھی وہی روایت نئے رنگ میں جلوہ گر ہے۔ دنیا کی نظریں یہاں مرکوز ہیں، اور دلی کے ایوانوں میں اس پیش رفت پر تشویش کی لہریں دوڑ رہی ہیں۔ بھارتی مبصرین کیلئے یہ ایک کرناک حقیقت ہے کہ جس ملک کو وہ طعن و تشنیع کا ہدف بناتے رہے، وہی آج عالمی امن کی امید بن کر ابھر رہا ہے۔

بین الاقوامی نظام اس وقت ایک عبوری دور سے گزر رہا ہے۔ سرد جنگ کے بعد قائم ہونے والا ایک قطبی نظام اب اپنی افادیت کھو رہا ہے اور ایک کثیر القطبی دنیا کی تشکیل ہو رہی ہے۔ اس نئی دنیا میں علاقائی طاقتوں کا کردار بڑھ رہا ہے، اور پاکستان انہی ابھرتی ہوئی قوتوں میں شامل ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔

بھارتی اپوزیشن کے رہنما ششی تھروور کی آواز اس بے چینی کی آئینہ دار ہے۔ ان کا یہ اعتراف کہ بھارت کو بھی امن مذاکرات میں پہل کرنی چاہیے تھی، دراصل ایک کھوئے ہوئے موقع کا نوحہ ہے۔ پاکستان، مصر اور ترکی کی پیش قدمی نے جہاں امن کے امکانات کو جلا بخشی ہے، وہیں بھارت کی سفارتی سستی اور ناکامی کو بھی نمایاں کر دیا ہے۔ گویا تاریخ نے ایک بار پھر ثابت کیا کہ جو قومیں وقت کے تقاضوں کو نہیں سمجھتیں، وہ مواقع کے قافلے سے پیچھے رہ جاتی ہیں۔

پاکستان کی خارجہ پالیسی میں ایک خاص لطافت ہمیشہ سے موجود رہی ہے۔ وہ لطافت جو توازن، احتیاط اور مکالمے پر مبنی ہے۔ ایران کے ساتھ برادرانہ تعلقات اور امریکا کے ساتھ اسٹریٹجک روابط نے اسے ایک ایسا منفرد مقام عطا کیا ہے جہاں سے وہ دونوں فریقوں کے درمیان پل بن سکتا ہے۔ یہی وہ وصف ہے جو کسی بھی ثالث کو معتبر بناتا ہے۔ اسلام آباد آج محض ایک انتظامی دارالحکومت نہیں بلکہ سفارتی حکمت کا مرکز بن چکا ہے۔ یہاں ہونے والی ملاقاتیں، خفیہ پیغامات اور پس پردہ روابط اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ پاکستان عالمی سطح پر ایک سنجیدہ اور ذمہ دار کردار ادا کرنے کیلئے تیار ہے۔

پاکستان کی سفارت کاری ہمیشہ ایک خاص توازن کی حامل رہی ہے۔ یہ نہ تو مکمل طور پر کسی ایک بلاک کا حصہ بنتی ہے اور نہ ہی خود کو تنہائی کا شکار ہونے دیتی ہے۔ یہی اعتدال اسے ایک قابل اعتماد ثالث بناتا ہے۔ فیلڈ مارشل عاصم منیر کا بطور ثالث ابھرنا محض ایک فرد کی کامیابی نہیں بلکہ ریاستی عزم اور ادارہ جاتی ہم آہنگی کا مظہر ہے۔ واشنگٹن اور تہران کے درمیان پل کا کردار ادا کرنا ایک ایسا کارنامہ ہے جو پاکستان کی سیاسی بصیرت اور علاقائی اہمیت کو دوچند کر دیتا ہے۔ یہ وہ لمحہ ہے جب تاریخ اپنے اوراق میں ایک نئے باب کا اضافہ کر رہی ہے۔

امریکا کی جانب سے پاکستان کی ثالثی کی حمایت ایک غیر معمولی پیش رفت ہے۔ یہ محض ایک سفارتی بیان نہیں بلکہ ایک اعتماد کا اظہار ہے۔ وہ اعتماد جو برسوں کی شراکت داری اور باہمی مفادات کے نتیجے میں پروان چڑھا ہے۔ ٹرمپ انتظامیہ کا یہ جھکاؤ پاکستان کیلئے ایک سفارتی سرمایہ ثابت ہو سکتا ہے خارجہ عباس عراچی کا یہ کہنا کہ ایران فی الحال مذاکرات کا خواہاں نہیں، بظاہر ایک سخت موقف معلوم ہوتا ہے، مگر سفارت کاری کی جبکہ ایرانی وزیر زبان میں یہ ایک دروازہ بند ہونے کے ساتھ ساتھ کئی کھڑکیوں کے کھلے رہنے کا اشارہ بھی ہوتا ہے۔ دراصل سفارتی زبان کا ایک نازک پہلو کی رمت

چھپی ہوتی ہے۔ پیغامات کا تبادلہ اس بات کی دلیل ہے کہ دروازے مکمل طور پر بند نہیں ہوئے۔ پیغامات ہے۔ بسا اوقات انکار کے پردے میں اقرار کا تبادلہ اس بات کی دلیل ہے کہ پس پردہ سفارتی سرگرمیاں جاری ہیں۔

بھارت میں اس پیش رفت پر جو اضطراب پایا جاتا ہے، وہ اس کے اندرونی خدشات کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ وہ لمحہ ہے جب ایک حریف کی کامیابی دوسرے کیلئے سوالیہ نشان بن جاتی ہے۔ بھارت میں اس پیش رفت پر جو رد عمل سامنے آرہا ہے، وہ محض سیاسی بیان بازی نہیں بلکہ ایک گہری تشویش بھارتی صحافیوں کی جانب سے پاکستان کی ممکنہ کامیابی کو ”سفارتی انقلاب“ قرار دینا ایک غیر معمولی تلخ اعتراف ہے۔ یہ وہی پاکستان ہے جسے اکثر کاغذ پر تنقید کا نشانہ بنایا جاتا رہا، اور آج وہی ملک عالمی امن کی امید بن کر ابھر رہا ہے۔

برسوں سے پاکستان کو ناکام ریاست قرار دینے والے آج اسی کے کردار کو سراہنے پر مجبور ہیں۔ اگر پاکستان اس آگ کو بجھانے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو یہ نہ صرف ایک جنگ کا خاتمہ ہو گا بلکہ عالمی سطح پر طاقت کے توازن میں ایک نمایاں تبدیلی بھی ہوگی۔ تجزیہ کاروں کے نزدیک پاکستان کی کامیابی بھارت کیلئے ایک سفارتی دھچکا ہو سکتی ہے۔ یہ وہ لمحہ ہے جب دلی کو اپنے فیصلوں پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ بھارتی اپوزیشن ششی تھورو کا بیان ایک اعتراف ہے۔ ایک ایسا اعتراف جو اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ بھارت ایک اہم موقع کھو بیٹھا ہے۔ ششی تھورو کا بیان دراصل ایک آئینہ ہے جس میں بھارت کی سفارتی کمزوری صاف جھلکتی ہے۔ ان کا یہ کہنا کہ حکومت کو امن مذاکرات میں پہل کرنی چاہیے تھی، اس بات کا اعتراف بیٹھا ہے اور یہ عظیم ناقابل تلافی سیاسی حادثہ مودی جیسے نااہل کے دور میں ہوا ہے۔ ہے کہ بھارت ایک اہم موقع گنوا

ثالثی بذات خود کوئی معجزہ نہیں، مگر اس کی کامیابی ایک قوم کی ساکھ کو نئی بلندیوں تک لے جاسکتی ہے۔ آج دنیا کی نظریں اسلام آباد پر مرکوز ہیں۔ یہ شہر، جو کبھی صرف ایک دارالحکومت سمجھا جاتا تھا، اب عالمی سفارت کاری کا مرکز بنتا جا رہا ہے۔ ہر بیان، ہر ملاقات اور ہر پیش رفت کو بغور دیکھا جا رہا ہے۔ گویا یہ شہر ایک ایسے اسٹیج میں بدل چکا ہے جہاں عالمی سیاست کا ڈرامہ اپنے عروج پر ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ماضی میں بھی اسلام آباد نے بڑی طاقتوں کے درمیان پل کا کردار ادا کیا۔ پاکستان ماضی میں بھی عالمی ثالثی میں اہم کردار ادا کر چکا ہے۔ یہ ایک ایسی روایت ہے جو آج بھی زندہ ہے۔ یہ وہی شہر ہے جس نے کبھی واشنگٹن اور بیجنگ کو قریب لانے میں کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ آج پھر وہی داستان نئے انداز میں رقم ہو رہی ہے۔ یہ پہلا موقع نہیں کہ پاکستان نے عالمی سطح پر ثالثی کا کردار ادا کیا ہو۔ ماضی میں بھی اسلام آباد نے بڑی طاقتوں کے درمیان پل کا کردار ادا کیا تھا۔ یہ روایت آج بھی زندہ ہے اور ایک نئے باب کی صورت میں سامنے آرہی ہے۔

پاکستان کی حکمت عملی مفاہمت اور توازن پر مبنی ہے، جو اسے ایک مؤثر ثالث بناتی ہے۔ دنیا کی نظریں اس وقت اسلام آباد پر مرکوز ہیں۔ یہ شہر ایک ایسے اسٹیج میں تبدیل ہو چکا ہے جہاں عالمی سیاست کے اہم کردار اپنی اپنی چالیں چل رہے ہیں۔ امریکا کی جانب سے پاکستان کی ثالثی کی حمایت اس بات کا ثبوت ہے کہ عالمی طاقتیں بھی اس کی صلاحیتوں کو تسلیم کر رہی ہیں۔ امریکا کا اعتماد پاکستان کیلئے ایک اہم سفارتی سرمایہ بن چکا ہے اور کبھی یہی کردار پاکستان نے دوحہ میں افغان امریکانڈا کرات میں بھی بڑی خوش اسلوبی سے ادا کیا تھا اس کے بعد امریکا کا افغانستان سے انخلا ممکن ہوا تھا۔

ہمیں یہاں بہت محتاط ہو کر آنے والے اقدامات کیلئے ایک واضح اور جامع پالیسی تیار کرنا ہوگی کہ ایک مرتبہ پھر صدر ٹرمپ کی انتظامیہ کا یہ اعتماد اور انحصار پاکستان کیلئے کہیں کوئی نئی آزمائش نہ بن جائے۔ پاکستان کی ممکنہ کامیابی کو سفارتی انقلاب قرار دینا دراصل اس کے کردار کی اہمیت کا جہاں



اعتراف ہے وہاں دوحہ میں طالبان کے مذاکرات کے بعد اب ہم جس صورتحال سے گزر رہے ہیں، فیلڈ مارشل عاصم منیر کا بطور ثالث ابھرنا پاکستان کی فیصلہ کن قیادت کا مظہر ہے۔ فیلڈ مارشل عاصم منیر کی قیادت پاکستان کی فیصلہ کن پالیسیوں کی عکاس ہے۔ یہ قیادت نہ صرف داخلی سطح پر مضبوط ہے بلکہ عالمی سطح پر بھی اپنا اثر دکھا رہی ہے۔ ان کی سفارتی سرگرمیاں اور عالمی رہنماؤں سے

روابط اس بات کی دلیل ہیں کہ پاکستان محض رد عمل دینے والا ملک نہیں بلکہ مشکل حالات کو تعمیری شکل دینے والا کردار ادا کر رہا ہے۔

مشرق وسطیٰ کے حوالے سے بھارت کی پالیسی ایک زمانے تک توازن اور احتیاط کی مثال سمجھی جاتی تھی۔ ایران، خلیجی ممالک اور اسرائیل کے ساتھ اس کے تعلقات ایک نازک توازن پر قائم تھے، مگر حالیہ برسوں میں مودی حکومت نے یہ توازن بری طرح بگاڑ دیا ہے۔ بھارت کی خارجہ پالیسی میں حالیہ برسوں میں واضح تبدیلی آئی ہے۔ بھارت کی حالیہ خارجہ پالیسی میں توازن کی کمی واضح دکھائی دیتی ہے، جو اس کیلئے سفارتی چیلنجز پیدا کر رہی ہے۔ جہاں پہلے وہ توازن کی پالیسی اپناتا تھا، اب اس کا جھکاؤ ایک خاص سمت میں نظر آتا ہے۔ یہ تبدیلی اس کے علاقائی تعلقات پر اثر انداز ہو رہی ہے۔

بھارت کا جھکاؤ ایک خاص سمت میں ہونا اس کی غیر جانبداری کو متاثر کر رہا ہے۔ یعنی ایران پر حملوں کے بعد بھارت کا موقف اور جھکاؤ واضح طور پر امریکا اور اسرائیل کے حق میں نظر آتا ہے۔ اس یک طرفہ رویے نے نہ صرف اس کی غیر جانبداری کو مشکوک بنادیا بلکہ اسے ایک فریق کے طور پر پیش کیا ہے جس نے اس کے علاقائی تعلقات کو بھی متاثر کیا ہے۔ سفارت کاری میں توازن کھودینا ایسے ہی ہے جیسے کشتی بان اپنا قطب نما گم کر دے۔ پھر سمتیں دھندلا جاتی ہیں اور منزل کھو جاتی ہے۔ ایران پر حملوں کے بعد بھارت کا موقف واضح طور پر امریکا اور اسرائیل کے حق میں نظر آتا ہے۔ اس یک طرفہ رویے نے اس کی غیر جانبداری کو متاثر کیا ہے۔

یہ جنگ ایک پیچیدہ صورت حال اختیار کر چکی ہے جس میں ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا ضروری ہے۔ ایران کی جنگ ایک پیچیدہ شطرنج ہے جس میں ہر چال سوچ سمجھ کر چلنی پڑتی ہے، اور ہر چال کے کئی معنی ہوتے ہیں۔ اسرائیل، امریکا، ایران اور دیگر علاقائی طاقتیں اس کھیل کے اہم کردار ہیں۔ پاکستان اس کھیل میں ثالث کا کردار ادا کر رہا ہے، جو سب سے مشکل مگر سب سے مؤثر کردار ہوتا ہے۔ پاکستان کے اس سے عدم تعلق کے باعث ثالثی کا عمل مزید دشوار ہو جاتا ہے۔ تاہم امریکا کی حمایت نے پاکستان کو وہ اعتماد عطا کیا ہے جو بڑے فیصلوں کی بنیاد بنتا ہے۔ سفارت کاری میں توازن ہی کامیابی کی کنجی ہوتا ہے۔ بین الاقوامی سیاست میں توازن ایک بنیادی اصول ہے۔ جو ممالک اس توازن کو برقرار رکھتے ہیں، وہی دیر پا اثرات چھوڑتے ہیں۔ پاکستان کی موجودہ حکمت عملی اسی اصول کی عکاس ہے۔ پاکستان کو جو اعتماد حاصل ہے، وہ اس کی سب سے بڑی قوت ہے۔ امریکا کی حمایت اور ایران کے ساتھ تعلقات نے اسے ایک منفرد حیثیت دی ہے۔

بھارت نے ابتدا ہی سے ایک واضح صف بندی اختیار کر لی ہے۔ خلیجی ممالک کے ساتھ معاشی مفادات اور امریکا کے ساتھ اسٹریٹجک تعلقات نے اسے ایک خاص سمت میں دھکیل دیا ہے۔ اس کے بیانات اور اقدامات اسی جھکاؤ کی عکاسی کرتے ہیں۔ بھارت کا کردار اس بحران میں محدود دکھائی دیتا ہے۔ یہ

امر بھی قابل غور ہے کہ بھارت نے کبھی سنجیدگی سے ثالثی کی پیشکش نہیں کی۔ امریکا کا اس پر عدم اعتماد دراصل اسی خلا کی نشاندہی کرتا ہے۔ یوں بھارت ایک خود مختار ثالث کی بجائے ایک تابعہ اتحادی کے طور پر سامنے آتا ہے۔ اس کی پالیسیوں نے اسے ایک ثالث کی بجائے اسے خطے کی ظالم قوت کا فعال ساتھی بنا دیا ہے۔

بھارت کے اندرونی حلقوں میں بڑھتی ہوئی تنقید اس امر کی غماز ہے کہ اس کی خارجہ پالیسی اپنی سمت کھو بیٹھی ہے۔ غزہ سے لے کر ایران تک، اس کی کمزور آواز نے اس کے وقار کو متاثر کیا ہے۔ عالمی سیاست میں خاموشی اکثر بے وزنی کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ بھارت کے اندرونی حلقوں میں ہونے والی تنقید اس بات کی بھی نشاندہی کرتی ہے کہ اس کی خارجہ پالیسی پر سوالات اٹھ رہے ہیں۔ ایران جیسے قریبی ہمسائے کے معاملے میں خاموشی یا جانبداری ایک بڑی سفارتی لغزش سمجھی جا رہی ہے۔ جب جنگ دروازے پر دستک دے رہی ہو تو خاموشی بھی ایک کمزوری کی علامت اور ایک بھیانک مکروہ جرم بن جاتی ہے۔ یوں عالمی طور پر پاکستان اور بھارت کی قیادت کے انداز میں واضح فرق نظر آتا ہے۔

اس خطے میں طاقت کا توازن مسلسل بدل رہا ہے۔ ایران کی مزاحمت، اسرائیل کی جارحیت اور امریکا کی مداخلت نے ایک پیچیدہ صورت حال پیدا کر دی ہے۔ ادھر دوسری طرف اسرائیل اس تنازع میں ایک اہم کردار ادا کر رہا ہے، جس کے بغیر کسی بھی حل کا تصور ادھورا ہے۔ خلیجی ممالک اس بحران میں اہم حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے فیصلے مستقبل کو متاثر کر سکتے ہیں۔ ان کے مفادات اور تعلقات اس تنازع کے نتائج پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ یہ خطہ ایک نئے توازن کی طرف بڑھ رہا ہے جہاں ہر طاقت اپنا کردار ادا کر رہی ہے۔ یہ بحران عالمی سیاست میں ایک نئے باب کا آغاز کر سکتا ہے۔ طاقت کے توازن میں تبدیلیاں اور نئے اتحاد اس کے ممکنہ نتائج ہیں۔

اگر پاکستان اپنی ثالثی میں کامیاب ہوتا ہے تو اس کا عالمی وقار غیر معمولی حد تک بڑھ جائے گا۔ یہ ایک تاریخی کامیابی ہوگی۔ ایک کامیاب ثالثی نہ صرف جنگ کو ختم کر سکتی ہے بلکہ مستقبل کے تنازعات کیلئے ایک مثال بھی قائم کر سکتی ہے۔ یہ صورتحال بھارت کیلئے ایک سبق ہے کہ خارجہ پالیسی میں توازن اور بروقت فیصلے کتنے اہم ہوتے ہیں۔ یاد رہے کہ یہ بحران عالمی نظام کی نئی تشکیل کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔ پاکستان کا کردار اسے عالمی سطح پر ایک نئی پہچان دے رہا ہے۔ کامیاب ثالثی نہ صرف جنگ کو ختم کرے گی بلکہ مستقبل کیلئے ایک مثال قائم کرے گی۔ یہ صورتحال جہاں بھارت کیلئے ایک اہم سبق ہے کہ سفارت کاری میں توازن اور بروقت فیصلے کتنے ضروری ہوتے ہیں وہاں تاریخ ہمیشہ ان قوموں کا احتساب کرتی ہے جو اہم مواقع پر درست فیصلے کرنے میں ناکام رہتی ہیں۔

پاکستان اور بھارت کی قیادت کے انداز میں واضح فرق نظر آتا ہے۔ جہاں ایک طرف فیصلہ کن اقدامات ہیں، اور پاکستان کی فیصلہ کن قیادت نے اس کے کردار کو مزید مستحکم کیا ہے۔ جہاں ایک طرف بھارت میں تذبذب اور تردد دکھائی دیتا ہے، وہیں پاکستان میں واضح حکمت عملی اور جرات اقدام نظر آتی ہے۔ قیادت کا یہی وصف قوموں کی تقدیر بدل دیتا ہے۔

بالآخر یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ پاکستان ایک نئے سفارتی عہد کی دلیز پر کھڑا ہے۔ اگر اس کی ثالثی کامیاب ہوتی ہے تو یہ نہ صرف ایک جنگ کا خاتمہ ہو گا بلکہ ایک نئے عالمی بیانیے کا آغاز بھی۔ اس کے برعکس بھارت کیلئے یہ لمحہ احتساب ہے۔ ایک ایسا آئینہ جس میں اسے اپنی منافقانہ پالیسیوں کی کمزوری صاف دکھائی دے رہی ہے۔ تاریخ کا پیہ گھوم رہا ہے، اور اس بار اس کی گردش میں پاکستان کا قد واقعی بلند ہو تا دکھائی دے رہا ہے۔

تاریخ ہمیشہ ان قوموں کو یاد رکھتی ہے جو مشکل وقت میں درست فیصلے کرتی ہیں۔ پاکستان اس وقت ایک ایسے ہی موڑ پر کھڑا ہے۔ آنے والے دن اس بحران کے نتائج کا تعین کریں گے، مگر ایک بات واضح ہے کہ پاکستان نے اپنی موجودگی کا بھرپور احساس دلایا ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ پاکستان ایک نئے سفارتی افق کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اگر اس کی ثالثی کامیاب ہوتی ہے تو یہ نہ صرف جہاں ایک جنگ کا خاتمہ ہو گا اور ایک نئے عالمی نظام کی بنیاد بھی رکھے گا، وہاں ایک نئی عالمی ترتیب کا آغاز بھی۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ تاریخ کے افق پر ایک نئی سحر طلوع ہو رہی ہے۔ ایک ایسی سحر جس میں پاکستان کا قد واقعی بلند ہو جائے گا، اور اس کی آواز عالمی ضمیر کی بازگشت بن کر گونجے گی۔

سوموار 25 شوال المکرم 1447ھ / 13 اپریل 2026ء

سفارت کی میز، جنگ کا سایہ

یہ داستان محض سیاست کے خشک اور بے روح ابواب میں سے ایک باب نہیں، بلکہ یہ انسانیت کے سینے پر لکھی ہوئی وہ دردناک تحریر ہے جس کے ہر لفظ سے بارود کی بو اور ہر سطر سے آہوں کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ یہ معاملہ دور یاستوں کے درمیان کشاکش کا نہیں، بلکہ اُس عالمی ضمیر کا امتحان ہے جو صدیوں کی تہذیب، مذہب، اخلاق اور انسان دوستی کے دعوؤں کے باوجود آج بھی طاقت کے بت کے سامنے سجدہ ریز دکھائی دیتا ہے۔

عصرِ حاضر کی دنیا ظاہر ترقی، علم اور ٹیکنالوجی کے بامِ عروج پر کھڑی ہے، مگر باطن میں وہی قدیم درندگی، وہی ہوسِ اقتدار اور وہی خون آشام مفادات آج بھی زندہ ہیں۔ طاقت کے ایوانوں میں بیٹھے ہوئے وہ عناصر، جو اپنے مفادات کی شمع کو روشن رکھنے کیلئے پوری انسانیت کو اندھیروں میں دھکیلنے سے بھی گریز نہیں کرتے، دراصل اسی المیے کے معمار ہیں۔ یہ وہ قوتیں ہیں جو امن کے نام پر جنگ کی تجارت کرتی ہیں، اور انسانیت کے نام پر انسانوں کے لہو سے اپنے ایوانوں کی بنیادیں مضبوط کرتی ہیں۔

یہی وہ پس منظر ہے جس میں یہ تنازع ایک معمولی سفارتی اختلاف سے بڑھ کر ایک عالمی سانحہ بن جاتا ہے۔ یہاں ہر فیصلہ صرف سیاسی نہیں، بلکہ انسانی تقدیروں کا فیصلہ بن جاتا ہے۔ ایک طرف طاقت کا غرور ہے، تو دوسری جانب بقا کی جدوجہد؛ ایک طرف مفادات کا اندھا کھیل ہے، تو دوسری جانب انسانیت کی سسکتی ہوئی آواز۔

قارئین! اس تحریر کے محض ایک رپورٹ نہ سمجھا جائے، بلکہ اسے ایک آئینہ تصور کیا جائے جس میں ہم اپنے عہد کی سچائیوں کو بے نقاب ہوتے دیکھ سکتے ہیں۔ یہ وہ لمحہ فکریہ ہے جہاں ہمیں یہ طے کرنا ہے کہ آیا ہم جنگ کے اس اندھے طوفان کا حصہ بنیں گے یا امن کی اُس شمع کو روشن کریں گے جو اندھیروں کے سینے کو چیر کر روشنی کی نوید دیتی ہے۔ کیونکہ تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی انسان نے تلوار کو دلیل پر ترجیح دی، تو اس کے ہاتھ میں فتح نہیں بلکہ اپنے ہی وجود کی شکست آئی۔ یہ قضیہ محض سفارتی نزاکتوں کا بیان نہیں، بلکہ عہدِ حاضر کی بین الاقوامی سیاست کے اُس پیچیدہ شطرنج کا نقشہ ہے جس میں ہر مہرہ اپنی چال سے زیادہ اپنے مفہوم کا حامل ہے۔

یہ معاملہ محض دور یاستوں کے درمیان اختلافات کا نہیں اور نہ یہ قضیہ محض سفارتی نزاکتوں کا بیان ہے، بلکہ عصرِ حاضر کی عالمی سیاست کے اُس پیچیدہ نقشہ اور اس پیچیدہ باب کا عنوان ہے جس میں ہر مہرہ اپنی چال سے زیادہ اپنے مفہوم کا حامل ہے۔ جس میں طاقت، نظریہ، مفاد اور خوف — شطرنج کا ایک دوسرے میں اس طرح پیوست ہو چکے ہیں کہ ان کی تفریق محال نظر آتی ہے۔ اسی پس منظر میں ایک مفصل، اور فکری گہرائی سے چاروں عناصر مزین رپورٹ، اصل ترتیب کے ساتھ، پیش کی جا رہی ہے تاکہ آپ خود فیصلہ کر سکیں کہ دنیا کی تباہی جو چند گھنٹوں کے فاصلے پر منتظر تھی، ابھی تک ان خطرات سے باہر نہیں نکل سکی۔

امریکا اور ایران کے تعلقات کی داستان ایک ایسے آئینے کی مانند ہے جس میں بدگمانی کی دھند ہمیشہ چھائی رہتی ہے۔ اس وقت امریکا اور ایران کے درمیان پانچ بڑے اختلافات ایسے موجود ہیں جو کامیابی کی صلیب پر دنیا کے امن کو لگا کر رہے ہیں۔

☆ پہلا ایرانی جوہری پروگرام کے متعلق ہے، یہ وہ عقدہ ہے جو مدتوں سے کھلنے کا نام نہیں لیتا؛ یہ وہ بنیادی نکتہ نزاع ہے جس نے دہائیوں سے دونوں ممالک کو آمنے سامنے لاکھڑا کیا ہے۔ امریکا کے نزدیک ایران کا جوہری پروگرام ایک ممکنہ خطرہ ہے، جبکہ ایران اسے اپنی قومی خود مختاری اور سائنسی ترقی کا حق سمجھتا ہے۔ گویا ایک کے نزدیک یہ ”خطرہ“ ہے، دوسرے کے نزدیک ”جائز حق اور وقار“ کا مسئلہ ہے۔

☆ دوسرا علاقائی اثر و رسوخ ہے، ایران کا ”محور مزاحمت“ امریکا و اسرائیل کیلئے خارِ راہ ہے۔ ایران نے مشرق وسطیٰ میں اپنے اتحادیوں اور پرانسی گروہوں کے ذریعے ایک ایسا جغرافیائی دائرہ قائم کیا ہے جسے وہ ”مزاحمت کا محور“ کہتا ہے۔ امریکا اور اس کے اتحادی اسے عدم استحکام کا سبب سمجھتے ہیں۔ یوں یہ اختلاف صرف سرحدوں کا نہیں، بلکہ نظریات کی جنگ ہے۔

☆ تیسرا پابندیوں اور معاشی دباؤ کا ہے، امریکا کی اقتصادی پابندیوں کی تلوار، ایران کی گردن پر ہمیشہ معلق رہی ہے۔ امریکا کی عائد کردہ پابندیاں ایران کی معیشت کو مسلسل دباؤ میں رکھتی ہیں۔ ایران ان پابندیوں کو ”اقتصادی جنگ“ قرار دیتا ہے، جبکہ امریکا انہیں ”دباؤ کا سفارتی ہتھیار“ سمجھتا ہے۔

☆ چوتھا آبنائے ہر مز کا تنازع ہے، یہ محض ایک گزر گاہ نہیں، بلکہ عالمی معیشت کی شہ رگ ہے۔ ایران اس پر اپنی خود مختاری کا دعویٰ کرتا ہے، جبکہ امریکا اسے بین الاقوامی پانی قرار دیتا ہے۔ اس اختلاف میں عالمی معیشت کی دھڑکن شامل ہے۔

☆ اور پانچواں اعتماد کا شدید فقدان ہے، سب سے بڑا مسئلہ شاید یہی ہے کہ دونوں کے درمیان اعتماد کا رشتہ ناپید ہے۔ دونوں فریقوں کے درمیان بدگمانی کی دیواریں اس قدر بلند ہیں کہ مکالمہ بھی سر نہ لگاتا محسوس ہوتا ہے۔ ہر معاہدہ شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور ہر بیان کے پیچھے نیت پر سوال اٹھایا جاتا ہے۔

اسلام آباد کی سرزمین پر ہونے والے مذاکرات بظاہر ایک نئی صبح کی امید تھے، گویا اس چراغ کی مانند تھے جسے آندھی کے بیچ روشن کرنے کی سعی کی گئی ہو مگر درحقیقت یہ ایک ایسے سفر کا آغاز تھا جس کی منزل خود دھند میں لپٹی ہوئی تھی۔ ابتدا ہی سے یہ امر روز روشن کی طرح عیاں تھا کہ دونوں اطراف کے مابین ایسے بنیادی اختلافات کے پہاڑ حائل ہیں جو نہ صرف محض سفارتی مسکراہٹوں سے حل ہو سکتے ہیں اور نہ ہی الفاظ کے پل سے عبور کیا جا سکتا ہے۔ یہ مذاکرات ایک ایسے دریا پر پل بنانے کی کوشش تھے جس کے دونوں کنارے نہ صرف دور تھے بلکہ درمیان میں طوفانی اور سرکش شیطانی موجیں بھی سر اٹھائے کھڑی تھیں۔

ایرانی وزارت خارجہ کے ترجمان اسماعیل بقائی کا بیان اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ مذاکرات مکمل ناکام نہیں تھے، مگر چند بنیادی نکات ایسے تھے جو ”گرہ کور“ بنے رہے اور کامیابی سے بھی کوسوں دور رہے لیکن ایرانی ترجمان کے بیان سے یہ حقیقت بھی مترشح ہوتی ہے کہ اگرچہ کئی امور پر مفاہمت کی کرن پھوٹی، مگر دو یا تین اہم نکات ایسے تھے جو ”گرہ ناگشودہ“ بنے رہے۔ آبنائے ہر مز جیسے نئے موضوعات نے اس پیچیدگی میں مزید تہہ دہہ اضافہ کیا، ہر موضوع اپنے اندر ایک نئی الجھن لیے ہوئے تھا، گویا ایک مسئلہ حل کرنے کیلئے کئی نئے مسائل کو جنم دیا جا رہا ہو۔ یوں یہ مذاکرات منزل سے پہلے ہی تھک کر بیٹھ گئے۔

ایران کا جوہری پروگرام اس تنازع کا مرکزی ستون ہے۔ یہ تنازع گویا ایک ایسی پرانی داستان ہے جس کے اوراق بوسیدہ ضرور ہو چکے ہیں، مگر اس کی شدت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ امریکا کا موقف ہے کہ ایران اس پروگرام کی آڑ میں جوہری ہتھیار بنانے کی صلاحیت حاصل کرنا چاہتا ہے، امریکا کے نزدیک یہ خطرے کی گھنٹی ہے، جبکہ ایران اس الزام کو مسترد کرتے ہوئے اسے محض پر امن مقاصد کیلئے قرار دیتا ہے اور ایران اسے اپنی خود مختاری



کا استعارہ سمجھتا ہے۔ یہ اختلاف دراصل طاقت اور خوف کے درمیان ایک کشمکش ہے۔ امریکا کا خوف اور ایران کی طاقت کی خواہش۔ امریکی نائب صدر جے ڈی وینس کے بیان میں ایک واضح پیغام پوشیدہ تھا، ہمیں الفاظ نہیں، یقین چاہیے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ امریکا کی اولین ترجیح ایران سے ایسی ٹھوس یقین دہانی حاصل کرنا ہے جو محض الفاظ تک محدود نہ ہو۔

ان کے مطابق مذاکرات کی روح یہی تھی کہ ایران کو نہ صرف جوہری ہتھیار بنانے سے باز رہنا ہو گا بلکہ اس کیلئے درکار تمام وسائل اور صلاحیتوں سے بھی دستبردار ہونا ہو گا بلکہ اس سمت جانے والے تمام راستے بھی مسدود کرنے کی تحریری یقین دہانی کروانا ہو گی۔ یہ مطالبہ دراصل ”عدم اعتماد“ کی بنیاد پر کھڑا ہے، امریکا کو ایران کے وعدوں پر یقین نہیں، اور وہ عملی اقدامات کا خواہاں ہے مگر بقول اُن کے، یہ ”آبادی“ ابھی افق پر نمودار نہیں ہوئی۔

ایران اپنے موقف پر کوہ گراں کی مانند قائم ہے کہ جوہری عدم پھیلاؤ کے معاہدے کے تحت اسے پر امن مقاصد کیلئے یورینیم افزودہ کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ ایران اپنے موقف میں یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ وہ جوہری عدم پھیلاؤ کے معاہدے کا دستخط کنندہ ہے، لہذا اسے پر امن مقاصد کیلئے یورینیم افزودہ کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس کی دس نکاتی تجویز اسی اصول کی بین الاقوامی توثیق کی طلبگار ہے۔ گویا وہ اپنے حق کو سند جو ازد لوانا چاہتا ہے، جس میں وہ عالمی سطح پر اپنے اس حق کی تسلیم شدگی کا حق دار ہے۔ یہ محض ایک تکنیکی مسئلہ نہیں، بلکہ ایران کی قومی خود مختاری اور وقار کا سوال ہے۔

امریکی خاکہ اس کے برعکس ایک انتہائی مطالبہ پیش کرتا ہے، امریکا کے 15 نکاتی منصوبے میں ایران سے یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ اپنی سر زمین پر ہر قسم کی یورینیم افزودگی مکمل طور پر ختم کرے۔ یہ مطالبہ ایران کیلئے ناقابل قبول ہے اور یہ ایسا مطالبہ ہے جو ایران کیلئے اپنی ملکی اور سائنسی خود مختاری سے دستبرداری کے مترادف ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں مفاہمت کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ یوں یہ اختلاف ایک ایسی لکیر بن جاتا ہے جسے عبور کرنا دونوں کیلئے مشکل ہے۔

مشترکہ جامع منصوبہ عمل (جو انٹ کپری ہینسوپلان آف ایکشن) ”ایران جوہری معاہدے“ کا باقاعدہ نام ہے۔ یہ 2015ء میں (امریکا، برطانیہ، فرانس، چین، روس، علاوہ جرمنی) اور یورپی یونین اور ایران کے درمیان ایک معاہدہ ہوا تھا، جو اقتصادی پابندیوں میں نرمی کے بدلے ایران کے جوہری پروگرام کو محدود کرنے کیلئے ڈیزائن کیا گیا تھا۔ ایک زمانے میں امید کی کرن تھا، یہ ایک ایسا معاہدہ تھا جس نے ایک وقت میں امید کی نئی راہیں کھولی تھیں جسے طویل سفارتی ریاضت کے بعد حاصل کیا گیا مگر آج وہ ایک ایسی داستان نیم تمام معلوم ہوتا ہے جسے وقت کی گرد نے دھندلا دیا ہے۔ وقت کے ساتھ یہ معاہدہ اپنی افادیت کھو بیٹھا ہے اور آج یہ ایک ادھوری کہانی کی مانند محسوس ہوتا ہے۔ ایک ایسا باب جو مکمل ہونے سے پہلے ہی بند ہو گیا۔

لبنان میں حزب اللہ کے خلاف اسرائیلی کارروائیاں ان مذاکرات پر ایک ایسے گہرے سایے کی مانند چھائی رہیں جیسے بادل سورج کی روشنی کو مدھم کر دیتے ہیں۔ ایران کے اتحادی گروہ، خصوصاً حزب اللہ، اس تنازع کا اہم حصہ ہیں۔ ایرانی صدر مسعود پزیشکیان کی تنبیہ اس امر کی غماز تھی کہ میدان جنگ کی گونج، میز مذاکرات کی آواز کو دبا سکتی ہے۔ اگر یہ کارروائیاں جاری رہیں تو مذاکرات کی حیثیت محض رسمی رہ جائے گی۔

جنگ بندی کا اعلان بظاہر ایک مثبت قدم تھا، مگر اس کی پائیداری مشکوک رہی۔ اسرائیل کی جانب سے لبنان میں جاری کارروائیوں نے اس معاہدے کو کمزور کر دیا۔ یہ صورتحال اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ میدان جنگ کی حقیقتیں اکثر سفارتی معاہدوں کو بے معنی بنا دیتی ہیں۔ اسلام آباد سے امریکی وفد کی روانگی کے فوراً بعد جنوبی لبنان میں حملوں کی خبریں اس حقیقت کا اعلان تھیں کہ جنگ بندی محض کاغذی معاہدہ بھی ہو سکتی ہے۔ گویا لفظوں کے قلعے، بارود کی ایک چنگاری سے مسمار ہو جاتے ہیں۔

آبنائے ہرمز ایک ایسی گزرگاہ ہے جس سے دنیا کی ایک بڑی مقدار میں تیل کی ترسیل ہوتی ہے۔ یہ گزرگاہ محض جغرافیہ نہیں، بلکہ عالمی معیشت کی نبض ہے۔ ایران کا اس پر کنٹرول جہاں عالمی سطح پر تشویش کا باعث ہے وہاں ایران کا اس پر سخت کنٹرول اور جہازوں سے محمولات وصول کرنا امریکا کیلئے ناقابل قبول ہے۔ امریکا کا موقف ہے کہ یہ بین الاقوامی پانی ہے، جبکہ ایران اسے اپنی خود مختاری کا حصہ قرار دیتا ہے۔ یہ تنازع دراصل ”جغرافیہ“ اور ”معیشت“ کے ملاپ کا نتیجہ ہے، یہاں مفاد اور اختیار کی کشمکش اپنے عروج پر ہے۔

ایران آبنائے ہرمز کو اپنے پانی قرار دے کر جہاں ایک نئی قانونی و سیاسی بساط بچھنا چاہتا ہے وہاں آبنائے ہرمز پر اپنی گرفت کو مضبوط کرتے ہوئے اسے باضابطہ شکل دینا چاہتا ہے۔ یہ قدم دراصل اس کی اس خواہش کا اظہار ہے کہ وہ خطے میں اپنی بالادستی کو باضابطہ شکل دے۔ وہ نئے قواعد و ضوابط متعارف کروانے کی بات کر رہا ہے تاکہ اس گزرگاہ پر اس کا کنٹرول مزید مستحکم ہو سکے۔ یہ قدم اس کی علاقائی حکمت عملی کا حصہ ہے جس کے ذریعے وہ اپنی پوزیشن کو مضبوط بنانا چاہتا ہے۔

ایران کا پرکسی نیٹ ورک، جس میں حزب اللہ، حوثی، حماس اور دیگر گروہ شامل ہیں۔ اس کی ”فارورڈ ڈیفنس“ حکمت عملی کا بنیادی جزو اور جنگی حکمت عملی کا ستون ہیں۔ یہی وہ جال ہے جس کے ذریعے ایران اپنے دشمنوں کو دور سے الجھائے رکھتا ہے، اور براہ راست تصادم سے بچتے ہوئے اپنے مفادات کا تحفظ کرتا ہے مگر یہی نیٹ ورک امریکا اور اسرائیل کیلئے ایک مستقل خطرہ تصور کیا جاتا ہے۔ اسرائیل اسے اپنے وجود کیلئے خطرہ سمجھ کر اس کے خاتمے کا خواہاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکا اور ایران میں جنگ بندی کے باوجود اسرائیل کے لبنان پر مسلسل فضائی حملے جاری ہیں جس کی سنگینی پر اب عالمی اور یورپی رہنماؤں کی طرف سے بھی تشویش کا اظہار کیا جا رہا ہے۔

ادھر دوسری طرف ایران کی معیشت طویل عرصے سے پابندیوں کے باعث دباؤ کا شکار اور پابندیوں کے بوجھ تلے کرا رہی ہے۔ عوام کی بڑھتی ہوئی بے چینی اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ داخلی سطح پر بھی حکومت کو چیلنجز کا سامنا ہے۔ عوام کی خواہش ہے کہ وسائل جنگی سرگرمیوں اور مہمات کی بجائے فلاح عامہ پر صرف ہوں، مگر ریاستی پالیسی اور ترجیحات ابھی تک اس خواہش کی ہم نوا نظر نہیں آتی کیونکہ ایک طویل عرصے سے امریکا اور اسرائیل نے ایران پر جنگ ٹھونس رکھی ہے اور ایران سلامتی کے پیش نظر ملکی دفاع پر خطیر رقم خرچ کرنے کیلئے مجبور ہے۔

ایران کا ایک بڑا مطالبہ یہ ہے کہ اس کے منجمد اثاثے بحال کیے جائیں اور بین الاقوامی پابندیاں ختم کی جائیں۔ مگر امریکا کی جانب سے ایسی فراخ دلی

کا امکان کم دکھائی دیتا ہے۔ اور دن بدن اس مطالبے کو قبول کرنے کے امکانات محدود دکھائی دیتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں امید اور حقیقت کے درمیان خلیج وسیع ہو جاتی ہے اور مذاکرات کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ حائل ہو جاتی ہے۔

یہ تمام قضیہ اس حقیقت کی آئینہ داری کرتے ہیں کہ امریکا اور ایران کے درمیان تنازع محض چند نکات کا اختلاف نہیں، بلکہ نظریات، مفادات، طاقت اور تاریخ کا ایک ایسا پیچیدہ امتزاج ہے، جس کے بوجھ کا تصادم بالخصوص مشرق وسطیٰ اور بالعموم ساری دنیا کو تباہی کے کنارے پر لاکھڑا کیا ہے اور اب تو مشرق وسطیٰ کے عوام بھی برملا کہہ رہے ہیں کہ امریکا اس خطے میں اسرائیل کی بالادستی کیلئے ہمارے وسائل کو بھی لوٹ رہا ہے۔ یہ ایک ایسی داستان ہے جس کا ہر باب نئے سوالات کو جنم دیتا ہے، اور ہر کوشش کے باوجود اس کا انجام ابھی تک تحریر نہیں ہو سکا۔ یہ ایک ایسی گرہ ہے جسے کھولنے کیلئے صرف سفارت کاری نہیں، بلکہ اعتماد، بصیرت اور وقت — تینوں کی ضرورت ہے۔

یہ تمام تر منظر نامہ ایک تلخ حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے کہ دنیا آج بھی طاقت کے توازن کی بنیاد پر چل رہی ہے، انصاف اور انسانیت کے اصول ابھی تک عملی دنیا میں مکمل طور پر نافذ نہیں ہو سکے۔ یہ تنازعات، یہ جنگیں، یہ سفارتی کشمکشیں — یہ سب دراصل اس بات کا ثبوت ہیں کہ انسان ابھی تک اپنی فطری درندگی سے مکمل طور پر نجات حاصل نہیں کر سکا۔ مگر سوال یہ ہے کہ آخر کب تک؟ کب تک انسانیت کے نام پر انسانوں کے خون سے کھیل کھیلا جاتا رہے گا؟ کب تک معصوم جانیں طاقت کے ایوانوں کی نذر ہوتی رہیں گی؟ اور کب تک امن کی آواز کو بارود کی گھن گرج میں دبایا جاتا رہے گا؟

دنیا کی امن پسند قوتوں کیلئے یہ ایک لمحہ آزمائش ہے۔ اگر آج بھی وہ خاموش رہیں، تو تاریخ انہیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔ وقت کا تقاضا ہے کہ وہ میدانِ عمل میں آئیں، اور ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر ان ظالم اور جارح قوتوں کے سامنے کھڑی ہو جائیں جو اپنے مفادات کیلئے پوری دنیا کو تباہی کے دہانے پر لے آئی ہیں۔

امن کوئی کمزوری نہیں، بلکہ سب سے بڑی طاقت ہے۔ یہ وہ قوت ہے جو قوموں کو جوڑتی ہے، تہذیبوں کو پروان چڑھاتی ہے اور انسانیت کو بقا عطا کرتی ہے۔ اس کے برعکس جنگ ایک ایسی آگ ہے جو نہ صرف دشمن کو بلکہ خود اپنے وجود کو بھی جلا ڈالتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ عالمی برادری محض بیانات اور قراردادوں تک محدود نہ رہے، بلکہ عملی اقدامات کے ذریعے ان قوتوں کا سدباب کرے جو دنیا کو ایک نئے عالمی ایلیے کی طرف دھکیل رہی ہیں۔ یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ جب تک مفادات کی سیاست کو اصولوں کی سیاست پر فوقیت حاصل رہے گی، تب تک امن ایک خواب ہی رہے گا۔ اس خواب کو حقیقت میں بدلنے کیلئے ضروری ہے کہ عالمی نظام کو انصاف، مساوات اور باہمی احترام کی بنیادوں پر استوار کیا جائے۔

آج انسانیت ایک دورا ہے پر کھڑی ہے — ایک راستہ جنگ، تباہی اور بربادی کی طرف جاتا ہے، جبکہ دوسرا امن، استحکام اور بقا کی طرف — انتخاب ہمیں کرنا ہے۔ اگر ہم نے آج بھی خاموشی اختیار کی، تو کل تاریخ ہمارے بارے میں یہی لکھے گی کہ جب دنیا جل رہی تھی، ہم تماشائی بنے بیٹھے تھے۔ پس، وقت کی پکار یہی ہے کہ انسانیت کے علمبردار اٹھیں، ظلم کے خلاف آواز بلند کریں، اور اس دنیا کو ایک بار پھر امن کا گہوارہ بنانے کیلئے اپنی ذمہ داری ادا کریں کیونکہ اگر آج ہم نے انسانیت کو نہ بچایا، تو کل شاید انسانیت ہمیں بچانے کیلئے موجود نہ ہو۔

فی الحال، یہ کشتی بچ منجھڑھار میں سیاست کے طوفانی سمندر میں بچکولے کھارہی ہے، اور ساحل ابھی نگاہوں سے دور اور اوجھل توقعات اور امیدوں کے دم توڑنے کا پتہ دے رہا ہے مگر پھر بھی کچھ غیبی ہاتھ انسانیت کی بقاء کیلئے مسیحائی کا کردار ادا کر رہے ہیں اور عالمی طور پر پاکستان پر سب کی نگاہیں اٹکی ہوئی ہیں کہ کب دائمی جنگ بندی کی نامکمل داستان مکمل ہو کر دنیا میں امن کا پیام بن کر ابھرے۔

جمعرات 28 شوال المکرم 1447ھ / 16 اپریل 2026ء

خاموش سفارت کی بازگشت

عالمی سیاست کے افق پر جب کشیدگی کے بادل چھٹنے لگتے ہیں تو سفارت کاری کے چراغ از خود روشن ہو جاتے ہیں۔ عالمی سیاست کے پیچیدہ اور پر آشوب نامے میں بعض لمحات ایسے بھی آتے ہیں جب کشیدگی کے بادل چھٹنے لگتے ہیں اور افق پر مفاہمت کی ہلکی سی روشنی نمودار ہوتی ہے۔ یہی کیفیت منظر حالیہ ایام میں دیکھی گئی جب چین کی سرزمین پر پاکستان اور افغانستان کے درمیان سات روزہ مذاکرات کا انعقاد ہوا۔ یہ محض سفارتی سرگرمی نہ تھی بلکہ ایک ایسا تاریخی لمحہ تھا جس میں تلخیوں کے طویل سلسلے کو مکالمے کی شیرینی سے بدلنے کی سعی کی گئی۔ گویا یہ اجتماع الفاظ کا نہیں بلکہ ارادوں کا سنگم تھا۔ ایک ایسا سنگم جہاں ماضی کے زخموں پر مستقبل کے امکانات کا مرہم رکھا جا رہا تھا۔

یہی منظر حالیہ دنوں میں دیکھنے میں آیا جب چین کے خطہ اورچی میں پاکستان اور افغانستان کے درمیان سات روزہ مذاکرات کا انعقاد ہوا۔ یہ محض سفارتی سرگرمی نہ تھی بلکہ تاریخ کے دھند لکوں میں ایک ایسا چراغ تھا جس نے مستقبل کی راہوں کو منور کرنے کی جسارت کی۔ یہ محض نشست و برخاست نہ تھی بلکہ ایک ایسے عہد کی تمہید تھی جس میں بارود کی بو کے بجائے مکالمے کی مہک محسوس ہونے لگی ہے۔ گویا یہ نشست محض الفاظ کا تبادلہ نہ تھی بلکہ ارادوں کا امتحان اور نیتوں کا آئینہ تھی۔

امریکا اور ایران کے درمیان جنگ بندی نے اگرچہ وقتی طور پر عالمی فضا میں سکون پیدا کیا، مگر اس سکون کے پس پردہ طاقت کے توازن کی ایک نئی ترتیب جنم لے رہی تھی اور اسی پس منظر میں چین نے اپنی روایتی حکمت و دانائی کے ساتھ اسی موقع کو غنیمت جانتے ہوئے اپنی سفارتی بصیرت کا مظاہرہ کیا اور پاکستان و افغانستان کو ایک میز پر لا کر یہ پیغام دیا کہ مشرق اب محض تماشائی نہیں بلکہ عالمی سیاست کا فعال معمار ہے۔ چینی وزارت خارجہ کا ”جامع حل“ کا بیان دراصل ایک فکری دستاویز، اور ایک فکری منشور کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایسا منشور جس میں جزوی تدابیر کی بجائے ہمہ جہت حکمت عملی کی نقشہ جس میں مسائل کے جزوی نہیں بلکہ کلی حل کی جستجو نمایاں ہے۔ جو اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ مسائل کو سطحی نہیں جھلک دکھائی دیتی ہے، ایسا بلکہ گہرائی میں جا کر حل کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ اس امر کا اعلان بھی ہے کہ مسائل کا حل وقتی اقدامات سے نہیں بلکہ مستقل بنیادوں پر سوچنے سے ممکن ہے۔

پاکستان کا کردار اس پورے منظر نامے میں نہایت اہمیت کا حامل رہا ہے۔ امریکا اور ایران کے درمیان کشیدگی میں اس کی خاموش سفارت کاری ایک ایسے پل کی مانند تھی جس نے دو متحارب قوتوں کو وقتی طور پر قریب لانے میں مدد دی۔ پاکستان نے جہاں عالمی سطح پر امریکا و ایران کے درمیان مفاہمت میں ایک خاموش مگر مؤثر کردار ادا کیا، وہیں چین نے علاقائی سطح پر ثالثی کا فریضہ سنبھال کر ایک بار پھر اپنے ”مشرق کے دانا“ ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے ثالث کی حیثیت سے اپنے کردار کو اس مہارت سے نبھایا کہ دونوں فریق نہ صرف آمادہ گفتگو ہوئے بلکہ ایک مثبت فضا بھی قائم ہوئی۔ گویا چین نے علاقائی سطح پر ثالثی کا کردار ادا کرتے ہوئے نہ صرف اپنی سفارتی بصیرت کا مظاہرہ کیا بلکہ یہ بھی واضح کیا کہ اب عالمی طاقت کا توازن محض عسکری قوت سے نہیں بلکہ سفارتی حکمت سے طے ہو گا۔

ماضی کے برعکس اس بار مذاکرات میں تلخی کی جگہ ٹھہراؤ اور بے یقینی کی جگہ متوازن فضا اور احتیاط نے لے لی۔ گویا سفارت کاری نے جذبات پر غلبہ

پالیا ہو۔ گویا فریقین نے تلخی کے بجائے تدبیر کو ترجیح دی ہو۔ اگرچہ ماضی میں بھی پاک افغان مذاکرات کے کئی باب رقم ہو چکے ہیں، مگر اس باری فضا میں ایک سنجیدگی، ایک ٹھہراؤ اور ایک مثبت ارتعاش محسوس کیا جا رہا ہے۔ اہم سوال یہی ہے کہ آیا یہ مذاکرات محض الفاظ کی بازی گری ثابت ہوں گے یا واقعی حالات کو معمول پر لانے کا پیش خیمہ بنیں گے اور ایک مستقل امن کی بنیاد رکھیں گے؟؟ تاریخ گواہ ہے کہ نیتوں کی صداقت سے زندگی اور عمل کی استقامت ہی معاہدوں کو دوام بخشی ہے۔

اگر ارادے مضبوط ہوں تو معاہدے محض کاغذی نہیں رہتے بلکہ عملی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ تاریخ کا سبق یہی ہے تاہم اگر نیتوں میں کھوٹ ہو تو بہترین الفاظ بھی بے اثر ہو جاتے ہیں۔ یہی وہ نکتہ ہے جہاں ان مذاکرات کی کامیابی یا ناکامی کا دار و مدار ہے۔ اگر ان مذاکرات کے پیچھے اخلاص اور سنجیدگی موجود ہے تو بعید نہیں کہ یہ خطہ ایک نئے دور میں داخل ہو جائے۔ ایسا دور جہاں اختلافات کو تصادم کی بجائے مکالمے سے حل کیا جائے۔

اور محی میں ہونے والے یہ مذاکرات ایک خاموش دریا کی مانند تھے۔ بظاہر ساکت، مگر اندر ہی اندر گہرے بہاؤ کے حامل۔ یہ مذاکرات بظاہر خاموش ان کی معنوی گونج خطے کے طول و عرض اور دور تک سنائی دے رہی ہے۔ چین کی وزارت خارجہ کے مطابق دونوں ممالک نے گزشتہ برس تھے، مگر اکتوبر سے جاری کشیدگی کے خاتمے کیلئے ایک جامع حل تلاش کرنے پر اتفاق کیا ہے۔ یہ بیان اس امر کا مظہر ہے کہ اب وقتی تدابیر کی بجائے دیر پا حکمت عملی کی طرف پیش قدمی ہو رہی ہے۔ یہ بیان دراصل اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ اب وقتی اقدامات کی بجائے دیر پا امن اور مستقل امن کی تلاش کی جا رہی ہے۔ ایسا امن جو محض سرحدوں تک محدود نہ ہو بلکہ عوام کے دلوں تک پہنچے۔

چینی ترجمان کے الفاظ میں جو توازن اور وقار ہے، وہ سفارتکاری کے اعلیٰ اصولوں کی عکاسی کرتا ہے۔ دونوں ممالک کا یہ عہد کہ وہ کوئی ایسا قدم نہیں اٹھائیں گے جو صورت حال کو مزید پیچیدہ بنائے، دراصل ایک اخلاقی معاہدہ ہے۔ ایسا معاہدہ جو تحریری نہ ہونے کے باوجود اپنی معنوی قوت میں مضبوط ہے۔ گویا یہ اعلان نہیں بلکہ ایک اخلاقی میثاق ہے۔ ایسا میثاق جس میں تحمل، تدبیر اور توازن کی روح کار فرما ہے۔ چین کا مذاکراتی فریم ورک فراہم کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اس عمل کو وقتی نہیں بلکہ مسلسل اور مربوط سلسلہ دیکھنا چاہتا ہے۔

اجلاس میں اس حقیقت کو بھی تسلیم کیا گیا کہ جنوبی ایشیا کا امن، پاکستان اور افغانستان کے باہمی تعلقات سے مشروط ہے۔ دہشتگردی کو اس رشتے کی سب سے بڑی رکاوٹ قرار دینا دراصل اس ناسور کی نشاندہی ہے جو برسوں سے اس خطے کے جسم میں پیوست ہے، دوسرے الفاظ میں دہشتگردی کو اس رشتے کی سب سے بڑی رکاوٹ قرار دینا دراصل اس مرض کی تشخیص ہے جو برسوں سے اس خطے کو لاحق ہے۔ جب تک اس ناسور کا علاج نہیں کیا جاتا۔ چین دینا اس امر کا ثبوت ہے کہ توپ و تفنگ نہیں بلکہ گفتگو ہی مسائل کا حقیقی مداوا ہے۔ امن کی کوئی بھی کوشش ادھوری رہے گی۔ مکالمے کا مکالمے پر زور دینا دراصل اس اصول کی توثیق ہے کہ بندوبست کی گولی وقتی خاموشی تو لا سکتی ہے مگر دیر پا امن نہیں۔ یہ اس بات کا اعلان ہے کہ اب اور مشاورت پر زور بندوبست کی بجائے زبان اور دلیل کو ترجیح دی جائے گی۔

پاکستان کی جانب سے بظاہر خاموشی اختیار کرنا ایک معنی خیز حکمت عملی اور دانشمندانہ سکوت معلوم ہوتا ہے، جس میں شاید غور و فکر کی گونج پوشیدہ ہے۔ سفارتکاری میں بعض اوقات خاموشی ہی سب سے بلیغ بیان ہوتی ہے اور الفاظ سے زیادہ خاموشی بولتی ہے۔ اور سفارتکاری کے میدان میں یہ خاموشی اکثر حکمت کا پیر ہن اوڑھے ہوتی ہے۔ یہ خاموشی شاید اس بات کی غماز ہے کہ پس پردہ سنجیدہ غور و فکر جاری ہے اور کسی حتمی موقف سے قبل تمام



پہلوؤں کا بار یک بینی سے جائزہ لیا جا رہا ہے۔

اگرچہ مذاکرات میں اعلیٰ سطح کے نمائندے شریک نہیں تھے، تاہم سفیروں کی ملاقاتیں اور مثبت بیانات اس بات کا ثبوت ہیں کہ پس پردہ ایک سنجیدہ پیشرفت اور سفارتی عمل جاری و ساری ہے جو اس بات کا عندیہ ہے کہ پس پردہ ایک سنجیدہ پیش رفت جاری ہے۔ سفیروں کی ملاقاتیں اور مثبت بیانات اس خاموش سفارتکاری کے مظاہر ہیں۔ یہ وہ خاموش سفارتکاری ہے جو اکثر بڑے فیصلوں کی بنیاد بنتی ہے اور جس کے اثرات فوری طور پر نہیں بلکہ بتدریج ظاہر ہوتے ہیں۔ امید کی جاسکتی ہے کہ آنے والے مراحل میں یہ مذاکرات مزید اعلیٰ سطح تک پہنچیں گے۔

دوسری جانب پاکستان کا سکیورٹی بیانیہ اپنی جگہ واضح اور دو ٹوک ہے۔ دہشتگردی کے خلاف جاری آپریشن اس امر کی دلیل ہے کہ پاکستان اس مسئلے خلاف استعمال کا مسئلہ محض ایک شکایت نہیں بلکہ عارضی خطرہ نہیں بلکہ اپنی بقا سے جوڑ کر دیکھتا ہے۔ افغان سرزمین کے پاکستان کے کو محض سیاسی اور ایک دیرینہ خدشہ ہے جو دونوں ممالک کے تعلقات پر سایہ فگن رہا ہے جو اب ایک مطالبے کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ تجزیہ کاروں کے مطابق پاکستان کا بنیادی نکتہ یہی ہے کہ افغان سرزمین پاکستان کے خلاف استعمال نہ ہو۔ یہ مطالبہ دراصل قومی سلامتی کا استعارہ ہے۔

افغانستان کی جانب سے آنے والے مثبت بیانات اس بات کی علامت ہیں کہ وہ بھی اس مسئلے کے حل کیلئے سنجیدہ ہے۔ امیر خان متقی کے الفاظ میں امید کی کرن اور اعتدال کی جھلک ملتی ہے کہ معمولی اختلافات اس عمل کی راہ میں دیوار نہیں بنیں گے، جو اس امر کا ثبوت ہے کہ دونوں فریق اب تصادم کی بجائے تعاون کی راہ پر گامزن ہونا چاہتے ہیں۔ یہ بیان دراصل جہاں اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ اختلافات فطری ہیں، مگر ان کا حل ہی اصل دانشمندی ہے وہاں افغانستان کی جانب سے مثبت بیانات اس بات کی علامت ہیں کہ وہ بھی اس مسئلے کے حل کیلئے سنجیدہ ہے۔ امیر خان متقی کے الفاظ میں ایک امید جھلکتی ہے۔ ایسی امید جو اگر عملی اقدامات میں ڈھل جائے تو خطے کیلئے ایک نئی صبح کا آغاز ہو سکتا ہے۔

قطر میں افغان ترجمان سہیل شاہین کا محتاط بیان سفارتی نزاکت کا آئینہ دار ہے۔ تجزیہ نگاروں کے مطابق اس بار مذاکرات میں فریقین کا رویہ نسبتاً نرم اور شائستہ رہا، جو خوش آئند تبدیلی کا ثبوت ہے کہ دونوں ممالک اب ماضی کی تلخیوں کو پس پشت ڈال کر مستقبل کی طرف دیکھنا چاہتے ہیں۔ گویا تلخ یادوں کے باوجود مستقبل کی طرف ایک مثبت قدم بڑھایا جا رہا ہے۔

گزشتہ اکتوبر کی کشیدگی اس خطے کی تاریخ کے ناقابل یقین اور افسوس کے وہ اہم لمحات ہیں جب دو برادر مسلم ممالک کے درمیان دشمن اپنی چالوں میں کامیاب رہا اور کشیدگی، فضائی حملے اور جوابی کارروائیوں نے اس خطے کی تاریخ کے وہ ابواب رقم کئے جو خون آلود سطروں سے لکھے گئے۔ یہ اس امر کی یاد دہانی ہیں کہ جنگ کا راستہ ہمیشہ تباہی کی طرف لے جاتا ہے۔ یہی تجربہ اب دونوں ممالک کو مذاکرات کی اہمیت کا احساس دلارہا ہے۔ یہی پس منظر ان مذاکرات کو مزید اہم بناتا ہے، کیونکہ یہ محض حال کا نہیں بلکہ ماضی کے زخموں کا بھی مداوا ہیں۔

سرحدی بندش اور تجارتی تعطل نے دونوں ممالک کو معاشی اور سماجی سطح پر شدید متاثر کیا۔ تجارت کارک جانادرا اصل زندگی کی روانی کارک جانا، عوامی زندگی کیلئے جان لیوا ثابت ہو رہا ہے۔ اور یہی احساس اب دونوں فریقین کو مکالمے کی میز تک لے آیا ہے اور اب دونوں ممالک اس حقیقت کو تسلیم کر رہے ہیں کہ معاشی روابط کو سیاسی اختلافات سے الگ رکھنا ضروری اور ناگزیر ہے۔

اگرچہ باضابطہ اعلامیہ سامنے نہیں آیا، مگر سات روزہ مذاکرات اس بات کا ثبوت ہیں کہ بات چیت سنجیدگی سے ہوئی۔ یہ محض رسمی ملاقاتیں نہیں بلکہ ایک مسلسل مکالمہ تھا جس میں دونوں فریقین نے اپنے موقف کھل کر بیان کیے۔ یہ محض رسمی نشستیں نہیں بلکہ ایک مسلسل اور گہرا مکالمہ تھا۔ سات دن کا مسلسل مکالمہ اس بات کا ثبوت ہے کہ دونوں فریق سنجیدگی سے حل کے متلاشی ہیں۔

پاکستان کا موقف واضح ہے کہ وہ افغانستان میں موجود شدت پسند گروہوں کے خلاف ٹھوس کارروائی چاہتا ہے جو ایک عرصہ دراز سے دشمن ملک کی پر کسی وار کا آلہ کار بنے ہوئے ہیں اور پاکستان میں دہشتگردانہ کاروائیوں میں نہ صرف ملوث ہیں بلکہ ان حملوں کی مکمل ذمہ داری بھی قبول کرتے ہیں۔ پاکستان کا یہ مطالبہ اس کے داخلی امن اور استحکام سے جڑا ہوا ہے۔ اس مسئلے کو حل کیے بغیر کسی بھی قسم کی پیش رفت ممکن نہیں۔ یہ مطالبہ محض سیاسی دباؤ نہیں بلکہ ایک مسلسل تجربے کا نچوڑ ہے اور یہ مطالبہ اس کے داخلی امن سے جڑا ہوا ہے اور اس کے بغیر کسی بھی قسم کی پیش رفت ممکن نہیں۔

تحریک طالبان پاکستان کے حوالے سے پاکستان کا موقف نہایت واضح ہے۔ اسے دہشتگرد تنظیم قرار دینا اور اس کے نیٹ ورک کو ختم کرنا وہ اقدامات ہیں جو اعتماد کی بحالی کیلئے ضروری اقدامات ہیں۔ تحریک طالبان پاکستان کے حوالے سے پاکستان کا اصرار دراصل اس کے داخلی امن کا تقاضا ہے۔ جنگ بندی اور سرحد پار حملوں کی روک تھام ایسے نکات ہیں جو کسی بھی پائیدار امن کیلئے ناگزیر ہیں۔ اب اصل کسوٹی عملدرآمد ہے۔ اگر یہ مذاکرات اگلے مرحلے میں اعلیٰ سطح تک پہنچتے ہیں تو یہ اس بات کی دلیل ہوگی کہ ابتدائی بیچ نے جڑ پکڑ لی ہے اور یہی ان مذاکرات کی ایک بڑی کامیابی ہوگی۔ بصورت دیگر یہ بھی ماضی کی ناکام کوششوں کی فہرست میں شامل ہو سکتے ہیں۔

دیگر شدت پسند تنظیموں کا مسئلہ بھی اسی زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ جب تک ان عناصر کی سرگرمیاں کم نہیں ہوتیں، اعتماد کی فضا مکمل طور پر قائم نہیں ہو سکتی۔ ان کی سرگرمیوں میں کمی ہی اس بات کا ثبوت ہوگی کہ مذاکرات کامیاب ہو رہے ہیں۔ داعش اور القاعدہ جیسے عناصر اس خطے کیلئے مشترکہ خطرہ ہیں۔ اگرچہ القاعدہ کی سرگرمیاں محدود ہو چکی ہیں، مگر داعش ایک ابھرتا ہوا چیلنج ہے جس پر دونوں ممالک کو مشترکہ حکمت عملی اپنانا ہوگی۔ ان کے خلاف مشترکہ حکمت عملی ہی دیرپا امن کی ضمانت دے سکتی ہے۔

حالیہ دنوں میں حملوں میں کمی ایک مثبت اشارہ ہے۔ جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ شاید پس پردہ کچھ پیش رفت ہو رہی ہے۔ گویا طوفان کے بعد ایک ہلکی سی خاموشی، جو کسی بڑے تغیر کا پیش خیمہ بھی ہو سکتی ہے۔ شدت پسند عناصر کی نقل مکانی کی اطلاعات اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ کچھ عملی اقدامات کیے جا رہے ہیں، اگرچہ ان کی مکمل تفصیلات واضح طور پر سامنے نہیں آئیں۔ افغانستان کا موقف کہ تجارت کو سیاست سے الگ رکھا جائے، ایک عملی اور معقول اور حقیقت پسندانہ تجویز ہے۔ سرحدی راستوں کی بحالی دونوں ممالک کے عوام کیلئے فائدہ مند اور زندگی کی نئی راہیں کھول سکتی ہے۔

بالآخر، یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ نہ پاکستان طویل جنگ کا متحمل ہو سکتا ہے اور نہ افغانستان۔ امن ہی وہ واحد راستہ ہے جو دونوں کو استحکام کی منزل تک لے جاسکتا ہے۔ ماضی کی ناکام کوششیں اس بات کی یاد دہانی ہیں کہ صرف مذاکرات کافی نہیں، بلکہ نیت، اعتماد اور عمل کا امتزاج انتہائی ضروری ہے۔ تحریری ضمانت کا مطالبہ اور اس پر اختلاف، گزشتہ ناکامیوں کی ایک بڑی وجہ رہا۔ یہی وہ نکتہ ہے جہاں دونوں فریقین کے درمیان اعتماد کی کمی اور اختلاف واضح اور نمایاں ہو جاتا ہے۔ پاکستان کا مطالبہ اور افغان طالبان کا موقف دراصل دو مختلف زاویہ ہائے نظر کی عکاسی کرتے ہیں۔ ایک سلامتی کے تناظر میں سوچتا ہے، اور دوسرا خود مختاری اور نظریاتی وابستگی کے پس منظر میں۔

اور مچی مذاکرات اس طویل داستان کا ایک نیا باب ہیں اور چین کی ثالثی نے اس عمل کو ایک نئی جہت دی ہے۔ اگر یہ سلسلہ اسی سنجیدگی سے جاری رہا تو بعید نہیں کہ یہ خطہ، جو مدتوں سے اضطراب اور بے یقینی کا شکار رہا ہے، ایک دن امن و استحکام کا گہوارہ بن جائے۔ یہ مذاکرات محض سفارتی عمل نہیں بلکہ ایک امید ہیں۔ اور امید ہی وہ قوت ہے جو اگر حقیقت کا روپ دھار لے تو تاریخ کا دھارا بدل دیتی ہے۔

ہفتہ 30 شوال المکرم 1447ھ / اپریل 2026ء

نئے عالمی نظام کی پہلی گونج

عین قرین قیاس ہے کہ امریکا، اسرائیل اور ایران کے مابین برپا حالیہ کشمکش کو اُس نوخیز عالمی نظام کی اولین بڑی تمہیدی جنگوں میں شمار کیا جائے جو ابھی اپنی ہیئت و ماہیت متعین کرتے ہوئے اپنی فکری اور عملی تشکیل کے مراحل سے گزر رہا ہے۔ تاریخ کا چلن یہ رہا ہے کہ جب بھی عالمی طاقت کا توازن بدلتا ہے تو اس کی تمہید میدان جنگ میں لکھی جاتی ہے، اور اس کا مقدمہ سفارت کے ایوانوں میں۔ یہ وہ عہدِ نو ہے جس میں پرانے اصول، جو کبھی بین الاقوامی سیاست کے ستون سمجھے جاتے تھے، اب وقت کی گرد میں اپنی تاثیر کھوٹے محسوس ہوتے ہیں؛ گویا تاریخ کا پہیہ ایک نئے مدار میں داخل ہو چکا ہے جہاں ضابطے نہیں بلکہ طاقت کی نئی تعبیرات فیصلہ کن حیثیت اختیار کر رہی ہیں۔

تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ ہر نیا عالمی نظام کسی نہ کسی بڑے تصادم کی آغوش میں جنم لیتا ہے۔ جیسے یورپ کی مذہبی جنگوں نے قومی ریاست کے تصور کو جنم دیا اور پہلی دوسری عالمی جنگوں نے بین الاقوامی اداروں کی بنیاد رکھی، اسی طرح موجودہ کشمکش بھی ایک ایسے عہد کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے جہاں اصولوں کی بجائے طاقت کے نئے پیمانے متعین ہوں گے۔ یہ وہ لمحہ ہے جب عالمی سیاست ایک نئی لغت ترتیب دے رہی ہے، اور پرانے محاورے اپنی معنویت کھوٹے جا رہے ہیں۔

آج کا منظر نامہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ ایک ایسا عہد جس میں پرانے اصول گویا خزاں رسیدہ پتوں کی طرح جھڑتے محسوس ہوتے ہیں، اور نئی قدریں ابھی پوری طرح جڑ نہیں پکڑ سکیں۔ یہ کشمکش محض جغرافیائی یا عسکری نہیں بلکہ تہذیبی، فکری اور نظامی تبدیلی کی علامت ہے؛ گویا دنیا ایک نئے ”میشاقِ قوت“ کی جانب بڑھ رہی ہے۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد عالمی سیاست ایک ایسے منضبط سانچے میں ڈھلی رہی جس کی بنیاد بین الاقوامی قانون اور عالمی اداروں پر رکھی گئی تھی۔ اگرچہ اس عمارت میں کہیں کہیں دراڑیں بھی پڑیں، مگر ریاستیں عموماً اپنے اقدامات کو اسی نظام کے اندر رہتے ہوئے جائز قرار دینے کی سعی کرتی رہیں۔ یوں قانون اور قوت کا ایک نازک توازن قائم رہا۔ ایک ایسا توازن جو بظاہر ٹوٹنے لگا ہے۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد قائم ہونے والا عالمی نظام دراصل ایک تہذیبی معاہدہ تھا۔ وہ دراصل طاقت کو اخلاقی حدود میں مقید کرنے کی ایک شعوری کوشش تھی۔ ایک ایسا غیر تحریری عہد نامہ جس میں طاقت کو قانون کے تابع کرنے کی کوشش کی گئی۔ اقوام متحدہ، جنیوا کنونشنز، عالمی عدالت انصاف اور مختلف بین الاقوامی معاہدے اسی خواب کی تعبیر تھے کہ جنگ بھی قانون کے تابع ہو اور امن بھی اصولوں کا پابند۔ اگرچہ بڑی طاقتوں نے کئی مواقع پر ان اصولوں کو اپنے مفادات کے تابع اور اپنی مرضی کے مطابق ڈھالا، مگر وہ اس حقیقت سے انکار نہ کر سکیں کہ انہیں اپنے اقدامات کیلئے کسی نہ کسی قانونی و اخلاقی جواز کی ضرورت ہے اور اقرار کا یہ پہلو باقی رہا کہ قانون ایک حوالہ ہے، ایک میزان ہے جس پر عمل کو پرکھا جاسکتا ہے۔ یہی وہ اخلاقی جبر تھا جو طاقتور کو بھی کسی نہ کسی حد تک جواب دہ بنائے رکھتا تھا۔ یہی وہ تہذیبی پردہ تھا جو طاقت کو بے مہار ہونے سے روکتا تھا مگر اب یہی پردہ تار تار ہوتا دکھائی دیتا ہے، اور قانون کی کتابیں طاقِ نسیاں کی زینت بنتی جا رہی ہیں۔

ماضی میں عسکری کارروائی محض توپ و تفنگ کی گھن گرج نہ تھی بلکہ اس کے ساتھ سفارتی گفت و شنید، قانونی موٹوگافیاں اور اتحادوں کی شطرنج بھی بچھائی جاتی تھی بلکہ ایک مکمل بیانیہ تھی جس میں قانونی دلائل، سفارتی روابط اور اتحادوں کی بساط شامل ہوتی تھی جہاں سفارتی میزوں پر بھی ان کی بازگشت سنائی دیتی تھی۔ ہر عسکری اقدام کے ساتھ ایک سفارتی جواز بھی پیش کیا جاتا تھا تاکہ عالمی رائے عامہ کو مطمئن کیا جاسکے۔ ہر گولی کے پیچھے ایک دلیل ہوتی تھی، ہر حملے کے ساتھ ایک وضاحت پیش کی جاتی تھی۔

لیکن ایران کے حالیہ قیضے میں یہ تمام لوازمات ثانوی حیثیت اختیار کرتے دکھائی دیتے ہیں اور حالیہ ایرانی تنازع میں یہ روایت ماند پڑتی دکھائی دیتی ہے۔ اب فیصلے قانون کے ایوانوں میں نہیں بلکہ سٹریٹجک تھنک ٹینکس اور عسکری ہیڈ کوارٹرز میں کیے جاتے ہیں۔ گویا فیصلے اب خفیہ کمروں میں کیے جاتے ہیں جہاں قانون کی کتابیں نہیں بلکہ طاقت کے نقشے بچھے ہوتے ہیں۔ سفارت کاری کی جگہ سٹریٹجک حساب کتاب نے لے لی ہے۔ فیصلے اب قانون کی میزان پر نہیں بلکہ مفاد کے ترازو میں تولے جارہے ہیں۔ گویا دنیا ایک ایسے دور میں داخل ہو رہی ہے جہاں ”حق“ کی تعریف طاقت کے ہاتھ میں ہے۔

ایران کیلئے یہ طرز عمل کوئی اجنبی نہیں۔ ایران کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ اس نے ہمیشہ نامساعد حالات میں اپنی راہ خود متعین کی ہے۔ ایران کیلئے یہ حالات نئے نہیں۔ انقلاب 1979 کے بعد سے یہ ملک مسلسل عالمی پابندیوں، سیاسی تنہائی اور سفارتی دباؤ کا سامنا کرتا آیا ہے۔ دہائیوں سے پابندیوں اور تنہائی کے خارزار میں سفر کرتے ہوئے اس نے بقا کے ایسے قرینے سیکھ لیے ہیں جو رسمی عالمی ضوابط سے ماورا ہیں۔ اسی کڑے امتحان نے اسے ایک ایسی خود انحصاری عطا کی جو دیگر ممالک کیلئے مثال بھی ہے اور معمر بھی۔

اسی مسلسل آزمائش نے اسے ایک منفرد سٹریٹجک ذہن عطا کیا ہے۔ اس کی معیشت اور سفارت دونوں نے ایک متبادل نظام کا وضع کر لیا ہے۔ ایران نے غیر رسمی مالیاتی نیٹ ورکس، علاقائی اتحادوں اور متبادل تجارتی راستوں کے ذریعے اپنی معیشت کو زندہ رکھا۔ گویا اس نے عالمی نظام کے باہر ایک ذیلی نظام تشکیل دے لیا۔ ایک ایسا نظام جو پابندیوں کے حصار میں بھی سانس لے سکتا ہے۔ یہ ایک ایسی حکمت عملی ہے جو بظاہر غیر روایتی ہے مگر مؤثر ہے۔ گویا ایران نے عالمی نظام کے پہلو میں ایک متوازی نظام قائم کر لیا ہو۔

ایران کی تیل کی برآمدات اس کی معاشی شہ رگ ہیں، اور پابندیوں کے باوجود ان کا جاری رہنا اس کی حکمت عملی کی کامیابی کا ثبوت اور اس کی معاشی استقامت کی روشن مثال ہے۔ حیرت انگیز امر یہ ہے کہ کڑی عالمی پابندیوں کے باوجود ایران نے نہ صرف اپنی تیل کی برآمدات جاری رکھیں بلکہ بعض اوقات وسعت بھی دی اور خطے میں اپنا اثر و رسوخ بھی برقرار رکھا۔ گویا اس نے ثابت کیا کہ اگر ارادہ صیقل ہو تو بند دروازوں میں بھی راستے نکل آتے ہیں۔ یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جو محض معاشی تدبیر نہیں بلکہ سیاسی بصیرت کا مظہر بھی ہے۔ یہ امر اس بات کا غماز ہے کہ عالمی نظام کی سخت ترین رکاوٹیں بھی مستقل عزم کے سامنے کمزور پڑ سکتی ہیں۔ ایران نے یہ ثابت کیا کہ اگر ریاستی ارادہ مضبوط ہو تو عالمی دباؤ بھی اس کی سمت متعین نہیں کر سکتا۔ ایران نے ثابت کیا کہ عالمی نظام کے دروازے بند ہوں تو کھڑکیاں تلاش کی جاسکتی ہیں۔ اور اگر کھڑکیاں بھی بند ہوں تو دیواروں میں راستے بنائے جاسکتے ہیں۔

ایران کی سٹریٹجک ثقافت میں کشیدگی کو ایک فن کے طور پر برتا جاتا ہے۔ ایران کی سٹریٹجک ثقافت میں ”حساب شدہ کشیدگی“ ایک کلیدی تصور ہے۔ ایران کی سٹریٹجک ثقافت دراصل صبر و تدبر اور نفسیاتی دباؤ کا ایک حسین امتزاج ہے۔ وہ تصادم کو ایک فن کی طرح برتتا ہے، جس میں شدت



اور اعتدال دونوں کا خیال رکھا جاتا ہے۔ وہ تصادم کو اس حد تک بڑھاتا ہے جہاں دشمن کیلئے قیمت بڑھ جائے، مگر آگ اس درجہ نہ بھڑکے کہ پورا خطہ لپیٹ میں آجائے۔ اس کی حکمت عملی میں رد عمل بھی نپاٹا ہوتا ہے اور پیغام بھی گہرا — دباؤ بڑھاؤ، مگر دروازہ بند نہ کرو۔

اس کا مقصد دشمن کو مکمل طور پر شکست دینا نہیں بلکہ اسے اس نہج پر لے آنا ہے جہاں وہ خود مفاہمت پر آمادہ ہو جائے۔ یہ حکمت عملی بظاہر کمزور دکھائی دیتی ہے مگر درحقیقت اس میں ایک گہری بصیرت پوشیدہ ہے — کہ ہر جنگ جیتنا ضروری نہیں، بعض اوقات جنگ کو طول دینا ہی کامیابی ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسا

طرز عمل ہے جس میں ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھایا جاتا ہے، اور ہر رد عمل ایک پیغام لیے ہوتا ہے۔ گویا ایران جنگ کو محض لڑنا نہیں بلکہ اسے ایک فن کے طور پر برتنا ہے

دوسری طرف اسرائیل کا مزاج اس سے مختلف ہے۔ اس کی عسکری فکر اس کے برعکس ایک فوری اور فیصلہ کن رد عمل اور جارحیت پر مبنی ہے اور وہ پیشگی حملہ اور برق رفتار فیصلہ کن کارروائی کو اپنے آقا اور مربی امریکا کی شہ پر پڑوسی ملکوں کو تاراج کرنا اپنا بنیادی حق سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک اپنی جارحیت کو جائز قرار دینے کیلئے عالمی طور پر پروپیگنڈے کا سہارا لیتے ہوئے خطے میں اپنی بالادستی قائم رکھنے کیلئے ہزاروں افراد کو تہ تیغ کر دینا جائز سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی حکمت عملی میں پیشگی حملے اور طاقت کا بھرپور استعمال مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسرائیل کی تاریخ، جو مسلسل خطرات اور جنگوں سے عبارت ہے، اس سوچ کو تقویت دیتی ہے کہ بقا کیلئے جارحیت بھی ایک دفاعی ہتھیار ہو سکتی ہے۔ اس کے نزدیک دفاع اور سلامتی کے نام پر خوفناک حملے ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ گویا بقا کی جنگ میں اخلاقی ابہام کی کوئی جگہ نہیں۔

غزہ اور دیگر تنازعات میں اسرائیل کی کارروائیوں نے اسے عالمی قانونی فورمز کے کٹھنرے میں لاکھڑا کیا ہے۔ عالمی عدالت انصاف اور بین الاقوامی فوجداری عدالت جیسے ادارے اب اس کے اقدامات کا جائزہ لے رہے ہیں۔ مگر اس سب کے باوجود اسرائیل کا موقف یہی ہے کہ اس کی سلامتی ہر اصول پر مقدم ہے۔ امریکا کی غیر متزلزل حمایت اور پشت پناہی اس موقف کو مزید مضبوط بناتی ہے، جس سے عالمی نظام کے توازن پر سوالات اٹھتے ہیں۔ یہ صورتحال عالمی نظام میں عدم توازن کی نشاندہی کرتی ہے، جہاں قانون کا اطلاق یکساں نہیں رہتا۔

امریکا کا کردار اس پوری داستان میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ نہ صرف اس نظام کا حصہ ہے بلکہ اس کا معمار بھی ہے اور نگران بھی، جس کے تحت دنیائے دہائیوں تک سانس لی۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد اس نے عالمی اداروں، عسکری اتحادوں اور قانونی اصولوں کی ایسی بساط بچھائی جس سے اس کا اثر و نفوذ عالمی سطح پر مستحکم ہوا۔ اس نے عالمی سیاست کے قواعد و ضوابط وضع کیے اور ان کے ذریعے اپنی برتری کو برقرار رکھا مگر اب جب وہ خود ان اصولوں سے انحراف کرتا دکھائی دیتا ہے اور اب اس کے رویے میں ایک تبدیلی محسوس ہوتی ہے۔ اب یہ سوال جنم لیتا ہے کہ جب معمار ہی اپنے اصولوں سے انحراف کرنے لگے تو عمارت کی بنیادیں ہلنا فطری امر ہے۔ کیا معمار اپنی ہی تعمیر کو منہدم کرنے پر آمادہ ہو چکا ہے؟

عراق جنگ اس تضاد کی ایک نمایاں مثال تھی۔ 2003ء میں عراق پر حملہ وہ لمحہ تھا جب امریکانے اس نظام سے صریحاً انحراف کیا، امریکانے اس جنگ کو عالمی اتحاد کے پردے میں پیش کیا، حالانکہ اس کے قانونی جواز پر شدید اختلاف موجود تھا۔ یہ وہ لمحہ تھا جب اصول اور مفاد کے درمیان خلیج واضح ہونے لگی۔ مگر اس وقت بھی ایک کوشش موجود تھی کہ عالمی نظام کا لبادہ برقرار رکھا جائے، اصولوں کا احترام کمزور ضرور ہوا مگر مکمل طور پر ختم نہ ہو گیا اصولوں سے انحراف بھی اصولوں کے پردے میں کیا گیا۔ یہی اس نظام کی اخلاقی نزاکت تھی۔

تاہم موجودہ تضاد میں یہ پردہ بھی چاک ہو تا دکھائی دیتا ہے۔ بیانات میں وہ سفارتی شائستگی باقی نہیں رہی جو کبھی بڑی طاقتوں کا طرہ امتیاز اور سفارت کاری کا خاصہ تھی۔ اب الفاظ میں بھی وہی شدت در آئی ہے جو میدان جنگ میں نظر آتی ہے۔ اور بعض اوقات جارحانہ بیانیہ گولی سے زیادہ زخم دیتا ہے۔ یہ تبدیلی عالمی سیاست کے مزاج میں ایک گہری تبدیلی کی عکاس ہے۔ گویا زبان بھی بارود کی بو سے آشنا ہو گئی ہے۔ اب الفاظ بھی ہتھیار بن چکے ہیں۔ تیز، بے باک اور کبھی کبھی بے مہار۔ یہ تبدیلی اس بات کی علامت ہے کہ عالمی سیاست کا مزاج تبدیل ہو رہا ہے۔ اس نئے عہد میں معاشی ہتھیار بھی تلوار کی طرح استعمال ہو رہے ہیں۔ محصولات، تجارتی پابندیاں اور مالیاتی دباؤ۔ یہ سب محض معاشی تدابیر نہیں بلکہ سیاسی حربے بن چکے ہیں، اور دوست و دشمن کی تمیز بھی دھندلا گئی ہے۔ معاشی ہتھیار بڑا دھواں، ارحانہ اور تلوار کی طرح استعمال ہو رہے ہیں بلکہ ٹیرف، پابندیاں اور مالیاتی دباؤ اب صرف اقتصادی پالیسی نہیں بلکہ سیاسی حکمت عملی اور دباؤ کے ہتھیار بن چکے ہیں۔ یہ ایک ایسا میدان ہے جہاں جنگ بغیر گولی چلائے لڑی جاتی ہے، مگر اس کے اثرات کسی بھی عسکری کارروائی سے کم نہیں ہوتے۔ یہ ایک خاموش جنگ ہے جس کے اثرات دور رس اور گہرے ہوتے ہیں۔

امریکا کی جانب سے اپنے اتحادیوں پر دباؤ اس بات کا ثبوت ہے کہ عالمی نظام کے اندرونی تضادات بڑھ رہے ہیں اور عالمی نظام کے ستونوں میں دراڑیں پڑ گئی ہیں جو خود اپنی بنیادوں کو ہلا رہے ہیں۔ جب اتحادی بھی ایک دوسرے پر اعتماد کھودیں تو نظام کی بنیادیں کمزور ہو جاتی ہیں۔ اگر معمار ہی دیواروں کو کمزور کرنے لگے تو عمارت کی پائیداری پر سوال اٹھنا فطری امر ہے۔ یہ صورتحال ایک ایسے مستقبل کی طرف اشارہ کرتی ہے جہاں ہر ملک اپنی بقا کیلئے خود ہی راستہ تلاش کرے گا۔

ایران نے ماضی میں اپنی کارروائیوں کو ایک حد کے اندر رکھا، حتیٰ کہ 12 روزہ جنگ جیسے مواقع پر بھی اس نے اپنی سرخ لکیروں کا لحاظ کیا، ہمیشہ اپنی کارروائیوں کو ایک حد کے اندر رکھا۔ یہ احتیاط اس کی حکمت عملی کا حصہ تھی تاکہ تصادم قابو سے باہر نہ ہو۔ یہ طرز عمل اس کی سیاسی بصیرت کا عکاس اور سٹریٹجک بصیرت کا مظہر تھا کہ وہ تصادم کو قابو میں رکھتا تھا مگر حالیہ جنگ میں یہ توازن متزلزل دکھائی دیتا ہے۔ امریکا اور اسرائیل نے باقاعدہ ملی بھگت سے ایران پر جارحانہ حملے کر کے اس کی قیادت کے 50 سے زائد افراد کو شہید کر دیا اور اب تک بقول ٹرمپ کے ایران کو تاراج کرنے کیلئے 8 ہزار سے زائد خوفناک فضائی حملے کر کے ہزاروں مقامات کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ قیادت کے نقصان کے بعد ایران کا رد عمل زیادہ وسیع اور شدید ہو گیا اور بڑھتے ہوئے دباؤ نے ایران کو ایک زیادہ جارحانہ رد عمل پر مجبور کر دیا ہے۔ خلیج کے پانیوں سے لے کر عالمی منڈیوں تک اس کے اثرات محسوس کیے گئے۔ آبنائے ہرمز میں خلل نے یہ ثابت کر دیا کہ علاقائی جنگ بھی عالمی معیشت کو ہلا سکتی ہے؛ گویا ایک چنگاری نے عالمی بازار کو لرزادیا۔ آبنائے ہرمز میں خلل اور عالمی منڈیوں پر اثرات اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ تنازع اب محض علاقائی نہیں رہا بلکہ عالمی سطح پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ آبنائے ہرمز میں خلل اور عالمی منڈیوں پر اثرات اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ تنازع اب عالمی معیشت کو بھی متاثر کر رہا ہے۔ گویا ایک علاقائی چنگاری نے عالمی نظام کو لرزادیا ہے۔

بڑی طاقتیں اس صورت حال سے اپنے اپنے نتائج اخذ کر رہی ہیں اور اپنے اپنے زاویے سے دیکھ رہی ہیں روس کیلئے توانائی کی بڑھتی قیمتیں ایک بہترین معاشی موقع ہیں، جبکہ چین اس پورے منظر نامے کو ایک سٹریٹجک تجربہ گاہ کے طور پر دیکھ رہا ہے۔ کہ عالمی اصول کس طرح بدلتے ہیں اور طاقت کا توازن کس سمت جھکتا ہے۔ ہر طاقت اس بحران سے اپنے لیے راستے تلاش کر رہی ہے اور اپنے مفادات کے مطابق نتائج اخذ کر رہی ہے۔

یورپ اس تمام منظر نامے میں ایک کمزور کردار کے طور پر سامنے آرہا ہے اور اس تمام ہنگامے میں ایک خاموش ناظر دکھائی دیتا ہے۔ یورپ کی محدود حیثیت اس بات کی عکاسی کرتی ہے کہ عالمی سیاست میں اس کا کردار کمزور پڑتا جا رہا ہے۔ وہ اب فیصلہ ساز نہیں بلکہ ایک مبصر بن کر رہ گیا ہے۔ سفارتی کوششوں کے باوجود وہ فیصلہ سازی میں نمایاں کردار ادا نہیں کر پا رہا۔ یہ اس کے عالمی اثر و رسوخ میں کمی کی علامت ہے، جیسے شطرنج کی بساط پر ایک ایسا کھلاڑی جس کے مہرے حرکت سے محروم ہو گئے ہوں۔

بالآخر یہ سوال ابھر کر سامنے آتا ہے کہ کیا موجودہ عالمی نظام اپنی عمر پوری کر چکا ہے؟ یہ تصادم محض ایک علاقائی جنگ نہیں بلکہ اس عالمی نظام کے مستقبل کا سوال ہے جو 1945 کے بعد قائم ہوا تھا۔ اگر اصولوں کی جگہ طاقت نے لے لی تو دنیا ایک ایسے دور میں داخل ہو سکتی ہے جہاں قانون کی بجائے قوت کا راج ہو۔ یہ ایک ایسا منظر نامہ ہے جہاں ریاستیں اپنے فیصلے عالمی اصولوں کے بجائے اپنی طاقت، مفاد اور بقا کے تقاضوں کے تحت کریں گی اور تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جب اصول کمزور پڑ جائیں تو تصادم ناگزیر ہو جاتا ہے۔ تاریخ بخایہ بھی ایک تلخ سبق ہے کہ ایسے ادوار عموماً عدم استحکام اور انتشار کا پیش خیمہ ہوتے ہیں۔

اگر یہ ڈھانچہ مزید کمزور ہو تو دنیا ایک ایسے عہد میں داخل ہو سکتی ہے جہاں اصولوں کی جگہ محض طاقت کا راج ہو اور تاریخ ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ جب قانون کی روشنی مدھم پڑ جائے تو طاقت کا اندھیرا سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ بھی جو کبھی اس روشنی کے امین تھے۔

یہ تمام نکات مل کر ایک ایسی تصویر پیش کرتے ہیں جو نہ صرف موجودہ عالمی سیاست کی عکاسی کرتے ہیں بلکہ مستقبل کے خدو خال بھی واضح کرتے ہیں۔ ایک ایسا مستقبل جو غیر یقینی، پیچیدہ اور شاید پہلے سے زیادہ خطرناک ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ دنیا ایک نئے عہد کے دہانے پر کھڑی ہے۔ ایک ایسا عہد جو غیر یقینی، پیچیدہ اور شاید پہلے سے زیادہ خطرناک ہے؛ مگر اسی میں مستقبل کے امکانات بھی پوشیدہ ہیں۔

جب اعتماد ٹوٹ جائے

انسانی تاریخ کے طویل و پیچیدہ سفر میں کچھ لمحے ایسے آتے ہیں جو محض واقعات نہیں ہوتے بلکہ تقدیر کے دھارے کو موڑ دینے والے سنگ میل بن جاتے ہیں۔ یہ وہ ساعتیں ہوتی ہیں جب زمانہ خود اپنے آپ سے سوال کرتا ہے، جب تہذیب اپنے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنے پر مجبور ہوتی ہے، اور جب انسان کو یہ طے کرنا پڑتا ہے کہ وہ روشنی کا وارث بنے گا یا تاریکی کا اسیر۔ آج کی دنیا بھی ایک ایسے ہی دہانے پر کھڑی ہے۔ جہاں بارود کی بوفضا میں رچی ہوئی ہے، مگر انسانیت کی سانس اب بھی امید کے سہارے چل رہی ہے۔

یہ مضمون محض الفاظ کا مجموعہ نہیں، بلکہ ایک فکری پکار ہے۔ ایک ایسی صدا جو تاریخ کے اوراق سے ابھر کر حال کے ایوانوں میں گونج رہی ہے۔ یہ اس عہد کا نوحہ بھی ہے اور اس کی اصلاح کا امکان بھی، یہاں سیاست کی بے رحمی بھی ہے اور انسانیت کی مظلومیت بھی، یہاں طاقت کا غرور بھی ہے اور امن کی خاموش التجا بھی۔

قاری جب ان سطور میں داخل ہو گا تو وہ خود کو محض ایک مبصر نہیں بلکہ اس داستان کا حصہ محسوس کرے گا۔ ایسی داستان جس میں ہر انسان کی قسمت جڑی ہوئی ہے، ہر دل کی دھڑکن شامل ہے، اور ہر آنے والی نسل کا مستقبل پوشیدہ ہے۔ یہ تحریر آپ سے صرف پڑھنے کا تقاضا نہیں کرتی، بلکہ سوچنے، محسوس کرنے اور فیصلہ کرنے کی دعوت دیتی ہے کیونکہ یہ وہ لمحہ ہے جب خاموشی بھی جرم بن سکتی ہے، اور ایک آواز تاریخ کا دھار ابدل سکتی ہے۔

عصر نو کی سیاست اپنے باطن میں ایک عجیب اضطراب لیے ہوئے ہے۔ گویا تہذیب کے چہرے پر مسکراہٹ ہے مگر آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں لرز رہی ہیں۔ طاقت کی اس بساط پر جہاں قومیں اپنے مفادات کی شطرنج کھیل رہی ہیں، وہاں اصول، اخلاق اور عالمی معاہدے اکثر محض کاغذی حوالہ بن کر رہ جاتے ہیں۔ گویا ایک ایسا شطرنج خانہ ہے جہاں مہرے انسان ہیں اور چالیں تقدیروں کو بدل دیتی ہیں۔ تاریخ کے اوراق جب پلٹے جاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قوت و اقتدار کی اس کشمکش میں عقل کی صدا اکثر تلواروں کی جھنکار میں دب جاتی ہے۔

امریکا اور اسرائیل کی جانب سے ایران کے خلاف حالیہ جنگ بھی اسی تسلسل کی ایک کڑی ہے۔ ایسی کڑی جس کے حلقے صرف مشرق وسطیٰ ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کے گرد تنگ ہوتے جا رہے ہیں۔ امریکا اور اسرائیل کی ایران کے خلاف جارحیت اسی عالمی کشمکش کا ایک ایسا باب ہے جس نے نہ صرف مشرق وسطیٰ بلکہ پوری دنیا کے فکری، سیاسی اور عسکری توازن کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ یہ معاملہ محض ایک جنگ نہیں، بلکہ ایک ایسا سنگ میل ہے جہاں سے عالمی تاریخ ایک نئے رخ پر مڑ سکتی ہے۔

زیر نظر گزارشات میں ہم اس قضیے کو محض واقعاتی ترتیب کے طور پر نہیں بلکہ ایک فکری و تہذیبی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کریں گے، جہاں سیاست نہ صرف اپنی معنویت کے ساتھ اور تاریخ اپنی عبرت کے ساتھ جلوہ گر ہو بلکہ اس انداز میں کہ فکر کی گہرائی، زبان کی لطافت اور تاریخ کی سنجیدگی ایک دوسرے میں یوں مدغم ہو جائیں جیسے دریا سمندر میں جا گرتا ہے۔

کیا یہ جنگ جو ہری دوڑ کا پیش خیمہ بن سکتی ہے؟ یہ سوال محض ایک سیاسی تجزیہ یا سوال نہیں بلکہ انسانی بقا کے باب میں ایک بنیادی استفسار میں سے ایک ہے۔ جب طاقت کے ایوانوں میں یہ تصور جڑ پکڑ لے کہ امن کی ضمانت اخلاقی اصولوں یا سفارتی معاہدوں میں نہیں بلکہ تباہی کے ہتھیاروں میں مضمر

ہے، تو گویا تہذیب کا چراغ ہوا کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ جب اقوام اپنے تحفظ کیلئے روایتی سفارت کاری اور اجتماعی سلامتی کے نظام پر اعتماد کھو بیٹھیں، تو وہ لازماً ایسے ذرائع کی طرف مائل ہوتی ہیں جو فوری اور قطعی تحفظ کا تاثر دیتے ہوں۔

جوہری ہتھیار اسی "حتمی تحفظ" کا استعارہ بن چکے ہیں۔ امریکا اور اسرائیل کا ایران کے خلاف جارحیت بظاہر ایک روک تھام کی پالیسی کا بہانہ تھا، مگر اس کے مضمرات اس کے برعکس ہو سکتے ہیں۔ یہ اقدام دراصل دنیا کے دیگر ممالک کیلئے ایک خاموش پیغام ہے کہ اگر آپ کے پاس طاقت نہیں تو آپ غیر محفوظ ہیں۔ یہ سوچ ایک ایسی دوڑ کو جنم دے سکتی ہے جس میں ہر ملک خود کو ایٹمی قوت بنانے کی کوشش کرے گا، اور یوں دنیا ایک بار پھر سرد جنگ کے سائے میں داخل ہو سکتی ہے۔ مگر اس بار زیادہ غیر یقینی، زیادہ خطرناک اور زیادہ بے قابو انداز میں۔

امریکا اور اسرائیل کی ایران کے خلاف جارحیت اک بار پھر دنیا کو دھوکہ دینے کے مترادف تھی اور اس کے باطن میں ایک ایسا پیغام پوشیدہ ہے جو دنیا کے کمزور اور متوسط ممالک کیلئے نہایت خطرناک ہے "اپنے تحفظ کیلئے خود کو مسلح کرو، خواہ اس کی قیمت انسانیت ہی کیوں نہ ہو۔ یہی وہ نکتہ ہے جہاں سے جوہری دوڑ کا آغاز ہوتا ہے۔ خوف کے بطن سے جنم لینے والی ایک ایسی دوڑ، جس کی منزل تباہی کے سوا کچھ نہیں۔

ایک ماہ سے زائد عرصہ گزرنے کے باوجود یہ جنگ اپنی بازگشت میں مسلسل وسعت اختیار کر گئی۔ یہ بازگشت صرف بارود کی گونج نہیں بلکہ خوف، عدم اعتماد اور شکوک کی وہ فضا بن گئی جس نے عالمی سیاست کو اپنے حصار میں لے کر ایٹمی خطرات سے دوچار کر دیا۔ ایک ماہ سے زائد عرصہ گزرنے کے باوجود اس جنگ کے اثرات ابھی تک پوری طرح واضح نہیں ہوئے، مگر افاق پر ابھرنے والے سائے اب بھی کسی بڑے طوفان کی خبر دیتے ہیں۔ جوہری عدم پھیلاؤ کے ماہرین اس خدشے کا اظہار کر رہے ہیں کہ ایران ہی نہیں بلکہ دیگر ممالک بھی اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ روایتی ہتھیار یا سفارت کاری اب ناکافی ہو چکی ہے۔ جوہری عدم پھیلاؤ کے ماہرین اس بات کی بھی نشاندہی کر رہے ہیں کہ یہ تنازع دیگر ممالک کیلئے ایک سبق بن سکتا ہے۔ اور وہ یہ کہ اگر آپ کے پاس ایٹم بم نہیں تو آپ کی خود مختاری خطرے میں ہے۔ یہ سوچ عالمی نظام کیلئے نہایت مہلک ہے، کیونکہ یہ اس اصول کو چیلنج کرتی ہے جس پر گزشتہ کئی دہائیوں سے عالمی امن کی عمارت کھڑی کی گئی تھی اور آج ہم اس دور میں پہنچ گئے ہیں جہاں عالمی نظام کی بنیادیں لرزتی محسوس ہوتی ہیں۔ جب ریاستیں یہ سوچنے لگیں کہ انصاف کے بجائے طاقت ہی بقا کی ضامن ہے، تو پھر قانون جنگل اپنی پوری سفاکی کے ساتھ نمودار ہوتا ہے۔

امریکا طویل عرصے سے اپنے اتحادیوں کیلئے ایک محافظ کے طور پر پیش کیا جاتا رہا ہے۔ مگر حالیہ واقعات نے اس تصور میں دراڑ ڈال دی ہے۔ جب مشرق وسطیٰ کے ممالک ایران کے جوابی حملوں کی زد میں آئے، تو یہ سوال شدت اختیار کر گیا کہ کیا امریکا اپنے اتحادیوں کی سلامتی کا واقعی ضامن ہے؟ متحدہ عرب امارات سے لے کر سعودی عرب تک، کئی ممالک ایران کے جوابی حملوں کی زد میں آ چکے ہیں۔

اس صورتحال نے ایک نئی فکری تبدیلی اور انقلاب کو جنم دے دیا ہے۔ ایسا انقلاب جس میں ریاستیں اپنی سلامتی کیلئے بیرونی طاقتوں پر انحصار ترک کر کے خود انحصاری کی طرف مائل ہوں۔ وہ تبدیلی جس میں ریاستیں یہ سمجھنے لگیں کہ دوسروں کے سائے میں کھڑا ہونا دراصل اپنی کمزوری کا اعتراف ہے۔ چنانچہ مقامی سطح پر جوہری صلاحیت کا حصول ایک "ضرورت" کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے، نہ کہ محض ایک "انتخاب" کے طور پر اور اس خود انحصاری کا سب سے نمایاں مظہر جوہری صلاحیت ہو سکتا ہے۔

یہ ایک عجیب ستم ظریفی اور المیہ ہے کہ جس جنگ کا مقصد ایران کو ایٹم بم بنانے سے روکنا تھا، وہی جنگ ایران کو اس سمت میں دھکیل سکتی ہے۔ سیاسیات کا یہ المیہ نیا نہیں؛ تاریخ گواہ ہے کہ اکثر طاقتور اقوام اپنے اقدامات سے وہی نتائج پیدا کرتی ہیں جن سے بچنے کا دعویٰ کرتی ہیں، اور تاریخ میں ایسے واقعات کی بھی کمی نہیں جہاں طاقت کے استعمال نے مسائل کو حل کرنے کی بجائے مزید پیچیدہ بنا دیا ہو۔ ایران کی قیادت اب اس سوال سے دوچار ہے کہ آیا وہ اپنی بقا کیلئے وہی راستہ اختیار کرے جسے وہ اب تک رد کرتی آئی تھی۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو یہ عالمی سیاست کی ایک بڑی ناکامی ہوگی۔ ایران کی قیادت اب اس سوال سے دوچار ہے کہ آیا مستقبل میں اپنی بقا کیلئے اسے وہی راستہ اختیار کرنا چاہیے جس سے اسے روکا جا رہا تھا۔

یہ بحران کسی ایک لمحے کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک طویل سلسلہ غلط فیصلوں کا حاصل ہے۔ مذاکرات جاری تھے، امکانات موجود تھے، سفارتی راستے کھلے تھے، مگر طاقت کے نشے نے تدبیر کی راہوں کو مسدود کر دیا۔ یہاں یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ جنگ دراصل سفارت کاری کی ناکامی کا دوسرا نام ہے۔ جب مکالمہ ختم ہو جاتا ہے تو خطرناک بموں کی زبان بولنے لگتی ہے۔ اور یہ زبان ہمیشہ خون آلود ہوتی ہے۔ یہاں ہمیں یہ تسلیم کرنا ہو گا کہ جنگ اکثر ناکامی سیاست کا اعتراف ہوتی ہے، اور جب سیاست ناکام ہو جائے تو اس کے بلے تلے انسانیت دفن ہو جاتی ہے۔

سعودی عرب پہلے ہی واضح کر چکا ہے کہ اگر ایران جوہری ہتھیار حاصل کرتا ہے تو وہ بھی اسی راستے پر چلے گا۔ یہ اعلان دراصل ایک انتباہ ہے۔ ایسا انتباہ جو پورے خطے کو ایک خطرناک دوڑ میں جھونک سکتا ہے۔ دراصل یہ ایک خطرناک سلسلے کی ابتدا ہو سکتی ہے۔ اگر ایک ملک یہ قدم اٹھاتا ہے تو دیگر ممالک بھی اس کی پیروی کریں گے۔ یہ صورت حال ایک ایسے "ڈومینو ایفیکٹ" کو جنم دے سکتی ہے جہاں ایک کے بعد ایک ملک جوہری ہتھیاروں کی طرف بڑھتا جائے گا، یوں ایک چنگاری پورے جنگل کو اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہے۔ اور پورا خطہ ایک بارود کے ڈھیر میں تبدیل ہو جائے گا۔

ایران کا جوہری پروگرام ہمیشہ سے عالمی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ اگرچہ اس نے عدم پھیلاؤ کے معاہدے پر دستخط کر رکھے ہیں، مگر اس کے پروگرام پر شکوک و شبہات برقرار رہے ہیں۔ یہ مسئلہ دراصل ٹیکنالوجی سے زیادہ اعتماد کا ہے۔ عالمی سیاست میں اعتماد ایک نایاب شے بن چکا ہے، اور جب اعتماد ختم ہو جائے تو ہر اقدام مشکوک نظر آنے لگتا ہے۔ یاد رکھیں کہ اعتماد وہ شے ہے جو ایک بار ٹوٹ جائے تو پھر آسانی سے بحال نہیں ہوتا۔

ایران کا دعویٰ ہے کہ اس کا پروگرام پر امن مقاصد کیلئے ہے، مگر افزودگی کی سطح اور نگرانی کے مسائل نے اس موقف کو کمزور کیا ہے اور عالمی طاقتیں اس پر یقین کرنے کو تیار نہیں۔ یہ بد اعتمادی دراصل عالمی نظام کی کمزوری کو ظاہر کرتی ہے۔ یہاں سوال یہ نہیں کہ ایران کیا کہتا ہے، بلکہ یہ ہے کہ دنیا اس پر کیوں یقین نہیں کرتی اور اس سوال کا جواب عالمی سیاست کی پیچیدہ نفسیات میں پوشیدہ ہے۔ کیا عالمی قوانین سب کیلئے یکساں ہیں؟ یا طاقتور ممالک اپنی مرضی کے مطابق ان کی تشریح کرتے ہیں؟

2018 میں امریکا کا جوہری معاہدے سے نکل جانا نہ صرف ایک یکطرفہ فیصلہ کن موڑ تھا بلکہ ایک ایسا فیصلہ تھا جس نے عالمی اعتماد کو شدید نقصان پہنچایا۔ یہ اقدام نہ صرف ایران بلکہ دیگر ممالک کیلئے بھی ایک پیغام تھا کہ معاہدے مستقل نہیں ہوتے۔ اس اقدام نے نہ صرف اعتماد کو ٹھیس پہنچائی بلکہ سفارت کاری کے امکانات کو بھی محدود کر دیا۔ یہی وہ نکتہ ہے جہاں سے عالمی نظام کی ساکھ متاثر ہوئی، اور اس کے اثرات آج بھی محسوس کیے جا رہے ہیں۔ یہ وہ لمحہ تھا جب تاریخ نے ایک اور موقع کھودیا۔ ایک ایسا موقع جو شاید جنگ کو روک سکتا تھا۔



اگرچہ ایران کے پاس جوہری ہتھیار بنانے کی تکنیکی صلاحیت موجود تھی، مگر اس نے عملی طور پر اس حد کو عبور نہیں کیا۔ یہ ایک اہم حقیقت ہے جسے اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ایران نے ایک حد تک عالمی دباؤ اور اصولوں کا احترام کرتے ہوئے ایک حد تک ضبط کا مظاہرہ کیا، مگر حالیہ جنگ کے بعد یہ رویہ تبدیل ہو سکتا ہے اور اس تبدیلی کا قصور وار ایران نہیں بلکہ امریکا اور اسرائیل کو ٹھہرانے کی ضرورت ہے جنہوں نے اپنی جارحیت کی بنیاد پر ایران پر حملہ کر کے اسے اس راستہ پر گامزن کرنے کیلئے مجبور کر دیا کہ وہ مستقبل میں اپنی بقاء کیلئے اپنا حق استعمال کر سکے۔

فوجی حملے تنصیبات کو تباہ کر سکتے ہیں، مگر علم کو بلے تلے دفن نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی ذہنی صلاحیتوں کو ختم کر سکتے ہیں۔ ایران کے سائنسدان اور ان کی مہارت اس پروگرام کی اصل قوت ہیں۔ ایران کے پاس موجود سائنسی مہارت اسے دوبارہ کھڑا ہونے کی صلاحیت دیتی ہے، یہی وجہ ہے کہ محض بمباری کسی بھی جوہری پروگرام کو مکمل طور پر ختم نہیں کر سکتی۔ ایرانی قوم کے پاس ایسی صلاحیت موجود ہے کہ وہ تاخیر کا شکار تو ہو سکتے ہیں مگر اسی راہ اور بلے سے اپنی منزل کو تلاش کر کے سرخرو ہو سکتے ہیں۔

بین الاقوامی معائنہ کاروں کی رسائی محدود ہونے سے شکوک میں اضافہ ہو رہا ہے۔ حملوں کے بعد بین الاقوامی معائنہ کاروں کی رسائی محدود ہو گئی ہے، جو ایک خطرناک پیش رفت ہے۔ یہ صورت حال مزید کشیدگی کو جنم دے سکتی ہے۔ شفافیت کے بغیر اعتماد ممکن نہیں، اور اعتماد کے بغیر امن ایک سراب بن جاتا ہے۔ اور جب شفافیت ختم ہو جائے تو شکوک بڑھتے ہیں، اور جب شکوک بڑھتے ہیں تو تصادم ناگزیر ہو جاتا ہے۔

اگر ایران جوہری ہتھیار حاصل کرنے کی دہلیز عبور کر لیتا ہے تو یہ محض ایک ریاست کا فیصلہ نہیں ہو گا، بلکہ پورے خطے کیلئے ایک نفسیاتی و تزویراتی زلزلہ ثابت ہو گا۔ مشرق وسطیٰ، جو پہلے ہی فرقہ وارانہ کشیدگی، جغرافیائی رقابت اور عالمی طاقتوں کی چپقلش کا میدان بنا ہوا ہے، ایک نئی دوڑ کا اسیر ہو سکتا ہے۔ ایسی دوڑ جس میں ہر ملک اپنے آپ کو عدم تحفظ کے اندھیرے سے نکالنے کیلئے ایٹمی روشنی کی طرف لپکے گا، چاہے وہ روشنی دراصل ایک آگ ہی کیوں نہ ہو۔ اگر ایران نے جوہری ہتھیار حاصل کیے تو یقیناً دیگر ممالک بھی اس دوڑ میں شامل ہو جائیں گے۔ یہ ایک ایسا سلسلہ ہو گا جسے روکنا مشکل ہو گا بالکل ایسے جیسے بند ٹوٹ جائے اور پانی ہر سمت بہنے لگے۔

اس دوڑ کی خاص بات یہ ہو گی کہ یہ کھلے عام اعلان کے ساتھ نہیں بلکہ خاموشی، شبہ اور خفیہ منصوبہ بندی کے پردے میں آگے بڑھے گی۔ ہر ریاست اپنے ہمسایے کے ارادوں کا اندازہ لگاتے ہوئے اپنے ہتھیاروں کے ذخیرے کو بڑھانے کی کوشش کرے گی۔ یوں عدم اعتماد کی ایک زنجیر وجود میں آئے گی، جس کا ہر حلقہ دوسرے سے جڑا ہو گا، اور جس کا ٹوٹنا کسی ایک حادثے سے ممکن ہو جائے گا۔

دنیا میں پہلے ہی نو ممالک (امریکا، روس، چین، فرانس، برطانیہ، پاکستان، انڈیا، اسرائیل اور شمالی کوریا) جوہری ہتھیاروں کے حامل سمجھے جاتے ہیں، اس کے باوجود مزید ممالک میں اس خواہش کا بڑھنا ایک تشویشناک اور خطرناک رجحان ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ عدم پھیلاؤ کا نظام کمزور پڑ رہا ہے۔ اور یہ حقیقت بذات خود ایک سوالیہ نشان ہے کہ جب اتنی بڑی تعداد میں ریاستیں اس ہتھیار کو اپنے دفاع کا لازمی جزو سمجھتی ہیں تو دیگر ممالک کیوں نہ

اسی راہ پر چلیں؟

عوامی سطح پر بھی اس رجحان میں اضافہ ہو رہا ہے۔ جنوبی کوریا، ترکی اور پولینڈ جیسے ممالک میں عوامی رائے کے جائزے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ لوگ اپنے ملک کی سلامتی کیلئے جوہری صلاحیت کو ضروری سمجھنے لگے ہیں۔ یہ رجحان محض سیاسی نہیں بلکہ نفسیاتی ہے۔ خوف کا وہ سایہ جو اجتماعی شعور پر چھا جاتا ہے اور لوگوں کو غیر معمولی فیصلوں کی طرف مائل کرتا ہے۔

یہاں ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ جوہری ہتھیار اب صرف عسکری طاقت کا نشان نہیں رہے بلکہ قومی وقار اور خود مختاری کی علامت بن چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی خواہش میں اضافہ ایک فطری مگر خطرناک عمل بن چکا ہے۔ جب بڑی طاقتیں خود اپنے ذخائر بڑھا رہی ہوں تو وہ دوسروں کو کیسے روک سکتی ہیں؟ یہ ایک واضح تضاد ہے۔ چین اور فرانس جیسے ممالک کی جانب سے اپنے جوہری ذخائر میں اضافہ اس رجحان کو مزید تقویت اور ایک واضح پیغام دیتا ہے کہ جب بڑے ممالک خود اس دوڑ میں شامل ہوں تو چھوٹے ممالک کو کیسے روکا جاسکتا ہے؟ عالمی طاقتیں خود ان اصولوں پر عمل نہیں کرتیں جن کی وہ دوسروں کو تلقین کرتی ہیں۔ یہ دوہرا معیار عالمی نظام کی ساکھ کو مجروح کرتا ہے۔

چین کی تیز رفتار عسکری ترقی اور فرانس کا اپنے جوہری پروگرام کو وسعت دینے کا ارادہ دراصل اس بات کا ثبوت ہے کہ طاقت کی سیاست میں اخلاقیات کی گنجائش محدود ہوتی جا رہی ہے۔ جب بڑے ممالک خود اس دوڑ میں شامل ہوں تو چھوٹے ممالک کیلئے یہ دلیل مزید مضبوط ہو جاتی ہے کہ اگر انہیں زندہ رہنا ہے تو انہیں بھی اسی راستے پر چلنا ہو گا۔ یہ صورتحال عالمی نظام کیلئے ایک سنگین چیلنج ہے، کیونکہ یہ عدم پھیلاؤ کے اصول کو کمزور اور ایک نئے اسلحہ جاتی توازن کو جنم دیتی ہے۔

جوہری ہتھیاروں کی جدید کاری ایک ایسا عمل ہے جسے بظاہر دفاعی بہتری کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، مگر حقیقت میں یہ ان کے استعمال کے امکانات کو بڑھاتا ہے۔ جوہری ہتھیاروں کی جدید کاری دراصل ان کے استعمال کے امکانات کو بڑھاتی ہے، جو تباہی کا نیا چہرہ اور ایک نہایت خطرناک رجحان ہے۔ جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے بنائے گئے ہتھیار زیادہ تیز، زیادہ درست اور زیادہ تباہ کن ہوتے ہیں۔ جوہری ہتھیاروں کی جدید کاری دراصل ان کے استعمال کے امکانات کو بڑھاتی ہے۔ یہ ایک ایسا کھیل ہے جس میں جیتنے والا بھی ہارتا ہے۔

یہ ترقی ایک ایسے خطرناک رجحان کو جنم دیتی ہے جس میں ہتھیاروں کو "قابل استعمال" بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یعنی وہ محض خوف کی علامت نہ رہیں بلکہ عملی میدان میں استعمال کے قابل بھی ہوں۔ یہ تصور انسانی تاریخ کیلئے ایک بھیانک موڑ ثابت ہو سکتا ہے، کیونکہ جب ہتھیار قابل استعمال بن جائیں تو ان کے استعمال کا امکان بھی بڑھ جاتا ہے۔

نیوٹن معاہدے کا خاتمہ دراصل ایک ایسے خلا کی نشاندہی کرتا ہے جسے پر نہ کیا گیا تو عالمی امن خطرے میں پڑ سکتا ہے اور دنیا ایک نئے اسلحہ جاتی بحران کا شکار ہو سکتی ہے۔ یہ معاہدہ امریکا اور روس کے درمیان اعتماد اور توازن کا ایک ستون تھا، اور اس کے خاتمے نے اس ستون کو گرا دیا ہے۔ اب صورتحال یہ ہے کہ دونوں ممالک بغیر کسی مؤثر نگرانی کے اپنے ہتھیاروں کے ذخائر کو بڑھا سکتے ہیں۔ یہ خلا نہ صرف ان دونوں ممالک کیلئے بلکہ پوری دنیا کیلئے خطرناک ہے، کیونکہ اس سے اسلحہ جاتی دوڑ کو تقویت ملتی ہے۔

در اصل تین بنیادی عوامل دنیا کو جوہری پھیلاؤ کی طرف دھکیل رہے ہیں، چین کی صنعتی توسیع کا خوف، روس کی حکمت عملی، اور امریکا کی غیر متوقع اور غیر یقینی پالیسی۔ یہ تینوں عوامل دنیا کو ایک غیر یقینی مستقبل اور خطرناک سمت کی طرف دھکیل رہے ہیں۔

☆ اول، چین کی تیز رفتار صنعتی توسیع۔ یہ ایک ابھرتی ہوئی طاقت ہے جو اپنے عسکری اثر و رسوخ کو بڑھانے کیلئے جوہری ہتھیاروں کو ایک اہم ذریعہ سمجھتی ہے۔

☆ دوم، روس کی یوکرین جنگ۔ اس جنگ نے یہ ثابت کیا کہ جوہری دھمکیاں بھی ایک مؤثر سیاسی ہتھیار بن سکتی ہیں۔

☆ سوم، امریکا کی غیر متوقع پالیسی۔ یہ عنصر نہ صرف حریفوں بلکہ اتحادیوں کیلئے بھی عدم یقین پیدا کرتا ہے۔

یہ تینوں عوامل مل کر ایک ایسی فضا پیدا کرتے ہیں جس میں ہر ریاست خود کو غیر محفوظ محسوس کرتی ہے، اور یہی احساس جوہری ہتھیاروں کی طرف جھکاؤ کو بڑھاتا ہے۔

یوکرین نے اپنے جوہری ہتھیار ترک کیے مگر اسے حملے سے نہیں بچایا جاسکا۔ یوکرین کی مثال جہاں ایک عبرت ناک داستان ہے وہاں دیگر ممالک کیلئے ایک اہم اور خطرناک سبق بن چکی ہے۔ اس نے اپنی جوہری صلاحیت ترک کر کے مغربی ممالک پر اعتماد کیا لیکن ضمانتوں کے باوجود اسے حملے سے نہیں بچایا جاسکا، اور تین دہائیوں بعد اسے اس اعتماد کی بھاری قیمت چکانا پڑی جو مسلسل ابھی جاری ہے۔ یہ واقعہ عالمی سیاست میں ایک اہم موڑ ہے، کیونکہ اس نے یہ پیغام دیا کہ بین الاقوامی ضمانتیں ہمیشہ قابل اعتبار نہیں ہوتیں۔ یہ سبق دیگر ممالک کیلئے نہایت اہم ہے، اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی سلامتی کیلئے خود پر انحصار کرنے کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔

لیبیا اور شمالی کوریا کی مثالیں عالمی سیاست کے دو متضاد پہلوؤں کو نمایاں کرتی ہیں۔ لیبیا نے اپنے جوہری ہتھیار ترک کیے اور بالآخر بیرونی مداخلت کا شکار ہو کر عبرتناک انجام کو پہنچا، جبکہ شمالی کوریا نے اپنے پروگرام کو جاری رکھا اور آج تک محفوظ ہے۔ یہ تقابل جہاں عالمی نظام کی کمزوری کو ظاہر کرتا ہے وہاں ایک تلخ حقیقت کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ یہ تقابل نہ صرف عالمی نظام کی اخلاقی کمزوری کو بے نقاب کرتا ہے وہاں عالمی نظام میں اصولوں سے زیادہ طاقت کی اہمیت ہے۔ یہی وہ سوچ ہے جو دیگر ممالک کو جوہری ہتھیار حاصل کرنے کی طرف مائل کرتی ہے۔

اور یہ حقیقت بذات خود ایک سوالیہ نشان ہے کہ جب اتنی بڑی تعداد میں ریاستیں اس ہتھیار کو اپنے دفاع کا لازمی جزو سمجھتی ہیں تو دیگر ممالک کیوں نہ تمام تر خدشات کے باوجود یہ کہنا درست ہو گا کہ جوہری دوڑ ناگزیر نہیں۔ یہ انسان کے فیصلوں پر منحصر ہے۔ جوہری ہتھیار نہ صرف منگے، خطرناک اور پیچیدہ ہیں، ہر ریاست انہیں حاصل نہیں کر سکتی، اور نہ ہی ہر ریاست کو ان کی ضرورت ہے بلکہ ان کے حصول کے ساتھ اہم اقتصادی مسائل بھی جڑے ہوتے ہیں۔ اگرچہ حالات اس سمت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں، مگر تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ انسان نے کئی بار تباہی کے دہانے سے واپس لوٹنے کا راستہ اختیار کیا ہے۔

جوہری ہتھیاروں کے حصول کے ساتھ بے شمار مشکلات جڑی ہوتی ہیں۔ تکنیکی پیچیدگیاں، مالی اخراجات، بین الاقوامی پابندیاں اور سفارتی تنہائی۔ یہی عوامل کئی ممالک کو اس راستے سے دور رکھتے ہیں۔ مزید برآں، عالمی برادری کی جانب سے اجتماعی اقدامات، معاہدوں کی بحالی اور اعتماد سازی کی کوششیں اس دوڑ کو روک سکتی ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں امید کی کرن نظر آتی ہے۔ ایک ایسی کرن جو اگرچہ مدہم ہے، مگر مکمل طور پر بجھی نہیں۔

یہ نکات ہمیں اس حقیقت کی طرف لے جاتے ہیں کہ دنیا ایک نازک موڑ پر کھڑی ہے۔ جوہری ہتھیاروں کی دوڑ محض عسکری مسئلہ نہیں بلکہ ایک تہذیبی بحران ہے۔ دنیا اس وقت ایک ایسے موڑ پر کھڑی ہے جہاں سے دو راستے نکلتے ہیں۔ ایک جنگ اور تباہی کی طرف، دوسرا امن اور مکالمے کی طرف۔ یہ فیصلہ انسان کو کرنا ہے کہ وہ کس راستے کا انتخاب کرتا ہے۔ تاریخ ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ طاقت کا غرور عارضی ہوتا ہے، مگر اس کے اثرات دیرپا۔ اگر عالمی برادری نے اس موقع پر دانشمندی کا مظاہرہ نہ کیا تو یہ جوہری دوڑ ایک ایسا المیہ بن جائے گی جس کا خمیازہ آنے والی نسلوں کو بھگتنا پڑے گا اور وہ ہمیں معاف نہیں کریں گی۔

اگر عقل و تدبیر کو ترجیح دی گئی تو شاید ابھی بھی وقت ہے کہ اس آگ کو بجھایا جاسکے۔ اس سے پہلے کہ یہ پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ دنیا ایک بار پھر مکالمے کی طرف لوٹے، اعتماد کی بنیادیں استوار کرے، اور اس حقیقت کو تسلیم کرے کہ امن کی ضمانت ہتھیاروں میں نہیں بلکہ انسان کے باطن میں پوشیدہ ہے۔ ورنہ یہ جوہری دوڑ ایک ایسا المیہ بن جائے گی جس کا اختتام کسی کے حق میں نہیں ہو گا۔ نہ فاتح کے، نہ مفتوح کے، بلکہ پوری انسانیت کیلئے ایک مشترکہ شکست کی صورت میں۔ اگر انسان نے اس بحران کو سنجیدگی سے نہ لیا تو یہ صرف ریاستوں کا نہیں بلکہ پوری انسانیت کا المیہ بن جائے گا۔ اگر دانش، تدبیر اور اخلاقی جرات کو بروئے کار لایا گیا تو شاید یہ بحران ایک نئے عالمی شعور کو جنم دے۔ ایسا شعور جو طاقت کے بجائے امن کو ترجیح دے۔

جب تاریخ اپنے اوراق سیمٹتی ہے تو وہ صرف واقعات درج نہیں کرتی بلکہ قوموں کے فیصلوں کا حساب بھی رکھتی ہے۔ آنے والی نسلیں جب اس دور کو دیکھیں گی تو وہ یہ نہیں پوچھیں گی کہ کس کے پاس کتنے ہتھیار تھے، بلکہ یہ سوال کریں گی کہ جب دنیا تباہی کے دہانے پر کھڑی تھی تو انسانیت کے پاس کتنی دانش، کتنی ہمت اور کتنی بصیرت تھی۔

آج کا انسان ایک ایسے دور ہے پر کھڑا ہے جہاں ایک راستہ آگ کی وادیوں میں اترتا ہے اور دوسرا امن کے سبزہ زاروں کی طرف جاتا ہے۔ مگر المیہ یہ ہے کہ آگ کا راستہ ہمیشہ زیادہ روشن دکھائی دیتا ہے۔ چمکدار، پرکشش، مگر اندر سے کھوکھلا اور مہلک۔ اگر ہم نے اس فریب کو نہ پہچانا تو وہ دن دور نہیں جب زمین کا سینہ بارود سے بھر جائے گا اور آسمان انسان کی بے بسی کا گواہ بن جائے گا۔ مگر ابھی وقت باقی ہے۔ ابھی انسان کے پاس وہ اختیار موجود ہے جس کے ذریعے وہ تقدیر کا دھار ابدل سکتا ہے۔ اگر دلوں میں نفرت کی جگہ ہمدردی لے لے، اگر طاقت کے نشے کی جگہ عقل و تدبیر کو فوقیت دی جائے، اگر مفادات کی دیواروں کو گر کر انسانیت کے پل تعمیر کیے جائیں۔ تو شاید یہ دنیا ایک بار پھر امن کا گہوارہ بن سکتی ہے۔

یہ تحریر ایک گزارش ہے، ایک التجا ہے، ایک عہد کی پکار ہے۔ کہ اسے صرف پڑھ کر نہ چھوڑ دیا جائے بلکہ اسے دل میں جگہ دی جائے، سوچ میں بسایا جائے، اور آگے بڑھایا جائے۔ کیونکہ امن کا پیغام بھی اسی وقت زندہ رہتا ہے جب وہ دل سے دل تک پہنچے، اور انسان سے انسان تک منتقل ہو۔ آئیے، ہم سب اس پیغام کے امین بن جائیں۔ تاکہ آنے والی نسلیں ہمیں اس نظر سے دیکھیں کہ ہم نے تباہی کے اندھیروں میں بھی روشنی کا چراغ جلانے کی کوشش کی تھی، اور ہم نے جنگ کے شور میں بھی امن کی صدا کو زندہ رکھا تھا۔

ایک لمحے کے رحم و کرم پر دنیا

اقتدار، غرور اور ایٹمی سایہ

دنیا کی تاریخ ہمیں بار بار یہ سبق سکھاتی ہے کہ طاقت، شہرت یا ذاتی جذبات کے ہاتھوں کیے گئے فیصلے کروڑوں انسانوں کی زندگیوں پر نہ صرف اثر ڈال سکتے ہیں بلکہ جلد بازی، غرور اور ذاتی رنجشیں انسانیت کیلئے قیامت کا پیش خیمہ بن سکتی ہیں۔ دنیا نے اکثر دیکھا ہے کہ ایک واحد شخص کے فیصلے، ایک لمحے کی جذباتیت، یا ایک کم ظرف رد عمل کس طرح ہزاروں، لاکھوں، بلکہ کروڑوں انسانوں کی زندگیوں پر اثر ڈال سکتے ہیں۔ امریکا، جو آزادی، انصاف اور عالمی قیادت کی علامت کے طور پر جانا جاتا ہے، اس کی صدارت صرف ایک عہدہ نہیں بلکہ پوری دنیا کی تقدیر کے فیصلوں کی کمان ہے۔ ہر فیصلہ امن یا جنگ، زندگی یا موت، امید یا خوف کے درمیان ہوتا ہے۔

امریکا، جسے آزادی، طاقت اور عالمی قیادت کی علامت سمجھا جاتا ہے، اس کی صدارت صرف ایک قومی عہدہ نہیں، بلکہ عالمی امن اور جنگ کے فیصلوں کی کمان ہے۔ یہاں ہر فیصلہ زندگی اور موت، امن اور جنگ، امید اور خوف کے درمیان ہوتا ہے۔

ہلری کلنٹن کی یہ تنبیہ آج وقت کی کڑوی حقیقت بن چکی ہے۔ ٹرمپ کی غیر مستحکم شخصیت، جذباتی فیصلے، اور عالمی تعلقات میں بے دھیانی نے نہ صرف امریکا بلکہ پوری دنیا کو ایک خطرناک چوراہے پر لا کھڑا کیا ہے۔ یہ مضمون اسی سبق کی عکاسی کرتا ہے کہ قیادت صرف طاقت یا شہرت کی بنیاد پر نہیں بلکہ علم، صبر، اور عالمی شعور کی بنیاد پر منتخب کی جانی چاہیے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ایسے رہنما، جو ذاتی غرور اور جلد بازی پر فیصلے کرتے ہیں، نہ صرف اپنی قوم بلکہ عالمی امن کو بھی نقصان پہنچاتے ہیں۔

2016ء میں ہلیری کلنٹن نے امریکی عوام کو ایک ایسا پیغام دیا جو محض تنبیہ نہیں بلکہ تاریخ کی ایک کڑوی حقیقت کی پیشگی اطلاع تھی، یہ آسان نہیں کہ کسی کے کم ظرف ہونے یا جذباتی غصے کی بنیاد پر امریکا کو جنگ میں دھکیل دیا جائے۔ ٹرمپ کی غیر مستحکم شخصیت، عجیب و غریب رنجشیں، اور جذبات پر مبنی فیصلے اور عالمی تعلقات میں بے دھیانی نے نہ صرف امریکا بلکہ پوری دنیا کو ایک خطرناک چوراہے پر لا کھڑا کیا ہے۔

شمالی کوریا کی دھمکیاں ہوں، ایران کے نیوکلیر پروگرام کے معاملات، یا مشرق وسطیٰ کے بحران، ہر جگہ غیر ذمہ دارانہ قیادت کے اثرات واضح ہیں۔ یہ ابتدائیہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ قیادت صرف طاقت یا شہرت کی بنیاد پر نہیں بلکہ علم، صبر، بصیرت، اور عالمی شعور کی بنیاد پر ہونی چاہیے۔ تاریخ کی کتابیں بار بار گواہی دیتی ہیں کہ غیر مستحکم رہنما، جو اپنے ذاتی جذبات کی بنیاد پر فیصلے کرتے ہیں، نہ صرف اپنی قوم بلکہ پوری دنیا کے امن کو خطرے میں ڈال دیتے ہیں۔ یہ مضمون اسی سبق کی عکاسی کرتا ہے کہ قیادت کی عظمت، علم اور اخلاق کے بغیر، انسانیت کیلئے ایک خطرناک بوجھ بن سکتی ہے۔

امریکی صدارت کا انتخاب نہ صرف امریکا کیلئے بلکہ عالمی سطح پر بھی بے پناہ اثرات رکھتا ہے۔ صدر کا عہدہ صرف ایک سیاسی مقام نہیں بلکہ یہ جنگ و امن، زندگی اور موت، اور عالمی تعلقات کے فیصلوں سے جڑا ہوتا ہے۔ 2016ء میں ہلیری کلنٹن نے 2016ء میں امریکی عوام کو انتباہ کیا تھا کہ ڈونلڈ ٹرمپ کی شخصیت اور پالیسی فیصلے امریکا اور دنیا دونوں کیلئے خطرناک ہو سکتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ صدر کا انتخاب صرف ایک سیاسی عہدہ نہیں بلکہ جنگ

وامن، زندگی اور موت کے فیصلوں کیلئے بھی ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ آسان نہیں ہے کہ کسی کے کم ظرف ہونے کی بنیاد پر امریکا کو جنگ میں دھکیل دیا جائے۔

ہلیری کلنٹن کے اس بیان میں امریکی عوام کو یاد دہانی کرائی گئی کہ صدر کا انتخاب ایک ذمہ دارانہ فیصلہ ہے، کیونکہ یہ شخص عالمی سطح پر جنگ یا امن کے فیصلے کرے گا۔ ان کے مطابق ٹرمپ کے انتخاب سے نہ صرف امریکا بلکہ دنیا کے دیگر ممالک بھی خطرے میں آسکتے ہیں، اور یہ فیصلہ تاریخی غلطی ثابت ہو سکتا ہے۔

ہلیری کلنٹن نے ٹرمپ کو ذہنی اور جذباتی طور پر غیر موزوں اور غیر مستحکم قرار دیا۔ انہوں نے کہا کہ ٹرمپ کے خیالات محض بے ترتیب باتوں، ذاتی رنجشوں اور جھوٹ پر مبنی ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ایسے شخص کو صدر کا عہدہ دینا خطرناک ہے، کیونکہ وہ کسی بھی لمحے جنگ کے فیصلے کر سکتا ہے۔ ہلیری کلنٹن نے واضح کیا کہ ٹرمپ نہ صرف تجربہ کار نہیں، بلکہ ان کی سوچ خطرناک حد تک غیر منطقی اور غیر مستحکم ہے۔

ایک صدر جو نیوکلئیر کوڈز کے حامل ہوں، ان کا غصہ یا ذاتی رنجش کی بنیاد پر جنگ کا فیصلہ کرنا انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر، ٹرمپ کی شمالی کوریا پالیسی میں شدت اور بلاوجہ اشتعال کی بنیاد پر جنگ کے خطرات پیدا ہو گئے۔ 2017 میں شمالی کوریا کے رہنما کم جونگ اُن کے ساتھ ٹرمپ کی ذاتی رنجش اور ٹویٹ پر مبنی تبادلہ خیال نے عالمی برادری میں خوف اور عدم استحکام پیدا کیا۔ کلنٹن نے پہلے ہی کہا تھا کہ ایسے شخص کو نیوکلئیر ہتھیاروں کا اختیار دینا غیر ذمہ دارانہ ہے۔ اگر کوئی بھی غیر مستحکم اور کم ظرف رہنما نیوکلئیر ہتھیاروں کے اختیار میں ہو تو عالمی تباہی کا خطرہ ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ ٹرمپ کی شخصیت کی ایک اور مثال ان کی ایران مخالف تقریر ہے، جس میں انہوں نے ایران معاہدے کو مسترد کیا اور عالمی سطح پر امریکا کی ساکھ کو کمزور کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہلیری کلنٹن کی پیشگوئی درست ثابت ہوئی ہے، کیونکہ غیر مستحکم جذبات اور کم ظرفی عالمی سطح پر خطرات پیدا کر سکتی ہیں۔

ہلیری کلنٹن نے واضح کیا کہ ٹرمپ کی جلد بازی اور کم ظرفی کے سبب امریکا کو جنگ میں دھکیلنے کا خطرہ بہت زیادہ ہے، اور نیوکلئیر ہتھیاروں کا اختیار ایسے شخص کے ہاتھ میں ہونا ناقابل تصور خطرہ ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کی شدت اور نتائج پوری دنیا پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر، 2017 میں شمالی کوریا کے ساتھ کشیدگی کے دوران ٹرمپ نے ٹویٹر پر شدید بیانات جاری کیے جن میں انہوں نے نیوکلئیر ہتھیاروں کے استعمال کی دھمکی دی۔ عالمی تجزیہ کاروں کے مطابق، اگر اس وقت ٹرمپ کا غصہ ذاتی نوعیت کا نہ ہوتا تو عالمی بحران اس شدت تک نہ پہنچتا۔ ہلیری کلنٹن نے پہلے ہی خبردار کیا تھا کہ ایک پتلی جلد والا ناسمجھ صدر عالمی امن کیلئے خطرہ بن سکتا ہے۔

نیوکلئیر خطرات صرف شمالی کوریا تک محدود نہیں ہیں۔ ایران کے نیوکلئیر پروگرام کے معاملے میں بھی ٹرمپ کی پالیسی نے خطرات بڑھا دیے۔ انہوں نے ایران معاہدے کو مسترد کیا، جس سے ایران دوبارہ نیوکلئیر ہتھیار بنانے کی راہ اختیار کر سکتا تھا، اور عالمی طاقتیں غیر مستحکم ہو سکتی تھیں۔ ہلیری کلنٹن نے واضح کیا کہ سفارتکاری صبر، مستقل مزاجی اور دانشمندی کے بغیر ممکن نہیں۔ ایران کے نیوکلئیر پروگرام کے معاملے میں سابق صدر اوباما نے فوجی کارروائی کی بجائے اقتصادی پابندیاں اور مذاکرات کو ترجیح دی، جس سے ایران کو نیوکلئیر ہتھیار بنانے سے روکا گیا۔

ٹرمپ نے ایران معاہدے کو مسترد کیا اور عالمی سطح پر امریکا کی ساکھ کمزور کی۔ ایران نے دوبارہ نیوکلئیر پروگرام کی راہ اختیار کی، مشرق وسطیٰ میں کشیدگی بڑھی، اور عالمی اقتصادی استحکام متاثر ہوا۔ ہلیری کلنٹن نے کہا کہ سفارتکاری اکثر واحد راستہ ہے جو بڑے بحران سے بچا سکتی ہے۔ صبر، مستقل مزاجی، اور طویل مدتی منصوبہ بندی عالمی تنازعات کو حل کرنے کیلئے ضروری ہیں۔ مثال کے طور پر، ایران کے نیوکلئیر پروگرام کے دوران سابق صدر اوباما نے فوجی کارروائی کی بجائے اقتصادی پابندیاں اور مذاکرات کو ترجیح دی۔ سخت پابندیاں اور مذاکرات کے ذریعے ایک معاہدہ طے پایا جس نے ایران کو ہتھیار حاصل کرنے سے روکا۔ اگر اس وقت ٹرمپ جیسا غیر مستحکم شخص صدر ہوتا، تو فوری فوجی کارروائی یا سخت بیانات سے پورے مشرق وسطیٰ میں جنگ کے امکانات بڑھ سکتے تھے۔

سفارتکاری کی ایک اور مثال عالمی سطح پر شمالی کوریا کے ساتھ مذاکرات ہیں۔ 2018 میں ٹرمپ نے تاریخی ملاقاتیں کیں، لیکن ان کا طرز عمل اور غیر متوقع بیانات عالمی رہنماؤں کیلئے تشویش کا باعث بنے۔ ہلیری کلنٹن کے مطابق، مسائل کو صبر اور دانشمندی سے حل کرنا ہی پائیدار امن کی ضمانت ہے۔ ٹرمپ نے ایران معاہدے کو مسترد کیا، عالمی سطح پر تنقید کی اور عالمی پابندیوں کو کمزور کیا، اور ایران کو دوبارہ نیوکلئیر پروگرام کی راہ پر ڈال دیا۔ اس کے نتیجے میں مشرق وسطیٰ میں کشیدگی بڑھی، اور دنیا میں امریکا کی ساکھ کمزور ہوئی۔ ہلیری کے مطابق ایسے غیر ذمہ دارانہ اقدامات عالمی امن کو خطرے میں ڈال سکتے ہیں۔



مثال کے طور پر، 2019 میں ایران اور امریکا کے درمیان کشیدگی نے خلیج فارس میں تیل کی ترسیل کے راستوں کو خطرے میں ڈال دیا۔ عالمی منڈی میں تیل کی قیمتوں میں اضافہ ہوا اور کئی ممالک کو اقتصادی نقصان اٹھانا پڑا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہلیری کلنٹن کی تنبیہات درست تھیں، اور ٹرمپ کی پالیسی نے عالمی امن اور اقتصادی استحکام کو نقصان پہنچایا۔ ٹرمپ کی پالیسیوں نے اسرائیل، یورپ اور دیگر

اتحادی ممالک کے تعلقات کو متاثر کیا۔ نیتن یاہو کی ایران مخالف پالیسی ٹرمپ کی مدد سے کامیاب ہوئی، جس کے نتیجے میں مشرق وسطیٰ میں عدم استحکام اور امریکی فوجی اڈے خطرے میں آئے۔

ٹرمپ کی جلد بازی اور جذباتیت نے عالمی امن کیلئے سنگین خطرہ پیدا کیا۔ ہلیری کلنٹن نے کہا کہ جنگ سے بچنے کا سب سے مؤثر طریقہ صبر، سفارتکاری اور معقول فیصلے ہیں۔ مثال کے طور پر، 2020 میں ایران کے جنرل قاسم سلیمانی کے قتل کے بعد خطے میں فوری جنگ کا خطرہ پیدا ہوا۔ اگر صدر زیادہ جذباتی اور کم ظرف ہوتا، تو یہ ایک بڑے عالمی بحران میں تبدیل ہو سکتا تھا۔ ہلیری کلنٹن کی پیٹنگوئی کے مطابق ایسے حالات میں غیر مستحکم صدر عالمی امن کیلئے خطرہ ہیں۔

ٹرمپ کی پالیسیاں نہ صرف ایران بلکہ اسرائیل، یورپ، اور دیگر اتحادی ممالک کے تعلقات پر بھی منفی اثر ڈال رہی ہیں۔ اسرائیل کے وزیراعظم بنیامین نتن یاہو نے کئی سالوں تک امریکا پر دباؤ ڈالا کہ ایران کے خلاف سخت اقدامات کیے جائیں، اور ٹرمپ کے صدر بننے کے بعد یہ دباؤ کامیاب ہوا۔ اس کے نتیجے میں نہ صرف ایران بلکہ پورے مشرق وسطیٰ میں بحران پیدا ہوا۔ امریکی اتحادی ممالک بھی غیر مستحکم ہو گئے، اور علاقے میں خود امریکی فوجی اڈے خطرے میں آ گئے۔ مثال کے طور پر، عراق اور شام میں امریکی فوجی تنصیبات پر حملوں میں اضافہ ہوا، جس سے عالمی امن خطرے میں پڑ گیا۔

ذمہ دارانہ تقریر اور پالیسیز نے امریکی عوام کے اعتماد کو ٹرمپ کی قیادت میں امریکا کی داخلی سیاست بھی تقسیم اور کشیدگی کا شکار ہوئی ہے۔ ان کی غیر کمزور کیا اور یہ ظاہر کیا کہ امریکا کا فیصلہ ساز نظام بھی خطرے میں ہے۔ مثال کے طور پر، 2021 میں کیسیٹل ہل پر حملہ ٹرمپ کے بیانات اور اپنی پارٹی کی حمایت کے نتیجے میں ہوا، جس نے امریکی جمہوریت کے استحکام کو شدید نقصان پہنچایا۔ یہ ہلیری کلنٹن کے پیشگوئی کی تصدیق ہے کہ غیر مستحکم صدر امریکا کے اندرونی نظام کیلئے بھی خطرہ بن سکتا ہے۔

ٹرمپ کی جلد بازی اور جذباتیت نے عالمی امن کیلئے سنگین خطرہ پیدا کیا ہے۔ ہلیری نے کہا کہ جنگ سے بچنے کا سب سے مؤثر طریقہ صبر، سفارتکاری اور معقول فیصلے ہیں۔ مگر ٹرمپ کی صورت میں دنیا ایک غیر مستحکم اور خطرناک رہنما کے ہاتھ میں ہے جو ذاتی جذبات پر عالمی فیصلے کر سکتا ہے۔ ٹرمپ کی پالیسیاں عالمی اقتصادی استحکام کیلئے بھی خطرہ ہیں۔ ٹرمپ کی تجارتی پالیسیوں اور ایران پر اقدامات نے عالمی اقتصادی استحکام کو متاثر کیا۔ ایران پر پابندیاں کمزور ہوئیں، جنگ کے خطرات بڑھے، اور عالمی سرمایہ کاری کے مواقع کم ہو گئے۔ مثال کے طور پر، 2018 میں امریکا نے چین کے ساتھ تجارتی جنگ شروع کی، جس سے عالمی منڈی میں بے یقینی پیدا ہوئی اور متعدد ممالک کی معیشت متاثر ہوئی۔ مشرق وسطیٰ میں کشیدگی نے تیل کی قیمتیں بڑھائیں، چین کے ساتھ تجارتی جنگ نے عالمی معیشت میں بے یقینی پیدا کی، اور کئی ممالک کو مالی نقصان اٹھانا پڑا اور عالمی تجارت متاثر ہوئی۔ اس سے دنیا میں اقتصادی عدم استحکام پیدا ہوا، اور عالمی سرمایہ کاری کے مواقع کم ہو گئے جس کا اثر ہر ملک پر محسوس کیا جا رہا ہے۔

ٹرمپ کی پالیسیوں کے باعث امریکی ہتھیاروں کی صنعت نے اپنے مقاصد حاصل کیے۔ جنگ اور تنازعات کے امکان بڑھنے سے ہتھیاروں کی فروخت میں اضافہ ہوا، جو کہ امریکا کے مفادات کیلئے فائدہ مند رہا، لیکن عالمی امن کیلئے نقصان دہ ہے۔ مثال کے طور پر، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات نے امریکا سے ہتھیار خریدے تاکہ ایران کے خلاف اپنی فوجی تیاری مضبوط کریں، جس سے عالمی کشیدگی اور خطرات بڑھ گئے۔

ٹرمپ کی پالیسیوں کے باعث امریکی ہتھیاروں کی صنعت نے اپنے مقاصد حاصل کیے۔ امریکی ہتھیاروں کی صنعت کو فائدہ پہنچایا۔ ٹرمپ کی پالیسیوں کے باعث امریکی ہتھیاروں کی صنعت نے اپنے مقاصد حاصل کیے۔ جنگ اور تنازعات کے امکان بڑھنے سے ہتھیاروں کی فروخت میں اضافہ ہوا، جو کہ امریکا کے مفادات کیلئے فائدہ مند رہا، لیکن عالمی امن کیلئے انتہائی نقصان دہ ہے۔ سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات نے ہتھیار خریدے، جس سے عالمی کشیدگی بڑھی۔ جنگ اور تنازعات کے امکان بڑھنے سے ہتھیاروں کی فروخت میں اضافہ ہوا، جو عالمی امن کیلئے نقصان دہ تھا۔

نتن یاہو کی ایران مخالف پالیسی ٹرمپ کی مدد سے کامیاب ہوئی۔ اس کے نتیجے میں مشرق وسطیٰ میں عدم استحکام بڑھا، اور امریکی اتحادی ممالک خطرے میں پڑ گئے۔ مثال کے طور پر، 2020 میں اسرائیل اور متحدہ عرب امارات کے درمیان تعلقات قائم ہوئے، لیکن اس کے ساتھ ہی فلسطینی

تنازعات میں شدت آگئی۔ امریکی حمایت نے کچھ ممالک کے موقف کو مضبوط کیا جبکہ دیگر ممالک میں نفرت اور کشیدگی پیدا ہوئی۔ اس کے نتیجے میں نہ صرف ایران بلکہ پورے مشرق وسطیٰ میں بحران پیدا ہوا۔ امریکی اتحادی ممالک بھی غیر مستحکم ہو گئے، اور علاقے میں امریکی فوجی اڈے خطرے میں آ گئے۔

ٹرمپ کی پالیسیاں یورپ اور مشرق وسطیٰ کے ممالک کیلئے بھی چیلنج بن گئی ہیں۔ یورپی ممالک ایران معاہدے کو برقرار رکھنے کی کوشش کر رہے تھے، مگر امریکا کی غیر متوقع پالیسیوں نے انہیں مشکلات میں ڈال دیا۔ امریکی اتحادی ممالک پر دباؤ بڑھا، امن کی کوششیں کمزور ہوئیں، اور عالمی سیاست میں عدم استحکام پیدا ہوا۔ مثال کے طور پر، یورپی ممالک نے ایران معاہدے کو برقرار رکھنے کی کوشش کی، لیکن امریکا کی غیر متوقع پالیسیوں نے انہیں مشکلات میں ڈال دیا۔ روس اور چین نے بھی اس خلا کا فائدہ اٹھایا، جو عالمی طاقتوں کے درمیان نئی کشیدگی پیدا کرنے کا سبب بنا۔ ہلیری نے امریکی عوام پر اعتماد ظاہر کیا کہ وہ صحیح فیصلہ کریں گے۔ ان کے مطابق امریکا ایک ایسا ملک ہے جس میں عقلمندی، قومی فخر اور شعور موجود ہے، اور عوام عالمی خطرات کو سمجھ کر فیصلے کریں گے۔

مثال کے طور پر، 2020 کے صدارتی انتخابات میں امریکی عوام نے ٹرمپ کی غیر مستحکم پالیسیوں کے اثرات کو مد نظر رکھتے ہوئے فیصلہ کیا، جس سے ظاہر ہوا کہ ہلیری کلنٹن کی توقعات درست تھیں۔ ہلیری کلنٹن کی پیشگوئی درست ثابت ہوئی ہے۔ ٹرمپ کی قیادت نے عالمی امن، اقتصادی استحکام، مشرق وسطیٰ میں حالات، اور نیوکلیر خطرات میں اضافہ کیا ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ایک غیر مستحکم اور جذباتی صدر کا انتخاب نہ صرف امریکا بلکہ پوری دنیا کیلئے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔

عالمی قیادت میں ذمہ دارانہ فیصلے لازمی ہیں۔

سفارتکاری اور مذاکرات کو ترجیح دینا چاہیے۔

نیوکلیر ہتھیاروں کا اختیار صرف مستحکم اور تجربہ کار قیادت کو دیا جانا چاہیے۔

امریکی عوام اور دنیا کو ایسے رہنماؤں کے انتخاب میں محتاط رہنا چاہیے جو عالمی امن اور استحکام کے دشمن نہ ہوں۔

مشرق وسطیٰ میں بحرانوں کے حل کیلئے عالمی طاقتوں کو مشترکہ حکمت عملی اپنانا ضروری ہے۔

امریکی عوام اور دنیا کو ایسے رہنماؤں کے انتخاب میں محتاط رہنا چاہیے جو عالمی امن اور استحکام کے دشمن نہ ہوں۔

آج ہم اس تاریخی لمحے کی گواہی دے رہے ہیں جب ایک غیر مستحکم اور جذباتی رہنما کے فیصلوں نے عالمی امن و سیاست، اقتصادی استحکام، اور انسانی زندگیوں کو خطرے میں ڈال دیا۔ ہلیری کلنٹن کی پیشگوئی صرف تنبیہ نہیں بلکہ ایک انتباہ ہے، بلکہ ایک سبق ہے جو صدیوں تک یاد رکھا جائے گا۔ ہلیری کلنٹن کا بیان ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ قیادت کا انتخاب کوئی معمولی عمل نہیں۔ یہ پیغام صرف امریکا کیلئے نہیں، بلکہ ہر قوم، ہر شہری، اور ہر رہنما کیلئے ہے۔ عالمی طاقت اور جنگ و امن کے فیصلے جذبات یا ذاتی مفادات کی بنیاد پر نہیں بلکہ دانشمندی، صبر، اور عالمی شعور کی بنیاد پر کیے جانے چاہئیں۔ قیادت وہ نہیں جو طاقت یا ذاتی غرور کی بنیاد پر فیصلہ کرے، بلکہ وہ ہے جو علم، بصیرت، صبر اور اخلاق کے ساتھ دنیا کی تقدیر کی ذمہ داری اٹھائے۔

اگر ہم اس سبق کو نہ سمجھیں، تو تاریخ ہمیں بار بار اسی تلخ حقیقت سے دوچار کرے گی کہ غیر ذمہ دار قیادت نہ صرف اپنی قوم بلکہ پوری انسانیت کیلئے خطرہ ہے۔ یہ ہماری زمینی ذمہ داری ہے کہ ہم ایسے رہنماؤں کو آگے آنے نہ دیں جو جذبات، غرور یا ذاتی مفادات کے باعث انسانی زندگیوں اور امن

کو خطرے میں ڈال سکتے ہیں۔ آج ہمیں یہ عزم کرنا ہے کہ قیادت کے فیصلے صرف طاقت، شہرت یا ذاتی جذبات کی بنیاد پر نہیں، بلکہ عقل، تجربے، اخلاقیات اور عالمی شعور کی بنیاد پر کیے جائیں۔ یہی سبق ہے، یہی پیغام ہے، اور یہی ہمارا تاریخی فرض ہے کہ ہم مستقبل کی قیادت کو ایک ذمہ دارانہ اور انسانی سوچ کے ساتھ منتخب کریں۔

اتوار 9 ذیقعدہ 1447ھ 26 اپریل 2026ء

مشرق وسطیٰ کا طوفان

اگر اس جنگ کو صرف ایران اور اسرائیل کے درمیان ایک عسکری تصادم کے طور پر دیکھا جائے تو شاید اس کی اصل نوعیت سمجھ میں نہ آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ مشرق وسطیٰ میں ہونے والی تقریباً ہر بڑی جنگ دراصل علاقائی اور عالمی طاقتوں کے درمیان طاقت کے توازن کی کشمکش کا مظہر ہوتی ہے۔ موجودہ جنگ بھی اسی طویل تاریخی سلسلے کا ایک نیا باب معلوم ہوتی ہے۔

اس خطے کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ یہاں کے تنازعات کبھی محض دوریاستوں کے درمیان نہیں رہتے بلکہ ان کے پیچھے وسیع تر جغرافیائی سیاسی مفادات کا رفرما ہوتے ہیں۔ بیسویں صدی کے وسط سے لے کر آج تک مشرق وسطیٰ کی سیاست تین بنیادی عوامل کے گرد گھومتی رہی ہے: توانائی کے وسائل، عالمی طاقتوں کی مداخلت اور علاقائی طاقتوں کی رقابت۔ موجودہ جنگ کو بھی انہی عوامل کے تناظر میں سمجھنا ضروری ہے۔

28 فروری کی شب، جب دنیا کے بیشتر حصوں میں زندگی معمول کے مطابق جاری تھی، مشرق وسطیٰ کی فضاں میں ایک نئی ہلچل جنم لے رہی تھی۔ جمعہ اور ہفتہ کی درمیانی شب اچانک امریکا اور اسرائیل نے ایران پر وسیع فضائی حملوں کا آغاز کر دیا۔ چند ہی گھنٹوں کے اندر اندر وہ خطہ جو پہلے ہی کئی دہائیوں سے سیاسی کشیدگی، پر کسی جنگوں اور طاقت کے توازن کی کشمکش کا میدان رہا ہے، ایک نئی اور خطرناک جنگ کی لپیٹ میں آگیا۔ صبح ہوتے ہوتے دنیا کو معلوم ہو چکا تھا کہ مشرق وسطیٰ میں ایک نئی جنگ شروع ہو چکی ہے۔ ایران نے فوری طور پر جوابی کارروائی کرتے ہوئے اسرائیل اور خطے میں موجود امریکی فوجی اڈوں کو نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ چند دنوں میں صورتحال اس حد تک بگڑ گئی کہ نہ صرف ایران اور اسرائیل بلکہ پورا خطہ اس تصادم کی زد میں آگیا۔

ابتدائی اطلاعات کے مطابق اس جنگ میں ایران کی اعلیٰ قیادت کو شدید نقصان پہنچا ہے۔ ایران کے رہبر اعلیٰ آیت اللہ علی خامنہ ای سمیت اعلیٰ فوجی قیادت کے متعدد افراد ہلاک ہونے کی خبریں سامنے آئیں۔ امریکی اور اسرائیلی حملوں میں تین ہزار سے زائد ایرانی شہری مارے جا چکے ہیں جن میں ڈیڑھ سو سے زیادہ اسکول کی بچیاں بھی شامل بتائی جاتی ہیں۔ دوسری طرف ایران کی جوابی کارروائیوں میں اسرائیلی شہریوں اور امریکی فوجیوں کی ہلاکتیں بھی رپورٹ ہوئی ہیں۔ لیکن اس جنگ کا دائرہ صرف ایران اور اسرائیل تک محدود نہیں رہا۔ لبنان، عراق اور شام کے بعد اب خلیجی ممالک بھی اس کے اثرات محسوس کر رہے ہیں۔ سعودی عرب، قطر، عمان، بحرین اور متحدہ عرب امارات جیسے ممالک اس تصادم کے سائے میں آچکے ہیں۔

ایران نے ایک طرف آبنائے ہرمز کو بند کرنے کا اعلان کیا ہے، جبکہ دوسری طرف خلیجی ممالک کے اندر موجود توانائی کے بنیادی ڈھانچے، امریکی سفارت خانوں اور ایئرپورٹس کو بھی نشانہ بنایا ہے۔ جیسے جیسے یہ جنگ پھیل رہی ہے، خطے میں جانی اور مالی نقصان بڑھتا جا رہا ہے۔ اس پس منظر میں یہ سوال نہایت اہم ہو جاتا ہے کہ اسرائیل اور امریکا کے ایران پر حملوں کے بعد شروع ہونے والی اس جنگ کے خلیجی عرب ممالک اور پورے مشرق وسطیٰ پر کیا اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔

اسی تناظر میں دو بنیادی سوالات سامنے آتے ہیں:

ایران امریکی اڈوں کے ساتھ ساتھ خلیجی ممالک کے غیر فوجی اہداف کو کیوں نشانہ بنا رہا ہے؟

اس تنازع کا خلیجی ممالک کے باہمی تعلقات اور امریکا کے ساتھ ان کے تعلقات پر کیا اثر پڑ سکتا ہے؟

اگر موجودہ صورتحال کا جائزہ لیا جائے تو امریکا اور اسرائیل کا دعویٰ ہے کہ ایران میں کئی اہم فوجی اور سیاسی اہداف کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ ان کے مطابق رہبر اعلیٰ کے کمپاؤنڈ، پاسداران انقلاب کے کمانڈ اینڈ کنٹرول سینٹر اور صدارتی دفتر سمیت کئی اہم مقامات کو تباہ کیا گیا۔ امریکی حکام کے مطابق پہلے 48 گھنٹوں میں ایران کے اندر 1200 سے زائد اہداف پر حملے کیے گئے۔ دوسری جانب ایران کا کہنا ہے کہ جنوبی ایران میں منیاب کے مقام پر ایک اسکول پر تین میزائل داغے گئے جن میں 150 سے زائد طالبات شہید ہوئیں۔ اسی طرح کرمان شاہ اور تبریز میں فوجی تنصیبات، جبکہ بندرعباس اور کنار کے علاقوں میں ایرانی بحری تنصیبات کو نشانہ بنایا گیا۔

امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے دعویٰ کیا کہ امریکی افواج نے ایران کے 28 بحری جہاز تباہ کر دیے اور ایران کے بحری ہیڈ کوارٹر کو تقریباً ناکارہ بنادیا۔ ایران نے پہلے ہی خبردار کیا تھا کہ اگر اس پر حملہ ہو تو وہ پورے خطے میں امریکی اور اسرائیلی مفادات کو نشانہ بنائے گا۔ اور واقعی یہی ہوا۔ ایران نے اپنی جوابی کارروائی میں اسرائیل کے علاوہ کویت، اردن، بحرین، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات میں موجود امریکی فوجی اڈوں پر سینکڑوں میزائل داغے اور تقریباً ایک ہزار ڈرون حملے کیے۔ بحرین میں امریکی بحریہ کے ففٹھ فلیٹ ہیڈ کوارٹر، سعودی عرب کی راس تنورہ آئل ریفائنری اور دبئی کی جبل علی بندرگاہ جیسے اہم مراکز کو نشانہ بنایا گیا۔

یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے، کیا امریکا کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ ایران اس طرح پورے خطے میں جوابی کارروائی کرے گا؟ تجزیہ کاروں کے مطابق امریکا کو اس بات کا مکمل اندازہ تھا کہ ایران رد عمل دے گا۔ درحقیقت جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی امریکی فوج نے اپنی کئی اہم تنصیبات کو محفوظ مقامات پر منتقل کر دیا تھا۔ بحرین میں موجود پانچویں بحری بیڑے کے کچھ جہاز ہٹا دیے گئے، قطر کے العدید ایئر بیس سے کئی طیارے منتقل کر دیے گئے اور کچھ فارورڈ آپریشننگ پوزیشنز کو اردن اور اسرائیل کے اندر منتقل کیا گیا یعنی جنگ کی قیمت اور اس کے ممکنہ اثرات پہلے ہی حساب میں لائے جا چکے تھے۔

اگرچہ فوجی نقصان کی شدت کے بارے میں مختلف آراء موجود ہیں، لیکن ایک چیز پر سب متفق ہیں کہ اس جنگ کی معاشی قیمت مسلسل بڑھ رہی ہے۔ تیل اور گیس کی عالمی قیمتیں تیزی سے اوپر جا رہی ہیں۔ عالمی مارکیٹوں میں بے یقینی بڑھ رہی ہے اور سرمایہ کار محتاط ہو گئے ہیں۔ معاشی ماہرین کا کہنا ہے کہ مارکیٹیں عموماً غیر متوقع واقعات پر شدید رد عمل دیتی ہیں، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ اکثر حالات معمول پر واپس آ جاتے ہیں۔ تاہم مشرق وسطیٰ کی جنگوں کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ اکثر مختصر نہیں ہوتیں۔

خلیجی ممالک کے اندر بڑھتی بے چینی اب ایک نئی بحث جنم لے رہی ہے۔ کچھ سعودی حکام اب کھلے عام یہ کہہ رہے ہیں کہ امریکا کی دفاعی حکمت عملی کا اصل مرکز اسرائیل ہے، نہ کہ خلیجی ممالک۔ ان کا کہنا ہے کہ امریکا اسرائیل کی سلامتی کے بارے میں تو فوری رد عمل دیتا ہے، لیکن خلیجی ممالک کو پہنچنے والے نقصانات پر اتنی سنجیدگی نہیں دکھاتا۔ یہ احساس بہت حد تک درست اور خلیجی ممالک میں ایک طرح کی ناراضی کو جنم دے رہا ہے۔ سیاسی نظام جب دباؤ میں آتے ہیں تو ان کے اندر موجود دراڑیں بھی نمایاں ہو جاتی ہیں۔ یہی صورتحال اب خلیجی خطے میں نظر آرہی ہے۔



ایران خلیجی ممالک کو کیوں نشانہ بنا رہا ہے؟ یہ سوال اس جنگ کا سب سے اہم پہلو ہے۔ ایران کا موقف یہ ہے کہ وہ براہ راست خلیجی ممالک کو نشانہ نہیں بنا رہا بلکہ ان ممالک میں موجود امریکی فوجی اڈوں کو نشانہ بنا رہا ہے۔ ایرانی وزیر خارجہ عباس عراقچی کے مطابق "اگر امریکا ہمارے خلاف حملے ان اڈوں سے کرتا ہے تو وہ اڈے ہمارے لیے جائز فوجی اہداف ہیں" لیکن حقیقت اس سے زیادہ پیچیدہ ہے۔ کچھ حملے ایسے بھی ہوئے ہیں جن میں خلیجی ممالک کے شہری انفراسٹرکچر کو نقصان پہنچا ہے، مثلاً متحدہ عرب امارات کے ایئرپورٹس یا بحرین کے بعض شہری علاقے۔ یہ محض حادثہ نہیں لگتا۔ زیادہ تر تجزیہ کاروں کے مطابق ایران دراصل جنگ کی قیمت پورے خطے کیلئے بڑھانا چاہتا ہے۔ اگر خلیجی ممالک کو اس جنگ کا معاشی اور سیاسی نقصان ہو گا تو وہ امریکا پر دباؤ ڈالیں گے کہ وہ جنگ ختم کرے۔

کیا خلیجی ممالک جنگ میں شامل ہوں گے؟ یہ بھی ایک اہم سوال ہے۔ خلیجی ممالک نے سخت بیانات ضرور دیے ہیں لیکن انہوں نے ابھی تک براہ راست فوجی کارروائی نہیں کی۔ اس کی ایک بڑی وجہ صلاحیت کی کمی بھی ہے۔ اگر ان کے پاس مکمل دفاعی صلاحیت ہوتی تو خطے میں اتنے بڑے امریکی فوجی اڈے موجود نہ ہوتے۔ قطر میں العدید ایئر بیس، بحرین میں ففٹھ فلیٹ اور سعودی عرب میں امریکی فوجی تنصیبات اس بات کا ثبوت ہیں کہ خلیجی ممالک اپنی سلامتی کیلئے امریکا پر انحصار کرتے ہیں۔

اس جنگ کا ایک بڑا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ خلیج میں عسکریت پسندی بڑھ جائے۔ ایران کے ڈرون اور میزائل پروگرام نے خلیجی ممالک کو یہ احساس دلایا ہے کہ وہ براہ راست خطرے میں ہیں۔ ایران کے شہید ڈرونز تقریباً 2000 کلومیٹر تک مار کر سکتے ہیں، جس کا مطلب ہے کہ پورا خلیجی خطہ ان کی پہنچ میں ہے۔ اسی لیے خلیجی ممالک پہلے ہی میزائل دفاعی نظاموں پر اربوں ڈالر خرچ کر رہے ہیں۔

اس جنگ کا سب سے بڑا اثر عام لوگوں پر پڑ رہا ہے۔ خلیجی ممالک کی معیشتیں عالمی سرمایہ کاری اور بیرونی افرادی قوت پر قائم ہیں۔ پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش کے لاکھوں لوگ وہاں کام کرتے ہیں۔ اب جب ایئرپورٹس بند ہیں اور میزائل حملوں کا خطرہ موجود ہے تو ہزاروں لوگ وہاں پھنس گئے ہیں۔ کئی مسافروں کی دل دہلا دینے والی کہانیاں میڈیا پر سامنے آرہی ہیں۔ ایک امریکی خاتون نے روتے ہوئے کہا "ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ہم بھی ایسے حالات میں پھنس جائیں گے"۔ ایک اور مسافر نے بتایا کہ وہ میزائل حملوں سے بچنے کیلئے پہاڑوں کی طرف بھاگ گئے۔ یہ صورتحال اس حقیقت کی یاد دہانی ہے کہ جنگ ہمیشہ عام انسان کی زندگی کو سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے۔

کیا امریکا اور خلیجی ممالک کے تعلقات بدل رہے ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ مختصر مدت میں شاید نہیں۔ امریکا اب بھی خلیجی ممالک کا سب سے بڑا سیوریٹی فراہم کرنے والا ہے۔ لیکن طویل مدت میں تبدیلی کے آثار نظر آرہے ہیں۔ خلیجی ممالک اب اپنی دفاعی پالیسیوں کو متنوع بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ چین، یورپ اور دیگر ممالک کے ساتھ دفاعی تعاون بڑھا رہے ہیں تاکہ مکمل طور پر امریکا پر انحصار نہ کرنا پڑے۔

ادھر دوسری طرف مشرق وسطیٰ کی نئی جنگ اور عالمی سیاست کے وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو ایران کی جانب سے آبنائے ہرمز کو بند کرنے کی دھمکی نے عالمی معیشت میں بے چینی پیدا کر دی ہے۔ یہ سمندری راستہ دنیا کے سب سے اہم توانائی کے راستوں میں شمار ہوتا ہے۔ عالمی سطح پر تیل کی ایک بڑی مقدار اسی راستے سے گزرتی ہے۔ اگر اس راستے میں رکاوٹ پیدا ہو جائے تو نہ صرف تیل کی قیمتوں میں غیر معمولی اضافہ ہو سکتا ہے بلکہ عالمی تجارتی نظام بھی متاثر ہو سکتا ہے۔ ابھی ایران کی طرف سے مسلسل یہ اعلان سامنے آ رہا ہے کہ اس نے آبنائے ہرمز بند نہیں کی لیکن تیل کی عالمی قیمتیں آسمان کی طرف پرواز کرتی دکھائی دے رہی ہیں اور دنیا بھر کے اسٹاک ایکسچینج میں مندی کی اطلاعات آنا شروع ہو گئی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ امریکا اور اس کے اتحادی ہمیشہ اس بات کو یقینی بنانے کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ آبنائے ہرمز کھلی رہے۔ ایران اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے اور اسی لیے اس نے بارہا اس راستے کو ایک اسٹریٹجک دباؤ کے آلے کے طور پر استعمال کرنے کی دھمکی دی ہے۔ پاسداران انقلاب کے کمانڈر نے ٹرمپ کی دھمکیوں کے جواب میں کہا ہے کہ آبنائے ہرمز سے کسی بھی تجارتی جہاز کیلئے کھول کر دکھاؤ، جس کے بعد تمام عالمی جہازوں کے کمپنیوں نے اپنے جہازوں کو اس روٹ کو استعمال کرنا چھوڑ دیا ہے۔ موجودہ جنگ میں بھی یہی حکمت عملی نظر آتی ہے۔ ایران یہ پیغام دینا چاہتا ہے کہ اگر اس کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہو تو وہ عالمی معیشت کیلئے بھی مشکلات پیدا کر سکتا ہے۔

ہر جنگ صرف میدان جنگ میں نہیں لڑی جاتی بلکہ اس کا ایک بڑا حصہ نفسیاتی اور اطلاعاتی جنگ پر مشتمل ہوتا ہے۔ موجودہ جنگ میں بھی یہی عنصر نمایاں ہے۔ ایران، اسرائیل اور امریکائیوں اپنی اپنی کامیابیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کر رہے ہیں جبکہ نقصانات کو کم ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میڈیا کے ذریعے عوامی رائے کو متاثر کرنا بھی اس جنگ کا ایک اہم حصہ بن چکا ہے۔ ایک طرف ایرانی میڈیا اپنے عوام کو یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہا ہے کہ وہ ایک بڑی عالمی طاقت کے خلاف مزاحمت کر رہے ہیں، جبکہ دوسری طرف اسرائیلی اور امریکی میڈیا اس جنگ کو ایران کے عسکری ڈھانچے کو کمزور کرنے کی مہم کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔

خلیجی ممالک کیلئے یہ جنگ صرف ایک خارجی مسئلہ نہیں بلکہ داخلی سطح پر بھی ایک بڑا چیلنج ہے۔ گزشتہ تین دہائیوں میں ان ممالک نے اپنے آپ کو ایک ایسے خطے کے طور پر پیش کیا ہے جہاں معاشی ترقی، جدید انفراسٹرکچر اور عالمی سرمایہ کاری کو فروغ دیا جاتا ہے۔ دبئی، دوحہ اور ریاض جیسے شہر اس پالیسی کی مثال ہیں۔ یہاں دنیا بھر سے سرمایہ کار، سیاح اور مزدور آتے ہیں۔ لیکن جنگ کے ماحول میں یہ ماڈل شدید دباؤ کا شکار ہو سکتا ہے۔ اگر خطے میں مسلسل عدم استحکام پیدا ہوتا ہے تو عالمی سرمایہ کار محتاط ہو سکتے ہیں اور سیاحت و تجارت پر منفی اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خلیجی ممالک اس جنگ کے جلد خاتمے کے خواہاں نظر آتے ہیں۔

تاہم ایران کی عسکری اور سیاسی حکمت عملی کو سمجھنے کیلئے اس کے تاریخی تجربات کو مد نظر رکھنا ضروری ہے۔ ایران نے 1980 کی دہائی میں عراق کے ساتھ آٹھ سالہ طویل جنگ کا سامنا کیا تھا جس میں اسے شدید جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا۔ اس جنگ کے بعد ایران نے اپنی دفاعی پالیسی میں بنیادی تبدیلیاں کیں۔ اس نے روایتی فوجی طاقت کے بجائے میزائل پروگرام، ڈرون ٹیکنالوجی اور علاقائی اتحادی گروہوں پر زیادہ انحصار کرنا شروع کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج ایران کے پاس ایک ایسا میزائل اور ڈرون نیٹ ورک موجود ہے جو پورے خطے میں اثر انداز ہو سکتا ہے۔ موجودہ جنگ میں ایران اسی حکمت عملی کو استعمال کر رہا ہے۔ وہ براہ راست محاذ آرائی کی بجائے مختلف محاذوں پر دباؤ ڈال کر اپنے مخالفین کو تھکانے کی کوشش کر رہا ہے۔

اسرائیل کی پالیسی ہمیشہ سے یہ رہی ہے کہ وہ اپنے ممکنہ خطرات کو ابتدائی مرحلے میں ہی ختم کرنے کی کوشش کرے۔ اسی اصول کے تحت اس نے ماضی میں عراق اور شام کے جوہری پروگراموں کو نشانہ بنایا تھا۔ اسرائیل کیلئے ایران کا عسکری پروگرام اور اس کے علاقائی اتحادی ایک بڑا خطرہ سمجھے جاتے ہیں۔ اسی لیے اسرائیل بارہا یہ اعلان کر چکا ہے کہ وہ ایران کو جوہری یا عسکری برتری حاصل کرنے کی اجازت نہیں دے گا۔ موجودہ جنگ کو بھی اسی پالیسی کا تسلسل سمجھا جاسکتا ہے۔

مشرق وسطیٰ کی کسی بھی بڑی جنگ میں عالمی طاقتوں کا کردار ہمیشہ اہم رہا ہے۔ امریکا تو براہ راست اس تنازع کا حصہ ہے، لیکن چین، روس اور یورپی ممالک بھی اس صورتحال پر گہری نظر رکھے ہوئے ہیں۔ چین کی معیشت توانائی کے درآمدی وسائل پر انحصار کرتی ہے، اس لیے اسے خلیجی خطے میں استحکام کی ضرورت ہے۔ روس بھی اس خطے میں اپنی سفارتی اور عسکری موجودگی کو برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ ممکن ہے کہ آنے والے دنوں میں یہ ممالک جنگ بندی یا سفارتی حل کی کوششوں میں کردار ادا کریں۔ موجودہ صورتحال کو دیکھتے ہوئے چند ممکنہ منظر نامے سامنے آسکتے ہیں۔

☆ پہلا منظر نامہ یہ ہے کہ جنگ محدود دائرے میں رہتے ہوئے چند ہفتوں یا مہینوں میں ختم ہو جائے۔ اس صورت میں دونوں فریق اپنی اپنی کامیابیوں کا اعلان کر کے پیچھے ہٹ سکتے ہیں۔

☆ دوسرا منظر نامہ یہ ہے کہ جنگ طویل ہو جائے اور خطے کے مزید ممالک اس میں شامل ہو جائیں۔ یہ صورتحال عالمی معیشت کیلئے انتہائی خطرناک ہو سکتی ہے۔

☆ تیسرا منظر نامہ یہ ہے کہ بین الاقوامی دبا کے نتیجے میں سفارتی مذاکرات شروع ہو جائیں اور کسی سمجھوتے کے ذریعے کشیدگی کم کر دی جائے۔

ہر جنگ کی طرح اس جنگ کا سب سے بڑا نقصان عام لوگوں کو اٹھانا پڑ رہا ہے۔ شہری آبادیوں پر حملوں، نقل مکانی اور معاشی مشکلات نے لاکھوں لوگوں کی زندگیوں کو متاثر کیا ہے۔ بچے، خواتین اور بزرگ وہ طبقہ ہیں جو سب سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ جنگی ماحول میں تعلیم، صحت اور روزگار کے مواقع محدود ہو جاتے ہیں اور معاشرتی ڈھانچہ کمزور پڑنے لگتا ہے۔ یہ انسانی پہلو اکثر سیاسی بحثوں میں نظر انداز ہو جاتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جنگ کی اصل قیمت یہی عام لوگ ادا کرتے ہیں۔ اگر مجموعی طور پر اس جنگ کا جائزہ لیا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ مشرق وسطیٰ ایک بار پھر ایک اہم تاریخی موڑ پر کھڑا ہے۔ اس جنگ کے اثرات صرف ایران، اسرائیل یا خلیجی ممالک تک محدود نہیں رہیں گے بلکہ عالمی سیاست اور معیشت کو بھی متاثر کریں گے۔

یہ کہنا بھی قبل از وقت ہے کہ یہ جنگ کس سمت جائے گی، لیکن ایک بات یقینی ہے کہ اس کے اثرات طویل عرصے تک محسوس کیے جائیں گے۔ مشرق وسطیٰ کی تاریخ ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ یہاں ہونے والی جنگیں کبھی صرف میدان جنگ تک محدود نہیں رہتیں بلکہ وہ عالمی طاقتوں کی سیاست، توانائی کی منڈیوں اور بین الاقوامی تعلقات کو بھی نئی شکل دیتی ہیں۔ ممکن ہے کہ آنے والے برسوں میں مؤرخین اس جنگ کو اکیسویں صدی کے ان واقعات میں شمار کریں جو عالمی نظام کے توازن کو بدلنے کا سبب بنے۔

اگر اس پوری صورتحال کو ایران کے زاویے سے دیکھا جائے تو یہ صرف جوابی کارروائی نہیں بلکہ بقا کی جنگ بن چکی ہے۔ ایران یہ واضح کرنا چاہتا ہے کہ اگر وہ غیر مستحکم ہو تو پورا خطہ بھی غیر مستحکم ہو جائے گا۔ دوسری طرف خلیجی ممالک ایک مشکل صورتحال میں پھنس چکے ہیں۔ اگر جنگ طویل ہو جاتی

ہے تو اس کی سب سے بڑی قیمت شاید انہی ممالک کو ادا کرنا پڑے گی۔ ان کی معیشت، سلامتی اور عالمی سرمایہ کاری سب خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ اس جنگ کا حقیقی میدان شاید ایران اور اسرائیل نہ ہوں بلکہ پورا مشرق وسطیٰ ہو۔ اور تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ جب مشرق وسطیٰ میں جنگیں شروع ہوتی ہیں تو ان کے اثرات صرف خطے تک محدود نہیں رہتے بلکہ پوری دنیا کو متاثر کرتے ہیں۔

بدھ 12 ذیقعدہ 1447ھ 29 اپریل 2026ء

بیانیہ، راز اور عالمی کھیل

بیسویں اور اکیسویں صدی کی سیاسی تاریخ ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ طاقت کبھی بھی محض قوت فیصلہ کا نام نہیں رہی؛ بلکہ وہ اکثر اثر، دباؤ، پوشیدہ مفادات کا ایک پیچیدہ جال ہوتی ہے۔ بعض اوقات ایسے واقعات سامنے آتے ہیں جن میں بڑے پیمانے پر دستاویزات، تصاویر یا شواہد کے دعوے کیے جاتے ہیں، ایسے دعوے جو بظاہر کسی فرد کی ذاتی زندگی سے کہیں بڑھ کر ایک وسیع تر نظامی بحران کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ لیکن یہاں احتیاط لازم ہے ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی، اور ہر سایہ حقیقت کا عکس نہیں ہوتا۔

یہ سوال کہ کوئی شخص اپنے مبینہ جرائم کا اتنا وسیع ریکارڈ کیوں رکھے گا، بظاہر حیران کن ہے۔ مگر تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ بعض اوقات طاقت کا کھیل صرف دولت یا عہدے سے نہیں کھیلا جاتا، بلکہ معلومات اور راز اس کھیل کی اصل کرنی ہوتے ہیں جیسا کہ ایک قدیم مقولہ ہے راز وہ تلوار ہے جس کا دستہ دکھائی نہیں دیتا، مگر وار گہرا ہوتا ہے۔

اسی تناظر میں، بعض مبصرین یہ مفروضہ پیش کرتے ہیں کہ طاقتور حلقوں کے مابین تعلقات محض رسمی یا سفارتی نہیں ہوتے، بلکہ ان میں ذاتی کمزوریوں، باہمی مفادات اور بعض اوقات دباؤ کے عناصر بھی شامل ہو سکتے ہیں۔ تاہم، ایک سنجیدہ تحقیقی ذہن کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ قیاس اور ثبوت کے درمیان حد فاصل کو برقرار رکھے۔ اقوام متحدہ یا دیگر اداروں کی رپورٹس بھی اسی وقت معتبر ہوتی ہیں جب وہ آزادانہ تحقیق، شفاف طریقہ کار اور قابل تصدیق شواہد پر مبنی ہوں، جہاں تک عالمی قیادت کے بعض فیصلوں کا تعلق ہے جو بظاہر عوامی مفاد کے خلاف محسوس ہوتے ہیں تو یہ انسانی تاریخ کا ایک پرانا المیہ ہے۔ جنگوں، پابندیوں، اور پالیسیوں کے پیچھے کارفرما عوامل اکثر کثیر الجہتی ہوتے ہیں۔ معاشی مفادات، جغرافیائی سیاست، داخلی دباؤ، اور نظریاتی وابستگیوں یہ سب مل کر وہ تصویر بناتے ہیں جو بظاہر سادہ نظر آتی ہے مگر حقیقت میں نہایت پیچیدہ ہوتی ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے دریا کی گہرائی کا اندازہ کنارے سے نہیں ہوتا۔

یہ ہمارے عہد کا المیہ بھی ہے اور امتیاز بھی کہ ہم ایک ایسی دنیا میں سانس لے رہے ہیں جہاں معلومات کا سیلاب ہے مگر یقین کی زمین بخر ہوتی جا رہی تاریخ کے اوراق جب بھی کھلتے ہیں، تو ان میں انسانی عظمت کے ساتھ ساتھ انسانی کمزوری کی داستانیں بھی ثبت ہوتی ہیں۔ اقتدار کے ایوان ہے۔ جو بظاہر شیشے کے محل معلوم ہوتے ہیں، اکثر اندر سے ایسے اسرار و موز سے بھرے ہوتے ہیں جنہیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سوال جنم لیتا ہے کیا اقتدار خود ایک امتحان ہے، یا ایک فریب؟

ہر روز کوئی نہ کوئی روایت، کوئی دستاویز، یا کوئی ویڈیو سامنے آتی ہے جو بظاہر اقتدار کے ایوانوں کے پردے چاک کرتی ہے مگر سوال یہ ہے کہ کیا ہر داستان اور انکشاف روشنی ہے، یا کبھی کبھی وہ خود ایک نیا سایہ بھی پیدا کرتی ہے؟ یہ محض ایک داستان نہیں؛ یہ ہمارے عہد کا آئینہ ہے، ایک ایسا آئینہ جس میں چہرے بھی نظر آتے ہیں اور نقاب بھی۔ سوال یہ نہیں کہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں؛ سوال یہ ہے کہ ہم کیا ماننے کو تیار ہیں؟

کبھی کبھار ایسے دعوے سامنے آتے ہیں جن میں کہا جاتا ہے جیفری پیسنین فائلز کسی خفیہ حقیقت کا ثبوت ہیں۔ بادی النظر میں ذہن پر ایک ہیبت طاری ہوتی ہے گویا سچائی کا پہاڑ ہمارے سامنے کھڑا ہو۔ یہ مقدار و دیکھ دلیل معلوم ہوتی ہے گویا حجم ہی صداقت کا مترادف ہو۔ اگر یہ دعویٰ درست

ہو، تو یہ محض ایک فرد کی لغزش کا ریکارڈ نہیں بلکہ ایک وسیع تر نظام کی علامت بن جاتا ہے، کیونکہ بعض اوقات اعداد و شمار کا ہجوم، استدلال کی کمزوری کو چھپانے کا ہنر بھی ہوتا ہے مگر یہاں سوال وہی ہے، کیا کثرتِ مواد، صداقت کی ضمانت ہے یا محض تاثر کی شدت؟

بعض اوقات بیانیے کی مہارت، ثبوت کی کثرت، صداقت کی ضمانت کی تحقیق بھی لازم ہے۔ یہاں سوال یہ نہیں کہ مواد کتنا ہے، بلکہ یہ ہے کہ اس کی تصدیق کیسے ہوئی، اس کا ماخذ کیا ہے، اور اس کی تشریح کس زاویے سے کی جا رہی ہے۔ کیا یہ مواد آزادانہ طور پر تصدیق شدہ ہے؟ کیا اس کے ماخذ شفاف ہیں؟ اور کیا اس کی تعبیر غیر جانبدار ہے؟ جہاں ثبوت کا شور زیادہ ہو، وہاں سوال کی آواز اور بلند ہونی چاہیے۔

یہ دعوے کہ دنیا کے با اثر حلقوں میں اخلاقی انحطاط اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے، یقیناً چونکا دینے والے اور انسانیت کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کیلئے کافی ہیں۔ ایسے بیانیوں میں اکثر اخلاقی انحطاط، طاقت کے ناجائز استعمال، اور انسانی حقوق کی پامالی کے واقعات بیان کیے جاتے ہیں۔ یہ موضوعات بذاتِ خود نہایت سنجیدہ ہیں، اور دنیا کی تاریخ ان سے خالی نہیں۔ مگر ایک مہذب، ذمہ دار تجربہ کار کیلئے ضروری ہے کہ وہ ثابت شدہ حقائق اور مبہم دعوؤں کے درمیان واضح فرق قائم رکھے، تاکہ قاری جذباتی بیجان کا شکار ہونے کی بجائے فکری توازن برقرار رکھ سکے اور وہ دعوے کو اس کے ماخذ، تحقیقاتی معیار، اور تصدیقی حیثیت کے ساتھ پرکھے ورنہ آگ کا دھواں حقیقت اور افسانے کو ایک ہی رنگ میں رنگ دیتا ہے۔

لیکن یہاں ہمیں ایک نازک فرق کو سمجھنا ہو گا۔ انفرادی جرائم اور اجتماعی سازشیں دو الگ دائرے ہیں۔ اگر تاریخ میں ظلم ہوا ہے، تو انصاف بھی ہوا ہے؛ اگر اندھیرے ہیں، تو روشنی کے چراغ بھی بجھے نہیں۔ مگر ایک بیانیہ جو ہر واقعے کو ایک ہی عظیم سازش کے دھاگے میں پرونا چاہتا ہے، وہ اکثر پیچیدہ حقیقت کو سادہ کہانی میں بدل دیتا ہے۔

کیا جیفری ایپسٹن کی تین ملین دستاویزات جس میں 2 ہزار سے زائد ویڈیوز، ایک لاکھ 80 ہزار سے زائد تصاویر کے پیچھے کوئی ناقابل فہم داستان چھپی ہوئی ہے؟ آخر کوئی کیوں اپنے اس قدر ہولناک جرائم کا اتنا مکمل اور مستقل ریکارڈ بنائے گا؟ اس کا پیمانہ ہمیں جواب دیتا ہے، یہ صرف ایک آدمی کی بد حالی کا ریکارڈ نہیں تھا، یہ عالمی اشرفیہ کی کرپشن کا کیڑا لگ تھا، فائلوں میں ارب پتیوں، غیر ملکی معززین، شہزادیوں، ماہرین تعلیم، اعلیٰ سفارت کاروں اور جی ہاں، امریکا کے سابق اور موجودہ صدر کے نام بھی موجود ہیں۔

ہم نے فحش ای میلز، جنسی طور پر واضح خطوط، مجرمانہ تصاویر دیکھی ہیں لیکن یہ سمجھوتہ کرنے والے مواد سے کہیں آگے ہے، ایپسٹن پر اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ میں جنسی غلامی، تشدد اور قتل سمیت بچوں کے خلاف جرائم کے ثبوت بھی موجود ہیں۔ یہ تصور کہ طاقتور افراد ایک دوسرے پر راز کے ذریعے اثر انداز ہوتے ہیں، نیا نہیں۔ سرد جنگ کے دور سے لے کر جدید سفارت کاری تک، معلومات ہمیشہ ایک طاقت رہی ہے۔

تو ہم مرکزی سوال کی طرف لوٹتے ہیں کہ سب کیوں ریکارڈ کیا گیا؟ جیفری ایپسٹن کے چھوٹے جزیرے سینٹ جیمز پر چھپے ہوئے کیمرے ذاتی تسکین کیلئے نہیں تھے، وہ ایک ٹول تھے۔ ایپسٹن فائدہ اٹھانے کی ایک لائبریری بنا رہا تھا، اب یہ بڑے پیمانے پر بتایا گیا ہے کہ وہ ایک انٹیلی جنس اثاثہ تھا، اسرائیل کے موساد سے آرڈر لے رہا تھا۔ مقصد واضح تھا کہ زمین کے طاقتور ترین لوگوں کو جرائم کے جال میں پھنسا یا جائے، جس کا مقصد ان سب کو ایک غیر ملکی قوم صہیونی اسرائیل کی مرضی کے مطابق جھکانا ہے۔



یہ انکشاف کہ خفیہ کیمرے اور ریکارڈنگ کسی وسیع تر دباؤ یا اثر و رسوخ کے نظام کا حصہ تھے، ایک ایسا خیال ہے جو جدید سیاسی تجربے میں بار بار ابھرتا ہے۔ تاریخ میں بھی ہمیں ایسے اشارے ملتے ہیں جہاں معلومات کو طاقت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ یہ تصور کہ راز، اقتدار کا خاموش سکہ ہیں، کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ سیاست کے ایوانوں میں جہاں مسکراہٹیں سفارت ہوتی ہیں وہیں پس پردہ معلومات کا تبادلہ ایک غیر مرئی قوت کے طور پر موجود رہتا ہے۔ طاقتور افراد ایک دوسرے پر راز کے ذریعے اثر انداز ہوتے ہیں، یہ حربہ نیا نہیں۔ سرد جنگ کے دور سے لے کر جدید سفارت کاری تک، معلومات ہمیشہ ایک طاقت رہی ہے۔ مگر یہاں ایک اہم سوال اٹھتا ہے، کیا ہر راز، غلامی کا

سبب بنتا ہے؟ یا بعض اوقات یہ محض انسانی کمزوری کا عکس ہوتا ہے، نہ کہ کسی منظم عالمی جال کا ثبوت؟

جیسا کہ کہا جاتا ہے، ہر سرگوشی سازش نہیں ہوتی، اور ہر سایہ دیوار نہیں ہوتا جیسا کہ "جنگ کی ہنگامہ خیزی میں سچ اس قدر نایاب اور قیمتی ہو جاتا ہے کہ اس کی نگہبانی کیلئے جھوٹ کے محافظ کھڑے کرنے پڑتے ہیں، سچ بہت قیمتی ہوتا ہے مگر یہ ہمیشہ وضاحت کا محتاج رہتا ہے"۔ حقیقت اور بیانیہ اکثر ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔

آج کے اس پر فتن دور میں ہر باضمیر اور امن پسند انسان پوچھ رہا ہے کہ کیا آپ نے کبھی کسی عالمی رہنما کو غرہ کو نہ صرف کھنڈرات میں تبدیل کر کے جبری طور پر وہاں اپنی مرضی کا نیا سیاسی شہر بنانے کیلئے اسی خطے کے دیگر ممالک کو سرمایہ فراہم کرنے کا حکم دیا جائے اور اس کا مکمل کنٹرول اپنے ہاتھ میں رکھنے کا واضح اعلان کر کے بادی النظر میں ناجائز اور ظالم ملک اسرائیل کو تحفظ فراہم کرنے کے پلان کو عملی طور پر حقیقت بنایا جائے، اپنے ہی لوگوں کے مفاد کے خلاف اتنا حیران کن، اتنا ظالمانہ فیصلہ کرتے دیکھا ہے؟ کیا آپ نے سوچا کہ یہ کیسے ممکن ہے، ایک لیڈر اس قدر اتفاقی طور پر شہریوں پر بمباری کر کے ہزاروں لوگوں کی ہلاکتوں کی نگرانی کر سکتا ہے، غیر ملکی رہنماؤں کو اغوا یا قتل کر سکتا ہے اور بغیر کسی پچھتاوے کے جھوٹ بول سکتا ہے، وہ خود کو اتنے معصوم کیسے محسوس کر سکتے ہیں کہ انہیں یقین ہو کہ وہ بیکس اور معصوم بچوں، عورتوں، بوڑھوں، اور جوانوں کے قتل سے بچ سکتے ہیں اور پھر بھی دوبارہ منتخب ہو سکتے ہیں۔

ایمبسٹن فائلیں ایک خوفناک معقول جواب فراہم کرتی ہیں۔ وہ اس طرح کام نہیں کر رہے کیونکہ وہ مضبوط ہیں؟ وہ اس طرح کام کر رہے ہیں کیونکہ وہ سمجھوتہ کر رہے ہیں، ان کا ماضی ان کے خلاف ایک ہتھیار ہے کیونکہ وہ کرتے ہیں جو انہیں کہا جاتا ہے، وفاداری کی وجہ سے نہیں بلکہ وہ اپنے جرائم کے انکشاف کے خوف یا رازداری کی حفاظت کی اشد ضرورت کے تحت ان جرائم کا ارتکاب جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اور ان جرائم کا راستہ ہمیں ٹرمپ تک بھی پہنچتا ہے۔ ان کے فیصلہ سازی کی افراط فری کو دیکھیں، نوڈا سٹامپ، میڈیکلڈ اور ہاؤسنگ سبسڈی میں کمی کرتے ہوئے اربوں ڈالرز کے فوجی ہارڈ ویئر اسرائیل کو بھیجے گئے۔ ٹیرف کا ہتھیار بنانا، غرہ میں جنگی جرائم میں غیر متزلزل شراکت، اور اب ایران کے ساتھ ایک نئی جنگ کی طرف بڑھنا جو تیسری جنگ عظیم شروع کرنے کا حقیقی امکان لئے ہوئے ہے۔

یہ سوال بجا ہے کہ بعض عالمی فیصلے عوامی مفاد سے متصادم کیوں محسوس ہوتے ہیں۔ جنگیں، پابندیاں، اور سیاسی اتحاد یہ سب بسا اوقات ایسے نتائج پیدا کرتے ہیں جو اخلاقی طور پر تشویشناک ہوتے ہیں۔ مگر ان کی وجوہات کو صرف ایک خفیہ سازش تک محدود کر دینا ضرورت سے بڑھ کر سادہ کاری اور سہل ہو گا جبکہ حقیقت اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے۔

عالمی رہنماؤں کو کسی منظم منصوبے کے تحت قابو کیا جاتا ہے، بظاہر ایک نہایت سنگین مفروضہ رہا ہے۔ جب کوئی عالمی رہنما ایسا فیصلہ کرتا ہے جو عوامی مفاد کے خلاف محسوس ہو، تو دل میں ایک اضطراب جنم لیتا ہے۔ مگر کیا ہر متنازع فیصلہ کسی خفیہ دباؤ کا نتیجہ ہوتا ہے؟ یہاں ہمیں سیاسی پیچیدگی کو پوری سنجیدگی کے ساتھ دیکھنا ہو گا۔ تاریخی طور پر، داخلی سیاست، بین الاقوامی تعلقات اور دباؤ، معاشی مفادات، طاقت کے توازن، اور سفارتی اور دفاعی حکمت عملی کا مرکب رہے ہیں اور یہ سب عوامل مل کر فیصلوں کی تشکیل کرتے ہیں، نہ کہ صرف خفیہ دباؤ کا نتیجہ۔

ہم اس خیال کو کہ رہنما اپنے ماضی کے بوجھ تلے دب کر فیصلے کرتے ہیں، یا کسی راز کی وجہ سے مجبور ہو جاتے ہیں، ایک دلکش، پرکشش مگر خطرناک مفروضہ بھی قرار نہیں دے سکتے لیکن اگر ان فیصلوں کو بلیک میلنگ کا نتیجہ قرار دیں، تو اس سے جہاں اداروں کی اہمیت کم ہو جاتی ہے، جمہوری عمل نظر انداز ہونے کے خدشات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، وہاں انسانی قدروں کو بے قدری اور بے توقیری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یاد رکھیں کہ انسان کمزور ہو سکتا ہے، مگر ہر کمزوری غلامی پر مجبور نہیں کر سکتی۔ اگرچہ انسانی کمزوری ایک حقیقت ہے، مگر اداروں، آئینی ڈھانچوں، اور جمہوری عمل کو نظر انداز کر دینا ہمیں حقیقت سے دور لے جاسکتا ہے۔

ایک سنجیدہ مضمون نگار کیلئے اصل چیلنج یہی ہے کہ وہ نہ تو اندھا انکار کرے اور نہ ہی غیر مصدقہ دعووں کو سچ کا درجہ دے۔ یاد رہے کہ فصاحت کے ساتھ ساتھ استدلال بھی غالب رہتا ہے بلکہ وہ ایک ایسا اسلوب اختیار کرے جو سوال اٹھائے، دلائل پیش کرے اور قاری کو سوچنے پر مجبور کرے کہ آج کی دنیا میں کن خفیہ سازشوں سے ون ورلڈ آرڈر کو نافذ کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ تاریخ ہمیں یہ بھی سکھاتی ہے کہ جب طاقت بے لگام ہو جائے، تو جو ابدی کمزور پڑ جاتی ہے۔

آج کا دور محض اطلاعات کا نہیں، بلکہ بیانیوں کی جنگ کا ہے۔ ہر ویڈیو، ہر رپورٹ، ہر دعویٰ ایک خاص زاویے سے پیش کیا جاتا ہے۔ یہاں قاری کا امتحان شروع ہوتا ہے، کیا وہ صرف سنتا ہے؟ یا پرکھتا بھی ہے؟ یہی وہ مقام ہے جہاں ایک لکھاری کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے کہ وہ روشنی دکھائے، نہ کہ آگ بھڑکائے اور فیصلہ قاری پر چھوڑ دیا جائے۔

ہم ایک ایسے دور میں ہیں جہاں ہر شخص کے ہاتھ میں ایک کہانی ہے مگر ہر کہانی سچ نہیں ہوتی، اور ہر سچ کہانی کی صورت میں سامنے نہیں آتا۔ حقیقت اکثر شور میں دب جاتی ہے، اور دانشمندی یہ ہے کہ ہم نہ صرف سنیں بلکہ چھاننیں بھی۔ لہذا، اگر ہمارا مقصد واقعی امن، انصاف اور عالمی شعور کا فروغ ہے، تو ہمیں ایسے بیانیوں کو تنقیدی بصیرت، تحقیقی معیار، اور ادبی وقار کے ساتھ پیش کرنا ہو گا تا کہ ہم جذبات نہیں، بلکہ فہم کو بیدار کریں۔ یہ تصور کہ رہنما خوف کے تحت فیصلے کرتے ہیں، انسانی نفسیات سے بعید نہیں۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ سیاست میں مفاد، نظریہ، اور دباؤ سب مل کر فیصلہ سازی کو تشکیل دیتے ہیں۔

ہم ایک ایسے دور میں کھڑے ہیں جہاں سچ موجود ہے، مگر بکھرا ہوا، جھوٹ موجود ہے، مگر پُرکشش اور انسان موجود ہے، مگر متذبذب، لہذا، ہمیں یہ تسلیم کرنا ہو گا کہ ہر بڑا دعویٰ، بڑے ثبوت کا تقاضا کرتا ہے۔ اور اگر ہمارا مقصد واقعی امن ہے، تو ہمیں ایسے بیانیوں کو تحقیق کے پیمانے پر پرکھنا ہو گا، استدلال کے ترازو میں تولنا ہو گا اور اخلاقی دیانت کے ساتھ پیش کرنا ہو گا۔

معاصر سیاست خواہ وہ ٹرمپ کا دور ہو یا کوئی اور ہمیشہ شدید تنقید اور متضاد بیانیوں کا مرکز رہی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ایک لکھاری کو جذبات سے زیادہ توازن اور تحقیق کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ تاریخ فاتحین لکھتے ہیں، مگر ایک سنجیدہ قاری جانتا ہے کہ تاریخ کو سمجھنے کیلئے مختلف زاویوں سے دیکھنا ضروری ہے۔ نتیجہ؟ سوال باقی ہے، مگر جواب ذمہ داری سے دینا ضروری ہے۔ آخر کار، یہ بیانیہ ہمیں ایک اہم سوال کے سامنے لا کھڑا کرتا ہے، ہم کس چیز پر یقین کریں، اور کیوں؟ یہی وہ مقام ہے جہاں ایک ذمہ دار قلم کار کو چاہیے کہ وہ نہ صرف سوال اٹھائے بلکہ قاری کو یہ بھی سکھائے کہ سچ کی تلاش کیسے کی جاتی ہے۔

تاریخ ہمیں صرف یہ نہیں سکھاتی کہ کیا ہوا؛ وہ ہمیں یہ بھی سکھاتی ہے کہ ہم کیا ماننے کیلئے تیار تھے۔ لہذا، اصل سوال اب بھی قائم ہے مگر اس کا جواب جذباتی یقین میں نہیں، بلکہ فکری جستجو میں پوشیدہ ہے۔ یہ مضمون کسی دعوے کی توثیق نہیں بلکہ ایک فکری آئینہ ہے، جس میں ہم الزامات، تاریخ، اور سیاست کو ایک ساتھ دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ دانش وہ چراغ ہے جو اندھیروں کو ختم نہیں کرتا، مگر راستہ ضرور دکھاتا ہے۔

آخر کار، ہم ایک ایسے عہد میں زندہ ہیں جہاں معلومات کی فراوانی ہے مگر یقین کی کمی۔ ہر فائل، ہر تصویر، اور ہر دعویٰ ایک داستان سناتا ہے مگر ہر داستان کی پیچیدگی معاملہ کو سلجھانے کی بجائے مزید الجھا دیتی ہے اور بمسٹن فائلز کا مقدر بھی دانستہ اس سے منسلک کر دیا گیا ہے تاکہ مجرم کے چہروں کا دبیز نقاب ہٹانے سے قبل مقاصد کی تکمیل ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اقتدار کے ایوانوں میں جو کچھ ہوتا ہے، وہ ہمیشہ مکمل طور پر عوام کے سامنے نہیں آتا، لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ہر پردے کے پیچھے ایک ہی طرح کی کہانی چھپی ہو۔ سچ اکثر دھند میں لپٹا ہوتا ہے؛ اور دانشمندی یہی ہے کہ ہم نہ صرف دیکھیں، بلکہ پرکھیں بھی۔ پس، سوال اب بھی وہی ہے مگر اس کا جواب جذباتی ردِ عمل میں نہیں، بلکہ تحقیق، تنقید، اور فکری دیانت میں پوشیدہ ہے۔

جب راستے بولنے لگیں

پاکستان نے ایران کیلئے تجارتی راہداری کھولنے کا اعلان کیا ہے جس کے تحت ایران اپنی مصنوعات کی ترسیل اور حصول کیلئے گوادراور کراچی کی بندرگاہوں سے استفادہ کر سکے گا۔ بادی النظر میں یہ ایک انتظامی فیصلہ اور سرکاری اعلامیہ ہے، مگر درحقیقت یہ اُس خاموش سفارتکاری کی گونج اور تاریخ کے دھارے میں ڈالا گیا ایک ایسا معنوی کنکر ہے جس کی لہریں دور تک پھیلنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ اور یہ بروقت فیصلہ قوموں کی تقدیر کے دھارے کو موڑنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ اعلان محض ایک انتظامی فیصلہ نہیں، بلکہ خطہ ایشیا کی سیاسی و معاشی بسات پر ایک نئی چال ہے، ایک ایسی چال جس میں تدبر کی روشنی، مصلحت کی نرمی ہے اور تاریخ کی گہری بازگشت سنائی دیتی ہے۔ تاریخ کے اوراق میں جب بھی اقوام نے اپنے جغرافیے کو شعور کی آنکھ سے دیکھا ہے، انہوں نے راستوں کو محض راستے نہیں رہنے دیا انہیں تقدیر کی شاہراہوں میں بدل دیا۔

یہ فیصلہ ایک ایسے وقت میں سامنے آیا ہے جب مشرق وسطیٰ کے افق پر بارود کی بورچی ہوئی ہے، آبنائے ہرمز کی موجیں سیاست کے طوفان سے مضطرب ہیں اور یہ خطہ آگ میں دھک رہا ہے، اور عالمی طاقتوں کی کشمکش نے تجارت کے سمندروں کو بھی بے قرار کر رکھا ہے۔ عالمی شطرنج پر مہرے اپنی اپنی چالیں چل رہے ہیں۔ یہ اقدام اس عہد کے سیاسی اضطراب، معاشی مجبوریوں اور علاقائی تقاضوں کا ایسا مرکب ہے جس میں حکمت کی چاشنی بھی ہے اور جرأت کی حرارت بھی۔ گویا پاکستان نے ایک ایسے وقت میں، جب خطہ مشرق وسطیٰ جنگ کی آگ میں جھلس رہا ہے، اپنے جغرافیے کو ایک وسیلہ امن و تجارت میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ ایسے میں پاکستان کا یہ فیصلہ نہ صرف تلاطم خیز لہروں کے درمیان ایک پرسکون بندرگاہ کا کردار ادا کرتا ہے بلکہ ایسے میں پاکستان کا یہ اقدام جو نہ صرف اپنے لیے بلکہ اپنے ہمسائے کیلئے بھی گویا ایک ایسا چراغ ہے جو اندھیروں کے بیچ روشن کیا گیا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں تاریخ اپنے نئے باب رقم کرتی ہے۔ یاد رہے کہ قومیں صرف تلوار سے نہیں، تدبیر سے زندہ رہتی ہیں اور یہی تدبیر آج پاکستان کی پالیسی میں جھلکتی نظر آتی ہے۔

پاکستان کی وزارت تجارت کا "پاکستان کے ذریعے سامان کی ٹرانزٹ آرڈر 2026" کے تحت ایران کیلئے چھ مختلف تجارتی راہداریوں کا اعلان محض انتظامی پیش رفت اور محض راستوں کی نشاندہی نہیں، بلکہ جہاں امکانات کی توسیع کا ایک فکری انقلاب ہے وہاں دراصل ایک ایسے دروازے کو وا کرنا ہے جو برسوں سے نیم وا تھا۔ یہ اقدام اس تصور کی عملی تعبیر ہے کہ سرحدیں اگرچہ زمین پر کھینچی جاتی ہیں، مگر تجارت ان سرحدوں کو عبور کرنے کا ہنر جانتی ہے۔

ان راہداریوں کے ذریعے ایران اپنی مصنوعات کو پاکستانی بندرگاہوں کے ذریعے دنیا بھر کی منڈیوں اور تیسرے ممالک تک پہنچا سکے گا، اور بیرونی دنیا سے سامان منگوانے کیلئے بھی پاکستان کو ایک محفوظ تجارتی پل کے طور پر استعمال کرے گا۔ گویا پاکستان نے اپنے جغرافیے کو ایک ایسے وسیلے میں ڈھال دیا ہے جو صرف زمین کا ٹکڑا نہیں بلکہ امکانات کا استعارہ بن چکا ہے۔

یہ راستے گویا شریانیں ہیں اور ان میں دوڑنے والا خون تجارت کا وہ سیال ہے جو معیشت کو زندگی عطا کرتا ہے۔ یوں کہیے کہ یہ راہیں اب خاک کی پگڈنڈیاں نہیں، بلکہ زر کی شاہراہیں بننے جا رہی ہیں۔ یہ فیصلہ اس حقیقت کی عکاسی کرتا ہے کہ تجارت محض منڈیوں کا لین دین نہیں بلکہ ریاستوں کے

درمیان اعتماد کال بھی ہوتی ہے۔ یہ اقدام دراصل اُس نظریے کی عملی شکل ہے کہ جغرافیہ اگر بصیرت کے ہاتھوں میں ہو تو تقدیر میں بدل جاتا ہے۔ یہ راستے محض سڑکیں نہیں بلکہ اقتصادی شریانیں ہیں، جن میں تجارت کا خون دوڑے گا اور علاقائی معیشت کو حیات نو بخشنے گا۔ اس اقدام سے پاکستان خود کو ایک ایسے پل کے طور پر پیش کر رہا ہے جو مشرق اور مغرب، جنوب اور شمال کے درمیان رابطے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

ایران میں 28 فروری سے جاری جنگ اور آبنائے ہرمز میں امریکی ناکہ بندی نے ایران کی معیشت کو ایک ایسے حصار میں قید کر کے اس کی شہ رگ کو گویا بادیا ہے جہاں نہ صرف ہر راستہ مسدود دکھائی دیتا ہے بلکہ سانس لینا بھی دشوار ہو چکا ہے۔ سمندر جو کبھی وسعت کا استعارہ تھا، اب پابندی کا نشان بن چکا ہے۔ تجارت کے در بند ہوں تو ریاستیں صرف معیشت نہیں بلکہ اپنے عوام کے حوصلے بھی کھو بیٹھتی ہیں۔ ایسے میں پاکستان کا یہ فیصلہ ایک ایسا دروازہ کھولنے کے مترادف ہے جو بند گلی میں امید کی ایسی کھڑکی ہے جس سے تازہ ہوا کا جھونکا اندر داخل ہو سکتا ہے۔ یہ اقدام محض اقتصادی سہولت نہیں بلکہ ایک راست موقف بھی ہے اور انسانی ہمدردی اور ایک اسلامی تصور اخوت کی جھلک بھی ہے، جہاں ہمسائیگی محض جغرافیائی نہیں بلکہ اخلاقی ذمہ داری بھی ہوتی ہے۔ مشکل کی گھڑی میں ہمسایہ ہاتھ تھامتے ہیں، منہ نہیں موڑتے۔ اور یہی وہ پہلو ہے جو اسے ایک اخلاقی وزن عطا کرتا ہے اور سیاسی بصیرت کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔

یہ فیصلہ محض سیاسی حکمت نہیں بلکہ ایک اسلامی تصور اخوت کی جھلک بھی رکھتا ہے، جہاں ہمسائیگی محض جغرافیائی نہیں بلکہ اخلاقی ذمہ داری بھی ہوتی ہے۔ جب بندر گاہیں خاموش ہو انہیں اور سمندر راستہ دینے سے انکار کر دے، تب خشکی کی راہیں ہی امید کا چراغ بنتی ہیں۔ ایسے میں پاکستان کی جانب سے یہ انسانی ہمدردی کے تحت سہولت فراہم کرنا ایک ایسا نیک عمل ہے جو ایرانی اپنی تاریخ کا روشن باب سمجھ کر اس کی ہمیشہ قدر کریں گے۔

عالمی اصولوں کے مطابق لینڈ لاک ممالک اپنی تجارت کیلئے دیگر ممالک اور بالخصوص پڑوسی ریاستوں کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں اور ان کی بندر گاہوں پر انحصار ان کی معاشی زندگی کی مجبوری ہوتا ہے۔ اگرچہ ایران ایک ساحلی ملک ہے، مگر موجودہ حالات نے اسے عملاً ایک لینڈ لاک ریاست میں بدل دیا ہے۔ ایران، جو کبھی اپنی بندر گاہوں کے ذریعے عالمی منڈیوں سے جڑا ہوا تھا، اب حالات کے جبر سے ایک ایسے مقام پر آکھڑا ہوا ہے جہاں اسے متبادل راستوں کی ضرورت ہے۔ اور ایسے میں ہمسایہ ممالک کا کردار فیصلہ کن ہو جاتا ہے۔

یہ صورتحال ہمیں اس حقیقت کی یاد دلاتی ہے کہ جغرافیہ جامد نہیں ہوتا، وہ سیاست کے ہاتھوں بدلتا رہتا ہے۔ جب سمندر راستہ نہ دے، تو خشکی اپنی آغوش کھول دیتی ہے۔ پاکستان کا یہ اقدام اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے مترادف ہے کہ جغرافیہ کبھی کبھی سیاست کے سامنے جھک جاتا ہے، پاکستان نے اس حقیقت کو سمجھتے ہوئے ایران کیلئے اپنے دروازے وا کیے ہیں، گویا اس نے اپنے جغرافیے کو ایک وسیلہ رحمت بنا دیا ہو۔ اس تناظر میں پاکستان کا کردار ایک ایسے ہمسائے کا ہے جو وقت ضرورت دروازہ بند کرنے کی بجائے چراغ جلا دیتا ہے۔

پاکستان کی جانب سے امریکا اور ایران کے درمیان کشیدگی کم کرنے کی کوششیں پہلے ہی جاری تھیں۔ ایسے میں یہ تجارتی راہداری ایک خاموش سفارتی اشارہ ہے، ایک ایسا اشارہ جو الفاظ سے زیادہ عمل کی زبان میں موثر بات کرتا ہے۔ سفارتکاری کا کمال یہی ہے کہ وہ شور کے بغیر اثر پیدا کرے۔ یہ اقدام اعتماد سازی کی ایک اینٹ ہے، جس پر مستقبل کے تعلقات کی عمارت کھڑی ہو سکتی ہے۔ تجزیہ کار اسے اعتماد سازی کا ایک اہم قدم قرار دیتے ہیں، کیونکہ بین الاقوامی تعلقات میں اکثر وہی اقدامات دیرپا ثابت ہوتے ہیں جو عملی بنیادوں پر اٹھائے جائیں۔ یہ اقدام سفارتکاری کے اس اصول کی

یاد دلاتا ہے کہ بعض اوقات خاموش خدمات بلند ترین خطبات سے زیادہ اثر رکھتی ہیں۔ گویا سیاست اگر حکمت سے خالی ہو تو محض شور رہ جاتی ہے اور پاکستان نے اس شور میں حکمت کی آواز پیدا کی ہے۔

وزارت تجارت کے بیان کے مطابق پاکستان اس اقدام سے نہ صرف علاقائی تجارت کو فروغ اور اقتصادی مرکز بننے کی جانب گامزن اور ایک لاجسٹکس حب میں تبدیل کرنے کی راہ ہموار کرے گا بلکہ پاکستان کی سٹریٹیجک اہمیت میں بھی اضافہ ہو گا۔ گوادر، کراچی اور تافان کو ٹرانزٹ کوریڈورز قرار دینا اس بات کا اعلان ہے کہ پاکستان اب محض ایک گزر گاہ نہیں بلکہ ایک مرکز بننے کی خواہش رکھتا ہے اور اپنی جغرافیائی حیثیت کو معاشی قوت میں تبدیل کرنا چاہتا ہے۔ یہ وہی خواب ہے جو صدیوں پہلے شاہراہ ریشم کے قافلوں نے دیکھا تھا کہ یہ خطہ دنیا کی تجارت کا دل بن سکتا ہے۔ آج پاکستان اسی خواب کی تعبیر کی طرف قدم بڑھا رہا ہے۔ یہ بروقت فیصلہ دراصل پاکستان کے جغرافیے کو اقتصادی تقدیر میں بدلنے کی ایک کوشش ہے۔

پاکستان اور ایران کے درمیان 909 کلومیٹر طویل سرحد محض ایک حد بندی نہیں بلکہ تہذیبوں کا سنگم اور ربط کی علامت ہے۔ تافان، گبد اور مند جیسے راستے صدیوں سے قافلوں کی گزر گاہ اور تاجروں کے قدموں کی چاپ سنتے آئے ہیں۔ یہ وہ راستے ہیں جن پر کبھی اونٹوں کی گھنٹیاں بجتی تھیں، آج بھی راستے جدید تجارت کی شاہراہیں بننے جارہے ہیں، آج انہی شاہراہوں پر ٹرکوں کے قافلے چلیں گے۔ فرق صرف رفتار کا ہے، مقصد کا نہیں کہ تجارت ہمیشہ قوموں کو جوڑتی ہے، توڑتی نہیں۔ گویا تاریخ خود کو نئے قالب میں ڈھال رہی ہے۔ یہ سرحد نہیں، دو تہذیبوں کے درمیان ایک مکالمہ ہے جو کبھی رکا نہیں، صرف بدلتا رہا ہے۔

اگر جغرافیہ تقدیر کا پہلا باب ہے تو رسائی اُس کی تکمیل کا آخری مصرع۔ ایران کیلئے کھولی گئی یہ تجارتی راہداری دراصل پاکستان کیلئے وسطی ایشیا کے دروازوں پر دستک ہے۔ یہ وہ خطہ ہے جو قدرتی وسائل سے مالا مال، مگر سمندری راستوں سے محروم رہا ہے اور یہی محرومی اسے راہداریوں کا محتاج بناتی ہے۔ یہ راہداری مستقبل میں پاکستان کیلئے وسطی ایشیائی ریاستوں تک رسائی کا دروازہ کھول سکتی ہے۔ پاکستان کا یہ اقدام گویا ایک تیر سے دو شکار کے مترادف ہے۔ یہ اقدام صرف ایک فوری ضرورت کا جواب نہیں بلکہ ایک طویل المدتی حکمت عملی کا حصہ ہے، ایسی حکمت عملی جو پاکستان کو علاقائی تجارت کے مرکز میں لاسکتی ہے۔

بظاہر یہ سہولت ایران کیلئے ہے، مگر درحقیقت یہ راستہ تاشقند، سمرقند اور بخارا کے دروازوں تک جا پہنچتا ہے۔ یہ وہی سرزمین ہے جہاں کبھی ریشم، مصالحہ جات اور علم کے قافلے گزرتے تھے۔ آج اگر وہی راستے جدید شاہراہوں میں ڈھل جائیں تو تاریخ ایک بار پھر اپنے آپ کو دہرا سکتی ہے مگر اس بار دائرہ وسیع تر رفتار ہو گا۔ تو میں جب اپنے جغرافیے کو پہچان لیتی ہوں تو فاصلے سمٹ جاتے ہیں اور سرحدیں راستوں میں بدل جاتی ہیں۔ گویا یہ قدم صرف ایک ملک کیلئے نہیں بلکہ پورے خطے کیلئے امکانات کی نئی صبح لے کر آیا ہے۔

یہ اقدام کسی اچانک وارد ہونے والے خیال کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک طویل تاریخی تسلسل کی کڑی ہے۔ 2008 میں پاکستان اور ایران کے درمیان سڑک کے ذریعے تجارت کا معاہدہ طے پایا، جبکہ 2006 میں ٹرانزٹ آرڈر جاری کیا گیا، یہ دونوں معاہدے گویا اس فیصلے کی بنیاد ہیں اور پاکستان اپنی تجارتی پالیسیوں کا تسلسل برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ اب 2026 میں انہی بنیادوں پر ایک نئی عمارت تعمیر کی جا رہی ہے۔ یہ وہ تسلسل ہے جو قوموں کو سنجیدگی



عطا کرتا ہے، ریاستوں کو استحکام بخشتا ہے اور عالمی برادری میں ان کی ساکھ کو مضبوط کرتا ہے کیونکہ پالیسیوں کا تسلسل ہی ریاستی وقار کا ضامن اور ریاستوں کو استحکام بخشتا ہے۔

یاد رہے کہ یہ فیصلے یکایک نہیں اُگتے، یہ تاریخ کی زمین میں برسوں پہلے بوئے گئے بیج ہوتے ہیں، جو وقت آنے پر ثمر دیتے ہیں۔ یہاں یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ پاکستان نے محض معاہدے کیے نہیں بلکہ انہیں وقت کے تقاضوں کے مطابق زندہ رکھا اور یہی زندہ قوموں کی پہچان ہے۔ پاکستان نے ثابت کیا ہے کہ تاریخ کے اوراق صرف محفوظ رکھنے کیلئے نہیں بلکہ وقت آنے پر انہیں عمل کی روشنائی سے دوبارہ لکھنے کیلئے ہوتے ہیں۔

بین الاقوامی تعلقات میں اعتماد وہ سکہ ہے جو ہر بازار میں چلتا ہے، مگر اسے کمانا آسان نہیں ہوتا۔ پاکستان نے ایران کے ساتھ تجارت کیلئے بینکنگ شرائط میں نرمی کر کے اور اب ٹرانزٹ سہولت فراہم کر کے ایک ایسا ماحول پیدا کیا ہے جس میں باہمی اعتماد پروان چڑھ سکتا ہے۔ تجارت دراصل تعلقات کی وہ زبان ہے جسے ہر قوم سمجھتی ہے۔ یہ اقدام محض اقتصادی نہیں بلکہ نفسیاتی بھی ہے کیونکہ قومیں صرف مفادات سے نہیں، اعتماد سے جڑتی ہیں۔ ایران کے عوام میں پاکستان کیلئے خیر گالی کا جذبہ بھی اسی عمل سے فروغ پائے گا۔ اسے یوں فکری انداز میں کہا جاسکتا ہے کہ معیشت اگر اخلاق سے جڑی ہو تو وہ محض دولت کا ذریعہ نہیں رہتی بلکہ جہاں تجارت کا یہ بہاؤ تعلقات کی زمین کو زرخیز بنائے گا وہاں یہ تعلقات کی تعمیر کا مضبوط وسیلہ بھی بن جاتا ہے۔ یہ اقدام سیاسی زبان میں ایک مثبت پیغام ہے۔

اگرچہ ایران توانائی کے وسائل سے مالا مال ہے، اور دنیا کے بڑے تیل اور گیس پیدا کرنے والے ممالک میں شمار ہوتا ہے، مگر عالمی پابندیوں نے اس کی اقتصادی قوت کو محدود کر دیا ہے۔ پاکستان، جو اپنی توانائی کی ضروریات کیلئے دیگر خلیجی ممالک پر انحصار کرتا ہے، اور اس صورتحال میں ایک محتاط توازن برقرار رکھے ہوئے ہے۔ پاکستان کا یہ اقدام حقیقت پسندی پر مبنی ہے، وہ براہِ راست تجارت کے بجائے سہولت فراہم کر رہا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پاکستان کی پالیسی میں حقیقت پسندی جھلکتی ہے۔ پاکستان کا یہ قدم براہِ راست تجارت نہیں بلکہ سہولت فراہم کرنا ہے، جو بین الاقوامی قوانین کے دائرے میں آتا ہے۔ وہ براہِ راست توانائی کے شعبے میں ایران سے وابستگی بڑھانے کی بجائے ایک ایسا راستہ اختیار کر رہا ہے جو قانونی اور سفارتی حدود میں بھی ہو اور فائدہ مند بھی۔ یہ سیاست کی وہ لطیف جہت ہے جہاں اصول اور مفاد ایک دوسرے سے متصادم نہیں بلکہ ہم آہنگ دکھائی دیتے ہیں۔ اسے سفارتی رنگ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ حکمت وہی ہے جو حالات کے ساتھ نکلانے کی بجائے انہیں اپنے حق میں موڑ لے

جب رسمی بینکنگ نظام پابندیوں کے بوجھ تلے دب جائے تو تجارت اپنے لیے نئے راستے تراشتی ہے۔ پاکستان اور ایران کے درمیان بارٹر سسٹم اسی تخلیقی مزاحمت کی ایک مثال ہے، جس کے تحت اشیاء کے بدلے اشیاء کا تبادلہ جاری رہا۔ یہ اس حقیقت کی دلیل ہے کہ جب رسمی راستے بند ہوں تو غیر رسمی راستے جنم لیتے ہیں اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ایسی صورت میں قومیں نئے راستے تلاش کر لیتی ہیں۔ یہ نظام بظاہر قدیم محسوس ہوتا ہے، مگر

در حقیقت یہ جدید معاشی جمود کے خلاف ایک عملی حل ہے۔ یہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ معیشت کا پیہہ صرف کرنسی سے نہیں بلکہ ضرورت سے چلتا ہے۔ اسے شگفتہ نثر میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ جب سگے خاموش ہو جائیں تو ضرورت خود زبان بن جاتی ہے، اور تجارت اپنی نئی لغت ترتیب دیتی ہے۔

یہ سوال اپنی جگہ اہم ہے کہ کیا پاکستان عالمی پابندیوں کے باوجود ایران کو ٹرانزٹ سہولت فراہم کر سکتا ہے؟ اس کا جواب بین الاقوامی قانون میں پوشیدہ ہے۔ اقوام متحدہ کے قوانین کے تحت ٹرانزٹ فراہم کرنا ایک جائز عمل ہے اور سمندری قوانین کے تحت کسی ایسے ملک کو، جو عملی طور پر لینڈ لاک ہو چکا ہو، تجارتی راہداری فراہم کرنا ایک جائز عمل ہے۔ پاکستان نے اسی قانونی بنیاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ قدم اٹھایا ہے، جس سے اسے عالمی دباؤ کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ یہ فیصلہ اس بات کی دلیل ہے کہ پاکستان نہ صرف اپنے مفادات کا خیال رکھتا ہے بلکہ عالمی قوانین کی پاسداری کو بھی مقدم جانتا ہے۔ اسے سفارتی اور فکری سانچے میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ عدل وہی ہے جو اصولوں پر قائم ہو، اور سیاست وہی پائیدار ہوتی ہے جو انصاف کے دائرے سے باہر نہ جائے۔

پاکستان کی جانب سے ایران کیلئے تجارتی راہداریاں کھولنے کے اعلان پر امریکا کی طرف سے تاحال کوئی واضح رد عمل سامنے نہیں آیا۔ بظاہر یہ خاموشی ایک معمولی امر محسوس ہوتی ہے، مگر سفارتکاری کی دنیا میں خاموشی بھی ایک زبان رکھتی ہے اور اکثر اوقات یہ زبان الفاظ سے زیادہ بلیغ ہوتی ہے۔ یہ عدم رد عمل اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ پاکستان نے اپنے اس فیصلے میں نہ صرف قانونی تقاضوں کو ملحوظ رکھا بلکہ عالمی طاقتوں کو بھی پیشگی اعتماد میں لیا۔ گویا یہ اقدام کسی جذباتی جوش کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک سوچا سمجھا، نپا تلا قدم ہے۔

ایران میں جنگ کے باعث ادویات اور دیگر ضروری اشیاء کی قلت پیدا ہو چکی ہے، اور پاکستان کے ذریعے انہی اشیاء کی ترسیل ممکن ہوگی جو عالمی پابندیوں کی زد میں نہیں آتیں۔ یہ پہلو اس فیصلے کو ایک انسانی جہت بھی عطا کرتا ہے کہ تجارت یہاں محض منافع کا کھیل نہیں بلکہ انسانی ضرورت کی تکمیل کا وسیلہ بھی ہے۔ اسے بھی سفارتی اور انسانی ہمدردی کی زبان میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ خاموشی اگر حکمت سے لبریز ہو تو وہ خود ایک تقریر بن جاتی ہے، جسے سمجھنے کیلئے الفاظ کی نہیں، بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے۔

امریکا کی جانب سے تاحال کوئی رد عمل نہ آنا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ اقدام عالمی اصولوں کے مطابق ہے۔ اب تک امریکا کی جانب سے کوئی واضح رد عمل سامنے نہیں آیا، جو اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ اقدام نہ صرف عالمی سطح پر قابل قبول دائرے میں ہے بلکہ عالمی اصولوں کے مطابق ہے۔

اقتصادی ماہرین اس اقدام کو پاکستان کے اس دیرینہ خواب کی تعبیر کی طرف ایک اہم قدم قرار دیتے ہیں جس کے تحت وہ علاقائی تجارت کا مرکز بننا چاہتا ہے۔ اقتصادی ماہرین اسے ایک سٹریٹجک پیش رفت قرار دیتے ہیں۔ یہ ایک ایسا خواب ہے جس کی تعبیر پورے خطے کی تقدیر بدل سکتی ہے اور یہ خواب محض اقتصادی نہیں بلکہ جغرافیائی حقیقتوں میں پیوست ہے۔ پاکستان ایک ایسے مقام پر واقع ہے جہاں جنوب ایشیا، مشرق وسطیٰ اور وسطی ایشیا کی سرحدیں ایک دوسرے سے ہم آغوش ہوتی ہیں۔ اگر اس محل وقوع کو موثر حکمت عملی کے ساتھ استعمال کیا جائے تو یہ خطہ عالمی تجارت کے نقشے پر ایک نمایاں مقام حاصل کر سکتا ہے۔ گویا یہ سرزمین اگر اپنی حیثیت کو پہچان لے تو قافلے اس کے در پر خود دستک دیں گے، اور راستے اس کے نام سے پہچانے جائیں گے۔

پاکستان-ایران ٹرانزٹ راہداری کے عملی آغاز کے ساتھ ہی پہلی تجارتی کھیپ ایران کے راستے تاشقند، ازبکستان روانہ کی گئی۔ یہ واقعہ اس امر کا ثبوت ہے کہ یہ منصوبہ محض کاغذی نہیں بلکہ عملی حقیقت میں ڈھل چکا ہے۔ کراچی سے گبد اور رامیدان بارڈر کے راستے ایران میں داخل ہونے والا یہ سامان دراصل اس بات کی علامت ہے کہ خطے میں تجارت کے نئے در کھل رہے ہیں۔ یہ ایک علامتی سفر بھی ہے جو یہ پیغام دیتا ہے کہ اگر ارادہ پختہ ہو تو فاصلے رکاوٹ نہیں بنتے۔ اسے فکری انداز میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ عمل وہ معیار ہے جو دعویٰ کو حقیقت میں بدلتا ہے، اور قومیں اسی سے پہچانی جاتی ہیں کہ وہ اپنے ارادوں کو کس حد تک عملی جامہ پہناتی ہیں۔

2018ء میں پاکستان اور ایران کے درمیان یہ اتفاق ہوا تھا کہ ایران کے راستے ترکی تک اور پاکستان کے راستے چین تک تجارتی راہداری کھولی جائے گی۔ یہ معاہدہ دراصل ایک وسیع تر اقتصادی نیٹ ورک کی بنیاد ہے، جس میں پورا خطہ ایک دوسرے سے جڑ سکتا ہے۔ اگر ایران پاکستان کی بندرگاہوں کے ذریعے عالمی تجارت میں حصہ لیتا ہے تو پاکستان بھی ایران کے راستے وسطی ایشیا اور یورپ تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ یہ باہمی انحصار دراصل علاقائی استحکام کا ضامن بن سکتا ہے۔ اسے سفارتی اسلوب میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ راستے جب ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں تو وہ صرف فاصلے کم نہیں کرتے بلکہ دلوں کو بھی قریب لے آتے ہیں۔

پاکستان ماضی میں وسطی ایشیا تک زمینی رسائی کیلئے افغانستان پر انحصار کرتا رہا ہے، مگر وہاں کی غیر یقینی صورتحال اور سیاسی کشیدگی نے اس راستے کو غیر مستحکم بنا دیا ہے۔ گزشتہ سال سے پاکستان اور افغانستان کے درمیان سرحدی کشیدگی کے باعث گزرگاہیں بند ہیں، جس سے تجارت شدید متاثر ہوئی جس نے پاکستان کو متبادل راستوں کی تلاش پر مجبور کیا کہ ایران کے ذریعے یہ خلا پُر ہو سکتا ہے اور تجارت کو تسلسل مل سکتا ہے۔ ایسے میں ایران کے ذریعے متبادل راستہ تلاش کرنا ایک ناگزیر حکمت عملی تھی۔ یہ اقدام پاکستان کو ایک زیادہ محفوظ اور قابل اعتماد تجارتی راستہ فراہم کر سکتا ہے، ایسا راستہ جو سیاسی اتار چڑھاؤ سے نسبتاً محفوظ ہو۔ گویا جب ایک در بند ہو جائے تو دانشمند وہی ہے جو دیوار میں دروازہ تلاش کرے، نہ کہ بند در کے سامنے بیٹھ کر ماتم کرے

آبنائے ہر مرکزی بندش کے دوران کئی جہاز پاکستان کی بندرگاہوں پر لنگر انداز ہوئے، جس سے کراچی کی بندرگاہوں پر کارگو ہینڈلنگ میں نمایاں اضافہ ہوا۔ عالمی تجارتی جہازوں کی آمد نے یہ واضح کر دیا کہ یہ بندرگاہیں خطے کی معیشت میں کلیدی کردار ادا کر سکتی ہیں۔ یوں بڑھتی ہوئی تجارتی سرگرمیاں اس بات کی علامت ہیں کہ پاکستان ایک معاشی مرکز بننے کی راہ پر گامزن ہے۔ اب ایران کیلئے تجارتی راہداری کھلنے کے بعد یہ سرگرمیاں مزید تیز ہونے کی توقع ہے۔ گوادار اور کراچی کی بندرگاہیں محض ساحلی مقامات نہیں رہیں بلکہ وہ معاشی سرگرمیوں کے مراکز بننے جارہی ہیں۔ یہ بندرگاہیں اب محض ساحلی مقامات نہیں بلکہ اقتصادی زندگی کی دھڑکن بن رہی ہیں۔ یہ وہ دھڑکنیں ہیں جن سے معیشت کا جسم زندہ رہتا ہے۔ گویا سیاسی دانش کا یہ بروقت فیصلہ درست ثابت ہوا کہ معیشت کی قوت اس کے بہاؤ میں ہوتی ہے، اور جہاں بہاؤ رک جائے وہاں زوال جنم لیتا ہے یہ اقدام اسی بہاؤ کو برقرار رکھنے کی ایک کوشش ہے۔ اب اس فیصلے کے بعد ان میں مزید تیزی آئے گی۔

یہ ساری داستان محض راہداریوں، بندرگاہوں اور معاہدوں کی نہیں بلکہ ایک قوم کے شعور کی کہانی ہے، ایک ایسی قوم جو اپنے محل وقوع کو اپنی تقدیر میں بدلنے کی کوشش کر رہی ہے۔ پاکستان نے ایران کیلئے تجارتی راہداری کھول کر نہ صرف ایک ہمسائے کی مدد کی ہے بلکہ اپنے لیے بھی امکانات کے دروا کیے ہیں۔ یہ اقدام سیاست، معیشت اور اخلاق تینوں کا ایک حسین امتزاج ہے۔ یہ فیصلہ محض ایک اقتصادی اقدام نہیں بلکہ ایک فکری اعلان ہے

کہ پاکستان اپنے جغرافیے کو اپنی تقدیر بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اگر نیت میں اخلاص اور حکمت میں توازن قائم رہا، اور یہ پالیسی تسلسل کے ساتھ جاری رہی تو وہ دن دور نہیں جب پاکستان واقعی علاقائی تجارت کا مرکز بن جائے گا اور تب تاریخ یہ لکھے گی کہ ایک قوم تھی جس نے اپنے جغرافیے کو پہچانا، اسے سنوارا، اور پھر اسے اپنی تقدیر بنالیا اور یہی وہ لمحہ تھا جب جغرافیہ اللہ کی بیش بہا نعمت ثابت ہوا اور زمین نے تاریخ کو جنم دیا۔

یہ فیصلہ محض راہداری کھولنے کا نہیں بلکہ امکانات کے دروازے کا ہے۔ اس میں سیاست کی بصیرت، معیشت کی ضرورت اور تہذیب کی شائستگی تینوں یکجا ہیں۔ اگر تاریخ کو غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اقوام وہی زندہ رہتی ہیں جو اپنے جغرافیے کو تقدیر میں بدلنا جانتی ہیں۔ پاکستان نے اس اقدام کے ذریعے یہی پیغام دیا ہے کہ وہ محض ایک ریاست نہیں بلکہ ایک راستہ ہے ایک ایسا راستہ جو مشرق و مغرب کو ملاتا ہے، اور جس پر چل کر خطہ ایشیا ایک نئی صبح کی طرف بڑھ سکتا ہے۔

ایک عہد، ایک قیادت، ایک فیصلہ

پاکستان کی سیاسی و عسکری تاریخ کے افق پر بعض ادوار ایسے طلوع ہوتے ہیں جو محض واقعات کا مجموعہ نہیں ہوتے بلکہ ایک عہد کی فکری و تہذیبی تشکیل کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں۔ تاریخ محض واقعات کی قطار نہیں ہوتی، بلکہ وہ ایک زندہ شعور ہے جو قوموں کے عروج و زوال، ان کے فکری سانچوں، اور قیادت کی بصیرت کو اپنے دامن میں سمیٹ کر آگے بڑھتی ہے۔ بعض اوقات زمانہ ایسے افراد کو جنم دیتا ہے جو محض حالات کے تابع نہیں ہوتے، جو نہ صرف حالات کو اپنی بصیرت سے نئی جہت عطا کرتے ہیں بلکہ محض عہدوں کی بلندی سے نہیں بلکہ حالات کی دھار کو موڑ دینے کی صلاحیت سے پہچانے جاتے ہیں۔

یہ وہ لمحات ہوتے ہیں جب تاریخ اپنے معمول کے بہاؤ سے ہٹ کر ایک نئے دھارے کی صورت اختیار کر لیتی ہے، اور افراد اپنے کردار کے ذریعے عہد کی سمت متعین کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو وقت کے طوفانوں میں چراغ کی مانند جلتے ہیں اور تاریخ کے اندھیروں میں سمت کا تعین کرتے ہیں۔ پاکستان کی حالیہ سیاسی و عسکری تاریخ میں فیلڈ مارشل عاصم منیر کی شخصیت اسی نوع کی ایک علامت کے طور پر ابھری ہے۔

یہ داستان صرف ایک سپہ سالار کے عروج کی نہیں بلکہ ایک ایسے عہد کی ہے جس میں داخلی انتشار، خارجی دباؤ، اور عالمی سیاست کے پیچیدہ دھارے ایک دوسرے سے ٹکراتے نظر آتے ہیں۔ اور انہی تصادمات کے بیچ ایک قیادت اپنے کردار کو منواتی ہے۔ فیلڈ مارشل عاصم منیر کی شخصیت بھی اسی نوع کی ایک مثال کے طور پر سامنے آئی ہے۔ ایک ایسی مثال جس میں عسکری وقار، سیاسی بصیرت، اور عالمی سفارت کاری کا نادر امتزاج دکھائی دیتا ہے۔ فیلڈ مارشل عاصم منیر کا عروج بھی اسی نوع کا ایک ایسا تاریخی منظر ہے جس میں داخلی بحران، عسکری استقامت، سفارتی مہارت اور عالمی سیاست کے پیچیدہ تانے بانے ایک دوسرے میں پیوست ہو کر ایک نئی کہانی رقم کرتے ہیں۔

نومبر 2022 میں جب عاصم منیر نے پاک فوج کی کمان سنبھالی، تو پاکستان ایک ہمہ گیر سیاسی بحران اور اضطراب کی گرفت میں مبتلا تھا۔ تحریک عدم اعتماد کے نتیجے میں عمران خان کی حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا، اور ملک ایک ایسی کشمکش کا شکار تھا جس میں ریاستی اداروں کی ساکھ، سیاسی بیانیے اور عوامی اعتماد سبھی آزمائش میں تھے۔ تحریک عدم اعتماد کے نتیجے میں عمران خان کی رخصتی نے سیاسی منظر نامے کو دھندلا دیا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ریاستی کشتی بے یقینی کے گرداب میں ہچکولے کھا رہی ہو، اور ہر سمت سے اٹھنے والی لہریں اس کے توازن کو چیلنج کر رہی ہوں۔ یہ وہ لمحہ تھا جسے تاریخ ”ابتلائے قیادت“ سے تعبیر کرتی ہے۔ جہاں منصب اعزاز نہیں بلکہ ذمہ داری کا بوجھ بن جاتا ہے۔ ایسے میں جب عاصم منیر کو فوج کی کمان سونپی گئی تو گویا ان کے ہاتھوں میں ایک ایسے جہاز کی باگ ڈور دی گئی جو طوفانی سمندر میں راستہ تلاش کر رہا تھا۔

عمران خان کی قیادت میں شروع ہونے والی احتجاجی تحریک نے سیاسی فضا کو گرمادیا۔ ملک کے طول و عرض میں احتجاج کی صدائیں گونج رہی تھیں۔ سڑکیں نعروں سے آباد اور دل شکوک سے بھر گئے۔ عمران کے حامی سڑکوں پر تھے اور الزامات کی بوچھاڑ براہ راست فوجی قیادت پر ہو رہی تھی۔ براہ راست الزامات نے اس کشیدگی کو ایک نئے مرحلے میں داخل کر دیا۔ یہ وہ مرحلہ تھا جب الفاظ تلواروں کا کام دے رہے تھے اور بیانیے میدان جنگ

بن چکے تھے۔ یہ صرف سیاسی اختلاف نہ تھا بلکہ بیانیے کی ایسی جنگ تھی جس میں ہر فریق اپنی سچائی کا علم اٹھائے کھڑا تھا۔ اس پس منظر میں فوجی قیادت پر لگنے والے الزامات نے ایک نئی کشیدگی کو جنم دیا، جس نے ریاستی اداروں کے درمیان اعتماد کی فضا کو متاثر کیا۔

فوج اور حکومت کی جانب سے الزامات کی مسلسل تردید کی گئی، مگر فضا میں شکوک و شبہات کے بادل بدستور منڈلاتے رہے۔ فوج اور حکومت کی جانب سے ان الزامات کی مسلسل تردید کی گئی جو سوشل میڈیا اور جلسوں کے ذریعے پھیل رہا تھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب اعتماد کا رشتہ متزلزل اور کمزور پڑ جائے تو وضاحتیں اسے بحال کرنے سے قاصر اور اکثر بے اثر ہو جاتی ہیں۔ یہی وہ مرحلہ تھا جہاں ریاستی بیانیہ جذبات کی آندھی میں غوطے لگا رہا تھا اور دلیل کی آواز مدہم ہوتی چلی گئی اور عوامی تاثر ایک دوسرے سے متصادم دکھائی دینے لگا۔

نومئی کے واقعات پاکستان کی سیاسی تاریخ میں ایک ہنگامہ خیز باب اور سنگ میل ثابت ہوئے جس نے پاکستان کی سیاسی تاریخ میں ایک گہرا شکاف ڈال دیا۔ عمران کی گرفتاری کے بعد ملک بھر میں ہونے والے پر تشدد مظاہروں نے ریاستی نظم کو ہلا کر رکھ دیا۔ راولپنڈی میں جی ایچ کیو سمیت کئی حساس تنصیبات کو نشانہ بنایا گیا۔ عسکری تنصیبات پر حملے دراصل ایک علامتی بغاوت کی شکل اختیار کر گئے۔ یہ وہ دن تھا جب احتجاج اور بغاوت کے درمیان لکیر دھندلا گئی۔

ان واقعات کے بعد مقدمات کا ایک سلسلہ شروع ہوا، جس میں سینکڑوں افراد نامزد ہوئے۔ ریاست نے سخت قانونی کارروائی کا آغاز کیا، عمران اور ان کی جماعت نے اسے انتقامی کارروائی قرار دیا جبکہ ریاست نے اسے قانون کی عملداری کا تقاضا بتایا۔ یوں بیانیے کی جنگ مزید گہری ہو گئی، اور سیاسی تقسیم واضح تر ہوتی گئی۔ یہی وہ موڑ تھا جہاں سے سیاسی تحریک کی رفتار مدہم پڑتی دکھائی دی۔ اس کشمکش نے سیاسی فضا کو مزید پیچیدہ بنا دیا۔

نومئی کے واقعات نے درحقیقت سیاسی تحریک کی رفتار کو متاثر کیا۔ جو تحریک ایک عوامی لہر کے طور پر ابھری تھی، وہ رفتہ رفتہ اپنی توانائی کھونے لگی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے تاریخ نے ایک موڑ لے لیا ہو اور سیاسی قوتوں کو اس بحرانی موڑ پر از سر نو صف بندی اور حکمت عملی پر نظر ثانی کرنا پڑی۔ فروری 2024 کے انتخابات نے ایک نئی سیاسی ترتیب کو جنم دیا۔ مسلم لیگ (ن) اور اس کے اتحادیوں کی حکومت قائم ہوئی، اور یوں سیاسی بساط پر مہرے از سر نو ترتیب دیے گئے۔ یوں اقتدار کا توازن ایک نئی سمت میں منتقل ہوا۔ یہ تبدیلی محض سیاسی نہ تھی بلکہ اس کے اثرات ریاستی پالیسیوں پر بھی مرتب ہوئے۔ مگر اصل تبدیلی مئی 2025 کی پاک بھارت جنگ کے بعد آئی، جب عاصم منیر نے صرف عسکری قیادت کے استعارے کے طور پر ابھرے بلکہ انہیں فیلڈ مارشل کے خطاب سے بھی نوازا گیا۔ یہ اعزاز محض ایک منصب نہیں بلکہ ایک عہد کی علامت بن گیا۔

مئی 2025 میں پاک بھارت جنگ نے خطے کو جہاں ہلا کر رکھ دیا وہاں ایک غیر متوقع مگر فیصلہ کن موڑ فراہم کیا۔ چار دنوں پر محیط اس جنگ نے نہ صرف عسکری طاقت کا مظاہرہ کیا بلکہ نفسیاتی سطح پر بھی ایک نئی فضا پیدا کی۔ اس جنگ میں جدید ٹیکنالوجی، ڈرونز، اور میزائلوں کا استعمال ہوا، جس نے اسے روایتی جنگوں سے مختلف بنا دیا۔ پاکستان کی جانب سے جدید جنگی حکمت عملی کا استعمال عالمی حلقوں میں موضوع بحث بن گیا۔ اس جنگ میں پاکستان کی کامیابیوں کا چرچا عالمی سطح پر ہوا۔ حالات اس نہج تک پہنچ گئے کہ امریکا کو مداخلت کرنی پڑی۔ ابتدا میں غیر جانبداری کا اعلان کرنے والا عالمی طاقت کا مرکز، آخر کار جنگ بندی کی اپیل پر مجبور ہوا۔

پاکستانی دعوؤں کے مطابق انڈیا کے جدید رافیل طیاروں کی تباہی نے جنگ کا رخ بدل دیا اور عالمی میڈیا میں مضبوط شواہد کے اعتراف نے پہلی مرتبہ اقوام علم کو ششدر کر کے رکھ دیا اور عسکری تاریخ میں ایک اہم سنگ میل کے طور پر دیکھا گیا۔ یہ واقعہ محض عسکری کامیابی نہ تھا بلکہ اس نے عالمی دفاعی تجزیہ نگاروں کو چوکا دیا۔ یوں محسوس ہوا کہ طاقت کا توازن یکسر تبدیل ہو رہا ہے۔ یہاں تاریخ کا ایک دلچسپ پہلو سامنے آتا ہے کہ طاقت کے توازن میں معمولی سی تبدیلی بھی عالمی بیانیے کو بدل دیتی ہے۔ جو کل تک تماشائی تھا، آج ثالث بننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

عالمی تجزیہ نگاروں کے مطابق یہ جنگ نہ صرف عسکری بلکہ نفسیاتی سطح پر بھی ایک فیصلہ کن موڑ تھی۔ اس نے پاکستان کے اندر اعتماد کو بحال کیا اور بیرونی دنیا کو ایک واضح پیغام دیا کہ یہ ریاست ابھی زندہ ہے، متحرک ہے، اور اپنے دفاع کی مکمل صلاحیت رکھتی ہے۔ ابتدا میں عالمی طاقتوں نے اس جنگ کو علاقائی تنازع سمجھ کر نظر انداز کیا، مگر جیسے جیسے حالات نے شدت اختیار کی، امریکا کو مداخلت کرنا پڑی۔ گویا ٹرمپ کی جنگ بندی کی اپیل اس حقیقت کا ظہار تھا کہ علاقائی تنازعات بھی عالمی سیاست کو متاثر کرتے ہیں۔ یہ تبدیلی عالمی سیاست کے اس اصول کی عکاس ہے کہ طاقت کا اظہار سفارت کاری کو جنم دیتا ہے۔ جب میدان جنگ میں توازن بگڑتا ہے تو مذاکرات کی میز خود بخود سوج جاتی ہے۔ اسی جنگ کے بعد عاصم منیر کو پانچ ستارہ جزل کے عہدے پر ترقی دی گئی۔ یہ ترقی دراصل ان کی قیادت پر مہر تصدیق تھی، جو میدان عمل میں اپنی اہلیت ثابت کر چکی تھی۔

اس جنگ کے بعد عاصم منیر کو فیلڈ مارشل کے عہدے پر ترقی دی گئی۔ یہ اعزاز پاکستان کی تاریخ میں نہایت کم شخصیات کو ملا ہے، اور اس کا مطلب صرف عسکری کامیابی نہیں بلکہ قومی اعتماد کا اظہار بھی ہے۔ یہ اعزاز پاکستان کی تاریخ میں ایک غیر معمولی مقام رکھتا ہے۔ امریکی صدر کی جانب سے جنگ بندی کا دعویٰ اور پاکستان کی جانب سے اس کی تائید، ایک نئی سفارتی ہم آہنگی کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں عسکری حکمت عملی سفارتی مہارت میں ڈھلتی نظر آتی ہے۔

عالمی سطح پر اس جنگ نے پاکستان کی عسکری صلاحیت کو ایک نئی پہچان دی۔ دفاعی ماہرین نے اس بات کا اعتراف کیا کہ پاکستان نہ صرف اپنی سرحدوں کا دفاع کر سکتا ہے بلکہ جدید جنگی تقاضوں سے بھی ہم آہنگ ہے۔ اس جنگ کے بعد پاکستان کی عسکری صلاحیت کو عالمی سطح پر تسلیم کیا گیا۔ یہ ایک ایسا لمحہ تھا جب ریاست نے اپنی موجودگی کا بھرپور احساس دلایا۔ عاصم منیر کی شخصیت میں اس دوران ایک نمایاں تبدیلی بھی محسوس کی گئی۔ جو ابتدا میں خاموش اور محتاط دکھائی دیتے تھے، وہ اب پُر اعتماد و واضح موقف رکھنے والے رہنما کے طور پر سامنے آئے۔

اس کے ساتھ ہی بھارت کے اندر سیاسی دباؤ میں اضافہ ہوا۔ مودی کو شدید تنقید کا سامنا کرنا پڑا، اور ان کی خارجہ پالیسی پر سوالات اٹھنے لگے۔ واشنگٹن کے دوروں میں یہ فرق نمایاں تھا۔ پہلی ملاقات میں جو احتیاط تھی، دوسری میں وہی شخصیت ایک پختہ سفارتکار کے روپ میں دکھائی دی۔ یہ تبدیلی محض ذاتی نہیں بلکہ حالات کی پیداوار تھی۔ جنگیں انسانوں کو بدل دیتی ہیں، اور قیادت کو نکھار دیتی ہیں۔ بھارت کے اسرائیل کے ساتھ تعلقات اور ایران کے خلاف مہینہ کردار نے خطے میں نئی کشیدگی کو جنم دیا۔ اس تناظر میں بھارت کے اسرائیل کے ساتھ تعلقات اور ایران کے خلاف مہینہ کردار نے خطے میں ایک نئی کشیدگی کو جنم دیا۔ یہ واقعات عالمی سیاست کے پیچیدہ روابط کی عکاسی کرتے ہیں، جہاں مفادات اصولوں پر غالب آجاتے ہیں۔ یہ واقعات عالمی سیاست کی پیچیدگیوں کو ظاہر کرتے ہیں۔

پاکستان نے اس صورتحال میں ایک متوازن پالیسی اپناتے ہوئے خود کو ایک ذمہ دار ریاست کے طور پر پیش کیا۔ یہی وہ مقام تھا جہاں عسکری قیادت نے سفارتی کردار بھی ادا کرنا شروع کیا۔ ان کے قریبی ساتھیوں کے مطابق عاصم منیر ایک کم گو مگر عمل پر یقین رکھنے والے فرد ہیں۔ وہ شور نہیں مچاتے، بلکہ نتائج سے بات کرتے ہیں۔ اور یہی انداز انہیں منفرد بناتا ہے۔

واشنگٹن میں ہونے والی ملاقاتوں نے عاصم منیر کو عالمی سطح پر متعارف کروایا۔ ابتدا میں ان کی شخصیت محتاط اور کم گو سمجھی جاتی تھی، مگر وقت کے ساتھ ساتھ ان میں ایک غیر معمولی اعتماد پیدا ہوا۔ عاصم منیر کے دورہ امریکا نے ان کی شخصیت کو عالمی سطح پر متعارف کروایا۔ ابتدا میں محتاط انداز رکھنے والے یہ رہنما اب ایک پر اعتماد سفارتکار کے طور پر سامنے آئے۔ ان کی عالمی سرگرمیاں بھی قابل ذکر ہیں۔ چین، سعودی عرب، اور ایران کے دورے اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ محض عسکری نہیں بلکہ سفارتی میدان میں بھی فعال کردار ادا کر رہے ہیں۔

جون 2025 کے دورے میں ان کی شخصیت ایک پختہ سفارتکار کے طور پر سامنے آئی۔ امریکی حلقوں میں ان کے بارے میں مثبت تاثرات نے پاکستان کیلئے ایک نئی راہ ہموار کی اور ان کا اعتماد اور طرز گفتگو عالمی حلقوں کو متاثر کرنے میں کامیاب رہا۔ یہ ایک نئی سفارتی جہت کا آغاز تھا۔ پاکستان کی خارجہ پالیسی میں ان کی شمولیت اس بات کی عکاس ہے کہ موجودہ دور میں عسکری اور سفارتی دائرے ایک دوسرے سے جدا نہیں رہے۔

ایران اور امریکا کے درمیان کشیدگی میں پاکستان کی ثالثی کی پیشکش ایک اہم سفارتی قدم تھا۔ دنیا اس وقت تباہی کے دہانے پر کھڑی مضطرب ہے اور اس نازک وقت میں ثالثی کی پیشکش، دراصل ایک دوراندیشی کا مظہر تھی، جس نے پاکستان کے کردار کو مزید مضبوط کیا۔ یہ پیشکش دراصل اس وزن کا اظہار تھی جس کے تحت پاکستان خود کو ایک پل کے طور پر پیش کرنا چاہتا ہے، نہ کہ محض ایک فریق کے طور پر۔ یہ قدم اس بات کا غماز ہے کہ پاکستان خود کو ایک ذمہ دار عالمی کردار کے طور پر پیش کرنا چاہتا ہے۔ جون 2025 میں وائٹ ہاؤس میں ہونے والی ملاقات نے اس سفر کو ایک نئی سفارتی جہت اور عسکری بلندی عطا کی۔ عالمی میڈیا نے اسے غیر معمولی قرار دیا، اور یوں عاصم منیر عالمی سیاست کے ایک اہم کردار کے طور پر تسلیم کیے گئے۔

وائٹ ہاؤس کی رسمی ملاقات کے بعد، امریکی دارالحکومت میں پاکستانی سفارتخانے کی ایک نشست محض ضیافت نہ تھی بلکہ ایک فکری مجلس کا رنگ لیے ہوئے تھی۔ اس نشست میں امریکی ماہرین خارجہ پالیسی کی موجودگی نے اسے ایک غیر رسمی تھنک ٹینک میں تبدیل کر دیا۔ یہاں فیلڈ مارشل عاصم منیر کا یہ جملہ گویا ایک اصولی اعلان تھا: "سفارتکاری ہی کشیدگی کم کرنے کا موثر راستہ ہے، اور پاکستان اس میں معاونت کر سکتا ہے۔"

ایران اور امریکا کے درمیان کشیدگی کے دوران، جہاں وزیراعظم اور وزیر خارجہ سفارتی محاذ پر متحرک تھے، وہیں فیلڈ مارشل عاصم منیر کی خاموش مگر موثر سفارت کاری بھی جاری رہی۔ وائٹ ہاؤس کے ایک عہدیدار کی جانب سے ان رابطوں کی تصدیق اس امر کا ثبوت ہے کہ پاکستان کا عسکری و سفارتی اشتراک ایک ہم آہنگ حکمت عملی کے تحت کام کر رہا ہے۔ یہ وہی طرز عمل ہے جسے عالمی سیاست میں ٹریک ٹو ڈپلومیسی کہا جاتا ہے، جہاں رسمی اور غیر رسمی روابط ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ یہ بیان نہ صرف ایک سفارتی عزم کی ترجمانی کرتا ہے بلکہ اس امر کی بھی غمازی کرتا ہے کہ پاکستان اب محض رد عمل دینے والا ملک نہیں بلکہ عالمی بحرانوں میں پیش قدمی کرنے والا کردار بن چکا ہے۔

11 / اپریل کو اسلام آباد میں ہونے والے ایران-امریکا مذاکرات نے پاکستان کے جغرافیائی اور سفارتی مقام کو ایک نئی جہت عطا کی۔ یہ حقیقت کہ ان مذاکرات میں وزیراعظم شہباز شریف اور فیلڈ مارشل عاصم منیر دونوں شریک تھے، اس بات کی علامت ہے کہ پاکستان میں ریاستی ادارے ایک

مشترکہ قومی بیانیے کے تحت کام کر رہے ہیں۔ اگرچہ یہ مذاکرات فوری نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکے، مگر یہ اس طویل سفارتی سفر کا پہلا سنگ میل ضرور تھے جس میں تسلسل کو کامیابی کی کنجی سمجھا جاتا ہے۔

ٹرمپ کا یہ اعتراف کہ ایران-امریکا جنگ بندی پاکستان کی درخواست پر ممکن ہوئی، بظاہر ایک سفارتی کامیابی سے کہیں بڑھ کر ہے۔ یہ اس امر کا اعلان ہے کہ پاکستان اب عالمی طاقتوں کے درمیان ایک قابل اعتماد ثالث کے طور پر تسلیم کیا جا رہا ہے۔ اگرچہ مذاکرات کا اگلا دور پاکستان میں نہ ہونے کا فیصلہ کیا گیا، مگر اسلام آباد کی شمولیت کا برقرار رہنا اس کے کردار کی اہمیت کو مزید مستحکم کرتا ہے۔

یہ سوال بجاطور پر اٹھتا ہے کہ آخر کیوں ایران اور امریکا جیسے متحارب ممالک ایک ہی شخصیت کو ثالث کے طور پر قبول کرتے ہیں؟ اس کا جواب پاکستان کی متوازن خارجہ پالیسی میں مضمر ہے۔ ایران، خلیجی ممالک، چین اور امریکا—سب کے ساتھ متوازن تعلقات نے پاکستان کو ایک ایسا پل بنا دیا ہے جو متضاد مفادات کو جوڑنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں فیلڈ مارشل عاصم منیر کی قیادت ایک ریاستی حکمت عملی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ پاکستان نے اپنے اتحادیوں—سعودی عرب، چین اور امریکا—کی سلامتی ترجیحات کو ایک متوازن انداز میں آگے بڑھا کر خود کو ایک ذمہ دار شرکت دار کے طور پر منوایا ہے۔ یہ محض سفارت کاری نہیں بلکہ ایک باریک بین توازن ہے، جہاں ہر قدم ناپ تول کر رکھا جاتا ہے تاکہ کسی ایک فریق کی حمایت دوسرے کیلئے تشویش کا باعث نہ بنے۔

فیلڈ مارشل عاصم منیر کی کامیاب ثالثی کا ایک اہم سبب ان کے دیرینہ انٹیلیجنس روابط ہیں۔ 2016ء میں ملٹری انٹیلیجنس اور بعد ازاں آئی ایس آئی کی قیادت کے دوران ایران کے ساتھ قائم ہونے والے روابط نے انہیں ایک ایسا اعتماد فراہم کیا جو محض رسمی سفارت کاری سے حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ایران اور امریکا دونوں انہیں ایک ایسے فرد کے طور پر دیکھتے ہیں جو نہ صرف ان کی پوزیشن کو سمجھتا ہے بلکہ اسے دوسرے فریق تک مؤثر انداز میں پہنچانے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔

ٹرمپ کا غیر روایتی طرز سیاست کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ ان کے نزدیک تعلقات عہدوں سے زیادہ شخصیات کے گرد گھومتے ہیں۔ اسی تناظر میں فیلڈ مارشل عاصم منیر کے ساتھ ان کی قربت ایک نئی سفارتی حقیقت کو جنم دیتی ہے، جہاں رسمی پروٹوکول سے ہٹ کر ذاتی اعتماد کو فوقیت دی جاتی ہے۔ یہ وہ عنصر ہے جو جدید عالمی سیاست میں غیر معمولی اہمیت اختیار کر چکا ہے۔

جب دیگر ممکنہ ثالث—ترکی، سعودی عرب، چین، روس—مختلف وجوہات کی بنا پر اس کردار سے پیچھے ہٹ جاتے ہیں، تو پاکستان ایک واحد قابل عمل آپشن کے طور پر سامنے آتا ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں بلکہ ایک طویل المدتی سفارتی حکمت عملی کا نتیجہ ہے، جس میں پاکستان نے اپنے آپ کو ہر فریق کیلئے قابل قبول رکھا۔

آخر میں، فیلڈ مارشل عاصم منیر کی شخصیت کا وہ پہلو سامنے آتا ہے جو انہیں دیگر عسکری و سیاسی رہنماؤں سے ممتاز کرتا ہے۔ ان کا واضح، دو ٹوک اور فیصلہ کن انداز۔ ٹرمپ جیسے رہنما کیلئے، جو ابہام سے زیادہ وضاحت کو ترجیح دیتے ہیں، یہ خصوصیت غیر معمولی کشش رکھتی ہے۔ یہی وہ وصف ہے جو انہیں نہ صرف ایک مؤثر سپہ سالار بلکہ ایک کامیاب سفارت کار بھی بناتا ہے۔

عالمی سیاست میں بعض اوقات ایک جملہ محض الفاظ کا مجموعہ نہیں ہوتا بلکہ وہ پورے عہد کی ذہنی کیفیت اور ریاستی ترجیحات کا آئینہ دار بن جاتا ہے۔ ایسا ہی ایک لمحہ اس وقت سامنے آیا جب امریکا میں ایک نشست کے دوران فیلڈ مارشل عاصم منیر سے پاکستان کو لاحق خطرات — بالخصوص اس کے ممکنہ عدم استحکام یا ٹوٹنے کے خدشات — کے بارے میں سوال کیا گیا۔

یہ سوال اپنی نوعیت میں محض ایک تجزیاتی استفسار نہ تھا بلکہ اس کے پس منظر میں وہ تمام اندیشے کار فرما تھے جو برسوں سے عالمی تھنک ٹینکس اور پالیسی ساز حلقوں میں زیر بحث رہے ہیں۔ ایک ایسے خطے میں جہاں جغرافیائی کشیدگی، داخلی سیاسی اتار چڑھاؤ، اور اقتصادی دباؤ بیک وقت موجود ہوں، وہاں کسی بھی ریاست کے مستقبل کے بارے میں سوال اٹھانا غیر معمولی امر نہیں سمجھا جاتا۔ مگر اس سوال کے جواب میں فیلڈ مارشل عاصم منیر کا ردِ عمل فوری، واضح اور غیر مبہم تھا۔ انہوں نے نہایت دو ٹوک انداز میں کہا:

”میں کبھی بھی اس دنیا کو پاکستان کے بغیر نہیں دیکھ رہا۔“

یہ جملہ محض ایک دفاعی موقف نہیں بلکہ ایک فکری اعلان تھا۔ ایک ایسا اعلان جو ریاستی خود اعتمادی، قومی بقا کے عزم، اور تاریخی تسلسل کی یقین دہانی کا مظہر ہے۔ تاہم اسی جواب کے ایک اور پہلو نے عالمی حلقوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی، جب انہوں نے یہ عندیہ دیا کہ اگر خدا نخواستہ پاکستان کے وجود کو کوئی سنگین خطرہ لاحق ہوا تو وہ اس کے دفاع کیلئے ہر ممکن صلاحیت رکھتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایسی صلاحیت بھی جو عالمی سطح پر تباہ کن اثرات مرتب کر سکتی ہے۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ پاکستان کی قیادت ایک ایسے مرحلے میں داخل ہو چکی ہے جہاں الفاظ بھی ہتھیار کی مانند اثر رکھتے ہیں۔ اور بعض اوقات ایک جملہ پوری جنگ کو روکنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ فیلڈ مارشل عاصم منیر کا یہ بیان بھی شاید اسی نوعیت کا ہے۔ ایک ایسا جملہ جو بظاہر سخت، مگر درحقیقت امن کی ایک پیچیدہ مگر موثر ضمانت ہے۔ بین الاقوامی تعلقات کے تناظر میں اس بیان کو محض جذباتی اظہار کے طور پر نہیں دیکھا جاسکتا۔ یہ درحقیقت اس نظریے کی توسیع ہے جسے ڈیٹرنس کہا جاتا ہے۔ ڈیٹرنس ایک ایسا اصول جس کے تحت طاقت کا اظہار اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ جنگ کو روکا جاسکے، نہ کہ اسے چھیڑا جائے۔

پاکستان، ایک ایسی قوت ہونے کے ناطے، پہلے ہی اس نظریے کا حامل رہا ہے۔ مگر اس موقع پر فیلڈ مارشل عاصم منیر کا بیان اس بات کی تجدید تھا کہ پاکستان کی دفاعی حکمت عملی محض جغرافیائی سرحدوں کے تحفظ تک محدود نہیں بلکہ اس کے وجودی تحفظ تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہ وہی تصور ہے جو سرد جنگ کے دوران عالمی طاقتوں کے درمیان کار فرما رہا۔ جہاں تباہی کی صلاحیت ہی دراصل امن کی ضمانت بن گئی تھی۔

یہ بیان جہاں ایک طرف عسکری عزم کا اظہار ہے، وہیں دوسری طرف سفارتی پیغام بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ ایک جانب یہ پاکستان کے مخالفین کیلئے ایک واضح تنبیہ ہے کہ ریاست کی بقا پر کوئی سمجھوتہ نہیں کیا جاسکتا، تو دوسری جانب یہ اتحادیوں اور عالمی برادری کیلئے ایک یقین دہانی بھی ہے کہ پاکستان اپنی سلامتی کے معاملے میں سنجیدہ، خود مختار اور فیصلہ کن ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں عسکری قیادت اور سفارتی حکمت عملی ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتی ہیں۔ اور یہی وہ طرزِ فکر ہے جو جدید ریاستی قیادت کی پہچان بننا چاہا ہے۔

بین الاقوامی حلقوں میں اس بیان کو مختلف زاویوں سے دیکھا گیا۔ کچھ مبصرین نے اسے ایک سخت اور غیر معمولی اظہار قرار دیا، جبکہ دیگر نے اسے ایک ذمہ دار ایٹمی ریاست کے اس عزم کے طور پر تعبیر کیا جو اپنے وجود کے تحفظ کیلئے کسی بھی حد تک جانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ مگر اس کا مقصد تصادم نہیں بلکہ اس کا سد باب ہے۔ یہی تضاد دراصل جدید عالمی سیاست کی حقیقت ہے، جہاں طاقت اور امن بظاہر متضاد مگر درحقیقت ایک دوسرے کے تکمیلی عناصر بن چکے ہیں۔

اگر اس بیان کو پاکستان کی تاریخ کے آئینے میں دیکھا جائے تو یہ کسی اچانک رد عمل کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک طویل فکری اور عملی تسلسل کا حصہ ہے۔ قیام پاکستان سے لے کر آج تک، اس ریاست نے بارہا ایسے چیلنجز کا سامنا کیا ہے جہاں اس کی بقا ہی داؤ پر لگی محسوس ہوئی۔ ایسے ہر موقع پر ریاستی قیادت نے ایک واضح پیغام دیا کہ پاکستان محض ایک جغرافیائی اکائی نہیں بلکہ ایک نظریاتی حقیقت ہے۔ اور نظریات کو محض طاقت سے مٹایا نہیں جاسکتا۔

عاصم منیر کا یہ بیان بظاہر ایک مختصر جواب تھا، مگر اپنے اندر کئی جہتیں سموئے ہوئے ہے۔ یہ ایک ریاستی عزم کا اظہار ہے، ایک عسکری حکمت عملی کا تسلسل ہے اور ایک سفارتی پیغام کا جامع خلاصہ ہے۔ یہ ہمیں یہ بھی یاد دلاتا ہے کہ جدید دنیا میں بقا کا انحصار صرف طاقت پر نہیں بلکہ اس کے دانش مندانہ استعمال پر ہے۔ پاکستان کی سفارتی تاریخ ایک نئے باب میں داخل ہو چکی ہے۔ ایسا باب جہاں جنگ اور امن، دونوں کے درمیان ایک باریک مگر مضبوط لکیر کھینچی جا رہی ہے۔ فیلڈ مارشل عاصم منیر کی قیادت میں پاکستان نے یہ ثابت کیا ہے کہ جدید دنیا میں اصل طاقت صرف اسلحے کی نہیں بلکہ بصیرت، توازن اور اعتماد کی ہوتی ہے۔ یہ وہ سفر ہے جو محض ایک فرد کی کامیابی نہیں بلکہ ایک ریاست کے فکری ارتقاء کی داستان ہے۔ اور شاید آنے والے وقت میں یہی داستان عالمی سیاست کے دھارے کو ایک نئی سمت دے گی۔

تاریخ کا دھارا ہمیشہ سیدھا نہیں بہتا؛ اس میں موڑ آتے ہیں، بھنور آتے ہیں، اور کبھی کبھی ایسے پل اور موڑ بھی آتے ہیں جہاں سے گزر کر قومیں اپنی تقدیر از سر نو لکھتی ہیں۔ یوں فیلڈ مارشل عاصم منیر کا سفر محض ایک عسکری افسر کے عروج کی داستان نہیں بلکہ ایک عہد کی تشکیل کی کہانی ہے۔ فیلڈ مارشل عاصم منیر کا عروج بھی اسی نوع کا ایک موڑ اور پل معلوم ہوتا ہے۔ ایک ایسا پل جس پر کھڑے ہو کر پاکستان نے نہ صرف اپنے داخلی انتشار کو قابو کرنے کی کوشش کی بلکہ عالمی سیاست میں بھی اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہوئے خارجی خطرات کا مقابلہ کیا، اور عالمی سطح پر پاکستان کی موجودگی کو مؤثر انداز میں اجاگر کیا۔

یہ داستان ابھی مکمل نہیں ہے۔ یہ تو محض آغاز ہے۔ آنے والے دنوں میں تاریخ کے اوراق مزید کھلیں گے، اور وقت فیصلہ کرے گا کہ یہ باب کس مقام پر جا کر ٹھہرتا ہے۔ مگر فی الحال اتنا کہنا کافی ہے کہ ایک نام تاریخ کے سینے پر ثبت ہو چکا ہے۔ ایسا نام جو حالات کا اسیر نہیں بلکہ ان کا معمار بن کر ابھرا ہے۔ یہ کہنا قبل از وقت ہو گا کہ یہ سفر کہاں جا کر رکے گا، مگر اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ تاریخ کے اس باب میں ایک نام روشن حروف سے درج ہو چکا ہے۔ ایک ایسا نام جو حالات کا اسیر نہیں بلکہ ان کا معمار بن کر ابھرا ہے۔

اکیسویں صدی کی عالمی سیاست ایک ایسے دور ہے پر کھڑی ہے جہاں عسکری قوت اور سفارتی حکمت، دونوں ایک دوسرے کیلئے لازم و ملزوم بن چکے ہیں۔ طاقت کا اظہار اب صرف میدان جنگ تک محدود نہیں رہا بلکہ مذاکرات کی میز پر بھی اقوام کی تقدیر لکھی جا رہی ہے۔ اسی تناظر میں پاکستان، جو کبھی محض ایک علاقائی قوت سمجھا جاتا تھا، اب ایک ذمہ دار اور فعال عالمی کردار کے طور پر ابھرنا دکھائی دیتا ہے۔ اور اس ارتقاء کے پس منظر میں

فیلڈ مارشل عاصم منیر کی شخصیت ایک مرکزی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔

تاریخ کے صفحات پر ایسے کردار کم ہی ملتے ہیں جو بیک وقت سپاہی بھی ہوں، مدبر بھی، اور سفارتکار بھی۔ عاصم منیر کی شخصیت اسی نادر امتزاج کی عکاس ہے۔ اگر آنے والے دنوں میں پاکستان اپنی داخلی استحکام اور خارجی وقار کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہوتا ہے، تو اس میں اس قیادت کا کردار ایک سنگِ میل کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔ تاہم یہ داستان ابھی مکمل نہیں ہوئی۔ یہ تو محض ایک باب ہے، جس کے بعد تاریخ کے اور بھی اوراق کھلنے باقی ہیں۔

بدھ 19 ذیقعد 1447ھ 6 مئی 2026ء

خاک و خون سے ابھرتی ہوئی نئی دنیا

تاریخ کے سنہرے اوراق جب اپنے دامن میں خونچکاں حکایات سمیٹتے ہیں تو وہ محض واقعات کی فہرست نہیں رہتے بلکہ انسانی ارادے، سیاسی بصیرت اور تہذیبی شعور کی جیتی جاگتی علامت بن جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ جب اپنے اوراق الٹی ہے تو وہ محض گزرے ہوئے واقعات کا حساب نہیں رکھتی بلکہ آنے والے زمانوں کیلئے اشارے بھی چھوڑ جاتی ہے۔ یہ خوفناک اور ہولناک لمحے محض واقعات نہیں ہوتے بلکہ عہد ساز علامات کے طور پر تاریخ کے سینے پر ثبت ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ لحات ہوتے ہیں جب طاقت کا توازن، بیانیے کی جہت، اور اقوام کی نفسیات ایک نئے سانچے میں ڈھلنے لگتی ہیں اور ایسے ابواب رقم ہو جاتے ہیں جو محض حادثات نہیں رہتے بلکہ تہذیبوں کی تقدیر کا استعارہ بن جاتے ہیں۔ تاریخ کے افق پر اٹھنے والے یہ طوفان محض جغرافیہ کو نہیں، بلکہ فکر و نظر، اقتدار کے تصورات اور تہذیبی شعور کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔

گزشتہ چند ہفتوں میں مشرق وسطیٰ کے افق پر جو گردِ آشوب اٹھی ہے، وہ محض ایک جنگ نہیں بلکہ عالمی سیاست کے ایک نئے عہد کی تمہید محسوس ہوتی ہے۔ امریکا اور اسرائیل کی جانب سے ایران پر ہونے والی شدید عسکری یلغار، اور اس کے جواب میں ایران کی مزاحمت، اس حقیقت کو آشکار کرتی ہے کہ طاقت کی روایتی تعریف اب اپنے حدود سے تجاوز کر چکی ہے۔ یہ تصادم اگرچہ بارود اور فولاد کے تصادم کے طور پر شروع ہوا، مگر جلد ہی اس نے خود کو سفارت، معیشت اور عالمی رائے عامہ کے پیچیدہ دائروں میں پھیلا دیا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ہمیں بصیرت یا دلدلائی ہے کہ جنگیں محض میدانِ کارزار میں نہیں لڑی جاتیں بلکہ ذہنوں، بیانیوں اور تاریخ کے دھاروں میں بھی اپنا اثر چھوڑتی ہیں۔

گزشتہ آٹھ ہفتوں میں مشرق وسطیٰ کی سرزمین، ایران، امریکا اور اسرائیل کے مابین برپا ہونے والی جنگ کا آتش فشاں بھی اسی قبیل کی ایک داستان ہے۔ ایک ایسا باب جہاں بارود کی بو، سفارت کی نزاکت، اور قوموں کے عزم و ارادہ ایک پیچیدہ مگر معنی خیز نقش میں ڈھل گئے۔ جہاں خطرناک میزائل اور بموں کی گھن گرج، سفارت کی سرگوشیاں، اور قوموں کی نفسیاتی کشمکش ایک دوسرے میں یوں پیوست ہو گئی ہیں کہ انہیں الگ کرنا ممکن نہیں رہا اور جس کے پس منظر میں عالمی سیاست کا ایک نیا نقشہ ابھر تاد کھائی دیتا ہے۔

یہ جنگ بظاہر ایک روایتی عسکری تصادم کے طور پر شروع ہوئی، مگر جلد ہی اس نے اپنے دائرے کو وسعت دیتے ہوئے لبنان، خلیجی ریاستوں اور عالمی معیشت تک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ امریکا اور اسرائیل کی جانب سے ایران پر اچانک اور شدید فضائی و میزائل حملوں نے جس جنگ کو جنم دیا، وہ ابتدا میں ایک محدود عسکری کارروائی دکھائی دیتی تھی، مگر جلد ہی اس نے اپنے دائرے کو وسعت دیتے ہوئے لبنان، خلیجی ممالک اور عالمی معاشی نظام تک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یہ وہ لمحہ تھا جب طاقت کے روایتی پیمانے لرزنے لگے اور ایک نئے تزویراتی کھیل کا آغاز ہوا۔ یہ جنگ، جو بظاہر امریکا اور اسرائیل کے ایران پر اچانک اور بھرپور حملوں سے شروع ہوئی۔ درحقیقت عالمی سیاست کے اس نہج کا مظہر ہے جہاں طاقت کا توازن محض عسکری قوت سے نہیں بلکہ حکمت، صبر اور بیانیے کی قوت سے متعین ہوتا ہے۔ یہ جنگ، جس کا آغاز امریکا اور اسرائیل کی جانب سے ایران پر شدید بمباری سے ہوا، اسی نوع کا ایک ہمہ گیر بحران ہے۔ ایک ایسا بحران جس میں بارود کی تپش کے ساتھ سفارت کاری کی ٹھنڈی سانسیں بھی شامل ہیں، اور جہاں طاقت کی تعریف از سر نو لکھی جا رہی ہے۔ یہ محض ایک جنگ نہیں، بلکہ ایک بیانیہ کی جنگ ہے۔ اور شاید اسی لیے اس کے اثرات گولہ و بارود سے کہیں آگے تک پھیلے ہوئے ہیں۔

امریکا اور اسرائیل نے ایران پر جس شدت کے ساتھ حملے کیے، اس میں ایک طرح کا اعتماد بلکہ غرور جھلکتا تھا۔ یہ حملے محض عسکری کارروائیاں نہ تھیں بلکہ ایک سیاسی پیغام بھی تھے۔ ایک ایسا پیغام جس کا مقصد ایران کو نہ صرف عسکری بلکہ نفسیاتی طور پر بھی مفلوج کرنا تھا۔ امریکا اور اسرائیل کے پیش نظر ایک واضح مقصد تھا: ایران کی عسکری صلاحیت کو تباہ و برباد کر کے اس کی سیاسی قیادت کو اس پنج پر لانا جہاں وہ پسپائی اختیار کرنے پر مجبور ہو جائے۔ یہ سمجھا گیا کہ چند روزہ بمباری ایران کی عسکری قوت اور کمانڈ اینڈ کنٹرول نظام کو چند دنوں میں نیست و نابود کر دیں گے۔

ابتدائی بیانات اور ٹرمپ کے مسلسل دعوے کہ ایران کی فوجی ریڑھ کی ہڈی توڑ دی گئی ہے۔ اسی اعتماد کی عکاسی کرتے تھے کہ چند دنوں کی کارروائی ایران کو جھکا دے گی مگر یہ اندازہ شاید زمینی حقیقتوں سے ہم آہنگ نہ تھا مگر یہاں تاریخ نے ایک بار پھر وہی سبق دہرایا کہ قوموں کی قوت ان کے اسلحے میں نہیں بلکہ ان کے شعور میں ہوتی ہے لیکن امریکا اور اسرائیل بھول گئے کہ تاریخ کا ایک مستقل اصول ہے کہ وہ غرور کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کرتی۔

ایران نے نہ صرف اپنی مزاحمتی صلاحیت کو برقرار رکھا بلکہ آبنائے ہرمز کو ایک تزویراتی ہتھیار میں بدل کر عالمی معیشت کی نبض پر ہاتھ رکھ دیا۔ یہ وہی مقام ہے جہاں تاریخ ہمیں بارہا یہ سبق دیتی ہے کہ طاقت صرف اسلحے کی کثرت کا نام نہیں بلکہ ارادے کی پختگی، حکمت عملی کی باریکی، قومی یکجہتی اور قومی بیانیے کی ہم آہنگی بھی اس کے بنیادی اور فیصلہ کن عناصر ہوتے ہیں۔

ایران نے ابتدائی صدمے کے باوجود جس تیزی سے خود کو منظم کر کے خود کو سنبھالا اور نہ صرف ان حملوں کو برداشت کیا بلکہ جلد ہی اپنی جوابی حکمت عملی کے ذریعے یہ واضح کر دیا کہ وہ محض ایک ہدف نہیں بلکہ ایک فعال اور متحرک قوت ہے۔ اس نے خطے میں موجود امریکی مفادات کو نشانہ بنایا، اور اپنے اتحادی نیٹ ورکس کے ذریعے ایک ہمہ جہت دباؤ قائم کیا اور جوابی حکمت عملی کے ذریعے جنگ کا رخ تبدیل کرنا شروع کر دیا۔ اس نے اس مفروضے کو چیلنج کر دیا کہ عسکری برتری ہی فیصلہ کن عنصر ہے۔

امریکا اور اسرائیل کی جانب سے ایران پر ہونے والی شدید بمباری نے ایک ایسی جنگ کو جنم دیا جس کے اثرات فوری طور پر سرحدوں سے نکل کر عالمی سطح تک محسوس کیے جانے لگے۔ یہ جنگ جلد ہی ایران کی حدود سے نکل کر لبنان، عراق، یمن اور خلیجی ممالک تک پھیل گئی۔ امریکی اڈے، سفارتی مراکز اور اقتصادی مفادات ایران کے نشانے پر آئے۔ یوں ایک محدود جنگ ایک علاقائی بحران میں تبدیل ہو گئی۔ ایران نے جوابی کارروائی میں نہ صرف خطے میں موجود امریکی مفادات کو نشانہ بنایا بلکہ اپنے علاقائی اتحادیوں کے ذریعے ایک ہمہ جہت مزاحمت کا مظاہرہ کیا۔ ایران نے واضح کر دیا کہ اگر اسے نشانہ بنایا جائے گا تو وہ جواب بھی محدود نہیں رکھے گا۔ یہ وہ لمحہ تھا جب جنگ ایک علاقائی تصادم میں بدل گئی۔ اور عالمی طاقتوں کیلئے صورتحال پیچیدہ ہو گئی۔

یہاں ایران کی حکمت عملی میں ایک اہم پہلو نمایاں ہوتا ہے: اس نے جنگ کو محض دفاعی دائرے میں محدود نہیں رکھا بلکہ اسے ایک وسیع تر جغرافیائی اور معاشی تناظر میں منتقل کر دیا۔ ایران کا سب سے بڑا تزویراتی کارنامہ آبنائے ہرمز کو بطور ہتھیار استعمال کرنا تھا جس میں کافی حد تک وہ کامیاب ہو گیا ہے۔ اس نے نہ صرف تیل کی ترسیل کو متاثر کیا بلکہ عالمی معیشت کو بھی ایک غیر یقینی کیفیت میں مبتلا کر دیا۔ یہ اقدام اس بات کا ثبوت تھا کہ جدید

جنگوں میں جغرافیہ بھی ایک طاقتور ہتھیار بن سکتا ہے۔ آبنائے ہر مہم محض ایک سمندری راستہ نہیں بلکہ عالمی معیشت کی شہ رگ ہے۔ جب ایران نے اس پر کنٹرول مضبوط کیا اور اس کی آمد و رفت کو محدود کیا تو دراصل اس نے دنیا کی معاشی نبض کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

آبنائے ہر مہم پر ایرانی کنٹرول ایک ایسا دباؤ کا آلہ بن گیا جس نے عالمی معیشت کو لرزاکر رکھ دیا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں تاریخ میں جنگیں اکثر اپنے اعلان سے بڑی ہو جاتی ہیں، کیونکہ ان کے پس پردہ محرکات کہیں زیادہ وسیع ہوتے ہیں۔ یہ اقدام اس بات کی علامت تھا کہ جدید جنگوں میں جغرافیہ بھی ایک ہتھیار بن سکتا ہے۔ امریکا اور اسرائیل شاید اس امکان کا مکمل ادراک نہ کر سکے تھے کہ ایران اس حد تک جاسکتا ہے کہ عالمی معیشت کو زیرِ غمّال بنالے۔ امریکا اور اسرائیل کیلئے یہ ایک غیر متوقع موڑ تھا۔ گویا میدانِ جنگ اچانک عالمی منڈیوں تک پھیل گیا۔

امریکا نے دعویٰ کیا کہ اس نے ایران کے ہزاروں اہداف کو تباہ کر دیا ہے، مگر زمینی حقیقت اس سے مختلف دکھائی دی۔ ایران کی جوانی کارروائیاں اس بیانیے کو چیلنج کرتی رہیں۔ ایران نے اپنی جوانی کارروائیوں، میزائل حملوں اور اتحادی نیٹ ورکس کے ذریعے یہ ثابت کیا کہ وہ اب بھی فعال اور موثر ہے۔ یہ تضاد عالمی سطح پر بھی محسوس کیا گیا۔ کہ کیا واقعی ایران کمزور ہوا ہے، یا وہ ایک نئے انداز میں ابھر رہا ہے؟ ٹرمپ کا ہر لمحہ بدلتا بیانیہ ہمیں اس فکر کی یاد دلاتا ہے کہ ظاہری قوت ہمیشہ حقیقی طاقت کی عکاسی نہیں کرتی، یہی وجہ ہے کہ پہلی مرتبہ امریکی صدر کا بیانیہ بری طرح چٹ رہا ہے۔

اسلام آباد میں ہونے والے مذاکرات اس پوری کشمکش کا ایک اہم باب ہیں۔ پاکستان کی ثالثی میں امریکا اور ایران کا براہِ راست آمنے سامنے آنا ایک غیر معمولی پیش رفت اور ایک تاریخی موڑ تھے مگر اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ ایران نے ان مذاکرات میں شرکت کسی کمزور فریق کے طور پر نہیں بلکہ ایک خود مختار اور با اعتماد ریاست کے طور پر کی جو اپنے مفادات کے تحفظ کیلئے ہر محاذ پر سرگرم ہے۔ ایران کا اندازِ گفتگو اور مطالبات اس بات کی نشاندہی کرتے تھے کہ وہ سفارت کاری کو جنگ کا تسلسل سمجھتا ہے، نہ کہ اس کا اختتام۔ یہی وہ انداز ہے جہاں الفاظ محض اظہار نہیں بلکہ حکمت کا وسیلہ ہوتے ہیں۔

یہی وہ دانشمندانہ اسلوب کی جھلک بھی ہے۔ جہاں اصولی موقف کو وقتی دباؤ پر ترجیح دی جاتی ہے۔ ایران نے واضح کیا کہ وہ مذاکرات کرے گا، مگر اپنی شرائط پر۔ اس نے واضح کیا کہ سفارت کاری اس کیلئے جنگ کا تسلسل ہے، نہ کہ اس کا متبادل۔ یہ طرزِ فکر اس بات کا غماز ہے کہ ایران نے نہ صرف عسکری بلکہ سفارتی میدان میں بھی اپنی جگہ مضبوط کی۔

اگرچہ مذاکرات کا پہلا دور بے نتیجہ رہا، مگر اس نے ایک نئی راہ ضرور ہموار کی۔ یہاں ہمیں ایرانی خارجہ پالیسی کی وہ جھلک دکھائی دیتی ہے جہاں وہ تاریخ کو محض واقعات کا تسلسل نہیں بلکہ ارادوں کی کشمکش قرار دیتے ہیں۔ ایران نے اسی اصول پر عمل کرتے ہوئے سفارت کاری کو جنگ کا تسلسل بنایا۔ ایک ایسا تسلسل جس میں ہتھیاروں کی جگہ الفاظ نے لے لی، مگر مقصد وہی رہا: خود مختاری کا تحفظ۔

امریکا نے ایک طرف جنگ بندی کا اعلان کیا، مگر دوسری طرف ایران پر دباؤ بڑھانے کیلئے بحری ناکہ بندی نافذ کر دی اور ایک ایرانی جہاز کو قبضے میں لے لیا۔ یہ طرزِ عمل اس تضاد کی عکاسی کرتا ہے جو امریکی پالیسی میں اکثر دکھائی دیتا ہے۔ ایک ہاتھ میں امن کا پرچم اور دوسرے میں دباؤ کا ہتھیار۔ ایران نے اس صورتحال کو اپنے حق میں استعمال کیا۔ اس نے نہ صرف جنگ بندی کو قبول کیا بلکہ اسے ایک وقفہ سمجھتے ہوئے اپنی سفارتی پوزیشن کو مضبوط کیا۔



ایران نے مذاکرات میں ایک دس نکاتی منصوبہ پیش کیا جس میں جنگ بندی، پابندیوں میں نرمی، اور سلامتی کی ضمانتیں شامل تھیں۔ یہ مطالبات ایک ایسے ملک کی ترجمانی کرتے ہیں جو اپنے حقوق کیلئے کھڑا ہے اور کسی دباؤ میں آنے کو تیار نہیں، گویا یہ اس کی مزاحمت کا سفارقی اظہار تھا۔ یہ وہ سفارقی انداز کی یاد دلاتا ہے جہاں وہ اصولی موقف کو وقتی مصلحتوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ ایران نے بھی یہی کیا۔ اس نے وقتی نقصان کے باوجود اپنے اصولی موقف کو برقرار رکھا۔ یہ مطالبات اس بات کا اظہار تھے کہ ایران کسی بھی قیمت پر اپنی خود مختاری اور تئوری اٹاٹوں پر سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں۔

یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ ایران نے اس جنگ میں بھاری نقصان اٹھایا۔ ہزاروں افراد شہید، لاکھوں لوگ بے گھر ہوئے، اربوں ڈالر کا معاشی نقصان، اور اہم انفراسٹرکچر کی تباہی۔ تیل و گیس کی تنصیبات، صنعتی کارخانے، تعلیمی ادارے، اور بنیادی ڈھانچہ شدید متاثر ہوا۔ یہ سب اس قیمت کا حصہ ہیں جو ایران نے ادا کی مگر سوال یہ ہے کہ کیا یہ نقصان اس کی کمزوری کی علامت ہے یا اس کی استقامت کا ثبوت؟ اقوام کی تاریخ میں ایسے لمحات بھی آتے ہیں جب نقصان محض نقصان نہیں رہتا بلکہ ایک اجتماعی شعور کو جنم دیتا ہے۔

ایران میں بھی یہی ہوا۔ تباہی نے ایک نئے قومی بیانیے کو جنم دیا۔ ایک ایسا بیانیہ جو مزاحمت کو جواز فراہم کرتا ہے۔ ایران کے اندر ایک مضبوط بیانیہ ابھرا کہ بیرونی جارحیت کا مقابلہ کرنا ایمان کا حصہ ہے۔ عوام نے اپنے عمل سے اس بیانیے کو تقویت دی۔ وہ پلوں، تنصیبات اور قومی علامات کے ساتھ کھڑے ہو گئے، گویا وہ خود ایک زندہ ڈھال بن گئے ہوں۔ یہ منظر ہمیں اس تمثیلی زبان کی یاد دلاتا ہے جہاں قوم اور اس کی شناخت ایک دوسرے میں ضم ہو جاتی ہیں۔ مگر تاریخ میں ایسی مثالیں کم نہیں جہاں نقصان نے قوموں کو کمزور کرنے کی بجائے مضبوط کیا ہو۔ قومیں اپنے الفاظ اور اپنے بیانیے سے زندہ رہتی ہیں۔

جنگ کے ابتدائی دنوں میں ایران کی اعلیٰ قیادت کو نشانہ بنایا گیا، جس کے نتیجے میں ایک بڑا خلا پیدا ہوا۔ آیت اللہ علی خامنہ ای کے بعد محتجبی خامنہ ای کا نیا رہبر اعلیٰ انتخاب ایک نئے سیاسی دور کا آغاز ثابت ہوا۔ یہ تبدیلی بظاہر ایک کمزوری سمجھی جا رہی تھی، مگر عملی طور پر اس نے نظام کو مزید سخت گیر اور منظم بنا دیا۔ پاسداران انقلاب کا کردار مضبوط اور اثرورسوخ بڑھ گیا ہے، اور داخلی اختلافات وقتی طور پر دب کر پس منظر میں چلے گئے۔

یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ ایران نے اس جنگ میں بھاری نقصان اٹھایا۔ یہ سب اس کی قیمت کا حصہ ہیں مگر سوال یہ ہے کہ کیا یہ نقصان اس کی کمزوری کی علامت ہے یا اس کی استقامت کا ثبوت؟ ایران نے اس نقصان کو ایک قومی بیانیے میں ڈھال دیا۔ مزاحمت کو ایمان کا درجہ دیا گیا، اور عوام نے اس بیانیے کو اپنے عمل سے تقویت دی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں تمثیلی زبان میں قومیں اپنے الفاظ اور اپنے بیانیے سے زندہ رہتی ہیں۔

اس جنگ نے عالمی طاقت کے توازن پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔ جہاں پہلے دنیا کو امریکا، روس اور چین کے تین مراکز قوت میں تقسیم کیا جا رہا تھا، وہیں اب ایران جیسے ممالک بھی اس نظام کو چیلنج کرتے نظر آرہے ہیں۔ یہ ایک نئی عالمی ترتیب کا آغاز ہو سکتا ہے۔ ایک ایسی ترتیب جس میں طاقت کا معیار صرف معاشی یا عسکری قوت نہیں بلکہ تزویراتی مقام اور مزاحمتی صلاحیت بھی ہو۔

اس جنگ نے عالمی طاقت کے تصور کو بھی چیلنج کیا ہے۔ جہاں پہلے طاقت کو صرف معاشی اور عسکری پیمانوں سے ناپا جاتا تھا، وہیں اب تزویراتی مقام، علاقائی اثر و رسوخ، اور مزاحمتی صلاحیت بھی اہم عوامل بن کر سامنے آئے ہیں۔ یہ جنگ عالمی طاقت کے تصور کو بدل رہی ہے۔ اب طاقت صرف معیشت یا فوجی قوت کا نام نہیں رہی بلکہ تزویراتی مقام، بیانیہ سازی، اور مزاحمتی صلاحیت بھی اس کا حصہ بن چکی ہیں۔ ایران جیسے ممالک اب عالمی نظام کو چیلنج کر رہے ہیں۔ ایران نے ثابت کیا کہ ایک نسبتاً کمزور ملک بھی اگر درست حکمت عملی اختیار کرے تو وہ بڑی طاقتوں کے مقابلے عالمی نظام میں اپنا مقام اور جگہ بنا سکتا ہے۔

ٹریمپ کو اس جنگ کے باعث داخلی اور خارجی دباؤ کا سامنا ہے۔ کانگریس کی منظوری، مالی اخراجات، اور آئندہ انتخابات — یہ سب عوامل امریکا کی پالیسی کو محدود کر رہے ہیں۔ عالمی سطح پر امریکا کی ساکھ متاثر ہوئی ہے، اس جنگ کے نتیجے میں ایران کی عالمی شبیہ میں نمایاں تبدیلی آئی ہے جبکہ ایران کو گلوبل ساؤتھ میں پذیرائی ملی ہے۔ گلوبل ساؤتھ کے ممالک میں اسے ایک مزاحمتی قوت کے طور پر دیکھا جا رہا ہے، جبکہ امریکا کے خلاف جذبات میں اضافہ ہوا ہے۔ ایران نے اس صورتحال کو بخوبی سمجھتے ہوئے وقت کو اپنے حق میں استعمال کیا ہے اور خود کو کسی جلدی میں نہ دکھایا جبکہ ایران کو گلوبل ساؤتھ میں پذیرائی ملی ہے۔ یہ ایک دلچسپ تضاد ہے کہ جس جنگ کا مقصد ایران کو کمزور کرنا تھا، اسی نے اسے عالمی سطح پر زیادہ نمایاں اور ایک مضبوط فریق بنا دیا جبکہ امریکا کے خلاف جذبات میں اضافہ ہوا ہے۔

یہ ایک دلچسپ تضاد ہے کہ جس جنگ کا مقصد ایران کو کمزور کرنا تھا، اسی نے اسے عالمی سطح پر زیادہ نمایاں کر دیا۔ ایران کے اندر ایک مضبوط قومی بیانیہ ابھر رہا ہے جس میں مزاحمت کو قومی فریضہ قرار دیا گیا ہے۔ عوام نے نہ صرف حکومت کا ساتھ دیا بلکہ اپنے عمل سے یہ ثابت کیا کہ بیرونی خطرات کے سامنے داخلی اختلافات ثانوی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ منظر ہمیں اس تمثیل کی یاد دلاتا ہے جہاں زبان اور قوم ایک دوسرے کا سہارا بنتے ہیں — یہاں بھی قوم اور بیانیہ ایک دوسرے کے محافظ بن گئے۔

اگر اس پوری جنگ کا حاصل دیکھا جائے تو دو سوالات کے جواب واضح ہوتے ہیں۔
 اول: جانی، مالی، معیشت، انفراسٹرکچر اور عسکری لحاظ سے ایران نے ایک بھاری قیمت ادا کی ہے۔
 دوم: اس کے باوجود، ایران آج بین الاقوامی سطح پر ایک مضبوط اور مؤثر فریق کے طور پر ابھر رہا ہے۔
 یہ ایک ایسا تضاد ہے جو تاریخ میں اکثر دیکھنے کو ملتا ہے — جہاں شکست کے سائے میں بھی کامیابی کے چراغ جلتے ہیں۔

یہ جنگ محض ہتھیاروں کی جنگ نہیں تھی بلکہ بیانیوں کی جنگ تھی — ارادوں کی جنگ تھی۔ ایران نے اس جنگ میں یہ ثابت کیا کہ مزاحمت اگر حکمت کے ساتھ ہو تو وہ محض دفاع نہیں بلکہ ایک نئی تاریخ کی بنیاد بھی بن سکتی ہے۔ کمزور سمجھا جانے والا فریق بھی اگر حکمت، صبر اور استقامت سے کام لے، اور مزاحمت اگر شعور اور صبر کے ساتھ ہو تو وہ نہ صرف تاریخ کا دھاراموڑ سکتی ہے بلکہ وہ عالمی طاقتوں کے مقابلے میں اپنا مقام منو سکتا ہے۔
 آج دنیا ایک نئے موڑ پر کھڑی ہے — جہاں طاقت کی تعریف بدل رہی ہے، اور جہاں کمزور سمجھے جانے والے بھی اپنی تقدیر خود لکھنے لگے ہیں۔ تاریخ کے اس موڑ پر کھڑے ہو کر یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ یہ جنگ ایک نئے عالمی بیانیے کی تمہید ہے — ایک ایسا بیانیہ جس میں طاقت کی تعریف بدل رہی ہے، اور جس میں مزاحمت ایک نئی لغت لکھ رہی ہے۔

یہ جنگ ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ طاقت کی تعریف بدل رہی ہے۔ اب صرف اسلحہ کافی نہیں، بیانیہ، استقامت، اور حکمت بھی ضروری ہیں۔ ایران نے ثابت کیا کہ کمزور سمجھا جانے والا بھی اگر ڈٹ جائے، تو تاریخ کا رخ موڑ سکتا ہے۔ اگر اس پوری داستان کو ایک جملے میں سمیٹا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ ایران نے اس جنگ میں نقصان اٹھایا، مگر اپنی حیثیت حاصل کر لی۔ یہی تاریخ کا وہ سبق ہے جو بارہا دہرایا جاتا ہے۔ کہ طاقت صرف وسائل سے نہیں بلکہ ارادے سے پیدا ہوتی ہے۔ آج دنیا ایک نئے موڑ پر کھڑی ہے۔ طاقت کی تعریف بدل رہی ہے، اور وہ اقوام جو کل کمزور سمجھی جاتی تھیں، آج اپنے لیے نئی جگہ بنا رہی ہیں۔ ایران کی یہ داستان اسی تبدیلی کی ایک نمایاں مثال ہے۔ ایک ایسی مثال جو آنے والے برسوں میں عالمی سیاست کے رخ کو متعین کر سکتی ہے۔

جمعرات 20 ذیقعد 1447ھ 7 مئی 2026ء